خطباتِ اقبال و جدید یتِ فکر

جدیدیت و مسلم جدیدیت

مقالاتِ جامعی

جلد چہارم

سیاست،جدیدیت،روزنماچہ،دہشت گردی

تہذیبی تصادم،اقبالیات،توہین، رسالت اورمغرب پر سید خالد جامعی کی فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ ۔

مرتبہ

ڈاکٹر محمد علی جنید

KURF

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum

توہین رسالت اور عصر جدید

مغرب،اسلام اور د ہشت گردی

عنوان:مقالاتِ خالد جامعی:جلد چہارم۔
مرتبہ،تہذیب،فہرست،سرورق و تمہید:ڈاکٹر محمد علی جنید۔
کلید:جدیدیت،مغرب،دہشت گردی،خواجہ عبدالواحید کا روزنامچہ،اقبال،خطباتِ اقبال۔غامدیت،مشال خان،توہین رسالت،ارتداد،ملحد،الھاد،پاکستان،عدالتِ عالیہ،سید خالد جامعی اور ڈاکٹر محمد علی جنید۔

www.facebook.com/kurf.ku
www.facebook.com/groups/kurfku
www.kurfku.blogspot.com

Karachi University Research Forum
جامعہ کراچی دارالتحقیق برائے علم وادانش

تمہید

زیر مطالعہ جلد مقالات سید خالد جامعی کے سلسلے کی چوتھی جلد ہے،جسکی ضخامت اور وزن کافی وزنی ہوگیا ہے،اس جلد میں سید صاحب کی کچھ جدید و نسبتاً قدیم تحریریں جمع کردی گئیں ہیں۔

اس کے باوجود ان سب کا موضوع و محور بحر حال مغرب،جدیدیت ،نسل کشی،الحاد،جہاد،اسلام اور عصر حاضر،مشعل خان کے قتل کی بحث ،زبانوں کا معدوم ہونا، دہشت گردی کی تاریخ ،اقبال کے خطبات کی جدیدیت ،خوجہ عبدالوحید کے روزنماچہ وغیرہ رہے ہیں۔

اس جلد میں سابقہ جلدوں میں پائی جانے والی تحریروں کی مقابلے میں ندرت،عملیتِ علم و تنوع زیادہ ملتا ہے۔پیچیدہ فلسفیانہ بحث کے برخلاف،جدید علم سیاست ،مذہب اور عالمی سیاست کے ساتھ ساتھ مغرب کی علمی و اخلاقی ضبو حالی پر تفاصیل جا بجا ملتی ہیں،اسکے علاوہ،غامدی صاحب اور عمار ناصر پر تنقید بھی حسب ضرورت ملتی ہے۔یوں اس جلد میں خالد صاحب کے مطالعے میں آنے والی پندرہ سالوں کی کتب کے حوالہ جات جمع ہوگئے چناچہ کوئی فرد اس میں ۲۰۰۱ تا ۲۰۱۸ تک کے علمی مباحث پاکستان ،عالم اسلام اور مغرب کے تناظر میں ڈھونڈھ سکتا ہے۔

اس جلد میں خاکسار نے کافی جمع پھٹک کے بعد جو تحریریں جمع کر کے حسب شان مخصوص کیں ہیں ان میں :

۱۔جہاد ریاست کا حق ہے یا فرد کا؟:ایک بحث۔

۲۔قانونِ زکوۃ کی بابت غامدی صاحب کے متناقص اصول۔

۳۔عدالت عالیہ سے کچھ سوالات اور مکالمات کے ضمن میں علمی محاکمہ۔

۴۔ فیس بک پر علمی مکالمہ کیوں ممکن نہیں؟ ۔

۵۔ مشعل خان کے قتل پر ایک عالم دین سے مکالمہ۔

۶۔سیکولرازم الحاد اور مشعل خان کے قتل پر عمار ناصر سے ایک مکالمہ۔

۷۔تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ :تاریخی تجزیہ۔

۸۔اقبال کی جدیدیت اور خطبات کے ضمن میں ایک نادر علمی بحث:خواجہ عبدالوحید ؒصاحب ِ سیف و قلم کا روزنامچہ:خطبات اقبالؒ اور سید سلیمان ندویؒ۔

۹۔دہشت گردی تاریخ و تحقیق کی روشنی میں ۔شامل ہیں ۔

یہ جلد قریباً ساڑھے چار سو صفحات پر محیط نو مقالات کا مجموعہ ہے۔اس میں مصنف سے کچھ جگہ اختلاف کی گنجایش موجود ہے بلخصوص ،مشعل خان کے ضمن میں ابہام موجود ہے،کہ آیا اس سے دین،شریعت ،اللہ و رسول کی شان میں گستاخی ثابت ہے کہ نہیں؟،اسکے گھر والوں ،والد اور بھن کا اسکی تردید کرنا کتنا مبنی بر حق ہے یا کتنی کذب بیانی اللہ ہی جانے۔ مگر خاکسار کی تحقیق کی رو سے مشعل خان کی آئی۔ڈی پر کافی ابہام اور عدم تعین آن لاین ملتا ہے ،اطلاعات کی رو سے کچھ فیس بکیوں نے اس آئی ۔ڈی کو اسکی موت بعد بھی استعمال ہوتے دیکھنے کے بیان دئیے ہیں ،یہ بحث آن لاین اسکے موافق اور مخالف دونوں فریقوں کے درمیان میں نے خاموشی سے دیکھیو سنی ہے ۔

مشعل خان بھلے مجرم بھی تھا تو بحرحال اسکے خلاف قاتلوں کو گواہی دینی چاہئے تھی ثبوت ،اکھٹے کرکے دیتے،جب وہ اتنی بڑی ،تعداد اور قوت کے ساتھ قتل کر سکتے ہیں تو ،گواہیاں اور ثبوت بھی بھم پہنچا سکتے تھے۔کچھ بیانات اور اطلاعات کے متابق ،مشعل خان کے والد کا اے۔این۔پی سے تعلق تھا جبکہ،اسکو قتل کرنے والے مجمعے کی پشت پناہی ،تحریک انصاف والے کر رہے تھے ، واللہ علم ۔

یہ بھی میں نے محسوس کیا کہ مشعل خان کا اور اسکے والد و خاندان کا رجحان،مارکسی نظریات کی طرف تھا مگر میں لاتعداد اے۔این ۔پی کے پشتون نواز لوگوں کو جانتا ہوں جو ،مارکسی قوم پرست ہونے کے ساتھ ساتھ پکے دیوبندی بھی ہیں جبھی صر جامعاتی علمی رجحانات پر کفر و الحاد کا اطلاق ممکن نہیں ہے ۔

جب لوگوں کے عقاید و نظریات اتنے پیچیدہ،معجونی کیفیت کے حامل ہوں جائیں۔اور انکا کفر و شرک،الھاد واضح نا ہو تو ان پر حدود کا نفاذ مشتبہ ہوجاتا ہے،اور امر مشتبہ و غیر واضح میں حدود کے عدم نفاذ کے فیصلے اور نظیریں ملتی ہیں۔ایسے میں تعزیراً سزا اور قید عمدہ ہوتی ہے۔

اب شرعاً فیس بک جیسا مشکوک مقام اور ذریعہ جبکہ آئی۔ڈی کس کی ہے،اور کتنے لوگ اسے کتنے طریقے سے استعمال کررہے ہوں،کئی سوال حقیقی فرد کے ہونے یا نا ہونے پر اُٹھا جاتے ہیں۔اب یا تو گواہ سچی یا جھوٹی گواہی دیتے،مشعل خان اسکا اقرار کرتا یا تردید۔دونوں فریق اپنی بات سچ قرار دیکر ایک دوسرے پر لعن و طعن

کرتے یعنی قسامۃ کرتے،یا ریاست مشعل خان کو قید کرکے اس سے توبہ کا مطالبہ کرتی،اور اسکے رجوع پر اسکو تنبیہ کر کے چھوڑ دیتی۔

بحرحال یہ تو طے ہے کہ کسی بھی فرد کو قانون ہاتھ میں لینے کا حق کسی سورت میں حاصل نہیں،بلخصوص جبکہ کہ ملک میں نا شرعی نظام ہو اور نا اخلاقی طور پر لوگ مضبوط کردار اور خوف الہی کے حامل ہوں،ایسا کرنا ایک تباہ کن نراجیت کی علامت ہے ،بلخصوص جبکہ عشق رسول کے نام پر کچھ مفادپسند سیاست چمکا رہے ہوں،اس طرح تو کوئی بھی اپنے مخالف پر الزام لگا کر ہجوم کے ہاتھوں قتل کرواسکتا ہے۔مگر یہ واضح ہو کہ ،شعایر اسلام ،دین اسلام،شریعت ،اللہ و رسول کے گستاخوں کو

سزا لازما ملنی چاہئے،اگر مطلوبہ شرعی تقاضے پورے ہو جائیں۔یہ بھی واضح ہو کہ ختم نبوت ہو یا ،شاتم رسول کی سزا کا معاملہ ہو دونوں شرعاً ثابت ہیں اور تاقیامت نافذ رہینگی۔

لہذا مشعل خان کے ضمن میں ایک اور معاملہ یہ بھی رہا کہ اسکے اپنی جامعہ کی انتظامیہ سے بھی بد عنوانی کے ضمن میں معاملات کشیدہ چل رہے تھے ۔جبھی اصل کہانی اتنی آسان نہیں جتنا اسے سمجھا جارھا ہے۔جبھی اس طرح کے امور جن میں حق شفافیت غیر واضح ہو کسی پر بھتان طرازی کوئی اہل علم و فکر کا شیوہ نہیں۔

ہم ساری زندگی غیر شرعی حرکتیں کرکے،سیکولر زندگی گزار کر اچانک بلا علم کسی کی ترغیب پر کسی کام کو سرانجام دیکر اسے عین دین نہیں قرار دے سکتے۔یہاں علم دین شہید والا معاملہ نہیں ،کہ اسنے گستاخ ہندو کو ماردیا،جسکی کتب،اور تقریریں اسکے جرم کا چلتا پھرتا ثبوت تھیں۔یہاں ایک ایسے فرد کا تعلق ہے جسکو اور اسکے اہل خانہ کو خود کے مسلمان ہونے پر اصرار تھا۔جس مقام پر پر وہ بلوہ ،یا ہجوم کے ہاتھوں مرا وہاں اسکا ان سے تنازعہ چل رہا تھا اوروہ جگہ اسکی مادر علمی بھی تھی چناچہ،طلبہ سیاست میں یہ عام معمول ہے کہ ہجوم کسی کو ماردے ،قاتل کچھ ماہ بعد عدم شہادت اور عدم وضاحتِ اقدام قتل پرچھوٹ جاتےہوں۔

یہ معاملہ ایک جامعہ کے دایرہ کار میں ہوا،اس میں ایک مخالف تنظیم کا ضلعی عہدیدار بھی ملوث پایا گیا تھا۔جبھی گتھیاں سلجھائیں تو بڑے بڑے عقدے کھل سکتے اور کئی نام سامنے آینگے اس امرمیں کہ کون کیا تھا؟

اصل مسلہ یہ بھی تھا کہ فیس بک پر ملحدوں کے مخالف کاروائی میں مشعل کا واقعہ پیش آگیا،حلانکہ میں کچھ اہل علم کو جب ملحدوں ،اللہ کے دشمنوں کے خلاف کچھ کام کرنے علمی جہاد کرنے کا کہتاتھا تو کوئی توجہ نا دیتا،اور کہتے تھے کہ انہیں بھونکنے دیں،ان سے کچھ نہیں ہوتا،شیطان صفت بے راہ روی کا شکار لوگ ہیں ،اگر

غور کرو تو معلوم ہوگا کہ :انکے ہاں گستاخ اللہ کی کوئی خاص اہمیت نہیں ،مگر یہ سب گستاخ رسول کے نام پر خوب کھیل کھیلتے ہیں،قلم اٹھاتے ہیں،جذبات کو گرماتے ہیں۔لہذا ان سب نے اس واقعے کو بھینسا ،روشنی جیسے پیجوں پر سر گرم لوگوں کے تناظر میں دیکھا ،حلانکہ ان سب کے ماخذات کوئی بنیادی نہیں بلکہ اخبارات کی غیر واضح رپورٹنگ ہوا کرتی تھی۔ قیاس آرائیوں کا نیا بازار قایم کیا گیا،کچھ نے کہا کہ مشعل بھی ایسی کاروایئوں میں شریک تھا ،مگر تاحال اسکا کوئی مضبوط ثبوت بہم نہیں پہنچایا گیا ہے۔ایف ۔آئی۔اے اور اسکا سایبر ونگ بھی ایسا کوئی فارنسک تجزیہ مشعل کے متعلق کرسکا ہے۔

فیس بک پر جو موافق اور مخالف بیانات پیش ہوئے ان میں بھی ،فوٹو شاپ کی کاریگری نے سچ اور جھوٹ کوغیر واضح کردیا جیسے:

ایک مشعل خان کی پوسٹ : جس میں مقتول کی تصویر لگی تھی نبی اکرم کو گالی دیتا ہے،جبکہ تقابلی پوسٹ میں یہی پوسٹ:ایک فضل خان نامی فرد کے نام سے ملتی ہے دونوں رات گیارہ بجے یہ گستاخانہ کلمات ادا کرتے ہیں۔اب یہ مشعل خان کا کارنامہ ہے یہ فضل خان کا اللہ جانے۔

اسی طرح مشعل خان کی ایک پوسٹ میں مشعل کہتا ہے کہ کوئی میری جعلی آئی ۔ڈی بنا کر استعمال کر رہا ہے اورمجھے بدنام کررہا ہے۔ہوشیار رہو ،اور وہ لڑکی کی آئی۔ڈی پر میری تصویر لگا کر استعمال کر ہاہے ،اور وہ فرد کوئی قریبی ہے۔یہ پوسٹ عکسی رو سے ۲۶ دسمبر ۲۰۱۶: دوپہر تین بجے کے قریب کا وقت ظاہر کرتی ہے۔سب کو معلوم ہے کہ فیس میں ایک ہی نام کے لاتعداد افراد سرچ پر ملتے ہیں،اکثر کی تصویر بھی ایک ہوتی ہے جسے ،کوئی بھی اٹھا کر کہں بھی پیسٹ مار دیتا ہے،جبھی اصل و نقل کا فرق کرنا ایف۔آئی۔اے۔پی۔ٹی۔اے اور سافٹ ویر یا آئی ۔ٹی ایکسپرٹ کی معاونٹ کے بغیر ناممکن ہے،انکا فارنسک آڈٹ کوئی بچوں کو کھیل نہیں ، کہ صرف تحریر لکھ کر فیصلہ کردیا جائے۔

جبھی فیس بک کا گواہی اور شرعی شہادت میں مقام کا تعین ابھی مقرر کرنا باقی ہے۔ہاں اگر کسی فرد کا وہ اکاونٹ اتنا واضح ،معروف اور حقیقی فرد کا ثابت ہو جائے اور وہ اسکا اقرار کرے کہ مہدوفہ بیان ،تاثرات اسکے ہیں تواُسے اسکا اعتراف تصور کرنا چاہئے،ورنا یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی کسی کے آن لاین اکاونٹ کو اسکے سامنے یا پیچھے استعمال کرے،یا ہیک کرلے ،اور وہ ،یہ اندازہ قایم نہیں کر پائے کہ اُس نے کیا لکھا ہے۔اور دیکھے بغیر آف لاین ہوجائے اور اتنی دیر میں تباہی آکر گزر جائے۔ایسے لاتعداد زاوئےموجود ہیں جن سے یہ معاملہ دیکھا سمجھا جاسکتا ہے۔

اسکے ساتھ غور کیا جائے کہ :مشعل خان نے قتل سے دو دن قبل خیبر نیوز کو ایک انٹرویو میں اپنی جامعہ کی انتظامیہ پر کئی سوال اٹھائے تھے۔جیسے کہ میں ماس کوم کا طالب علم ہوں ،جامعہ میں دبا کر بدعنوانی جاری ہے،اور بعض اساتذہ بیک وقت دو دو عہدوں پر براجمان ہیں۔ بہت سے پروفیسرز کے پاس تو تین تین عہدے ہیں۔ہمارا احتجاج ایک اس سبب بھی ہے کہ جامعہ نے فیسوں میں اضافہ واپس نہیں لیا،ڈگریاں روک کر رکھی ہیں،یہ ایک سرکاری جامعہ ہوکر کس چیز کے پچیس ہزار ماہانہ لے رہی ہے۔اس ظلم کو میڈیا واضح کرے۔

مشعل خان کی متضاد پوسٹیں ملتی ہیں جس اسکے اصل مذہبی رجحانات کا واضھ تعین مشکل بن جاتا ہے :جیسے ۲۵۔نومبر ۔۲۰۱۴ کو ڈیلی قدرت کی پوسٹ شیر کی کہ:یا اللہ میری عزت کے لئے یہی کافی ہے کہ میں تیرا بندہ ہوں۔جبکہ :تیرہ ۔اگست:۲۰۱۶: کو لکھا کہ:دل خوش ہوا مسجد ویران دیکھ کر ....میری طرح خدا کا خانہ خراب ہے(نعوذ باللہ) غور کریں تو معلوم ہوگا کہ مشعل۔

خان کی ہر پوسٹ موافق اور مخالف میں اسکی کالے قمیض شلوار کی تصویر عام ہے۔اب یہ کون مشعل خان ہے ؛اسکے مخالفین کب سے اسکے پیچھے تھے ،اصل محرکات،جامعاتی سیاست سے متعلق تھے،انتظامی تھے،ذاتی تھے،مذہبی تھے،یا سیاسی کچھ واضح نہیں ہے ۔

اسی طرح مشعل کے اہل خانہ ،باپ،بہن کے مطابق وہ صحابہ کرام بلخصوص حضرت عمر ؓکو بہت پسند کرتا تھا۔غرض یہ کل مشعل خان کی بابت اسکے جرم من ملوث ہونے کی بابت کچھ صراحت سے کہنا خارج از امکان ہے۔اتنا طے ہے کہ جرم تھا یا نہیں ،قاتلوں کا طریقہ لازما غیر شرعی تھا۔اور اسکی حمایت کرنا خود ایک ظلم ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ: حضرت عثمان ؓ کے دور خلافت پر جب ام المومنین حفضہؓ نے اپنی کنیز کو جادو کرکے اعتراف کرنے پر قتل کردیا[1] تو ،عثمان ؓ نے اسےناپسند فرمایا ،کیونکہ قتل ،حدود وغیرہ کے مقدمات فصیل کرناامیر اور اسکے مقررہ نائب کا حق جانا جاتاتھا۔مگرابن عمر ؓنے توجہ دلائی کے قتل کرنے والی کوئی عام خاتون نہیں ،ایک ام المومنین تھیں تو آپ نےخاموشی اختیار کی،مگر کیا ان کے والد اس پر خاموشی اختیار کرتے؟

---

[1] موطا:۱۵۱۳ عبدالرزاق:۱۸۷۴۷۔بہیقی:۱۶۴۹۹ ۔

یہ تو متفقہ معاملہ ہے کہ وہ شاتم رسول جسکی گستاخیاں واضح ہوں،جسکے گواہ ہوں ،اور وہ انکی تردید نا کرے بلکہ ،یا تو اقرار کرے یا الزام کی تردید نا کرے تو اسکو قتل کرنا جائز ہے۔یا اسکی کتب ،تحریریں،ریکارڈ شدہ بیانات موجود ہوں تو وہ اعتراف کے قایم مقام تصور ہونی چاہییں۔

یا پھر ایسا فرد جو باردو تین دفعہ گستاخی کرے پھر معافی مانگ لیا کرے تو اسکواسکا معمول مان کر اسکی آئیندہ معافی اور توبہ قبول ناہوگی بلکہ اسے اس رذیل،مسلسل گستاخی پر ذدِ تلوار کیا جائےگا ،یا ریاست جو موت کا طریقہ مقررکرے وہ اسکا مستحق جاناجائے۔

یہاں اصل معاملہ اُسکاہے جو شرعی اعتراف یا گواہی کے تقاضوں پر پورا نا اترے،اور اسے الزام قرار دے،یا اسےغیر شرعی طریقے سے ہلاک کیا جائے،اسکےقاتل کئی ہوں،اور خود ہی قاضی،خود ہی مدعی،خود ہی خصم، بن جائیں۔اور ان کے الزام بھی ثابت نا ہوں تو ان سےکیا سلوک روا رکھا جائے؟۔

شاتم الرسول کی بابت یہ امر غور طلب ہے کہ عہد فاروقی میں عمرؓ اول ایسوں کو اول قید کرکے ،دعوتِ اسلام دینا،یا توبہ کرنے کی ترغیب دینا پسند فرماتے تھے۔ایسےایک گستاخ کو ابو موسیٰ،امیرِ عمری بیس دن دعوت دیتے رہے ،اس دوران جب انکی ولایت میں حضرت معاذ بن جبلؓ کا آناہوا تو ،انھونے بھی اسے دعوت دی،اس نے توبہ سے برات ظاہر کی تو اسے انھونے قتل کردیا،یعنی اُس مردود کی گردن اڑادی گئی [2] غالباً اسی واقعے یا کسی اور واقعے میں جو گستاخی رسول کےسلسلے میں پیش آیا کے ضمن میں عمرؓ کو خبر ملی کےابو موسیٰ کی ولایت میں ایسا ہوا ہے تو عمرؓ نےفرمایا :تم نے ایسا کیوں نا کیااسے تین دن قید رکھ کرکھلاتے ،پلاتےدعوت توبہ دیتے شاید وہ توبہ کرلیتا؟[3]

جبھی مشعل کو مارنے والے اول اسکا معاملہ قانون کے سامنے لاتے،گواہیاں اور ثبوت پیش کرتے،اگر انکے ثبوت تسلیم نا کیئے جاتے تو انھونے اپنا فرض پورا کردیا،اللہ اس مردود کا فیصلہ کردیتا،ورنا،وہ جب یہ یقین کے بعد کہ وہ سچے ہیں،اور قانون اور عدالتیں کچھ نہیں کر رہیں،تب وہ کام کرتے جو انھونے اول کردیا،تاکہ ان لبرلز ،سیکولر پر اتمام حجت ہوجاتی ،کہ انھونے اسے انصاف کا موقع دیا تھا مگرریاست نے

---

[2] ابو داود:۴۳۵۶۔صحیح ابی داود:۳۶۶۲:کتاب الحدود۔
[3] الموطا:۱۴۱۳۔سعید بن منصور:۲۵۸۶،۲۵۸۵۔

اجتماعی زندیقیت دکھا دی،اب ہم پر اسکا قتل قانون سے باہرجایز ہے۔ان سے پوچھا جاتا کہ فیس بک سے ہٹ کر بلمشافہ مشعل نے کون سے کلمات ادا کئے جو انھونے بذات خود سنے ،اور دیگر گواہ پیش کر کے معاملہ مضبوط کرتے۔

یہ تو واضح ہے کہ:

جسکی بابت شہادتیں و اعتراف موجود ہوں کہ اس نے اللہ،اسلام،احکام الہی ،انبیا کی شان میں گستاخی کی وہ قتل ہوگا،اور نمونہ عبرت بنادیا جائیگا،مگر ان زندیقوں کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے جو ظاہراً اسلام کے دعوےدار ہوں مگر اسکے جز اور احکامات ،شعایر کا مذاق اڑائیں اور اسلام کی تاویل سلف و خلف سے خارج کریں سے کیا سلوک روا رکھا جائے؟

آج کی مسلم لبرل،سیکولر دنیا ایسوں سے بھری پڑی ہے،اور اختیار و اقتدار بھی انکے پاس ہے ۔اسلامی تاریخ میں حکمرانوں نے زندیقیوں کو بلا تردد قتل کیا،حضرت علی نے عبداللہ بن سبا اور اسکے متعلقین جو علیؓ کو رب مانتے تھےکو آگ جلوا کو جلوادیا[4]،منصور نے خودکو رب کو رب کہنے والوں کا قتال کروادیا۔[5]

ڈاکٹر وہبہ ذحیلی نے ایسی کئی رایوں کو جوزندیق کی بابت ملتی ہیں کاجاہزۃ لیا ہے اور،یہ بتایا ہے کہ ایسا افرد اسلام ظاہر کرکے اپنے من کی کفرانہ خباثتوں کو چھپاتا ہے اور اسلامی احکامات اور شرایع کا بطلان کرنے میں مگن رہتاہے ،اس تعریف کو انھونے فقہائے شافعیہ کی طرف منسوب کیا ہے مگر انکا تمام رایوں کا جایزہ لینے کےبعد فیصلہ عصر جدید میں بھی یہی ہے کہ وہ قتل کیا جائیگا۔[6]

ہم دیکھتے ہیں کہ بے دین کو امام نوویؒ :ایک طرح کا زندیق مانتے ہیں یعنی عہد قدیم کا زندیق آج کا مسلم ،یا غیر مسلم ملحد کی قسم سے تعلق رکھتا ہے،جبکہ امام مالکؒ کے عہد تک یہ معاملہ ایساواضح نا تھا جبھی انکے خیال میں ایسے افراد منافقین کے قبیل سے تعلق رکھتے ہیں۔[7]

---

[4] بخاری:۶۹۲۲۔ الکشی: رجال کشی:صہ:۱۰۷:اثر عدد:۱۷۲،۱۷۱۔

[5] معین الدین ندوی،شاہتاریخ الاسلام :مکتبہ اسلامیہ:لاہور:۲۰۱۲:حصہ :سوم ؛جلد دویم:صہ: ۳۱:بحوالہ:ابن اثیر:جلد:۵:صہ:۱۸۷،۸۸۱۔

[6] وھبہ ذحیلی،ڈاکٹر۔الفقہ الاسلامی الادلہ:صہ:۵۵۷۷:ج:۷بیروت۔

[7] ابن حجر عسقلانی،حافظ۔فتح الباری شرح البخاری:صہ:۲۷۱:ج:۴:بیروت۔

صاحب کتاب الاختیار نے البحر رایق جو فقہ حنفی کی معتبر کتاب کے حوالے سےبیان کیا ہے کہ:دوران جرم ہر مسلمان تعزیراً گناہ گار یا مجرم کو روک سکتا ہے مگر بعد از جرم اسکا حق صرف حاکم کو ہوتا ہے[8]

کیا آج کی عدالتوں کو ہم حاکم وقت کا قایم مقام جانکر کسی معاہدہ عمرانی کے ضمن یا شرعی مکلف کا فیصلہ فصیل کرنے والے کا قایم مقام جانکر اس حق کو تعزیراً نافذ جانیں یا حقوق اللہ و رسول کے ضمن میں دیکھیں گے،اس سوال کا جواب حل طلب ہے،ہماری عدالتوں اور حکومت نے ایسی قانونی عجب معجونیت طاری کردی ہے کہ مفردات کو مرکبات سے علیجدہ کرنا مشکل ہونا جارہا ہے۔

اب اگر کوی کسی مسلمان پر الحاد اور زندیقیت کی تہمت لگائے اور اسکا ثبوت نا دے تو شرح وقایہ کی رو سے اسے تعزیراً سزا دی جائیگی۔[9]

اب جو یہ کہے اسے تعزیراً نہیں حقوق رسول کےضمن میں قتل کیا جائیگا اسے جواب ہے،کہ جسکا جرم ثابت ہوجائے ،شہادتیں،اقرار یا گواہیاں موجود ہوں تو اس کی سزا پر بحث فضول ہے ،کیونکہ وہ لایق گردن زدنی ہے۔ سوائے اس صورت کہ وہ مجنوں ،یا نابالغ ہو مگر احتیاطاً تعزیراً سزا دینا چاہیے تاکہ جراتوں کو لگام لگے،اور تربیت نفس ہو۔

اسی طرح اگر کوئی مدعی کسی پر کفر کا دعوی ثابت نا کرسکے تو مدعی کو سزا نا ملنے کا حنفیوں کا فیصلہ ہے مگر جب برا بھلا کہے،تحقیر کرے، دشمنی میں کرے تواس سبب قاضی اسے تعزیراً سزا دیگا۔[10]

اسی طرح اگر گواہ جھوٹے ہوں تو امام ابی حنیفہؒ کے قول کی رو سے انکی تشہیر لازم ہے جبکہ صاحبین کے مطابق انکو تعزیراً سزا اور قید بھی کیا جاسکتا ہے۔[11]

شعایر اسلام کا مزاق اڑانے والا،اراکین اسلام کا منکر بھی مرتد ہی ہے مگر عمرؓ اور صدیق اکبرؓ کی بابت کئی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے ،جیسا کہ عمرؓ کی بابت روایات اوپر گزر چکی ہیں،اب صدیق اکبر کو دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ آپ نے بھی جو نظیریں قایم کیں تھیں یہی غالباً عمری دور کے لئے مشعل راہ بنیں انکے مطابق مرتدوں کو توبہ کا موقع دیا جاتا تھا، ۔دعوت اسلام د ی جاتی تھی اور نا ماننے پر انکی گردن ماردی جاتی تھی۔

---

[8] سلامت علی،مولانا۔اسلامی فوجداری قانون ترجمہ کتاب الاختیار۔مکتبہ امدادیہ۔ملتان:صہ:۱۵۶۔عدد:۴۳۶۔
[9] ایضاً:صہ:۱۶۷:عدد:۴۷۶۔
[10] ایضاً:صہ:۱۷۳۔۱۷۴۔:عدد:۴۹۹:بحوالہ:النہر الفایق۔
[11] ایضاً:صہ:۱۷۵؛عدد:۵۰۵۔:بحوالہ:الہدایہ۔

جیسا کہ قلعہ جی نے بیان کیا کہ: ہتھیار والے فرد واحد یا ،گروہ کو آپ اسکی غلطی سدھارنے کا موقع دیا کرتے تھے۔ایسا معاملہ عینیہ بن حصن فزاری کے ساتھ پیش آیا ،جسے خالد بن ولید ؓ نے ہاتھ باندھ کر قیدی بنا کر مدینہ بھیجا تھا ،مدینہ کے بچے و لڑکے اس کے کفر و ارتداد کا تمسخر اُڑانے لگے تھے ۔پھر جب وہ ابو بکرؓ کے سامنے لایا گیا تو اس نے اپنے قبول اسلام کا انکار کردیا، مگر ابو بکرؓ نے اسے اسکے ارتداد سے توبہ کی ترغیب دی تو اس نے توبہ کی جبھی معاف کردیا گیا۔

قلعہ جی کہتے ہیں کہ:اگر مرتد فرد ہو کر توبہ نا کرےتو قتل ہوگا اور گروہ سے قتال کیا جائیگا ،صدیق اکبرؓ مرد و عورت کو توبہ کا موقع دیتے تو پھر گستاخ چاہے مرد ہو یا عورت دونوں کی سزا موت تھی جیسا کہ ام قرفہ کی روایت سے ثابت ہے،جو ارتداد پر قتل کردی گئی۔[12]

لوگوں کی نیتوں کو اس ضمن میں ملحوظ نظر رکھا جائیگا،اگر کوئی فرد ایک دفعہ پہلے اس قبیل کی توبہ کرچکا ہو ،اور وہ صحیح ہوش و ہواس کے ساتھ پھر ایسا جرم کرے اور اقرار و انکار نا کرے تو اسکی خاموشی اسکا اقرار جانو ،اور اقرار تو اقرار ہے اسکی توبہ اب قبول نا ہوگی اسے لازماً سزا ملنی چاہئے۔

کسی کو کفر اور مرتد کہنے والا یہ جان لے کہ نبی اکرمﷺ کو یہ امر سخت نا پسند تھا کہ کوئی کسی مومن کو کافر قرار دے حلانکہ وہ نا ہو تو دونوں میں سے کوئی ایک ضرور کافر ہو جاتا ہے۔[13]

شیخ رفیق طاہر :اس بابت کہ فرماتے ہیں کہ:

یہ دیکھ لو جسکو تم اسلام ،مخالف شریعت مخالف کہہ کر کفر کا فتویٰ صادر کر رہے ہو ،کیا شریعت اسے کفر گردانتی ہے کہ نہیں؟ہمارے معاشرے میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ امر کفر ثابت نہیں ہوتا مگر ،مگر لوگوں کو کافر قرار دے دیا جاتا ہے ۔ایسا اکثر قران ،اللہ کی گستاخی،اور نبی اکرم کے نام پر کیا جاتا ہے(مطلب صرف الزام ہوتا ہے حقیقت میں ایسا نہیں ہوتا)،حلانکہ بہت سے ایسے اقوال و افعال شریعت کی میزان میں گستاخی نہیں ہوتے مگر اس پر ظلم و بربریت کو طوفان بدتمیزی بپا کردیا جاتا ہے،اور لوگوں کو قتل کردیا جاتا ہے۔[14]

---

[12] قلعہ جی،ڈاکٹر۔ فقہ ابوبکر کا انسائکلو پیڈیا۔ادارہ معارف اسلامی:لاہور:۱۹۸۹ع:صہ:۱۴۴،۱۵۳۔بحوالہ:البدایہ والنہایہ:جلد:۶:سہ:۳۱۵۔سنن بہیقی:جلد:۸:صہ:۲۰۴،۲۰۱۔

[13] بخاری:۶۱۰۳۔

[14] محمد رفیق طاہر،شیخ۔کافر کون؟۔مکتبہ اہل حدیث۔صہ:۱۵۔اختصاراً

کسی کے کفر و عدم کفر کا فیصلہ شریعت کی روشنی میں فقہا،محدثین،علمائے وقت یا شرعی عدالتیں کریں گی اور اس ضمن میں وہ شرعی نصوص و فکر کو لازماً ملحوظِ نظر رکھیں گی ورنا ،مذہب اور اخلاق میں کمزور افراد ایک نراجیت و بربریت کو طوفان بدتمیزی برپا کرکے امن و امان کو تہ و بالا کرکے رکھ دینگے۔

یہ امر حق و انصاف کے قریب ہے کہ متہم کی بابت شہادت و اقرار کو طلب کرکے غور و فکر کرے،اگر اسکے خلاف ثبوت مل جائیں تو بدبخت کو قتل کردینا عمدہ ہے،مگر شروع سے جس امر پر ہماری توجہ ہے کہ عدم واضح،شہادتوں،اقراروں،قسموں،گواہوں کی خصومیت،شرعی تقاضوں کو پورا نا ہونا،حاکم ،قاضی،پولیس اور عدالت کے بغیر خود انصاف کرنا،اپنے دشمن ،مخالف جس سے عناد ہو پر الزام لگا کر ماردینا ،ثابت شدہ امور سے مختلیف ہے۔

حیران کن بات ہے کہ اس امر کی قدما نے زیادہ وضاحت نہیں کی،یا تو یہ سبب تھا کہ اسلام کے واضح قانون شہادت،لوگوں میں آج کے مقابل خوف خدا،عمدہ اخلاقی حالت ہونے کے سبب بلوہ سازی کے واقعات بہت کم تھے جبھی اس کی مکمل وضاحت شاید اتنی ضروری نا جانی گئی ہو، جبکہ آج کے دور میں میڈیا،سوشل میڈیا،راویوں،شہادتوں کے عدم معیار،اور پروپگینڈے نے صحیح و غلط ،حق بو باطل کی تفریق مشکل بنادی ہے۔

<u>امام ابو الحسن ماوردیؒ :فرماتے ہیں کہ:</u>

امیر(حاکم ریاست یا اسکے مقررہ نایبین) کو جائز نہیں کہ:وہ متہم کے خلاف بلا تحقیق دعویٰ اعوان کسی امر کی تہمت سنے البتہ ان سے متہم کے حالات،آیا وہ مشتبہ لوگوں میں سے ہے ،یا اس طرح کی قابل تہمت باتوں میں مشہور ہے، یا نہیں دریافت کرے۔

اگر وہ اسکی برات بیان کریں تو تہمت خفیف ہو کر ساقط ہوجائیگی،اور وہ فوراً چھوڑدیا جائے مگر جب اسکے خلاف اس جیسے کاموں کی تہمت قوی ہوجائے گی۔

مزید براں امیر کو اختیار ہے کہ تہمت کے قوت و ضعف معلوم کرنے کے لئے متہم کے اوصاف و شواہدِ حال کو مدِ نظر رکھے ۔[15]

---

[15] ابو الحسن ماوردیؒ،قاضی،امام،احکام السلطانیہ،مکتبہ اسلامایت،لاہور،کراچی :ع:۱۹۸۸،صہ:۳۴۵۔

<u>امام ابن تیمیہؒ کا ذیل کا ایک اقتباس اس ضمن میں پڑھنے کے لایق ہے آپ فرماتے ہیں کہ:</u>

علماء نے اس بات پر اتفاق کیا ہے کہ حاکم کو اپنے علم کے خلاف فیصلہ نہیں کرنا چاہیے، اگرچہ ثقہ اور عدول لوگ اس کے نزدیک اس کی شہادت دیتے ہوں، حاکم کے لیے جائز ہے کہ ان کی شہادت کے مطابق فیصلہ کرے جبکہ اس کے خلاف اُسے معلوم نہ ہو، اگر وہ کوئی ایسا اقرار کرے جس کے بارے میں اُسے معلوم ہو کہ وہ اس میں جھوٹا ہے، تب بھی یہی صورت ہوگی، مثلاً اپنے سے بڑی عمر کے آدمی سے کہے: یہ میرا بیٹا ہے تو اس کا نسب اور میراث ثابت نہیں ہوگی، اس پر علماء کا اتفاق ہے، شرعی دلائل کی بھی یہی صورت ہے، مثلاً ایک ثقہ آدمی کی خبر واحد، نیز امر ونہی اور عموم وقیاس کہ اُن کی پیروی واجب ہے، الّا یہ کہ قوی تر دلیل سے ثابت ہو کہ ان کا باطن ظاہر کے مخالف ہے، اور اس کے نظائر وامثال بکثرت ہیں۔

جب تم یہ جان چکے تو ہم کہتے ہیں کہ اس شخص کے فاسد عقیدے، اس کی تکذیب اور استہانت پر دلیل قائم ہوچکی ہے، پس اب اس کا اقرار رسالت اسی جیسا ہے جس کا اظہار وہ پہلے کیا کرتا تھا۔ اور اس کی دلالت باطل ہوچکی ہے، لہٰذا اُس پر بھروسہ کرنا جائز نہیں، یہ نکتہ ان لوگوں کی ایجاد ہے جو زندیق کی توبہ قبول نہیں کرتے، اہل مدینہ، امام مالک اور ان کے اصحاب اور لیث بن سعد کا یہی مذہب ہے، امام ابوحنیفہ سے منقول دو روایتوں میں سے ترجیح اسی روایت کو ہے، امام احمد سے بھی ایک روایت یہی منقول ہے، جس کی تائید آپ رحمہ اللہ کے بہت سے اصحاب رحمہم اللہ نے کی ہے۔ امام ابوحنیفہ اور احمد سے ایک روایت یہ بھی منقول ہے کہ اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے، امام شافعی رحمہ اللہ سے بھی یہی روایت مشہور ہے، امام ابو یوسف کا آخری قول یہی ہے کہ میں توبہ کا مطالبہ کیے بغیر اُسے قتل کرتا ہوں، لیکن اگر قتل کرنے سے پہلے توبہ کرلے تو اس کی توبہ مقبول ہوگی، امام احمد سے تیسری روایت یہی منقول ہے۔

ان دلائل کے پیش نظر جب دشنام دہندہ مکرر گالی دے جو اس کے کفر پر دلالت کرتا ہے تو دیگر علامات کے شامل ہونے سے گالی کو مزید تقویت حاصل ہوگی، مثلاً اللہ کے محرمات کی تخفیف، فرائض خداوندی کی اہانت اور اس قسم کے امور جو زندیق اور منافق پر دلالت کرتے ہیں، اس کے زندقہ اور کفر کے اثبات کے لیے یہ چیز بڑی موثر ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے ان امور کی موجودگی میں اس کے اظہارِ اسلام کو قبول نہ کیا جائے۔ ایسے آدمی کو قتل کرنے میں توقف سے کام لینا چاہیے اور نہ ہی اسلام لانے کی وجہ سے اس سے قتل کو ساقط کیا جائے، کیونکہ پکڑے جانے کے بعد اس کی حالت میں کوئی نئی تبدیلی پیدا نہیں ہوئی۔ جو قبل ازیں نہ تھی، پھر حدود شرعیہ کو بلاوجہ کیسے معطل رکھا جاسکتا ہے، البتہ اگر اس کا مقدمہ عدالت میں لے جانے سے پیشتر اس سے ایسے اقوال واعمال کا ظہور ہو جو اس کے حسن اسلام پر دلالت کرے اور وہ ان باتوں سے رک جائے تو اُسے فی الحال قتل نہیں کیا جائے گا، تاہم اس قول کے قائلین میں اختلاف پایا جاتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

جن آیات میں نفاق سے توبہ کا ذکر ہے ان کو اسی قسم کے آدمی پر، بلکہ جو اس سے خفیف تر درجے کا ہو اور اس کا نفاق ظاہر نہ ہو، محمول کیا جائے گا اور جن آیات میں اقامت حدود کا تذکرہ ہے ان کو پہلی حالت پر محمول کیا جائے گا، جو اسلام قبول کرنے والے ذمی سے قتل کو ساقط کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اسی کے ساتھ ذمی اور کافر کا فرق واضح ہوجاتا ہے جبکہ وہ اسلام لائے، اس لیے کہ وہ ایسے دین کا اظہار کرتا تھا جو رسول کریم ﷺ کو گالی دینے کو مباح کرتا تھا یا گالی دینے سے منع کرتا تھا، پھر اس نے دین اسلام کا اظہار کیا جو آپ ﷺ کے اکرام و احترام کو واجب قرار دیتا ہے، پس یہ اس امر کی دلیل ہے کہ اس کا دوسرے مذہب کی طرف انتقال صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ اس سے متصادم نہیں، پس اس پر عمل واجب ہے۔

اور یہ طرز و انداز اس بات پر مبنی ہے کہ زندیق کی توبہ مقبول نہیں، جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ یہاں کفر کی علامت تو ظاہر ہے مگر اسلام کا کوئی نشان ظاہر نہیں اور یہ بھی قیاس جلی کی ایک قسم ہے۔

[16]

اس ساری گفتگو کا لُبِ لُباب یہ ہے کہ :

شاتم رسول کی سزا بلا شبہ موت ہے ،اگر اسکی بابت شہادتیں،ثبوت،اسکے اقرار اور تحریریں ثابت ہوجائیں۔جبکہ جب متنازعہ اور قاب لاعتراض بیانات اور اقوال جن پر کسی پر کفر کا اطلاق کیا جائے اس بندے کیطرف واضح طور پر ثابت نا ہوں،اور حق یقین کا درجہ حاصل نا کریں تو ،اس بابت تحقیق کامل طور پر کر لینی چاہئے کیونکہ اس طرح کی الزام تراشیوں کے سبب نا صرف نراجیت پھیل سکتی ہے بلکہ کئی مسلمانوں کا ایمان خطرے کا شکار ہوسکتا ،پھر قاتل اور مقتول کی دشمنی عناد،خصومیت،مخالفت بھی قابل توجہ ہوتی ہے۔میرے پاس مشعل کے گستاخ اور عدم گستاخ ہونے کا کوئی معقول ،و مستند ذریعہ نہیں ہے۔

مگر اتنا میں نے جان لیا ہے کہ اسکی جدیدیت،مارکسی فکر کی طرف کے طرف جھکاو،اسکے کفر کو ثابت نہیں کرتے،اسکے نام کی کئی فیس بکی آئی ڈیز اور ان پر اسکی تصویر کا چسپاں ہونا،اور،آئی پیز کا مختلیف ہونا،موت بعد بھی انکا چلنا،اسکے دوستوں مخالفوں کا مختلیف الآرا ہونا،اسکا گھیراو کرکے قتل کرنا،اور اسی جامعہ کے احاطے میں جہاں اسکے انتظامیہ سے سخت اختلافات چل رہے ہوں،اے۔این۔پی۔تحریک انصاف اور دیگر جماعتوں کا اس جامعہ میں اثر و نفوذ و اختلاف ،باہمی سازشیں۔اس معاملے کو کئی زاویوں سے غیر واضح،،غیر یقینی اور کم از کم جرم کے ثابت ہونے کی حدود سے زیادتی کی حدود میں ضرور لا کھڑا کرتے ہیں۔

---

[16] ابن تیمیہؒ۔امام۔الصارم المسلول علی شاتم الرسول۔مکتبہ قدوسیہ،لاہور۔۲۰۱۱۔صہ:۴۴۷۔۴۴۹۔

،اس جلد کے وزن و ضخامت کے سبب مشعل خان اور ضمنی مباحث پر جامع بحچ نہیں کرسکتا کیونکہ اس پر بھچ ایک کامل تحقیق کا تقاضہ کرتی ہے،جسکا یہاں مقام نہیں جبھی اس غیر کامل بحث پر معذرت خواں ہوں ،باقی آپ حضرات کو جامعی صاحب کی تحریروں کا یہ مجموعہ کتنا پسند آتا ہے یہ آپ مطالعے کے بعد ہی محسوس کر پائینگے۔

والسلام:

ڈاکٹر محمد علی جنید۔

صفحات	فہرست مضامین	عدد
1	جہاد ریاست کا حق ہے یا فرد کا: ایک اہم بحث	۱
1	جہاد فرد کا حق ہے: غامدی صاحب کے گیارہ اصول	۲
2	دہشت گردی کا سبب غامدی صاحب کا فلسفہ اجتہاد یا علماء کا اجتہاد	۳
3	فرشتے بھی اجتہاد کرتے ہیں: غامدی	۴
3	غامدی صاحب عالم اسلام کے عربی زبان سے ناواقف پہلے مجتہد	۵
4	غامدی صاحب نے پہلی مرتبہ ماخذات دین میں ہی اجتہاد کر دیا	۶
5	غامدی صاحب کا فلسفہ اجتہاد اور قوم پرستی	۷
5	اجتہاد صرف اور صرف علماء کر سکتے ہیں جاہل نہیں	۸
6	عالم اسلام میں پرتشدد تحریکوں کا سبب جمہوریت پر ایمان ویقین ہے	۹
7	جمہوریت اور نسلی، مذہبی، لسانی قتل عام لازم وملزوم ہیں	۱۰
11	جدید ریاست، جمہوریت اور تشدد	۱۱
12	اسلامک ماڈرن ازم پروٹسٹنٹ ازم کا چربہ ہے	۱۲
13	دہشت گردی جدیدیت کا عالمی ردعمل ہے	۱۳
14	دہشت گرد کون پاکستان یا اسلام یا مغرب؟	۱۴
18	عالمی غربت کے موضوع پر ایک اہم کتاب	۱۵
18	جدید ریاست سائنس سرمایہ اور ترقی کے جھوٹے خواب	۱۶
20	جدید سائنس، سرمایہ، انسانی حقوق، ہر تہذیب کی اقدار کیوں بدل دیتے ہیں؟ ترقی کے تمام اسلامی ماڈل سود اور قرضے پر مبنی ہیں	۱۷
23	قانون زکوۃ کے بارے میں غامدی صاحب کے متناقص Oxymoron اصول	۱۸
25	سوالات و جوابات	۱۹

51	تعلیم پر اربوں روپے کا خرچ اور جاہلوں کی کثرت	۲۰
51	سیکولر تعلیمی اداروں کا حال سیکولر دانشور کے خیال میں	۲۱
58	عدالتِ عالیہ سے کچھ سوالات اور مکالمات کے تناظر میں علمی محاکمہ	۲۲
59	مفتی منیب الرحمان کی نقطہ سنجی	۲۳
61	اسپریم کورٹ نے جمہوریت کی دہشت گردی کا کوئی نوٹس کیوں نہیں لیا؟	۲۴
62	عارف حسن اور آئی۔۔اے۔رحمان کا ترقی کے مضر نتایج کو تسلیم کرکے خاموشی اختیار کرنا معنی خیز لگتا ہے؟ کیوں جی ؟	۲۵
65	زنا کرنے کی آزادی ہے اور نکاح کرنے پر پابندی ہے	۲۶
68	فیس بک پر علمی بحث و مباحثہ کیوں ممکن نہیں؟	۲۷
77	غامدی صاحب کا تصور جہاد: مرزا قادیانی کا سرقہ	۲۸
78	اسلام دین فطرت ہے مگر مسلمان فطرت پر عمل نہ کریں	۲۹
79	امت مسلمہ کا غلبہ صرف تکوینی طور پر ہوگا	۳۰
79	ریاست کے بغیر غلبہ دین ناممکن ہے	۳۱
80	سر سید غیر ہندی کو ہند میں جہاد کی اجازت دیتے ہیں	۳۲
105	مشال کے قتل پر چند علماء چند لبرل اہل علم سے مکالمہ	۳۳
105	لبرل ازم کی دہشت گردی اور لبرل احباب کا ردعمل	۳۴
105	جان رالس جیسا فلسفی اتنا متشدد اور جارح ہے!	۳۵
107	پاکستانی ریاست اور علماء کا مکالمہ ناکام کیوں ہے؟	۳۶
107	لبرل متجددین کا ریاست کے بارے میں نقطہ نظر	۳۷
108	لبرل مفکرین کا نقطہ نظر: پاکستانی ریاست	۳۸
111	مشال کے قتل پر ایک عالم دین سے مکالمہ	۳۹

۴۰	افغانستان میں دنیا کا سب سے بڑا بم مشال والے واقعے کے دن گرایا گیا	112
۴۱	افغانستان میں ہزاروں لوگ مرے مگر اس کی وڈیو فلم جاری نہیں کی گئی	113
۴۲	ایک وڈیو فلم نے بڑے بڑوں کے عشق رسول کا خاتمہ کردیا	114
۴۳	اگر رجم کی سزا کی وڈیو جاری ہوجائے تو لوگ رجم کی سزا کے بھی خلاف ہوجائیں گے	114
۴۴	کسی کو قتل کرنا اتنا بڑا جرم نہیں اصل جرم اللہ اور اس کے رسول کی توہین ہے:	115
۴۵	لبرل ازم ہر شخص کو بکواس کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے	
۴۶	رچرڈ رارٹی نے لکھا امریکہ نے جرائم کیے ہیں مگر ہم نے اپنے آپ کو معاف کردیا ہے	117
۴۷	امریکہ ڈرون حملوں کی وڈیو فلم کیوں جاری نہیں کررہا؟	118
۴۸	فلم اور تصویر افسانے کو حقیقت اور حقیقت کو افسانہ بنادیتی ہے	119
۴۹	تصویر اصل حقیقت کو ضائع کردیتی اور کسی خاص جزو کو نمایاں کرتی ہے	120
۵۰	تمام روایتی، الہامی تہذیبوں میں تصویر حرام رہی ہے	121
۵۱	مشال کا تشدد نظر آگیا امریکی بم کا تشدد نظر نہیں آیا کیوں؟:	124
۵۲	روایتی قدیم تشدد اور جدید تشدد کا تقابلی مطالعہ	125
۵۳	جدیدیت ریاست کا تشدد چنگیز و ہلاکو سے زیادہ خطرناک و مہلک ہے	125
۵۴	لبرل ازم نے اپنے بدترین تشدد کو بھی جمالیاتی رنگ دے دیا ہے	126
۵۵	دنیا میں سب سے بدترین تشدد اسکول جانے والے بچوں پر	126
۵۶	جس جبر و ظلم کے ساتھ جمالیات اور ترقی ہو وہ قبول ہے	127
۵۷	لبرل ازم کا تشدد مشال واقعے کے مقابلے میں ہزاروں گنا بڑا تشدد ہے	128
۵۸	مشال کا واقعہ تاریخ کی بدترین دہشت گردی ہے: غامدی	128
۵۹	لبرل ڈربن کہتا ہے جو آزادی جمہوریت کی دلیل مانگے اسے گولی ماردو:	128
۶۰	لبرل ازم کے دشمنوں کو جراثیم کی طرح ختم کردیا جائے: John Rawls	129
۶۱	مغربی تہذیب درندگی و بربریت کی تہذیب ہے: Enzo Traverso	129
۶۲	غامدی صاحب لبرل ازم کس قسم کی درندگی اور سفاکی کرتا ہے: چند ہولناک مثالیں	131

131	تین سالہ بچے کو تین لبرلز فوجیوں نے بے دردی سے قتل کیا:	۶۳
132	لبرلز نے چھ ماہ، نو ماہ، دو سال کے بچوں کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا	۶۴
132	لبرلز نے چھریوں سے بچوں کے پیٹ کاٹ دیے یہ انسانیت ہے	۶۵
133	سرخ ہندیوں کی عبرت ناک اموات: مائیکل مین کی شہادت پڑھیے:	۶۶
133	کیلی فورنیا: سرخ ہندیوں کا قبرستان: The Dark Side of Democracy	۶۷
134	سرخ ہندیوں کے خلاف امریکیوں نے نعرہ لگایا Exterminate or Banish امریکہ کے عظیم صدر جارج واشنگٹن نے کہا: سرخ ہندی بھیڑیے ہیں:	۶۸
135	امریکی صدر جیفرسن نے کہا: سرخ ہندیوں کی جڑیں کاٹ دو	۶۹
135	جیفرسن کے خوں خوار احکامات: سرخ ہندیوں کی تحلیل، بے دخلی یا قتل	۷۰
135	امریکی صدر جیکسن کے زہریلے ارشادات: سرخ ہندی بھیڑیے	۷۱
136	سرخ ہندیوں کے بارے میں امریکی صدر ابراہام لنکن کے خونی ارشادات	۷۲
136	امریکی صدر روزویلٹ کے خیال میں مردہ ہندی بہترین آدمی ہے:	۷۳
136	چار امریکی صدور پر جنگی ٹریبونل میں مقدمہ چلایا جا سکتا ہے: مائیکل مین	۷۴
137	جمہوریت قومی ریاست سب سے زیادہ نسلی قتل عام کرتی ہے	۷۵
139	۱۴۸۰ء سے ۱۹۴۰ء تک مغرب نے تین ہزار جنگیں لڑیں: ارک فرام	۷۶
140	دنیا کی تاریخ کے کل ۱۵۰ ملین مقتولین میں سے چھیانوے فی صد لوگ مغرب نے قتل کیے	۷۷
144	اصل فتنہ آزادی اظہار رائے کا عقیدہ ہے	۷۸
144	دور فتنہ میں ایمان کا اقرار نہیں اظہار بھی لازمی ہے	۷۹
145	کیا آپ پیغمبر کی توہین برداشت کر سکتے ہیں یہ ایمان سے متعلق سوال ہے	۸۱
146	جدید ریاست جیسے جیسے اسلامائز ہوتی ہے اسلام خود بخود سیکولرائز ہو جاتا ہے	۸۲
154	میڈیا ہمیشہ دوسرا سوال کیوں پوچھتا ہے؟	۸۳
159	سیکولر ازم ،الحاد اور مشعل خان کے قتل پر عمار ناصر سے ایک مکالمہ	۸۵
159	ہمیں مذہبی معاشرے کی نہیں سیکولر ازم کی ضرورت ہے: عمار ناصر غامدی	۸۶

۸۷	جنسی دہشت گردی امریکا کے ہر شہر کے اسکول میں	160
۸۸	امریکا میں عورت تنہا ہے صرف ریاست مشکل میں مدد کرتی ہے	160
۸۹	UNO کم عمری کی شادی ختم کرنا چاہتی ہے زنا نہیں	161
۹۰	جبری زنا کاری کرنے والے عورت پر بہیمانہ تشدد کرتے ہیں	162
۹۱	سیکولر امریکا میں مرد عورتوں پر بہیمانہ تشدد کرتے ہیں	163
۹۲	سیکولر امریکا میں عورت باپ بھائی سے بھی محفوظ نہیں	163
۹۳	مساوات کے فلسفے نے بیٹی ماں سہیلی طوائف کو مساوی کر دیا	164
۹۴	سیکولر آسٹریلیا میں اسی سالہ بوڑھیوں سے جبری زنا کاری	166
۹۵	سیکولر امریکا میں عورت کا کیا حشر ہے؟	166
۹۶	امریکا کی پولیس عدالتی نظام پاکستان سے بدتر ہے	167
۹۷	سیکولر امریکا میں عدل کا کیا حال ہے	168
۹۸	سیکولر بھارت چین میں ماں باپ کو اولاد نے گھروں سے نکال دیا	169
۹۹	امریکی فوج میں عورتوں مردوں سے جبری زنا	169
۱۰۰	سیکولر امریکا میں جنسی دہشت گردی کے مسئلے کا حل	170
۱۰۱	سیکولر امریکا کے اسکولوں میں لڑکیاں جنسی دہشت گردی کا شکار	171
۱۰۲	سیکولر امریکا میں جنسی دہشت گرد لڑکیوں کے دوست اور عاشق ہی ہوتے ہیں	172
۱۰۳	سیکولر امریکا میں جبری زنا جرم ہے رضامندی کا زنا جرم نہیں	172
۱۰۴	سیکولر امریکا کے مرد عورت فوجی بھی جنسی دہشت گردی کا شکار	174
۱۰۵	جنسی دہشت گردی کا علاج اصلاح نفس نہیں ٹکنالوجی ہے	175
۱۰۶	جنسی دہشت گردی لڑکے لڑکیوں کی دوستی آزادی کا نتیجہ ہے	176
۱۰۷	سیکولر امریکی ثقافت جنسی دہشت گردی کا اصل سبب ہے	177
۱۰۸	سیکولر امریکہ میں مردوں کے خلاف عورتوں کی جنسی دہشت گردی	177

178	سیکولر امریکی مرد عورت کو بس جنسی کھلونا سمجھتے ہیں	۱۰۹
179	جنسی دہشت گردی سے بہتر ہے کہ چار شادیاں کرلی جائیں	۱۱۰
179	سیکولر امریکی مرد سمجھتا ہے کہ عورت خود زنا کرنا چاہتی ہے	۱۱۱
181	امریکا میں زنا کی تعریف بھی تبدیل کردی گئی ہے	۱۱۲
182	سیکولر مغرب میں لڑکی کی بلوغت کی عمر پانچ سال کم ہوگئی	۱۱۳
183	سیکولر مغرب میں بچے پر اسکول کا ظلم	۱۱۴
184	سیکولر یوروپ میں کروڑوں عورتوں سے جنسی دہشت گردی	۱۱۵
185	سیکولر جرمنی میں جانوروں سے زنا کاری کے مراکز قائم ہیں	۱۱۶
186	سیکولر یوروپ میں دس کروڑ عورتیں جنسی درندگی کا نشانہ	۱۱۷
187	زنا سے محفوظ علاقے نہیں شادی سے محفوظ علاقے چاہئیں	۱۱۸
189	تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ: تاریخی تجزیہ	۱۱۹
193	اسلام: سب سے بڑا خطرہ:	۱۲۰
193	مستقبل کی مغربی حکمت عملی:	۱۲۱
194	ایڈورڈ سعید کی سادگی:	۱۲۲
195	تہذیبوں کا تصادم: تازہ تشریح: جمہوریت مذہب ہے:	۱۲۳
195	مغربی عقلیت: جواز کی دلیل بے کار ہے:	۱۲۴
196	مغرب کو شکست ہوچکی ہے:	۱۲۵
197	ہنٹنگٹن کا فلسفہ: اس کے نتائج:	۱۲۶
198	اقبال کی جدیدیت و خطبات کے ضمن میں ایک نادر علمی بحث خواجہ عبدالوحیدؒ: صاحب سیف و قلم کا روزنامچہ خطبات، اقبالیات اور سید سلیمان ندویؒ	۱۲۷
199	اردو میں روزنامچہ نگاری:	۱۲۸

۱۲۹	روزنامچہ کیا ہے؟ روزنامچہ نگاری کیا ہے؟	199
۱۳۰	روزنامچے، روزنامچہ نگاری: روی والے	199
۱۳۱	آپ بیتی، خطوط نگاری روزنامچے میں فرق:	199
۱۳۲	روزنامچوں کی اہمیت: ضرورت	200
۱۳۳	روزنامچہ نویسی کا جواز: والٹر اسکاٹ	202
۱۳۴	روزنامچہ خودکلامی کی اعلیٰ ترین شکل:	203
۱۳۵	مغرب میں روزنامچہ نویسی کی تاریخ:	204
۱۳۶	جرنل اور ڈائری میں فرق:	204
۱۳۷	انگریزی میں روزنامچہ نویسی کی توانا روایت: اہم روزنامچے	204
۱۳۸	انگریزی روزنامچہ نگاروں کے پیشے:	205
۱۳۹	Laughing Gas کے موجد کا روزنامچہ:	205
۱۴۰	انگریزی کے سب سے عمدہ روزنامچے:	206
۱۴۱	روزنامچے کا مقصد: ورثا کی کفالت	206
۱۴۲	انگلستان میں مذہبی روزنامچہ نگاری کی ابتداء:	206
۱۴۳	اردو کا پہلا روزنامچہ فرمان سلیمانی ۱۸۸۲ء	207
۱۴۴	اٹھارہ سو ستاون: جنگ آزادی کے روزنامچے:	208
۱۴۵	عطیہ فیضی کا روزنامچہ: زمانہ تحصیل خاندان فیضی کے اردو روزنامچے:	208
۱۴۶	اشاعت کے منتظر روزنامچے:	208
۱۴۷	خوف فساد خلق، کتابیں، روزنامچے	209
۱۴۸	روزنامچے، بیاض: کشکول، یادداشتیں	209
۱۴۹	افسانوی روزنامچوں کی صنف:	209
۱۵۰	بوسنیا: سرایوو کی محصور لڑکی کا روزنامچہ: مقبول ترین روزنامچہ	210
۱۵۱	خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کی اہمیت:	210

نمبر	عنوان	صفحہ
۱۵۲	خواجہ عبدالوحید: صاحب سیف وقلم	211
۱۵۳	خواجہ عبدالوحید کے مجاہدے:	211
۱۵۴	توہین رسالت مآبؐ کا انتقام: سلسلۃ الاخوان کا قیام	212
۱۵۵	قادیانیوں کے خلاف جہاد:	213
۱۵۶	امارت شریعہ کا قیام: نیا انقلاب	214
۱۵۷	خدام اسلام: نئی تنظیم کا قیام	215
۱۵۸	مولانا احمد علیؒ لاہوری سے بیعت: بیعت نامہ	215
۱۵۹	جمعیت شبان المسلمین کا قیام: حلف نامہ	215
۱۶۰	اچھوتوں کو مسلمان کرنا: ڈاکٹر امبیدکر سے رابطہ	218
۱۶۱	غداروں کو بے نقاب کرنے کی روایت: خواجہ صاحب کی خطابت	219
۱۶۲	شاہی مسجد لاہور: صندوقچیاں چھین لی گئیں	220
۱۶۳	خواجہ وحید کی خطابت پر علامہ کی تحسین:	221
۱۶۴	خواجہ عبدالوحید کے آباؤ اجداد: میاں محمد بوٹا:	221
۱۶۵	میاں محمد بوٹا: فارسی کا اعلیٰ ذوق	221
۱۶۶	۱۹۱۸ء: للّی لاج: اہم تہذیبی مرکز	221
۱۶۷	اس عہد کی تہذیب وثقافت:	222
۱۶۸	للّی لاج کے مکین: اقبال مرحوم سے خاص تعلقات	222
۱۶۹	خواجہ عبدالوحید: ولادت	222
۱۷۰	اقبال مرحوم کی سفارش پر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ	223
۱۷۱	خواجہ عبدالوحید: مطالعے کا جنون:	223
۱۷۲	کتابوں اور چائے خانہ کا کاروبار:	224
۱۷۳	للّی لاج سے قدیر منزل: نیا سفر	224
۱۷۴	خواجہ عبدالوحید: معاشی حالات	225
۱۷۵	اقبال کے مرد مومن کا عملی نمونہ: خواجہ عبدالوحیدؒ	228

229	خواجہ عبدالوحیدؒ علمی و ادبی زندگی	۱۷۶
229	پندرہ روزہ "اسلام" کا اجراء، علامہ اقبالؒ کی سرپرستی	۱۷۷
229	اسلام پر پابندی: خواجہ عبدالوحیدؒ کا مضمون	۱۷۸
230	اخبار اسلام پر اعتراضات:	۱۷۹
230	اسلام کی تحسین: سلیمان ندویؒ ماجدؒ	۱۸۰
231	خواجہ عبدالوحید کی صحافت: لندن اسکول آف جرنلزم کی شہادت	۱۸۱
231	اسلام میں فیڈرنٹ نہرو کے تبصرے کا جواب اقبال کے قلم سے:	۱۸۲
232	اسلام کے اداریے:	۱۸۳
232	خواجہ عبدالوحید: انگریزی تصانیف	۱۸۴
232	خواجہ عبدالوحید: اردو تصانیف	۱۸۵
233	خواجہ عبدالوحید: مجالس کی رنگینیت	۱۸۶
234	اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ:	۱۸۷
234	خواجہ عبدالوحید: سسرال	۱۸۸
235	خواجہ عبدالوحید: علامہ اقبال مرحوم سے گہرے تعلقات	۱۸۹
235	اس عہد کی روایات: خواجہ صاحب کا تقویٰ	۱۹۰
236	روزنامچے کی خصوصیات:	۱۹۱
236	اس عہد کی معاشرت، سیاست اور ماحولیات کی جھلکیاں ، شملہ: بچوں سے محبت کی روایت:	۱۹۲
237	اس زمانے کی معاشرت: قراقرم میں سامان سفر	۱۹۳
237	خالدہ خانم: تقریر کے لیے پیسے دیے ہوں گے	۱۹۴
237	لاہور کی معاشرت: کوئی رئیس مہمان نواز نہ تھا	۱۹۵
237	قادیانیت: امیر مراکش اور محمد علی لاہوری کا مباحثہ	۱۹۶
237	شریف مراکش سے قادیانیوں کا مناظرہ:	۱۹۷
238	کوئٹہ کا زلزلہ ۱۹۳۵ء:	۱۹۸
239	شہید گنج تمام قیادت نا قابل اعتبار	۱۹۹

239	مسجد شہید گنج: اکابرین کی غداری	۲۰۰
239	نامحرم عورت سے ملاقات: دل و دماغ کی کشمکش	۲۰۱
240	اچھوتوں کو مسلمان کرنا: غلبہ اور تسلط کی خواہش	۲۰۲
240	مولوی دیدار علی: علامہ کے خلاف فتوی	۲۰۳
240	انگریزی پنجابی کی کشمکش: ڈاکٹر تاثیر	۲۰۴
240	اہل علم کی: ظاہری وضع قطع: ڈاکٹر حمید اللہ	۲۰۵
241	احمد علیؒ لاہوری: طریق تربیت	۲۰۶
241	مولانا مہر سے بدتمیزی: تاثیر کی تنقید	۲۰۷
241	صوفی تبسم: اس عہد کی وضع داری کا نمونہ	۲۰۸
241	تقریر کی ذمہ داری: احساس ذمہ داری	۲۰۹
241	بزم احباب کا حال احوال:	۲۱۰
242	والدہ کی رحلت: باوقار تجہیز و تکفین	۲۱۱
242	اس عہد کے موضوعات علمی	۲۱۲
242	جماعتوں کا تجزیہ: ناکامی کے اسباب	۲۱۳
243	تنہائی کی زندگی: بزم احباب	۲۱۴
243	احباب کے کرم: خواجہ صاحب پر	۲۱۵
243	انسٹی ٹیوٹ:	۲۱۶
243	احباب کے اختلافات: معاشرتی رویہ:	۲۱۷
243	احباب سے تعلقات کی نوعیت:	۲۱۸
245	۱۹۳۵ء میں ثقافت بدل رہی تھی:	۲۱۹
245	محافل موسیقی:	۲۲۰
245	فلم گھر اور فلمیں:	۲۲۱
246	لاہور اور دیگر شہروں کے مشہور ہوٹل:	۲۲۲
246	فلمیں:	۲۲۳
246	لاہور کا موسم: بیضہ مرغ کے برابر اولے	۲۲۴

246	کاغان: اس عہد کا موسم	۲۲۵
247	جدیدیت پسندوں کے دعوے:	۲۲۶
247	سائنس داں عالم نبی سب برابر ہیں:	۲۲۷
248	جدید انسان کے لیے جدید زبان ضروری ہے:	۲۲۸
252	ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہلاک کر دیا جائے: اقبال	۲۲۹
253	جاپان میں اسلام ہفتوں میں پھیل سکتا ہے: اقبال	۲۳۰
253	مرد دماغ سے تخلیقی کام لیتا ہے عورت رحم سے:	۲۳۱
254	اقبال مرحوم کا عشق ایمانی: طوائفیں:	۲۳۲
255	بد اخلاقی کو طاقت سے مٹا دیا جائے: اقبال	۲۳۳
255	جذبات حسنہ کو مردہ کرنے والا آرٹ ممنوع ہے: اقبال	۲۳۴
256	عہد حاضر کی حکومت اخلاق کی حفاظت کو فرض نہیں سمجھتی: اقبال	۲۳۵
256	ہندوؤں کی تباہی میں موسیقی کا حصہ ہے: اقبال	۲۳۶
256	اسلام کی فلاح برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے: اقبال	۲۳۷
256	فقر سے انسان بے پناہ فائدہ اٹھا سکتا ہے: اقبال	۲۳۸
257	تعلیم سے نہ دنیا ملی نہ دین: اقبال	۲۳۹
257	ابلیس خارجی چیز ہے شیطان داخلی: اقبال	۲۴۰
257	بزرگان سلف اور ہم نبوت محمدی کی حقیقت نہ سمجھ سکے	۲۴۱
257	سترہ روز بعد قادیان تباہ ہو جائے گا:	۲۴۲
259	خطبات اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں:	۲۴۳
260	علامہ سید سلیمان ندویؒ اور خطبات اقبال علامہ ندوی کے افادات اور نقد	۲۴۴
271	مثنوی اسرار خودی کا دیباچہ جو حذف کر دیا گیا:	۲۴۵
283	تقلید، حدود، نفسیات اور اسلام:	۲۴۶

۲۴۷	کیا اسلام جمہوری مذہب ہے؟	286
۲۴۸	اقبال مرحوم کا انائے مطلق کیا ہے؟ اقبال مرحوم کا تصور امکان مذہب؟	290
۲۴۹	ذات خداوندی ترقی: تخلیقیت	297
۲۵۰	حقیقت ماورائے ذات نہیں ہے:	297
۲۵۱	انسان کی دسترس سے لوح محفوظ بھی محفوظ نہیں:	297
۲۵۲	مغرب اور نطشے کی ہم آہنگی:	298
۲۵۳	اقبال مرحوم اور کانٹ: دوامی امور ہنگامی امور	298
۲۵۴	مسلم ماڈرن ازم: مسلم لبرل ازم	299
۲۵۵	سرسید چراغ علی: قرآن کلام اللہ نہیں	299
۲۵۶	خطبات اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ	300
۲۵۷	جو کام علماء نہ کر سکے وہ کام اقبال مرحوم نے انجام دیا:	301
۲۵۸	اقبال پر حلیمت، افغانی، چراغ علی، سعید پاشا، گوکلپ، قادر مغربی، غنی دلیس، پادری رجب علی، پادری میکال کے اثرات:	301
۲۵۹	اقبال پر نطشے، اشوینڈر، میکزی، برگساں، ولیم جیمز، وارڈ، سورلے میکٹیگرٹ کے اثرات:	304
۲۶۰	خطبہ اجتہاد اور ماجد صاحب	306
۲۶۱	مدینہ کی جگہ اندلس نے لے لی:	309
۲۶۲	اقبال مرحوم اور عربی زبان:	310
۲۶۳	عہد حاضر میں اجتہاد کی شرائط:	311
۲۶۴	اقبال پر مصری مفکر عبدالرازق کے اثرات:	319
۲۶۵	اقبال مرحوم پر افغانی کا اثر:	319
۲۶۶	مذہب سائنس کا محتاج ہے:	320
۲۶۷	حوالہ جات	321
۲۶۸		

327	دہشت گردی: تاریخ و تحقیق کی روشنی میں	۲۶۹
327	زبانیں اور استعماری طاقتیں:	۲۷۰
328	براعظم آسٹریلیا: زبانوں کا قتل عام:	۲۷۱
328	جزیرہ تسمانیہ کے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا:	۲۷۲
329	آسٹریلیا کی ۲۳۵ زبانیں موت کی دہلیز پر:	۲۷۳
329	شمالی صوبہ کوئنز لینڈ:	۲۷۴
329	قدیم باشندوں کے حقوق ۲۰۰۲ء میں معطل:	۲۷۵
329	زبانوں کو مٹانے کے بعد تحفظ کی تحریک:	۲۷۶
330	مٹنے والی زبانوں کی فہرست:	۲۷۷
333	آسٹریلیا کی مردہ زبانیں:	۲۷۸
333	کیتھولک استعماریت: رنجو زبان کا خاتمہ:	۲۷۹
334	ہندی استعماریت اور پالی و مقامی زبانیں:	۲۸۰
334	نو کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل عام:	۲۸۱
335	کانٹ، مارکس، لاک، ہیوم سرخ ہندیوں کے دشمن:	۲۸۲
336	انگریز آباد کاروں کے ہاتھ قتل عام:	۲۸۳
336	قصاب اسکاٹ لینڈ: لارڈ ممبر لینڈ:	۲۸۴
336	کیلی فورنیا یا زبانوں کا قبرستان	۲۸۵
337	سرخ ہندیوں کے قتل و غارت گری کی تحقیقی داستانیں:	۲۸۶
339	براعظم امریکا کی آبادی افریقہ اور یورپ سے زیادہ تھی:	۲۸۷
340	اسی لاکھ سرخ ہندی اکیس سال میں ہلاک کیے گئے:	۲۸۸
340	تقابل: ہٹلر کے مقتولین اور براعظم امریکہ کے مقتولین:	۲۸۹
342	سرخ ہندیوں کے لیے گالی نما القابات:	۲۹۰
343	خدا، سائنس، سرخ ہندی اور کلیسا:	۲۹۱
343	سرخ ہندی اجنبی ہی رہے:	۲۹۲
343	سرخ ہندی یا بھیڑیے:	۲۹۳

۲۹۴	سرخ ہندیوں کی جلاوطنی کا عمل:	344
۲۹۵	قبولیت، عیسائیت اور سرخ ہندی:	345
۲۹۶	عیسائیت کے مظالم سرخ ہندیوں پر:	346
۲۹۷	سرخ ہندیوں کی عبرت ناک اموات:	347
۲۹۸	کیلی فورنیا: سرخ ہندیوں کا قبرستان	348
۲۹۹	جمہوریت اور بہیمیت کا فطری تعلق:	349
۳۰۱	سرخ ہندیوں کو مارنے کی آزادی:	349
۳۰۲	سرخ ہندیوں کے خلاف، ان کے خاتمے تک جنگ کا اعلان:	350
۳۰۳	ہٹلر اور کیلی فورنیا کے گورنروں کا تقابل:	350
۳۰۴	سرخ ہندیوں کے خلاف نفرت کی تاریخ:	351
۳۰۵	سرخ ہندی: "شہر بدر کردو یا ختم کردو"!	351
۳۰۶	اخبارات کی جانب سے قتل عام کی حمایت:	352
۳۰۷	چار سفید فاموں کے قتل کا بدلہ ۱۴۴ لوگوں سے!	352
۳۰۸	عدالتوں میں بے انصافی کی کہانی:	352
۳۰۹	عدالتیں: سرخ ہندی کی شہادت قبول نہیں	352
۳۱۰	سرخ ہندیوں کے خلاف جیفرسن اور واشنگٹن کے احکامات:	353
۳۱۱	جارج واشنگٹن: سرخ ہندی بھیڑیے ہیں:	353
۳۱۲	جیفرسن: سرخ ہندیوں کی جڑیں کاٹ دو	354
۳۱۳	جیفرسن کے خوں خوار احکامات: تحلیل، بے دخلی یا قتل	354
۳۱۴	سرخ ہندیوں کے خلاف جیکسن کا اعلان جنگ:	355
۳۱۵	جیکسن کے زہریلے ارشادات: سرخ ہندی بھیڑیے	355
۳۱۶	سرخ ہندیوں کے خلاف لنکن کی مہم جوئی:	356
۳۱۷	روزویلٹ کے خیال میں مردہ ہندی بہترین آدمی ہے:	357
۳۱۸	امریکی صدور کے اعلانات کا جمہوری پس منظر:	358
۳۱۹	نو کروڑ قتل: پچاس برس!	359

۳۲۰	گھوڑے چوری کرنے پر تمام سرخ ہندی واجب القتل ہو گئے:	360
۳۲۱	سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری یلغار:	360
۳۲۲	سرخ ہندیوں کے خلاف بہیمانہ جذبات: قتل کر دو یا نکال دو	360
۳۳۲	سرخ ہندیوں کا وحشیانہ قتل عام:	361
۳۲۴	وحشیانہ قتل عام پر ایک جنرل کا شدید احتجاج:	361
۳۲۵	مظالم پر تنقید کرنے والوں کو مسترد کر دیا گیا:	362
۳۲۶	سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری کارروائیاں:	362
۳۲۷	ہر سرخ ہندی کو قتل کر دو:	363
۳۲۸	قاتل اخبارات میں ہیرو کے طور پر پیش کیے جاتے:	363
۳۲۹	براعظم امریکہ: سرخ ہندیوں کی زبانوں کا قتل عام	364
۳۳۰	سرخ ہندیوں کی زبانوں کا خاتمہ:	364
۳۳۱	سرخ ہندی قصہ گو اور ان کی کہانیاں:	365
۳۳۲	سرخ ہندی: ریچھوں کو نہیں مارتے تھے:	365
۳۳۳	کیلی فورنیا زبانوں کا قبرستان:	365
۳۳۴	سرخ ہندیوں کی دو سو تیس زبانیں: مختصر جائزہ:	366
۳۳۵	صرف ایک ہزار سرخ ہندی قبائل باقی ہیں:	366
۳۳۶	سرخ ہندی: پچیس ہزار قبل مسیح سے امریکہ میں آباد تھے:	366
۳۳۷	براعظم امریکہ کے بڑے لسانی گروہ:	367
۳۳۸	قتل عام کے بعد تحفظاتی علاقوں کا قیام:	367
۳۳۹	سرخ ہندیوں کا اصل مرکز: اوکلاہوما:	367
۳۴۰	آنسوؤں کا سفر: کبھی ختم نہ ہو سکا:	368
۳۴۱	سرخ ہندی: آہنی شخصیت کے مالک:	368
۳۴۲	امریکہ کی واحد بڑی سرخ ہندی زبان: اپاچی:	368
۳۴۳	اپاچی طرز بیاں ختم ہو گیا:	369
۳۴۴	سرخ ہندی باشندے: نفرت و حقارت کا نشانہ:	369

369	چے روکی زبان: ۸۶ حروف تہجی:	۳۴۵
370	موہاک زبان نسل کا جبری انخلاء:	۳۴۶
370	چوکتا سے ان کا آبائی علاقہ چھین لیا گیا:	۳۴۷
370	کریک اور گوروں کی کشمکش:	۳۴۸
370	ڈی لاویر نسل کا انخلاء:	۳۴۹
371	ہوائی زبان کا تیزی سے خاتمہ:	۳۵۰
371	تلنگٹ زبان کا حال:	۳۵۱
371	انا پاسکان اور الگون کیان: خاموشی کے سمندر میں:	۳۵۲
371	سرخ ہندیوں کی بہت جلد مٹنے والی زبانیں:	۳۵۳
385	جدید امریکہ: توسیع پسندانہ عزائم کی جھلک	۳۵۴
395	امریکہ: دنیا بھر میں خفیہ جیلیں:	۳۵۵
396	بیسویں صدی جمہوری اور لبرل معاشروں کے کمالات	۳۵۶
396	اکیس سال میں ۸۰ لاکھ سرخ ہندی مارے گئے:	۳۵۷
397	خانہ جنگیوں کی شدت ۱۸۱۶ء۔۱۹۹۸ء	۳۵۸
398	بیسویں صدی: انیسویں صدی کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ اموات:	۳۵۹
398	بیسویں صدی: ۱۸ اویں صدی سے سات گنا زیادہ ہلاکتیں:	۳۶۰
398	افلاطون: جنگ سیاسی زندگی کی بنیادی حقیقت:	۳۶۱
399	ارسطو: ہتھیار صاحب جائیداد رکھے گا	۳۶۲
399	میکیاولی: حکمرانوں کو ہلاکت خیز قوت کی اجازت	۳۶۳
399	ہابس: حکمران کو اختیار رہے کہ عوام کو قتل کر سکے	۳۶۴
400	لاک: حکمرانوں اور عوام کو ہلاکت کا اختیار دیتا ہے	۳۶۵
400	مارکس اینگلز: عبوری دور میں غارت گری کی اجازت ہے	۳۶۶
400	روسو: زندگی ریاست کی جانب سے مشروط تحفہ ہے	۳۵۷
401	میکس ویبر: سیاست کا فیصلہ کن عنصر تشدد ہے	۳۵۸
401	امریکی دانش کا اجماع: ہلاکت گری سماج محال ہے	۳۵۹

401	امریکی صدارتی دعا: قتل عام کے جذبات ابھارتی ہے	۳۶۰
402	امریکہ: ایک ہلاکت آفرین ریاست	۳۶۱
402	امریکی توسیع پسندی گلین ڈی پیج کی تحقیق	۳۶۲
402	گلین پیج: امریکہ کی جنگیں دوسری قوموں کے خلاف	۳۶۳
403	گلین پیج: امریکی ہلاکت خیزی کی صلاحیت	۳۶۴
403	گلین ڈی پیج کی تحقیقات کا خلاصہ	۴۶۵
403	دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت کا دعویٰ	۴۶۶
404	اکیسویں صدی: امریکی صدی	۴۶۷
404	امریکہ میں اندرونی ہلاکتوں کی تعداد کا موزانہ	۴۶۸
405	امریکی شہریوں کے قتل کے طریقے	۴۶۹
405	امریکہ: خوف زدہ انسانوں کی سرزمین	۴۷۰
406	امریکی عوام: دہشت گردی کا عجیب مزاج	۴۷۱
406	امریکی شہری: بیس کروڑ بندوقیں سات کروڑ رائفلیں اسی لاکھ دو ہزار گنیں	۴۷۲
406	امریکی بچے: ڈیڑھ لاکھ پستولیں اسکول لے جاتے ہیں:	۴۷۳
407	امریکہ: سزائے موت کے نفاذ کا مطالبہ	۴۷۴
407	تشدد کی تربیت: ویڈیو اور کمپیوٹر گیمز تشدد کے اصل مراکز	۴۷۵
408	امریکی کارٹون فلم ٹی وی پروگرام: ہلاکت آفرینی کے ادارے	۴۷۶
408	پیشہ ور محب وطن قاتلوں کی ضرورت ہے: فوجی بھرتی کے اشتہارات کا حاصل کیا ہے؟	۴۷۷
408	امریکہ: روزمرہ کی گفتگو میں تشدد کے عناصر	۴۷۸
409	امریکی: ہلاکت آفرینی کی زبان کیوں بولتے ہیں؟	۴۷۹
409	دہشت گردی کو چھپانے کے لیے خوبصورت لفظ، ہیروشیما پر گرانے والا پہلے بم کا نام "ننھا بچہ" تھا	۴۸۰
410	امریکہ: ہلاکت آفرینی کے عناصر اور وجوہات:	۴۸۱
410	امریکی سیاسی علماء: ہلاکت گریز سماج کے امکان کو مسترد کرتے ہیں	۴۸۲
411	کولمبیا: امریکی دانشوروں کے برعکس رویہ	۴۸۳
411	انسانی کنبہ: محبت کا حصار نفرت کے خلاف دیوار	۴۸۴

۴۸۵	کیا عالمی طاقتیں اور کمزور ملکوں میں مفاہمت ممکن نہیں؟	412
۴۸۶	انسانی حیوانی طور پر جنگجو نہیں اس کی فطرت بہترین ہے:	413
۴۸۷	انسان حیاتیاتی طور پر پر تشدد مزاج نہیں رکھتا:	413
۴۸۸	اطالوی استعمار اور زبانیں:	414
۴۸۹	فرانسیسی استعمار اور زبانیں:	414
۴۹۰	ولندیزی استعمار اور زبانیں:	414
۴۹۱	روسی استعمار اور زبانیں:	415
۴۹۲	ایران و ہند: مذہبی استعماریت اور زبانوں کا قتل عام:	415
۴۹۳	یونانی استعماریت کے ہاتھوں زندگی بربادی:	417
۴۹۴	بھارت: گیارہ معدوم زبانیں:	418
۴۹۵	سترہویں صدی سے پہلے کے قتل عام:	419
۴۹۶	بارہویں صدی صلیبی جنگ: عیسائیوں کے مظالم: ستر ہزار قتل	419
۴۹۷	افریقی غلام: ساڑھے چھ کروڑ قتل	420
۴۹۸	منگولوں کی یلغار اور اس کی تاریخ:	420
۴۹۹	چنگیز خان: بخارا سمرقند: ساٹھ ہزار شہید	420
۵۰۰	مرو: ۱۳ لاکھ شہید	420
۵۰۱	قزوین، نیشاپور: ایک لاکھ بیس ہزار شہید	420
۵۰۲	خراسان: تیرہ لاکھ شہید	420
۵۰۳	رے: تین ہزار مساجد اور کل آبادی شہید	420
۵۰۴	بغداد: ۸ لاکھ شہادتیں	421
۵۰۵	تیمور: تین ہزار جیلیں، سروں کے مینار	421
۵۰۶	منگولوں کے ہاتھوں تین کروڑ انسانوں کا قتل	421
۵۰۷	قبلائی خان: ایک کروڑ پچاسی لاکھ چینیوں کا قتل	421
۵۰۸	شہنشاہ یونگ [چین]: ۴۶۰ دانشور زندہ دفن کر دیے	421
۵۰۹	ہان شہنشاہیت: ایک کروڑ قتل	422

نمبر	عنوان	صفحہ
۵۱۰	چین: تین سو سال میں چار کروڑ تیس لاکھ قتل	422
۵۱۱	ٹانگ شہنشائیت: ساڑھے تین کروڑ لوگوں کا قتل	422
۵۱۲	سانگ شہنشائیت: ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کا قتل	422
۵۱۳	تاپینگ ٹرائنڈ غدر: چار کروڑ تیس لاکھ قتل	422
۶۱۴	عثمانی سلاطین: چالیس ہزار لوگوں کا قتل	423
۵۱۵	ڈیوک آف بوربن: لاکھوں لوگوں کا قتل عام	424
۵۱۶	ڈیوک آف البا: اٹھارہ ہزار قتل	424
۵۱۷	بوہیمیا: ایک کروڑ دس لاکھ قتل	424
۵۱۸	صلیبی جنگیں: لاکھوں لوگوں کا قتل عام	425
۵۱۹	فرانس: گیارہ لاکھ لوگوں کا قتل	425
۵۲۰	دو کروڑ پچیس لاکھ یورپیوں کا قتل	425
۵۲۱	جزیرہ بورنیو میں قتل عام:	425
۵۲۲	ولندیزی استعمار: ہزاروں چینیوں کا قتل	425
۵۲۳	امریکی استعمار: آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل	426
۵۲۴	برطانوی استعمار: آسٹریلیا کے باشندوں کا قتل عام	428
۵۲۵	سلطان فیروز شاہ کے ہاتھوں قتل عام	428
۵۲۶	کنگ چارلس نہم: ایک لاکھ کالونسٹوں کا قائل	428
۵۲۷	عثمانی سلاطین: قتل عام کی وارداتیں	428
۵۲۸	بیسویں صدی: دنیا کی تاریخ کی سب سے خونی صدی	429
۵۲۹	بیسویں صدی: پندرہ کروڑ دس لاکھ لوگوں کی قائل، میدان جنگ میں مرنے والے: تین کروڑ پچاسی لاکھ	429
۵۳۰	بیسویں صدی: ڈیموسائیڈ میں ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کا قتل	430
۵۳۱	روس میں بیگاری نظام: چار کروڑ کا قائل:	430
۵۳۲	بیسویں صدی کے اٹھاسی سال: سترہ کروڑ لوگوں کی تعذیب /۲۶ کروڑ لوگوں کی قائل	430

٥٣٣	جنگوں اور خانہ جنگوں میں: بیس کروڑ بیس لاکھ قتل	431
٥٣٤	ہٹلر: ۲ کروڑ دس لاکھ یہودیوں کا قاتل ، روسی شہری چھ کروڑ بیس لاکھ قتل	431
٥٣٥	نازی، جاپانی اور چینیوں کے ہاتھوں قتل عام:	431
٥٣٦	بیسویں صدی: حکومتیں سترہ کروڑ لوگوں کی قاتل	431
٥٣٧	بدترین قاتل: روسی حکومت	432
٥٣٨	چیانگ کائی شیک: ایک کروڑ لوگوں کا قاتل	432
٥٣٩	بیسویں صدی: دیگر قتل عام	433
٥٤٠	جدید جمہوریتوں کے ہاتھوں پندرہ کروڑ لوگوں کا قتل: مائیکل مین	434
٥٤١	صرف امریکی استعمار نے ۹ کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کیا	434
٥٤٢	دائرۃ المعارف Wikipedia: نسل کشی کے قدیم و جدید اعداد و شمار	435
٥٤٣	Biblical Genocide:	435
٥٤٤	ایران میں سکندر اعظم کی نسل کشی:	435
٥٤٥	رومۃ الکبریٰ	436
٥٤٦	فرانس:	436
٥٤٧	امریکہ:	436
٥٤٨	کینیڈا:	436
٥٤٩	گوئٹے مالا:	436
٥٥٠	کانگو:	436
٥٥١	آسٹریلیا:	437
٥٥٢	جرمن شمال مغربی افریقہ:	437
٥٥٣	ترکی:	437
٥٥٤	جرمن نازی نسل کشی:	437
٥٥٥	دوسری جنگ عظیم میں جاپانی نسل کشی:	437
٥٥٦	کمبوڈیا:	437

۵۵۷	سوڈان:	438
۵۵۸	ویتنام:	438
۵۵۹	برطانوی جنرل ڈائر:	438
۵۶۰	انڈین نیشنل کانگریس کی سکھوں کے خلاف نسل کشی:	438
۵۶۱	جموں اور کشمیر:	438
۵۶۲	عراق:	438
۵۶۳	دائرۃ المعارف انکارنا: مہذب دنیا میں نسل کشی کے اعداد وشمار	439
۴۶۴	آرمینیائی قتل:	440
۵۶۵	روانڈا:	440
۵۶۶	:Holocaust	440
۵۶۷	شمال مغربی افریقہ Herero قتل عام (نمیبیا):	440
۵۶۸	**BIBLIOGRAPHY**	441

جہاد ریاست کا حق ہے یا فرد کا: ایک اہم بحث

جنرل باجوہ صاحب کہتے ہیں کہ جہاد صرف ریاست کا حق ہے [جنگ ۷ ستمبر ۲۰۱۷ء]

مگر غامدی صاحب فرماتے ہیں یہ فرد کا حق ہے [غامدی البیان جلد سوم طبع اوّل ۲۰۱۶ ص ۳۴۳]

باجوہ صاحب صحیح ہیں یا غامدی صاحب اس کا فیصلہ صرف علماء کر سکتے ہیں دونوں علماء کو اتھارٹی مان لیں

انصار الشریعہ، المہاجرون، حزب التحریر، التکفیر و الھجرہ، القاعدہ، داعش، بوکو حرام، TTP، جنداللہ، SSP، لال مسجد سب

غامدی صاحب اور اسلامک ماڈرن ازم کے آزاد فلسفۂ اجتہاد بلکہ فلسفۂ فساد و الحاد کا منطقی فطری نتیجہ ہیں

فرشتے بھی اجتہاد کرتے ہیں فرشتے خضر نے اجتہاد کیا تھا: غامدی البیان جلد سوم ص ۱۵۴

سید خالد جامعی

جنرل باجوہ صاحب نے چھ ستمبر کو اپنی تقریر میں اعلان کیا ہے کہ جہاد صرف اور صرف ریاست کا حق ہے کسی فرد کو اپنی مرضی سے جہاد کا حق نہیں مگر ہمارے متجدد جناب غامدی صاحب نے اپنی تفسیر البیـــان جلد سوم میں ہر فرد کو جہاد کا حق [Right] تفویض کرتے ہوئے جو فلسفہ بیان کیا ہے اس فلسفے سے اخذ شدہ گیارہ اصولوں کا مطالعہ کیجیے ان گیارہ اصولوں کی تقریر آپ ان کی تفسیر کے صفحہ ۳۴۳ پر خود ملاحظہ کر سکتے ہیں:

<u>جہاد فرد کا حق ہے: غامدی صاحب کے گیارہ اصول</u>

(۱) حرم کی حفاظت کے لئے جہاد صرف اہل مکہ یا وہاں کی حکومت کا کام نہیں ہر مسلمان کی انفرادی ذمہ داری ہے: غامدی، البیان (جلد سوم) المورد ص ۳۴۳ (۲) ہر مسلمان کو حق ہے کہ وہ حرم کی حفاظت کے لئے خود جہاد کرے [غامدی البیان ص ۳۴۳] (۳) جو مسلم حکومت مسلمان کو حرم کی حفاظت کے جہاد سے روکے وہ نام نہاد مسلمانوں کی حکومت ہے غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳ (۴) ایسی نام نہاد مسلمان حکومت کے خلاف ہر مسلمان پر جہاد فرض ہے غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳ (۵) حرم کی حفاظت کے معاملے میں کسی قومی یا بین الاقوامی معاہدے کا بھی لحاظ جائز نہیں ہوگا جہاد ہر مسلمان پر فوراً فرض ہو جائے گا غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳ (۶) مکہ پر حملہ ہو تو کسی بھی قومی بین الاقوامی

معاہدے اور اپنی اسلامی حکومت کی پابندی کی پرواہ کیے بغیر ہر مسلم مکہ پہنچ کر جہاد شروع کردے: غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳ (۷) جہاد حرم کی راہ میں حائل نام نہاد مسلمان حکومت کے خلاف نظم اجتماعی کے بغیر جہاد کیا جاسکتا ہے غامدی البیان جلد سوم ص ۳۴۳ (۸) دنیا کا ہر مسلمان حرم کی حفاظت کے لیے ریاست کی اجازت کے بغیر جہاد کرنے کا پابند ہے غامدی البیان جلد سوم، طبع اول ۲۰۱۶ء ص ۳۴۳ (۹) ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنی انفرادی سطح پر بھی حرم کی حفاظت کے لئے قوت صرف کرے غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳ (۱۰) حرم کی حفاظت کے جہاد کے لیے نظم اجتماعی کی کوئی شرط نہیں ہے غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳ (۱۱) اگر کوئی نام نہاد مسلمان حکومت حرم کے لیے جہاد سے روکے تو اس مسلمان حکومت کے خلاف بھی اہل ایمان پر جہاد فرض ہوگا غامدی البیان جلد سوم المورد لاہور ص ۳۴۳

غامدی صاحب فرماتے ہیں:

شریعت آتشی (آگ والی) ہوتی ہے آتشی شریعت کا مطلب ہے اشدا علی الکفار یعنی جو اس پتھر (شریعت پر) پر گرے گا وہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا لیکن جس پر وہ گرے گا (مراد شریعت ہے) اسے پیس ڈالے گا: غامدی البیان جلد چہارم المورد لاہور طبع اول ۲۰۱۶ء ص ۵۷۵

غامدی صاحب کے فلسفہ مذہب کے تحت حرم مکہ کی حفاظت کے لیے جہاد سے کسی مسلمان کو روکنا اتنا بڑا جرم ہے کہ روکنے والے مسلم حاکم کا خون بہانا بھی حلال ہو جاتا ہے اس حاکم، اس کی فوج اس کی ریاست سے لڑنا بھی فرض ہو جاتا ہے۔ دوسرے معنوں میں وہ حاکم نہ مسلمان رہتا ہے نہ اس کی مملکت اسلامی رہتی ہے اسی لیے تو غامدی صاحب ایسے مسلم حکمران اور ایسی مسلمان حکومت اور اس کی فوج کے خلاف عوام کو جہاد کی اجازت عام دے رہے ہیں۔

<u>دہشت گردی کا سبب غامدی صاحب کا فلسفہ اجتہاد یا علماء کا اجتہاد</u>

غامدی صاحب جاہل کو بھی اجتہاد کی آزادی دیتے ہیں

اگر جہاد فرد کا حق ہے تو دہشت گردی غامدی صاحب کا فلسفہ پھیلا رہا ہے یا مدرسے پھیلا رہے ہیں پاکستانی طالبان بوکوحرام، داعش، القاعدہ، وغیرہ وغیرہ اسلامک ماڈرن ازم کے آزادانہ اجتہاد کے فلسفے کا نتیجہ ہیں اور عصر حاضر میں اس فلسفے کے امام غامدی صاحب ہیں جو ہر مسلمان کو بے تکان اجتہاد کی آزادی دے کر اسلام کو تباہ کر رہے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے یہاں صرف اور صرف علماء کو اجتہاد کا حق ہے اور بعض علماء کے یہاں اجتہاد کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو چکا ہے لہٰذا اجتہاد کا مسئلہ اسلامک ماڈرن ازم کا پیدا کردہ مسئلہ ہے اور عسکریت پسندی اس جدید اجتہاد کا نتیجہ ہے۔

غامدی صاحب سرسید کی تقلید و اتباع میں ہر فرد کو اجتہاد کی آزادی دیتے ہیں وہ لکھتے ہیں اجتہاد کے لیے کوئی شرائط نہیں صحابی، تابعی، عامی، عارف، عالم، جاہل، کافر سب کو اجتہاد کی آزادی ہے [غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ۱۵۴، ۱۵۵]

فرشتے بھی اجتہاد کرتے ہیں: غامدی

غامدی صاحب نے کافر عامی جاہل کو اجتہاد کا حق دینے کے بعد یہ حق فرشتوں کو بھی تفویض کر دیا ہے لکھتے ہیں:

خضر ملائکہ میں سے کوئی ہستی تھے جو انسانی صورت میں موسیٰ کو ملے غامدی البیان جلد سوم ص ۱۵۰ سورہ کہف کی آیت ۸۰ میں خشیـنـا کا لفظ اللہ تعالی کے تعلق سے نہیں بلکہ فرشتے خضر کے اپنے اجتہاد کی تعبیر کے لیے استعمال ہوا ہے کیوں کہ وہ (خضر) یہاں اس پوری جماعت (کے اجتہاد) کی نمائندگی کر رہے ہیں جو کارکنان قضاوقدر کی حیثیت سے انہی کاموں کے لیے مامور ہے [غامدی میزان جلد سوم ص ۱۵۴]

غامدی صاحب فرماتے ہیں عامی جاہل کافر کے غلط اجتہاد سے کوئی فرق نہیں پڑتا لوگوں کو اجتہاد کرنا چاہیے ان میں سے ایک غلطی کرے گا تو دوسرے کی تنقید اسے درست کر دے گی: غامدی مقامات ۲۰۱۴ ص ۱۵۴

غامدی صاحب عالم اسلام کے عربی زبان سے ناواقف پہلے مجتہد

غامدی صاحب کی عربی تفسیر الاشراق کہاں غائب ہوگئی؟

غامدی صاحب نے ہر جاہل کو اجتہاد کی آزادی اس لیے دی ہے کہ وہ عربی زبان پر عبور نہیں رکھتے انہوں نے زندگی میں صرف دو عربی مضمون لکھے ایک مضمون شرح شواهد الفراهي جوان کی کتاب مقامات ۲۰۰۴ء میں تھا ۲۵ صفحات کے اس مضمون میں چھ سو سے زیادہ غلطیاں تھیں اہل علم نے غلطیاں واضح کیں تو کتاب غائب کرادی گئی نئی اشاعت سے وہ مضمون نکال دیا گیا اشراق میں آیت بسم الله کی عربی تفسیر پڑھ لیجیے وہ اغلاط کا دفتر ہے انہوں نے ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۹ء تک اپنے رسالے اشراق میں اپنی عربی تفسیر الاشراق کا اشتہار چھاپا لیکن جب غامدی صاحب کی عربی کی اغلاط نمایاں کردی گئیں تو اب وہ تفسیر اشتہارات سے غائب ہوگئی مقامات میں اپنی غیر مطبوعہ تصانیف کی فہرست سے انہوں نے الاشراق کو نکال دیا۔

جس شخص کی عربی اس قدر کم زور ہو وہی ایسے ہی غلط سلط اجتہادات کرسکتا ہے اور پوری امت کو اجتہاد کی آزادی دے کر فساد ہی پیدا کرسکتا ہے۔

غامدی صاحب سے درخواست ہے کہ تمام پر تشدد عسکری تنظیموں نے اپنے اجتہادات سے جو غلطی کی ہے غامدی صاحب اسے اپنے اجتہاد ات سے درست کر دیں۔ ان کو یہ تک معلوم نہیں کہ اجتہاد کا نتیجہ کیا نکلتا ہے وہ اجتہاد کو بس ایک علمی کام سمجھتے ہیں کہ ہر مسلم کافر اجتہاد کا مشغلہ، پیشہ، راستہ اختیار کرلے۔ اب اجتہاد کے خطرناک نتائج سامنے آنے لگے تو غامدی صاحب اپنے اصول کی روشنی میں اجتہاد کو اجتہاد سے درست کرنے کے بجائے پاکستان کی ریاست سے مطالبہ کررہے ہیں کہ ریاست کو آخر کار مذہبی انتہا پسندی سے لڑنے کا ہی فیصلہ کرنا پڑے گا: غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۱۹۷

سوال یہ ہے کہ غلط اجتہاد کا جواب صحیح اجتہاد ہے تو غامدی صاحب اجتہاد کی اصلاح کرنے کے بجائے تشدد کے ذریعے اجتہاد کرنے والوں کو کیوں ختم کرنا چاہتے ہیں اس طرح وہ خود اپنے اصول کی خلاف ورزی کر رہے ہیں میزان میں انہوں نے لکھا ہے مجتہد کے لیے اپنے اصول کی پابندی لازم ہے مجتہد کا اپنے اجتہاد سے انحراف خدا سے خیانت ہے: غامدی میزان ۲۰۱۵ء ص ۳۶۶

سوال یہ ہے کہ کیا اپنے اصول سے انحراف کرنے والے مجتہد اور اپنے اصول کے تحت خدا سے خیانت کے مجرم سے دین اخذ کیا جاسکتا ہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ جو شخص عربی زبان پر عبور نہیں رکھتا اس سے دین کے احکامات لیے جاسکتے ہیں؟

غامدی صاحب نے پہلی مرتبہ ماخذات دین میں ہی اجتہاد کر دیا

ماخذات دین قرآن اور سنت قطعی الدلالہ نہیں ہیں: غامدی

سرسید کا فلسفہ یہ تھا کہ نصوص کے سوا ہر شخص ہر مسئلے میں اجتہاد کر سکتا ہے وہ آپ اپنا مجتہد ہے [حالی حیات جاوید جلد اوّل الجرہ پبلشرز ۱۹۸۳ء ص ۲۸۰] مگر غامدی صاحب نے نصوص میں بھی اجتہاد کی آزادی عطا کر کے سرسید کو پیچھے چھوڑ دیا اسلامی علمیت کی تاریخ میں ماخذات دین کی بنیاد پر اجتہاد ہوتا تھا غامدی صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے پہلی مرتبہ ماخذات دین میں ہی اجتہاد کر دیا اجماع و قیاس کو ماخذات سے خارج کر دیا قرآن و سنت کو بھی مشکوک ماخذات ثابت کیا ان کی نظر میں نہ قرآن قطعی الدلالۃ ہے نہ سنت قطعی ہے سب تغیر کی زد میں ہیں اور یہ دونوں ماخذات دین قرآن و سنت علم کی تعریف پر پورے نہیں اترتے کیوں کہ علم وہ ہے جس میں ظن نہ ہو جو اپنا نقیض [Oxymoron] نہ ہو غامدی صاحب نے میزان اور البیان میں قرآن و سنت کے اندر تضادات ثابت کیے ہیں قرآن کی ایک آیت کے کئی معانی بتائے کئی تاویلات کیں جبکہ ان کا اصول یہ ہے کہ القرآن لا یحتمل الا تاویلاً واحداً قرآن میں ایک سے زیادہ تاویلات کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہوتی [غامدی میزان ۲۰۱۵ء ص ۵۲] اسی طرح انہوں نے دعویٰ کیا کہ سنت قرآن کی طرح قطعی ہے [غامدی، میزان، ۲۰۱۵ء ص ۱۴] مگر انہوں نے مقامات میں لکھا ہے کہ سنت قطعی نہیں ہے سنت کی تعداد میں کمی بیشی ہو سکتی ہے [غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۱۵۱] خود لکھتے ہیں قطعیت احتمال کی نفی ہے قطعیت علم ہے علم وہ صفت جس سے حقائق میں ایسا امتیاز حاصل ہو جائے کہ نقیض [Oxymoron] کا احتمال نہ رہے: غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۱۳۸] لہٰذا غامدی صاحب کے اصول کے تحت نہ قرآن قطعی ہے نہ مطلق نہ سنت قطعی ہے نہ مطلق سب ہر لمحے تحقیق کے ذریعے متغیر ہیں۔ اس کی تفصیلات کے لیے آپ جناب عمار ناصر صاحب کے جواب میں لکھی گئی وضاع سیریز میں ہمارے پچاس مضامین دیکھیے۔

ہماری رائے میں اگر اسلامک ماڈرن ازم کا خاتمہ کر دیا جائے تو آزادانہ اجتہاد ختم ہو جائے گا اور صرف علماء کا اجتہاد باقی رہ جائے گا۔ اسلامک ماڈرن ازم کے تمام اجتہاد، الحاد، فساد ہیں اور اس الحاد کے خلاف بھی راہ راست، راہ نجات، ضرب عضب، اور رد الفساد کی طرح مستقل جدوجہد کی ضرورت ہے۔ عالم اسلام میں تمام جدید عسکری تنظیمیں اسلامک ماڈرن ازم کے آزادانہ اجتہاد کا نتیجہ اور مغربیت، جدیدیت کا ردعمل

Reaction ہے اور ردعمل کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا Reaction has no Ideology

سرسید اور غامدی صاحب کے فلسفے کے تحت پروٹسٹنٹ ازم کی اتباع وتقلید میں جب ہر جاہل عامی کا فرکو قرآن وسنت میں اجتہاد کی آزادی مل گئی تو اس کا منطقی نتیجہ پاکستانی طالبان، لال مسجد، داعش، بوکوحرام، القاعدہ، المہاجرون، حزب التحریر، التکفیر والہجرہ ہیں۔

غامدی صاحب کا فلسفہ اجتہاد اور قوم پرستی

ہر ایک علیحدہ وطن حاصل کرسکتا ہے: غامدی

غامدی صاحب ہر قسم کی علاقائی، نسلی، لسانی، قوم پرستی کے حامی ہیں اور ایسی تحریکوں کے الگ وطن کے مطالبے کو عین الحق، جائز، صائب اور درست سمجھتے ہیں ''مقامات'' میں لکھتے ہیں اسلام قومیت کی نفی نہیں کرتا مسلمانوں کے مختلف گروہ اگر اپنی قوم کے حوالے سے اپنا تعارف کرائیں حقوق کا مطالبہ کریں یا اپنی کوئی الگ قومی ریاست قائم کرنا چاہیں تو اسے بھی وہ ناجائز نہیں کہتا: غامدی مقامات ۲۰۱۴ء ص ۱۷۶ اس فلسفے کے تحت اگر مہاجر، سرائیکی، بلوچ، سندھی قوم پرست الگ وطن کا مطالبہ کریں تو وہ جائز ہے ظاہر ہے قوم پرستی کا انجام اسی قسم کی علاقائی نسلی لسانی قوم پرستی ہے غامدی صاحب کو یہ تک معلوم نہیں کہ اسلام قوم پرستی کے فلسفے کو تسلیم نہیں کرتا یہ مغرب کا فلسفہ ہے۔

مغربیت، جدیدیت اور مغرب کے سنگین مظالم اور مسلمانوں کے خلاف اجتماعی تاریخی دہشت گردی پر عالم اسلام میں فطری طور پر ابھرنے والی تمام ردعمل کی تحریکوں کو علمی جواز مہیا کرنے کا کام غامدی صاحب کا آزادانہ اجتہاد کا فلسفہ کررہا ہے اگر علماء کی تقلید کی جاتی تو کسی عامی کو اجتہاد کی جرأت نہ ہوتی یہ جرأت صرف غامدی صاحب مہیا کررہے ہیں اجتہاد صرف علماء یا دینی مدارس تک محدود ہوجائے تو کھمبیوں کی طرح اُگتی ہوئی تنظیمیں خود ختم ہوجائیں گی اس کے لیے علماء کی اتھارٹی تسلیم کرنا ہوگی۔ اسلام کی پندرہ سوسالہ تاریخ میں اجتہاد ____ ریاست یا حاکم وقت نے نہیں عالم یا علماء نے یا حاکم نے علماء کے مشورے سے کیا ہے۔

منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ اس وقت کے سب سے بڑے عالم ثانی لاثانی حضرت ابوبکر نے کیا جن کی امامت میں رسالت مآب نے نمازیں ادا کی تھیں جس شخص کی امامت میں رسالت مآب نے نمازیں پڑھیں ان کا کیا مقام اور کیا درجہ ہوگا مفتوحہ زمینوں کو غنیمت میں تقسیم نہ کرنے کا اجتہاد حضرت عمرؓ نے کیا جو اپنے عہد کے سب سے بڑے عالم اور فقیہہ تھے۔

اجتہاد صرف اور صرف علماء کرسکتے ہیں جاہل نہیں

اجتہاد صرف اور صرف علماء کرسکتے ہیں اگر عسکری جدوجہد سے متعلق تمام اجتہادات فیصلے منہج اہل سنت والجماعت کے علماء یا کسی دوسرے مکتب ومنہج کے اکابرین کرتے تو عسکری جدوجہد کا جواز مہیا کرنے والا مرکز متعین ہوجاتا علماء سے اختیار واقتدار چھین لینے کے بعد ہر شخص مجتہد وقت بن گیا ہے لہٰذا کسی کو متعین کرنا محال ہوگیا ہے علماء کے اجتہاد کی یہی مصلحت ہے کہ آپ مرکز اجتہاد کو متعین کرسکتے ہیں اس سے بات کرسکتے ہیں اس

سے مکالمہ ممکن ہے اسلامک ماڈرن ازم نے اپنے اجتہاد کے ذریعے اس مرکز کو تباہ کر دیا۔

اسلامک ماڈرن ازم اتھارٹی کا انکار کرتا ہے وہ فرد کو مغرب کی طرح لامحدود آزادی Freedom عطا کر کے اسے Right of Self Determininination حق خود اداریت یعنی ہر مسئلے کا فیصلہ خود کرنے کی آزادی عطا کر کے اسے فاعل مختار مطلق بنا دیتا ہے ایسا آزاد وجود جو کسی اتھارٹی کو نہیں مانتا _____ اسلامک ماڈرن ازم نے مغرب کے جدید فلسفے کے تین عقیدوں آزادی، مساوات، ترقی کے لیے علماء کی اتھارٹی تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس کا نتیجہ جدید عسکری تنظیمیں ہیں اس کا دینی مدارس، علماء، اسلامی علمیت سے کوئی تعلق نہیں جنھوں نے کبھی غلطی سے یا کسی مصلحت کے تحت جزوی حمایت کی تھی وہ بھی رد عمل کی پیداوار ان متشدد، بے سمت، تیر بے ہدف تنظیموں کی حمایت سے کامل دستبردار ہو چکے ہیں لہٰذا اب آزادانہ اجتہاد کی فکری دہشت گردی کے ذریعے عسکریت پسندی کو ممکن بنانے کا کام صرف اسلامک ماڈرن ازم اور جاوید غامدی کا فلسفہ اجتہاد کر رہا ہے اس پر توجہ کی ضرورت ہے۔

<u>عالم اسلام میں پر تشدد تحریکوں کا سبب جمہوریت پر ایمان ویقین ہے</u>

جمہوریت اور عسکریت کے سوا بھی تبدیلی کے کئی طریقے ہیں

گزشتہ سو برسوں میں عالم اسلام کی اکثر احیائی، اصلاحی، انقلابی، احتجاجی، تعمیری، دعوتی اسلامی تحریکوں نے جدو جہد کے صرف دو طریقے اختیار کیے ہیں (۱) جمہوریت (۲) عسکریت۔ ان دو طریقوں کے سوا وہ کسی تیسرے طریقے کو اختیار کرنے پر آمادہ نہیں کیوں کہ دوسرے طریقوں میں کردار کی عظمت بنیادی مطالبہ ہے اصحاب کہف، اصحاب الاخدود، امام غزالیؒ، امام ابو حنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ، امام ابن تیمیہؒ کی جدو جہد فاطمئین مصر کے قبضے کے بعد علماء کی طویل جدو جہد، اکبر کے زمانے میں علماء کی جدو جہد اور مجدد الف ثانیؒ کی جدو جہد ____ ان اسلامی تحریکوں کے لیے کوئی خاص اہمیت ہی نہیں رکھتی اس جدو جہد میں نہ فساد ہے نہ تشدد۔ اس میں علماء اپنی پیٹھ حکمرانوں کو کوڑوں کے لیے پیش کرتے ہیں یہ قربانی دینے کی جدو جہد ہے ہمیں صرف قربانی لینے کی جدو جہد پسند ہے اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ عسکری جدو جہد حرام ہے وہ جائز ہے فرض ہے اور جہاد قیامت تک ہو گا لیکن اس کی شرائط حدود قیود طریقے علماء بتائیں گے لال مسجد کے مولوی نہیں۔ اور یونیورسٹی کے پڑھے ہوئے جذباتی نوجوان نہیں۔ جو نہ اسلام سے واقف ہیں نہ مغرب سے بس انتقام کی آگ ان کے سینے میں دہکی ہوئی ہے ان کے اخلاص میں شبہ نہیں مگر یہ علم سے عاری ہے اور اخلاص علم کا متبادل نہیں ہو سکتا

عسکری طریقے ہمیشہ اسلامی تحریکیں اس وقت اختیار کرتی ہیں جب وہ جمہوریت پر ایمان لانے کے بعد جمہوری جدو جہد میں کامیاب ہو جانے کے بعد بھی بری طرح ناکام ہو جاتی ہیں مغرب پہلے انہیں بے وقوف بناتا ہے کہ تبدیلی کا طریقہ انتخابات ہیں لہٰذا وہ اس راستے کو اختیار کر لیتی ہیں جب مغرب اقتدار نہیں دیتا تو وہ آپے سے باہر ہو جاتی ہیں لہٰذا جمہوری طریقے سے اقتدار میں ناکامی کا رد عمل لازماً عسکری جدو جہد

کے طور پر سامنے آتا ہے۔ فلسطین، مصر، الجزائر، اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ لہٰذا عالم اسلام اور دنیا بھر میں تشدد، عسکریت کا اصل سبب جمہوریت ہے جمہوریت جہاں جہاں جاتی ہے تشدد، خون خرابہ لاتی ہے مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy پڑھ لیجیے وجے مہتا کی کتاب The Economics of Killing: How the west fuels war and poverty in the developing world. پڑھ لیجیے۔

عالم اسلام میں جہاں جہاں تشدد عسکریت عام ہے وہاں جمہوریت انسانی حقوق میں ناکامی کا ردعمل تشدد ہے۔ لبنان میں عسکریت کا سبب بھی جدید ریاست اور جمہوریت ہے لبنان میں عیسائی اور مسلمانوں کی آبادی کا تناسب بدل گیا تو حقوق کی سیاست کا رخ بھی بدل گیا عیسائی اقلیت ہو گئے مسلمان اکثریت میں آ گئے لہٰذا تمام مناصب مراتب کی قدیم ترتیب الٹ گئی جس کے نتیجے میں تشدد عام ہو گیا۔ مسلم اکثریت نے عیسائی اقلیت کو تشدد پر آمادہ کیا جس کا نتیجہ تشدد نکلا اس کا ایک جزوی نتیجہ حزب اللہ ہے یہ جمہوری عمل کا منطقی نتیجہ ہے۔

برنارڈ لیوس نے اپنی کئی کتابوں میں لکھا ہے کہ ترکی میں جب تک خلافت تھی مسلمان غیر مسلم مساوی نہیں تھے غیر مسلم ذمی یا معاہد کی حیثیت سے رہتے تھے جزیہ دیتے تھے خلافت میں ان کا کوئی حصہ نہیں تھا سیاست عدالت ریاست کے عہدوں پر ان کا کوئی حق نہیں تھا۔ اس وقت تک تمام اقلیتیں محفوظ تھیں ان کو بے مثال آزادی میسر تھی لیکن جیسے ہی جمہوریت اور مساوات و آزادی آئی اس کے ردعمل اور اثر سے اقلیتوں کا قتل عام شروع ہوا آرمینائیوں کا قتل عام خلافت عثمانیہ نے نہیں ماڈرن ترکی نے مغربی اصول و اقدار قبول کرنے کے بعد کیا۔ خلافت عثمانیہ میں۔ غیر مسلم اقلیتوں کے شان دار حالات کے بارے میں اس کے خیالات Islam in Europe میں پڑھے جا سکتے ہیں۔

تمام مسلمان خلافتوں میں اقلیتوں کو ہر طرح کا تحفظ حاصل رہا تفصیل درج ذیل کتابوں میں پڑھ لیجیے: لیکن دنیا بھر میں آج تمام مسلمان اقلیتیں شدید مظالم کا شکار ہیں

Bernard Lewis., Islam in Europe,

Fareed Zakria., The Future of Freedom

J.Rawls., The Law of the people.

Michal Man., The Dark Side of Democracy.

Joseph Lumbard: Islam Fundamentalism & the Betrayal of Tradition

<u>جمہوریت اور نسلی، مذہبی، لسانی قتل عام لازم و ملزوم ہیں</u>

دنیا میں جہاں بھی جمہوریت جاتی ہے وہاں نسلی لسانی مذہبی قتل عام ہوتے ہیں کیوں کہ جمہوریت حقوق کی سیاست Politics of

Rights کو عام کرتی ہے اور حقوق کی سیاست جیسے ہی شروع ہوتی ہے لسانی نسلی علاقائی مذہبی عصبیتیں ردعمل کے طور پر ابھرتی ہیں۔ برما ۱۹۴۸ میں آزاد ہوا تو وہاں بھی خودمختاری کی عسکری جدوجہد شروع ہوئی وہاں ۳۵ سے زائد نسلی گروہ [Ethini Minorities] تھے ہر گروہ اپنی علاقائی خودمختاری اور الگ ریاست [Regional Autonomy] کا علمبردار تھا ان نسلی گروہوں نے اقتدار پر قابض اکثریتی بامر نسلی گروہ [Bamer Ethinic Group] کے خلاف ہتھیار اٹھا کر عسکری جدوجہد شروع کردی یہ جدوجہد جمہوریت انسانی حقوق کے نام پر ہوئی برما میں صرف مسلمان ہی نہیں دیگر دس بارہ نسلی گروہ گزشتہ ستر سال سے عسکری کارروائیوں میں مصروف ہیں ۲۰۱۵ء میں پہلی مرتبہ Myanmar Peace Centre کے بانی UMINZAWOO کی کوششوں سے آٹھ باغی ملیشیاؤں [Eight reble militias] نے حکومت برما سے جنگ بندی کا معاہدہ کیا۔ برما میں ۱۹۴۸ء سے لے کر آج تک مختلف نسلوں گروہوں اور مسلمانوں کے قتل عام ہوتے رہے اب صرف مسلمان نشانہ ہیں کیوں کہ وہ جس صوبے میں موجود ہیں وہ برما کا وسائل سے مالا مال صوبہ ہے قدرتی ذخائر کے علاوہ وہاں برمی حکومت نے چین سے بندرگاہ بنانے کا معاہدہ کیا ہے لہٰذا مستقبل میں یہ صوبہ ترقی کے حوالے سے اہمیت کا حامل ہوگا لہٰذا۔ برمی قوم کے لیے۔ قومی ترقی کے لیے معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافے کے لیے ___ ترقی کے ثمرات سمیٹنے کے لیے مسلمانوں کا قتل عام جائز ہے یہ غیر برمی ہیں یہ باہر سے آئے ہیں یہ مقامی قومی نہیں ہیں۔ یہ مسلمان بھی ہیں ان میں ہی دہشت گرد ہوتے ہیں ان کے سوا دنیا کی تمام اقلیتیں پرامن ہیں۔ برمی مسلمانوں کے خلاف تشدد جمہوریت جدید ریاست قوم پرستی ترقی، آزادی کے عقیدوں کا پیدا کردہ تشدد ہے۔

مسلمانوں کا قتل عام اس لیے بھی جائز ہے کہ برما کی آزادی کے بعد ان اراکانی، مسلمانوں نے برما سے علیحدگی کا مطالبہ کیا تھا انہوں نے پاکستان میں شمولیت کی کوشش کی تھی انہوں نے آخر میں مطالبہ کیا تھا کہ انھیں برما کی شہریت دی جائے۔ مگر جب یہ مطالبہ بھی منظور نہ ہوا حقوق اور مطالبات کی جمہوری جدوجہد ناکام ہوگئی تو مسلمانوں نے جمہوری عمل سے مایوسی کے بعد عسکری جدوجہد شروع کردی۔ انھوں نے برما سے طویل عرصے تک مختلف پرچموں کے سائے میں جنگ کی تھی [ARSA] بھی عسکری جدوجہد کرتی رہی مگر یہ تنظیم بھی مشکوک ہے لہٰذا اب مسلمانوں کا برما کی زمین پر کوئی حق نہیں ہے۔ دیگر آٹھ نسلی گروہوں کو معاف کیا جاسکتا تھا مسلم نسلی گروہ کو معاف نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ برما کی سب سے زرخیز، مالا مال خطے پر قابض تھے یہاں ان کی اکثریت تھی۔

برما سے نسل پرستی، مفاد پرستی، قوم پرستی کی بنیاد پر نکالے گئے مسلمانوں کو نہ بنگلہ دیش قبول کر رہا ہے نہ بھارت نہ پاکستان کیوں کہ سب کی قومی ترقی ان کی آمد سے متاثر ہوگی سب سے پہلے قوم ہے اس کے بعد دنیا کا درد ___ روہنگیا مسلمانوں کے خلاف بے دخلی، ظلم، قتل عام پر مبنی برمی آپریشن کی چین نے مکمل حمایت کا اعلان کیا ہے۔ چین نے کہا میانمار کے امن واستحکام کے قیام کے حق کی حمایت کرتے ہیں عالمی برادری بھی ان کی مدد کرے We support for her government's efforts uphold peace & stability in Rakhine

[تمام قومی اخبارات ۱۳ستمبر ۲۰۱۷ء]

چین کومسلمانوں کے صوبے میں اربوں ڈالر کی بندرگاہ بنانے کا ٹھیکہ ملا ہے معاشی ترقی کے دیگر کام بھی ملیں گے لہٰذا چین کا معاشی مفاد برما کی حمایت میں ہے خود چین کو سنکیانگ میں مسلم مزاحمت کا سامنا ہے لہٰذا چین مسلمانوں کی موجودگی کو اس خطے میں ایک خطرہ تصور کرتا ہے جدید ریاست صرف اپنے قومی معاشی مفادات کے اصول کو ہر اصول پر مقدم رکھتی ہے انسانیت وغیرہ صرف افسانے ہیں کیوں کہ جدید فرد اور جدید ریاست کا مقصد صرف اور صرف سرمایہ کا حصول مادی خوشیوں کی فراوانی، منافع میں لامحدود اضافہ، آمدنی معیار زندگی میں مستقل و مسلسل اضافہ ہے لہٰذا ان مقاصد کے لیے انسانی قتل عام بھی جائز قرار دیا جاتا ہے امریکہ نے دس کروڑ سرخ ہندیوں کو اسی بنیاد پر قتل کیا تھا اور فلسفی جان لاک نے اس قتل عام کی حمایت کی تھی کہ سرخ ہندی آزادی، ترقی، سرمایہ میں اضافہ کی اقدار سے بے بہرہ تھے اور انسان بننے پر تیار نہ تھے جدید امریکہ وہاں کے اصل باشندوں کے قتل عام کے بعد قائم ہوا ہے مائیکل مین کی کتاب پڑھ لیجیے۔

ہر جدید ریاست GDP، GNP، GNI، BMI، HDI کو اپنی قوت طاقت شان شوکت کا پیمانہ بناتی ہے لہٰذا وہ دارالاسلام نہیں بن سکتی جہاں انصار نے مہاجرین کو پناہ دیتے ہوئے کوئی تنگی محسوس نہیں کی۔ دارالاسلام، ایمان، یقین، محبت، ایثار اور مواخات کی بنیادوں پر قائم ہوتا ہے قومی ریاست نفرت آزادی ترقی اور مساوات کے عقیدوں پر قائم ہوتی ہے لہٰذا قومی ریاستیں اگر کبھی سترہ لاکھ، اسی لاکھ مہاجرین کو قبول کرتی ہیں تو اس کی شرط اربوں ڈالر کی عالمی امداد ہوتی ہے صرف انسانیت، مذہب، محبت کی بنیاد پر کسی انسان کو قبول نہیں کرتی قومی سرحدیں خود آزادی مساوات اور انسانیت کے اصول کی خلاف ورزی کا اعلان ہیں۔

خلافت اسلامیہ میں کوئی قومی سرحد تھی نہ ویزا نہ پاسپورٹ یونان، روم وایران کی سلطنتوں میں بھی قوم پرستی نہیں تھی۔ فلسفی مائیکل سانڈل نے اپنی کتاب Justice میں لکھا ہے کہ دنیا کے کسی بھی ملک کی شہریت امیر لوگ جب چاہے حاصل کر سکتے ہیں۔

اگر آپ امیر ہیں آپ کے پاس سرمایہ ہے تو آپ عالمی انسان ہیں ہر قومی سرحد آپ کے لیے کھل جائے گی دو گھنٹے میں آپ کو ہر ملک کی شہریت مل جائے گی۔

یہ ہے عصر حاضر کی انسانیت ___ انسانیت کا مطلب ہے سرمایہ پرستی ہر شخص سرمایہ پرستی [Worship of Capital] میں مبتلا ہے۔

حرص وحسد ہوس کی عمومیت اور عالمگیریت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اسی لیے تمام اقدار، روایات، مذاہب، اخلاقیات دم توڑ رہے ہیں ہر ملک کی قومی سرحد صرف ان لوگوں پر بند ہے جو غریب ہیں مدد کے محتاج ہیں ضرورت مند ہیں لیکن ہر ملک کی سرحد امیروں کے لیے سرمایہ کے لیے کھلی ہوئی ہے کیوں کہ سرمایہ آنے سے اس ملک کی ترقی میں اضافہ ہوگا اور انسانیت کے ذریعے غریب مہاجرین کے آنے سے اس ملک کی ترقی وسائل

اسباب کم ہوں گے

افریقہ کے کئی ملکوں میں خشک سالی، قحط سالی کے باعث لوگ ایک ملک سے دوسرے ملک منتقل ہونے کی کوشش کررہے تھے تو سرحدی محافظ مہاجرین کو گولیاں مار مار کر ہلاک کررہے تھے مگر اسی ملک کے درندے چرندے پرندے خوراک کی تلاش میں دوسرے ملک میں منتقل ہورہے تھے تو ان پر گولی نہیں چلائی جارہی تھی کیوں کہ ان کی آمد سے جنگلی حیاتیات (وائلڈ لائف) میں اضافہ ہورہا تھا۔ انسانوں کے لیے سرحدیں بند تھیں جانوروں پرندوں درندوں کے لیے سرحدیں کھلی تھیں یہ ہے عصر حاضر کی انسانیت، آزادی، مساوات اور یہ ہے مذہب حقوق انسانی کا پیدا کردہ انسان اور اس کی تخلیق کردہ جدید ریاست اور اس کی قومی سرحدیں۔

واضح رہے کہ امن مرکز کے بانی Min خود بیس سال تک ایک باغی انقلابی رہے اور برمی فوج برمی حکومت کے خلاف آل برما اسٹوڈنٹ ڈیموکریٹک فرنٹ کے پلیٹ فارم سے جنگلات میں چھپ کر عسکری جدوجہد کرتے رہے وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اگر تمام باغی گروہ مل کر فوج کو شکست دے دیں تب بھی یہ فتح امن کے بجائے مزید جنگوں اور تشدد کا سبب بنے گی

...even if the ragtag collection of rebel groups were somehow to defeat the Military that would only lead to more fighting.

یہی آئینی دستوری جمہوریت کی کامیابی ہے جو دینی لوگوں نسلی علاقائی لسانی تنظیموں کو عسکریت پر آمادہ یا مجبور کرتی ہے اور پھر یہی تشدد لوگ پلٹ کر دوبارہ اسی جمہوریت کے سائے میں آجاتے ہیں۔ دنیا جان لیتی ہے کہ جمہوریت ایک ناگزیر برائی ہے ظاہر ہے یہ نقطۂ نظر بس التباس [illusion] ہے ۔مصر اور الجزائر میں یہی تاریخ دہرائی جارہی ہے حالانکہ تشدد اور عسکریت کا اصل ماخذ جمہوریت ہی ہے۔ جمہوریت کی پوری تاریخ آگ خون قتل عام کی تاریخ ہے مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy پڑھ لیجے انقلاب فرانس، انقلاب امریکہ جو جمہوری انقلابات تھے کروڑوں لوگوں کے قتل عام کے بعد ہی تو کامیاب ہوئے۔

افغانستان میں روس کو شکست دینے کے بعد تمام عسکری گروہوں نے کیا کیا؟۔ روس کی شکست کے بعد امن قائم نہیں ہوا یہ فتح مزید خوں ریزی میں تبدیل ہوگئی۔ امریکہ نے اسی لیے اس جدوجہد کو مرکزی قیادت کے تحت مجتمع نہیں ہونے دیا انھیں ازبک، تاجک، پختون شناختوں سے وابستہ کر کے قومی نسلی علاقائی لسانی قوم پرستی کے جراثیم زندہ رکھے اگر وہ مذہب کے نام پر مرکزی قیادت کے تحت اکٹھے ہوتے تو کبھی یہ صورت حال نہ ہوتی۔

واضح رہے کہ Min نے جارج میسن یونیورسٹی میں جمہوریت اور تشدد پر اپنی تحقیق میں دنیا کے چھیاسی ملکوں کا مطالعہ کیا جہاں گزشتہ نصف صدی میں تشدد اور جمہوریت کے اثرات نے مختلف تجربات کو جنم دیا جمہوریت سے تشدد پھوٹا پھر اسی تشدد کے ذریعے لوگ دوبارہ جمہوریت کی

طرف لوٹ گئے۔یعنی جمہوریت ___ پھر تشدد پھر جمہوریت۔تشدد اور صرف تشدد یہی جدید انسان اور جدید ریاست کا مقدر ہے۔جمہوری ریاستوں میں علاقائی مذہبی نسلی لسانی گروہوں [Groups] کی جانب سے حقوق کی سیاست [Politics of Rights] اور خودمختاری، آزادی، علیحدگی Autonomy/ Freedom/ Sepration کے مطالبے بھی ریاست پر قابض اکثریتی گروہ کے جوابی تشدد کا ایک اہم سبب ہے لیکن مسئلہ یہ ہے کہ جمہوریت آزادی دستور و آئین اور بنیادی حقوق کے منشور کے نتیجے میں حقوق کی سیاست ہی عام ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ تشدد جوابی تشدد اور پھر مزید تشدد ہوتا ہے۔

بھارت، بنگلہ دیش، برما، سری لنکا، فلپائن اس کی نمایاں مثالیں ہیں جمہوریت نے ہر جگہ عسکریت پسندی کو جنم دیا ہے جمہوریت میں ہر اقلیت خود کو غیر محفوظ سمجھتی ہے صرف ایک اقلیت محفوظ ہوتی ہے۔جسے سرمایہ دارانہ اقلیت Capitalist Minority کہتے ہیں اسے بس نیشنلائزیشن کا خطرہ ہوسکتا ہے مگر کبھی کبھار۔ایمی چوا کی کتاب The world on fire پڑھ لیجیے جس میں دنیا بھر کی سرمایہ دارانہ اقلیتوں کے بارے میں حیرت انگیز معلومات جمع کی گئی ہیں۔

اس سوال پر بھی غور کی ضرورت ہے کہ بنگلہ دیش کے بہاری مسلمانوں کے خلاف بنگالیوں کا تشدد کیوں ختم ہوگیا؟ صرف اس لیے کہ وہ حقوق اور مطالبات کی سیاست سے دور رہے ان کا صرف ایک ہی مطالبہ ہے ہمیں پاکستان جانے دیا جائے۔یہ مطالبہ بنگلہ دیش کی حکومت کو بہت پسند ہے لہٰذا وہ قتل عام سے محفوظ ہیں۔

<u>جدید ریاست، جمہوریت اور تشدد</u>

جدید ریاست جدیدیت جمہوریت اور نسلی لسانی فسادات تشدد Violence سے ہی پیدا ہوتی ہے اور تشدد کو ہی جنم دیتی ہے اور اس کی ذمہ داری مذاہب، علاقائیت، نسل اور لسانیت پرستی پر ڈالتی ہے اور قوم پرستی کے پیدا کردہ مسئلے کا حل لبرل ازم میں ڈھونڈتی ہے جب لبرل ازم مسئلے پیدا کرتا ہے تو اس کا حل قوم پرستی میں تلاش کرتی ہے قومی ریاستیں کس طرح علاقائی نسلی مقامی لسانی نسل پرستی کو پیدا کرتی اور کس شدت سے انہیں کچلتی ہیں اس تشدد کے لیے جدید ریاست کیا کیا کام کس کس طرح کرتی ہے اس کے لیے درج ذیل کتابوں کا مطالعہ مفید رہے گا

(1) Andreas Wimmer., The Waves of War: Nationalism, State Formation, and Ethnic Exclusion in the Modern World.

(2) Michal Man., States, War, and Capitalism: Studies in Political Sociology

جدید ریاست قوم پرستی اور لبرل ازم کے ذریعے Exclusion اور Inclusion کرتی رہتی ہے۔

پاکستان میں سندھی بلوچی مہاجر نسل پرستی اسی جدیدیت اور جمہوریت کا ثمر ہے سب خود کو محروم مجبور بے کس سمجھ رہے ہیں اور اپنی محرومی کا

الزام پنجابی اکثریت پر عائد کررہے ہیں ہر قومی ریاست میں ایسا ہی ہوتا ہے یہ پاکستان کا مسئلہ نہیں ہم اسے صرف پاکستان اور اسلام سے وابستہ کردیتے ہیں۔فرانس میں مسلمانوں کی تعداد نہایت تیزی سے بڑھ رہی ہے فرانس کے سابق صدر سرکوزی نے غصے میں کہا تھا مسلمان چوہوں کی طرح اپنی نسلیں بڑھا رہے ہیں ۲۰۴۰ تک فرانس میں مسلمانوں کی تعداد فرانسیسیوں کی تعداد سے بڑھ جائے گی للہذا جمہوری سیاست کے ذریعے مسلمانوں اقتدار میں آسکتے ہیں للہذا فرانس اور جرمنی میں مسلمانوں کے خلاف بڑھتی ہوئی نفرت جرمن اور فرنچ نسل پرستی میں اضافے کا سبب اصلاً جدید جمہوری نظام ہے اسلام نہیں اگر وہاں بادشاہت ہوتی تو مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی آبادی ان کے لیے کوئی خطرہ پیدا نہ کرتی۔

بھارت میں مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی تعداد مستقبل میں ہندوؤں کے لیے جمہوری خطرہ ہے للہذا وہاں بھی قتل عام ہو رہا ہے۔اگر تقسیم ہند نہ ہوتی تو بھارت میں مسلمانوں کی تعداد اس وقت ستر کروڑ ہوتی اس وقت بھی ان کی آبادی ۲۴ کروڑ کے قریب ہے اور شرح افزائش سب سے زیادہ ہے اس کی وجہ مسلمانوں میں شادی کا ادارہ، بچوں سے محبت، تقدیر پر بھروسہ، خاندانی نظام اور سنت رسول کی اتباع ہے مسلمان نکاح کی سنت کو نہایت اہتمام سے ادا کرتے ہیں اور بچوں کی اکثریت سے خوف زدہ نہیں ہوتے۔اگر بھارت میں بادشاہت ہوتی تو کبھی مسلمان قتل نہ ہوتے کیوں کہ بادشاہت میں انتخابات نہیں ہوتے۔بادشاہ کو کسی اکثریت سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہوسکتا جس طرح مغلیہ سلطنت میں مسلمان صرف چار فی صد تھے اکثریت ہندوں، کی تھی للہذا نہ جمہوریت تھی نہ حقوق انسانی نہ اکثریت کے باعث بادشاہت کا اقتدار خطرے میں تھا للہذا وہاں کبھی سیاسی، نسلی، مذہبی، علاقائی بنیادوں پر کبھی فسادات نہیں ہوئے۔

بادشاہت میں کسی نسل مذہب کو کوئی خطرہ نہیں ہوتا للہذا تمام بادشاہتوں میں تمام مذاہب اور نسلیں سکون سے رہتی تھیں جمہوریت اور مذہب انسانی حقوق [Religion of Human Rights] نے یہ سکون ہی غارت کردیا۔

مغلیہ سلطنت کے خاتمے کے بعد پہلا مذہبی فساد ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان انگریزوں کی آمد کے بعد بنارس میں ہوا ہندوستان کی جمہوری تقسیم کے بعد دو لاکھ سے زیادہ ہندو مسلم فسادات ہو چکے ہیں یہی حال دوسرے ہمسایہ ملکوں کا ہے ہر جگہ یہی ہو رہا ہے۔ جب بھی کوئی جمہوریت پر تنقید کرتا ہے یا اعتراض کرتا ہے تو منطق استقرائی [Induction logic] کے تحت فوراً جہلاء یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ یہ شخص لازماً آمریت کا حامی ہے تشدد دہشت گردی اور عسکریت کا علم بردار ہے۔ یہ جہالت عالم اسلام میں عام ہے لیکن مغرب میں جمہوریت پر تنقید کرنے والوں کو اس رویے کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

<u>اسلامک ماڈرن ازم پروٹسٹنٹ ازم کا چربہ ہے</u>

اسلام اور علماء کی دشمنی میں علماء کی ذمہ داریوں کو اور اجتہاد جیسے نازک نفیس فریضے کو بغیر کسی تحدید، تخصیص کے کفار اور مسلم عوام تک وسیع کرنے کا انجام عسکریت پسندی ہے عالم اسلام عسکریت پسندی سے اگر تباہ ہو رہا ہے تو اس کی وجہ مفتی، عبدہٗ، افغانی سرسید کے جدید مکتب فکر کے باطل

افکار ہیں جو پروٹسٹنٹ ازم کا چربہ ہیں ۔ عالم مغرب میں پروٹسٹنٹ ازم نے کیتھولک ازم اور راسخ العقیدہ عیسائی مذہب ،تہذیب ،تمدن کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا آزادانہ اجتہاد کی آزادی دے کر مذہب کا خاتمہ کر دیا اور تاریخ انسانی میں پہلی مرتبہ مذہب کو دنیا پرستی کے جواز کا ذریعہ بنا کر Work Ethics سے سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ پرستی اور حرص و ہوس وحسد کی عمومیت و عالمگیریت کو مذہبی جواز ،لباس اور لبادہ عطا کیا چین جیسا سرمایہ دار ملک بھی تیزی سے پروٹسٹنٹ ازم قبول کر رہا ہے تفصیلات کے لیے نائیل فرگوسن کی کتاب The West & the Rest کا باب نیا یروشلم چین ملاحظہ کیجئے۔

باجوہ صاحب کا فتوی کہ جہاد ریاست کا حق ہے غامدی صاحب کا فتوی کہ یہ فرد کا حق ہے۔اس فکری اختلاف تنازعے کا فیصلہ صرف اور صرف علماء کر سکتے ہیں کیوں کہ وہ مسند رسول کے وارث ہیں دونوں حضرات علماء کو اتھارٹی تسلیم کر لیں اور اپنا موقف ان کی خدمت میں آخری فیصلے کے لیے پیش کر دیں۔علماء کا اجتہاد سب تسلیم کر لیں تمام مسائل حل ہو جائیں گے۔

دہشت گردی کے عالمی مسئلے کو ہم نے ابھی تک وسیع بنیادوں پر سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی پہلے مدارس اس کا مرکز قرار دیے گئے اب سیکولر یونیورسٹیاں اس کا مرکز ہیں جب کہ یہ عالمی مسئلہ ہے اور جدیدیت کا ردعمل ہے برما میں ۱۹۴۸ء میں آزادی کے بعد سے ۲۰۰۵ء تک دہشت گردی کیوں ہوتی رہی صرف اس کی تاریخ پڑھ لی جائے۔

<u>دہشت گردی جدیدیت کا عالمی ردعمل ہے</u>

مغرب عالم اسلام کی چھوٹی موٹی عسکریت پسند تنظیموں کے چند سو مقتولوں کو عالمی مسئلے کے طور پر پیش کرتا ہے جب کہ دہشت گردی کا اصل سبب کچھ اور ہے مہتا لکھتا ہے کہ اس کا سبب مغرب کی عسکریت پسندی، ترقی، ملٹرائزیشن ہے پوری کتاب اسی محور پر لکھی گئی ہے وہ لکھتا ہے کہ ریاستوں کے مابین کوئی جنگ نہیں دنیا بھر میں ریاستوں کی اپنے ہی عوام کے خلاف جنگ جاری ہے یہی جدید ریاستوں کی حکمت عملی ہے اپنے عوام ہی ریاستوں کا نشانہ ہیں۔

یہ جنگیں جدیدیت ،جمہوریت یا قوم پرستی کے فتنوں کا نتیجہ ہیں روس امریکا برطانیہ نے غیر فطری طور پر دنیا کو قومی ریاستوں میں تبدیل کر کے ان کو منشور انسانی حقوق کے ذریعے حقوق کی سیاست میں مبتلا کر کے دنیا کے ہر ملک میں آگ، خاک، خون کا جہنم دہکا دیا ہے یہ قیامت تک دہکتا رہے گا۔

جدید ریاست میکس ویبر کے اصول پر چلتی ہے یعنی تشدد پر صرف ریاست کا اجارہ ہے۔ریاست جو چاہے کر سکتی ہے فرد، اجتماعیت، خاندان، قبیلہ کچھ نہیں کر سکتا وہ صرف اطاعت کرے سمعنا و طعینا وجے مہتا لکھتا ہے

Global peace index noted that the fountain of violence was no longer interstate but wars between repressive governments and the people they rule [p. 14 chapter 11]

دہشت گردی صرف پاکستان کا مسئلہ نہیں عالمی مسئلہ ہے پوری دنیا دہشت گردی کے نرغے میں ہے مگر میڈیا اسے اسلام سے جوڑ رہا ہے۔

ایک اہم کتاب Global Terrorism پڑھ لیجیے یا طلال اسد کی کتاب On sucide bombing پڑھ لیجیے۔

وجے مہتا لکھتا ہے کہ آدھی دنیا حالت جنگ، مصیبتوں اور قحط سالی و بھوک کی آفتوں میں گرفتار ہے۔

military industrial trading relation that kept half of the world in a state of war misery and starvation[p. 164]

<u>دہشت گرد کون پاکستان یا اسلام یا مغرب؟</u>

امریکہ کا صدر ٹرمپ اور امریکہ کے مخالف چین بھارت روس برازیل وغیرہ نے برکس کے اجلاس میں پاکستان کو دنیا کا بدترین دہشت گرد ملک ثابت کر رہے ہیں پاکستانی وزیر خارجہ نے اپنے بیان میں ٹرمپ کے الزامات اور چین میں ہونے والے برکس اجلاس کے لگائے گئے الزامات کی تصدیق کرتے ہوئے بے شرمی سے کہا کہ اپنا گھر ٹھیک کرنا ہوگا انہوں نے کہا دنیا ہماری طرف انگلیاں اٹھا رہی ہے۔ معاملات بہتر کرنے کی ضرورت ہے کیا ہم اسی چکر میں لگے رہیں انہوں نے پاکستانی فوج کو دہشت گرد تنظیموں کا سرپرست قرار دیا (جنگ ۶ستمبر ۲۰۱۷ء) اس کے برعکس ترجمان دفتر خارجہ نے برکس اجلاس کے اعلامیہ میں عائد تمام الزامات کی تردید کردی۔

بے چارے وزیر خارجہ کو یہ کہنے کی جرات نہ ہوئی کہ پاکستان مغرب کے تمام ملکوں اور سلامتی کونسل کے پانچ ملکوں کی مشترکہ دہشت گردی کے سامنے کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتا۔ تم نے جو دہشت گردی کی ہے اور کر رہے ہو اس کی تاریخ کیا ہے وہ پڑھ لو۔ امریکہ نے کمیونسٹوں کے ساتھ کیا کیا؟ Black Panthor تحریک کے لاکھوں کارکن ایک رات میں کہاں غائب ہو گئے اس نے عراق میں کیا کیا؟ بش نے عراق پر حملہ کیا پھر کہا عراق پر حملہ ہماری غلطی تھی ہمیں غلط اطلاعات دی گئیں مگر عراق چھوڑنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ عراق پر حملہ ہماری غلطی تھی لیکن عراق کو چھوڑ دینا اس سے بڑی غلطی ہوگی یہ ہے امن کے علم بردار امریکہ کی تاریخ لیکن غلام قوم کا وزیر خارجہ یہ نہیں کہہ سکتا۔

Global Politics کا مصنف لکھتا ہے کہ مغرب کی پانچ صدیوں کی خوں ریز تاریخ میں سے انیسویں اور بیسویں ــــ گزشتہ دو صدیوں میں سب سے زیادہ جنگیں لڑی گئی ہیں ہم تاریخ انسانی کے بدترین دور میں رہ رہے ہیں یہ دور۔ جدیدیت (ماڈرن ازم) کا پیدا کردہ دور ہے جو نہایت سفاک، درندہ صفت اور وحشی ہے۔

It has been suggested that since 3600 B.C., there have been only 292 years without

war, and each decade since 1816 has averaged twenty-two wars.It is estimated that more than 150 million people have died from war-related deaths since 3000 B.C.

"Each of the centuries prior to the sixteenth accounted for less than 1 percent of all war deaths. In fact all of them added together accounted for little more than 4 percent of these deaths, while almost 96 percent of war deaths were estimated to occur in the modern period of history, 1500-2000."Seventy-three percent of all war-related deaths since 3000 B.C. have occurred in the twentieth century A.D." Civilian deaths have been a large part of the increase in war deaths. According to UN Secretary General Kofi Annan, "UN sources estimate that at least three-quarters of the casualties of recent conflicts have been civilians, though the precise numbers are not known. " Over half of the civilians, though war victims of the past decade have been children, including two million dead and six million physically disabled since 1990.

Most of the war throughout history have occurred in the past two centuries. perhaps more disturbing.

from the point of global security, it is a shocking fact... that in some ways we are living through one of the worst decades in modern history. The 1970s were the decade with the most war onsets of all types. This was not an insolated spike, as 1960s and 1980s were also worse decades than average. And while the data for the 1990s are not complete, the 1990s will likely win the dubious distinction of being one of the two most war-prone decades [along with the 1970s] since the Congress of

Vienna. [Juliet Kaarbo . -James Lee Ray Global Politics, Wadsworth publishing 10 edition (Febuary 2010)chap 5 International Confilct p.162,163]

وزیر خارجہ صاحب اپنے انٹرویو میں امریکہ مغرب اور برکس کی خدمت میں یہی حوالہ پیش کردیتے کہ تم کس منہ سے ہمیں برا بھلا کہہ رہے ہو ہم بہت برے ہیں مگر تمہارے جیسے نہیں تم سے بہتر اور برتر ہیں تمہارے بلند مقام تک پہنچنے میں ہمیں صدیاں لگیں گی وہ امریکی ریاستی فلسفی رچرڈ رارٹی کی طرح یہی کہہ دیتے کہ یہ ٹھیک ہے کہ ہم نے غلطیاں کی ہیں ہم نے اپنے آپ کو معاف کردیا ہے رارٹی نے اپنی کتاب Achieveing our country میں یہی کہا تھا آپ کے اندر تو رارٹی جیسی جرات اور بصیرت بھی نہیں ہے۔

وجے مہتا لکھتا ہے بیسویں صدی میں دوسو پچاس سے زیادہ جنگیں لڑی گئیں اور ۱۶۰ ملین لوگوں کا قتل عام ہوا ایک صدی تک کمیونزم، سوشلزم، فاشزم کے نام پر یہ قتل عام ہوتا رہا یہ سب ازم ماڈرن ازم کے ہی نظریے تھے۔ جدیدیت اور ترقی نے دنیا کو قتل وخون کے سوا کچھ نہیں دیا یہ تمام ازم بہار کے پھولوں کی طرح لہلہائے پھیلے اور دنیا کو تاخت وتاراج کرنے کے بعد ختم ہوگئے۔

In the twentieth century over 250 wars were fought and 160 million lives were lost. Militarism survived and thrived throughout a century in which communism, socialism and fascism all blossomed, withered and died. The broken, artificial states created by European colonialists in the twentieth century are the war-zones of the twenty first century. Over two billion people subsist on less than $2 a day. Every 3.6 seconds, a person dies of starvaion. Every 30 seconds a child dies of malaria. Every minute a women dies in childbirth.[p.4]

پاکستان پر دہشت گردی کے الزام عائد کرنے والے چین کا حال مہتا کی کتاب کے آٹھویں باب میں موجود ہے وہ لکھتا ہے کہ فروری ۱۹۷۹ء کو ویت نام میں چین نے اپنی ڈھائی لاکھ فوج ایک محدود حملے کے لیے داخل کی اس کا مقابلہ ویت نامی سرحدی ملیشیا نے کیا گوریلا جنگ کے ذریعے انہوں نے تریسٹھ ہزار چینی فوج کا قتل عام کردیا ایک برطانوی سفارت کار نے چینی حکومت کو اتنی بڑی ہزیمت میں مرنے والے فوجیوں کی تعداد سے آگاہ کیا تو چینی جنرل نے ہنستے ہوئے جواب دیا ہماری آبادی بہت ہے ہمارے پاس افرادی قوت کی کمی نہیں۔

A British Diplomate who posed this figure to Chinese general said the commander merely laughed and replied we have a lot of people. [p. 109]

تریسٹھ ہزار لوگوں کی موت جدید ریاست کے لیے کوئی حادثہ نہیں تھا۔جس ریاست کی یہ حالت ہو وہ پاکستان پر کیا تبصرہ کر سکتی ہے؟

وجے مہتا کے خیال میں دنیا بھر میں غربت،تشدد،دہشت گردی بدامنی خون خرابے قتل عام تباہی و بربادی آفت و ہلاکت قحط بھوک افلاس کا اصل سبب مغربی قوموں کے ملٹری انڈسٹریل کمپلکس ہیں وہ کہتا ہے کہ اگر مغربی قومیں تیسری دنیا میں اور غیر ترقی یافتہ دنیا میں چین کے ترقیاتی ماڈل کو پھیلنے دیں گی تو دہشت گردی ختم ہو جائے گی دنیا بھر میں دہشت گردی کا سبب مغرب کی عسکری اور معاشی دہشت گردی ہے۔وہ لکھتا ہے کہ مغرب کا یہی نظام دہشت گردوں کو پروان چڑھاتا ہے۔لیکن وجے مہتا یہ نہیں بتاتا کہ چین کے ماڈل کے پھیلنے کے نتیجے میں چین میں کیا تباہی آئی ہے خاندانی نظام،اقدار و روایات،ماحولیات،تعلقات،رشتے سب کچھ کس طرح تباہ و برباد ہو گئے ہیں اور بیس سال میں چین نے وہ تباہی خود پیدا کر لی ہے جو مغرب نے تین سو سال میں حاصل کی تھی۔جیرڈ ڈائمنڈ کی کتاب The Collaps کا چین پر باب پڑھ لیا جائے جو بتاتا ہے کہ چین کے تمام دریا صنعتی فضلے سے زہریلے ہو گئے ہیں صاف تازہ ہوا میں سانس لینا مشکل ہے ماحولیاتی بربادی اس کے سوا ہے۔

Human security can only be enhanced by adopting a strategy of disarmament and demiltarisation, freeing up resources for constructive economic political and cultural development.

The book explores the questions: why does the West sell weapons to its enemies? Where did Iraqis learn to make roadside bombs?

It shows how Europe and the US conspire with local dictators to prevent their countries from developing advanced industries and how this system has incubated a global terrorist threat.

Fifty years after President Dwight D. Eisenhower warned of a military indusrial complex and a decade after 9/11 it shows how freedom of speech and national inerests are subordinated to the interests of military industrialelites, creating a global economics of killing.

While outlining the crippling human and economic toll of this systemic economic abuse, the book shows how the military industrial model can be replaced

by adopting equitable policies for Disarmament Demilitarisation and working for sustainable developent thus ending the cycle of violence and poverty.[p. 4,5]

ہمیں وجے مہتا کے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے۔ کہ مغرب پوری دنیا میں چینی ترقی کے ماڈل کو عام کردے تو تشدد دہشت گردی کا خاتمہ ہوجائے گا کیوں کہ سائنس وٹکنالوجی یا ٹیکنو سائنس یا scientism یا سائنٹفک امپریل ازم کا اصل سبب ماخذ اور منبع مغرب کا ملٹری ازم اور ملٹری انڈسٹریل کمپلکس ہیں۔ جوہری توانائی سیٹلائٹ، کمپیوٹر، موبائل، پینٹا گون کی ایجاد ہیں عسکری مقاصد ریاستی سرپرستی اور سرمایہ کی فراہمی نے ہی سائنس کو اتنا بلند مقام عطا کیا ہے بیسویں صدی کی تمام اہم ایجادات عسکریت اور سرمایہ دارانہ سودی نظام کے بطن سے نکلی ہیں ان ایجادات کے بغیر زبردست ترقی ناممکن ہے سائنس کو سرمایہ اور ریاست کی سرپرستی سے الگ کردیجیے اس کا پھولتا پھلتا ہوا غبارہ ایک لمحے میں پھٹ جائے گا۔ اسی لیے فیرابینڈ اپنی شاہ کار کتاب Against Method میں لکھتا ہے کہ جدید ریاست سائنس کی سرپرستی ختم کردے۔ وہ لکھتا ہے کہ جدید سائنس اور افریقہ کے کالے جادو میں کوئی فرق نہیں ہے It works بس

دنیا میں ردعمل کی ہزاروں عسکری تحریکوں کی جانب سے تشدد کا سبب مغرب کی جانب سے صرف اپنی اقدار روایات، عقیدوں، اداروں کا دنیا بھر پر جبراً تسلط ہے اور کوئی اس تسلط کو قبول کرنے پر تیار نہیں۔

مغرب نے کالونیل ازم کے خاتمے کے بعد soft Power کے ذریعے پوری دنیا کو لوگوں کے ذہنوں کو کالونائز کردیا ہے۔

یہ تہذیبوں اور اقدار کا بھی ردعمل ہے خود امریکہ میں کئی متشدد گروہ موجود ہیں سانڈل نے اپنی کتاب Justice میں اوکلاھاما یونیورسٹی کے ریاضی کے پروفیسر یونا بامبر کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جس نے ٹکنالوجی اور سائنس کے خلاف کتاب لکھی تھی سائنس دانوں کو قتل کیا وہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی سے نفرت کرتا تھا آخر کار اسے اس کے بھائی کی مدد سے گرفتار کرلیا گیا۔ اور موت کی سزا سنادی گئی۔

عالمی غربت کے موضوع پر ایک اہم کتاب

Let them Eat Junk: How Capitalism Creates hunger & Obesity کا مطالعہ کیجئے۔ قوم پرستی اور جدیدیت کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے A.D. Smith کی کتاب Nationalism & Modernism کا مطالعہ کیجئے۔ مغرب کی تباہی کے لئے Nomi Orecses کی کتاب The Collaps of westren civilization اور ماحولیاتی بربادی کے لئے N.Clane کی کتاب The Climate Vs Capitalism پڑھیے۔

<u>جدید ریاست سائنس سرمایہ اور ترقی کے جھوٹے خواب</u>

جدید ریاست سائنس اور سرمایہ کی تنظیم کا ہی نام ہے تاکہ ترقی ہوسکے لہٰذا ترقی کا کوئی جدید ماڈل قرضے کے بغیر سود کے بغیر اور دوسروں کا

استحصال کیے بغیر کام نہیں کرسکتا سب سے زیادہ ترقی امریکہ نے کی ہے دنیا میں سب سے زیادہ قرضہ بھی امریکہ پر ہے تمام ترقی یافتہ قومیں جاپان جرمنی برطانیہ چین روس فرانس اربوں کھربوں ڈالر کے۔اندرونی بیرونی قرضوں میں جکڑے ہوئے ہیں نائیل فرگوسن نے اپنی کتاب The Great Degeneration میں امریکہ کے بارے میں لارنس کوٹلی کاف کے حوالے سے لکھ دیا ہے کہ امریکہ اپنے قرضوں کے خاتمے کے لیے موجودہ ٹیکسوں کی شرح میں یا تو فوری طور پر ۶۴ فی صد اضافہ کردے یا وفاقی اخراجات میں فوری طور پر چالیس فی صد کمی کردے۔

......to eliminate the fadral government fiscal gap would require an immediate 64 percent increase in all Taxes or an immediate 40 percent cut in all fedral expenditures [Niall Ferguson, p. 42]

امریکی شہری چالیس فی صد تنخواہ ٹیکس میں دیتے ہیں ۶۴ فی صد ٹیکس اضافے کا مطلب یہ ہے کہ وہ پوری تنخواہ حکومت کو دے دیں۔اور اس کے بعد بھی اپنی جیب سے کچھ اور رقم حکومت کو مہیا کریں تاکہ ترقی ہوتی رہے۔

سوال یہ ہے کہ قرضوں سے فائدہ تو آج کی نسل اٹھائے گی لیکن قرضوں کی ادائیگی وہ آنے والی نسلیں کریں گی جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئیں یہ کیسی جمہوریت ہے کہ ان نسلوں سے پوچھے بغیر ان کی رائے معلوم کیے بغیر قرضے استعمال کر لیے گئے اور ان قرضوں کا بوجھ مستقبل کی نسلوں پر منتقل کر دیا گیا مغربی جمہوریت اسی تماشے کا نام ہے UNO جو دنیا بھر پر جمہوریت مسلط کر رہا ہے غیر جمہوری حکومتوں پر پابندیاں عائد کرتا ہے خود اس کا نظام غیر جمہوری ہے اگر سب مساوی ہیں تو UNO کے دوسو سے زیادہ اراکین میں سے صرف پانچ بڑے طاقت ور ملک سلامتی کونسل کے رکن کیوں ہیں؟ یہ مساوات کا انکار ہے سلامتی کونسل میں بھی جمہوریت نہیں ہے کیوں کہ اگر چار اراکین ایک طرف ہوں تو صرف ایک رکن ان چار کے مشترکہ نقطۂ نظر کو ویٹو کرسکتا ہے یعنی جمہوریت پر خود UNO کو یقین نہیں ہے وہ غیر جمہوری طریقے سے چلائی جارہی ہے مگر دنیا کے تمام ممالک ،تمام سیکولر،لبرل ،مذہبی مفکرین جمہوریت کے قصیدے پڑھ رہے ہیں جو ادارہ دنیا پر جمہوریت مسلط کر رہا ہے وہ خود جمہوریت پر عمل نہیں کرتا مگر کوئی لبرل سیکولر مفکر UNO پر تنقید نہیں کرتا UNO کا غیر جمہوری ادارہ تنقید سے ماوراء ہے اس موضوع پر نہ کوئی لکھتا ہے نہ بحث کرتا ہے یہ ڈسکورس کی طاقت ہے۔سب اس کے سامنے سر بہ سجدہ ہیں۔

غالب ڈسکورس جو چاہے کہتا ہے جو چاہے کرتا ہے اس سے مرعوب مغلوب قومیں اس کے تضادات پر بھی تنقید کرنے کی جرات نہیں رکھتیں غلام قوموں کا یہی حال ہوتا ہے غلامی Mimic Self تخلیق کرتی ہے ایسا نفس اور ایسا وجود جو اپنے ذلیل اور ظالم آقا کی بھونڈی نقالی میں فخر محسوس کرتا ہے۔

جدید سائنس، سرمایہ، انسانی حقوق، ہر تہذیب کی اقدار کیوں بدل دیتے ہیں؟

ترقی کے تمام اسلامی ماڈل سود اور قرضے پر مبنی ہیں

ایران، ملیشیا، ترکی، سعودی عرب، پاکستان کے تمام اسلامی ترقیاتی ماڈل بھی سود سٹے قرضے پر مبنی ہیں ترقی اور قرضہ ترقی اور سائنس ترقی اور ملٹری انڈسٹریل کمپلکس لازم و ملزوم ہیں جب تک دنیا آزادی اور ترقی کے ذلیل مغربی عقیدے سے دستبردار نہیں ہوگی دہشت گردی جاری رہے گی۔ دہشت گردی کا کسی مذہب کسی قوم کسی نسل سے کوئی تعلق نہیں یہ جدیدیت جدید ریاست قوم پرستی جمہوریت سرمایہ داری آزادی اور ترقی کے عقیدوں کا پیدا کردہ عالمی ردعمل ہے اور ردعمل کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا Reaction has no ideology لیکن ردعمل کرنے والے لازماً کسی نہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہیں لہٰذا اس تشدد کا الزام اس مذہب پر لگادیا جاتا ہے مثلاً برما میں تشدد کرنے والے اتفاق سے بدھ مذہب کے ماننے والے ہیں لہٰذا عالمی میڈیا یہ تاثر دے رہا ہے کہ بدھ مت اور اسلام کے مابین کوئی مذہبی جنگ برپا ہے جب کہ بدھ مت دنیا کا پرامن ترین مذہب ہے۔ اس میں جانور کو مارنے کی اجازت نہیں تو بدھ مت کسی انسان کو مارنے کی اجازت کیسے دے سکتا ہے۔

مسلمان کو مارنے والے برمی بدھ اصلاً مذہبی نہیں ہیں وہ سول سوسائٹی جدید ریاست اور انسانی حقوق کی پیدا کردہ مخلوق ہے جس کی زندگی کا مقصد صرف ترقی، افادہ پرستی، لذت پرستی اور انفرایت پرستی Utallitariarism/Hedonism/Individualism Development] کے فلسفوں پر عمل کرنا ہے۔

جمہوریت اور لبرل ازم اور قومی ریاست کی کامیابی یہی ہے کہ لوگ تشدد کے اصل سبب کو جاننے کے بجائے اس کا الزام مذہب نسل علاقے زبان کے اختلافات پر عائد کر دیتے ہیں۔

جدید انسان ایسا ہی ہوتا ہے مارکوزے اسی لیے جدید انسان اسے One dimensional man یک رخا آدمی کہتا ہے، جس کی نظر صرف اور صرف اپنے مادی، معاشی، مالی، دنیاوی فائدے پر ہوتی ہے جو زیادہ سے زیادہ منافع چاہتا ہے اور اپنے سرمایے اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافے کا طالب ہوتا ہے اس کی خاطر یہ اپنے مذہب، اقدار، روایات قوم، ملک، شہر، گھر، رشتہ دار، خاندان، قبیلے، تہذیب، زبان، برادری، بیوی، بھائی، بہن حتی کہ ماں باپ اور بچوں کو بھی چھوڑ دیتا ہے اسی لیے مغرب میں Old Homes اور نرسنگ ہوم بنائے گئے ہیں چین اور ہندوستان نے ترقی کے ذریعے جدید بننے کی کوشش کی تو تیس سالوں میں دونوں ملکوں کی تعلیم یافتہ اور ترقی یافتہ نسل نے جو ہدایت یافتہ نہیں تھی اپنے ماں باپ کو گھروں سے نکال کر پھینکنا شروع کیا لہٰذا دونوں ملکوں نے Parents Protection Act بنائے جس کے تحت ماں باپ کی خدمت کرنا ان کو گھر میں رکھنا لازمی ہے نکالنے والے کو جرمانے قید جیل کی سزا ہو سکتی ہے جدید انسان اتنا خبیث ہوتا ہے یہ جدیدیت کا نتیجہ ہے مذہب کا نہیں۔

سوال یہ ہے کہ دنیا کے جس معاشرے تہذیب ملک میں جدید سائنس، جمہوریت، سرمایہ دارانہ نظام، ترقی، جدید تعلیم اور مذہب انسانی

حقوق گئے ان معاشروں تہذیبوں کی تمام اقدار روایات عقائد رویے طریقے سب بدل گئے سوال صرف یہ ہے کہ اگر سائنس، جمہوریت، سرمایہ داری، انسانی حقوق، جدید تعلیم غیر اقداری value nutral ہیں تو یہ دوسری تہذیبوں معاشروں کی اقدار کیوں بدل دیتی ہیں؟

جدید ریاست جس ٹیکنو سائنس کو خدا کے درجے پر فائز کر رہی ہے اس کی حقیقت ورلڈ فلاسفیکل کانگریس کے صدر اور ہائیڈ یگر کے استاد ہزرل نے اپنی کتاب The critique on European sciences میں ہائیڈ یگر نے ۱۹۲۶ء میں اپنی کتاب Question Concerning Technology میں فرانسیسی فلسفی جے الول Illul نے اپنی کتاب The Technological Society میں ممفرڈ نے اپنی بے شمار کتابوں میں واضح کر دی ہیں افسوس ہے کہ عالم اسلام میں کوئی ان مباحث کو پڑھنے پر تیار نہیں ان مباحث کو آسان طریقے سے سمجھنے کے خواہش مند اگر ضیاء الدین سردار کے مضامین پڑھ لیں یا Niel Pstman نیل پوسٹ مین کی کتاب Technopoly پڑھ لیں جس میں پوسٹ مین نے ہائیڈ یگر کی کتب کے مباحث کو آسان کر کے پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ٹکنالوجی خدا کی جگہ لے چکی ہے انسان خدا کے بجائے اب صرف ٹکنالوجی کا محتاج ہے وہ اس کا عبد ہے اس کی تقلید کرتا ہے صرف اس سے ہدایت لیتا ہے صرف اس کا غلام ہے پوسٹ مین نے بتایا کہ تمام تہذیبیں خواہ مذہبی الہامی ہوں یا روایتی وہ اپنے عقیدے سے رہنمائی لیتی تھیں۔ ان کا عقیدہ زندگی کے ہر دائرے کو تمام آلات کو اپنے تابع رکھتا تھا آلات Technology انسان کے تابع تھے انسان ان کے تابع نہیں تھا۔

that all such cultures are either theocratic or "unified by some metaphysical theory", which forced tools to operate within the bounds of a controlling ideology and made it "almost impossible for technics to subordinate people to its own needs".

جدید عہد ٹیکنو سائنس کا عہد ہے جہاں انسان آلات کا ٹیکنو سائنس کا غلام بن چکا ہے ٹکنالوجی خدا کی جگہ لے چکی ہے کانٹ نے کہا تھا کہ انسان کسی مقصد کا ذریعہ نہیں وہ خود بذاتہ مقصد ہے End in himself ہے لیکن ہائیڈ یگر اور نیل پوسٹ مین بتاتے ہیں کہ انسان ٹکنالوجی کا غلام بن چکا ہے۔ وہ سرمایہ کے مقصد کا آلہ کار ہے وہ خود مقصد نہیں رہا، اس کی زندگی صرف سرمایہ میں اضافے کے لیے وقف ہے پوسٹ مین لکھتا ہے

Technopoly as a society in which technology is deified, meaning “the culture seeks its authorisation in technology, finds its satisfactions in technology, and takes its orders from technology”.

"totalitarian technocracy", which demands the "submission of all forms of cultural life

to the sovereignty of technique and technology".

Technology establishes sovereignty over all areas of human experience based on the claim that it "'thinks' better than we can".

Monopoly of Technology are led to believe in the false "wisdom" offered by the new technology, which has little relevance to the average person.

"information appears indiscriminately, directed at no one in particular, in enormous volume at high speeds, and disconnected from theory, meaning, or purpose".

جدید انسان، جدید ریاست، خدا کی جگہ۔صرف اور صرف سرمایہ، جدید ٹکنالوجی اور مذہب انسانی حقوق کی عبادت میں مصروف ہے۔جس کا نتیجہ یہ تشدد، دہشت اور بہیمیت ہے۔اس کا اسلام پاکستان اور پاکستانی یونیورسٹی سے کوئی تعلق نہیں۔

قانون زکوۃ کے بارے میں غامدی صاحب کے متناقض Oxymoron اصول

کراچی میں محاضرات میزان ۱۹۹۸ء پر انجینئر یوسف کے گھر پر غامدی صاحب کی گفتگو

سید خالد جامعی

احادیث کی کتابوں میں زکوٰۃ کی شرح پانچ اور دس فی صد ہے: ہم نے دوسو حوالے جمع کیے ہیں: غامدی

کوئی شخص انفرادی طور پر کسی کو زکوٰۃ سپرد نہیں کر سکتا اموال باطنہ میں فرد کو تصرف کا حق نہیں: غامدی

ہر فرد اپنی زکوٰۃ، عشر، صرف اور صرف ریاست کے بیت المال کو دینے کا پابند ہے: غامدی

زکوٰۃ ایک فرد کو بھی اور عوامی فلاح و بہبود کے لیے ادارے کو اجتماعی فائدے کے بھی لیے دی جا سکتی ہے: غامدی

جو شخص دس اور پانچ فی صد کی شرح سے زکوٰۃ ادا کرتا ہے وہ ٹیکس کی رقم منہا کر سکتا ہے: غامدی

قرآن نے ریاست کو ٹیکس لگانے کا اختیار نہیں دیا عوام کو اختیار ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ٹیکس لگائیں: غامدی

اگر زکوٰۃ کی شرح صرف ڈھائی فی صد ہوتی تو اسلامی خلافت کیسے چل سکتی تھی: غامدی

پارلیمنٹ وہ ادارہ ہے جو خالق و مخلوق کی رضا کا سنگم ہے یہ ٹیکس عائد کرے تو جائز ہوگا: غامدی

عہد رسالت میں روزانہ ماہانہ اجرت کو پیداوار ہی تصور کیا جاتا تھا اور اس پر زکوٰۃ عائد تھی: غامدی

ماہانہ تنخواہ پیداوار ہے اس پر پانچ فی صد یا دس فی صد کے حساب سے زکوٰۃ عائد ہوگی: غامدی

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنے ماہانہ معاوضے پر بیت المال کو زکوٰۃ ادا کرتے تھے اور عاملین سے زکوٰۃ لیتے تھے: غامدی

وارث کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی قرآن حدیث اور اسوۂ رسول نے ممانعت کی ہے: غامدی

اموال باطنہ پر ٹیکس انفرادی اور اموال ظاہرہ پر ٹیکس اجتماعی تھا مگر یہ غلط تھا ٹیکس صرف ریاست لے سکتی ہے: غامدی

اموال ظاہرہ و باطنہ کی فقہی تقسیم صرف فقہاء کی بدعت و ضلالت ہے شریعت اس سے ناواقف ہے: غامدی

حضرت ابوبکر اور تمام خلفاء اور تمام عمال حکومت اپنی تنخواہوں پر زکوٰۃ دیتے تھے: غامدی

اضافی گھر جو استعمال میں نہ ہوں اور وہ گھر جو کرایہ پر دیئے گئے ہوں ان پر لازماً زکوٰۃ عائد ہوگی: غامدی

تمام سرکاری اخراجات اور ملازمین کی تنخواہیں زکوٰۃ سے ادا ہوں گی: غامدی

ریاست زکوٰۃ کی کم از کم حد مقرر کر سکتی ہے وہ رسول کی نیابت کرتی ہے: غامدی

میں نے زکوٰۃ کا جو قانون بیان کیا ہے وہ قرآن و سنت اور تاریخ سے ثابت شدہ ہے: غامدی

"میزان" میں زکوٰۃ پانچ فی صد دس فی صد شرح کے حساب سے زکوٰۃ کے تمام حوالے جلد آرہے ہیں: غامدی

عہد رسالت میں اجرت پیداوار سمجھی جاتی تھی اس پر زکوٰۃ تواتر، تعامل، اجماع امت سے ثابت ہے: غامدی

جناب جاوید احمد غامدی صاحب ۱۹۹۸ء میں کراچی تشریف لائے اور دانش سرا سنو وہائٹ چیمبر بہادر آباد میں ۱۹ مارچ سے ۲۸ مارچ تک میزان پر پہلے محاضرات پیش کیے ان محاضرات کے دو سال بعد سن دو ہزار میں "میـــزان" دارالاشراق ۱۲۳بی ماڈل ٹاؤن سے طبع ہوگئی جس میں درج ذیل ابواب تھے۔ (۱) اصول مبادی (۲) قانون سیاست (۳) قانون معیشت (۴) قانون دعوت (۵) قانون جہاد (۶) حدود وتعزیرات (۷) رسوم و آداب (۸) قسم اور کفارہ قسم

واضح رہے کہ غامدی صاحب ۱۹۸۵ء میں میزان حصہ اوّل بھی شائع کر چکے تھے لیکن اس کے باوجود ۲۰۰۸ء میں جب میزان شائع ہوئی تو اس کے خاتمے میں ان کے دعوے پڑھ کر حیرت ہوئی لکھتے ہیں۔

میزان کی تصنیف کا کام جو ہیں ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع کیا تھا وہ آج سترہ سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا۔[غامدی میزان طبع اول ص ۲۰۰۸،۶۴۸، غامدی میزان ۲۰۱۵ طبع دہم ص ۶۵۰ لاہور المورد] حیرت ہے کہ میزان ۱۹۸۵ء میں اور ۲۰۰۰ء میں شائع ہو چکی مگر غامدی صاحب لکھتے ہیں کہ میں نے میزان ۱۹۹۰ء میں لکھنی شروع کی جواب ۲۰۰۷ء میں مکمل ہوئی۔ کتاب حضرت نے ۱۹۹۰ء میں لکھنی شروع کی اور وہ لکھے جانے سے پہلے ۱۹۸۵ء میں دارالاشراق سے غامدی صاحب نے خود شائع بھی کر دی یہ عجیب Paradox ہے۔

۱۹۹۸ء میں جب غامدی صاحب میزان کے محاضرات کے سلسلے میں کراچی تشریف لائے تو جناب شکیل الرحمان اور جناب ڈاکٹر طارق سجاد کی وساطت سے پہلی مرتبہ غامدی صاحب سے ملاقات ہوئی کئی نشستیں ہوئیں اور تبادلۂ خیالات بھی ہوا محاضرات میں انھوں نے قانون معیشت اور زکوٰۃ پیش کیا تو اس کی تفصیلات کے لیے ایک الگ علمی نشست منعقد کی گئی یہ نشست کے ڈی اے کے چیف انجینئر محمد یوسف صاحب کے گھر (کے ڈی اے آفیسرز ہاؤسنگ سوسائٹی) میں منعقد ہوئی جہاں اہلِ قرآن کا ہفتہ وار درس قرآن پابندی سے منعقد ہوتا تھا اتوار کے دن اس وقت مولانا طاہر مکی یہ درس دیتے تھے اس سے پہلے مولانا حبیب الرحمان کاندھلوی اس مسند پر رونق افروز ہوتے تھے۔ اس علمی نشست میں غامدی صاحب سے بہت سے علماء نے بھی سوالات کیے۔ قانون زکوٰۃ سے متعلق اس نشست کی روداد جون ۲۰۰۸ء کے ساحل میں شائع ہو چکی ہے اسے دوبارہ پیش کیا جارہا ہے۔

کراچی میں میزان پر ہونے والے محاضرات میزان کا پہلا علمی تعارف تھے۔ اپریل ۱۹۹۸ء اور مئی ۱۹۹۸ء کے ساحل میں محاضرات میزان کی دو قسطیں شائع ہوئی تھیں ان قسطوں پر علماء کی جانب سے بے شمار سوالات کیے گئے جو غامدی صاحب کو جوابات کے لیے ارسال کیے گئے لیکن غامدی صاحب مصروفیات کا عذر کر کے ان سوالوں کا جواب دینے سے محترز رہے لہٰذا محاضرات کی دوسری قسطوں کی اشاعت کا سلسلہ ختم کر دیا گیا۔ قانون زکوٰۃ پر غامدی صاحب کے جوابات غیر علمی اور بے بنیاد ہیں انھوں نے زکوٰۃ کی پانچ اور دس فی صد کی شرح کے بارے میں اسلامی تاریخ سے جتنے بھی حوالے دیئے ہیں وہ سب غلط ہیں اپنے دعوے کے مطابق انھوں نے میزان کی اشاعت ۲۰۰۰ء، ۲۰۰۱ء اور اشاعت ۲۰۰۸ء، ۲۰۱۵ء میں ایک حوالہ بھی اسلامی مصادر یا احادیث سے پیش نہیں کیا اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ غامدی صاحب عربی زبان سے بہت زیادہ واقف نہیں وہ عربی لکھنے پر قادر نہیں۔ ۲۰۰۶ء میں ان کی کتاب مقامات اردو، عربی، انگریزی میں آئی تو اس میں شامل ان کا پہلا عربی مضمون "شرح شواهد الفراهي" چھ سو اغلاط کا دفتر تھا ساحل نے اپریل ۲۰۰۷ء میں ان کی عربی دانی کی حقیقت کھول کر رکھ دی تو بازار سے یہ کتاب غائب کرادی گئی انھوں نے اشراق میں بسم اللہ کی عربی تفسیر شائع کی وہ بھی اغلاط کا مرکب ہے۔ اہل علم نے ان کی عربی پر توجہ نہیں دی۔

زکوٰۃ پر غامدی صاحب کے سوال و جواب ذیل میں ملاحظہ فرمائیے۔

سوالات و جوابات

سوال: غامدی صاحب محاضرات میــزان میں آپ نے زکوٰۃ کے قانون اور قانون معیشت کے حوالے سے جو کچھ بتایا وہ ہمارے لیے بالکل نیا تجربہ تھا ہم درخواست کریں گے کہ آپ ہمیں از سرِ نو بتائیں کہ زکوٰۃ کا فلسفہ کیا ہے؟

جواب: زکوٰۃ' انفاق فی سبیل اللہ کا وہ حصہ ہے' جو ایک مسلمان کے لئے اپنی اسلامی ریاست کو دینا لازم ہے تا کہ ریاست اس سے نظم اجتماعی کے اخراجات چلا سکے زکوٰۃ کسی فرد ادارے کو نہیں دی جا سکتی یہ صرف بیت المال کو ادا کی جائے گی ہم سے پہلے امتوں میں زکوٰۃ معبد کے خادموں کے سپرد کر دی جاتی تھی تا کہ وہ معبد میں عبادت کے لیے آنے والوں کی خدمت کریں ہماری شریعت میں سابقہ شریعتوں کا طریقہ کار باقی نہ رہا اب زکوٰۃ صرف اور صرف حکومت کے بیت المال کو ادا کی جائے گی۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد صدقہ، خیرات یعنی انفاق فی سبیل اللہ ایک فرد کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ اگر آدمی ذاتی ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا' تو اس کی سزا آخرت میں اسے ملے گی' لیکن ریاست اس معاملے میں کوئی مداخلت نہیں کر سکتی۔ زکوٰۃ کا یا معیشت کا جو قانون میں نے محاضرات میں پیش کیا ہے اس کی تفصیل آپ ہمارے کتابچے قـانـون معیشت میں پڑھ سکتے ہیں میزان جو زیر تصنیف ہے انشاء اللہ اس میں مزید اضافے اور تفصیلات اور تفصیلی حوالہ جات آئیں گی (انشاء اللہ)

ریاست کو پروردگار نے صرف اور صرف' زکوٰۃ کی شکل میں ایک لازمی ٹیکس اپنے باشندوں سے' بزورِ قوت وصول کرنے کا اختیار دیا ہے' جس کی شرحیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے' اپنی سنت کے ذریعے سے ہمیشہ کے لئے مقرر فرمادی ہیں۔ ریاست اس سے زیادہ ایک پیسہ بھی اپنے باشندوں سے بزور وصول نہیں کر سکتی۔ سورہ توبہ میں ارشاد ہے۔

''پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور نماز کا اہتمام کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔ (التوبہ ۹:۵) فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَ جَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَ احْصُرُوْهُمْ وَ اقْعُدُوْا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ فَاِنْ تَابُوْا وَ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَ اٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ[۹:۵] راہ چھوڑنے کا واضح مطلب یہی ہے کہ پھر حکومت ان سے کوئی مزید مطالبہ نہیں کر سکتی۔

سوال: زکوٰۃ تو ایک عبادت ہے' جب کہ ٹیکس تو حکومت ظلم کر کے لیتی ہے؟ عبادت کو ظلم کیسے کہہ سکتے ہیں؟

جواب: زکوٰۃ' اپنی روح کے اعتبار سے' ایک عبادت اور اللہ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار ہے اور ریاست کے اعتبار سے یہ ایک ٹیکس ہے۔ جیسے کہ نماز بھی' اپنی روح کے اعتبار سے' عبادت ہے' لیکن وہ اس کے ساتھ ساتھ اسلامی حکومت کی شرائط شہریت میں سے ایک شرط ہے۔ ٹیکس ظلم نہیں اگر اللہ کی طرف سے عائد ہو۔ ریاست زکوٰۃ کے سوا کوئی ٹیکس لوگوں کی رضامندی کے بغیر اور بغیر کسی وجہ اور ضرورت کے عائد کرے تو وہ صریح ظلم ہے۔ لیکن وہ ٹیکس جو خدا کے حکم سے رسولؐ کی سنت کے تحت ریاست وصول کرے وہ مالی عبادت ٹیکس ہے اس میں ظلم کا شائبہ نہیں۔ وہ ٹیکس جو عوام کی اجازت سے وصول کیا جائے وہ بھی ظلم نہیں ہے جب عوام اپنی رضامندی سے اپنی حکومت کو ٹیکس دے دیں تو وہ ظلم کیسے ہو سکتا ہے ریاست ٹیکس نہیں لے سکتی عوام ٹیکس کی اجازت دے سکتے ہیں۔

ٹیکس اور ظلم لازم ملزوم نہیں' حکومت عوام کی بھلائی ہی کے لئے قائم ہوتی ہے' اس لئے اس کے جائز اخراجات پورے کرنا بہت بڑا خیر ہے ۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہ اجمعین کے زمانے میں زکوٰۃ کا ایک ایک پیسہ حکومتی خزانے کو دیا جاتا تھا اور زکوٰۃ نہ دینے والا حکومت کا باغی تصور ہوتا تھا یہ جو فقہاء نے اپنے من گھڑت دین میں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ کی تقسیم کی ہے یہ قرآن وسنت کے منافی، بدعت اور ضلالت ہے۔ خیر القرون میں اس کا کوئی تصور موجود نہ تھا اللہ کا مال صرف اور صرف اللہ کی ریاست کی ملکیت تھا فرد کو اپنے مال میں اموال باطنہ کے نام پر تصرف کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس وقت انفرادی طور پر زکوٰۃ دینے کا کوئی تصور ہی نہ تھا۔ ہر وہ پیسہ جو اسلامی حکومت خدا کے حکم سے خدا کے رسولؐ کی طے کردہ شرائط کے تحت وصول کرتی ہے' ٹیکس ہی کہلاتا ہے۔ اگر اموال باطنہ کو قومی ٹیکس سے الگ کر کے انفرادی ٹیکس سمجھا جائے تو ریاست کے اخراجات کیسے چل سکتے تھے کیوں کہ زکوٰۃ کا ٹیکس پہلے ہی بہت کم تھا اموال باطنہ کی علیٰحدگی کے بعد ریاست کے اخراجات کہاں سے پورے ہوتے اس صورت میں ریاست ٹیکس لگانے کا ظلم کر سکتی تھی اسلام نے اس ظلم کا دروازہ پہلے ہی بند کر دیا لیکن خاص حالات کے تحت عوام کی اجازت سے ٹیکس لگانے کا دروازہ کھلا رکھا۔ ریاست ٹیکس نہیں لگا سکتی عوام البتہ خود پر ٹیکس لگانے کی اجازت ریاست کو دے سکتے ہیں۔

سوال: زکوٰۃ کے مصارف قرآن میں مقرر ہیں تو حکومت کے مصارف کہاں سے پورے ہوں گے؟

جواب: اگر بنظرِ غائر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں سورہ توبہ میں مقررہ آٹھ مدات میں حکومت کے تمام تر اخراجات آ گئے ہیں۔ انھیں پروردگار نے ہمارے سامنے اسی لئے بیان کیا ہے' تاکہ ترجیحاً ان کو پیش نظر رکھیں۔ مثلاً دیکھئے۔

۲۔ فقراء و مساکین: اسلامی خزانے پر سب سے پہلا حق معاشرے کے غریب اور مفلوک الحال طبقے کی فلاح و بہبود ہے۔

۳۔ عاملین علیھا: تمام سرکاری ملازمین۔ اس سے مراد صرف زکوٰۃ جمع کرنے والے عمال لینا یہ قرآن کی آیت کی تحدید، تخصیص ہے اور پیغمبر کو بھی اس طرح کا کوئی اختیار نہیں میزان کے باب اصول و مبادی میں ہم نے اس پہلو پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔

۴۔ مولفة قلوبهم: اسلام اور مسلمانوں کے مفاد میں تمام سیاسی اخراجات۔

۵۔ في الرقاب: جرمانے یا فدیے میں بندھے ہوئے سب قیدی۔

۶۔ الغارمین: نقصان' تاوان یا قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے لوگ۔

۷۔ في سبيل الله: دین کی اشاعت' تعلیم' فوج' صحت اور دین وملت کے تمام کام۔

۸۔ ابن السبیل: ذرائع آمد ورفت' مثلاً سڑکوں' پلوں اور ریل پٹڑیوں کی تعمیر' مسافروں کی بہبود کے لئے۔ مفاد عامہ، فلاح و بہبود عامہ اور اس سے متعلق تمام قومی مفادات کے کام اس دائرے میں شامل ہو جاتے ہیں۔

درج بالا آٹھ مدات میں ریاست کے تمام جائز اخراجات آ جاتے ہیں' عہد جدید کی ریاستوں کے تمام مالی مطالبات ان آٹھ مدوں میں سموئے گئے ہیں۔ حکومت کا کوئی خرچ ایسا نہیں ہے جو ان آٹھ اقسام سے باہر ہو یہی قرآن کی جامعیت ہے۔ البتہ ان آٹھ مدات میں حکومت کی عیاشیوں اور اللّے تللّوں کے لئے کوئی رقم نہیں ہے۔

سوال: کیا ہر شے پر زکوٰۃ ہے یا کچھ چیزوں کو زکوٰۃ سے مُبرّا بھی رکھا گیا ہے؟

جواب: صرف تین چیزیں زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہیں

ا۔عوامل پیداوار: مثلاً زمین کی پیداوار پر زکوٰۃ ہے' مگر زمین کی قیمت پر نہیں ہے (جب کہ وہ زمین پیداوار دے رہی ہو' محض جائیداد بنانا نہ ہو) اسی طرح کسی کارخانے کی پیداوار پر روزانہ یا ماہانہ ہے جو بھی طےشدہ طریقہ ہو اس کی بنیاد پر زکوٰۃ ہے' مگر کارخانے کی مالیت پر نہیں۔

ذاتی استعمال کی چیزیں: مثلاً وہ گھر جس میں انسان رہتا ہو۔سواری' گھر کا عام ساز و سامان وغیرہ۔اسلامی حکومت کو یہ اجازت ہے کہ وہ ذاتی استعمال کی چیزوں کی ایک فہرست مرتب کرے اور اس سے زائد ہر چیز کو قابل زکوٰۃ قرار دے۔مثلاً چار کمروں کا گھر تو زکوٰۃ سے مستثنیٰ ہو' مگر چالیس کمروں کے ایک محل میں باقی ماندہ چھتیس کمرے قابل زکوٰۃ قرار دیئے جائیں۔اسلام میں ضروریات زندگی کی اجازت ہے تعشیات زندگی کی اجازت نہیں ورنہ بحر و بر میں فساد برپا ہو جائے گا لوگ بھوکے مریں گے امراء کے کتے غالیچے پر سوئیں گے اور غرباء کو ایک وقت کی روٹی نہ ملے گی۔

۳۔نصاب سے کم سرمایہ: نقد رقم' سونے' چاندی' پلاٹینم میں ساڑھے باون تولے (چھ سو بارہ گرام) چاندی کی قیمت سے کم مالیت پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

غلے کی قسم کی اشیاء میں سے تیس من (ایک ہزار ایک سو نیس کلوگرام) کھجور یا اس کی قیمت سے کم غلے پر زکوٰۃ نہیں ہے۔

سوال: مستقل اثاثوں پر زکوٰۃ کی شرح کیا ہے؟

جواب: ہر قسم کے مستقل اثاثوں پر' جن سے پیداوار نہ ہوتی ہو' مثلاً سونا' چاندی' ہیرے' جواہرات' قیمتی نوادرات' پلاٹ' اضافی گھر (جو کرائے پر نہ چڑھے ہوں) وغیرہ پر ڈھائی فی صد سالانہ زکوٰۃ ہے۔اگر گھر کرائے پر ہوں تو ہر ماہ کرایے یعنی پیداوار پر زکوٰۃ ہو گی۔کارخانوں ،صنعتوں ،ذاتی چھوٹے کاروبار، ہنر مندی سے پیداوار ہوتی ہے۔یہ روزانہ بھی ہوتی ہے ماہانہ بھی اور سالانہ بھی۔لہٰذا اس پیداوار پر تینوں طریقوں سے زکوٰۃ عائد ہو سکتی ہے مثلاً تنخواہ دار طبقہ ماہانہ، چھوٹے کاروباری جو سر شام اپنی پیداوار کا حساب کر لیتے ہیں ان پر روزانہ بڑی صنعتوں کے حساب میں مشکل ہے تو ان کی ہفتہ وار ماہانہ یا سہ ماہی یا سالانہ پیداوار پر سہولت کے اعتبار سے زکوٰۃ عائد ہو گی۔اضافی گھر خواہ خالی ہو خواہ کرایہ پر چڑھایا گیا ہو ان پر لازماً زکوٰۃ عائد ہو گی (زکوٰۃ کی شرح خالی اور کرائے والے گھر کے لیے مختلف ہو گی) کیوں کہ دولت و سرمایہ بلاوجہ مرتکز ہو گیا ہے اس سے سرمایہ کو روکنے کی یعنی ارتکاز دولت کی حوصلہ شکنی ہو گی اور انفاق اور سرمایہ کی گردش ممکن ہو گی۔

سوال: زرعی پیداوار پر زکوٰۃ کا قانون کیا ہے؟

جواب: اگر کسی پیداوار میں محنت اور سرمایہ دونوں لگیں (مثلاً نہری زمین)' تو اس کی آمدنی پر پانچ فی صد زکوٰۃ' پیداوار لینے کے ساتھ ہی عائد ہو جاتی ہے۔اور اگر کسی پیداوار میں صرف محنت یا صرف سرمایہ لگے (مثلاً بارانی زمین)' تو اس کی آمدنی پر دس فی صد زکوٰۃ عائد ہوتی ہے۔اصول یہ ہے کہ جیسے ہی پیداوار آپ کے تصرف میں آئی آپ پر زکوٰۃ واجب ہو گئی خواہ وہ روزانہ ہو یا ماہانہ، ہفتہ وار یا سالانہ مثلاً تنخواہ دار ہر ماہ زکوٰۃ دے گا، چھوٹے کاروبار والا دن کے آخر میں پیداوار کے حساب کے وقت زکوٰۃ دے گا وغیرہ وغیرہ۔

سوال: صنعتی پیداوار پر زکوٰۃ کیسے عائد ہوتی ہے؟

جواب: صنعتی پیداوار بھی عام پیداوار کی مانند ہے۔ جس صنعتی پیداوار میں مالک کی محنت اور سرمایہ دونوں شامل ہوں۔ اس کی آمدنی پر پانچ فی صد زکوٰۃ ہے اور جس میں صرف سرمایہ ہو تو اس کی آمدنی پر دس فی صد زکوٰۃ ہے۔ یہ زکوٰۃ رسالت مآبؐ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے اگر زکوٰۃ کی شرح صرف ڈھائی فی صد ہوتی تو رسالت مآبؐ کی حکومت اور خلفائے راشدین کی سلطنت کبھی نہ چل سکتی۔ عہد رسالت اور اس کے بعد بھی تمام صنعتوں، کارخانوں پر اسی شرح سے زکوٰۃ عائد ہوتی تھی۔ بعض تاریخی کتب میں درج ہے کہ عاملین علیھا ____ کو جب تنخواہ دی جاتی تو ان کی تنخواہ سے زکوٰۃ منہا کر لی جاتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ بیت المال سے زکوٰۃ کی مد سے جو معاوضہ لیتے تھے اس پر خود زکوٰۃ ادا کرتے تھے۔ کتاب الخراج' موطا امام مالک میں اس سے متعلق احادیث موجود ہیں۔

خلفائے راشدین عمال حکومت و عمال زکوٰۃ کے معاوضے تنخواہیں سالانہ بنیاد پر ادا کرتے تھے اور اسی وقت اس رقم سے زکوٰۃ وصول کرتے تھے۔ موطا امام مالک کی کتاب الاموال میں درج ہے کہ حضرت ابوبکرؓ سالانہ تنخواہ کی ادائیگی کے وقت ہر عامل سے اس کی دولت کا پوچھ کر اس پر زکوٰۃ عائد کر دیتے تھے۔ امام ابن ابی شیبہ اور امام ابوعبید نے حضرت عمرؓ کے حوالے سے بھی اسی طریقہ کار کو بیان کیا ہے۔ عائشہ بنت قدامہ نے اپنے والد کے حوالے سے حضرت عثمانؓ کے بارے میں بھی اسی طرز عمل کو بیان کیا ہے وہ کہتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ سالانہ تنخواہ کی ادائیگی کے وقت ان کے والد سے ان کی دولت کے بارے میں پوچھتے جس پر زکوٰۃ واجب تھی پھر تنخواہ سے زکوٰۃ کی رقم منہا کر دیتے اور اگر زکوٰۃ واجب الادا نہ ہوتی تو پوری تنخواہ ادا کر دیتے تھے۔ جبیرہ بن یرمان کی روایت ہے کہ حضرت عبداللہ ابن مسعود تنخواہوں کی ادائیگی کے وقت زکوٰۃ منہا کر لیتے تھے لیکن پہلے وہ تنخواہ ادا کرتے پھر زکوٰۃ عائد کر کے زکوٰۃ طلب فرماتے خلفائے راشدین کے بعد بھی تنخواہوں اور عطیات کی ادائیگی کے وقت زکوٰۃ منہا کی جاتی تھی۔ حضرت عثمانؓ نے لوگوں کو اموال باطنہ پر خود زکوٰۃ دینے کی اجازت دی تھی ان سے پہلے یہ طریقہ کار نہیں تھا۔

سوال: روزانہ یا ماہانہ صرف محنت سے کمانے والے افراد مثلاً پرائیویٹ ڈاکٹر' ماہر تعمیرات' انجینئر اور سرکاری و غیر سرکاری ملازمین کی اجرتوں پر کتنی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے؟

جواب: چونکہ آج کل کی معروف اصطلاح میں یہ بھی پیداوار رہی ہے' اس لئے ان سب آمدنیوں پر دس فی صد زکوٰۃ ہے۔ اس میں حکومت چاہے تو کم از کم بنیادی آمدنی (مثلاً پانچ ہزار روپے ماہانہ یا کوئی اور معقول شرح جس کو پارلیمان منظور کرے) کی چھوٹ بھی دے سکتی ہے۔ عہد رسالت میں بھی اجرت کو پیداوار ہی تصور کیا جاتا تھا اور اس پر زکوٰۃ روزانہ یا ماہانہ بنیاد پر عائد کی گئی یہ رسولؐ کی سنت ثابتہ سے ثابت ہے تاریخ اور تواتر و تعامل و تسلسل و اجماع امت سے ثابت ہے یہ حجت قطعی ہے لاریب اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں۔

سوال: ابھی آپ نے فرمایا کہ زکوٰۃ طے شدہ ٹیکس ہے جو خدا کے حکم اور رسول کی سنت سے ثابت ہے اب آپ کہہ رہے ہیں کہ ریاست اس کی کم از کم حد مقرر کر سکتی ہے تو کیا ریاست خدا اور رسول کی قائم مقام ہے؟

جواب: خلافت اسلامیہ خدا اور رسول کی قائم مقام ہے اسی لئے حضرت عمرؓ نے مولفہ القلوب کے لئے زکوٰۃ کی ممانعت فرما دی تھی کتابیہ سے نکاح ممنوع کر دیا تھا مفتوحہ زمینیں مال غنیمت میں تقسیم نہ کیں۔ خلافت رسالت کی قائم مقام ہے اور قیامت تک جاری رہے گی یہ قرآنی اصطلاح ہے قرآن سے ثابت ہے کہ خلیفہ نائب رسول ہے اسے اختیار ہے کہ وہ قرآن و سنت کی اتباع میں ایسا اجتہاد کرے جو ماخذات

دین کی تقلید کو ہر عہد میں ممکن بنا سکے۔ یہ دین سے انحراف نہیں ہے۔ یہ اسوۂ رسول کی تقلید ہے قرآن نے اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے ساتھ ساتھ اولی الامر کی اطاعت ان دونوں اطاعتوں کے تابع ______ کر کے مشروط کر کے ______ حکمران کی اطاعت کا حکم دیا ہے یعنی حکمران کی اطاعت غیر مشروط نہیں ہے اس آیت کے تحت حکومت، ریاست، خلافت زکوٰۃ کی شرح میں حالات کے تحت ردوبدل کر سکتی ہے۔

سوال: آپ نے کہا کہ حضرت ابو بکر تنخواہ پر زکوٰۃ دیتے تھے تو رسول اللہ بھی زکوٰۃ دیتے ہوں گے آپ ان مصادر کی نشان دہی فرمائیں جن میں یہ حوالہ موجود ہو کہ رسول اللہ خلفاء اور خلافت کے سرکاری ملازمین کی تنخواہوں سے زکوٰۃ کاٹ لی جاتی تھی یا یہ کہ وہ لوگ زکوٰۃ نکال کر بیت المال کو ادا کرتے تھے اور یہ بھی کہ ہر پیداوار پر روزانہ ماہانہ یا سالانہ بنیاد پر پانچ دس فی صد زکوٰۃ خیر القرون میں ثابت ہے؟

جواب: مجھے حوالے اس وقت مستحضر نہیں آپ پروگرام کے اختتام پر میری رہائش گاہ پر ڈاکٹر طارق سجاد صاحب یا شکیل الرحمان صاحب سے وقت لے کر آجایئے حوالے پیش کر دیئے جائیں گے یا انتظار کیجئے تو میزان میں انشاءاللہ تمام حوالے آجائیں گے۔

سوال: اگر کسی نے اپنے گھر، پلازے یا دکانیں کرائے پر دی ہوں تو اس پر کتنی زکوٰۃ عائد ہوتی ہے؟

جواب: چونکہ یہ بھی پیداوار ہے۔ اس لئے اس پر بھی دس فی صد زکوٰۃ ہے۔ مثلاً اگر کسی مالک نے کوئی گھر دس ہزار روپے ماہانہ کرائے پر دیا ہے۔ تو اس پر ماہانہ (اس کے گھر کے کھاتے میں) ایک ہزار روپے زکوٰۃ عائد ہوتی ہے صنعتوں کی پیداوار اموال تجارت کے زمرے میں نہیں مزروعات کے دائرے میں آتی ہے اور اس میں زکوٰۃ کا وہی ضابطہ ہو گا جو شریعت نے پیداوار کے لئے متعین کیا ہے۔ اسی اصول کے عین مطابق اگر املاک کرایے پر اُٹھی ہوں تو مزروعات کی اور اگر نہ اُٹھی ہوں تو ان پر مال کی زکوٰۃ عائد کرنی چاہیے۔ یہ تصور کہ املاک پر زکوٰۃ نہیں ہوتی باطل تصور ہے یہ ملوکیت کی فقہ کا پیدا کردہ تصور ہے جس کی کوئی تاریخی اساس میسر نہیں ہے۔

سوال: اگر کسی بیوہ عورت کے پانچ بچے ہیں اس کی آمدنی پر آپ کی مقررہ شرح کے لحاظ سے زکوٰۃ عائد ہو جائے تو اس پر زکوٰۃ ظلم نہیں ہے ہم نے تو یہی سنا ہے کہ زکوٰۃ سال کے آخر میں صرف بچت پر ہوتی ہے اور صرف ڈھائی فی صد سالانہ کے حساب سے ہوتی ہے پانچ فی صد دس فی صد زکوٰۃ روزانہ، ماہانہ کا نہ کبھی سنا نہ کبھی پڑھا یہ تو آپ نئی بات لا رہے ہیں یہ تو ظلم کا ایک نیا نظام ہے جس میں سارے ٹیکس مسلمانوں پر لادے جا رہے ہیں۔ کیا ذمیوں، معاہدین، اور کفار پر بھی یہ ٹیکس عائد ہوں گے یا ان کے کفر کے بدلے میں وہ ہر قسم کی مالی رعایت کے مستحق ہوں گے اگر یہی صورتِ حال ماضی میں تھی تو حیرت ہے کہ لوگ کافر نہیں بنے بھاری ٹیکس ادا کر کے بھی مسلمان ہی رہے۔ اگر آج یہ قانون نافذ کیا جائے تو بہت سے لوگ خصوصاً ہمارا کاروباری طبقہ تو کافر ہی ہو جائے گا کہ ٹیکس کم دینے پڑیں گے کیوں کہ کفر *Tax Holyday* مہیا کر رہا ہے۔

جواب: دیکھئے سُنی سُنائی کی بات نہ کریں پندرہ سو سال سے دین اِنہی سُنی سُنائی باتوں پر چل رہا ہے زکوٰۃ کا جو قانون یا جو شرح میں بیان کر رہا ہوں پورے وثوق، یقین اور اعتماد سے کہتا ہوں کہ قرآن و سنت، تمام مستند احادیث اور تمام مستند تواریخ میں یہ قانون اور اس کی شرحیں موجود ہیں یہ صرف قرآن و سنت سے نہیں تواتر، تعامل، تسلسل اور اجماع امت سے ثابت ہے۔ میرا اصول ہے کہ امت کبھی گمراہی پر مجتمع نہیں ہو سکتی یہ اصول حدیث پر مبنی ہے اور حقیقت یہی ہے کہ امت کبھی بدعت، ضلالت پر مجتمع نہیں ہو سکتی۔ اگر امت خلافت راشدہ کے بعد چاروں

مکاتب فقہ کے ذریعے گمراہ ہوگئی ہے اور اس نے زکوٰۃ کی شرحیں بدل دی ہیں تو یہ ان کا مسئلہ ہے اصل مسئلہ، اس کا حل، اس کی شروح سب آج بھی محفوظ ہے۔ ڈھائی فی صد زکوٰۃ کے ذریعے کوئی ریاست نہیں چل سکتی اگر زکوٰۃ کی شرح اتنی کم ہے تو فقہاء اس میں ریاست چلا کر دکھائیں۔

اگر وہ مان لیں کہ اسلامی حکومت و ریاست کی سرے سے ضرورت نہیں تب ڈھائی فی صد سے گزارہ شاید ہو جائے۔ احادیث کی کتابوں میں یہ شرحیں موجود ہیں المیہ تو یہ ہے کہ علماء اور خصوصاً پاک و ہند کے علماء تو عربی بھی پوری طرح نہیں جانتے نظم قرآن سے واقف نہیں لہٰذا قرآن و سنت کے عجائب ان کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ میری کتاب میزان میں تمام کتب کے حوالے آ رہے ہیں کتاب میں پانچ دس فی صد زکوٰۃ کی فرضیت کے تاریخی ثبوت مہیا کئے گئے ہیں تب صورت حال مبرہن ہو جائے گی انتظار کیجئے جلد مکمل ہوگی تو پیش کر دی جائے گی۔

سوال: لیکن میزان کے دو باب جو آپ نے قانون سیاست و معیشت کے نام سے ۱۹۷۸ء میں لکھے دونوں حصے ساتھ شائع ہوئے۔ بعد میں اس کا ایک حصہ قانون معیشت کے نام سے الگ بھی شائع ہوا۔ اس میں آپ نے اپنے استدلال کا کوئی حوالہ نہیں دیا صرف دعوے کیے گئے ہیں کہ زکوٰۃ پانچ فی صد اور دس فی صد ہے اور ہر پیداوار پر ہے اور تنخواہ بھی پیداوار ہے میزان حصہ اوّل میں بھی اس کا کوئی حوالہ نہیں ہے تو کیا میزان جب کتابی صورت میں دوبارہ آئے گی آپ تب حوالہ جات پیش کریں گے؟

جواب: جی ہاں حوالے مل گئے ہیں ان کی تخریج کا کام باقی ہے پانچ فی صد اور دس فی صد زکوٰۃ ہر پیداوار، ہر آمدنی پر روزانہ، ماہانہ یا سالانہ بنیاد پر ___ زکوٰۃ کے سلسلے میں راقم دو سو سے زیادہ حوالے جمع کر چکا ہے۔ ساجد حمید، رفیع مفتی اور دیگر رفقائے کار ان حوالوں کی ترتیب تہذیب اور تخریج کا کام کر رہے ہیں یہ اپنی نوعیت کا منفرد ترین کام ہے یہ جب میزان شائع ہوگی تو دنیا کو پہلی مرتبہ معلوم ہوگا کہ ہماری فقہ نے ہمارے علماء نے ہمارے مکاتب اسلام نے کس طرح اسلام کے قانون زکوٰۃ کو مسخ کر کے پوری امت کو ڈھائی فی صد زکوٰۃ کے چکر میں ڈال کر ملت اسلامیہ کے خزانے خالی کر دیئے۔ امت کی معاشی بدحالی اس کے زوال کے اسباب میں سے ایک بنیادی سبب ہے جس پر کبھی غور نہیں کیا گیا اگر زکوٰۃ ہمیشہ اس شرح سے وصول کی جاتی رہتی جو میں نے پیش کی ہے تو امت کو زوال کا سامنا نہ کرنا پڑتا امت اور علماء کے انحراف کے باوجود اس امت میں کچھ اہل خیر رہے جو اس بات کی دعوت دیتے رہے جس کا اعادہ آج میں آپ کے سامنے کر رہا ہوں کیوں کہ رسالت مآبؐ کا فرمان ہے کہ میری امت کبھی ضلالت پر مجتمع نہ ہوگی امت کے ہر عہد میں ایسے لوگ موجود رہے ہیں جو اندھیرے میں جگنو بن کر چمکتے رہے۔ ابن تیمیہ سے لے کر امام فراہی، شبلی نعمانی، امین احسن اصلاحی اس کی مثالیں ہیں۔ اس امت کا مستقبل دبستان شبلی ہے۔ سرسید کے جدیدیت پسند مکتب فکر اور دیوبند، بریلی، اہل حدیث کے روایتی مکتب فکر اپنا وقت پورا کر چکے ہیں اور دین کے ایک بنیادی حکم کو اپنی تاویلات، اختلافات، شروحات، بے بنیاد استدلالات سے مسخ کر کے رکھ دیا۔ آج جب ہم دین کا حقیقی حکم پیش کرتے ہیں تو وہ لوگوں کے لئے ناقابل قبول ہوتا ہے اور دین کی غیر دینی تشریح لوگوں کے لیے واجب التسلیم ہوتی ہے یہی اسلام کا المیہ ہے حقیقی دین کھو چکا ہے اور مصنوعی دین اصل کا وارث بن گیا ہے ہمیں فقہ کی گرد ہٹا کر قرآن و سنت کا اصل چہرہ امت کے سامنے پیش کرنا ہے ظاہر ہے یہ عزیمت کا نام ہے آپ اس کام میں ہمارے معاون بنیں عملی تعاون کریں۔

سوال: عشر کیا زکوٰۃ سے الگ ہے یا اس کا حصہ ہے اس کی کیا شرح ہوگی؟ صدقہ فطر بھی کیا زکوٰۃ ہی ہے؟

جواب: یہ زکوٰۃ ہی کی قسم ہے ہر پیداوار پر زکوٰۃ ہے اگر محنت یا سرمایے سے پیداوار ہوئی تو اس پر دس فی صد زکوٰۃ ہوگی اگر سرمایہ محنت کے تعامل سے پیداوار ہوئی تو زکوٰۃ پانچ فی صد ہوگی زکوٰۃ کو قرآن نے صدقہ بھی کہا ہے۔ صدقہ فطر بھی زکوٰۃ کی ایک قسم ہی ہے۔

سوال: یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ اگر کوئی صرف محنت سے پیداوار کرے تو تو وہ دس فی صد زکوٰۃ دے گا اگر کوئی صرف سرمایہ سے پیداوار حاصل کرے تو تو وہ بھی دس فی صد دے گا۔ یہ قانون زکوٰۃ تو مزدور اور سرمایہ کو ایک ہی سطح پر رکھ رہا ہے اِس سے سرمایہ داری کو فروغ نہیں ملے گا۔

جواب: احکامات دین عقل اور اصول استقراء سے اخذ نہیں ہوئے یہ رسالت مآبؐ کا حکم ہے ایک صاحب ایمان کے ایمان کا تقاضہ یہی ہے کہ اگر حکم کی عقلی منطقی توجیہہ سمجھ میں نہیں آئی تب بھی وہ اپنا سر جھکا دے لیکن اس کے ہر حکم کی عقلی توجیہہ امر لازم نہیں دین عمل کے لیے کسی عقلی استدلال سے مشروط نہیں ہے ہمیں دین پر عمل کرنا ہے خواہ اس کے احکام ہماری محدود ناقص عقل میں آئیں یا نہ آئیں تدبر و تفکر جاری رکھا جائے مگر تدبر کے پہنچنے تک حکم پر عمل نہ منسوخ ہوتا ہے نہ معطل نہ ملتوی۔ ویسے ہم کسی مناسب موقع پر اس حکم کی عقلی توجیہہ بھی بیان کریں گے۔

سوال: تجارت پر زکوٰۃ کیسے عائد کی جائے گی؟

جواب: تجارت پر دو طریقوں سے زکوٰۃ عائد کی جاسکتی ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اسے پیداوار مان کر اس کی روزانہ آمدنی پر پانچ فی صد یا دس فی صد زکوٰۃ عائد کردی جائے۔ چونکہ بعض تاجروں کے لئے روزانہ کا حساب کتاب رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے اور اس طریقے سے قیمتیں بڑھنے کا اندیشہ بھی ہوتا ہے' اس لئے یہ طریقہ مناسب خیال نہیں کیا جاتا تھا۔ مگر اب کمپیوٹر کی آمد کے بعد کوئی مشکل نہیں کمپیوٹر سے پہلے حساب کتاب کی مشینیں آچکی ہیں لہٰذا ہوٹل والے: ہول سیل کا کام کرنے والے' سبزی منڈی' مویشی منڈی کے تاجر روزانہ حساب کتاب کرکے زکوٰۃ ادا کرسکتے ہیں عہد حاضر میں زکوٰۃ ادا کرنا بہت آسان ہوگیا ہے۔

سوال: بعض تجارتی کاروبار اس نوعیت کے ہوتے ہیں کہ ان میں سرمایہ بہت کم لگتا ہے اور آمدن بہت زیادہ ہوتی ہے۔ پھر ان کا وزانہ حساب بھی لگایا جاسکتا ہے۔ کیا یہ پیداوار کی ضمن میں آسکتا ہے؟ مثلاً تکے کباب کی دکانیں' ریسٹورنٹ اور بہت بڑے کاروباری ادارے' جو اپنا کمپیوٹرائزڈ حساب کتاب رکھ سکتے ہیں؟ بلکہ اب تو موبائل فون میں بھی کیلکولیٹر موجود ہے ایک لمحے میں سب حساب کتاب محفوظ ہو جاتا ہے۔

جواب: ایسے تجارتی کاروبار' تجارتی پیداوار کے ذیل میں آتے ہیں' ان پر آمدنی کے حساب سے پانچ فی صد یا دس فی صد زکوٰۃ روزانہ، ہفتہ وار یا ماہانہ بنیاد پر عائد کی جانی چاہیے۔

سوال: کیا زکوٰۃ' لازماً' کسی خاص مہینے میں ادا کرنی چاہیے؟

جواب: اگر حکومت کوئی تاریخ مقرر کردے' تو ظاہر ہے کہ اس کی پابندی لازم ہے' لیکن اگر حکومت زکوٰۃ وصول نہ کرے تو زکوٰۃ کسی بھی وقت نکالی جاسکتی ہے اور سارا سال تقسیم کی جاسکتی ہے۔ چونکہ عشر فصل کی پیداوار پر ہی دیا جاتا ہے لہٰذا فصل جس موسم میں ہو زکوٰۃ اسی موسم میں نکالی جائے گی۔

سوال: اگر اسلامی حکومت موجود نہ ہوتو زکوٰۃ کسے دی جائے کیوں کہ آپ کی تحقیق کے مطابق زکوٰۃ ریاست سے مشروط ہے۔جس طرح ریاست نہ ہوتو جہاد، ساقط ہو جاتا ہے تو اسی اصول پر زکوٰۃ ساقط ہوگی یا نہیں؟

جواب: جہاد کے اصول کی بنیاد پر زکوٰۃ کو بھی قیاس کیا جاسکتا ہے کیوں کہ زکوٰۃ میں ____ اموال باطنہ ظاہرہ سب بیت المال کو دیئے جاتے ہیں وہ اگر موجود ہی نہیں ہے تو زکوٰۃ ساقط رہے گی۔اس بارے میں غور وفکر کررہا ہوں حتمی رائے فی الحال بیان نہیں کرسکتا موجودہ رائے یہی ہے جو تحقیق کے بعد تبدیل ہوسکتی ہے۔اسلامی شریعت سے واقف ہر صاحب علم جانتا ہے کہ جمعہ، زکوٰۃ، فے، قتال، اقامت حدود پانچ احکام کے لئے ریاست کا وجود شرط لازم ہے۔فقہ واجتہاد کی اصطلاح میں ہم اسے "موکول الی السلطان" کہتے ہیں جن کے مخاطب عوام نہیں حکمران ہیں برھان میں میرے مضمون ''اہل بیعت کی خدمت میں'' اس کی تفصیل موجود ہے وہ دیکھ لیجئے۔

سوال: اگر جمعہ، زکوٰۃ، فے، قتال، اقامت، حدود کا مقدمہ ریاست ہے تو کیا ریاست کا قیام فریضہ دینی ہے یا نہیں؟ جس طرح نماز فرض ہے اور اس کا مقدمہ وضو یا غسل وہ بھی فرض ہے کیوں کہ فرض واجب کا مقدمہ بھی فرض اور واجب ہوتا ہے مگر آپ ریاست کے قیام کو فریضہ دینی تسلیم نہیں کرتے اس کی کیا دلیل ہے؟

جواب: میری کتاب برھان کے پہلے مضمون میں اس کا جواب ہے اقامت دین کی اصطلاح سے ریاست کے قیام کے فرض ہونے کا تصور نکلا ہے۔ریاست فرض نہیں نتیجہ ہے دین پر عمل کرنے کا جب آپ دین پر مکمل عمل کریں گے تو تکوینی طور پر ریاست انعام الٰہی کے طور پر قائم ہو جائے گی یا مل جائے گی جس طرح حضرت یوسفؑ کو ملی ہے یا مدینہ کی ریاست معاہدے سے مل گئی۔

سوال: لیکن دین پر مکمل عمل تو ریاست کے بغیر ممکن ہی نہیں جیسا کہ آپ نے خود ارشاد فرمایا تو پہلے ریاست قائم ہوگی یا پہلے دین پر مکمل عمل ہوگا۔ موکول علی السلطان ریاست کے بغیر کیسے ہوں گے ان کے لیے تو سلطان ضروری ہے یہ آپ کی دلیل ہے یہاں فلسفے کا مخمصہ Paradox پیدا ہو رہا ہے۔یعنی انڈہ پہلے تھا یا مرغی پہلے تھی؟ ریاست کو آپ ابھی عمل کا نتیجہ، اثر، انعام بتارہے ہیں اور اس کی شرط یہ بتارہے ہیں جب مسلمان دین پر مکمل عمل کریں تو ریاست کے بغیر دین کے پانچ بنیادی احکامات پر عمل ممکن ہی نہیں یعنی مسلمانوں کو کبھی اقتدار نہیں ملے گا۔

جواب: نصوص دین میں عدم تدبر کے باعث یہ التباس ہر شخص کو محسوس ہوتا ہے آپ دین کے صحیح تصور کو پڑھ لیں سمجھ لیں تو اس سوال کا جواب مل جائے گا۔حمید الدین فراہی اور امین احسن اصلاحی نے پہلی مرتبہ دین کی حکمت اور عظمت کو اپنے دلائل سے صحیح طور پر مبرہن کردیا ہے ان حضرات کا مطالعہ آپ کے خلجان کو دور کردے گا۔تفصیلات عرض کرنے کا وقت نہیں ہے۔

سوال: آج کل تو ریاستیں زکوٰۃ سے کہیں زیادہ ٹیکس وصول کررہی ہیں' لیکن اس کے باوجود اپنے اخراجات پورے نہیں کرسکتیں۔صرف زکوٰۃ لاگو کرکے ایک ریاست اپنے اخراجات کیسے پورے کرسکے گی؟

جواب: اس ضمن میں تین باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ آج تک انسان کوئی ایسا فارمولا دریافت نہیں کرسکا' جس کی رو سے حکومت کے ٹیکس لگانے کے اختیار کو محدود کیا جاسکے۔چونکہ ریاست کے پاس طاقت ہوتی ہے' اس لئے ٹیکسیشن کی تاریخ شاہد ہے کہ ریاست نے ہمیشہ' اپنی طاقت سے ناجائز فائدہ

اُٹھا کر ظالمانہ ٹیکس عوام پر مسلط کئے ہیں۔ جب ریاست زیادہ رقم کمانے کی عادی بن جاتی ہے اور اسے یہ بھی علم ہوتا ہے کہ وہ اپنی طاقت سے کام لے کر مزید ٹیکس بھی لگا سکتی ہے تو پھر وہ اپنے اخراجات بڑھاتی ہی رہتی ہے اور اس کا سلسلہ کہیں رُکنے میں نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے دین نے اس قضیے کو ہمیشہ کے لئے حل کر کے بتا دیا ہے کہ حکومت ان شرحوں سے آگے نہیں بڑھ سکتی۔

دوسری بات یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے ذرائع آمدنی زکوٰۃ کے علاوہ بھی ہیں، ان میں ایک تو مختلف جرمانے ہیں جہاد سے ملنے والا مال غنیمت ہے۔ دوسرے مختلف خدمات کا معاوضہ ہے: مثلاً بجلی یا فون کا معاوضہ، کفار سے معاہدے کے تحت ملنے والا ٹیکس، درآمدات پر لگایا گیا ٹیکس، معدنی خزانے، مخفی خزانے، دفینے، قدرتی حیاتیات، جنگلات، نباتات کے خزانے وغیرہ وغیرہ لیکن ان سے بھی بڑی بات اصل میں یہ ہے کہ پروردگار عالم، جس نے زکوٰۃ کا یہ نظام ہمیں دیا ہے، وعدہ کرتا ہے کہ میری شریعت کو نافذ کر دو، میں تمھارے لئے زمین و آسمان کے خزانے کھول دوں گا۔

ہم قرآن وسنت سے زکوٰۃ کا جو نظام اخذ کرتے ہیں، وہ تو آپ کے سامنے ہے، لیکن کیا یہ نظام محض یہی کچھ ہے جو ہمیں دکھائی دیتا ہے، نہیں ایسا نہیں ہے۔ یہ اس نظام کا ظاہر ہے اور اس کا باطن خدا کے وعدے ہیں، جن کے نتیجے میں مسلمان ریاست، ایک فلاحی ریاست بن جاتی ہے۔ یہ وعدے کسی ناقص نظام کے ساتھ نہیں، بلکہ ایک کامل نظام (Set up) کے ساتھ ہیں۔ خدا نے زکوٰۃ کا ایک مکمل نظام بھی دیا ہے اور اس کے ساتھ خیر و برکت کے وعدے بھی کئے ہیں۔ مسلمان فرد اور مسلمان حکومت (ٹیکس) کے ایک جامع نظام کے ساتھ، خدا کے وعدوں پر کھڑی ہے، یعنی تدبیر میں بھی کمال ہے اور توکل میں بھی۔ یہ ایک جامع نظام ہے۔ اس کی شکل اور اس کا (System) واضح ہے، اضافی سرمایہ کی، ایک نئے سرے سے تنظیم کے ذریعہ سے، یہ ممکن ہوسکتا ہے۔ اسے معیشت کی اصطلاح میں "تشکیل زر" (Capital Formation) کہا جاتا ہے۔

سوال: آپ کہہ رہے ہیں ایک اسلامی ریاست فلاحی ریاست ہوتی ہے اگر وہ فلاحی ریاست ہے تو کیا مہنگائی کے خلاف خروج جائز ہوگا؟

جواب: جی نہیں خروج کی شرط ہے کفربواح کا ارتکاب ____ رسالت مآبؐ نے واضح کر دیا اور کتاب اللہ نے بھی کہ ریاست کا اصل کام لوگوں کے لئے آخرت کی فلاح کو ممکن بنانا ہے صرف ان معنوں میں اسلامی ریاست فلاحی ریاست ہے کہ وہ آخرت کی فلاح کو آخری حد تک فرد کے لیے ممکن بنا دیتی ہے اسی لئے قرآن میں استخلاف فی الارض کے بعد خلیفہ اسلام کو صرف چار فرائض ادا کرنے کا حکم دیا گیا ہے صلوٰۃ زکوٰۃ امر بالمعروف نہی عن المنکر ____ ان چار اساسی اہداف کے سوا اسلامی ریاست وحکومت کا کوئی پانچواں مقصد نہیں اصل فلاح آخرت میں کامیابی ہے کہ روز حشر مالک کہہ دے کہ میں نے اپنے بندے کو بخش دیا اور اسے جنت عطا کر دی۔

ریاست کا اصل کام نیکی کے راستے پیدا کرنا اور گناہ کا ہر دروازہ بند کرنا یعنی نیکی کو ممکن بنا دینا اور گناہ کو محال کر دینا ہے تاکہ لوگ آخرت میں کامیابی کے قابل ہوسکیں۔ آخرت کو دنیا پر ترجیح حاصل ہے یہ نصوص قرآنی سے ثابت ہے۔ فلاح سے اور فلاحی ریاست سے مراد یہی ہے ____ اذان میں حی الفلاح کے الفاظ انہی معنوں میں ہیں کہ دوڑو اس اخروی فلاح کی طرف جس کا راستہ اذان کی آواز سنتے ہی دنیا ترک کر کے مسجد تک پہنچتا ہے اور یہ راستہ اللہ کے گھر میں عبادت سے ہو کر گزرتا ہے لہٰذا کسی اسلامی ریاست کے خلاف مہنگائی، بے روزگاری، سڑکوں کی ٹوٹ پھوٹ کے باعث خروج جائز نہیں ریاست کا کام لوگوں کی فلاح اخروی کو ممکن بنانا ہے فلاح دنیوی اصل مقصد

نہیں ہے ان معنوں میں جدید فلاحی ریاست ویلفیئر اسٹیٹ اور اسلامی فلاحی ریاست میں بنیادی نوعیت کا فرق ہے۔ جدید ریاست کا ایک اہم مقصد لوگوں کی مادی خوشیوں میں اضافہ اور معیار زندگی میں بدستور اضافہ بھی ہے۔ لہٰذا اسلامی فلاحی ریاست اور جدید ویلفیئر اسٹیٹ کے اغراض و مقاصد اہداف بالکل مختلف ہیں۔ ایک کو دوسرے پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ایسا قیاس بہت بڑی گم راہی ہے۔

سوال: ایک نقطۂ نظر یہ ہے کہ زکوٰۃ کی شرحیں حضورؐ نے اپنے زمانے کے مطابق متعین کی تھیں حالات زمانہ بدلنے سے احکامات شریعت میں بھی تغیر ہوجاتا ہے تو اب کیا ہمیں ان میں کمی بیشی کا اختیار حاصل ہے؟

جواب: یہ بالکل غلط ہے۔ زکوٰۃ کی یہ شرحیں حضورؐ نے خدا کا رسول ہونے کی حیثیت سے مقرر کی تھیں اور رسالت مآب' نہ کہ ریاست مدینہ کے فرمانروا کی حیثیت سے' اور اب یہ شرحیں اس امت میں آپ کی جاری کردہ سنت کی حیثیت رکھتی ہیں' ان سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا۔ یہ شرحیں منصوص ہیں لہٰذا منسوخ نہیں ہوسکتیں کسی کو ان میں تغیر و تبدل کا اختیار نہیں: اللہ تعالیٰ نے اَموال میں اپنے انبیاء کے ذریعے زکوٰۃ کی شرحیں مقرر کی تھیں یہ کوئی انسانی حق نہیں ہے کہ جو چاہے اپنے نفس کے تابع زکوٰۃ کی شرحیں خود عقل کے زور سے متعین کرے۔

سوال: لیکن رسول اللہ نے خود گھوڑوں اور غلاموں کی زکوٰۃ معاف کردی تھی ان کو یہ اختیار کس نے دیا قرآن میں اس کی منسوخی کی اطلاع نہیں ہے جب کہ حجت قرآن ہے زکوٰۃ تو خدا کا حق ہے اسے خدا ہی معاف کرسکتا ہے تو کیا رسولؐ خدا کے حق زکوٰۃ میں اپنی مرضی سے ردّ و بدل کرسکتا ہے؟ یہ اختیار رسول کو اللہ نے دیا ہے یا رسول اللہ نے نعوذ باللہ اپنے اختیارات سے تجاوز کیا ہے؟

جواب: جی ہاں رسولؐ کی اطاعت قرآن کی اطاعت ہے قرآن کے حکم کو خدا کے حکم کے تحت خدا ہی منسوخ کرسکتا ہے رسول اللہؐ کی براہِ راست نگرانی میں ہوتے ہیں ان کے ہر قول فعل کی حفاظت ہوتی ہے رسولؐ اپنی مرضی سے اللہ کے حکم کو منسوخ نہیں کرتے وہ حکم کی تشریح و تفسیر کرتے ہیں اس سے تنسیخ کا اصول اخذ کرنا علماء کا مسئلہ ہے رسول نے تو کبھی تنسیخ کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ خدا کا حکم دین کی تشریح و توضیح کے سلسلے زبان رسالت حدیث و سنت کے ذریعہ جاری ہوتا ہے یہ بھی وحی ہے وحی خفی ہے وحی غیر متلو ہے ____ کیوں کہ قرآن سے ہمیں اس کا علم نہیں ہوا کہ گھوڑے اور غلام پر زکوٰۃ ہے نہ اس کا علم ہوا کہ وہ منسوخ ہے یہ دونوں علم وحی غیر متلو سے منتقل ہوئے آپ کہیں گے کہ میں اپنے مؤقف سے انحراف کرتا ہوں یہ درست نہیں قرآن کے مشکل مقامات کے معانی اللہ رب العزت نے رسول کو قرآن کی آخری قرأت کے موقع پر خود بتائے لہٰذا قرآن میں سورہ قیامہ میں آتا ہے ان علینا بیانہ ظاہر ہے اللہ کا یہ کہنا کہ قرآن کی وضاحت ہمارے ہی ذمہ ہے اس بات کا اعلان ہے کہ قرآن کے بعض مقامات رسول کے لیے قابل فہم نہیں وہ اللہ کی وضاحت سے واضح ہوں گے یہ وضاحت ظاہر ہے قرآن میں نہیں ہے مگر قرآن سے متعلق ہے اللہ کی وضاحت جب رسول بتائے گا یہ الفاظ وحی تو نہیں ہیں مگر پیغام الٰہی تو ہیں اور حجت ہیں۔ یہ ہمارے دین کا بہت بڑا خیر ہے کہ اس نے زکوٰۃ کی آخری شرحیں مقرر کر کے فرد کو ریاست کے ظلم سے محفوظ کرلیا۔ اگر یہ شرحیں مقرر نہ کی جائیں تو پھر گویا ریاست پر ان زکوٰۃ کی شرحوں کو متعین کرنے کی ذمہ داری ڈالی جاتی' جس سے وہ کسی صورت میں بھی عہدہ برا نہیں ہوسکتی تھی۔

سوال: کیا حکومت کسی چیز کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ بھی قرار دے سکتی ہے' یا کسی چیز پر زکوٰۃ کی شرح کم کرسکتی ہے؟

جواب: حکومت' اپنی مصلحت یا عوام کو کسی تکلیف سے بچانے کی خاطر' کسی چیز کو وقتی طور پر زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دے سکتی ہے۔ مثلاً حضورؐ نے اپنے

زمانے میں سبزیوں کی پیداوار کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا۔ غلاموں کو زکوٰۃ سے بری کر دیا مستقل طور پر۔

اسی طرح اس وقت، چونکہ جہاد کے لئے گھوڑوں کی بھی ضرورت تھی، اس لئے ان پر زکوٰۃ ادا کرنے میں بھی چھوٹ دی گئی۔ بعد میں جب یہ صورتِ حال نہ رہی، تو حضرت عمرؓ نے گھوڑوں پر زکوٰۃ عائد کر دی۔ عقلی ذہن خصوصاً اہل قرآن پرویز صاحب یہ استدلال کریں گے کہ رسول نے جس حکم کو منسوخ کر دیا اسے حضرت عمرؓ کیسے بحال کر سکتے ہیں۔ لفظ پرست ذہن لٹرلسٹ اس طرح سوچتے ہیں جب قرآن کا فہم صرف لغت، لفظیات، کلام عرب، محاورہ عرب، سبعہ معلقہ تک محدود ہو جائے تو اس کی روح مر جاتی ہے صرف لفظی بازی گری کے ذریعے روزانہ قرآن کے نت نئے مطالب خلق ہوتے رہتے ہیں۔ احمد دین امرتسری، اسلم جیراج پوری، عبداللہ چکڑالوی، غلام احمد پرویز اور عمر احمد عثمانی اور اب مولانا طاہر مکی جیسے اہل قرآن اس خلط مبحث کا شکار ہیں۔

سوال: آج، جب کہ حکومت زکوٰۃ نہیں لے رہی اور اس کے بجائے بے شمار دوسرے ظالمانہ ٹیکس وصول کر رہی ہے، اگر ایک انسان ایک طرف زکوٰۃ بھی دے اور دوسری طرف حکومت کو ٹیکس بھی دے، تو یہ تو دہرا ٹیکس ہوا، اس کا کیا حل ہے؟

جواب: چونکہ حکومت کو زکوٰۃ کی شرح سے زیادہ ٹیکس وصول کرنے کا اختیار نہیں ہے، اس لئے ہر فرد کو چاہیے کہ وہ اپنی پوری زکوٰۃ کا حساب لگائے اور حکومت کو جو سالانہ ٹیکس دیتا ہے۔ اس زکوٰۃ کی رقم سے اسے منہا کرے اور پھر اگر رقم بچ جائے، اسے اللہ کے راستے میں، بقیہ زکوٰۃ ادا کرنے کی نیت سے خرچ کر دے۔

سوال: یعنی اسلام میں ٹیکس چوری کرنے کی اجازت ہے؟

جواب: ٹیکس نہیں۔ زکوٰۃ دینے کے بعد ٹیکس نہ دینے کی اجازت ہے حکمران ٹیکس وصول نہیں کر سکتے۔ حدیث ہے ٹیکس وصول کرنے والا جہنم میں جائے گا۔ زکوٰۃ ربّانی، الٰہی، الہامی، نبوی ٹیکس ہے اس کا وصول نہ کرنے والا جہنم میں جائے گا اور وہ جو زکوٰۃ دینے سے بچے ہیں وہ بھی جہنمی ہے۔ جب ایک فرد نے اللہ اور اس کے نبی کے مقرر کردہ طریقے سے ریاست کو ٹیکس ادا کر دیا اس کے بعد مزید ٹیکس لگانا جائز نہیں اگر ریاست Tax لگا رہی ہے تو جو کچھ ٹیکس آپ زکوٰۃ کی صورت میں دے چکے اس Tax سے منہا [Deduct] کرلیں اسے چوری کون کہہ سکتا ہے۔

سوال: کیا زکوٰۃ صرف کسی فرد کو یا ادارے کو بھی دی جا سکتی ہے؟

جواب: زکوٰۃ ہر اس فرد کو دی جا سکتی ہے جو آپ کے خیال میں اس کا مستحق ہو اور ہر اس ادارے کو بھی دی جا سکتی ہے جو دین وملت یا فقرا و مساکین کی بھلائی کے لئے سرگرم عمل ہو۔ زکوٰۃ ایک خیر ہے فقہاء نے تملیک ذاتی کی شرط لگا کر اس خیر کو محدود کرنے کی کوشش کی یہ غلط رویہ تھا۔

سوال: لیکن اجماع امت سے فقہاء نے پابندی عائد کی ہے کہ زکوٰۃ اداروں کو نہیں دی جا سکتی تملیک ذاتی ضروری ہے ورنہ زکوٰۃ ادا نہیں ہوگی۔

جواب: تملیک ذاتی کی شرط قرآن وسنت سے ثابت نہیں ہے یہ فقہاء کا استنباط ہے اور غلط ہے۔

سوال: آپ نے شروع میں فرمایا تھا کہ زکوٰۃ صرف اور صرف حکومت کو، بیت المال کو_____ نظم اجماعی کے اخراجات کے لیے ادا کرنا لازم ہے لیکن اب آپ فرما رہے ہیں کہ زکوٰۃ فرد کو بھی دی جا سکتی ہے اور کسی ادارے کو اجتماعی بہبود کے لیے بھی دی جا سکتی ہے تو آپ کے دونوں بیانات تو بالکل متضاد ہیں۔

جواب: آپ تاخیر سے تشریف لائے ہیں آپ نے پوری بحث نہیں سنی اس لیے آپ کا سوال مناسب نہیں پہلے آپ یہ گفتگو مکمل سن لیں پھر سوال کریں۔

سوال: ایک اسلامی حکومت غیر مسلموں پر کتنا ٹیکس لگا سکتی ہے؟

جواب: چونکہ آج کل تمام مسلمان ممالک کے اندر جو غیر مسلم رہتے ہیں' ان کی حیثیت ذمی کی نہیں' بلکہ معاہد (یعنی جو غیر مسلم ایک معاہدہ کے تحت کسی مسلمان میں رہ رہے ہوں) کی ہے' اس لئے مسلمانوں کی حکومت ان سے جن شرائط پر چاہے' معاملات طے کر سکتی ہے۔لیکن انصاف کا لازماً تقاضہ یہ ہے کہ ان پر جو بھی ٹیکس' محصول' عائد کیا جائے اس کی شرح ہرگز مسلمانوں کی شرح سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ کم ہو تو بہتر ہے اس طرح مسلمانوں اور غیر مسلموں میں موالات' مواسات' مواخات بلکہ محبت کا تعلق قائم ہو جائے گا جو رواداری کے فروغ میں معاون ہوگا۔

سوال: اگر مسلمانوں پر زیادہ ٹیکس لگائے گئے اور غیر مسلموں پر کم ٹیکس تو لوگوں کے دل میں غیر مسلم بننے کا رجحان پیدا ہو سکتا ہے۔اسلامی حکومت کوئی ایسا اقدام نہیں کر سکتی جو کفر کے فروغ باطل کے ارتقاء اور شر کے غلبے کو ممکن بنا دے۔شبلی نعمانی کی تحقیق یہ ہے کہ جزیہ اور زکوٰۃ کی شرح میں کوئی خاص فرق نہیں ہے یہ مساوات کے اصول پر لگایا گیا۔

جواب: یہ صرف تخیلاتی سوال ہے اسلامی تاریخ میں ایسا کبھی نہیں ہوا مسلمان ایثار کرتے ہیں وہ اللہ کے دین کے لیے قربانی دیتے ہیں وہ انفاق کرتے ہیں اللہ کی راہ میں وہ کفار سے زیادہ دیں تو اس میں کیا ہرج ہے؟

سوال: رسالت مآبؐ نے اور خلفائے راشدین نے آلات جنگ، زیورات، عطر وغیرہ کے کارخانوں یا آج کی اصطلاح میں صنعتوں سے پیداوار کے موقع پر کبھی ٹیکس نہیں لیا اور نہ ہی کسی روایت میں پانچ فی صد یا دس فی صد یا بیس فی صد زکوٰۃ کا حکم ملتا ہے اس زمانے میں سونے، لوہے وغیرہ کی صنعتیں عام تھیں مگر ان صنعتوں پر آپ کی شرح سے کبھی عہد رسالت یا خلافت راشدہ میں یا بعد کے دور میں کبھی زکوٰۃ نافذ نہیں ہوئی تو آپ کس دلیل، حدیث، قول رسول کی بنیاد پر یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زکوٰۃ کی شرح دس فی صد ہے پانچ فی صد ہے۔ڈھائی فی صد نہیں ہے؟

جواب: پہلے بھی عرض کر چکا ہوں ان تمام غلط سلط اعتراضات علماء کے پیدا کردہ اشکالات اشتباہات وغیرہ کا جواب میں میزان کی اشاعت اوّل میں جلد دوں گا۔

سوال: آپ نے تجویز کیا ہے کہ غیر مسلموں پر مسلمانوں سے زیادہ ٹیکس نہیں لگایا جائے گا مگر یہ تو غیر مسلموں پر ظلم ہے کیوں کہ میثاق مدینہ میں تو ان سے کسی قسم کا مالی مطالبہ نہیں کیا گیا یہ رسالت مآبؐ کی سنت ہے آپ اسے سنت نہ مانیں مگر آپ نے یہ اصول بیان کیا ہے کہ رسول کا قول فعل حدیث اگر سند سے ثابت ہے اور نص کے خلاف نہیں تو وہ حجت ہے۔ میثاق مدینہ سند سے ثابت ہے اور آپ نے کئی مضامین میں اس کی عربی عبارتیں نقل کی ہیں۔ میثاق مدینہ میں یہود و نصاریٰ سے بیت المال کو زکوٰۃ دینے کا مطالبہ نہیں کیا گیا جب کہ آپ نے محاضرات میں فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین زکوٰۃ سے اس کی شرح سے مصارف سے واقف تھے اور اس پر عامل تھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ میثاق میں معاہدین سے کوئی مالی مطالبہ سرے سے نہیں کیا گیا تو اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ معاہدین، اہل کتاب سے کوئی مالی

تاوان، ٹیکس نہ لیا جائے ___ میثاق مدینہ کے مطابق رسالت مآبؐ نے یہود جیسے دشمنان دین سے کوئی مالی مطالبہ کئے بغیر ان کو اسلامی ریاست میں مسلمانوں کے مساوی شہریت کے حقوق دیئے وہ زکوٰۃ اور صلوٰۃ کے قائل نہیں بلکہ عامل تھے آپ کی تحقیق بھی یہی ہے لیکن رسالت مآبؐ نے ان سے زکوٰہ ریاست کے لئے نہیں لی اس سے ثابت ہوا کہ شہریت کے لئے ریاست کو زکوٰۃ ادا کرنے کی شرط بھی لازمی نہیں ہے۔ زکوٰۃ تو کفار مشرکین اور اہل کتاب دیتے ہی تھے۔ مکّی سورتوں میں بھی زکوٰۃ کے احکامات موجود ہیں مگر رسول اللہؐ نے یہودیوں سے زکوٰۃ نہیں لی۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ مکہ میں مسلمانوں کی حکومت نہیں تھی تو مسلمان زکوٰۃ کسے دیتے تھے اور جب حکومت نہیں تھی تو اللہ تعالیٰ بار بار مسلمانوں کو زکوٰۃ دینے کی ہدایت کیوں کرتے تھے جب ریاست موجود نہیں ہے تو زکوٰۃ کون وصول کرے گا؟ لہٰذا آپ کا یہ استدلال کہ زکوٰۃ صرف ریاست ہی لے سکتی ہے زکوٰۃ صرف اسے دی جائے گی تو ریاست کے بغیر زکوٰۃ کا حکم کیا بے معنی حکم نہیں ہے؟

جواب: آپ شاید تاخیر سے تشریف لائے ہیں اگر آپ شروع میں شریک ہوتے تو آپ کے بہت سے سوالات کا جواب مل جاتا اس پروگرام کی ریکارڈنگ آپ آغا طارق سجاد صاحب سے حاصل کر کے سُن لیں پھر بھی کوئی شبہ ہو تو پوچھ لیجئے میں کراچی میں ہوں وقت لے کر آجایئے۔

سوال: آپ نے کہا کہ اسلامی حکومت زکوٰۃ کے سِوا کوئی ٹیکس نہیں لے سکتی اس کی شرعی دلیل کیا ہے اسلامی تاریخ میں کئی حکمرانوں نے ٹیکس وصول کئے۔ خلافت راشدہ میں بھی درآمدات کے تاجروں پر ٹیکس عائد کرنے کے شواہد ملے ہیں۔ خلافت راشدہ کے بعد کے ادوار میں بیت المال جب خالی ہوتا تو علماء کے مشورے سے ٹیکس لگا دیا جاتا تھا اگر ٹیکس لینا اسلامی حکومت کے لئے حرام ہے تو اسلامی ریاست اور علماء نے یہ حرام کیسے کیا؟

جواب: اسلامی تاریخ میں بہت سے کام علماء نے حکمرانوں کی خوشنودی کے لئے کئے ٹیکس بھی ان کے کہنے پر لگائے گئے مگر ایسے علماء بھی ہیں جنھوں نے ٹیکس لگانے سے انکار کیا جیل بھی گئے۔ یہ بات درست ہے کہ ٹیکس لگایا جاتا تھا بشرطیکہ بیت المال خالی ہو۔ مگر اس کے لئے اہل الرائے اصحاب الرائے علماء سے مشورہ ضروری ہے لہٰذا جب کبھی ٹیکس لگایا جائے تو شرط یہ ہوگی کہ حکمران ثابت کریں کہ ان کا خزانہ خالی ہے۔ ٹیکس عوام اور اسلام کے مفاد میں لگایا جارہا ہے اجتماعی مصالح عامہ پیش نظر ہیں۔ عصر حاضر میں چونکہ جمہوریت ہے اور جمہوریت کا اصول اسلام ہی نے دیا ہے اور جمہور کی نمائندگی پارلیمنٹ کرتی ہے لہٰذا عوام کے قائم مقام کی حیثیت سے پارلیمنٹ ٹیکس لگا سکتی ہے اسے اس کا مکمل اختیار حاصل ہے جو صرف اسے خدا نے ہی نہیں بلکہ عوام نے بھی دیا ہے۔ پارلیمنٹ کے فیصلے سورہ شوریٰ کی آیت کے تحت وَالَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِرَبِّهِمْ وَأَقَامُوا الصَّلوٰةَ وَأَمْرُهُمْ شُورٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنفِقُونَ [۴۲:۳۸] آجاتے ہیں نظم حکومت کی اساس یہی آیت ہے عوام کی رضامندی پارلیمنٹ کے انتخابات کے ذریعے آجاتی ہے۔ لہٰذا صرف پارلیمنٹ وہ ادارہ ہے جو خالق اور مخلوق کی رضا کا سنگم ہے۔ لہٰذا پارلیمنٹ ٹیکس عائد کرے تو جائز ہوگا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ عہد حاضر کی ریاست اور اٹھارہویں صدی سے پہلے کی ریاست میں ایک بنیادی تغیر واقع ہوگیا ہے وہ تغیر یہ ہے کہ اٹھارہویں صدی سے پہلے عوام ریاست و حکومت کے محتاج نہ تھے۔ عوام کی زندگی میں ریاست کا عمل دخل بہت محدود تھا جدید ریاست عوام کی خواب گاہوں تک میں داخل ہوگئی ہے زندگی کا کوئی شعبہ

ریاست وحکومت کے دائرہ سے باہر نہیں ہے ____ پہلے تعلیم، طب، روزگار، فلاح و بہبود یہ سب کچھ ریاست کی بنیادی ذمہ داری نہ تھی اسی لئے خروج صرف کفر لواح کے ارتکاب پر ہوسکتا تھا مگر اٹھارہویں صدی کے بعد جدید فلاحی پارلیمانی ریاست جس کا کوئی تصور سابقہ تاریخ میں موجود نہیں اس نے عوام کی فلاح و بہبود روزگار ہر شے کی ذمہ داری قبول کی ہے یہ بہت بڑی تبدیلی ہے۔لہٰذا عوام اب ہر کام کے لئے ریاست کی طرف دیکھتے ہیں لہٰذا اس صورت حال میں جب ریاست کو عوام نے تمام ذمہ داریوں کا مرکز بنادیا تو ٹیکس لامحالہ حکومت کی ضرورت ہے۔عوام نے بھی ریاست کو تمام کاموں کا مجاز بنایا لہٰذا عوام نے بھی ریاست کو اپنے نمائندوں کے ذریعے ہر سال بجٹ میں ٹیکس عائد کرنے اور ٹیکس منسوخ کرنے کی اجازت دی اس میں کوئی بات خلاف شریعت نہیں خلاف عقل نہیں خلاف فطرت نہیں حالات و زمانے کے بدلنے سے احکامات شریعت بھی بدل جاتے ہیں یہ شریعت کی تبدیلی نہیں حالات کی تبدیلی ہے بدلتے ہوئے حالات میں ٹیکس کا اختیار شریعت سے اخذ کردہ ہی اختیار ہے۔

سوال: پہلے آپ نے کہا کہ ٹیکس لگانا نص سے ممنوع ہے اب آپ کہہ رہے ہیں جائز ہے کیا یہ تضاد نہیں ہے؟

جواب: ہر قانون میں استثناء ہوتا ہے میں نے استثناء بیان کیا ہے خاص صورت خاص حالات کا ذکر کیا ہے اصولاً ٹیکس نہیں لگایا جاسکتا مصالح عامہ کے تحت استثنائی طور پر حالت اضطرار کے تحت ہر وقت عائد کیا جاسکتا ہے مگر یہ ارباب حل وعقد کے مشورے اجازت سے یعنی پارلیمنٹ کی منظوری سے یعنی عوام کی رضامندی سے مشروط ہے۔آج کل کی سیکولر ریاستوں کی طرح یہ اختیار آزادانہ نہیں ہے کہ ایک SRO اور آرڈیننس سے ٹیکس لگادیا اور کسی کو فائدہ پہنچانے کے لئے یہ ختم کردیا۔

مصنف ابن ابی شیبیھہ میں ہے کہ حضرت عمرؓ نے اہل ذمہ کے اموال ظاہرہ کے مال تجارت پر بیس دینار پر ایک دینار ٹیکس لگایا گزرنے والے تاجروں پر بھی حضرت عمرؓ نے سال میں ایک مرتبہ ٹیکس لگایا اور حکم دیا کہ تحریری دستاویز بھی دو کہ ثبوت رہے و اکتب لھم براۃ الی مثلھا من الحول بما تاخذ منھم یقیناً آپ یہ اعتراض کریں گے کہ جب اللہ نے ٹیکس کی شرح طے کردی تو اب عوام کو بھی کوئی اختیار نہیں کہ وہ اپنے اوپر ٹیکس عائد کرنے کی اجازت حکومت کو دیں یہ شریعت میں مداخلت ہے تحریف دین ہے میرا استدلال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنا پورا مال انفاق فی سبیل اللہ میں دینا چاہتا ہے تو دے دے قرآن اسے منع نہیں کرتا ریاست کو ٹیکس دینا چاہتے ہیں اپنی مرضی سے دینا چاہتے ہیں تو قرآن نے اس کی مخالفت کب کی ہے قرآن شریعت رسالت مآبؐ اور قانون زکوٰۃ نے تو ریاست کے اختیارات پر تحدید عائد کی ہے کہ تم کوئی ٹیکس نہیں لگاسکتے۔عوام کے اختیارات پر نص نے کوئی قدغن عائد نہیں کی۔ اگر عوام ٹیکس دینے پر راضی ہیں تو آپ کو اس میں کچھ خرابی کیوں محسوس ہورہی ہے اس کی وضاحت فرمائیے۔

کتاب الاموال میں ابوعبید نے نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ نبطیوں سے زیتون اور گیہوں پر نصف عشر لیا کرتے تھے تاکہ مدینہ میں سامان زیادہ مقدار میں پہنچے۔ذمیوں سے حضرت عمرؓ نصف عشر لیتے تھے ان سے اسی پر صلح ہوئی تھی نیز ذمیوں سے ان کے پھلوں فصلوں مویشی اور دیگر اموال پر کوئی مطالبہ نہیں تھا۔شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ اور البدر و البازغہ میں عادلانہ محصولات [Taxes] کا ذکر کیا ہے اور تکملہ فتح الملھم ،لسان العرب لابن منظور، بذل المجھود، البحر الرائق درمختار ، میں ٹیکس کی اجازت کے تمام حوالے موجود ہیں اور ان احادیث کے بارے میں یہ تصریح موجود ہے کہ حدیث میں جن ٹیکسوں کی مخالفت ہے وہ ظالمانہ غیر عادلانہ ٹیکس ہیں۔

ضريبه يا غلة کے نام سے بھی ٹیکس خیرالقرون میں موجود تھا صحیح بخاری کتاب الاجارہ باب ضریبة میں رسالت مآب کی حدیث ہے کہ ان کے مالکوں سے ان کا ٹیکس کم کرنے کی بات کی تو ان کے ٹیکس میں کمی کردی گئی فامر له لصباع او صاعين من طعام وكلم مواليه فخفف عن غلة او ضريبة

سوال: آپ نے یہ کہا کہ ٹیکس کی مخالفت کرنے والے علماء کو جیل بھیجا گیا یہ بات درست نہیں ہے اصلاً تاتاریوں سے مقابلے کے لئے بادشاہ نے جب علماء کو بلایا اور ٹیکس لگانے کے لئے فتویٰ طلب کیا اور اس دستاویز کی توثیق کے لئے امام نوویؒ سے کہا تو انھوں نے علماء کی دستاویز کی توثیق کرنے سے انکار کردیا۔ دیگر علماء نے صرف مصالحت وضرورت کے پیش نظر عارضی ٹیکس لگانے کی اجازت دی تھی امام نوویؒ نے انکار کی وجہ سلطان کو یہ بتائی کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تمھارے پاس ایک ہزار غلام ہیں ہر غلام کے پاس سونے کی تھیلی ہے دوسو باندیاں ہیں ہر ایک کے پاس زیورات کی پوٹلیاں ہیں یہ سارا مال جب جہاد کی تیاریوں میں صرف کرلو گے تب میں ٹیکس کا فتویٰ دوں گا کہ اب ٹیکس رعایا سے لینا جائز ہے۔ ظاہر ہے بیبرس امام صاحب سے ناراض ہوا انھیں دمشق سے نکال دیا گیا۔ اس واقعہ سے یہ ثابت ہوا کہ علماء بادشاہ کی خوشنودی کے لئے ٹیکس نہیں لگاتے تھے ٹیکس حرام نہیں تھا مگر ٹیکس مشروط تھا۔ لہٰذا آپ کا یہ استدلال ہے کہ علماء سوحکمرانوں کی خوشنودی کے لئے ٹیکس عائد کرتے تھے اسلام میں ٹیکس نہیں درست بات نہیں ہے۔؟

جواب: آپ نے بار بار مجھ سے حوالے طلب کئے ہیں آپ بھی اس واقعے کا حوالہ پیش کیجئے پھر کچھ عرض کرسکوں گا۔

سوال: آپ کی گفتگو سے بات بہت اُلجھ گئی ہے ایک جانب آپ کہہ رہے ہیں کہ حکمران ہمیشہ ٹیکس لگا کر عوام پر ظلم کرتے رہے ہیں اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے شرعی ٹیکس زکوٰۃ کے ذریعے حکومتوں کے ظلم کو روک دیا اور ان کے ہاتھ کاٹ کر رکھ دیئے یہی مفہوم ہے آپ کی گفتگو کا کہ حکمرانوں کے ظلم، تعدی، بربریت، بہیمیت، اللّے تللّوں، عیاشی سے بچانے کے لئے حکومت وریاست سے زکوٰۃ کے قانون کے ذریعے ہمیشہ کے لئے ٹیکس لگانے کا اختیار چھین لیا گیا ـــــ یہ بہت اہم بنیادی مقدمہ ہے۔ مگر دوسرے ہی سانس میں آپ ارشاد فرما رہے ہیں کہ عوام کی مرضی خدا کی مرضی پارلیمنٹ میں ہے اور پارلیمنٹ ٹیکس لگا سکتی ہے ـــــ جب قرآن وسنت نے حکمرانوں کے ٹیکس لگانے کے اختیارات ختم کردیئے جیسا کہ آپ کا مقدمہ ہے اور آپ نے جو آیات قرآنی سنائیں اور احادیث کا حوالہ دیا تو اس سے ہم یہی سمجھے ہیں کہ حکومت ریاست اب کوئی ٹیکس عائد نہیں کرسکتی یہ آپ کا منصوص سے اخذ کردہ مقدمہ ہے۔ مگر آپ یہ بھی فرمارہے ہیں کہ عوام کی اجازت سے ٹیکس جب چاہے لگایا جاسکتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب قرآن وشریعت نے ٹیکس لگانے کی قطعی ممانعت کردی تو عوام کو پارلیمنٹ کو حکومت کو یہ اختیار کیسے مل گیا اگر یہ اختیار ہے تو اس کا ثبوت بھی قرآن وسنت سے ثابت ہونا چاہیے۔ کیا آپ یہ کہنا چاہ رہے ہیں کہ قرآن اور سنت کا متبادل یا مترادف عوام پارلیمنٹ اور حکومت ہیں جس طرح خدا اور اس کا رسول شریعت دیتے ہیں شریعت میں تخصیص و تعمیم کرتے ہیں شریعت میں تبدیلی کرتے ہیں شریعت کے احکامات کو موخر ومقدم کرسکتے ہیں بالکل یہی اختیار عصر حاضر کی پارلیمنٹ عوام حکومت کو حاصل ہے؟

جواب: آپ میری بات نہیں سمجھ سکے یہ میری کج مج بیانی ہے۔ بنیادی بات یہ ہے کہ سورہ شوریٰ کی آیت بارہ کے تحت مشورہ ہوگا۔ سورہ آل عمران کی آیت کے تحت بھی مشورہ ہوگا فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ

وَ اسۡتَغۡفِرۡلَهُمۡ وَ شَاوِرۡهُمۡ فِی الۡاَمۡرِ فَاِذَا عَزَمۡتَ فَتَوَكَّلۡ عَلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الۡمُتَوَكِّلِیۡنَ[۳:۱۵۹] یہ مشورے شوریٰ کر سکتی ہے پارلیمنٹ سے ہوسکتا ہے ریفرنڈم الیکشن گیلپ پول مختلف سروے وغیرہ یہ سب مشورے کی شکلیں ہیں۔ قرآن نے اس کا حکم دیا ہے اس میں کوئی چیز غیر قرآنی نہیں۔ جمہوریت اسلام سے ثابت ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ جمہوریت کے اصول کو عقائد کے باب میں شامل کردینا چاہیے۔ عوام کی رضا ہی خالق کی رضا ہوتی ہے۔ محاورہ آپ نے سُنا ہوگا زبان خلق کو نقارۂ خدا کہئے *Gerenal Will* کا تصور کیا ہے یہی کہ عوام کی رائے ان کا فیصلہ درست ہوتا ہے۔ کیوں کہ لوگ فطرت پر ہوتے ہیں عموماً فطرت سے انحراف نہیں کرتے لہٰذا عموماً ان کے فیصلے بھی فطری ہوتے ہیں یعنی عین شریعت کے مطابق میں نے پہلے بھی کہا کہ قرآن نے زکوٰۃ کے ٹیکس کے ذریعے ریاست کا ٹیکس لگانے کا اختیار ہمیشہ کے لیے چھین لیا لیکن عوام کو یہ اختیار دیا کہ وہ اگر مناسب سمجھیں تو اپنے اوپر ٹیکس عائد کرنے کی اجازت ریاست کو دے دیں یہ لطیف نکتہ ہے جو اسلامی علمیت کا طرۂ امتیاز ہے۔

سوال: یعنی آپ نے تسلیم کرلیا کہ اللہ، رسول اللہ، اللہ کی شریعت، رسول کا اسوہ حسنہ، عوام کی رائے، پارلیمنٹ، حکومت کے فیصلے سب ایک جیسے ہی ہوتے ہیں۔

جواب: آپ اگر منطق کے اصولوں کے تحت میرے بیان کا جائزہ لے رہے ہیں تو شاید یہ بات درست ہو لیکن میں یہ بات منطق کے منہاج میں نہیں اسلامی علمیت کے منہاج میں بیان کر رہا ہوں اس کا سیاق وسباق تناظر سب کچھ مختلف ہے۔

سوال: غامدی صاحب نہایت ادب کے ساتھ بتانا چاہتا ہوں کہ احادیث میں ٹیکس کی بہت مذمت کی گئی ہے مسند احمد کی حدیث ہے ان صاحب مکس النار رسالت مآبؐ نے فرمایا کہ ٹیکس وصول کرنے والا جہنم میں جائے گا۔ کتاب الاموال میں بھی یہ حدیث موجود ہے صحیح مسلم میں کتاب الحدود باب حد الزنا میں حضرت غامدیہ کے رجم کی روایت میں رسالت مآبؐ کا یہ ارشاد موجود ہے فوالذی نفسی بعدہ لقد تابت توبة لو تابھا صاحب مکس لغفرله کہ غامدیہ نے ایسی سچی توبہ کرلی ہے کہ اگر ٹیکس والا بھی ایسی توبہ کرلیتا تو اس کی بھی مغفرت ہوجاتی اس سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ ٹیکس زنا اور بدکاری سے بھی بدتر اور قبیح ہے کیا آپ اسلامی ریاست کو زنا اور بدکاری سے زیادہ قبیح فعل کی اجازت دے رہے ہیں؟

جواب: ان احادیث کا موقع ومحل الگ ہے احادیث کو سمجھنے میں ہمارے یہاں بہت سی غلطیاں ہوئی ہیں اس موضوع پر ہم ایک اہم کام علم النبی، فقہ النبی کے نام سے مرتب کر رہے ہیں معز امجد، ساجد حمید، سلیم شہزاد، رفیع مفتی صاحب اس کام میں مصروف ہیں۔ یہ احادیث وآثار کی جمع وتدوین اور ان کے متون کی تنقیح کا کام ہے۔ اس کا انتظار کیجئے آپ کے تمام اشکالات دور ہوجائیں گے اس مختصر نشست میں اس سوال کا تفصیلی جواب ممکن نہیں ____ اس قسم کے شبہات اور سوالات صرف ان لوگوں کے ذہن میں اصول استقراء کے تحت پیدا ہوتے ہیں جو قرآن وسنت کا وسیع علم نہیں رکھتے اور اس کی تاریخ سے واقف نہیں ہوتے۔ اہل علم کے ذہنوں میں یہ سوالات اس لئے پیدا نہیں ہوتے کہ وہ اس سوال کے تاریخی تناظر سے بخوبی واقف ہوتے ہیں۔

سوال: بعض حدیثوں میں یہ بھی آیا ہے کہ ٹیکس والے کی مغفرت نہ ہوگی جیسے مجمع الزوائد، کنز العمال، الترغیب والترھیب، المعجم الکبیر للطبرانی، مجمع البحرین فی زوائد المعجمین، سنن ابو داؤد، سنن الدارمی، شرح معانی آلاثار، المعجم الکبیر

للطبراني، مشكوة المصابيح ،ردالمختار، المستدرك للحاكم وغیرہ میں ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف دولوگوں کی مغفرت نہیں کرتے زانیہ عورت اور ٹیکس وصول کرنے والا ان الله تعالیٰ یدنو من خلعة فیغفر لمن استغفر الاالبغی بفرجها والعشار ــــــ الا زانیه لتسعی بفرجها او عشار اور یہ حدیث بھی المعجم الکبیر للطبرانی میں ہے ان تقسیم عشار افاقتلوه یعنی اگر تمھارا ٹیکس والے سے آمنا سامنا ہوتو اسے قتل کردو ـــــ ان احادیث کی شرح وضاحت کیسے کی جائے کہ پارلیمنٹ کا ٹیکس لگانے کا اختیار دائرہ شریعت میں آجائے۔

جواب: جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ انتظار کیجئے علمی موضوعات چند لمحوں میں حل نہیں ہوتے کتاب آرہی ہے اس میں یہ مسائل انشاءاللہ شرح وضاحت سے بیان کردیئے جائیں گے۔سردست آپ بخاری، تاریخ یحيٰ بن معین ، قریش قبل الاسلام دورها السیاسی والاقتصادی والدینی، القائد الیٰ عیون العقائد، المفصل فی تاریخ العرب قبل الاسلام، العرب فی العصور القدیمة، ان کتابوں میں لکھا ہے کہ رسالت مآبؐ کے عہد میں خلافت راشدہ میں بھی ٹیکس لیا گیا اور بعد کے ادوار میں بھی ٹیکس لیا جاتا رہا بہ ظاہر ان متضاد احادیث ، روایات ،تاریخی واقعات میں تطبیق کی ضرورت ہے۔لہٰذا ٹیکس میری ایجاد کردہ بدعت نہیں ہے اس بدعت کا تعلق خیرالقرون سے ہے۔

سوال: آپ نے جن کتابوں کے حوالے دیئے ہیں ان میں تو ٹیکس کے مباحث سرے سے موجود نہیں، نہ کتابوں کا موضوع اسلام کا نظام محصولات ہے؟ فراہی صاحب کی کتاب عیون العقائد میں تو ٹیکس کی بحث سرے سے موجود ہی نہیں ہے۔

جواب: پہلے آپ ان کتابوں کو پڑھ لیں پھر بات کیجئے گا۔میرا ٹیلی فون نمبر آغا صاحب، شکیل صاحب، نثار صاحب سے لے لیجئے ،میرا ڈاک کا پتہ اشراق پر درج ہے۔

سوال: اگر قرض پر منافع ختم کردیا جائے تو پھر اسلامی معیشت کے تحت بینک کاری نظام (Banking System) کیسے چلے گا؟

جواب: ہمارے دین میں قرض پر منافع کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔اس میں تو صرف قرض حسنہ دیا جاتا ہے اور مجبوری کے سوا قرض لینے کو بھی ناپسند کیا گیا ہے رسالت مآبؐ مقروض کی نماز جنازہ نہیں پڑھتے تھے۔اس لئے اسلامی معیشت کے تحت نہ کسی بینک کاری نظام کی ضرورت ہے اور نہ اس میں یہ ممکن ہے کہ بنکوں کو قائم رکھا جاسکے۔البتہ بنکوں کو صرف اور صرف ریاستی سرپرستی میں امانت داری کے نظام کے لیے امانتوں کی حفاظت کے لیے استعمال کیا جاسکتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں زیادہ تر سودی قرضے تجارتی مقاصد ہی کے لئے حاصل کئے گئے۔ ذاتی مقاصد کے لئے حاصل کئے گئے قرضوں کی مقدار بہت کم ہوا کرتی تھی' کیوں کہ ہر قبیلہ اپنے غریب افراد کی سرپرستی کا ذمہ دار تھا۔ اسلام نے ان دونوں قسم کے قرضوں کے سود پر کامل پابندی لگادی۔عصر حاضر میں سود نے ایک نظام کی شکل اختیار کرلی ہے صنعتی دنیا میں سود کا سب سے بڑا آلہ بینک ہے اسے خصوصی طور پر سود کے لئے ہی تخلیق کیا گیا ہے۔

سوال: بلاسود بینک کاری یا بالفاظ دیگر شراکت ومضاربت کی بنیاد پر بینک کاری کا تصور کیا ہے؟

جواب: اس میں کارفرما تصور یہ ہے کہ بینک کے پاس جو رقومات رکھی جائیں' ان سے بینک خود کاروبار کرے اور منافع فریقین میں تقسیم کرلیا جائے

مگر بینک ایک کاروباری ادارہ نہیں ہے۔ بینک اپنے آپ کو کسی کاروبار میں ملوث نہیں کرتا وہ صرف قرضے سے بڑی مالی ضمانت کے بعد آپ کو قرض اپنی شرح سود پر دیتا ہے اسے آپ کے کاروبار کے نفع ونقصان سے کوئی تعلق ہی نہیں ہوتا۔ اسلامی بینک کاری نے جو شراکت ومضاربت کا دعویٰ کیا جس میں نقصان رب المال کے ذمے ہوتا ہے۔ لہٰذا اصلاً اسلامی بینکوں نے تمام سودی کام مرابحہ کے حیلوں سے کیا ابھی تک شرکت ومضاربت میں اسلامی بینک کاری کا حصہ اعشاریہ دس فی صد ہے۔ لہٰذا بلاسود بینک کاری کے تمام تجربے آخر کار سودی بینک کاری ہی کے طریقوں میں تبدیل ہوگئے ہیں۔

یہ بات بالکل واضح ہے کہ بینک ایک کاروبار کرنے والا ادارہ نہیں ہے۔ وہ لوگوں کی بچت محفوظ ترین ضمانتوں کے بدلے دوسروں کو قرضے مہیا کرنے کا ادارہ ہے اگر وہ خود کاروبار میں واقعی شرکت کرے تو وہ بینک نہیں رہے گا۔ بینک کبھی کاروبار کرتا ہی نہیں۔ اسلامی بینک جو شراکت ومضاربت کے دعوے کرتے ہیں یہ جھوٹ ہیں۔ یہ صرف شراکت ومضاربت کے نام پر سودی قرضوں کو حیلوں سے حلال کر کے غیر سودی قرضوں میں تبدیل کرتے ہیں۔ لوگ ان کے پاس قرضے لینے آتے ہیں۔ یہ بازار میں قرض دینے بیٹھے ہیں جیسے ہی کوئی قرض کا طلب گاران کے پاس آتا ہے یہ اسے حیلے سے شراکت ومضاربت کی گرفت میں لے آتے ہیں۔ نہ بینک مارکیٹ میں شراکت کے لئے بیٹھے ہیں نہ لوگ بینکوں سے شراکت ومضاربت کے لئے آرہے ہیں یہ سفید جھوٹ ہے۔ لوگ اپنی ضروریات، تعشیات، مکان گاڑی کے لیے قرض لینے آتے ہیں اور یہ بینک انھیں فوراً کاروبار میں شراکت کی دعوت دے کر جبراً انھیں اپنا کاروباری حصہ دار بنا لیتے ہیں حالانکہ وہ بچارے تو مارکیٹ میں قرضے کی تلاش میں آئے تھے اب اسے حیلے سے کاروبار بنا دینا اور شراکت، مرابحہ ومضاربت کے اصولوں کا اطلاق کر دینا ایک جبر ہے۔

سوال: اسراف اور تبذیر کیا چیز ہے' اس کے تحت کیا منع ہے؟

جواب: قرآن مجید کے مطابق کسی مسلمان کے لئے اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کے معاملے میں' اعتدال اور میانہ روی کا طریقہ چھوڑ کر' فضول خرچی کرنا اور مال اللے تللے اڑانا جائز نہیں یٰبَنِیۡۤ اٰدَمَ خُذُوۡا زِیۡنَتَکُمۡ عِنۡدَ کُلِّ مَسۡجِدٍ وَّ کُلُوۡا وَ اشۡرَبُوۡا وَ لَا تُسۡرِفُوۡا ۚ اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الۡمُسۡرِفِیۡنَ [۷:۳۱] اسی کے تحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی قیمتی کپڑے پہننے پر پابندی لگادی۔ کھانے پینے کے لئے سونے چاندی کے برتن استعمال کرنے کی ممانعت فرمادی۔ مردوں کے لئے زیور کا استعمال ممنوع ٹھہرایا' البتہ خواتین کے لئے صرف آرائش وزینت کی خاطر (نہ کہ تکبّر ونمائش کی خاطر) حد اعتدال کے اندر زیور پہننے کی اجازت ہے۔ علامہ ناصر الدین البانی کی تحقیق تو یہ ہے کہ مستند احادیث سے ثابت ہے عورتوں کو بھی سونے کے زیورات پہننے کی اجازت نہیں اور جب بات مستند حدیث کی آجائے تو ہمیں صحابہؓ کے اجماع سے بھی رجوع کر لینا چاہیے۔ اس طرح بنگلوں' کاروں' ملبوسات' زیورات' فرنیچر' سامان آرائش' تقریبات کے دوران اخراجات اور اس طرح کی تمام چیزوں میں اسراف وتبذیر' تکبّر اور نمود ونمائش سے پرہیز لازم ہے۔

سوال: لیکن تمام صحابیاتؓ نے حضرت عائشہؓ نے سونے کا زیور پہنا ہے اور اصول یہ ہے کہ اگر ایک صحابیؓ کا عمل اگر اس کی بیان کردہ روایت کے خلاف ہو تو حدیث قبول نہیں کی جائے گی کیوں کہ صحابی قول رسولؐ کے خلاف عمل نہیں کرسکتا لہٰذ صحابیؓ کا عمل حجت ہوگا قول نہیں۔ تو سونے کے بارے میں احادیث خواہ مستند ہوں۔ اجماع، امت کے تعامل، ازواج مطہرات کے عمل سے متعارض ہیں۔ اگر کاشانہ رسول میں

رہنے والی عورتوں کو سونے کی ممانعت کی احادیث کا پتہ نہیں اور ازواج نبی سونے کے زیورات پہنتی رہیں تو پھر علم دین کا حشر کیا ہوگا؟ لہٰذا میری رائے میں امت کا عمل، جماع اور ازواج مطہرات کا اسوہ امت کے لئے حجت ہے۔ خواہ اس کے مقابل ایسے مؤقف کو رد کرنے کے لیے مستند حدیث ہی کیوں نہ پیش کی جائے یا علامہ البانی جیسا محدث ہی کیوں پیش نہ کیا جائے۔؟

جواب: ویسے بھی میں نے تو علامہ البانی کا حوالہ دیا ہے اس کی تائیدوتوثیق تو نہیں کی۔ لیکن علامہ البانی کی تحقیق کو محض تقریر سے رد نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک اہم بات ہے اس پر تدبّر کی ضرورت ہے۔ تدبر کے بعد ہم حتمی نتیجے تک پہنچ سکیں گے۔

سوال: لیکن غامدی صاحب قرآن کی آیت ہے کہ عورت زیورات میں پالی جاتی ہے اور بحث وحجت میں اپنا مدعا بیان نہیں کر پاتی تو اس نص سے عورت کا زیورات پہننا تو ثابت ہے۔ سامری کے بچھڑے کو بھی تو زیورات پہنائے گئے تھے ظاہر ہے وہ زیورات بنی اسرائیل کی عورتوں کے ہوں گے؟

جواب: میں تو صرف سونے کے زیور کی بات کر رہا ہوں۔

سوال: کیا ریاست اسراف وتبذیر کے مختلف مظاہر پر پابندی لگا سکتی ہے؟

جواب: جی ہاں اس کے لئے حالات کے مطابق' مناسب قانون سازی کی جاسکتی ہے۔

سوال: کیا حرام چیزوں کی تجارت حرام ہے؟

جواب: ہر حرام چیز کی اجرت لینا' مثلاً فاحشہ کی اجرت' جادوٹونے کا نذرانہ' شراب' مردار' سؤر اور بتوں کی خرید وفروخت ناجائز ہے۔

سوال: لیکن سؤر کے بارے میں تو آپ کا نیا مؤقف یہ ہے کہ اس کا صرف کھانا پینا حرام ہے مگر اس کے دیگر استعمالات جائز ہیں تو کیا آپ نے اپنے مؤقف سے رجوع کرلیا ہے؟

جواب: جی نہیں میں اس پر غور وفکر کر رہا ہوں انشاء اللہ میزان میں اس سلسلے میں حتمی رائے پیش کروں گا (واضح رہے کہ میزان ۲۰۰۸ء میں غامدی صاحب نے واضح طور پر یہ حتمی مؤقف پیش کردیا ہے کہ سؤر صرف خورد ونوش کے لئے حرام ہے اس کے دیگر استعمالات جائز ہیں دیکھئے میزان ۲۰۰۸ء ص۔۔ میزان ۲۰۱۵ء ص ۶۳۷]

سوال: کن اوقات میں تجارت حرام ہے؟

جواب: نماز کے وقت' خصوصاً جمعہ کی نماز کے وقت تجارت ناجائز ہے۔

سوال: اسلام میں میراث کا کیا قانون ہے؟

جواب: قرآن مجید میں میراث کا قانون' سورہ نساء میں بیان ہوا ہے۔ اس سے جو احکام نکلتے ہیں' وہ درج ذیل ہیں:

مرنے والے کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے' اس کے ترکے میں سے' وہ ادا کیا جائے گا' پھر کوئی وصیت اگر اس نے کی تو وہ پوری کی جائے گی۔ اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی۔ اسی طرح قاتل' مقتول کی میراث نہیں پاسکتا اور کوئی کافر کسی مسلمان کا اور نہ مسلمان کسی کافر کا وارث ہوسکتا ہے۔ کافر اور کفر کسی زمان ومکان سے متعلق نہیں یہ عالمگیر حکم ہے ہر قسم کا کفر اور کافر قیامت تک اس حدیث کے دائرے میں شامل ہے۔ والدین اور بیوی یا شوہر کا حصہ دینے کے بعد ترکے کی وارث میت کی اولاد ہے۔

مرنے والے نے کوئی لڑکا نہ چھوڑا ہو اور اس کی اولاد میں دو یا دو سے زائد لڑکیاں ہی ہوں تو انھیں بچے ہوئے ترکے کا دو تہائی دیا جائے گا ۔ایک ہی لڑکی ہو تو وہ اس کے نصف کا حق دار ہوگی۔میت کی اولاد میں صرف لڑکے ہی ہوں تو یہ سارا مال ان میں تقسیم کیا جائے گا۔اولاد میں لڑکے لڑکیاں دونوں ہوں تو ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہوگا اور اس صورت میں بھی سارا مال انہی میں تقسیم کیا جائے گا۔

سوال: قرآن کی آیت میراث میں واضح طور پر درج ہے کہ پہلے وصیت پوری کی جائے گی پھر قرض ادا کیا جائے گا پھر میراث تقسیم ہوگی۔آپ نے ترجمے کرتے ہوئے اس قرآنی ترتیب کو بالکل اُلٹ دیا اور فرمایا کہ پہلے قرض ادا ہوگا کہ قرض زندگی میں ہوتا ہے۔کیا یہ بات تحریف فی القرآن نہیں؟ آپ نے یہ بھی کہا کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی اس کی کوئی دلیل نہیں دی کیوں کہ قرآن کی آیت میراث علی الاطلاق بتا رہی ہے کہ وصیت کسی کے بھی حق میں کی جاسکتی ہے وصیت پر کسی قسم کی کوئی تحدید قرآن کے الفاظ نے سرے سے عائد ہی نہیں کی اور امام فراہی و اصلاحی کے اصولوں کے مطابق قرآن کے الفاظ ہی حجت ہیں آپ کا مؤقف بھی یہی ہے____ تو ایک جانب آپ قرآن کو ہر شے پر حجت مانتے ہیں مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ وصیت اور قرآن کے معاملے میں حدیثوں کو حجت مانتے ہیں لہٰذا آپ اصلاً حدیثی اسلام ہی کے علم بردار ہیں۔مگر بہت سے لوگوں کی رائے یہی ہے کہ آپ اور اہل قرآن ایک ہی ہیں؟

جواب: قرآن کے معانی کا تعین اہل قرآن کی طرح صرف لغت سے نہیں ہوتا بلکہ پیغمبر کے عمل، ان کے اسوۂ حسنہ اور اُن کی تشریحات وتفسیرات سے ہوتا ہے____ قرآن کے معانی جس طرح رسالت مآبؐ نے سمجھے اور سمجھائے جس طرح قرآن پر عمل کر کے بتایا اور امت نے صحابہؓ کے ذریعے آیات قرآنی کے فہم کو سمجھا وہ اُمت کے لئے حجت ہے۔قرآن کی آیات کا وہی فہم حجت ہے جو عقلیت کی بنیاد پر نہیں اسوۂ رسولؐ سے متعین ہوگا۔ رسولؐ بتائیں گے کہ قرآن میں کیا چیز مقدم ہے کیا چیز موخر ہے____ ایک صاحبِ ایمان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ حکم رسولؐ اسوۂ رسولؐ کو دیکھے اور اس کے آگے سر جھکا دے۔دین میں ہر حکم کو عقلیت کی بنیاد پر پرکھنا قرآن کے نصوص کا انکار ہے۔قرآن حجت ہے اور قرآن کے فہم کو جاننے کے لئے رسولؐ کا فہم بھی حجت ہے۔اگر آپ اسے حدیثی اسلام کہتے ہیں تو آپ کو اپنی رائے رکھنے کا حق حاصل ہے۔اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ کس کو میراث میں کیا ملنا چاہیے۔اللہ تعالیٰ نے میراث میں جو حصے مقرر فرما دیئے اور رسولؐ نے اس کی جو وضاحت کردی کہ وارث کے حق میں وصیت نہیں ہوسکتی ____ یہ حتمی اصول ہے امت کا اس پر اجماع ہے۔یہ اصول تواتر وتعامل وتسلسل امت سے ثابت ہے۔پوری اسلامی تاریخ میں ایک دن بھی کسی ایک فقیہہ، عالم مجتہد نے اس اصول سے ہٹ کر کوئی فتویٰ نہیں دیا۔لہٰذا میراث کے طے شدہ اصولوں (یعنی پہلے قرض ادا کرنا، پھر وصیت کو پورا کرنا، وصیت کا وارث کے حق میں نہ ہونا، وصیت ایک تہائی سے زیادہ ہونا، وصیت کافر کے لیے نہ ہونا وغیرہ وغیرہ) پر سوال اُٹھانا اعتراض کرنا اللہ اور اس کے رسولؐ، اجماع امت، اجماع صحابہؓ، امت کی تاریخ، تہذیب، علمیت، وحدت پر اعتراض کرنے کے مترادف ہے۔میں اس بات سے پناہ مانگتا ہوں کہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے فرمان کے بعد اپنی عقل سے، منطق سے، یا لغت عرب کی بنیاد پر یا قواعد عربی کے تحت کوئی ایسی بات کہہ دوں جو وارث کے حق میں وصیت کو ممکن بنا دے میں ایسے کسی اجتہاد کا قائل نہیں۔کیا آپ اب بھی یہ سمجھتے ہیں کہ میں اہل قرآن میں سے ہوں؟

طحاویہ،نسفی،العقیدہ،فقہ الاکبر،(مبدی رمسلم)

عقیدہ طحاویہ کے اہم مقامات

عالمی مدارس میں نصاب داخل ہے۔العقیدہ پڑھائی جارہی ہے۔سلطنت عثمانیہ کے پانچ علماء کی کتاب ہے۔اللہ احد ہے واحد ہیں ہے____ نیشنل آرمومنٹ ریاضی سے اللہ کو ثابت نہیں کرتی۔

ابونعیم Religion & Civil Society

یہ سول سوسائٹی تھی سب آکر پوچھتے تھے CS کے تصور کو محدود کیا ہے۔

اسراف حرام ہے میز کرسی پر کھانا مکروہ ہے

human Rights پر____ وہاب بھائی نے کتاب دی۔

ICNA____ قادیانی کافروں سے بچنے کے لئے کافروں سے اتحاد

مسلمان ذمی ہو تو محفوظ رہتا ہے۔برنارڈ ڈیوس جمہوریت نہ ہو تو لوگ روادار ہوتے ہیں۔

شرح عقیدہ طحاویہ____ میں نبوت کا سائنٹیفک نظریہ بیان تھا۔

تنظیم الاسلامی طاہر القادری ۲۰۱۵ء اسلامک اسٹیٹ پر کتاب جاری کی____ برطانیہ کے مسلمانوں کے لئے خاص سلیبس بنایا ہے اِسے پاس کئے بغیر آپ برطانوی شہری نہیں بن سکتے۔شیخ یاسر قاضی نے ہم جنس پرستی کے بارے میں کہا کہ مسلمانوں کو متشدد نہیں ہونا چاہیے۔عیسائیت جب خاموش ہے تو تم کیوں تشدد برت رہے ہو۔براق سے مراد برق اس سے مراد روشنی رسول اللہ روشنی کی دنیا سے آسمان پر پہنچنے لگے۔

طاہر القادری صاحب نے پہلی مرتبہ سورہ البقرہ کا سائنسی ترجمہ پیش کیا ہے۔۱۹۲۶ء میں پہلی مرتبہ شیخ طنطاوی نے قرآن حکیم کی سائنسی تفسیر پیش کی تھی جو دس سال بعد خود سائنسی بنیادوں پر ہی مسترد ہو گئی تھی۔طاہر القادری صاحب نے ''اسلامی ریاست'' پر ۲۰۱۵ء میں کتاب لکھی ہے۔حکومت برطانیہ کے شہری بننے والے مسلمانوں کے لئے طاہر القادری صاحب نے ایک نصاب مرتب کیا ہے جس کا امتحان امیگریشن ڈیپارٹمنٹ لیتا ہے اس امتحان میں کامیابی کے بعد ہی کوئی مسلم برطانوی شہری بن سکتا ہے۔

یہ درست ہے کہ پاکستانی ریاست اسلام کو سپریم لاء کے طور پر تعظیماً حرماً قبول کرتی ہے مگر یہ بھی درست ہے کہ یہاں دارالسلام کے تمام قوانین اطلاق نہیں ہوتا جزوی اطلاق ہوتا ہے۔

شرح اربعین میں شیخ صالح الحسینی نے ابن تیمیہ کا یہ اصول بیان کیا ہے کہ____ بدعت اعتقادی دین سے خارج کرتی ہے بدعت عملی نہیں کرتی۔

اہل سنت میں سے اگر کوئی بدعت کا ارتکاب کرتا ہے تو اہل سنت سے خارج نہ ہوگا۔

غامدی صاحب پر تنقید کرنے والوں نے علم حدیث پر غامدی صاحب کی تنقید کو فقہی بحث بنا دیا ہے اور اس بات کو نظر انداز کر دیا کہ حدیث کے بارے میں ان کا اصولی مؤقف کیا ہے۔وہ حدیث کو بحیثیت ماخذ،مصدر تسلیم نہیں کرتے____ فقہاء کے یہاں تو حدیث ماخذ ہے لہٰذا غامدی صاحب پر تنقید کرتے ہوئے ان کے افکار کو فقہی ماخذ بنا دینا بہت بڑی غلطی ہے۔

☆ اہل سنت کے یہاں کسی بھی شعار دین کو مستقل ترک کر دینا حتیٰ کہ واجبات اور سنتوں کو مستقل بنیادوں پر ترک کر دینا ہی کفر ہے۔

☆ عصر حاضر کے جدیدیت پسند علماء دین کے ماخذ، اجماع اور قیاس کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ دو ماخذات قرآن وسنت کو اصطلاحاً تسلیم کرتے ہیں مگر ان اصطلاحات کی ایسی مسخ شدہ شرح Distorted Interpretation کرتے ہیں کہ یہ ماخذات اصلاً ماخذات نہیں رہتے کیوں کہ ان بنیاد پر جو دین اور احکامات اخذ ہوتے ہیں وہ صرف جدید مفکر کے الہامات نفس ہوتے ہیں___ عہد جدید کے مفکرین دین کے ماخذات میں اب صرف اجتہاد کو اصل شرعی ماخذ تسلیم کرتے ہیں۔ قرآن وسنت اجماع کے بجائے اجتہاد فقہی شرعی ماخذ ہے کیوں کہ اس میں انھیں آزادی اظہار رائے کی مکمل و مطلق اجازت حاصل ہوتی ہے___ حیرت ہے کہ وہ اجماع کو مسترد کرتے ہیں مگر اسلامی تاریخ میں کسی کا تفرد مل جائے تو فوراً اسے قبول کر لیتے ہیں اجماع اور مسلک جمہور کو حجت تسلیم نہ کرنے والے ایک فرد کی رائے کو کیسے حجت تسلیم کر لیتے ہیں صرف اس لئے کہ جدید مفکر اکیسویں صدی میں جس طرح سوچ رہا ہے متقدمین میں سے بھی کسی نے کبھی اس طرح سوچا تھا۔ لہٰذا کسی کا تفرد قرآن وسنت اجماع قیاس سے فائق تر ہے۔

☆ عہد حاضر کے تین بڑے علماء میں سے ایک بڑے عالم نے مغربی ممالک کی شہریت کو جائز قرار دیا ہے۔ حالانکہ دارالحرب مستقل شہریت کا حصول فرع کا نہیں عقیدے کا مسئلہ ہے۔ امت کا اجماع ہے کہ کوئی مسلمان دارالحرب کی مستقل شہریت اختیار نہیں کر سکتا کسی ضرورت حکمت، دینی بصیرت، فرع کے تحت عارضی سکونت کی تو اجازت فقہ میں دی گئی ہے مگر مستقل شہریت کی اجازت کسی فقیہہ سے ثابت نہیں۔ لطف کی بات یہ ہے کہ مذکورہ عالم اجماع کو ماخذ قانون تسلیم کرتے ہیں مگر ان کا فتویٰ ان کے اصول کے خلاف ہے۔ اس صورت میں کیا حدیث کے اس اصول کا اطلاق ان عالم پر کیا جا سکتا ہے کہ اگر راوی حدیث کا عمل حدیث کے خلاف ہو تو عمل قبول کیا جائے گا حدیث مسترد کر دی جائے گی مذکورہ عالم نے جو فتویٰ دیا ہے ان کا عمل اس فتوے کے خلاف ہے کیوں کہ ان عالم کو ایک ملک کی جانب سے شہریت کی دعوت دی گئی ہے تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ شیخ قرضادی تو فرماتے ہیں کہ قصہ اکبر میں بھی جہاد ہو سکتا ہے۔

☆ بڑے بڑے عالمی مدارس میں آج بھی سلطنت عثمانیہ کے پانچ بڑے علماء کی مرتبہ عقیدہ طحاویہ کی شرح پڑھائی جارہی ہے۔ (۲۰۱۵) یہ ایک نیک شگون ہے کہ عقیدے کے معاملے میں امت ایک کتاب ہی سے استفادہ کر رہی ہے۔ تمام مکاتب فکر عقیدہ طحاویہ کو پڑھاتے ہیں یعنی امت اعتقادی طور پر متفق علیہ سے گمراہی میں مبتلا نہیں مگر عملی طور پر یہ گم راہ ہو سکتی ہے۔

۲۰۱۳ء میں پاکستان کا صوبہ بلوچستان شدید زلزلے کی زد میں تھا___ بلوچ قوم شدید تکلیف میں مبتلا تھی۔ بلوچ علیحدگی پسندوں کی برپا کردہ تحریک کے باعث بلوچستان کے بہت سے علاقے مستقل بدامنی کا شکار تھے۔ لہٰذا فلاحی تنظیموں کو ان علاقوں تک پہنچ کر زلزلہ زدگان کی مدد کرنے کی اجازت نہ تھی اور بہت سے علاقوں میں مقامی اور عالمی امدادی، فلاحی تنظیمیں خوف کے مارے جانے پر آمادہ نہ تھیں۔ تباہ شدہ علاقوں میں ایک اہم علاقہ ''آواران'' بھی تھا جو بلوچ عوام کی علیحدگی پسند قوم پرستوں کا بہت بڑا مسکن تھا اور یہاں تباہی بھی بے پناہ ہوئی تھی۔ ہمارے دوست احمد نواز اعوان چند صحافیوں اور امدادی تنظیموں کے ساتھ اس علاقے میں پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں انھوں نے غیرت، خودداری، بے نیازی، کے عجیب مناظر دیکھے انھوں نے جو تاثرات بیان کئے وہ پڑھیے: ہم جب اس علاقے میں امدادی کاروان کے ساتھ پہنچے تو کوئی ایک آدمی یا بچہ بھی ہماری امداد کی طرف لپک کر نہیں آیا۔ تباہ شدہ علاقے میں مختلف ڈھیریوں پر عوام بلوچ بیٹھے ہوئے تھے کسی نے ہم سے امداد نہ مانگی نہ جھپٹنے کی کوشش کی وہ غربت کی تصویر بنے بیٹھے رہے امدادی شمع نے خود سامان ان تک پہنچایا تو انھوں نے لے لیا اور شکریہ ادا کیا۔ پورے علاقے میں کوئی عورت امداد

لینے کے لئے نہیں آئی۔ بچوں کو روپے اور ٹافیاں دی گئیں تو کسی بچے نے بے صبری اور لالچ کا مظاہرہ نہیں کیا نہ ہی ٹافیاں اور پیسے جیبوں میں چھپا کر دوبارہ طلب کرنے کی کوشش کی۔ امدادی ٹیم جو سامان لے گئی تھی وہ ایک جگہ ڈھیر کر دیا گیا تھا کسی نے سامان پر قبضہ کرنے جھپٹنے ملکیت بنانے کی کوشش نہیں کی۔ معلوم ہوا کہ ان کی روایت یہی ہے جو کچھ سامان آتا ہے وہ وہاں اکٹھا کر دیا جاتا ہے جس کو جتنی ضرورت ہوتی ہے وہ وہاں سے اٹھا کر لے جاتا کوئی کسی کو نہیں دیکھتا نہ پوچھتا سب مل جل کر رہتے ہیں۔ یہ نہایت گرم علاقہ ہے یہاں کے لوگ موسم کے لحاظ سے اپنے جوتے اور چپل بناتے ہیں۔ ☆ کسی ایک بچے بڑے کے پیر میں پاکستانی کمپنیوں یا ملٹی نیشنل کی کوئی چپل نہیں تھی۔ بھوسے، کھجور کی چھال سے بنائی ہوئی ان کی چپلیں یہاں کے لئے کارآمد نہیں تھیں ــــــــ یہاں کے لوگ ذکری مذہب سے تعلق رکھتے ہیں، سادہ رہن سہن ہے، آبادی چھ لاکھ سے زیادہ ہے ان کا جتنا بھی نقصان ہوا ہے اسے صرف چھ کروڑ کی امداد سے پورا کیا جاسکتا ہے زلزلے سے نہ کوئی شخص مرا نہ زخمی ہوا ــــــــ کیوں کہ ان کی رہائش گاہ نہایت سادہ اور کشادہ تھیں لہٰذا زلزلہ آیا تو یہ گھروں سے باہر نکل آئے۔ چھتیں، گھاس پھوس اور کیچڑ کی ہیں وہ گریں تو ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گریں جس سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ یہاں کون غریب نہیں تھا گو کہ جدید معاشیات کے اصولوں کے مطابق تمام صحافیوں کو یہ دنیا کا غریب ترین علاقہ نظر آرہا تھا کیوں کہ یہاں ہسپتال، کلینک، بڑی بڑی عمارتیں، بینک، ہوٹل، مارکیٹیں، عیش و عشرت کی دنیا نظر نہیں آرہی تھی۔ سب لوگ نہایت مطمئن تھے اور اپنی روایات کے مطابق اس مصیبت کے باوجود ہماری مہمان نوازی کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اکیسویں صدی میں ایسے لوگوں کو دیکھ کر میں تو حیران رہ گیا۔

احمد نواز اعوان صاحب نے اپنے سفر کے تاثرات ختم کئے تو راقم نے پہلا سوال کیا۔ اعوان صاحب نے کہا اس علاقے میں کوئی اسکول نہیں ہے؟ انھوں نے اس سوال پر حیرت اور تعجب کا اظہار کیا کہ اس گفتگو کا اسکول سے کیا تعلق ہے؟ راقم نے عرض کیا آپ یہ بتایئے کہ وہاں اسکول ہے یا نہیں۔ بچے سرکاری و غیر سرکاری اسکول جاتے ہیں یا نہیں یا روایتی طریقوں سے علم حاصل کرتے ہیں؟ ایک لمحہ توقف کے بعد ان کا جواب تھا وہاں کوئی اسکول نہیں ہے۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ وہاں ایک بچے سے ہم نے سوال کیا کہ بیٹے تم کس اسکول میں پڑھتے ہو بچے نے تعجب سے ہمیں دیکھا اور نہایت فخر سے جواب دیا ہم بلوچ ہوں۔ راقم نے عرض کیا یہ سب اقدار، روایات، رسومات، تہذیب، اخلاق، جو آپ کو آواران کے شہریوں میں نظر آرہی ہیں اس کا سبب صرف یہی ہے کہ وہاں جدید اسکول نہیں ہے اور لوگ قدیم طریقے سے روایتی طور پر وہ تعلیم حاصل کرتے ہیں جو ان کی معاش، تہذیب، عقیدے اخلاق کے عین مطابق ہوتی ہے۔

اس مؤقف کی تفصیلات معلوم کرنے کے لئے آپ لداخ سے متعلق ــــــ کا معرکہ آراء مقالہ پڑھ لیجئے آپ کو حقیقت حال کا علم حاصل ہو جائے گا۔

☆ اسلامی اصطلاحات کے ترجمے میں بہت سے مسائل ہیں مثلاً لونڈی کا ترجمہ Conecobine کیا جائے تو اس کا تاثر کچھ اور ہوگا اگر ترجمہ Stave girl ہوگا تو اس کا تاثر کچھ اور ہوگا۔

☆ میرے بھانجے عمر عظمت اللہ خواجہ ایچی سن اسکول لاہور میں پڑھتے ہیں اسلامیات کے استاد نے سید احمد شہید کی تحریک کی ناکامی کے اسباب ہیں بچوں کو یہ جملہ لکھوایا کہ وہ جھوٹ بولنے پر عورتوں کو کوڑے مارتے تھے۔ لہٰذا سب لوگ ان کے خلاف ہو گئے یہ جملہ عہد جدید کے تناظر میں لکھوایا گیا ہے اسلامیات کے استاد کو یہ بھی معلوم نہیں کہ اسلامی شریعت میں جھوٹ بولنے پر کوڑے نہیں مارے جاتے بلکہ کوڑے حد قذف میں مارے جاتے ہیں جب عورت یا مرد کسی شریف مرد عورت پر زنا کاری کا گھناؤنا الزام لگائیں اور اسے ثابت کرنے کے لئے چار ثقہ گواہ پیش نہ کرسکیں ــــــ اس

معاملے میں جھوٹ خواہ مرد پر ثابت ہو یا عورت پر دونوں کو کوڑے مارے جاتے ہیں_____ ظاہر ہے اسلامیات کا استاد یونیورسٹی سے دو سال کا ایم اے اسلامیات کر کے آتا ہے وہ نہ عربی جانتا ہے نہ علوم اسلامیہ_____ لہٰذا اگر اسلامیات نصاب کا حصہ بھی ہو نصاب بھی ٹھیک ہو مگر پڑھانے والا استاد ہی ٹھیک نہ ہو تو وہ بچوں کو غلط سلط باتیں سکھا سکتا ہے۔ لہٰذا صرف نصاب پر انحصار نہیں کیا جا سکتا_____ ایچی سن اسکول کے بچوں کی رائے تھی کہ استاد نے جھوٹ بولا ہے خود اضافہ کیا ہے کیوں کہ کتاب میں ایسی کوئی بات نہیں لکھی ہے_____ ایک لحاظ سے تو یہ بات بہت اہم اور بہت اچھی ہے کہ بچے استاد کا ناقدانہ جائزہ لینے کے اہل ہیں اور وہ سچ جھوٹ میں امتیاز کر سکتے ہیں____ لیکن یہ صورت حال کا ایک سطحی سرسری پہلو ہے۔ دوسرا خطرناک پہلو یہ ہے کہ بچے نصابی کتب Text Book کے متن Text کو آخری سند پیمانہ [Authority] سمجھتے ہیں اور استاد کو کتاب کے متن کی بنیاد پر دیکھ رہے ہیں یعنی ان کے ذہن میں یہ بات بٹھائی گئی ہے کہ جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ کتاب تو درست ہی ہوتی ہے حالانکہ بہت سے اسکولوں کی نصابی کتابوں میں خصوصاً O, A لیول کی اسلامیات کی کتابوں میں نہایت بے ہودہ اور غلط باتیں لکھی ہوئی ہیں____ مثلاً حضرت عائشہؓ کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ بہت کم عمر اور بہت خوب صورت تھیں لہٰذا رسالت مآبؐ ان سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کو ہی پسند کرتے تھے۔ حالانکہ یہ خلاف واقعہ معاملہ ہے____ لہٰذا نصابی کتابوں کے بارے میں بچوں کے اعتماد، اعتقاد، یقین کو بدلنے کی ضرورت ہے۔ ماں باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ بچوں کو یہ بتا دیں کہ کتابیں صحیح بھی ہوتی ہیں غلط بھی۔ لہٰذا ان سے متاثر ہونے کی ضرورت نہیں۔ دین کی تعلیم دینی لوگ اپنے بچوں کو خود اپنے گھر پر دیں یا پھر کسی مستند عالم سے دینی تعلیم کی مبادیات سے آگاہ کریں اور بچوں کو سمجھا دیں کہ ان اصولوں کی روشنی میں اسلامیات کی کتاب کے Text کو پڑھو جو صحیح ہو وہ ٹھیک ہے جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔ بچوں کو شروع سے ہی تنقیدی ذہن کا مالک بنا دیجئے، ہر کتاب کے بارے اور غیر تنقیدی ذہن کا مالک بنا دیجئے۔ قرآن وسنت کی تقلید کے بارے میں چھوٹی عمر میں بچوں کا تنقیدی ذہن بنانے کے کئی مسائل ہیں مگر دین کے اعتقادات پر یقین کے لئے یہ ذہن بنانا اب مجبوری ہے جو مسائل پیدا ہوں گے ان کا ازالہ کرنے کی دوسری کوششیں کی جائے۔

آپ کی خدمت میں تیرہ سوالات پیش کئے جارہے ہیں اگر آپ کا جواب ہاں (Yes) میں ہے تو اس کا مطلب ہے کہ جدید اصطلاح کے مطابق آپ واقعی انسان ہیں اور آپ کے اندر دوسرے انسان کی آزادی کی بہت زیادہ قدر ہے لہٰذا آپ اس کے اعمال کو Tolerance کرنے کی مکمل صلاحیت رکھتے ہیں۔ لہٰذا آپ جدید انسان کی تعریف پر پورا اترتے ہیں اور اگر آپ کے جوابات نفی (NO) میں ہیں تو Tolerate آپ منشور انسانی حقوق کے اندر طے شدہ انسان کی تعریف کے معیار پر پورا نہیں اترتے ہیں آپ وحشی اور درندے ہیں لہٰذا آپ فیصلہ کیجئے کہ آپ کون ہیں اور کیا بننا چاہتے ہیں۔

(۱) آپ کی بیوی اپنے کسی مرد دوست کے ساتھ سیر و تفریح کے لئے چلی گئی آپ کو اعتراض تو نہیں ہے؟

(۲) آپ کی بیٹی دنیا دیکھنے کے لئے چار ملکوں کی سیر کرنے اکیلے جارہی ہے آپ کو اعتراض تو نہیں ہے؟

(۳) اگر آپ کے علاقے میں جدید اسکول وجود ہی نہیں رکھتا ہو اور عورت کو تعلیم حاصل کرنے کا حق حاصل ہو، اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی آزادی ہو تو کیا یہ حق اور کیا یہ آزادی، اس عورت کی لئے فائدہ مند ہے؟ آزادی سے پہلے آزادی کے حصول کا سامان ضروری ہے یا نہیں؟ جب مسلمان یہ کہتے ہیں کہ ہماری تاریخ، تہذیب میں عورت کو تعلیم حاصل کرنے کی مکمل آزادی حاصل تھی تو وہ اس سوال کا جواب بھی دیں کہ اس آزادی کے حصول کے لئے مسلمانوں نے صرف لڑکیوں کے لئے کون سا اسکول، کالج، یونیورسٹی کب کہاں اور کیسے بنائی۔ تاریخ میں اس کا وجود کیوں نہیں ملتا؟ ممکن ہے لڑکیوں کے ادارے نہ ہوں تو کیا لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ مخلوط تعلیمی اداروں میں پڑھتی تھیں؟ دنیا کی کسی تہذیب و تاریخ میں اٹھارہویں صدی سے پہلے اسکولوں کے جدید نظام کا کوئی تصور ہی موجود نہیں تھا تو کیوں؟ کیا وہ سب ان پڑھ تہذیبیں تھیں؟ افلاطون، ارسطو، سقراط، بقراط تو کبھی کسی اسکول نہیں گئے تو وہ علم کیسے اور کہاں سے حاصل کرتے تھے؟

(۴) آپ تمام مذاہب عالم کو حق سمجھتے ہیں یا صرف اپنے مذہب کو الحق سمجھتے ہیں اور سب سے بہتر۔ آپ کا لڑکا لڑکی کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر گھومتا رہے آپ ناراض تو نہیں ہوں گے؟

(۵) سب میرین میں عورت مرد کو ڈیوٹی کرنی ہے جگہ کم ہے آپ کو اجنبی مرد کے ساتھ ہی سونا ہوگا یہ نوکری کا تقاضا ہے آپ کو یہ قابل قبول ہے یا نہیں؟

(۶) عورت فوج میں جائے گی، ہوائی جہاز اڑائے گی، خندقوں، صحراؤں، بیابانوں میں اسے مردوں کے ساتھ تنہائی میں گھنٹوں رہنا ہوگا آپ اسے برداشت کریں گے یا نہیں۔

(۷) آپ کی بیٹی نوکری کے لئے پڑھنے کے لئے اکیلے امریکا جانا چاہتی ہے آپ اجازت دیں گے یا نہیں؟

(۸) آپ کی بیٹی ایک NGO کے ساتھ شام جانا چاہتی ہے آپ جانے دیں گے؟ دعوت میں مردوں عورتوں کے ساتھ کھانا کھلایا جائے اس میں کوئی اعتراض ہے؟ آپ کا بیٹا کسی لڑکے سے شادی کرنا چاہتا ہے آپ اجازت دیں گے؟ آپ کا بیٹا بیٹی رات کو گھر پر سوئیں یا نہ سوئیں اس سے آپ کوئی فرق نہیں پڑتا۔

(۹) آپ کی لڑکی کسی لڑکے کو دوست بنا کر اس کے ساتھ شادی کئے بغیر زندگی بسر کرنا چاہتی ہو آپ کرنے دیں گے۔

(۱۰) آپ کے کمرے میں ایک دوست شراب پی رہا ہے دوسرا دوست تلاوت کر رہا ہے آپ اسے شراب پینے کی اجازت دیں گے۔

(۱۱) آپ کے سامنے کوئی گناہ کر رہا ہے آپ اسے منع کریں گے یا اسے کرنے دیں گے کہ تمھاری مرضی کرلو یا اسے سمجھائیں گے۔

(۱۲) آپ کی بیٹی اور بیٹا اٹھارہ سال کے بعد اپنی مرضی سے زنا کاری کریں آپ اجازت دیں گے یا نہیں؟

(۱۳) آپ کا بیٹا اور بیٹی گھر میں اپنے بوائے فرینڈز کو لے آئے آپ آنے دیں گے یا نہیں؟ وہ صرف اس لئے لا رہے ہیں کہ گھر سے مانوس کر سکیں ویسے دونوں کا ارادہ شادی کا ہے شادی سے پہلے افہام وتفہیم کے لئے یہ طریقۂ کار آپ کے لئے قابل اعتراض تو نہیں ہے؟

تعلیم پر اربوں روپے کا خرچ اور جاہلوں کی کثرت

اردو یونیورسٹی آف مینجمنٹ سائنسز کے پر فیسر ڈاکٹر فیصل باری روز نامہ DAWN میں پاکستان کے سیکولر تعلیمی اداروں، اساتذہ، معیار تعلیم کے بارے میں مسلسل لکھتے رہتے ہیں۔ایک ماہر تعلیم اور ماہرین معاشیات کی حیثیت سے وہ دنیا بھر کے سفر کرتے ہیں اور اندرون ملک اعلیٰ ترین تعلیم گاہوں میں اساتذہ،طلباء، انتظامیہ، سے براہ راست رابطے میں رہتے ہیں۔انھوں نے اپنے تجربات کی بنیاد پر پاکستان کے مہنگے ترین اعلیٰ تعلیمی اداروں، اے، اولیول میں کامیابی حاصل کرنے والے بچوں LUMS اور دیگر یونیورسٹیوں میں سائنس اور سوشل سائنس کے مضامین پڑھانے والے اساتذہ کی جو بدترین حالت اپنے تازہ مضمون میں بیان کی ہے۔وہ سیکولر تعلیمی اداروں میں کام کرنے والے سیکولر مفکر کی رائے یعنی گھر کی گواہ ہے جو گھر سے آتی ہے۔سرکاری تعلیمی ادارے عوام سے اربوں روپے ٹیکس وصول کرکے اور نجی ادارے عوام سے اربوں روپے فیسوں میں وصول کرکے کس قدر ناقص، گھٹیا تعلیم مہیا کر رہے ہیں اس کی ہلکی سی جھلک فیصل باری صاحب کے مضمون میں دیکھا جا سکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

☆Lums میں ان کے ساتھ پڑھانے والی استاد معاشیات یہ بھی نہیں جانتی کہ معاشیات کیا ہے؟

☆فیس لے کر بھی بڑے اسکولوں کا معیار گر رہا ہے____ کہاں سے لائیں گے اتنے پڑھے لکھے لوگ

سیکولر تعلیمی اداروں کا حال سیکولر دانشور کے خیال میں

production of Literate illiterates

This was brought home most forcefully when I was interviewing candidates for a senior research/teaching position. We met about 20-25 candidates, most of them with a Master's degree or a doctorate in the social sciences, and we could not find a single candidate who was even remotely interesting. This sounds awful, but it is the truth.

I have been giving lectures in a number of institutions of higher learning. The question-answer sessions that follow these lectures have given further evidence of the problem. Students, who have already had years of training in their chosen field, ask questions that should have been addressed long ago, or they give answers that betray the fact that their learning was mostly rote-based and they have understood little or nothing of what their subject is all about.

The problem is not specific to the social sciences. My colleagues who teach

mathematics and physics also talk of some of the same problems. At a recent conference on the teaching of physics, the main issues that were discussed were exactly these: people graduate without having understood the basics of their subject, the same graduates then become teachers and as teachers they teach exactly the way they had been taught.

Many researchers/teachers and even scholars feel that despite all the rhetoric about expansion in educational opportunities in the country, the quality of education that is being imparted to most children in Pakistan has fallen over time. Some hold that this is true even for some of the 'elite' (high tuition fee) schools of the country.

My teaching experience at a university that gets many of its students from these elite schools does, in general, corroborate the story of declining quality standards: students have become good at getting As, but their understanding of the subject seems to be poorer. Teachers and schools have cracked examination systems like matriculation, FSc, 'O' and 'A' Levels, but they have lost focus on the quality issue.

Pervez Hoodbhoy, in his article titled 'Enough PhD's, thank you', published on these pages on Nov 21, pointed out some of the consequences that recent Higher Education Commission (HEC) policies incentivising the production of PhD's and research in the higher education sector have had. But he talked more of issues of fake, poor and useless research, plagiarism and problems with publishing in unknown or fake journals. The criticism is clearly valid.

But, here, I am focusing on a different aspect of the same problem. The issue is not just of HEC policies, it is of the quality of people we are producing through the education that we are giving at the school and college level. By the time these students come to graduate programmes or take up teaching/research jobs, their work habits, ways of learning and understanding things, of engaging with learning, and utilising their knowledge are already entrenched. HEC incentives just reinforce

the poor pathways that have been created. But, the actual creation of the pathways happens long before.

A younger colleague, whom I had met for the first time, was telling me what her doctoral thesis was all about. I could not understand most of what she said. Admittedly, she was working in a different area of economics than I do, but I could not get even the basics of what her thesis was about. Her heavy use of specialised language from economics was part of the problem. I asked her to explain to me, in simple English, what problem she had investigated, how she had done it and what her results were. She could not do it. I left with the strong feeling that she herself did not understand what she had done.

Are we producing a lot of learned and literate illiterate[DAWN 4 - 12 - 2015 Prof Faisal Bari Lums]

☆ عصر حاضر میں عالمی ریاست کیوں قائم نہیں ہوسکتی تھی؟

☆ انیسویں صدی سے پہلے کی ریاستیں کیوں عالمی تھیں؟

☆ ۱۹۲۰ء میں لیگ آف نیشنز کے اراکین نے پاسپورٹ کے ڈیزائن کو منظور کیا اور ۱۹۲۴ء میں جواز سفر (ویزا) کے اجراء کے قوانین بنا کر پوری دنیا کو خانوں میں بانٹ دیا۔

تمام دنیا کے مسلمان ایک امت ہیں، اور کلمۂ اسلام کا ماننے والا خواہ کسی وطن اور کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، خواہ کوئی زبان بولتا ہو، خواہ اس کی جلد کا رنگ کچھ ہی ہو، بہر حال وہ ہے مسلمانوں کا بھائی اور مسلم معاشرے میں جہاں بھی چلا جائے اس کے حقوق وہی ہیں جو دوسرے سب مسلمانوں کے ہیں، اس تخیّل کا یہ کرشمہ دنیا صدیوں تک دیکھتی رہی ہے کہ مشرق سے مغرب تک مسلمان جس ملک میں بھی چاہتا بے روک ٹوک جا سکتا تھا، جہاں چاہتا پھر سکتا تھا، جتنے دن چاہتا ٹھہر سکتا تھا، جو کاروبار چاہتا کر سکتا تھا، بڑے سے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہو سکتا تھا اور شادی بیاہ میں بھی اس کے لئے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔ اسلامی تاریخ ایسی ہزاروں مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ اس کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ ہے جس نے ۲۷ سال دنیا بھر کے مسلمان ملکوں میں پھر کر گزار دیئے اور کہیں اس کو پاسپورٹ یا ویزا کی ضرورت پیش نہ آئی، کہیں اس سے پوچھا نہ گیا کہ تیری قومیت کیا ہے کہیں اسے اپنے معاش کے لیے وسائل فراہم کرنے میں کوئی زحمت پیش نہ آئی، کہیں اسے اقامت کے لئے پرمٹ نہ لینا پڑا، کہیں اس کے قیام کے لیے کوئی مدت مقرر نہ کی گئی، بلکہ کسی جگہ اگر اس نے سرکاری ملازمت کرنی چاہی تو وہ بھی بلا تکلف مل گئی۔ سلطان محمد تغلق کے زمانے میں وہ ہندوستان پہنچا ہے اور یہاں مراکش سے انتہائی سرے سے آیا ہوا وہ شخص مجسٹریٹ بنا دیا جاتا ہے۔ پھر سلطان اس کو اپنا سفیر بنا کر چین بھیج دیتا ہے، یعنی ڈپلومیٹک سروس تک میں اس کو داخل ہونے سے کوئی چیز روک نہیں سکتی۔ اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ اس وقت دنیا بھر کی مسلمان ریاستوں کے

درمیان محض دولت مشترکہ(COMMON WESLTH) ہی کا نہیں بلکہ شہریت مشترکہ(COMMOM CITIZEN SHIP) کا تصور بھی پوری طرح کارفرما تھا۔ دنیائے اسلام حقیقت میں ایک دارالاسلام تھی۔ اگرچہ اس کے مختلف حصوں میں الگ الگ حکومتیں پائی جاتی تھیں۔ اس دارالاسلام کی ہر حکومت کے لئے پوری اسلامی دنیا کی افرادی قوت (MAN POWER) قابل حصول تھی۔ ہر مسلمان ہر مسلم حکومت کا وفادار تھا اور دارالاسلام کی حفاظت و مدافعت تمام مسلمانوں کی مشترک ذمّہ داری تھی۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز تک دنیائے اسلام میں ہم یہی کیفیت جاری و ساری پاتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر اس بات کا اور کیا ثبوت ہوسکتا ہے کہ دنیا کے اہل فکر آج جس عالمی ریاست کی تمنا ظاہر کررہے ہیں، اسلام نے صرف یہی نہیں کہ اس کے لئے تمام فکری ونظری بنیادیں فراہم کردی ہیں، بلکہ صدیوں تک وہ عملاً اس کا مظاہرہ کرتا رہا ہے [مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، ترتیب الاستاذ خلیل احمد الحامدی، عصر حاضر میں امت مسلمہ کے مسائل اور ان کا حل، ادارہ معارف اسلامی لاہور ص ۱۱۸ تا ۱۲۰]

عدالتِ عالیہ سے کچھ سوالات اور مکالمات کے تناظر میں علمی محاکمہ

عمران اور طاہر القادری کے ۱۲۶ دن کے سیاسی دھرنے پر عدالتیں کیوں مہر بہ لب تھیں: مفتی منیب الرحمان کا بنیادی سوال

عدالت عالیہ اور عدالت عظمیٰ اس وقت بھی مہر بہ لب تھیں جب پی پی پی نے بھٹو کے قتل کو جوڈیشیل مرڈر کہا

عدالتیں آج بھی مہر بہ لب ہیں جب نواز شریف اور تمام وزراء عدالت عظمیٰ عدلیہ کو کھلے عام گالیاں دے رہے ہیں

چیف جسٹس نے کہا ہم صبر کررہے ہیں آخرت میں انشاءاللہ مغفرت ہوگی تو صبر کی روایت قائم رہنی چاہیے اب وہ روایت کیوں ٹوٹ رہی ہے؟ علامہ خادم حسین رضوی صاحب کے دھرنے پر بھی صبر وتحمل سے کام لیا جائے تو کیا ہرج ہے؟ یہی سپریم کورٹ کی روایت ہے اسے اپنی روایت قائم رکھ کر آخرت میں مغفرت کی امید رکھنی چاہیے وہ عدالتیں جو اتنے صبر وتحمل کا مظاہرہ کررہی تھیں اب اچانک اتنی متحرک کیوں ہورہی ہیں؟

سینٹ کو بتایا گیا کہ اسلام آباد میں خالص دودھ کسی کو نہیں مل رہا اور جو دودھ مل رہا ہے اس میں کیمیائی مادے، کپڑے دھونے کے پاؤڈر شامل کرکے لوگوں کو زہریلا دودھ دیا جارہا ہے [Dawn 1-11-2017] مگر عدلیہ اتنی بڑی خبر پر کیوں چپ رہی! پاکستان مدینہ ثانی ہے یہ کیسا مدینہ ہے جس کے دارالحکومت میں سپریم کورٹ کی عمارت موجود ہے اور وہاں کسی شہری کو خالص دودھ نہیں مل رہا؟ ملک بھر کے لوگ اسلامی عدلیہ کے ہوتے ہوئے خالص دودھ سے محروم ہیں

ڈی جی رینجرز نے بتایا کہ طالبان گردی سے صرف بائیس ہزار افراد ہلاک ہوئے لیکن کراچی میں لسانی دہشت گردی سے باون ہزار لوگ ہلاک ہوئے (جنگ ۱۴ نومبر ۲۰۱۷ء) لیکن عدالت اتنی بڑی خبر پر بھی چپ رہی آخر کیوں لوگوں کی زندگی بچانا اہم ہے یا دھرنے کو ختم کرنا زیادہ اہم ہے عدالت کی ترجیحات کیا ہیں؟

تھر کے ساٹھ لاکھ جانور تباہ ہونے والے ہیں تمام تھری بھوکے مریں گے آئی اے رحمان اور عارف حسن نے ڈان کے دو کالموں ۲ نومبر اور ۲۱ نومبر ۲۰۱۷ء میں جو کچھ لکھا اس پر سپریم کورٹ کو کوئی خیال نہیں آیا پاکستان کی قومی ترقی کے لیے تھر کو کیوں تباہ کیا جارہا ہے؟

سپریم کورٹ کے سابق چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے منشور بنیادی حقوق کے تناظر میں ہر شخص کو ارتداد کی آزادی عطا کی سپریم کورٹ نے اس غیر اسلامی فیصلے کا بھی کوئی نوٹس نہیں لیا اور اس پر نظر ثانی نہیں کی آخر کیوں؟

سیّد خالد جامعی

پہلے اسلام آباد ہائی کورٹ کے جسٹس شوکت عزیز صدیقی اور اب سپریم کورٹ کے محترم جسٹس فائز عیسیٰ صاحب نے اسلام آباد دھرنے پر نہایت غم و غصے کا اظہار کیا ہے ان کے اظہار کی حقیقت کیا ہے اسے جاننے سے پہلے مفتی منیب صاحب کی دلیل پڑھ لیجیے۔ صدر العلماء حضرت مفتی منیب الرحمان صاحب نے کراچی میں خطاب کرتے ہوئے بہت بنیادی بات کی ہے جو سب کے لیے مشعل راہ ہے۔

مفتی منیب الرحمان کی نقطہ سنجی

رویت ہلال کمیٹی کے چیرمین مفتی منیب الرحمان نے شرکاء سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی مقاصد کے لیے ۱۲۶ دن کے دھرنے سے کسی کو تکلیف نہیں ہوئی۔ حکومت ہوش کے ناخن لے اور فوری طور پر تحریک لبیک یا رسول اللہ ﷺ کے مطالبات تسلیم کرے، ۱۵ روز سے تحفظ ختم نبوت کی خاطر موسم کی سختیاں برداشت کرنے والوں کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔ حکومت یاد رکھے پورے پاکستان کے علماء کرام علامہ خادم حسین رضوی کی پشت پر ہیں ہر طرح کی محاذ آرائی سے گریز کرنا چاہیے۔ پاکستان کسی محاذ آرائی کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ انہوں نے کہا کہ حکومت اس معاملے کی حساسیت کو سمجھے، یہ آفت کوئی آسمانی نہیں بلکہ حکومت کے اپنے ہاتھوں کے کرتوت ہیں، ۱۲۶ دن کا دھرنا سیاسی مقاصد کے حصول کے لیے اسلام آباد میں دیا گیا، اس وقت کسی کو تکلیف نہیں ہوئی آج تحفظ ختم نبوت کے لیے جو دھرنا دیا گیا اس پر شور مچایا جارہا ہے [جنگ کراچی ۲۲ رنومبر ۲۰۱۷ء، ص ۲۰]

۱۲۶ دن کے سیاسی دھرنے سے متعلق حضرت مفتی منیب الرحمان صاحب کے سوالات نہایت اہم ہیں عدالتیں ۱۲۶ دن تک اسلام آباد میں سیاسی دھرنے کو کیوں برداشت کرتی رہیں۔ ہم صحیح غلط ___ حق باطل ___ کی بحث میں نہیں پڑ رہے کیونکہ علمائے حق کے بارے میں کسی بحث کی ضرورت ہی نہیں وہ الحق ہیں ___ مفتی صاحب جو پوچھ رہے ہیں اس کا جواب دیا جائے کہ اس سیاسی دھرنے کے وقت توقف، تجاہل، تساہل، تغافل کیوں تھا اور اب عجلت کیوں ہے؟ اس وقت جسٹس شاہد عزیز صدیقی اور عدالت عظمیٰ اتنے متحرک کیوں نہیں تھے اب اسلام آباد کے شہریوں کے بنیادی حقوق کیوں یاد آگئے یہ فرق کیوں ہے اس کی کیا وجہ ہے؟ یہ ہے اصل سوال

(۱) قاضی فائز عیسیٰ نے کہا ہے کہ دھرنے میں جو زبان استعمال کی جارہی ہے کون سا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے ہم نے دھرنے والوں کی کوئی تقریر نہیں سنی کیوں کہ ہم نہ میڈیا دیکھتے ہیں نہ فیس بک استعمال کرتے ہیں لیکن ہم قاضی صاحب سے یہ سوال پوچھتے ہیں کہ میڈیا، جیو، آگ اور پاکستان کے ۱۴۰ چینل، ڈرامے، فلموں کارٹونوں، ٹاک شو میں جو کچھ غلاظت خباثت جنسی اعمال دکھارہے ہیں اس کی کون سے اسلام نے اجازت دی ہے کیا ان کو پاکستان کے چینلوں میں کچھ نظر نہیں آرہا؟ صرف ریڈ زون کا دھرنا ہی نظر آرہا ہے میڈیا کیا تباہی پھیلا رہا ہے یہ آپ کا موضوع ہی نہیں کیوں کہ وہ آزادی کا دائرہ ہے اور آزادی UNO کا مسلط کردہ عقیدہ ہے کیا اس عقیدے کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہوسکتی؟

(۲) ٹریفک کے حادثات میں ہر سال اٹھارہ ہزار لوگ مر رہے ہیں آلودگی سے ملک میں پانچ لاکھ لوگ مر رہے ہیں ترقی کی پیدا کردہ آلودگی سے پانی کے ذخائر ختم ہو رہے ہیں پانی کا قحط آنے والا ہے عدالت عظمیٰ اس پر کیا کر رہی ہے؟

(۳) پورے ملک میں کاربائیڈ کے پکے ہوئے پھل کھلائے جارہے ہیں کیمیائی محلول سے آٹھ ماہ کی مرغی آٹھ ہفتوں میں تیار کی جارہی ہے پاکستان میں مرغی کا گوشت کھانے کے قابل نہیں ہے کھانے کی ہر چیز میں کیمیائی مادے ملانے سے لوگ کینسر سے مر رہے ہیں لیکن پاکستانی ریاست اور عدلیہ کو پھل، دودھ، خوراک، مرغی، آلودگی جیسے مسائل سے جو انسانی زندگی بڑے پیمانے پر تلف کر رہے ہیں کوئی دلچسپی نہیں ان کی دلچسپی صرف دھرنے سے ہے۔ تو آخر کیوں؟

✡ اخبارات میں خبریں چھپ رہی ہیں پنجاب میں کیمیکلز سے پکائے گئے پھلوں پر پابندی لگانے کا فیصلہ ۱۰ دسمبر کے بعد کیلشیم کاربائیڈ سے پکائے گئے پھلوں کو موقع پر تلف کر دیا جائے گا فروٹ فارمز کولڈ سٹوریج اور فروٹ منڈیوں کے تاجروں کو انتباہی نوٹس جاری کر دیے گئے ہیں ڈی جی فوڈ اتھارٹی نورالامین مینگل نے بتایا ہے کہ کیلشیم کاربائیڈ کے ذریعے مصنوعی طریقے سے پکائے جانے والے پھل کھانے سے کینسر انتڑیوں کی بیماریاں حافظے کی کمزوری نیند کی کمی اور دیگر پیچیدہ دماغی امراض لاحق ہو سکتے ہیں ایسے پھل مرد خواتین بوڑھوں اور بالخصوص کم سن بچوں کے لیے خطرناک بیماریوں کا سبب بن سکتے ہیں وزیر اعلیٰ کی ہدایات پر ۱۰ دسمبر کے بعد کیلشیم کاربائیڈ سے پکائے گئے پھلوں کو موقع پر تلف کر دیا جائے گا پھلوں کا کاروبار کرنے والے تمام فروٹ فارمز کولڈ سٹوریج اور فروٹ منڈیوں کے تاجروں کو انتباہی نوٹس جاری کر دیے گئے ہیں ڈی جی فوڈ اتھارٹی نے بتایا کہ ماہرین کے مطابق پھلوں پر کیلشیم کاربائیڈ لگانے سے ایسی ٹائیلین گیس پیدا ہوتی ہے جو انتہائی خطرناک بیماریوں کا سبب بن سکتی ہے نورالامین مینگل کا کہنا ہے کہ دنیا بھر میں کچے پھلوں کو مصنوعی طریقے سے پکانے کے لیے انسانی صحت کے لیے محفوظ ایتھالین گیس استعمال کی جاتی ہے جس سے بیماریوں کا اندیشہ نہیں رہتا کچے پھلوں کو پکانے کا طریق کار طے کرنے کے لیے معاملہ پی ایف اے سائنٹفک پینل کو ریفر کر دیا گیا ہے جس کی رپورٹ کے مطابق مزید کارروائی کی جائے گی ڈی جی پی ایف نے عوام سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ کیمیکل لگے پھل فروخت یا سٹور کرنے کی کسی صورت میں اجازت نہیں دی جائے گی عوام پھل خریدتے وقت کیلشیم کاربائیڈ یا دیگر کیمیکل کے بارے میں استفسار کر کے حفاظتی تدابیر کو یقینی بنائیں۔[جنگ ۱۱ نومبر ۲۰۱۷ء ص ۲۴]

(۴) ٹریفک حادثات سے مرنے والے عدالتوں کا مسئلہ کیوں نہیں؟ جنگ کے مطابق کراچی میں سڑک کے حادثات میں ہر سال اوسطاً ۱۱۰۰ افراد زندگی کی بازی ہار جاتے ہیں اور ۳۰ ہزار زخمی ہو جاتے ہیں۔ایک رپورٹ کے مطابق ۲۰۰۴ء سے ۲۰۱۳ء تک ساڑھے ۹۷ ہزار حادثات میں ۵۱۴۰۰ افراد موت کے منہ میں گئے۔رپورٹ کے مطابق کراچی کی سڑکوں پر چلنے والی ٹرانسپورٹ میں یومیہ ۹۰۸ گاڑیوں کا اضافہ ہوتا ہے۔نیشنل ہائی وے اتھارٹی کے مرتب کردہ اعدادوشمار کے مطابق پاکستان میں ہر سال ٹریفک کے کم وبیش ۳۰ ہزار سنگین حادثات ہوتے ہیں جن کی وجہ سے قومی خزانے کو سالانہ کم وبیش ۱۰۰ ارب روپے کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ان اعدادوشمار کے مطابق ملک میں ٹریفک کے حادثات میں اموات کی شرح اس خطے کے دیگر ممالک کے مقابلے میں بہت زیادہ ہے۔رواں برس مارچ کے مہینے میں سندھ ہائی کوٹ نے بھاری ٹریفک کے شہر میں داخلے پر پابندی عاید کر دی تھی۔عدالت کا کہنا تھا کہ ہیوی ٹریفک سے بھی دہشت گردی پھیلائی جا رہی ہے۔ ۱۵ ماہ میں ۲۵۰ افراد کو ٹریفک کے حادثات میں مار دیا گیا اور پبلک ٹرانسپورٹ کے لیے بھی اوقات مقرر ہونے چاہئیں۔عدالت نے حکام سے سوال کیا تھا کہ شہریوں کے مسائل کے حل کے لیے کیا ہو رہا ہے دہشت گردی سے زیادہ لوگ ہیوی ٹریفک کے حادثات میں مر رہے ہیں ایسے لوگوں کے خلاف دہشت گردی کا مقدمہ درج ہونا چاہیے۔[جنگ، مڈ ویک میگزین، ص ۲، ۳، بدھ ۲۲ نومبر ۲۰۱۷ء]

مارچ ختم ہوا نومبر ختم ہو رہا ہے مگر سڑکوں پر انسان کتے بلی کی طرح مر رہے ہیں سپریم کورٹ چپ ہے دھرنے پر اسلام آباد ہائی کوٹ کے جج نے نوٹس لیا تو سپریم کورٹ نے بھی از خود نوٹس لے لیا ٹریفک حادثات پر انسانی زندگی کے تحفظ کے لیے اس قدر عجلت کیوں نہیں ہے جتنی دھرنے کے مسئلے پر ہے ہمارا سوال صرف یہ ہے؟

(۵) تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ قتل عام گزشتہ پانچ سو سال میں مہذب مغربی اقوام نے کیا ہے لیکن پاکستانی حکومت انہی مغربی اقوام کو امن کا علمبردار ثابت کررہی ہے ان کی حلیف ہے۔ کے عارف کی کتاب Pakistan America Relations پڑھ لیجیے پاکستان ستر سال سے دنیا میں دہشت گردی پھیلانے والوں کا حلیف بنا ہوا ہے عدالت نے کبھی صدر وزیر اعظم سے نہیں پوچھا کہ یہ کیا ہورہا ہے پاکستانی طالبان جیسے چھوٹے دہشت گردوں کے خلاف کارروائی درست ہے مگر بڑوں کے بارے میں کیوں خاموشی ہے مغرب کی دہشت گردی کی تاریخ پڑھ لیجیے۔حوالہ درج ذیل ہے:

It has been suggested that since 3600 B.C., there have been only 292 years without war, and each decade since 1816 has averaged twenty-two wars.It is estimated that more than 150 million people have died from war-related deaths since 3000 B.C.

"Each of the centuries prior to the sixteenth accounted for less than 1 percent of all war deaths. In fact all of them added together accounted for little more than 4 percent of these deaths, while almost 96 percent of war deaths were estimated to occur in the modern period of history, 1500-2000."Seventy-three percent of all war-related deaths since 3000 B.C. have occurred in the twentieth century A.D." Civilian deaths have been a large part of the increase in war deaths. According to UN Secretary General Kofi Annan, "UN sources estimate that at least three-quarters of the casualties of recent conflicts have been civilians, though the precise numbers are not known. " Over half of the civilians, though war victims of the past decade have been children, including two million dead and six million physically disabled since 1990.

Most of the war throughout history have occurred in the past two centuries. perhaps more disturbing.

from the point of global security, it is a shocking fact... that in some ways we are living through one of the worst decades in modern history. The 1970s were the decade with the most war onsets of all types. This was not an insolated spike, as 1960s and 1980s were also worse decades than average. And while the data for the 1990s are not complete, the 1990s will likely win the dubious distinction of being one of the two most war-prone decades [along with the 1970s] since the Congress of Vienna. [Juliet Kaarbo . -James Lee Ray Global Politics, Wadsworth publishing 10 edition (Febuary 2010)chap 5 International Confilct p.162,163]

(۶) سپریم کورٹ نے جمہوریت کی دہشت گردی کا کوئی نوٹس کیوں نہیں لیا؟

جمہوریت کی پیدا کردہ دہشت گردی پاکستانی طالبان کی مذہبی دہشت گردی سے زیادہ خطرناک ہے رینجرز کے ڈائریکٹر جنرل نے میڈیا کو بتایا کہ کراچی میں ۱۹۸۷ء سے لے کر ۲۰۱۳ء تک ایم کیو ایم کی لسانی دہشت گردی میں باون ہزار لوگ ہلاک ہوئے انہوں نے بتایا کہ پاکستان میں طالبان کی مذہبی دہشت گردی کے ہاتھوں گزشتہ سترہ سال میں صرف بائیس ہزار افراد ہلاک ہوئے اور صرف کراچی میں مارے جانے والوں کی تعداد پورے ملک میں مذہبی دہشت گردی کے ہاتھوں مارے جانے والوں سے ڈھائی سو فی صد زیادہ ہے کراچی میں روزانہ ۸۰ سے ۱۰۰ ملین روزانہ بھتہ وصول کیا جاتا تھا [جنگ کراچی ۱۴ نومبر ۲۰۱۷ء]

سیاسی دہشت گردی کے اعداد و شمار کیا بتا رہے ہیں؟ سپریم کورٹ نے کبھی اس مسئلے پر کوئی جامع اور پرزور حکم جاری نہیں باون ہزار شہریوں کی ہلاکت کوئی سانحہ ہی نہیں ہے آخر کیوں؟

(۷) جناب آئی اے رحمان نے تھر میں جدید ترقی سے پیدا ہونے والے ماحولیاتی بحران، تباہی و بربادی کے نئے انسانی المیے اور دیگر مسائل پر اپنے کالم Don't Destroy Thar میں ___ قوم کو نہایت عمدہ طریقے سے متوجہ کیا ہے۔

عارف حسن اور آئی۔اے۔رحمان کا ترقی کے مضر نتایج کو تسلیم کرکے خاموشی اختیار کرنا معنی خیز لگتا ہے؟ کیوں جی ؟

عارف حسن نے اپنے مضمون The Coal Project [21-11-2017] میں لکھا ہے کہ تھر میں بجلی کی پیداوار سے ۶۳ لاکھ جانور بھوکے مریں گے چراگاہیں نباتات حیوانات کوئلے کی آلودگی سے ختم ہوجائیں گے کوئلے کے حصول کے لیے گہری کھدائی ہوگی جس سے پانی کے تمام ذخیرے ختم ہوجائیں گے سپریم کورٹ نے اس اہم ترین مضمون کا نوٹس کیوں نہیں لیا؟

آئی اے رحمان اور عارف حسن نے ترقی کے نتیجے یعنی تباہی پرتو تنقید کی ہے مگر دونوں نے آزادی ترقی کے عقیدے پر کوئی تنقید نہیں کی جبکہ یہی دوعقیدے تھر کی تباہی کا اصل سبب ہیں صرف تھر نہیں پوری دنیا ترقی کے عقیدے نے تباہ کردی ہے۔سپریم کورٹ نے تھر کے اتنے اہم مسئلے کا ابھی تک کوئی نوٹس نہیں لیا اس نے آزادی اور ترقی کے عقیدے پر آج تک کوئی فیصلہ جاری نہیں کیا سپریم کورٹ کے جج اگر نائب امریکی صدر الگورے کی کتاب An Inconvenient Truth ہارورڈ یونیورسٹی کی تاریخ کے پروفیسر Noami Oreskes کی کتاب The Collaps of Western Civilization اور Noami Clane کی کتاب Capitalism Vs Climate اور امریکی مورخ جیرڈ ڈائمنڈ کی کتاب The Collaps اور اسی مصنف کی کتاب The World until yesterday پڑھ لیں تو ان کو جدید سائنس ،ٹکنالوجی ،سرمایہ داری ترقی کے ہاتھوں دنیا میں آنے والی تباہی و بربادی کا اندازہ ہوگا۔۲۰۱۵ء میں دنیا میں آلودگی میں مزید دو فی صد کا اضافہ ہوا جس کے باعث دو فیصد کاربن بڑھنے سے دنیا میں ۳۷ بلین ٹن کاربن زیادہ پیدا ہوئی [جنگ کراچی ۱۴ نومبر ۲۰۱۷ء AFP] یہ کاربن پوری دنیا کو تباہ کررہی ہے آلودگی سے متاثرین میں پاکستان کا نمبر پہلا ہے جبکہ آلودگی پھیلانے والوں میں پاکستان کا نمبر ۱۹۷ ہے۔

جوممالک سب سے زیادہ آلودگی پھیلاتے ہیں وہ دنیا کی امامت کررہے ہیں چین دنیا میں 26%، امریکہ 25% اور اور بھارت 22% آلودگی پھیلا رہا ہے لہٰذا دنیا کو تباہ کرنے والے ہی دنیا کی امامت کے منصب پر فائز ہورہے ہیں امریکی مورخ جیرڈ ڈائمنڈ کی کتاب The Collaps کا آخری باب پڑھ لیجیے امریکہ میں ہر سال ڈیڑھ لاکھ اور پوری دنیا میں ہر سال ۵۷ لاکھ لوگ آلودگی سے ہلاک ہورہے ہیں مگر اسے کوئی دہشت گردی نہیں کہتا___ پاکستان کی ترقی کے لیے تھر سے کوئلے کی توانائی حاصل کی جارہی ہے جب ۱۹ ہزار کلو میٹر تھر میں سے دس ہزار کلومیٹر کوئلے کا رقبہ اور علاقہ بجلی کے حصول کے لیے استعمال کرکے___ ۵۳ دیہاتوں کو ختم کرکے زبردست آلودگی پھیلائی جائے گی اور ۹ ہزار کلومیٹر تھر میں بچ جانے والی آبادی کے تریسٹھ لاکھ جانوروں کے لیے چراہ گاہیں ختم ہوجائیں گی تو انسانی زندگی کا کیا ہوگا؟

تھر کے علاقے کے لاکھوں جانوروں کے لیے جب چراہ گاہ نہیں رہے گی تو وہ بھوکے مریں گے جو بچ جائیں گے وہ کوئلے کی آلودگی سے مریں گے پوری دنیا میں ترقی زبردست آلودگی کے ذریعے پھیلتی ہے۔ترقی وآلودگی لازم وملزوم ہیں۔لیکن آئی اے رحمان اور عارف حسن اس کے خلاف کچھ نہیں لکھتے کیوں کہ ترقی عقیدہ ہے عقیدے کی قیمت ہے لہٰذا وہ اور تمام لبرل کبھی ترقی کے عقیدے پر تنقید نہیں

کریں گے البتہ ترقی کے نتائج پر تنقید کریں گے جس کا کوئی فائدہ نہیں اگر ترقی عقیدہ ہے تو اس کی قیمت تھر کے لوگوں کو ادا کرنا ہوگی ہم تو ترقی کے عقیدے کو تسلیم ہی نہیں کرتے ہم تو کہتے ہیں ترقی ختم کرو سادہ زندگی بسر کرو۔ عدلیہ اس مسئلے پر کیوں چپ ہے عدلیہ کے معزز جج ترقی کے عقیدے کی ہلاکت جاننے کے لیے Development Dictionary اور G. Rist کی کتاب History of Development کا مطالعہ فرمالیں۔

آلودگی کا علاج صرف یہ ہے کہ دنیا سو سال پہلے کے سادہ زندگی کی طرف لوٹ جائے کراچی اس طرح ہو جائے کہ جس طرح آغا خان جم خانے کی تعمیر کے وقت تھا ہمارے ایک دوست نے ہمیں گارڈن کے علاقے میں آغا خان جم خانے میں مدعو کیا اور اس کی ابتدائی تصویریں دکھائیں آس پاس کپاس کے کھیت تھے اور کپاس کے پھول فصل میں لہلہا رہے تھے۔ ملیر کے ارد گرد آم امرود جامن شہتوت کے ہزاروں ایکڑ رقبے پر باغات تھے کراچی کی آبادی بیس لاکھ تھی آج یہ سب زرعی علاقے غارت کر کے بیس لاکھ کے شہر میں تین کروڑ بسا دیے گئے ہیں لہٰذا آلودگی ہی نہیں تباہی بھی آرہی ہے۔ لیکن سپریم کورٹ ان زندہ مسائل سے لاتعلق ہے۔ اس کی توجہ صرف دھرنے پر ہے؟

(۸) سپریم کورٹ نے منچھر جھیل میں آلودگی کا بار بار نوٹس لیا سپریم کورٹ کی ہدایت پر قائم کردہ کمیشن کے سربراہ ہائیکورٹ کے جج جسٹس کلوڑ نے بار بار بتایا کہ پورا سندھ آلودگی سے تباہ ہو رہا ہے تمام پانی گندہ ہے ہسپتالوں کا کیمیائی کوڑا اور کارخانوں کا کوڑا سمندر ___ دریا، ندی، نالوں اور آبادیوں میں پھینکا جا رہا ہے ہزاروں لوگ مر رہے ہیں لیکن سپریم کورٹ نے اس ترقی کا کوئی نوٹس نہیں لیا اس کو روکنے کا کوئی حکم جاری نہیں کیا جو اس تمام بربادی کا اصل سبب ہے ژی ژیک نے بالکل درست کہا تھا کہ ماڈرن ازم ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے پہلے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ عدلیہ بھی اسی فلسفے پر عمل کرتی ہے۔ مگر پہلا سوال کیا ہے اور دوسرا کیا؟

سلاوژی ژیک اس صدی کا بہت بڑا فلسفی ہے۔ ژی ژیک ایک بدتمیز بدقماش فلسفی ہے جسے مغرب میں ایک خطرناک فلسفی سمجھا جاتا ہے جو اپنے فلسفیانہ نکات گالیوں کے ذریعے پیش کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے موثر ترین ذریعہ ابلاغ گالی ہے جس کے ذریعے فی الفور [Immediate] ابلاغ ہو جاتا ہے۔

ژی ژیک پہلے اور دوسرے سوال کے بارے میں لکھتا ہے کہ ایک شخص روزانہ پانچ بجے اپنے دفتر سے گھر پہنچتا تھا ایک دن وہ حسن اتفاق سے چار بجے گھر پہنچ گیا اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی ایک اجنبی مرد کے ساتھ خواب گاہ میں ہم کلام ہے اس نے اپنی بیوی سے پوچھا یہ کون ہے اور یہاں کیوں ہے؟ یہاں کیا کر رہا ہے؟ (یہ پہلا سوال ہے)۔

بیوی نے جواب دیا یہ سوال غیر اہم ہے کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے اصل سوال یہ ہے کہ تم یہاں چار بجے کیا کر رہے ہو تمہارے آنے کا وقت پانچ بجے ہے (یہ دوسرا سوال ہے)۔

ژی ژیک کہتا ہے کہ جدید دنیا میں ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیا جاتا ہے پہلے سوال کو اسی طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ میڈیا اسی طرح ہمیشہ علماء سے دوسرے سوال کا جواب مانگتا ہے۔ قندیل بلوچ کو بھائی نے قتل کر دیا، شریعت میں اس کا کیا حکم

ہے؟ پہلے سوال کا جواب نہیں مانگتا کہ قندیل بلوچ اپنا جسم ،عزت ،عفت ،عصمت میڈیا پر بیچ رہی ہے اسکا شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیونکہ میڈیا والوں کو پتہ ہے کہ اگر شریعت سے قندیل بلوچ کی زندگی کا حکم پوچھا گیا تو شریعت کہہ دے گی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دو۔ فقتلو ا تقتیلا (اور ہماری عدالت اور شریعت کورٹ کبھی اس حکم پر عمل نہیں کرے گی)۔

اگر قندیل بلوچ کی زندگی پر شریعت کا حکم نافذ ہو گیا تو شاید پاکستان میں اسلام آجائے گا۔ یہ میڈیا کو منظور نہیں کیونکہ میڈیا کا کیا ہوگا؟ اگر میڈیا پر شریعت نافذ ہو جاتی یا کم از کم عدالت کے ذریعے قندیل بلوچ کی زندگی پر شریعت نافذ ہو جاتی تو قندیل بلوچ کے بھائی کو قتل کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ خلاء (Vacume) کبھی باقی نہیں رہتا اسے کوئی نہ کوئی پر کر دیتا ہے۔ پاکستانی عدالت اور شریعت کورٹ اور نواز شریف خلیفۃ المسلمین نے اپنا فرض پورا نہیں کیا تو اس خلاء کو قندیل کے بھائی نے پر کر دیا___ مسئلہ ماڈرن ازم پیدا کر رہا ہے تم جواب علماء سے مانگ رہے ہو، علماء کیوں جواب دیں۔ آزادی کے مغربی عقیدے کو___ ریاست نے اختیار کیا ہے جو چاہے کہہ دو، جو چاہے کرلو، لڑکی گھر سے بھاگ جائے یہ اس کی آزادی ہے جب آزادی دی ہے تو اس کا ردعمل ہو رہا ہے۔ علماء اس کا کیا جواب دیں؟

علماء کو تمام اہم مذہبی معاملات میں میڈیا کے شر انگیز سوالات کے جواب میں یہی کہنا چاہیے کہ آزادی اظہار رائے کا کفر تم عام کرو ، ہر ایک کو آزادانہ کافرانہ زندگی بسر کرنے کی آزادی دو سب کو جو چاہے کہنے کی آزادی ہو جب ماڈرن ازم کی آزادی کے عقیدے کے خلاف بغاوت ہو، ردعمل ہو، تو علماء سے پوچھو یہ کیا ہو رہا ہے۔ اسلام جواب دے، اسلام مسئلہ حل کرے۔ یہ مسئلہ اسلام نے پیدا نہیں کیا ہے یہ مسئلہ انسانی حقوق کے منشور کے عقیدہ ءآزادی نے پیدا کیا ہے وہی اس کا جواب دے۔

کچھ یہی حال عدلیہ کا ہے وہ سوموٹو نوٹس اور اپنے فیصلوں کے ذریعے ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتی ہے پہلے سوال کا جواب نہیں دیتی وہ اصل کو نہیں فرع کو دیکھتی ہے وہ کل پر نہیں جزو پر فیصلہ کرتی ہے وہ کلیت کو نہیں دیکھتی جزئیات کو دیکھتی ہے لہٰذا اس کے فیصلے کوئی بنیادی تبدیلی پیدا نہیں کرتے۔

(۹) جنرل مشرف کے زمانے میں وفاقی وزیر قانون وصی ظفر نے چیف جسٹس افتخار چوہدری کی عدالت میں ایک مقدمے کی سماعت کے دوران ہاتھوں کے اشاروں سے عدلیہ کو نہایت گندی اور غلیظ گالی دی پورے ملک میں احتجاج ہوا میڈیا نے جو خود روزانہ غلاظت کے ڈھیر لگاتا ہے اور اس سے زیادہ گندے اشارے گفتگو تصویروں اشاروں سے کرتا ہے اس نے بھی وصی ظفر کے خلاف محاذ بنالیا مگر عدالت نے نہایت خندہ پیشانی کا مظاہرہ کیا عدلیہ اتنی فراخ دل تھی تو اب دھرنے والوں کے لیے یہ فراخی کیوں نہیں ہے؟___ لیکن عدالت نے اس گالی کو نہایت خندہ پیشانی سے برداشت کیا تب توہین، تضحیک، تذلیل کا سوال کیوں نہیں پیدا ہوا؟ آج عدالت عظمیٰ اتنی حساس کیوں ہے؟ پاکستان کے ۱۵۰ چینل روزانہ جو گندی فحاشی عریانی بے حیائی بے شرمی پھیلا رہے ہیں سپریم کورٹ کو کبھی اس کا خیال کیوں نہیں آیا؟ آخر کیوں؟

(۱۰) زنا کرنے کی آزادی ہے اور نکاح کرنے پر پابندی ہے

پاکستان میں عائلی اصطلاحات کے سلسلے میں مغرب کے غلام مغرب کی بھونڈی نقالی کرنے والے جدید نفس[Mimic Self] والوں نے مغرب سے آگے بڑھ کر کردار ادا کیا اور پاکستان کے تمام صوبوں نے اٹھارہ سال سے کم عمر لڑکی کی شادی پر پابندی لگادی شادی کرانے والے ماں باپ اور دلہا کی گرفتاری کا حکم دیا ہے یہ پابندی صرف مغرب کے آزادی کے عقیدے کی تقلید کے لیے لگائی گئی۔
پاکستان میں ۱۵۰ چینل دن رات عورت مرد کو جنسی دہشت گردی کی دعوت دے رہے ہیں لوگوں کے جنسی جذبات میں اشتعال اور ابال پیدا کررہے ہیں ریاست نے ان کو جنسی دہشت گردی کی مکمل اجازت دے رکھی ہے مگر لڑکیوں کی شادی پر پابندی لگادی ہے ان غلاموں کو یہ بھی نہیں معلوم کہ امریکہ میں آج بھی بارہ سال کی عمر میں لڑکی کی شادی ہوتی ہے امریکہ کی کئی ریاستوں میں بارہ، تیرہ، چودہ سال کی لڑکیاں شادی کرسکتی ہیں۔ سپریم کورٹ نے حکومت کے اس غیر اسلامی غیر عقلی غیر منطقی فیصلے کا کوئی نوٹس نہیں لیا آخر کیوں؟ جنسی جذبات میں اشتعال پیدا کرنے کی آزادی ہے اور جنسی ضرورت کو شریعت کے دائرے میں پورا کرنے کی آزادی نہیں ہے یہ کیسا اسلام ہے؟ کون سا اسلام ہے؟ میڈیا زنا کاری کی دعوت دے رہا ہے سب کو زنا پر اکسا رہا ہے زنا کاری کی دعوت دے کر نکاح کو حرام کرنا یہ کیسی منطق ہے؟ ایک اسلامی ملک میں زنا کرنا آسان اور نکاح کرنا ناممکن بنا دیا گیا ہے ـــــ یہ کیسا اسلام ہے کون سا اسلام؟ کیا قاضی فائز عیسی اور چیف جسٹس ثاقب نثار صاحب کو یہ سب نظر نہیں آرہا؟ صرف دھرنا ہی نظر آرہا ہے کیا ان ججوں کے گھروں میں ٹی وی نہیں ہے ظاہر ہے آزادی میڈیا کا حق ہے اس حق پر عدلیہ پابندی نہیں لگا سکتی۔ تو عدلیہ اعتراف کرلے کہ وہ کیا کرسکتی ہے کیا نہیں کرسکتی تا کہ لوگ عدلیہ سے امید نہ رکھیں کوئی اور دروازہ دیکھیں۔

(۱۱) اخبارات کی خبر کے مطابق ایوان بالا (سینٹ) کی نیشنل ہیلتھ سروس کمپنی کے سامنے اپنے بیان میں اسلام آباد کے DHO نے کہا کہ اسلام آباد میں خالص دودھ کی دستیابی ناممکن ہے دودھ میں بدترین آلودگی پائی جاتی ہے پہلے لوگ دودھ میں پانی ملاتے تھے دودھ کو اصلی بنانے کے لیے کپڑے دھونے کا پاؤڈر اور کیمیائی مادے دودھ کے گاڑھے پن رنگ اور خوشبو برقرار رکھنے کے لیے استعمال کئے جاتے ہیں[DAWN News 1-11-2017] اور پاکستان مدینہ ثانی ہے اور اسلام آباد مدینہ ثانی کا دارالخلافہ ـــــ یہ کیسی اسلامی مملکت ہے جس کے دارالحکومت میں کسی شہری کو اصلی دودھ میسر نہیں اتنے اہم مسئلے کی خبر شائع ہوئی تو اندرونی صفحات میں یہ اخبار کی مرکزی خبر نہیں بن سکی اس لئے کہ لبرل ازم، سول سوسائٹی، جمہوریت سیکولرازم میں دھوکہ دہی بدعنوانی کوئی چیز نہیں ـــــ البتہ ایمان داری ایک خبر ہے وہ اخبارات میڈیا کو میسر نہیں۔ سوال یہ ہے کہ مدینہ ثانی اسلام آباد میں خالص دودھ کی دستیابی ناممکن ہے یہ کیسا اسلامی ملک ہے جس کے دارالحکومت میں اصلی دودھ نہیں ملتا وہ عدالت جو ہر چھوٹے مسئلے میں Sumoto Notice لیتی ہے اسے دودھ جیسے بنیادی مسئلے سے کوئی سروکار نہیں۔

لبرل ازم کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی جان رالس نے بھی یہی لکھا ہے کہ صرف اور صرف وہ انسان اپنی نظروں میں قابل عزت ہوسکتا ہے جسے چار بنیادی تصورات خیر حاصل ہوں (۱) آمدنی Income (۲) دولت Wealth (۳) طاقت Power (۴) اختیار Authority رالس لکھتا ہے، جس شخص کو یہ چار بنیادی تصورات خیر حاصل نہیں وہ شخص اپنی نظروں میں بھی عزت کے قابل نہیں رہتا جدید ریاست اور پارلیمنٹ کا کام رالس کے چار بنیادی تصورات خیر کی مسلسل و مستقل فراہمی ہے چونکہ پاکستانی ریاست یہ خیر فراہم نہیں کرسکی لہٰذا جدید پاکستانی انسان رالس کے اور جدیدیت کے مسلط کردہ تصورات خیر کے تحت زیادہ سے زیادہ سرمایہ حاصل کرنے کے لیے دودھ میں پانی ملا رہا ہے ــــــ ہر شخص اپنے اپنے پیشے میں چوری چکاری کر رہا ہے یہ عقیدے کی خرابی ہے لیکن ہمارے علمی حلقے آزادی ،مساوات،ترقی اور معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافوں کے مغربی عقیدوں کا رد کرنے کے بجائے یا تو چپ ہیں یا ان کی عجیب تعبیرات پیش کر رہے ہیں جس کے نتیجے میں تباہی و بربادی کا سامنا ہے کچھ لوگ کہیں گے اگر یہ دلیل درست ہے تو مغرب میں لوگ ایمان دار کیوں ہیں؟ ان کو معلوم نہیں کہ مغرب میں لوگ پاکستان سے زیادہ بے ایمان ہیں مگر انھوں نے Penoptilkon Society بنالی ہے جو لوگوں کو جرائم سے روکتی ہے، پکڑ لیتی ہے مگر یہ سوسائٹی کارپوریشن کے جرائم کو نہیں پکڑ سکتی اور پکڑنے میں بہت وقت لگاتی ہے۔ نیویارک ٹائمز میں روزانہ اربوں کھربوں ڈالر کی بدعنوانیوں کی خبریں شائع ہوتی ہیں مگر وہ ــــــ ہم نہیں پڑھتے۔

دودھ ایک بنیادی غذا ہے انسان کا پورا جسم نو دس ہڈیوں کے ڈھانچے پر مشتمل ہے اگر یہ نو دس ہڈیاں جعلی دودھ سے غذائیت حاصل کریں تو انسان کا کیا انجام ہوگا؟ وہ انجام سب کے سامنے ہے لاکھوں بچے بچیاں عورت مرد ہسپتال کے ہڈیوں کے وارڈ میں اس لئے جمع ہو رہے ہیں کہ ان کی ہڈیاں ان کا وزن اُٹھانے سے قاصر ہیں۔

جدید ریاست بس قانون بناسکتی ہے ــــــ وہ اس انسان کو ٹھیک نہیں کرسکتی جو ملاوٹ کرتا ہے سپریم کورٹ ملاوٹ کرنے والے کو سزا دے سکتی ہے پھانسی دے سکتی ہے یا جرمانہ لگاسکتی ہے مگر سپریم کورٹ اس نظام ریاست، سیاست، اس نظام تعلیم ،اس نظم معیشت کو کوئی سزا نہیں دے سکتی کوئی جرمانہ عائد نہیں کرسکتی جو اس قسم کے انسان لاکھوں کی تعداد میں پیدا کر رہے ہیں جن کا کام صرف اور صرف بدعنوانی ہے ــــــ جدید ریاست کے نظام میں سیاست و حکومت و تعلیم میں فرد کی اصلاح اس کے تزکیۂ نفس اس کے باطن کی درستگی اس کے اخلاق کردار کی بلندی کا کوئی نظام سرے سے موجود ہی نہیں کیوں کہ جدید ریاست فرد کو روشن خیالی کے فلسفے کے تحت ایک آزاد، عاقل،

فاعل مختار مطلق وجود تسلیم کرتی ہے جسے کسی خارجی ذریعے سے رہنمائی رہبری کی ضرورت نہیں۔ جدید ریاست کے بہت بڑے فلسفی کانٹ نے اپنے مضمون What is enlightenment میں یہی تو لکھا ہے کہ روشن خیال، جدید عقل مند انسان وہ ہے جو روشنی رہبری کے لیے اپنے سے باہر نہیں دیکھتا اپنے اندر جھانکتا ہے اور اپنی عقل سے رہنمائی لیتا ہے۔ روشن خیال وہ شخص ہے جو وحی الٰہی، کتاب اللہ، عالم دین ڈاکٹر سے رجوع نہیں کرتا اپنے آپ سے اپنی عقل سے اپنے اندرون سے رجوع کرتا ہے۔ جدیدیت نے دنیا کو تین عقیدے دیئے۔ آزادی، مساوات، ترقی ان تین عقیدوں کے لئے جو جدید ریاست، جدید پارلیمان اور مذہب انسانی حقوق ایجاد کئے گئے ان تینوں کا بنیادی کام فرد کے معیار زندگی میں مسلسل و مستقل اضافہ ہے۔ جدید انسان وہ ہے جو ہر وقت لامتناہی علم، لامتناہی دولت، لامتناہی طاقت، لامتناہی لذت، لامتناہی خرچ اور لامتناہی نفع کی تلاش و جستجو میں رہتا ہے۔ اس کے لئے حرام کھانا ضروری ہے کیا سپریم کورٹ ایک شریف انسان پیدا کرنے کے لیے ریاست کو کوئی حکم دے سکتی ہے؟ اگر وہ ایسا نہیں کرسکتی تو کم از کم ایک شریف ترین انسان علامہ رضوی اور ان کے جانثاروں ____ کو تشدد اور ظلم سے بچانے کا حکم جاری کرے۔

فیس بک پر علمی بحث ومباحثہ کیوں ممکن نہیں؟

جناب غامدی صاحب کے افکار و شخصیت؟
جناب عمار ناصر اور فیس بک کی آفتیں
سائنس زدگان کے بارے میں چند تصریحات

سید خالد جامعی

۲۲ رجون ۲۰۱۶ء

برادرم ومکرم جناب سمیع اللہ سعدی صاحب

مختصر خط آپ کو پہلے ارسال کر دیا تھا اب طویل خط حاضر خدمت ہے

اس سے پہلے کہ آپ کی خدمت اقدس میں فیس بک پر آپ کے مضمون ''انصاری اسکول آف تھاٹ کی باتیں'' پر تفصیلی معروضات پیش کروں اللہ رب العزت کی بارگاہ میں اپنے پیارے نبی کی ایک دعا پیش کرتا ہوں۔ **اللھم طھر قلبی من النفاق و عملی من الریا ولسانی من الکذب**

راقم کبھی سوشل میڈیا یا فیس بک استعمال نہیں کرتا اس کی بے شمار وجوہات ہیں لیکن بنیادی وجہ جذبہ مسابقت کے تحت عجلت میں جوابات دینے کی روایت جو چند مستثنیات کو چھوڑ کر اکثر بغیر کسی دلیل ثبوت کے الزام دشنام اور اتہام کی سطح تک چلے جاتے ہیں یعنی مقابلے کی کیفیت بھی پیدا ہو جاتی ہے اور علمی بحث کو کسی منطقی انجام تک پہنچانے کے بجائے ایک دوسرے کو زیر وزبر کرنے کا رویہ فتح وشکست کی آرزو میں ڈھل جاتا ہے لہٰذا فیس بک پر انتہائی عجلت میں بحث ومباحثے کے نتیجے میں صداقت کا حصول مشکل بلکہ اکثر محال ہو جاتا ہے۔ فیس بک پر یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ امام مالک کی طرح کہہ دیں لا ادری یا لکھ دیں ابھی غور کر رہا ہوں اگر آپ نے کوئی ایسا جملہ لکھ دیا تو اسی دن آپ جاہلوں کے زمرے میں شامل کر دیے جائیں گے کیونکہ فیس بک پر علم کے لیے کسی تفکر، تدبر، توقف کی اجازت نہیں اسی وقت ابھی ابھی اسی لمحے فوری فی البدیہہ جواب دینا ہی اصل کمال ہے اور جواب بھی دو چار سطروں میں مختصر ترین ورنہ کوئی نہیں پڑھے گا آپ ناکام ہو جائیں گے دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ فیس بک پر بحث علماء کرتے ہیں اور فیصلہ عوام کرتے ہیں کہ کس کی رائے درست ہے Likes اور Dislikes اس کا ثبوت ہیں۔ انٹرنیٹ پر برادرم عمار ناصر صاحب کا یہ تبصرہ کہ مرد عورت کو ہاتھ سے مارنے کے بجائے آنکھ مار دے اسی نقطۂ نظر کی بلیغ ترجمانی ہے عمار صاحب نہایت سنجیدہ متحمل فرد ہیں مگر فیس بک کے جمالیاتی سحر نے ان کی فقاہت اور ثقاہت کو اپنے اندر سمو لیا ان کو اپنے رنگ میں ڈھال لیا اس طرح کے عامیانہ تبصرے فیس بک استعمال کرنے والے اکثر علماء غیر شعوری طور پر کرتے رہتے ہیں یہ فیس بک کا غیر محسوس اثر ہے۔ جناب عمار صاحب کے اصل الفاظ یہ تھے

''سرکش بیوی کو کچھ اور مارنا مشکل ہو تو اضعف الایمان کے درجے میں آنکھ ماری جاسکتی ہے بر ابھی نہیں منائے گی اور مردانہ اختیار کا بھی استعمال ہو جائے گا''۔ ان کے یہ جملے فیس بک پر ۲۸ مئی ۲۰۱۶ء کو نشر ہوئے تو جواب میں ایک خاتون نے دو تبصرے پیش

کیے۔ ہلکا پھلکا تشدد دھونٹوں سے بھی ممکن ہے پٹنا تو ہر عورت کو ہے کس سے پٹنا ہے اس کا فیصلہ آپ خود کریں۔

فقہ حنفی میں استعمال زیورات کی زکوٰۃ جو حنفی بیوی پر واجب تھی اس زکوٰۃ کی شوہر کی طرف سے ادائیگی پر عمار صاحب کا فیس بک پر تبصرہ کتنا مضحکہ خیز ہے نا حق ہم مجبوروں پر تہمت ہے قوامی کی یہ سب فیس بک پر عامیانہ پن کے مظاہر ہیں۔ عمار خان ناصر صاحب جیسا متدین سنجیدہ شخص بھی اس ذریعے Medium کو استعمال کرتے ہوئے ایک عالم دین کی شان برقرار نہ رکھ سکے۔ سیلفی کے حوالے سے بھی ان کا ایک جملہ بہت مشہور رہا ہے اور یہ نازیبا جملہ کم از کم حضرت والا کے شایان شان نہیں ہے یہ اصلاً فیس بک کی آفت ہے۔ یہ فیس بک کی روحانیت علمیت اور معنویت ہے۔

آپ کے حلقے کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ آپ فیس بک جیسے عظیم سرچشمۂ علمی سے کیوں محروم ہیں؟ اس کا جواب پھر کبھی سر دست صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ فیس بک کی روحانی، معاشرتی، اخلاقی آفتوں سے قطع نظر دنیاوی سماجی اور تہذیبی مصیبتوں کے بارے میں بعض مغربی اہل قلم نے کمال کا نقد کیا ہے آپ کے وہ رفقاء جو اس وسیلے سے استفادہ کرتے ہیں ان کو یہ نقد ضرور پڑھنا چاہیے تا کہ انھیں یہ تو معلوم ہو کہ فیس بک کہیں ان کو اپنے سمندر میں تحلیل تو نہیں کر رہا۔ اور ان کی مذہبی تہذیبی معاشرتی روایتی تاریخی اقدار کہیں متاثر تو نہیں ہو رہیں۔

(1)Sherry Turkle., Alone Together: Why We Expect More from Technology and Less from Each Other

(2) Mark Bauerlein., The Dumbest Generation: How the Digital Age Stupefies Young Americans and Jeopardizes Our Future

(3) Nicholas G. Carr., The Digital Enterprise: How to Reshape Your Business for a Connected World

(4) Nicholas G. Carr., The Church of Google.

(5)Maggie Jackson., Distracted: The Erosion of Attentions and the Comming Dark Age

(6) Mark Bouerlein., The Digital Divide: Arguments for and Against Face book, Google, Taxting, and the Age of Social Networking.

(7) G.K. Raz ., The Digital Immigrants.

آپ کی عنایت اور محبت کے باعث راقم کو پہلی مرتبہ برادرم اسلام فانی کے ذریعے اپنے بارے میں فیس بک پر بعض دلچسپ پر لطف چشم کشا، حیران کن، خوشگوار اور ناقدانہ آراء پڑھنے کو ملیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے نہایت معتبر موقر حلقہ علمی کے بعض نہایت اہم لوگ بھی راقم کی تحریروں اس کے مقاصد علمی اس کے نظریات افکار لائحہ عمل بلکہ اس کے عقیدے سے قطعاً واقف نہیں ہیں حالانکہ برہان مارچ ۲۰۱۶ء میں توہین رسالت پر راقم کا مضمون اس کے مکتب فکر اور نقطۂ نظر کی مکمل وضاحت کرتا ہے راقم کا کوئی دوسرا مکتب فکر نہیں ہے اگر کسی کو غلط فہمی ہوئی ہے تو اب ختم ہو جانی چاہیے۔ فیس بک پر میری گفتگو سے متعلق آپ کی عبارت نے کچھ غلط فہمیاں بھی پیدا کیں اسی لئے راقم فیس بک استعمال نہیں کرتا کہ اختصار، بے شمار غلط فہمیوں کو جنم دیتا ہے راقم صرف مضمون لکھتا ہے تفصیل کے ساتھ لکھتا ہے لوگوں کو شکایت ہوتی ہے کہ بہت طویل ہوتا ہے لیکن کم از کم اس طوالت کے باعث کوئی ابہام، التباس، اعتراض پیدا ہی نہیں ہوتا مارچ کے برہان میں ستر صفحات پر مشتمل

مضمون ''قانون توہین رسالت کا اطلاق غامدی صاحب کے موقف کا علمی جائزہ'' پڑھ لیجئے تمام ابہامات دور ہو جائیں گے غامدی صاحب نے اس مضمون کا جواب دینے کی کوشش نہیں کی۔ اگر میری تمام گفتگو فیس بک پر آتی تو شاید شبہات پیدا نہ ہوتے یہ ذریعہ مسائل پیدا کرتا ہے اس لئے اس میں احتیاط کرتا ہوں اور فیس بک پر علمی مباحث میں شامل نہیں ہوتا۔ آپ کے مختصر نکات نے بھی بہت سے سوالات کو جنم دیا اور اعتراضات کو بھی اور شبہات و اشکلات کو بھی جن کا جواب دینا ممکن نہیں۔

آپ کے حلقۂ احباب کی علمیت دیانت اخلاص —— ملت کے لیے درد ان کی اس تنقید سے نمایاں ہے جو دلیل کے بغیر مجھ پر کی گئی ہے حتی کہ انفارمیشن ٹکنالوجی کے عہد میں راقم کے افکار نظریات عقائد کے بارے میں فیصلہ کرنے اور فیس بک پر حتمی رائے دینے بلکہ فتوے دینے سے پہلے راقم سے کسی ایک فرد نے بھی فون پر، ای میل پر خط و کتابت کے ذریعے کبھی رابطہ کرنے کی کوشش تک نہیں کی کم از کم یہی پوچھ لیتے کہ حضرت یہ آپ نے ہی کہا تھا آپ نے ہی لکھا تھا آپ اس تحریر پر اب بھی قائم ہیں یا ان افکار سے رجوع کر لیا ہے۔ ظاہر ہے ہم پیغمبر تو نہیں ہیں اسلامی علمیت کا اصل حسن اپنے ماخذات سے رجوع کے نتیجے میں اپنی ہر وقت اصلاح اور توبہ ہے یہ عمل زندگی بھر جاری رہنا چاہیے الحمدللہ راقم اسی راستے پر گام زن ہے اسے اپنی کسی غلطی سے رجوع کرنے میں ایک لمحے کا تامل نہ ہوگا اگر اسے اہل سنت کے ماخذات دین کی روشنی میں دلائل سے واضح کر دیا جائے۔

میں آپ کے تمام احباب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھے یاد رکھا مجھے آئینہ دکھایا اور منفی مثبت تبصروں کے ذریعے اپنی محبت کا اظہار کیا خاص طور پر ان احباب کا شکر گزار ہوں جنہوں نے صحیح یا غلط فہمی پر مبنی تنقید فرمائی اللہ تعالیٰ ان سب کے اجر میں اضافہ کرے یہ سب دین سے محبت رکھتے ہیں امت کا درد مجھ سے زیادہ رکھتے ہیں لہٰذا انھوں نے اس امت کی خاطر راقم کو تنقید کا نشانہ بنایا کہ یہ گستاخ و بے ادب امت کو گمراہ کر رہا ہے۔ میرے ان بھائیوں کی اس تنقید نے میرے دل میں ان کے لیے محبت کے شدید جذبات پیدا کیے ہیں یقین جانیے کہ ان کی غلط تنقید پڑھ کر بھی مجھے دکھ نہیں ہوا ان سب کے لیے ان سب کی خدمت میں رسالت مآب کی دعا پیش خدمت ہے **اللھم الف بین قلوبنا واصلح ذات بیننا واھدنا سبل السلام و نجنا من الظلمت الی النور** ان احباب کی محبت کے بارے میں جناب رسالت مآب کی طرح اللہ کی بارگاہ میں سوال محبت بھی پیش کرتا ہوں اللھم ارزقنی حبك وحب من ینفعنی حبه عندك۔ فیصل آباد کے مفتی زاہد صاحب اور ڈاکٹر شہباز منج صاحب خصوصی شکریہ کے مستحق ہیں۔

آپ کے تمام احباب کی خدمت میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ

☆ راقم الحروف کے شاگرد رشید جناب ظفر اقبال صاحب کی مرتبہ دو اہم ترین کتابیں **اسلام اور سائنس جدید تناظر میں** اور **اسلام اور جدیدیت کی کشمکش** کا مطالعہ فرمائیں ان کتابوں کی روشنی میں وہ بتائیں کہ راقم کی فکر میں کیا غلطی کیا حشو و زوائد کیا افراط و تفریط کیا شدت پسندی کیا فکری اعتقادی علمی غلطی ہے ان کتابوں کی تائید حضرت مفتی تقی عثمانی صاحب جناب زاہد الراشدی صاحب اور تمام مکاتب فکر کے تمام علماء کی جانب سے کی گئی ہے حتی کہ ہندوستان اور عالم عرب کے تمام مکاتب فکر کے بعض اہم علماء نے بھی اس کی

تائید فرمائی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ حضرت مفتی زاہد صاحب کم از کم حضرت مولانا تقی عثمانی صاحب اور شہباز منج صاحب کم از کم حضرت مولانا زاہد الراشدی صاحب کے افکار کی تردید کرتے ہوئے یقیناً کئی مرتبہ غور فرمائیں گے۔

اگر بحث و مباحثہ ضروری ہے تو ان دو کتابوں پر ہونا چاہیے۔ اگر اشکالات التباسات سوالات اشتباہات پیدا بھی ہوئے ہیں تو راقم سے کم از کم ایک مرتبہ تو براہِ راست ضرور پوچھا جائے بس یہی استدعا ہے۔

☆ آپ کے ایک رفیق نے جناب ڈاکٹر محمود احمد غازی صاحب کا ذکر کیا ہے ڈاکٹر صاحب کے آخری زمانے میں جب وہ ملیشیاء میں تھے راقم سے طویل خط و کتابت رہی جو عنقریب شائع ہوگی اس سلسلے میں ایک خط الحق کے مدیر مولانا سمیع الحق کو تحریر کیا تھا وہ آپ حضرات کو ارسال کرر ہا ہوں اسے دیکھ لیجیے انشاء اللہ آپ کو بعض نئی اور مثبت باتیں معلوم ہوں گی غازی صاحب نہایت مخلص صاحب علم اور صاحب کمال ہستی تھے ہم ان کی بہت قدر کرتے ہیں۔ وہ ہمارے نقطۂ نظر سے بڑی حد تک متفق ہو گئے تھے کیوں کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں پر ایمان لانے کے بجائے براہ راست سوالات کیے اور ہمارے ہزاروں صفحات کا مطالعہ فرمایا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ان سے وہی غلطی ہوئی جو علامہ اقبال سے ہوتی تھی غازی صاحب نے ''امالی غلام محمد'' پڑھے تو اس کے ہر لفظ سے اتفاق فرمایا اور کہا کہ افسوس ہم نے مغرب کو اس کے فلسفے اور سائنس کو انتقادی نظر سے نہیں دیکھا بلکہ اکثر ہمارے لیے اس کا تجربی عملی افادی پہلو کشش کا سبب رہا اور ہم **خذ ما صفا ودع ما کدر** کے تحت ہی مغربی مطالعات کرتے رہے۔ الشریعہ کے زیر اہتمام ان کا ایک خطبہ جو مغرب سے متعلق ہے اس پر بھی ڈاکٹر صاحب نظر ثانی کر رہے تھے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اب علوم کی تقسیم ختم ہوگئی ہے یہی نقطۂ نظر بعد میں زاہد راشدی صاحب نے اختیار کر لیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے رینے گینوں اور روایت کے مکتب فکر کے تنقیدی مطالعات بھی پڑھ لیے تھے اور وہ مغرب کی حقیقت سے بخوبی واقف ہو گئے تھے وہ محاضرات مغرب کے لیے ایک نئے انداز سے نئے زاویہ نظر کے ساتھ آمادہ تھے لیکن زندگی نے مہلت نہیں دی کاش ڈاکٹر صاحب اپنے مخصوص عالمانہ دل نشین انداز میں محاضرات پیش کرتے تو ہمارا کام آسان ہو جاتا ہم میں نہ وہ صلاحیت ہے نہ وہ دل نشین اسلوب کہ اپنا درست پیغام بھی احسن طریق سے آپ اہل علم تک پہنچا سکیں شاید ہم خود ہی اپنے پیغام کی راہ میں رکاوٹ ہیں اللہ تعالیٰ ہماری رہنمائی فرمائے اور ہماری بات کو اس کی روح اور جوہر کے ساتھ مخاطبین تک منتقل کرنے کی توفیق عطا فرمائے احباب جو ہماری بات سے اتفاق نہ کریں وہ مکالمہ مباحثہ ضرور کریں فتوے نہ دیں اور مکالمے کا دروازہ بند نہ کریں بس یہی عاجزانہ استدعا ہے جو لوگ اس درخواست کے باوجود مکالمہ پسند نہ کریں میں ان دوستوں کے بارے میں مکمل حسن ظن رکھتا ہوں ان کے ایمان اخلاص تقویٰ میں کوئی شک نہیں رکھتا اور سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے اعلیٰ ایمانی خصائص کی بنیاد پر راقم جیسے جاہل کی جہالت کو وجدانی طور پر قابل اصلاح ہی نہیں سمجھتے۔ پھر ایسے زندیق مرتد سے مکالمے کا کیا فائدہ ہے؟

آپ کے احباب کی ناراضگی کا اصل سبب سائنس و ٹکنالوجی اور ترقی کے معاملے میں ان تک پہنچنے والا ہمارا نامکمل نقطۂ نظر ہے چونکہ احباب اس موقف کی کلیت سے آگاہ نہیں لہٰذا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ راقم انھیں پتھر کے دور میں لے جانا اور اونٹ کی پیٹھ پر بٹھانا چاہتا ہے ان سے AC فریج گاڑی چھین کر گرمی میں پیدل چلانا چاہتا ہے کچھ یہی نقطہ نظر ہمارے ایک مخلص ساتھی تنظیم اسلامی کے سابق رفیق ملتان کے

جناب عبدالرشید صاحب کا تھا جنھوں نے برہان میں سو صفحات راقم کے خلاف لکھے اور فرمایا کہ سائنسی ترقی کے گدھے پر سواری کا اصل حق امت مسلمہ کا ہے خالد جامعی سائنس کے گدھے کی سواری کے مزے اٹھانے سے روکتا ہے۔ مدیر برہان نے حکم دیا کہ ان اعتراضات کے جواب کے لیے تمہیں سو صفحات نہیں صرف دس صفحات دیے جائیں گے ہم نے اس کا جواب دس صفحات میں تحریر کر دیا برہان کی ویب سائٹ پر وہ مضمون موجود ہے وحیدالدین خان صاحب کے سائنسی نقطۂ نظر اور جدید سائنس کے حوالے سے رشید صاحب کی گالیوں کے جواب میں بھی راقم کے مضمون کی صرف دو دو قسطیں برہان میں شائع ہوئیں ان پر کوئی حکم اگر لگ سکتا ہے تو اس سے آگاہ فرمایئے۔ برہان میں رشید صاحب کے جواب میں جو خط شائع ہوا اس میں سائنسی موضوعات بھی تفصیل کے ساتھ اور حوالوں کے ذریعے پیش کیے گئے ہیں اپنے احباب سے کہیے کہ اسے دیکھ لیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ انتہائی اہمیت کے حامل حساس موضوعات پر اعتراضات تو تین سطروں میں کیے جاسکتے ہیں مگر ان کا جواب پچاس صفحات سے کم میں نہیں دیا جاسکتا رسالوں کے پاس جگہ نہیں ہوتی ان کے پاس صرف مختصر مضامین کے لیے جگہ ہوتی ہے لہٰذا اہم مباحث تشنہ رہ جاتے ہیں اور شکوک کی نئی گرد پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ شکوک اہل علم کے مابین نفرت رقابت اور دائمی اختلاف پیدا کرنے کا سبب بن جاتے ہیں۔ لیکن انٹرنیٹ کے دور میں جب رابطہ آسان ہے تو متعلقہ فرد سے وضاحت تو طلب کی جاسکتی ہے اتنی دوری کا سبب کیا ہے؟

راقم عاجز حقیر فقیر پر تقصیر ہے اگر اس کی کسی تحریر سے یہ گمان ہوا کہ وہ انا الحق اور دیگر تمام جاہل مطلق ہیں تو راقم ایسی تحریروں سے اعلان برات کرتا ہے وہ اللہ کا ایک حقیر بندہ ہے اور علماء، دینی مدارس، اسلامی تحریکوں، راسخ العقیدہ مکاتب فکر، امت کے دینی گروہوں، کا خادم اور وکیل ہے وہ ان کی توہین، تنقیص، تذلیل، تضحیک کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ صرف یہی نہیں۔ دوسرے حلقوں سے تعلق رکھنے والے احباب مخالفانہ نقطۂ نظر رکھنے والے دوستوں کی بھی وہ دل سے قدر کرتا ہے اور ان کی تنقید سے سیکھنا چاہتا ہے مگر یہ دوست تنقید سے پہلے راقم کا نقطۂ نظر اس کی تحریروں یا گفتگو سے براہ راست معلوم کریں پھر وضاحت طلب فرمائیں پھر وہ فتویٰ جاری کرنا چاہیں تو جاری کریں راقم کسی کی توہین وتذلیل کا قائل نہیں۔ وہ ایسی ہر تحریر سے رجوع کا اعلان کرتا ہے اگر وہ تحریر اس کے نام سے کہیں شائع ہوئی ہے۔ راقم ایک گناہ گار اور سیاہ کار ہے اسے اپنے کسی موقف کو الحق کہنے کا دعویٰ نہیں وہ ایک طالب علم ہے اور تمام زندگی طالب علم رہنا چاہتا ہے میرے کسی بھی محترم مکرم معظم ناقد کو اگر میرے بارے میں یہ گمان پیدا ہوا تو امید ہے کہ اس معذرت کے بعد وہ راقم کے بارے میں اپنے آئینۂ دل سے غبار کو صاف کر دیں گے۔

ان حضرات کی خدمت میں نہایت عاجزی سے درخواست ہے کہ درج ذیل کتابوں کا مطالعہ فرمائیں تاکہ ہمارے موقف کے فہم میں حائل موانع دور ہوسکیں۔

(۱) جریدہ —— امالی غلام، خطبات اقبال پر سید سلیمان ندوی کی تنقید

(۲) جریدہ ۳۷ —— جس میں خطبات اقبال پر ہونے والے تمام مباحث جمع کر دیے گے ہیں۔

(۳) سرسید اور حالی کا نظریہ فطرت، ڈاکٹر ظفر حسن، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

(۴) برصغیر میں اسلامی جدیدیت، عزیز احمد، ادارہ ثقافت اسلامیہ، لاہور

(۵) خطبات اقبال نئے تناظر میں، سہیل عمر، اقبال اکیڈیمی لاہور

(٦) جریدہ ۲۹ میں کتاب Rejecting Freedom

(۷) جریدہ ۳۴ چ میں John Rawls کی تھیوری آف جسٹس پڑھیے جو لبرل تصور عدل کا غالب اور رائج تصور ہے اس میں لبرل ازم کی حقیقت معلوم ہوگی اور اسلام کو لبرل بنانے کے طریقوں میں موجود مضمرات واضح ہوں گے لبرل ازم اور اسلام میں کسی سطح پر ہم آہنگی ممکن ہی نہیں غامدی صاحب اور ان کا حلقہ ان مباحث سے واقف ہی نہیں

(۸) ساحل جدیدیت پر خصوصی شمارہ

(۹) Development Dictionary

(۱۰) Gilbert Rist-History of Development

(۱۱) Gilbert Rist Delusion of Economics

(۱۲) M. Sandal., The Justice

(۱۳) M. Sandal., What money can't buy

(۱۴) Niall Ferguson., The Great Degeneration

(۱۵) Niall Ferguson., The West and the Rest

(۱٦) John Dupre., Human Nature & Limits of Science

(۱۷) Graham Taylor., The New Political Sociology: Power, Ideology & the Identity in an age of complexity.

(۱۸) J.E. Hackett., The handbook of Science and Technology Studies

(۱۹) Vandana Shiva., Staying Alive

(۲۰) Jerry Mander., In The Absence of the Sacred: The Failure of Technology & the Survival of the Indian Nations

(۲۱) Sandra Harding., The Postcolonial Science and Technology Studies Reader

(۲۲) Tom Wessels., The Myth of Progress: Toward a Sustainable Future

(۲۳) EF Schumacher., Small is beautiful: a study of economics as if people mattered

(۲۴) Martin Lindstrom., Buy.ology: Truth and Lies About Why We Buy

(۲۵) Jurgan Habermas., Communication & the Evolution of Society.

(۲٦) Feryarbend., Against Method.

(۲۷) Richard Bessel., Violence: A Modern Obsession

(۲۸) William T Gavanaugh., The Myth of Religious Violence

(۲۹) Slavojzizek., Violence: Six Side Ways Reflections

ان کتابوں کا مطالعہ آپ کے حلقہ احباب کے لیے علم کی ایک نئی دنیا کا دروازہ کھولنے کا سبب بنے گا کیونکہ آپ کے حلقے میں اکثر لوگ ترقی سائنس وٹکنالوجی مادی فتوحات کے حوالے سے مغرب سے بہت متاثر ہیں اور نہایت اخلاص کے ساتھ مغرب کی تمام مادی فتوحات کو اسلامی شریعت کے ساتھ عالم اسلام میں حاصل کرنے کے لیے بے چین ہیں۔ خواہش اور حقیقت میں بہت فرق ہے صرف خواہش مسئلے کا حل نہیں ہے اس کا حصول جدید سائنس کے تاریخی تناظر کے ناقدانہ مطالعے کے بغیر بہت سے مسائل پیدا کرتا ہے ہم اس تنقیدی مطالعے پر لوگوں کی توجہ مبذول کرانا چاہتے ہیں اس انتقاد کو سائنس کے مکمل استرداد پر محمول کیا گیا ہے۔

عسکری صاحب پر راقم کام نہیں کر رہا اس کے ایک شاگرد عزیز ادب میں جدیدیت کے نفاذ و نفوذ کے حوالے سے عسکری صاحب

کے اہم مضامین جمع کر رہے ہیں کیونکہ مغربی تہذیب نے عام لوگوں میں اثر و رسوخ مغربی فکر و فلسفے کے ذریعے نہیں بلکہ اس فلسفے کی عملی تعبیر آرٹ، ادب، فنون لطیفہ کے ذریعے پیدا کیا ہے عسکری صاحب اور سلیم احمد نے اس پہلو پر بہت اچھا کام کیا ہے **خذ ما صفا و دع ما کدر** کے تحت اس سے استفادہ میں کوئی حرج نہیں۔ رینے گینوں کے حلقے کی ترجمانی ایک الگ کام ہے اور اس حلقے سے استفادہ دوسرا کام۔ اہل سنت کا منہج یہی ہے ان کے نصاب میں خوارج معتزلہ اور اہل تشیع کی کتب بھی شامل ہیں استفادہ کا یہ عمل اپنے اصولوں کی بنیاد پر ہوتا ہے نہ کہ ان کے اصولوں کی بنیاد پر **ساحل** میں عسکری صاحب کی کتاب کے تعارف میں راقم نے جو مضمون لکھا تھا ان مباحث کا اس نئے کام سے کوئی تعلق نہیں انٹرنیشنل اسلامک یونیورسٹی اسلام آباد کے علمی مجلّے رسالے **معیار** شمارہ ۱۳ میں ڈاکٹر محمد ارشد نے اپنے مقالے **مکتوبات ڈاکٹر محمد حمید اللہ** کے اختتام پر عسکری صاحب سے متعلق **ساحل** کے مضمون کی عکسی نقل اور **ساحل** کے متعلقہ شمارہ کے سرورق کا عکس شائع کر دیا ہے اسے ایک نظر دیکھ لیا جائے۔ آپ کے حلقہ احباب سے تبادلہ خیالات کا جی چاہتا ہے لیکن فیس بک کے بجائے خط و کتابت کے روایتی ذریعے سے ان سب کے پتے درکار ہیں۔

عسکری صاحب کے حلقے کے سلیم احمد، جمال پانی پتی، تحسین فراقی روایت کے مکتب فکر کی گمراہیوں کو تسلیم نہیں کرتے ان کے خیر کو قبول کرتے ہیں سہیل عمر سراج منیر روایت کے مکتبہ فکر کی گم راہیوں کو بھی برحق سمجھتے ہیں سہیل عمر روایت کے مکتبہ فکر کے برعظیم پاک و ہند میں مقدم ہیں وہ شواں کے مرید تھے لیکن شواں نے جب اپنی اہلیہ محترمہ کی عریاں تصاویر خلوت میں اپنے لیے کھینچیں مگر وہ کسی ذریعے سے باہر آ گئیں تو انہوں نے بیعت فسخ کر دی شواں کا موقف یہ تھا کہ یہ آرٹ ہے اور خلوت کا آرٹ ہے۔ سہیل عمر کا موقف یہ تھا کہ اس آرٹ کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہیں تھی شریعت نے کم از کم اس امر کی اجازت نہیں دی۔ ہر وہ مخفی جائز عمل جو کسی بھی ذریعے سے دوسرے تک پہنچنے کا ذریعہ بنے وہ ذریعہ بھی غلط ہے اور یہ طریقہ بھی غلط۔

روایت کے مکتب فکر کا ترجمان ''**روایت**'' ایک اہم علمی مجلّہ تھا جو سہیل عمر اور سراج منیر کی ادارت میں شائع ہوتا تھا اس مجلّے میں ڈاکٹر رشید احمد جالندھری کی مرتبہ کتاب **قرآن مجید: اسلامی فکر کا بنیادی سرچشمہ** میں شامل ان کے ایک مضمون **شریعت اسلامی کی تعبیر و تشریح کا مسئلہ** پر تنقید کرتے ہوئے مجلس ادارت نے جو تفردات پیش کیے ملاحظہ کیجیے ''اسلامی معاشرہ یہ وہ معاشرہ ہے جو قرآن و سنت کی عملی شکل ہے اور ان لوگوں پر مشتمل ہے جو عملاً دین کے لیے ایک زندہ نمونہ کی حیثیت رکھتے ہیں عقل کے ذریعہ جو اجتہاد کیا جائے گا اس کے لیے ضروری ہوگا کہ یہ اسلامی معاشرہ اسے قبول کرے اسلامی معاشرے کی اسی قبولیت کو اجماع امت کہتے ہیں قرآن و حدیث سے جس معاملے میں حکم نہیں ملے گا وہاں عقل ایمانی سے کام لیا جائے گا اور اس بات کا فیصلہ کہ کسی فرد نے جو اجتہاد کیا ہے وہ دین کی روح کے مطابق ہے یا نہیں اسلامی معاشرہ کرے گا یہی فقہ کے بنیادی اصول ہیں قرآن حدیث قیاس اور اجماع (سہیل عمر، سیر و سفر ہمارا، لاہور، اقبال اکیڈیمی ۲۰۰۹ء، طبع اول، اقبال اکیڈیمی، ص ۴۲، ۴۳)

مزید تفردات پڑھیے ''فقہ ان قیاسی یا عقلی اجتہادات پر مبنی ہے جن معاملات میں قرآن و سنت کا حکم نہیں ملتا انھیں حسب ضرورت

تبدیل کیا جاسکتا ہے بشرطیکہ اس تبدیلی کو مسلم معاشرے کی تائید اور منظوری حاصل ہو یہ ایک لازمی شرط ہے کیوں کہ اجتہاد ایک فرد کرتا ہے یا چند افراد مل کر جن کی رائے میں غلطی کا امکان ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اسلامی معاشرہ اس بات کا فیصلہ کرے کہ وہ اجتہاد اس کے نزدیک درست ہے یا نہیں۔[سہیل عمر ص ۴۳ محولہ بالا]

روایت کے مکتبہ فکر کی علمیت پر ساحل کے اعتراضات اسی تناظر میں ہیں۔ظاہر ہے روایت کے مکتب فکر کی یہ علمیت اہل سنت کے منہج علمی کے لیے کسی حالت میں قابل قبول نہیں۔علماء کے اجتہاد کے درست یا غلط ہونے کا فیصلہ جاہل عوام کریں گے یہ عجیب Paradox ہے یہی بات ہمارے محترم جاوید غامدی صاحب کرتے ہیں مقامات میں لکھتے ہیں کہ علماء اجتہاد کریں گے اور پارلیمان کے جاہل نمائندے اس اجتہاد میں سے جس اجتہاد کو پسند کریں گے اسے قانون بنا کر نافذ کر دیں گے۔یعنی علماء کی کون سی رائے قرآن وسنت کے قریب تر ہے اور کون سا اجتہادی فیصلہ اسلام کی روح کے مطابق ہے —— اس کا فیصلہ عالم نہیں علما نہیں جہلاء کریں گے جو نہ عربی جانتے ہیں نہ قرآن و سنت کی اصطلاحات سے واقف ہیں نہ خیر وشر میں فرق جانتے ہیں دین اب ایسے جید جہلاء کے رحم وکرم پر رہ جائے گا —— یہ عجیب منطق اور عقلیت ہے۔انہی معنوں میں روایت کے مکتبہ فکر کا موقف غامدی صاحب سے ملتا جلتا ہے لہٰذا ایک زمانے میں سہیل عمر صاحب اقبال اکیڈیمی کی مہروں سے غامدی صاحب کی کتابیں اکیڈیمی کے خرچ پر مفت احباب کو مہیا کرتے تھے ہمیں بھی ان کی جانب سے آٹھ کتابوں کا تحفہ موصول ہوا تھا جس میں ڈائریکٹر اقبال اکیڈیمی کا کارڈ چسپاں کیا گیا تھا غامدی صاحب کے بارے میں ساحل کے پانچ خصوصی شماروں کا سب سے زیادہ صدمہ بھی سہیل عمر اور احمد جاوید صاحب کو ہوا تھا۔ظاہر ہے انسان اپنے ہم خیال لوگوں پر ایسی تنقید سے ناراض ہوتا ہے جس کا جواب دینا بھی ممکن نہ ہو۔یہ بات صرف غامدی صاحب سے متعلق نہیں خود اقبال اکادمی سے بھی متعلق ہے اسالی غلام محمد جو خطبات اقبال پر سید سلیمان ندوی کی تنقید آشکار کرتے ہیں جریدہ اور ساحل میں ان کی اشاعت پر اقبال اکادمی کا حال بھی بالکل غامدی صاحب جیسا تھا فرق صرف یہ تھا کہ اس تنقید کے بعد احمد جاوید اور سہیل عمر صاحب ملاقات یا تبادلہ خیالات کے لیے بہ نفس نفیس کراچی تشریف لائے اور درخواست کی کہ اس سلسلے کو روک دیا جائے اس کی تفصیلات راقم آپ کو ایک خط میں تحریر کر چکا ہے۔غامدی صاحب نے راقم کی تنقید پر اپنے حلقے کو حتمی ہدایت کر دی کہ خالد جامعی کی کسی تنقید کا کوئی جواب نہ دیا جائے یہی حکمت عملی سہ ماہی ''جی'' کے حوالے سے بھی اختیار کی گئی ہے۔غامدی صاحب کا حلقہ جس تنقید کا جواب دے سکتا ہے صرف اسی پر تنقید کرتا ہے جس تنقید کا جواب دینا ان کے لیے ممکن نہیں ہوتا اس پر خاموشی اختیار کر لی جاتی ہے تاکہ ان کے حلقے کے لوگ اس موثر تنقید سے متاثر نہ ہوں مفتی عبدالواحد صاحب کے شاگرد نے عمار ناصر صاحب اور غامدی صاحب پر نہایت عالمانہ تنقیدی مضمون لکھا غامدی صاحب کے حلقے نے اور عمار ناصر صاحب نے اس مضمون کو بالکل نظر انداز کر دیا۔اجتہاد پر غامدی صاحب نے مقامات میں جو کچھ لکھا ہے وہ ان کی پچھلی رائے سے بالکل مختلف ہے۔اب وہ اجتہاد کے لئے مسلمان، مفتی، عالم، عربی سے گہری واقفیت علوم اسلامی پر عبور کی شرط بھی ختم کر چکے ہیں ان کی تحقیق یہ ہے کہ کافر، مومن، فاسق، فاجر، صحابی، زندیق، ملحد، بے دین، تابعی سب کا اجتہاد ایک جیسا ہوتا ہے جس کے اجتہاد کی عقلی دلیل مضبوط ہوگی اس کا اجتہاد قبول کر لیا جائے گا۔

۱۹۷۵ میں غامدی صاحب جماعت اسلامی میں تھے اور اہل سنت کے نقطہ نظر کو قبول کرتے تھے اور ماخذات دین میں اجتہاد کے بجائے صرف اجتہاد کے قائل تھے اور اجماع کا اجتہاد کا ماخذ سمجھتے تھے اور دور جدید کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالتے تھے مگر اب وہ اسلام کو دور جدید کے مطابق ڈھالنا چاہتے ہیں لہذا اجتہاد کی راہ میں اجماع کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے ہیں مقامات میں لکھتے ہیں اجماع ایک بدعت ہے اس سے شریعت کی ابدیت مجروح ہوئی دور جدید کی نسبت سے اسلام کا تعلق [relevance] ثابت کرنا مشکل ہو گیا [مقامات ۲۰۱۴ء ص ۱۸۷] ڈاکٹر ممتاز احمد خان کو ۱۹۷۵ میں انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں۔

[اجتہاد کے بارے میں میرے ایک سوال پر جاوید صاحب نے کہا]

اصل مسئلہ یہ ہے کہ جدید دور کے حالات کو کتاب وسنت کے مطابق ڈھالا جائے نہ کہ کتاب وسنت کو جدید دور کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی جائے۔ دنیا میں کوئی ایسا مسئلہ نہیں ہے جس کا حل اسلام نے نہ دیا ہو۔ [ممتاز احمد، دینی مدارس، روایت اور تجدید علماء کی نظر میں، اسلام آباد، یمل مطبوعات، ۲۰۱۲ء، ص ۶۶، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۳] حالی نے سر سید کے حوالے سے دو اہم باتیں لکھی ہیں

وہ (سرسیّد) ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی [حیات جاوید جلد اول دیباچہ ص ۱۰ محولہ بالا] سر سید دین میں نکتہ چینی کرنے والے آدمی تھے یہی رویہ غامدی صاحب کے مکتبہ فکر کا ہے لیکن سر سید اس نکتہ چینی کے باوجود کچھ حدود وقیود کے سختی سے قائل تھے غامدی صاحب ان حدود کو درست تسلیم نہیں کرتے سر سیّد نے اجتہاد کے بارے میں لکھا ہر شخص ان مسائل میں جو قرآن یا حدیث صحیح میں منصوص نہیں ہے۔ آپ اپنا مجتہد ہے [حیات جاوید جلد دوم ص ۲۵۷ محولہ بالا] سر سید نے تو اجتہاد کا حق صرف مسلمانوں کو دیا تھا اور غیر منصوص مسائل میں دیا تھا مگر غامدی صاحب نے تو صرف مسلم کو ہی نہیں غیر مسلم کو بھی اجتہاد کا حق دے دیا اور مسلمانوں کو حکم دیا کہ وہ غیر مسلموں کے اجتہاد کی تقلید کریں کیونکہ اجتہاد میں مجتہد کو نہیں بلکہ دلیل کو دیکھا جاتا ہے جس کی دلیل وزنی ہو گی اسے قبول کر لیا جائے گا خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو یہ موقف ان کی کتاب ''مقامات'' کے مضمون اجتہاد میں موجود ہے

غامدی صاحب کے چھبیس اجتہادات پر راقم نے ایک مضمون لکھا ہے وہ ارسال کروں گا حضرت والا کی عربی دانی کا حال ساحل میں شائع ہو چکا ہے ساحل اپریل ۲۰۰۷ء، مئی ۲۰۰۷ء، جون ۲۰۰۷ء، جولائی ۲۰۰۷ء، اگست ۲۰۰۷ء، میں ان کی عربی دانی، علمیت، سرقہ بازی، مدلل حوالوں کے ساتھ پیش کی گئی ان شماروں کی سرخیاں: درج ذیل ہیں جن سے مباحث کا انداز ہو گا آپ کے حلقے میں شامل غامدی صاحب کے مداح مفکرین نے ان مباحث کا مطالعہ نہیں کیا ہے۔

غامدی صاحب کی عربی دانی، اور جدید وقدیم علوم سے واقفیت کا پہلا محاکمہ، ساحل، اپریل ۲۰۰۷ء

سرقہ بازی کی تاریخ میں جاوید غامدی کا کوئی مدمقابل نہیں، ساحل، مئی ۲۰۰۷ء

جاوید غامدی تاریخ فکر اسلامی کے زعیم: زنیم یا ختار، ساحل، جون ۲۰۰۷ء

جاوید غامدی: نہ عربی سے واقف نہ قرآنیات جہاد سے، ساحل، جولائی ۲۰۰۷ء

لیے اصل مخاطب کی حیثیت اس کی اپنی قوم کو حاصل ہے یہ قرآن کی نص ہے لینذروا قومهم اذا رجعوآ اليهم [غامدی،میزان،لاہور،المورد،طبع دہم، ۲۰۱۵ء ص۵۵۰] اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ظالم حکمرانوں کا ظلم بھی انھیں [داعی کو] دعوت کے کام سے باز نہ رکھ سکے [میزان ص۵۵۱ محولہ بالا] قرآن کے نصوص کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اور اپنے ہی اصول اور اجتہاد کو پامال کر کے غامدی صاحب نے ملائشیا میں خود ساختہ جلاوطنی اختیار کر لی جبکہ حکمران، طاقت کے تمام مراکز، میڈیا، ریاست اور حکومت سب غامدی صاحب کے حامی تھے کوئی ان پر ظلم نہیں کر رہا تھا صرف عوام ان کے مخالف تھے انسانی تاریخ کے یہ پہلے نام نہاد مصلح [So-Called Reformer] ہیں جو حکمرانوں کے دل میں رہتے ہیں لیکن عوام کے دلوں میں ان کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ غامدی صاحب کا ہی اصول ہے جو میزان میں بیان ہوا ہے ''آدمی اگر اپنے اجتہاد یا گمان کے مطابق کسی چیز کو دین و شریعت کا تقاضہ سمجھتا ہے تو اس سے قطع نظر کہ وہ فی الواقع شریعت کا حکم ہے یا نہیں اس کی خلاف ورزی اس کے لیے جائز نہیں [میزان ص۳۶۶ محولہ بالا] اس اجتہاد کی روشنی میں ان کی جلاوطنی ان کے اصول اور اجتہاد کے خلاف ہے اور حرام ہے۔

کیا ایسے عالم سے دین اخذ کیا جا سکتا ہے جو اپنے ہی اصول پر عمل نہ کرتے ہوں۔ خود غامدی صاحب کا اجتہاد ہے داعی کے قول و عمل میں کسی پہلو سے کوئی تضاد نہ ہو وہ جس حق کی طرف لوگوں کو دعوت دیں ان کا عمل بھی ان کی شہادت دے، دعوت بے عمل واعظوں کا نہیں بلکہ ارباب عزیمت کا کام ہے جو سب سے پہلے اپنے نفس کو مخاطب بناتے اور پھر اسے مجبور کرتے ہیں کہ وہ بالکل آخری درجے میں اس حق کو اختیار کرے [میزان ص۵۵۲ محولہ بالا] غامدی صاحب کے اصولوں کے تحت غامدی صاحب جیسے عالم بے عمل کے تفردات کی کوئی حیثیت نہیں۔

غامدی صاحب کا تصور جہاد: مرزا قادیانی کا سرقہ:

غامدی صاحب کے بارے میں ایک اہم ترین انکشاف غامدی صاحب کی علمیت کے مصادر سے متعلق ہے " میزان "کے باب'' قانون جہاد'' میں انہوں نے امت کے اجماع سے ثابت ——— اقدامی جہاد کا انکار کیا ہے غامدی صاحب کے اس تصور جہاد کی روشنی میں اسلامی تاریخ کے تمام جہاد دہشت گردی کے زمرے میں آتے ہیں حتیٰ کہ صحابہ کرام کا روم و ایران پر حملہ بھی قرآن کی رو سے ناجائز قرار پاتا ہے۔

غامدی صاحب نے جہاد کا یہ فلسفہ خود تخلیق نہیں کیا بلکہ یہ فلسفہء جہاد فرانسیسی مفکر رینے گینوں (یحییٰ نور الدین) کے گمراہ روایتی مکتب فکر [Traditional School of Thought] کے اہم محقق ولیم چیٹک کی کتاب Vision of Islam اور ڈاکٹر حسین نصر کی کتاب Islam in the Modern World اور مرزا غلام احمد قادیانی کے صاحبزادے مرزا بشیر الدین محمود کی کتاب '' دعوۃ الامیر '' کا لفظ بہ لفظ، حرف بہ حرف سرقہ اور چربہ ہے۔ روایت کا مکتب فکر وحدت ادیان [Unity of Faiths] کے کفر کا قائل ہے اس مکتب فکر کے یہاں غامدی صاحب کی طرح اسلامی ریاست، سیاست، خلافت، قوت طاقت، کی بحث سرے سے ناپید ہے یہ مکتب فکر اسلامی سائنس، اسلامی فن تعمیر، اسلامی فنون کے احیاء کی بات کرتا ہے مگر یہ نہیں بتاتا کہ ان سب کا احیاء اسلامی ریاست کے احیاء کے بغیر کیسے ممکن ہے۔

مرزا بشیر الدین محمود کی کتاب '' دعوۃ الامیر '' ۲۸۴ صفحات پر مشتمل ہے یہ کتاب اصلاً ایک فارسی مکتوب ہے جو امیر افغانستان امیر امان اللہ خان کے نام قادیانی مذہب کی دعوت پہنچانے کے لئے تحریر کیا گیا تھا اس مکتوب کے اردو ترجمہ کا نام بھی " دعوۃ الامیر " ہے۔ ہمارے سامنے کتاب کی نویں اشاعت ہے جو ۱۹۷۹ء میں ضیاء الاسلام پریس ربوہ سے شائع ہوئی اس کے ناشر الشرکۃ الاسلامیہ ربوہ ہیں۔ کتاب کے صفحہ ۴۲ تا ۴۷ میں قادیانیت کا نظریہ جہاد بیان کیا گیا ہے۔ غامدی صاحب نے ان چھ صفحات کا خلاصہ اور قرآن کی آیتیں بھی اپنے قانون جہاد میں سرقہ کر کے شامل کر دیں۔

غامدی صاحب نے قیامت تک جہاد کو ممنوع قرار دیا ہے۔ میزان کے قانون جہاد میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ کا غلبہ دین کے لئے جہاد قانون اتمام حجت کے ساتھ خاص تھا اس قانون کے پانچ مرحلے تھے ۱۔ انداز ۲۔ انذار عام ۳۔ اتمام حجت ۴۔ ہجرت و برات ۵۔ جزا و سزا [غامدی میزان 2015

قانون دعوت ص ۵۴۴ تا ۵۴۵] ____ رسالت مآب کے ان مراحل کے بعد قانون اتمام حجت کے تحت اپنی تلواروں سے مشرکین و کفار پر اللہ کا عذاب نازل کر دیا لیکن رسالت مآب کے ساتھ ہی یہ غلبہ دین بھی قیامت تک کے لیے ختم ہوگیا۔ میزان میں غامدی صاحب قانون جہاد میں لکھتے ہیں البقرہ اور انفال میں یکون دین للہ کی ضمیر منصوب کا مرجع مشرکین عرب ہے لہذا یہ بات تو بالکل قطعی ہے کہ قتال کے دین سرزمین عرب میں پورا کا پورا اللہ کے لئے ہوجائے لیکن اس قتال کا تعلق شریعت سے نہیں ہے [میزان ۲۰۱۵ ص ۵۹۵] مشرکین عرب پر اللہ کا عذاب اتمام حجت کے بعد (جس کے پانچ مراحل قانون دعوت میں بیان ہوئے) نازل ہوا۔ منکرین حق کے خلاف جنگ اور خرمہ عائد کرنے کا حق اب ہمیشہ کے لئے ختم ہوگیا ہے قیامت تک کوئی شخص نہ اب دنیا کی کسی قوم پر اس مقصد سے حملہ کر سکتا ہے نہ کسی پر خرمہ عائد کرنے کی جسارت کر سکتا ہے [میزان ۲۰۱۵ ص ۵۹۹]

ان کی تحقیق یہ ہے کہ دنیا سے فتنہ یعنی مذہبی ظلم Persecution یعنی ظلم و جبر کے ساتھ مذہب سے برگشتہ کرنے کی روایت کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ میزان میں لکھتے ہیں مذہب سے بالجبر برگشتہ کرنا فتنہ ہے مگر فتنہ کی یہ روایت اب بڑی حد تک دنیا سے ختم ہوگئی ہے [میزان ۲۰۱۵ ص ۵۹۳]۔ (لہذا اگر کبھی جہاد ہوگا تو صرف اس فتنے کو روکنے کے لیے ____ اس لیے رسول اللہ کے سوا کسی کو قتال غلبہ کی اجازت نہیں صرف فتنے کے خلاف جہاد کے لئے قرآن کا یہ حکم قیامت تک کے لیے باقی ہے۔

دوسرے معنوں میں رسالت مآبؐ کے دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد غلبہ دین کے لیے جہاد ہمیشہ کے لیے ختم ہوگیا تھا لہذا صحابہؓ نے قیصر و کسریٰ کے خلاف جو جہاد کیا وہ جہاد نہیں تھا کیوں کہ قیصر و کسریٰ کے عوام فتنہ میں مبتلا نہیں تھے یعنی انھیں جبراً مسلمان ہونے سے نہیں روکا گیا تھا نہ قیصر و کسریٰ مسلمانوں کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کر رہے تھے نہ وہ مسلمانوں پر حملہ آور تھے اس کے باوجود صحابہؓ نے قرآن کی خلاف ورزی کی اور غامدی صاحب کے پانچ مراحل انذار، انذار عام، اتمام حجت، ہجرت و برات کے بغیر ہی جزا اور سزا ان پر مسلط کر دی۔

غامدی صاحب کے اسی اصول عقلی کی بنیاد پر اس امت نے دنیا میں عہد رسالت مآب ﷺ سے لے کر آج تک غلبے کے لیے جو جہاد کیے وہ دہشت گردی تھی، قرآن کی خلاف ورزی تھی۔ غامدی صاحب لکھتے ہیں مسلمان دین کے غلبے کے لیے نہ خود کوئی اقدام کر سکتے اور نہ ہی دنیا کی قوموں پر اس مقصد کے لیے حملہ آور ہو سکتے یہ حق قرآن نے نہیں دیا [مقامات ۲۰۱۴ ص ۱۹۵] غامدی صاحب کے فلسفے کے تحت دنیا سے فتنہ کے خاتمے کے بعد اب قیامت تک جہاد کا امکان بھی نہیں ہے کیوں کہ مذہب بدلنے کے لیے جبر کوئی نہیں کر رہا حالانکہ یہ دعویٰ بھی محض ایک خوبصورت افسانہ ہے۔ یو این او تو کسی مذہب کو الحق کے طور پر تسلیم ہی نہیں کرتا اور ہر ملک کے مذہب کی اقدار کو منشور انسانی حقوق سے ہم آہنگ کرنے کے لئے اس پر معاشی پابندیاں عائد کرتا اور عسکری حملے بھی کرتا ہے۔ یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس [UCHR] اپنے کئی فیصلوں میں تحریر کر چکا ہے کہ کسی بھی مذہب کے صرف اتنے حصے پر یورپ میں عمل کی آزادی ہے جو منشور انسانی حقوق کی روح اور جوہر سے ہم آہنگ ہو یہی بات اس صدی کے سب سے بڑے زندہ فلسفی یرگن ہابر ماس نے اپنے مقالے What is Meant by a post secular society ? A Discussion on Islam in Europe. میں فلسفیانہ استدلال کے ساتھ بیان کی ہے یہ مضمون ان کی کتاب Europe The flatering project میں شامل ہے۔ غامدی صاحب اور ان کے حلقے کے مفکرین کو معلوم ہی نہیں کہ انسانی حقوق کے منشور کے تحت کسی کو اپنے مذہب پر عمل کی کامل آزادی دنیا کے کسی ملک میں میسر نہیں کیا یہ مذہبی جبر نہیں ہے کیا یہ فتنہ نہیں ہے غامدی صاحب کو یہ معلوم ہی نہیں کہ مغرب میں منشور انسانی حقوق کے تحت صرف مذہب کے اتنے حصے پر عمل کی آزادی ہے جو اس منشور کی شقوں شرائط اور طے شدہ حدود کے مطابق ہو مذہب کا وہ حصہ جو منشور انسانی حقوق سے متصادم ہے اس پر ان کو کسی حال میں عمل کی آزادی نہیں ہے حیرت ہے کہ مغرب مذہبی جبر کرے تو غامدی صاحب اسے آزادی کہتے ہیں اسلام جبر کرے تو غامدی صاحب اور ان کا حلقہ اسے فتنہ قرار دیتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے مگر مسلمان فطرت پر عمل نہ کریں

''مقامات'' میں وہ لکھتے ہیں اسلام کا ہدف یہ حکومت نہیں [مقامات ص ۱۸۲] دین دنیا میں دعوت دینے کے لیے آیا ہے دنیا میں اپنے ماننے والوں

کی حکومت قائم کرنے کے لیےنہیں آیا[غامدی ،مقامات ۲۰۱۴ص ۱۸۲] اسلام کا اصل مخاطب فرد ہے وہ اس کے دل و دماغ پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے اسلام کا ہدف یہ حکومت نہیں ہے[مقامات ،۲۰۱۴ء ص ۱۸۲] اسلام کا اصل مخاطب صرف فرد ہے وہ اس کے دل و دماغ پر اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے چنانچہ اسی کو پابند کرتا ہے کہ وہ اپنے وجود پر اللہ کی حاکمیت کو تسلیم کرے[مقامات ۲۰۱۴ص ۱۸۱] دوسرے معنوں میں دین کا خطاب صرف انفرادیت سے اجتماعیت اور اداروں سے نہیں ہے اسلام اجتماعیت کی تعمیر نہیں کرتا۔

وہ فطرت کو دین کا ماخذ تسلیم کرتے ہیں[میزان ۲۰۱۵ء ص ۴۵] معروف و منکر، خیر و شر، نیکی و بدی کا علم فطرت سے ہوتا ہے۔ یہ علم من جملہ الہامات نفس ہے[مقامات ۲۰۱۴ص ۱۲۹] لہٰذا میزان کے قانون سیاست میں وہ لکھتے ہیں کہ انسان کو اللہ نے جس فطرت پر پیدا کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ بھی ہے کہ وہ تمدن کو چاہتا ہے اور اپنے اندر ایک نظم اجتماعی پیدا کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ فطرت کا مطالبہ اور عقل کا تقاضا یہ ہے کہ انسان ایک نظم اجتماعی (ریاست رپولیٹیکل آرڈر) پیدا کرے (کیوں کہ) اس دنیا میں حکومت کے بغیر کسی معاشرے اور تمدن کا خواب نہیں دیکھا جا سکتا۔ انسان کی فطرت نے اسے بالعموم یہی راہ (نظم اجتماعی ،سیاست ،ریاست ،حکومت) دکھائی ہے اور اسی راستے پر جدوجہد کے لیے آمادہ کیا ہے[میزان ۲۰۱۵ص ۴۸۱] مقامات میں لکھتے ہیں انسان کی فطرت میں ہے کہ وہ حکومت قائم کر کے زندگی بسر کرتا ہے[غامدی، مقامات ،۲۰۱۴ء ص ۱۷۹]۔ انسان جب بھی کوئی معاشرت پیدا کرتا ہے تو اس میں حق و انصاف کے لئے لازماً کوئی نظام قائم کرتا ہے اس کا قانون عدالتیں ادارے سے سب اسی حقیقت کی گواہ ہیں[مقامات ۲۰۱۴ص ۱۲۰]

اس فلسفۂ سیاست کے باوجود ان کی نظر میں صرف مسلمانوں کے لیے ریاست کا قیام نہ فطرت کا مطالبہ ہے نہ دین کا تقاضا۔ سوال یہ ہے کہ جب اسلام دین فطرت ہے اور فطرت کے الہامات عین الحق ہیں تو مسلمانوں کے لیے اس فطرت کے مطالبے پر عمل کرنا اور حکومت قائم کرنا کیوں غیر فطری ہے۔

امت مسلمہ کا غلبہ صرف تکوینی طور پر ہوگا

غامدی صاحب اس امت کے غلبے کے قائل ہیں مگر اس غلبے کے لیے کسی کوشش، جدوجہد اور جہاد کو حرام سمجھتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اللہ نے مسلمانوں سے غلبے کا وعدہ ضرور کیا مگر یہ غلبہ اللہ تعالیٰ خود قائم کریں گے اس کے لیے مسلمانوں کو کبھی کسی جدوجہد کی ضرورت نہیں۔ غامدی صاحب کے مطابق اسلامی حکومت کا قیام کسی کوشش اور جدوجہد سے نہیں ہوتا وہ لکھتے ہیں کفار پر غلبے کا وعدہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں کے ساتھ ہے (غلبے کے) اس وعدے کا ظہور تکوینی طور پر ہوتا ہے اور اس کے اسباب بھی اسی طریقے سے پیدا کیے جاتے ہیں (بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل) ان کا کام صرف یہ ہے کہ وہ اللہ کے تمام حکموں پر عمل کریں۔ (مقامات ،۲۰۱۴ء ص ۱۹۴، ۱۹۵)۔

ریاست کے بغیر غلبہ دین ناممکن ہے

غامدی صاحب اس دنیا میں اللہ کے دین کے غلبے کو درست سمجھتے ہیں مگر غلبہ دین کے لئے کسی جدوجہد، کوشش، جہاد، تحریک کے بجائے ہر فرد کو دین پر عامل ہونے کی تلقین کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ اس دنیا میں اللہ کے دین کے لئے غلبہ کے وعدے کا ظہور کسی جدوجہد کوشش اور جہاد سے نہیں۔ صرف اور صرف تکوینی طور پر ہوتا ہے اور اس کے اسباب بھی اسی طریقے سے پیدا کیے جاتے ہیں۔ اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے صرف اور صرف ایک شرط عائد کی ہے کہ مسلمان صرف خدا کے سب حکموں پر عمل کریں[مقامات ۲۰۱۴ص ۱۹۵] ظاہر ہے ریاست کے بغیر خدا کے سب حکموں پر عمل کبھی ممکن ہی نہیں کیوں کہ ''مو کول علی السلطان'' کا دائرۂ ریاست کے بغیر کبھی قابل عمل نہیں ہو سکتا۔ زکوٰۃ، جہاد، حدود و تعزیرات، امر بالمعروف نہی عن المنکر کے لیے ریاست لازم ہے چونکہ مسلمان غامدی صاحب کی شرط کے مطابق خدا کے سب حکموں پر ریاست کے بغیر کبھی عمل نہیں کر سکیں گے لہٰذا قرآن کے مطابق ان کا غلبہ تکوینی طور پر بھی کبھی ممکن نہیں اور غلبے کے لئے جہاد غامدی صاحب کے دین میں وجود ہی نہیں رکھتا۔ لہٰذا مسلمانوں کو اب دنیا میں قیامت تک اقتدار نہ جہاد سے مل سکتا ہے نہ تکوینی طریقے سے۔ دوسرے معنوں میں غامدی صاحب کے فلسفہ غلبہ دین کے تحت بھی اس دنیا میں مسلمانوں کو ریاست قائم کرنی ہو گی تاکہ وہ اللہ کے ان احکامات پر بھی

عمل کرسکیں جن پر ریاست کے بغیر عمل ممکن نہیں۔

سرسید غیر ہندی کو ہند میں جہاد کی اجازت دیتے ہیں

غامدی صاحب سے بہتر تو سرسید احمد خان تھے جو صرف انگریزوں کے خلاف ہندوستانی مسلمانوں کو جہاد کی اجازت نہیں دیتے تھے مگر ان مسلمانوں کو انگریز کے خلاف جہاد کی اجازت دیتے تھے جو ہندوستان میں رہتے تو ہیں مگر ہندوستان کے شہری نہیں ہیں وہ انگریزی استبداد اور استعمار کے اتنے حامی نہیں تھے جتنے غامدی صاحب ہیں ''تفسیر القرآن'' میں وہ جہاد کے امکانات، اجازت کے بارے میں صاف صاف لکھتے ہیں: اسلام فساد اور دغا اور غدر و بغاوت کی اجازت نہیں دیتا ——— جس نے اُن کو امن دیا ہو مسلمان ہو یا کافر، اس کی اطاعت اور احسان مندی کی ہدایت کرتا ہے ——— کافروں کے ساتھ جو عہد و اقرار ہوئے ہوں ان کو نہایت ایمان داری سے پورا کرنے کی تاکید کرتا ہے ——— خود کسی پر ملک گیری اور فتوحات حاصل کرنے کو فوج کشی اور خون ریزی کی اجازت نہیں دیتا ——— کسی قوم یا ملک کو اس غرض سے کہ اس میں بالجبر اسلام پھیلا دیا جاوے حملہ کر کے مغلوب و مجبور کرنا پسند نہیں کرتا، یہاں تک کہ کسی ایک شخص کو بھی اسلام قبول کرنے پر مجبور کرنا نہیں چاہتا ——— صرف دو صورتوں میں اس نے تلوار پکڑنے کی اجازت دی ہے ——— ایک اس حالت میں جب کہ کافر اسلام کی عداوت سے اور اسلام کے معدوم کرنے کی غرض سے نہ کسی ملکی اغراض سے، مسلمانوں پر حملہ آور ہوں، کیوں کہ ملکی اغراض سے جو لڑائیاں واقع ہوں، خواہ مسلمان مسلمانوں میں خواہ مسلمان و کافروں میں، وہ دنیاوی بات ہے مذہب سے کچھ تعلق نہیں ہے ——— دوسرے جب کہ اس ملک یا قوم میں مسلمانوں کو اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں ان کی جان و مال کو امن نہ ملے اور فرائض مذہبی کے ادا کرنے کی اجازت نہ ہو ——— مگر اس حالت میں بھی اسلام نے کیا عمدہ طریقہ ایمان داری کا بتایا ہے کہ جو لوگ اس ملک میں جہاں بطور رعیت کے رہتے ہوں، یا امن کا علانیہ یا ضمناً اقرار کیا ہو اور گو صرف بوجہ اسلام ان پر ظلم ہوتا ہو تو بھی ان کو تلوار پکڑنے کی اجازت نہیں دی۔ یا اس ظلم کو سہیں یا ہجرت کریں، یعنی اس ملک کو چھوڑ کر چلے جاویں۔ ہاں جو لوگ خود مختار ہیں اور اس ملک میں امن لیے ہوئے بطور رعیت کے نہیں ہیں، بلکہ دوسرے ملک کے باشندے ہیں، ان کو ان مظلوم مسلمانوں کے بچانے کو جن پر صرف اسلام کی وجہ سے ظلم ہوتا ہے، یا ان کے لیے امن اور ان کے لیے ادائے فرائض مذہبی کی آزادی حاصل کرنے تلوار کو پکڑنے کی اجازت دی ہے ——— لیکن جس وقت کوئی ملکی یا دنیوی غرض اس لڑائی کا باعث ہو اس کو مذہب اسلام کی طرف نسبت کرنے کی کسی طرح اسلام اجازت نہیں دیتا۔ [سرسید احمد خان، تفسیر القرآن، جلد اول، ص ۲۳۹، انسٹی ٹیوٹ پریس علی گڑھ، ۱۸۸۰ء]

مجھے حیرت ہے کہ شیخ الحدیث حضرت مفتی زاہد صاحب فیصل آباد، شہباز منج صاحب، اور میرے بہت ہی محترم بھائی عمار ناصر خان غامدی صاحب سے اتنے متاثر کیوں ہیں اب ان کا صرف ایک اجتہاد زکوٰۃ لیجیے جو ان کی فہرست اجتہادات میں سب سے کم زور غیر علمی بغیر کسی حوالے کے ایک نامعقول اجتہاد ہے اس اجتہاد کے حق میں غامدی صاحب اور ان کا پورا حلقہ آج تک سلف سے لے کر خلف تک متقدمین سے متاخرین تک ایک حوالہ بھی پیش نہیں کر سکا صرف غامدی صاحب کی اتباع میں زکوٰۃ کی شرح پانچ دس بیس فی صد اور ہر ماہ تنخواہ پر زکوٰۃ وصول کرنے کی گردان دہرائی جا رہی ہے ——— زکوٰۃ کے اجتہاد پر غامدی صاحب کے سب سے بہترین قابل شاگرد رشید رینے ساں کے سابق مدیر اور غامدی صاحب کے ادارے المورد کے سابق سربراہ اور سہ ماہی جی کے مدیر جناب نادر عقیل انصاری صاحب نے جو تنقید کی ہے وہ ان کے اجتہاد کی علمیت اور تاریخیت کی حقیقت کھولنے کے لیے کافی تھی مگر غامدی صاحب کے حلقے کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا ——— جی کے مضمون پر بالکل اسی طرح خاموشی اختیار کر لی گئی جس طرح ساحل کے پانچ شماروں کے

بارے میں چپ سادھ لی گئی —— غامدی صاحب کی حکمت عملی یہ ہے کہ فیس بک پر صرف اور صرف مسلمہ اسلامی علمیت کے خلاف بحث و مباحثے برپا کرتے رہو تا کہ اسلامی علمیت مشکوک ہوتی جائے اسلام کے ہر طے شدہ مسئلے پر بحث کے دروازے کھلے رہیں تا کہ دین پر کوئی عمل نہ کرے لیکن جب غامدی صاحب کی علمیت زیر بحث آئے تو فوراً بحث کا رخ موڑ دو لہٰذا آج تک فیس بک پر غامدی صاحب کے حلقے کی جانب سے غامدی صاحب کے افکار و نظریات پر کبھی اس طرح مسلسل مستقل اصولی مباحث نہیں ہوئے جس طرح اسلام کے خلاف ہوتے رہتے ہیں۔

غامدی صاحب کا تصور زکوٰۃ اور اس کے اصول باہم متضاد [Oxymoron] ہیں وہ جو تصور زکوٰۃ، شرح زکوٰۃ، مصارف زکوٰۃ، اور وصولی زکوٰۃ کا جو طریقہ پیش کرر ہے ہیں پوری اسلامی تاریخ میں آج تک اس طریقہ کار شرح اور نصاب پر امت کے کسی ایک فرد ایک فرقے ایک مکتب نے بھی عمل کیا۔ غامدی صاحب کی شرح زکوٰۃ یہ ہے اگر آپ ماہانہ تنخواہ لیتے ہیں تو ہر ماہ پانچ فی صد کی شرح زکوٰۃ ادا کریں گے۔ اگر آپ کاروبار کرتے ہیں اور روزانہ کی بنیاد پر حساب کتاب ہوتا ہے تو کام کے اختتام پر اس دن کی آمدنی پر پانچ فی صد کی شرح سے اگر کاروبار کا حساب کتاب سہ ماہی ہوتا ہے تو سہ ماہی بنیاد پر زکوٰۃ ادا ہوگی اگر کاروبار مال کے ذریعے مال کمانے والا ہے تو روزانہ یا ماہانہ بنیاد پر دس فی صد زکوٰۃ ادا کی جائے گی ظاہر ہے کہ زکوٰۃ کی یہ شرح امت کی تاریخ میں کسی عہد میں نافذ نہیں ہوئی غامدی صاحب تمام زکوٰۃ حکومت کو دینے کے قائل ہیں اموال ظاہرہ اور اموال باطنہ دونوں کی زکوٰۃ ریاست لے گی یہ بھی ان کا تخلیقی تخیل ہے جسے تفرد بھی نہیں کہا جاسکتا۔ غامدی صاحب کا یہ نصاب زکوٰۃ انہوں نے کراچی میں ''میزان'' سے متعلق پہلے محاضرات میں دانش سرا بہادر آباد میں پیش کیا یہ محاضرات ۱۹ مارچ تا ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ء دانش سرا بہادر آباد کراچی میں ہوئے ان محاضرات کی ریکارڈنگ ڈاکٹر طارق سجاد سابق صدر دانش سرا پاکستان کے پاس محفوظ ہے اس ایک ہفتے میں راقم کو روزانہ غامدی صاحب کے ساتھ شکیل الرحمان صاحب کی قیام گاہ پر تبادلہ خیالات کا طویل موقع بھی ملا اور گفتگو بحث مباحثے کا یہ سلسلہ چار پانچ سال تک جاری رہا اس کی تفصیلات عنقریب ایک الگ مضمون میں پیش کی جائیں گی جس میں غامدی صاحب کے وہ اجتہادات بھی پیش کئے جائیں گے جن پر وہ تحقیق کرر ہے تھے کچھ گفتی کچھ ناگفتنی

واضح رہے کہ غامدی صاحب کی زکوٰۃ کی شرح پانچ فی صد، دس فی صد، بیس فی صد کی شرح منظور الحسن صاحب نے بھی اشراق میں ایک مضمون میں تحریر کی ہے۔

غامدی صاحب نے میزان کے اصول و مبادی میں لکھا ہے کہ سنت صحابہ کے اجماع اور امت عملی تواتر سے ثابت ہے۔ لہٰذا جب زکوٰۃ اجماع اور امت کے عمل تواتر سے ثابت ہے تو اس کا نصاب اور اس کی شرح بھی تو اجماع اور عملی تواتر سے منتقل ہوئی ہوگی لہٰذا جو شرح غامدی صاحب نے مقرر کی ہے وہ اجماع اور تواتر امت سے امت تک منتقل ہونا چاہیے اور اس کا ثبوت خیر القرون، تابعین، تبع تابعین سے لے کر تمام اسلامی امارتوں خلافتوں میں ملنا چاہیے مگر اس شرح کا وجود پوری اسلامی تاریخ میں کہیں نہیں ملتا —— اس قدر بڑا دعویٰ جو کسی دلیل حوالے کے بغیر ہے غامدی صاحب کے حلقے میں جو تخلیقی اجتہاد کا قائل ہے کیسے قبول کرلیا گیا میزان کا باب قانون معیشت اور قانون عبادات دیکھ لیجیے زکوٰۃ کی بحث میں ایک کتاب کا حوالہ بھی نہیں دیا گیا یہ کس قسم کا علم ہے غامدی صاحب یہاں سرسید کے کامل مقلد

نظر آتے ہیں سرسید کے بارے میں حالی نے حیات جاوید میں جو تحقیق پیش کی ہے وہ غامدی صاحب پر حرف بہ حرف پوری اترتی ہے وہ لکھتے ہیں: سرسید نے جس قدر اختلافات مذہبی مسائل میں علمای سلف سے کیے ہیں —— سرسید کے تمام اختلافات کا اصل مقصد اسلام کی طرف سے معترضین کے اعتراضات یا متشککین کے شبہات کا رفع کرنا تھا —— دوسرے جن لوگوں نے سرسید کی طرز تصنیف کو بنظر غور دیکھا ہے وہ اس بات پر بخوبی واقف ہیں کہ وہ جب تک کسی مسئلہ کی نسبت خود اپنی کوئی رائے قائم نہ کر لیتے تھے اس وقت تک کتابوں کی طرف بہت ہی کم رجوع کرتے تھے۔ پھر اگر کسی مصنف کا قول ان کے موافق آتا تھا تو اس کو بھی اپنی رائے کی تائید کے لیے لکھ دیتے تھے ورنہ صرف اپنی رائے لکھ دینے پر اکتفا کرتے تھے۔ اکثر ایسا ہی ہوا ہے کہ جب ان کی تحریر چھپ کر شایع ہو چکی اس وقت حسن اتفاق سے کسی محقق کا قول سرسید کی رائے کا مؤید ان کے کسی دوست کو معلوم ہوا اور اس نے یا تو سرسید کو اس سے مطلع کر دیا اور یا بذریعہ تحریر کے کسی میگزین یا اخبار میں چھپوا دیا۔ اصل یہ ہے کہ سرسید کو مذہبی تحریرات میں جس قدر اپنے دماغ سے کام لینا پڑتا تھا اس قدر دوسرے مصنفوں کی کتابوں سے مدد ملنے کی ان کو توقع نہ تھی اور اس لیے وہ خود کتابوں کی طرف بہت کم رجوع کرتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی تصنیفات میں کتابوں کے حوالے جتنے کہ ہونے چاہیے تھے ان سے بہت کم ملتے ہیں اور جس قدر ملے ہیں ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو ان کے لیے اور لوگوں نے تلاش کر کے بہم پہنچائے ہیں۔ اس کے سوا بہت سے مقامات ان کی تصنیفات میں ایسے موجود ہیں جن میں اگرچہ انھوں نے سلف کے اقوال سے اپنی رائے پر استشہاد کیا ہے مگر ان اقوال کے مجمل اور غیر شافی بیان کو سرسید کے مدلل اور شافی بیان کے مقابلہ میں دیکھا جاتا ہے تو دونوں میں اس قدر فرق معلوم ہوتا ہے کہ مشکل سے ان اقوال کو سرسید کی رائے کا ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے باوجود ان سب باتوں کے ہم بے شمار تحقیقاتیں سرسید کی مذہبی تصنیفات میں ایسی اچھوتی پاتی ہیں جن کو بظاہر اس چودھویں صدی کے محقق سے پہلے کسی کے قلم نے مس نہیں کیا اور بہت سے ایسے ارجنل خیالات اور ارجنل رائیں دیکھتے ہیں جن کو اس کی اولیات کے ساتھ تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ اس نے سب سے پہلے مذہب کی سچائی کا یہ معیار قرار دیا کہ اس کی تعلیم میں کوئی بات فطرت انسانی یا فطرۃ اللہ کے خلاف نہ ہو اور اسی نے سب سے پہلے اس بات کا دعویٰ کیا کہ اس معیار پر جیسا کہ اسلام پورا اترتا ہے دنیا کا کوئی مذہب ایسا پورا نہیں اترتا۔ [حالی حیات جاوید، لاہور، ہجرہ انٹرنیشنل پبلشرز بار اول ۱۹۸۴ء دوسری جلد ص ۳۵۹، ۳۶۰]

غامدی صاحب نے میـــزان لکھنے سے پہلے اس کے کئی ابواب ڈاکٹر محمد فاروق کی کتاب اسلام کیا ہے؟ میں سوال و جواب کی صورت میں شائع کئے آپ دونوں کتابوں کا تقابلی مطالعہ کر لیجیے ڈاکٹر فاروق کی کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۹۱ء میں آیا تھا۔ اس پر آنے والی تنقید کا بغور جائزہ لیا گیا اور تنقید کی روشنی میں غامدی صاحب اپنے موقف کو تبدیل کرتے رہے۔ **اسلام کیا ھے** اور میزان کا تقابلی مطالعہ کر لیجیے جو کچھ **میزان** میں لکھا گیا وہی کچھ **اسلام کیا ھے** میں تحریر ہے حتی کہ انداز الفاظ دلائل، جملے، فقرے، اسلوب تک وہی ہے۔

۱۹۹۸ء میں میـــزان کا خاکہ مکمل ہو گیا اور اس کا مسودہ بھی بڑی حد تک کتابت ہو گیا تو انھوں نے میـــزان پر کراچی میں پہلے محاضرات رکھے یہ ۱۹ مارچ سے ۲۸ مارچ ۱۹۹۸ء تک دانش سرا بہادر آباد کراچی میں جاری رہے۔ عالم گیر مسجد کے قریب سنو وائٹ ڈرائی

کلیفٹن والے جناب شکیل الرحمان کی بہادر آباد میں قیام گاہ پر غامدی صاحب کا قیام تھا راقم بھی ان کے گھر کے قریب امیر خسرو روڈ پر رہتا تھا شکیل الرحمان صاحب سے بہت دوستی تھی لہٰذا روزانہ غامدی صاحب سے تبادلہ خیالات ملاقات کا سلسلہ جاری رہا —— ان محاضرات کی دو قسطیں راقم نے ساحل مارچ ۱۹۹۸ء اور مئی ۱۹۹۸ء میں شائع کیں محاضرات کی مکمل ریکارڈنگ ڈاکٹر طارق سجاد صدر دانش سرا کراچی اور دانش سرا پاکستان کے پاس محفوظ ہے۔ سنت اور زکوٰۃ کے مسئلے پر غامدی صاحب سے براہ راست گفتگو ہوئی لیکن موصوف کوئی مناسب تسلی بخش جواب نہیں دے سکے لہٰذا راقم نے دو قسطوں کے بعد ان محاضرات کی ساحل میں اشاعت روک دی۔

سنت کے بارے میں انھوں نے محاضرات میں فرمایا کہ ''قرآن کے بارے میں معلوم ہوگیا کہ یہ ۶۶۶۶ آیات کا مجموعہ ہے سنت کی تعریف کو نظر میں رکھ کر جب ہم امت کے علمی ذخیرے کا جائزہ لیتے ہیں تو جیسے قرآن بالکل محکم طریقے سے مل جاتا ہے ویسے ہی سنت بھی محکم طور پر مل جاتی ہے یعنی سنت کی فہرست لکھوائی جاسکتی ہے کہ یہ سنت ہے اس فہرست میں صرف چالیس سنتیں شامل ہیں جن پر صحابہ کا اجماع عملی ہے سنت کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے بشرطیکہ آپ یہ مان لیں کہ سنت وہ ہے جسے رسول اللہ نے دین کی حیثیت سے جاری کیا اور اس پر پوری امت کا اجماع ہوگیا سنت میں اختلاف کیسے ہوجائے گا جیسے ہی اختلاف ہوجائے گا وہ چیز سنت ثابت نہیں ہوگی اجماع اس کی لازمی شرط ہے۔ جیسے قرآن میں کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا سنت میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہوسکتا [ساحل مئی ۱۹۹۸ء ص ۵۸، ۵۹]

۱۹۹۸ء میں سنت قرآن کی طرح محکم تھی جس طرح قرآن ۶۶۶۶ آیتوں کی صورت میں بغیر کسی اختلاف کے اجماع امت سے منتقل ہوا اسی طرح سنتیں بھی اجماع امت سے منتقل ہورہی ہیں اور اجماع سے ثابت شدہ سنتیں صرف چالیس تھیں —— سنتیں اور ان کی تعداد غامدی صاحب کے دعوے کے مطابق قرآن کی آیات کی طرح قطعی حتمی ناقابل تغیر تھیں اس کے بعد میزان ۲۰۰۰ء میں آئی تو تعداد بدل گئی پھر مکمل میزان ۲۰۰۲ میں آئی تو اس میں سنتوں کی تعداد بدل گئی ۲۰۱۴ء میں مقامات میں انہوں نے ایک نیا رخ اختیار کیا کہ سنتوں کی تعداد میں وقتاً فوقتاً کمی بیشی کرتا رہا ہوں میں نے کبھی اس امکان کو رد نہیں کیا [مقامات طبع سوم ۲۰۱۴ء ص ۱۵۱] اس سال ۲۰۱۶ء رمضان میں ایک TV چینل پر ایک اینکر نے سنت سے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ میں نے سنتوں کو ۲۷ عنوانات کے تحت پیش کیا ہے یہ نہیں کہا کہ سنتیں صرف سینتیس ہیں ان عنوانات کے تحت سنتوں کی تعداد ہزاروں ہوسکتی ہے حالانکہ میزان میں غامدی صاحب کا موقف یہ ہے کہ سنت قرآن کی طرح امت کے اجماع اور تواتر سے ثابت ہے یہ کیسا اجماع اور تواتر ہے کہ ہر دو سال چار سال کے بعد بدل جاتا ہے سنت اگر سنت نہیں تو وہ لازماً بدعت ہوگی۔ امت غامدی صاحب کی تحقیق کے مطابق بدعت پر عمل کرتی رہی جب کہ بدعت حرام ہے تو امت کو حرام میں مبتلا کرنے کا فریضہ کس نے انجام دیا غامدی صاحب نے مقامات میں لکھا ہے کہ کل نو چیزیں حرام ہیں ان میں بدعت بھی ہے [مقامات طبع سوم ۲۰۱۴ء ص ۲۱۱] میزان کی ہر نئی اشاعت میں سنت کی تعداد کم ہورہی ہے ۲۰۱۵ء کی اشاعت میں سنتیں مزید کم ہوگئیں —— اگر سنت قرآن کی طرح ماخذ ہے تو ماخذ کیسے تبدیل ہورہا ہے۔ جو متغیر ہے اور مطلق نہیں وہ ماخذ کیسے ہوسکتا ہے؟ یہ ہے بنیادی سوال۔ دوسرے معنوں میں ماخذ صرف قرآن ہے جو مطلق ہے اور سنت ماخذ دین نہیں کہ وہ تغیر کی زد میں ہے جو خود متغیر ہے وہ ماخذ شریعت نہیں ہوسکتی۔

ہمارے عزیز مخلص و ہونہار دوست اور غامدی صاحب کے داماد حسن الیاس جو مولانا یوسف بنوری کے پڑنواسے اور مولانا طاسین داماد یوسف بنوری صاحب کے نواسے ہیں اپنے نکاح سے ایک ہفتہ قبل راقم سے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ ملاقات کے لیے چوبیس جون ۲۰۱۴ء کو تشریف لائے اور نکاح کی اطلاع دی اور دعوت بھی تو اس وقت بھی راقم نے ان سے یہی عرض کیا تھا کہ غامدی صاحب سے کہیے کہ وہ سنت کی تعریف میزان میں تبدیل کر دیں اور لکھ دیں کہ سنت قرآن کی طرح اجماع اور تواتر عملی سے ثابت نہیں قرآن کی آیات کی طرح سنتوں کی تعداد متعین اور مطلق نہیں لہٰذا اصلاً دین کا صرف ایک ہی ماخذ ہے قرآن مجید کیوں کہ وہی مطلق ہے سنت تو متغیر ہے اور ماخذ کبھی متغیر نہیں ہوسکتا انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ غامدی صاحب تک یہ تجویز پہنچا دیں گے اور میزان میں تصحیح بھی کرا دیں گے لیکن یہ وعدہ ابھی تک پورا نہیں ہوا ممکن ہے وہ بھول گئے ہوں اس ملاقات میں حسن الیاس صاحب نے عجیب بات کہی فرمایا کہ میں نے غامدی صاحب سے ایک دن پوچھا کہ اگر آپ کے دین کی غلطی آپ پر کوئی واضح کر دے تو آپ کا کیا ردعمل ہوگا؟ غامدی صاحب نے نہایت اطمینان اور سکون سے کہا مجھے اپنے دین سے رجوع کرنے میں ایک لمحے کا تامل نہ ہوگا میں اسی لمحے سب کچھ ترک کر دوں گا پھر استفہامیہ انداز سے پوچھنے لگے خالد جامعی صاحب دنیا میں کوئی عالم ایسا ہے جو غامدی صاحب کی طرح یہ بات کہہ سکے یہی وہ عظمت ہے جس نے غامدی صاحب کے لیے میرے دل میں محبت پیدا کر دی ہے ان کو اپنے علم پر غرور نہیں وہ بڑے وسیع القلب فرد ہیں راقم نے عرض کیا کہ علماء اس دین پر ایمان و یقین رکھتے ہیں جو نقل سے اور اجماع سے ملا ہے یہ دین ناقابل تغیر ہے مطلق ہے اس میں اصلاح غلطی کا امکان ہی نہیں کیوں کہ اس کے اصول ناقابل تغیر ہیں غامدی صاحب کا دین صرف اور صرف عقل سے ملا ہے جو محض تحقیقی پروجیکٹ ہے جو عقل ہر لمحہ ہر آن تغیر پذیر ہے لہٰذا غامدی صاحب کو اپنے دین پر خود یقین نہیں ہے اس لئے وہ رجوع پر تیار ہیں دین الحق ہوتا ہے نقش بر آب نہیں ہوتا۔

جس دین پر دین پیش کرنے والے کو خود یقین نہ ہو جو دین اصلاح کے ذریعے مسلسل و مستقل اپنی صورت گری کر رہا ہو جو مسلسل تحقیق سے تخلیق ہو رہا ہو یعنی ہمیشہ ارتقائی مراحل مدارج طے کر رہا ہو وہ دین نہیں تحقیقی پروجیکٹ Research Project ہے جو کسی بھی لمحے ختم ہوسکتا ہے۔ غامدی صاحب کے اس دعوے نے ثابت کر دیا ہے کہ غامدی صاحب کو اپنے دین پر یقین کامل حاصل نہیں اسی لیے وہ اس سے ہر لمحہ رجوع کے لیے تیار ہیں علماء کرام کو اپنے دین پر یقین کامل ہے لہٰذا وہ آپ کے عقلی دلائل سننے کے باوجود اپنے دین سے رجوع پر تیار نہیں۔ علماء کے دین میں کسی اصلاح کی ضرورت نہیں وہ حتمی قطعی ہے غامدی صاحب کا دین ۱۹۸۵ء سے مسلسل اصلاح پذیر اور ارتقاء پذیر ہے اور ابھی تک حتمی نہیں لہٰذا میزان کے خاتمہ میں لکھتے ہیں:

یہ ایک انسان کا کام ہے جو کسی طرح غلطیوں سے مبرا نہیں ہوسکتا میں بار بار اسے دیکھتا اور ترمیم و اضافہ کرتا رہا ہوں اخذ و استنباط کی کوئی غلطی اگر مجھ پر واضح ہوگئی ہے تو میں نے اس کی اصلاح کر دی ہے میں آئندہ بھی ہر وقت غلطیوں کی اصلاح کے لیے آمادہ ہوں [میزان ۲۰۱۵ء طبع دہم ص ۶۵۰] اس بیان سے ثابت ہوا کہ غامدی صاحب کا دین حجت نہیں ہے ابھی ارتقاء کے مرحلے میں ہے۔۔ ذات رسالت مآبؐ نے کفار مشرکین مکہ کے دباؤ کے بعد حضرت ابوطالب کی جانب سے بعض استفسارات کے جواب میں عجیب بات فرمائی تھی آپ نے

کہا تھا چچا جان اگر مشرکین مکہ میرے ایک ہاتھ پر چاند اور دوسرے ہاتھ پر سورج لا کر رکھ دیں تب بھی میں اپنے دین سے دستبردار نہ ہوں گا۔
چاند سورج اللہ کی مخلوق ہیں رسول اللہ۔ اللہ کے پیغمبر تھے اس کے باوجود وہ فرماتے ہیں کہ اگر کفار خدا کی ان دو عظیم مخلوقات کو بھی میرے ہاتھ پر رکھ دیں تب بھی میں قرآن کی صداقت کے دعوے سے دستبردار نہ ہوں گا دین کی قوت طاقت روحانیت یہ ہوتی ہے نہ کہ غامدی صاحب کی طرح کہ اگر کوئی ثابت کر دے تو رجوع کر لوں گا۔

ویسے بھی غامدی صاحب کے رجوع اور کذب کی داستان بہت طویل ہے اس کا آغاز ۱۹۸۵ء سے ہوتا ہے۔ جب حضرت والا نے میـــــزان حصہ اول جاوید الغامدی کے نام سے خود اپنی رہائش گاہ کے پتے سے اپنی پہلی کتاب شائع کی آج اس کتاب کا ذکر ان کی تصانیف میں نہیں ملتا حالانکہ آدمی پہلی بیوی، پہلی محبت، پہلی تنخواہ، پہلی اولاد کو کبھی نہیں بھولتا۔ یہ ان کے علمی سفر کا پہلا سنگ میل تھا اس دوران وہ اعلام کے نام سے رسالہ نکال چکے تھے اشراق کے نام سے کتابی سلسلہ شروع ہو چکا تھا حالانکہ مقامات میں لکھتے ہیں امین احسن کو ۱۹۷۳ء میں دیکھا اور پھر کسی اور طرف نہیں دیکھا [مقامات ۲۰۱۴ ص ۲۷] لیکن اسی مقامات میں لکھتے ہیں ۱۹۷۳ء میں دائرۃ الفکر قائم کیا مجلّہ اشراق چھاپا ۱۹۷۵ء میں جماعت اسلامی سے وابستہ ہوئے ادارہ معارف اسلامی کے سربراہ بنے ۱۹۷۷ء تک جماعت کے رکن رہے [مقامات ۲۰۱۴ ص ۳۵] ابھی دعویٰ تھا کہ امین احسن کی طرف دیکھا تو کسی کی طرف نہ دیکھا اب اسی دوران جماعت اسلامی کو اور ابوالاعلیٰ مودودی کو بھی دیکھ لیا بلکہ جماعت میں شامل بھی ہو گئے اور جماعت کے علمی ادارہ کے سربراہ بھی بن گئے حالانکہ اسی مـقـامـات میں دعویٰ کرتے ہیں کہ اصلاحی صاحب نے شاگردی میں جب لیا تو غامدی صاحب کے دعوے کے مطابق شاگردی کا یہ سلسلہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک جاری رہا جب تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہوا تو معتقدات کی دنیا میں اضطراب پیدا ہو چکا تھا میرے تصورات کا قصر منہدم ہو چکا تھا نئی تعمیر اب نئے بندوبست کا تقاضہ کر رہی تھی اگلے سات سال اسی بندوبست کی نذر ہو گئے ۱۹۹۰ء میں جا کر وہ زمین ہموار ہوئی جہاں نئی تعمیر کے لیے نیو ڈالی جائے [مقامات ۲۰۱۴ ص ۲۷، ۲۸، ۲۹] لیکن اسی مقامات میں درج ہے کہ انہوں نے اسی اضطراب کے عالم میں رسالہ اشراق جاری کر دیا تھا جب تحقیق جاری تھی تو اس حالت اضطراب میں رسالہ نکالنے کا کیا جواز تھا؟ لکھتے ہیں ۱۹۸۰ء میں اشراق نکالا ۱۹۸۳ء میں المورد وجود میں آ گیا ۱۹۸۵ء میں اشراق کا احیاء ہو گیا [مقامات طبع سوم ۲۰۱۴ ص ۱۴۱ سے ۱۴۳] ۱۹۸۳ء سے ۱۹۹۰ء تک وہ شک و شبہات کے دلدل میں تھے مگر اس دلدل میں یہ سارے کام ہو رہے تھے مگر کیسے؟ یہ تمام افکار، دعوے، خیالات Oxymoron ہیں۔

۱۹۷۳ء میں اصلاحی صاحب نے شاگردی میں لیا تو ہدایت کی کہ لیڈری کے خیالات ذہن سے نکال کر علم نظر فکر و تدبر کے لیے گوشہ گیر ہونا پڑے گا فرمایا اس زمانے میں پڑھے کم لکھے زیادہ لوگ ہیں قلم اس وقت اٹھائیے جب کوئی نئی حقیقت سامنے آئے چنانچہ طالب علمی کے اس دور میں لکھنے کی ہمت کم ہی ہوئی ۱۹۸۳ء میں تعلیم کا یہ مرحلہ ختم ہو گیا اگلے سات برس ۱۹۹۰ء تک غور و فکر میں بسر ہو گئے [مقامات ۲۰۱۴ ص ۲۷، ۲۸]

اصلاحی صاحب کی ہدایت کے باوجود غامدی صاحب گوشہ گیر نہ ہوئے قلم اٹھا کر لکھتے بھی رہے اشراق بھی نکالتے رہے جماعت

اسلامی میں بھی شامل رہے بلکہ اسی طالب علمی کے عرصے میں استاد بھی بن گئے اور میـــــزان حصہ اول کے نام سے کتاب بھی ۱۹۸۵ء میں شائع کردی جس کی نئی صورت میزان طبع اول ۲۰۰۸ء ہے ـــــ طالب علمی کے عرصے میں انھوں نے ایک اکیڈیمی بھی قائم کردی طلباء بھی جمع کرلیے منڈی مرید کے کی یہ اکیڈیمی نومبر ۱۹۷۰ء سے قائم تھی اور ۱۹۷۹ء میں بھی استادی کرتے رہے مقامات ۲۰۱۴ء میں لکھتے ہیں نومبر ۱۹۷۰ء میں وہ اکیڈیمی وجود میں آئی جو دارالاشراق کے نام سے ۱۹۷۸ء تک مرید کے میں باقاعدگی سے کام کرتی رہی اب کئی ماہ سے معطل ہے میرے کچھ رفقاء برسوں کی جدوجہد کے بعد گھروں کو لوٹ چکے ہیں یہ ایک کام تھا جو شروع ہوا اور اپنے وجود کو باقی رکھنے کے لیے بے شمار مراحل سے گزرا کرنے کا اصل کام یہی ہے ۱۹۷۵ء میں احباب کی تعداد اس ادارے میں سات ہوگئی بڑی صلاحیت کے نوجوان تھے یہاں تدریس بار بار شروع ہوکر ختم ہوتی رہی بہت تھوڑا کام باقی ہے اللہ اس کام کو ضائع نہیں کرے گا [مقامات ۲۰۱۴ء ص ۳۸، ۳۹، ۴۰، ۴۱] مقامات میں اصلاحی صاحب پر مضمون میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۳ء سے ۱۹۸۳ء تک صرف ان کا طالب علم رہا اسی مقامات میں لکھتے ہیں کہ ۱۹۷۰ء سے لے کر ۱۹۷۹ء تک منڈی مرید کے میں اکیڈمی چلاتا رہا۔

غامدی صاحب "مقامات" میں لکھ رہے ہیں کہ انہوں نے ۱۹۷۳ میں امین احسن اصلاحی کی شاگردگی قبول کی طالب علمی کا یہ دور ۱۹۸۳ تک قائم رہا اصلاحی صاحب نے نصیحت کی کہ دماغ سے لیڈری کے تمام خیالات نکال کر تعلیم حاصل کرنا [مقامات ۲۰۱۴ ص] مگر غامدی صاحب پر استاد کی نصیحت کا کوئی اثر نہیں ہوا طالب علمی کے اس دور میں ہی انہوں نے استادی شروع کردی ۱۹۷۵ میں انہوں نے اسی طالب علمی کے دور میں ممتاز احمد خان کو انٹرویو دیا جس میں اپنی استادی کی کہانی سنائی یہ انٹرویو ''دینی مدارس روایت وتجدید'' میں شامل ہے اس کہانی سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت غامدی نے انیس سال کی عمر میں منڈی مرید کے میں کوئی اکیڈمی قائم نہیں کی تھی وہ بھی جھوٹ تھا انٹرویو پڑھیے

ہمارے ہاں سب سے بڑا المیہ یہ رہا ہے کہ ہمارے ہاں دو نظام ہائے تعلیم ایک دوسرے سے الگ تھلگ موجود رہے ہیں۔
جماعت اسلامی کے اندر بھی لوگ قدیم اور جدید میں بٹے ہوئے ہیں اور امتزاج کی وہ صورت ابھی تک پیدا نہیں ہوسکی جو جماعت اسلامی کے پیش نظر تھی۔ جو لوگ مدارس کے فارغ التحصیل تھے وہ ان لوگوں سے الگ تھلگ نظر آتے ہیں جنہوں نے یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کی۔ اندریں حالات میں نے سوچا کہ احیائے علوم اسلامیہ کے لیے ایک بھرپور کوشش کی جانی چاہیے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ خود جماعت اسلامی کے اندر بھی ایسے لوگ موجود نہیں تھے جو یہ کام کرسکیں۔ چنانچہ ان مشکلات کو دیکھتے ہوئے میں نے درمیانی راستہ نکالا اور اپنے طالب علم ساتھیوں سے رابطہ قائم کرنا شروع کردیا۔ ان میں سے جو نوجوان ساتھی مختلف اوقات میں میرے ساتھ رہے اور درس وتدریس کے اس سلسلے میں شامل رہے ان کی تعداد ۳۵ تھی۔ میرے ذہن میں دراصل ایک ایسی اکیڈیمی کا نقشہ تھا جو آگے چل کر کسی جامعہ کے لیے اساتذہ فراہم کرسکے۔ اس وقت میرے پاس یہ چھ نوجوان ساتھی ہیں جو ان ۳۵ ساتھیوں میں سے منتخب کیے گئے ہیں۔ میرے پیش نظر یہ ہے کہ مطالعہ کے ساتھ ساتھ ان ساتھیوں کے سیرت وکردار کی بھی تعمیر کی جائے۔ یہ سب ساتھی تحریک اسلامی سے بھی وابستہ ہوں۔ تقریباً سب ساتھی مختلف مضامین میں ایم اے ہیں۔ میں خود عربی پڑھا رہا ہوں۔ قرآن پاک کی تمام اہم تفاسیر کا خلاصہ ان

کے سامنے رکھوں گا۔ میں خود اصول تفسیر پڑھاؤں گا۔ میں خود ''اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید'' کے موضوع پر کام کرنا چاہتا ہوں۔ [مجھے یقین ہے کہ میرے اس کام کے سامنے آنے کے بعد اس موضوع پر کوئی اشکال باقی نہیں رہے گی] [ممتاز احمد، دینی مدارس، روایت اور تحدید علماء کی نظر میں، اسلام آباد ، ایمل مطبوعات، ۲۰۱۲ء، ص ۶۶، ۶۹، ۷۰، ۷۱، ۷۲، ۷۳]

۱۹۷۵ میں غامدی صاحب نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا تھا ڈاکٹر ممتاز احمد کو ۱۹۷۵ میں انٹرویو دیتے ہوئے انہوں نے مولانا مودودی کو نبی اور خود کو بعد میں آنے والا نبی قرار دیا ـــــ یہ ہمارا الزام نہیں غامدی صاحب کا اپنا بیان ہے ممتاز احمد خان لکھتے ہیں۔

[میرے اس سوال کے جواب میں کہ مولانا مودودی صاحب نے دین کی جو تعبیر پیش کی ہے اور مختلف دینی مسائل پر جو کچھ انہوں نے لکھا ہے آپ اس سے کس حد تک متفق ہیں، جاوید صاحب نے کہا]

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ ہر آنے والا نبی اپنے سے پہلے نبی کی تصدیق کرتا ہے۔ مجھے مولانا مودودی کی تعبیر دین سے اتفاق ہے لیکن یہ تعبیر دین میں نے مولانا مودودی سے نہیں سیکھی بلکہ قرآن وحدیث کے آزادانہ مطالعہ سے براہ راست حاصل کی ہے۔ بعد میں مولانا مودودی کی تصنیفات پڑھیں تو معلوم ہوا کہ مولانا بھی دین تو اسی طرح سمجھے ہیں جیسا کہ میں نے سمجھا ہے۔ پھر جب اُن میں بھی وہی بات دیکھی جو میں نے سمجھی تھی تو اُن کے ساتھ شامل ہو گیا لیکن بعض مسائل پر مجھے مودودی صاحب سے اختلاف بھی ہے اگرچہ وہ بنیادی مسائل نہیں ہیں۔

غامدی صاحب کے یہ تمام بیانات Oxymoron ہیں اور ان کے جھوٹ کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہیں میزان حصہ اول ۱۹۸۵ء میں غامدی صاحب نے اپنی رہائش گاہ دارالاشراق لاہور سے شائع کی طابع ان کے شاگرد ڈاکٹر منیر احمد تھے اب اس کتاب کا ذکر کہیں نہیں ملتا ـــــ غامدی صاحب کی کذب بیانی کی انتہا دیکھیے میزان ۲۰۱۵ء طبع دہم کے خاتمے میں لکھتے ہیں۔

خدا کا شکر ہے کہ اس کتاب کی تصنیف کا جو کام میں نے ۱۹۹۰ء میں کسی وقت شروع کیا تھا وہ آج سترہ سال بعد پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا جاوید غامدی اپریل ۲۰۰۷ء [خاتمہ میزان طبع دہم ۲۰۱۵ء ص ۶۵۰، ۶۵۱]

سوال یہ ہے کہ میزان لکھنے کا آغاز ۱۹۹۰ء میں ہوا تو میزان ۱۹۸۵ء میں خود بخود کیسے شائع ہو گئی؟

ان کے علمی سفر کی روداد مقامات میں روداد سفر کے عنوان سے پڑھیے تو صاف معلوم ہو جائے گا کہ کتنے تضادات قدم قدم پر موجود ہیں۔

آپ کے ایک رفیق نے لکھا ہے کہ راقم کا کوئی مضمون ہے کہ انبیاء سائنس وٹکنالوجی کا خاتمہ کرنے کے لیے آئے تھے ـــــ راقم اس تحقیق سے لاعلم ہے نہ انبیاء کی آمد کا مقصد سائنس وٹکنالوجی میں کمال حاصل کرنا تھا نہ انبیاء کا مقصد بعثت سائنس وٹکنالوجی کا خاتمہ کرنا تھا لیکن طبعیات Physic جو Metaphysics سے نکلتی تھی اس میں سے کفار کی بہت سی طبعیات کو انبیاء نے رد کیا مثلاً عاد وثمود اور فراعنہ مصر کی عمارات بنانے کی عظیم سائنس یا ٹکنالوجی کو انبیاء نے نہ اختیار کیا نہ اسے استعمال کرنے کی اجازت دی نہ اس کی تاریخ محفوظ کی نہ اس میں تحقیق کی اجازت دی نہ اس میں اضافہ کیا نہ اسے تمدن کی ترقی تسلیم کیا اس ترقی کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہی کر دیا اللہ نے

صرف یہ کہا کہ ان عذاب رسیدہ بستیوں سے تیزی سے گزر جاؤ ظاہر ہے ان بستیوں پر ٹھہراؤ اور پڑاؤ کے بغیر علم آثار قدیمہ اور سیاحت سے مال و دولت کے حصول کا امکان کہاں رہا سوال یہ ہے کہ انبیاء نے تہذیب و تمدن کی فطری ترقی کے ان مظاہر کو محفوظ کیوں نہ کیا ایسے مظاہر خود کیوں پیش نہ کیے اور ایسی عمارتیں خود تعمیر کیوں نہیں کیں جیسی عمارات تباہ شدہ بستیوں کے مکینوں نے تعمیر کی تھیں فانی لا فانی کیوں تخلیق کر رہا تھا کیا فانی کو فانی ہی کی تخلیق زیب دیتی ہے کیا انبیاء کی Metaphysics سے یہی Psysic نکلتی ہے؟

موصوف جس مضمون کا حوالہ دے رہے ہیں اس میں صرف یہ بتایا گیا تھا کہ عروج و زوال کا تعلق سائنس وٹکنالوجی میں کمال اور زوال سے نہیں ہے اگر سائنس وٹکنالوجی اتنی اہم ہوتی تو قرآن میں اس کا بالخصوص ذکر ہوتا قرآن سے کھینچ تان کر سائنس وٹکنالوجی نکالنے سے کچھ نہیں ہوسکتا سو برس کا تجربہ یہی ہے۔

انسان زندگی بسر کرنے کے لیے جو کچھ کرتا ہے وہ مقاصد شریعہ کے تحت کرتا ہے سائنس وٹکنالوجی بس کام چلاتی ہے It works چالو چیز کو حقیقت حیات سمجھنا ٹھیک نہیں

مقاصد شریعہ کے تحت شریعت کے تحفظ کے لیے اس کا جس قدر حصول ضروری ہو وہ فرض کفایہ کے درجے میں تو آسکتا ہے مگر اسے فرض عین قرار نہیں دیا جاسکتا اور سائنس وٹکنالوجی کے منکر کو دائرہ اہل سنت سے باہر کرنا ممکن نہیں کیوں کہ جو کلمہ دین میں داخل کرتا ہے اس کلمے کے الفاظ اور روح کا انکار ہی اس فرد کو دین سے باہر کرسکتا ہے ایمان لانے والے کلمات میں سائنس وٹکنالوجی پر ایمان لانے کے الفاظ شامل ہی نہیں ہیں لہٰذا اسے دین سے کیوں جوڑا جائے بات بس اتنی سی ہے۔ ہر بچے کو سائنس جبراً پڑھانے کا کیا شرعی جواز ہے؟ سائنس پہلی جماعت سے کیوں پڑھائی جاتی ہے ہمارے مفکرین اس پر غور کریں یہ تعلیم بلاوجہ نہیں دی جاتی یہ مابعد الطبیعیاتی تبدیلی پیدا کرکے ذہن کو صرف علت و معلول کے سانچے میں ڈھالتی ہے جس کا نتیجہ کیا ہوسکتا ہے اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ جدید سائنس وٹکنالوجی کے بارے میں بہت زیادہ حساسیت دکھانے والے پہلے کچھ ابتدائی مطالعات کرلیں مثلاً جارج سارٹن کی تحقیقات، گائی ایٹن، رینے گینوں، مظفر اقبال، ضیاء الدین سردار منور انیس آیات والے کرمانی صاحب وقار حسینی عثمان بکر حسین نصر ہزرل ہائیڈیگر جے الول ممفرڈ کا باریک بینی سے مطالعہ کریں پھر ان سے مکالمہ کریں گے وہ ٹکنو سائنس سائنسٹزم سائنٹفک امپیریل ازم کی صطلاحات کا جائزہ لیں اور ٹکنالوجی سائنس و سرمایہ کے تعلق کو سمجھنے کی کوشش کریں صرف یہ کہہ دینا کہ وہ سائنس کا مخالف ہے ترقی نہیں چاہتا ترقی روکنا چاہتا ہے سادہ لوح ہے کسی کی مخالفت سے سائنس نہ رکی تھی نہ رکی ہے نہ رکے گی مسئلہ سائنس کو روکنے ٹوکنے کا نہیں اس کے شعور کا ہے اس کی مابعد الطبیعیاتی اساسات کو سمجھنے اور اس کا ناقدانہ جائزہ لینے کا ہے جسے لوگ سائنس کے خاتمے کا اعلان سمجھتے ہیں یہ اعلان سے ختم ہونے والی چیز نہیں جو ایسا سمجھتے ہیں وہ نہایت سادہ لوگ ہیں اس علم سے متعلق امت کو شعور کی فراوانی درکار ہے اس فراوانی کو آپ سائنس کی تردید، سائنس کا انکار ترقی سے آنکھیں بند کرنا سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں اگر ابہام اشکال التباس ہے تو فتوے دینے گالیاں بکنے کے بجائے سوال کریں اعتراض کریں عبارت پیش کریں تنقید کریں انتہا پسندی کے الزامات نہ دیں جب آپ اس موضوع پر ہمارا موقف ہی نہیں جانتے یا جو کچھ موقف آپ تک

پہنچا ہے وہ جزواً جزواً پہنچا ہے کلیت میں نہیں پہنچا۔ تو بات کیجیے۔ پوچھیے کہ آپ کیا کر رہے ہیں کیا چاہتے ہیں کیا دلیل ہے امت کے لیے سب کو مل جل کر کام کرنا چاہیے ایک دوسرے کی اصلاح کے بجائے صرف یہ کہنا کہ مکتب فرضی دنیا کا باسی ہے محض دعویٰ ہے کون سا مکتب ___ کیا اس مکتب کا کوئی منشور بھی ہے کہاں ہے یہ؟

عالم اسلام میں مغرب کے خلاف احتجاج مزاحمتی انقلابی عسکری تحریکوں کا محور عمل Action سے زیادہ ردعمل Reaction ہے یہ احتجاجی عسکری تحریکیں صرف اسلام میں نہیں بدھ مت عیسائیت جاپان امریکہ ہر جگہ اٹھ رہی ہیں اسے صرف عالم اسلام کا مسئلہ سمجھنا جاہلیت جدیدہ ہے Lutz کی کتاب Global Terrorism میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

Robert Pape کی کتاب Dying to win کے مطابق ۲۰۰۵ء تک مسلم دہشت گرد حملے کم تھے غیر مسلم دہشت گرد حملے زیادہ تھے۔ یہ غیر مسلم کون تھے عالم اسلام کے متجددین ان سے واقف ہی نہیں تو اب واقف ہو جائیں طلال اسد نے اپنی کتاب میں خودکش حملہ آوروں کی پوری تاریخ بیان کر کے اسے جدید جارح متشدد جابر ریاست کا ردعمل بتایا ہے جو احتجاج اور مخالفت کے لیے کوئی راستہ نہیں چھوڑتی ریاست اتنی جابر ہے کہ اپنی سرحدوں سے نکلنے والوں کا قبر تک پیچھا کرتی ہے قدیم سلطنتیں اتنی جابر نہیں تھیں یہ جباریت سائنس وٹکنالوجی اور سرمایے نے مہیا کی ہے۔ اس جبر کا ایک ہی علاج ہے خودکش حملے یہ طلال کی تحقیق ہے۔ لہٰذا خودکش حملے کا راستہ خود جدیدیت اور جدیدیت کی سائنس وٹکنالوجی کے ہتھیاروں نے دکھایا ہے لہٰذا ان تحریکوں کو جدیدیت اور انسانی حقوق کے نام پر مغربی دہشت گردی کے تناظر میں دیکھنا چاہیے مغربی دہشت گردی کی تاریخ ہم نے مختصراً اپنے مضمون توہین رسالت میں بیان کر دی ہے گزشتہ چار ہزار سال کی جنگوں میں جتنے لوگ مارے گئے ان کا ۹۶ فی صد حصہ صرف مغرب کی پانچ سو سالہ جنگوں میں مارا گیا یہ جنگیں ۱۵۰۰ء سے ۲۰۰۰ء کے درمیان مغرب نے مسلط کیں بقیہ تمام مذاہب عالم تمام قوموں کی چار ہزار سالہ جنگوں میں صرف چار فی صد لوگ قتل ہوئے غامدی صاحب کے حلقے کو مغرب کی یہ تاریخ نظر نہیں آتی انھیں صرف مسلمان دہشت گرد نظر آتے ہیں۔ جدید دنیا کی دہشت گردی کی مختصر ترین تاریخ پڑھ لیجیے ___

امریکی دہشت گردی کے لئے ہارورڈ یونیورسٹی سے شائع ہونے والی مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy پڑھیے کہ امریکہ نے پچاس سال میں دس کروڑ ریڈ انڈین کس طرح تڑپا تڑپا کر، زخمی کر کے، چیچک میں مبتلا کر کے، بھوکا پیاسا رکھ کر قتل کیے۔ سرخ ہندیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل کرنے کے لیے امریکیوں نے جو مظالم کیے اس کی تاریخ نہایت خونی ہے اس قتل کا علمی عقلی فلسفیانہ جواز مغرب کے بہت بڑے فلسفی John Lock نے مہیا کیا اس تاریخ کو پڑھتے ہوئے بہت سے امریکی اپنی تاریخ پر شرمسار ہوتے ہیں لیکن امریکہ کا سب سے بڑا فلسفی رچرڈ رارٹی اپنی کتاب Achieving our country میں لکھتا ہے کہ ہمیں اپنی تاریخ پر شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں یہ درست ہے کہ ہم نے ماضی میں غلطیاں کی ہیں مگر ان پر شرمسار ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہم نے اپنے آپ کو معاف کر دیا ہے۔ القاعدہ نے تو امریکا کے دعوے کے مطابق ورلڈ ٹریڈ ٹاور پر حملہ کر کے صرف بائیس سو لوگوں کو قتل کیا تھا اور اس دن اس عمارت میں کام کرنے والا کوئی یہودی اہل کار کام پر نہیں آیا تھا یہ حملہ بھی اب خود امریکی سائنس دانوں کی نظر میں ایک معمہ بن چکا ہے امریکی ماہرین تعمیرات فزکس کے پروفیسر اس واقعے پر اپنی تحقیقات پیش کر چکے ہیں۔ لیکن اس حملے کو اگر القاعدہ کا حملہ تسلیم کیا جائے تب بھی بنیادی سوال یہ ہے کہ دو ہزار لوگوں کو ایک ساتھ قتل کرنے والے دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد اور امریکی براعظم کے اصل باشندوں ریڈ انڈینز کو قتل کرنے والے قابض یوروپی اور اب امریکی دنیا میں امن کے علم بردار دس کروڑ لوگوں کو قتل کرنا دہشت گردی نہیں ہے صرف دو ہزار کو قتل کرنا دہشت گردی ہے یہ دہشت گردی کی جدید تعریف ہے۔

سائنس وٹکنالوجی کے بارے میں صرف چلتے پھرتے بیانات دینے نیک خواہشات اور خطیبانہ امنگیں ظاہر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں اس پر ٹھوس مطالعے اور ناقدانہ مباحثے کی ضرورت ہے ہمارے اکثر مفکرین قرآن میں آیات کائنات اور غور و تدبر کی آیات سے سائنس سائنٹفک میتھڈ ثابت کر دیتے ہیں حالانکہ ان آیات کے مطالعہ مشاہدے کا نتیجہ پہلے سے طے شدہ ہے کہ ان آیات کے مشاہدے کے بعد تم لازماً خدا پر ایمان لاؤ گے اگر نہیں لاؤ گے تو تم جہنمی مشرک کافر شیر سے بدک کر بھاگنے والے جنگلی گدھے جاہل ظالم فاسق فاجر ہو یہ سائنسی بیان نہیں سائنسی تدبر میں نتیجہ پہلے سے طے شدہ نہیں ہوتا لہٰذا قرآن کی آیات کائنات کو سائنسی بیانات تسلیم نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ تدبر تفکر اور مشاہدات کے بعد قرآن نے نتیجہ نکالنے کی دعوت نہیں دی بلکہ کہا ہے کہ ہر صاحب عقل کا نتیجہ ایک ہی ہونا چاہیے کہ یہ آیات خدا کے وجود کی شہادت دے رہی ہیں دوسرے معنوں میں اگر آیات کائنات کے مطالعے مشاہدے تجزیے کے بعد کوئی شخص یا سائنس داں نیوٹن کی طرح کہہ دے کہ اس کائناتی مشین میں مجھے خدا کہیں نظر نہیں آ رہا تو قرآن آپ کے اس بیان کو تسلیم ہی نہیں کرے گا امکان تردید اور کذب Falsification کے بغیر کوئی بیان سائنسی نہیں ہو سکتا اس بات میں ہمارے متجددین کو کیا ابہام ہے۔

سائنس Free Will کے اصول پر چلتی ہے قرآن میں کائنات پر تدبر، تفکر سے متعلق آیات میں Free Will پر قدغن عائد کر دی گئی ہے یعنی اس مشاہدے مطالعے کا نتیجہ ارادہ انسانی پر چھوڑنے کے بجائے معروضی [Objective] مطالعہ کرنے کے بجائے کائنات کا موضوعی [Subjective] مطالعہ کرنے کا حکم دیا گیا یعنی مطالعہ آثار کائنات کا مقصد منشاء پہلے سے طے شدہ ہے لہٰذا اس مشاہدے کو سائنسی مشاہدہ نہیں کہا جا سکتا اگر نتیجہ پہلے طے شدہ ہے تو سائنسی تجربہ بے معنی ہے کیونکہ سائنس وہ علم ہے جس کا علم صرف اور صرف تجربہ کے بعد ہی معلوم ہوتا ہے اور ہر مرتبہ ایک ہی تجربے کا نتیجہ ایک ہی نہیں ہوتا ارادہ خداوندی نے خود ہی طے کر دیا کہ اس مشاہدے کے نتیجے میں تمہیں لازماً خالق الٰہی کی معرفت حاصل ہونی چاہیے ہر وہ شخص جو مخلوق ہے خالق کے دائرہ علم سے ماورا نہیں ہو سکتا عقل، فلسفہ، تجربہ سب مخلوق ہیں سائنسی آدمی کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ ہر اس چیز کو جو عقلیت و تجربیت کے معیار پر پورا نہیں اترتی Superstitious قرار دیتا ہے اس کے خیال میں ایسی چیزیں Irrational ہوتی ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جن امور، علوم اور اشیاء کو سائنسی ذہن توہم، احمقانہ، مافوق الفطرت، غیر عقلی قرار دیتا ہے وہ اصلاً غیر عقلی نہیں ان کا فہم عقل کے محدود دائرے کے لئے مشکل ہوتا ہے وہ اصلاً Supera Rational یا Meta Rational ہوتے ہیں اور عقل ان کا ادراک نہیں کر سکتی جو چیز عقل کے دائرے میں نہ آئے وہاں عقل اپنے عجز کا اعلان کرنے کے بجائے اس شے کو ہی غیر عقلی قرار دے کر اپنی بے عقلی کا ثبوت دیتی ہے یہ بات اس طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ موجود کا دائرہ ہمیشہ معلوم سے بڑا ہوتا ہے انسان جو کچھ محسوس کر سکتا ہے اس سے زیادہ اشیاء اس کے اردگرد ایسی ہیں جنہیں وہ حواس سے نہیں پا سکتا۔ اگر بے شمار اشیاء وجود رکھنے کے باوجود انسان کے عقلی حسی تجربی وجود کے احاطے میں نہیں آ رہیں تو اس کا مطلب کبھی یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ اشیاء سرے سے وجود ہی نہیں رکھتیں اللہ کی بے شمار مخلوقات، اجسام، جراثیم ہمارے گرد موجود ہیں لیکن ہم ان کا ادراک عقلی، طبعی حسی طور پر نہیں کر سکتے۔ مثلاً مچھلیوں کے بارے میں یہ تحقیق ہو چکی ہے کہ وہ سب سے زیادہ شور مچاتی ہیں لیکن انسان نے کبھی ان کا شور نہیں سنا یہ انسان کے آلہ سماعت کی نارسائی ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ مچھلیوں کا شور وجود نہیں رکھتا مگر وہ انسانی وجود کے دائرہ محسوسات سے ماورا ہے کسی چیز کا انسانی عقل سے ماورا ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ شے غیر عقلی ہے یا وہ وجود ہی نہیں رکھتی بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ

انسان کے پاس وہ صلاحیت ہی نہیں یا اس قدر محدود ہے کہ وہ شے کے وجود کا ادراک نہیں حاصل کر سکتا یہ انسان کا عجز ہے اس نے اس عجز کو کبر میں ڈھال کر ان اشیاء کا ہی انکار کر دیا جو اس کی تجربیت وعقلیت کے دائرے میں نہیں آسکے۔

عالم اسلام کے سائنس پرستوں سے ہمارا اختلاف صرف یہ ہے کہ سائنس دنیا اور آخرت میں ذریعۂ نجات نہیں ہے یہ سمجھنا کہ سائنس کے بغیر نجات محال ہے بدعت ہے نجات کو سائنس سے مشروط کرنا نیا عقیدہ خلق کرنا ہے۔ یہ عقیدے کے باب میں اضافہ ہے۔ غامدی صاحب اس عقیدے کے بارے میں لکھتے ہیں انسانی تاریخ گواہی دیتی ہے کہ عروج وزوال تو ایک طرف انسان کے مرنے جینے کا انحصار بھی بیش تر سائنسی علوم میں مہارت پر رہا ہے یہ دنیا عالم اسباب ہے اور یہ اسباب زیادہ تر سائنسی علوم میں انسان کی مہارت سے پیدا ہوتے ہیں (مقامات ۲۰۱۴ ص ۱۷۲) متجددین کے خیال میں سائنس کا دائرہ وحی کا نہیں عقل کا دائرہ ہے لہٰذا غامدی صاحب کی تحقیق یہ ہے کہ جن معاملات میں عقل کی رہنمائی اس کے لیے کافی ہے ان سے اس کتاب قرآن کو کوئی تعلق نہیں (مقامات ۲۰۱۴ء، ص ۳۰۷) اصلاً جدیدیت پسند چاہتے ہیں کہ سائنس کو بے مہار چھوڑ دیا جائے تاکہ بے مثال ترقی حاصل ہو مگر سو سال گزرنے کے باوجود انہیں یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ترقی صرف سائنس سے حاصل نہیں ہوتی اس کے لیے مابعد الطبیعیات کی تبدیلی ضروری ہے۔ جب تک مابعد الطبیعیاتی اساسات تبدیل نہیں ہوں گی عالم اسلام کانٹ کی عقلیت وتجربیت کے آمیختے سے نکلنے والے علم [Transcendental Idealism] کو برتر افضل علم تسلیم نہیں کرے گا عالم اسلام جدید سائنس میں کبھی ترقی نہیں کر سکے گا۔ ان بے چاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ٹیکنو سائنس کی پیدا کردہ ماحولیاتی آلودگی اور فطرت کی بربادی کے باعث ۸۰ کروڑ لوگ قحط، بھوک، بیماری، غربت کا شکار ہیں سائنس ترقی کی بات کر رہی ہے مگر سائنسی ترقی کے نتیجے میں بھی ۸۰ کروڑ لوگ جو کل تک اپنی زمینوں پر کاشت کاری کے ذریعے اپنا پیٹ بھر سکتے تھے پانی بارش کی کمی کے باعث کچھ پیدا کرنے سے قاصر ہیں۔ ترقی چار فیصد گوری قوموں نے کی مگر ان کی پھیلائی ہوئی آلودگی نے پوری دنیا کو تباہ کر دیا کیونکہ آلودگی کو آپ قومی سرحدوں میں محدود نہیں کر سکتے ہوا آفاقی ہوتی ہے وہ آلودگی کو اڑا کر لے جاتی ہے۔ پاکستان آلودگی پھیلانے والے ممالک کی فہرست میں ۱۳۶ ویں نمبر پر ہے لیکن آلودگی سے متاثر ممالک کی فہرست میں اس کا نمبر ۶ ہے چین اور بھارت کی پیدا کردہ چالیس فی صد آلودگی پاکستان کے حصے میں آ رہی ہے اور اسے تباہ کر رہی ہے یہ کیسی سائنسی ترقی ہے کہ ترقی دوسرا کرتا ہے تباہی کسی اور پر آتی ہے اور سائنس کے حامی متجددین ان مباحث سے ناواقف عالم اسلام کی سائنسی ترقی کے معاملے میں بے چین رہتے ہیں UNO کے جنرل سکریٹری بانکی مون نے اپنے بیان میں اعتراف کیا ہے کہ لوگ بھوک کے مر رہے ہیں ان کا بیان پڑھیے:

800m undernourished due to declining soil fertility: Ban

The Newspaper's Correspondent - Updated 2 days ago

UNITED NATIONS: UN Secretary General Ban Ki-moon said on Friday nearly 800 million people are chronically undernourished as a direct consequence of land degradation, declining soil, fertility, unsustainable water use, drought and biodiversity loss, requiring long-term solutions to help communities increase resilience to climate change,.

"The livelihoods and well-being of hundreds of millions of people are at stake," the secretary-general said in his message to mark the World Day to Fight Desertification, whose theme this year is 'Protect Earth. Restore land. Engage people", according to a press release.

"Over the next 25 years, land degradation could reduce global food productivity by as much as 12 per cent, leading to a 30 per cent increase in world food prices," he added.

In his message, the secretary-general emphasised that more than 50 per cent of agricultural land is moderately or

severely degraded, with 12 million hectares lost to production each year.

"Desertification, land degradation, drought and climate change are interconnected. As a result of land degradation and climate change, the severity and frequency of droughts have been increasing, along with floods and extreme temperatures," he said.

The secretary-general emphasised that without a long-term solution, desertification and land degradation will not only affect food supply but lead to increased migration and threaten the stability of many nations and regions.

"This is why world leaders made land degradation neutrality one of the targets of the Sustainable Development Goals [SDGs]. That means rehabilitating at least 12 million hectares of degraded land a year."

In another message to mark the day, Irina Bokova, the Director-General of Unesco, underscored that desertification is a threat to both arid and non-arid regions, where land over-exploitation, including intensive farming, forest exploitation for fuel and timber and overgrazing have turned fertile soils into sterile land.

Published in Dawn, June 19th, 2016

MIT میں کام کرنے والے سائنس دان کئی کئی دن تک نہیں سوتے اپنے بال داڑھیاں نہیں کاٹتے وہ تحقیق میں ایسے منہمک ہوتے ہیں کہ انھیں کسی چیز کا ہوش نہیں ہوتا ___ خود کانٹ تین سال تک ایک کمرے میں بند رہا اور جب باہر نکلا تو اس نے فلسفے کا ایک شاہکار پیش کیا ایک سائنس دان مسلسل تجربات کررہا ہے۔ اس پر خیالات کا نزول ہورہا ہے کیا وہ اسے چھوڑ کر اُٹھ جائے۔ ظاہر ہے اگر سائنس اور فلسفے میں عروج حاصل ہوگا تو اسی طریقے اور ذریعے سے لیکن کیا مذہب کو یہ عروج مطلوب ہے؟ اور کیا انہی طریقوں سے مطلوب ہے؟ یا مذہب نے اس عروج کے حاصل کرنے کے متبادل طریقے بتائے ہیں ——

ظاہر ہے ایک مسلمان دن میں پانچ مرتبہ نماز کے لیے اپنے تجربات تجلیات افکار کی کہکشاں کو پھینک کر اُٹھے گا موذن کی اذان دن میں پانچ مرتبہ اس لیے بلند ہوتی ہے کہ دنیا میں مبتلا، دنیا میں مصروف عمل فرد کا رستہ اس دنیا سے توڑ کر جو عارضی فلاح کا راستہ ہے اُس دنیا آخرت سے جوڑتی ہے جو اصل فلاح ہے حی الفلاح کا یہی مطلب ہے اسلامی دنیا میں فلاح کا یہی تصور سائنس کی غیر معمولی ترقی میں اصل رکاوٹ ہے۔ ہر مسئلے میں عبادت، مذہبی احکام، حلال وحرام کا فرق صحیح غلط کے اصول آجاتے ہیں تعقل مذہبی زندگی کے ہر عمل کو حلال وحرام کے پیمانوں پر پرکھ کر ترقی کا راستہ مسدود کردیتا ہے۔ عبادات وقت ضائع کرتی ہے ان کی وجہ سے افکار کا تسلسل ٹوٹ جاتا ہے نادر خیال آرہا ہوتا ہے مگر وہ نکل جاتا ہے کانٹ کی طرح کوئی مسلمان تین سال تک سب سے کٹ کر الگ کمرے میں بند نہیں رہ سکتا حقوق اللہ اور حقوق العباد کے لیے اسے لازماً کمرے سے باہر آنا ہوگا اسلامی ارمات ایسے شخص کی علمی سرگرمی کو برداشت نہیں کرے گی لہٰذا اسلامی تہذیب میں کانٹ، ہیگل، نیوٹن نہیں پیدا ہوسکتے یہ بات سمجھنے میں کیا رکاوٹ ہے؟

سائنس ماضی میں بھی رہی ہے اس کے ساتھ امت کے تعلق کی نوعیت ماضی میں کیا تھی؟ لہٰذا پندرہ سو سالہ اسلامی علمیت میں اس سے جو برتاؤ کیا گیا وہی برتاؤ اس سے آج بھی کیا جانا چاہئے۔ سائنس کو نجات کا ذریعہ سمجھنا غلط ہے۔ مغرب میں ردعمل کی نفسیات کے تحت بے شمار لوگ سائنس کے دشمن ہیں پورا ایک مکتب فکر ہے ان کا سربراہ Blake ہے اس کی تحریریں پڑھیں ہمارا اس مکتب فکر سے کوئی تعلق نہیں سائنس کی طرح ٹکنالوجی کے خلاف بھی مغرب میں زبردست ردعمل پایا جاتا ہے مائیکل سانڈل نے اپنی کتاب Justice میں یونا بامبر کی پوری تفصیل دی ہے وہ اوکلاہاما یونیورسٹی کا ریاضی کا پروفیسر تھا اور سائنس دانوں کو قتل کرتا تھا کہتا تھا کہ یہی اصل بدمعاش ہیں۔ ظاہر ہے اس قسم کی جہالت سے جدید سائنس وٹکنالوجی کی جہالت کو شکست نہیں دی جاسکتی اصل مسئلہ سائنس نہیں مغرب کا عقیدہ آزادی مساوات ترقی ہے ان فلسفیانہ اصطلاحات کو ہمارے متجددین مغربی تناظر میں نہیں پڑھتے لہٰذا مسئلہ پیدا ہوجاتا ہے۔ ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سائنس بس کام چلانے کی چیز ہے It works بس اس کو اس کے اصل مقام پر رکھ کر دائرہ شریعت کے تابع مقاصد شریعت کے

لیے استعمال کیا جاسکتا ہے اس سے اگر کوئی فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے تو اٹھالیا جائے لیکن اسے غیر اقداری نہیں سمجھا جاسکتا اور فائدہ اٹھانے سے پہلے اس کا جارحانہ تنقیدی جائزہ لازمی ہے لیکن یہ بات ہر حال میں یاد رکھی جائے کہ وحی کا دائرہ ہر دائرہ علم پر حاوی رہے گا وحی فیصلہ کرے گی کہ سائنس وٹکنالوجی میں کیا درست ہے کیا غلط کتنا لیا جائے یا سب کو مسترد کردیا جائے غامدی صاحب یا طحہ جابر العلوانی کی طرح یہ موقف اختیار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر علم کا اپنا دائرہ ہے وہ اپنے دائرے میں رہے اس سے تجاوز کرکے دوسرے دائرے میں دخل نہ دے سائنس وحی عقل سب کے اپنے اپنے دائرے ہیں سائنس کا تعلق صرف عقل سے ہے لہٰذا سائنس کے لیے عقل کافی ہے اسے قرآن کی رہنمائی کی ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ باطل استدلال ہے کہ وحی سائنس کے دائرے میں دخل دینے کی مجاز نہیں مخلوق خالق پر پابندی عائد نہیں کرسکتی۔

ہزرل عالمی فلسفہ کانگریس کا صدر تھا اس نے انیسویں صدی کے آغاز میں یوروپی سائنسز کا جائزہ لیا اس کی کتاب The Crises of Uropean sciences موجود ہے اس کے شاگرد ہائیڈیگر نے جو کنگ فلاسفر تھا ۱۹۲۶ء میں Question Concerning Technology لکھ کر بتادیا تھا کہ ٹکنالوجی خدا کی جگہ حاصل کرلے گی اور ٹکنالوجی نے خدا کی جگہ لے لی بلکہ ہائیڈیگر نے اپنے آخری انٹرویو میں جو ۱۹۷۶ء میں جرمنی کے رسالے Der Spiegel کو دیا گیا۔ صاف صاف کہہ دیا تھا کہ فلسفہ سائنس وٹکنالوجی میں تحلیل ہوگیا ہے سائنس وٹکنالوجی نے اس دنیا کا نقشہ ہی بدل دیا ہے یہ وہ دنیا ہی نہیں جو ایک فطری حقیقی دنیا تھی انٹرویو لینے والے کو ہائیڈیگر نے صاف صاف کہا کہ میں اس مسئلے پر کچھ نہیں کہہ سکتا کوئی حل نہیں پیش کرسکتا صرف خدا ہی اس دنیا کو بچا سکتا ہے Only God can save this world سائنس اور مذہب پر بحث میں دلچسپی رکھنے والے Mary Midgley کی کتاب Science as salvation: A modern Myth and its meaning پڑھ لیں۔

جدید سائنس، ٹیکنو سائنس، سائنٹفک امپریل ازم نے اس کائنات کے ساتھ تسخیر کائنات کے نام پر کیا کیا قبیح افعال انجام دیئے اس کا خلاصہ Science Salvation کی مصنفہ کے قلم سے پڑھیے:

NATURE AND HER TORMENTORS What went wrong? It may be easier to see that if we notice the way in which the pioneers of mechanism went about reshaping the concept of Nature. Very properly, they wanted to try the experiment of depersonalizing it. With that in view, the first step they surely needed to take was to stop using the feminine pronoun, or indeed any personal pronoun for 'Nature' altogether. But this was not done. We come here to one more of the strange compensatory myths, dreams or dramas that are my theme. The literature of early modem science is a mine of highly-coloured passages that describe Nature, by no means as a neutral object, but as a seductive but troublesome female, to be unrelentingly pursued, sought out, fought against, chased into her inmost sanctuaries, prevented from escaping, persistently courted, wooed, harried, vexed, tormented, unveiled, unrobed, and 'put to the question' (i.e. interrogated under torture), forced to confess 'all that lay in her most intimate recesses', her 'beau-tiful bosom' must be laid bare, she must be held down and finally 'penetrated', 'pierced' and 'vanquished' (words which constantly recur). Now this odd talk does not come just from a few exceptionally uninhibited writers. It has not been invented by modern feminists. It is the common, constant idiom of the age. Since historians began to notice it, they have been able to collect it up easily in handfuls for every discussion. I can't spend time on doing that here, but I will just give briefly a few well-known examples from Francis Bacon, who was something of a trail-blazer in the matter. Bacon dismissed the Aristotelians as people who had stood impotent before Nature, destined 'never to lay hold of her and capture her'. Aristotle (said Bacon), being a mere contemplative, had 'left Nature herself untouched and inviolate'. By contrast, Bacon called upon the 'true sons of knowledge' to 'penetrate further' and to 'overcome Nature in action', so that 'passing by the outer courts of nature, which many have trodden, we may find a way at length into her inner chambers'. Mankind would then be able, not just to 'exert a gentle guidance over Nature's course', but to 'conquer and subdue nature, to shake her to her foundations' and to 'discover the secrets still locked in Nature's bosom'. Men (Bacon added) ought to make peace among themselves so as to turn 'with united forces against the Nature of Things, to storm and occupy her castles and strongholds'. By these means scientists would bring about the 'truly masculine birth of time' by which they would subdue 'Nature with

all her children, to bind her to your service and make her your slave'. Just to show that this way of talking did not die with the crude manners of the seventeenth century, here are a couple of later echoes from Adam Sedgwick, that immensely respectable clerical professor of geology at Cambridge who was so disturbed by Darwin's theories. Sedgwick, describing true scientific method, explained how, after laws have been carefully formulated, investigators must always 'again put nature to the torture and wring new secrets from her'. And, shifting to the military end of the spectrum, Sedgwick also described Newton as having 'stormed the sky with mathematical artillery.

Mary Midgley, *"Science as Salvation: A Modern Myth and It's meaning"*, (Routledge London 1992) P 76,77,78

۱۹۲۰ءاور ۱۹۲۶ء میں ہزرل اور ہائیڈ یگر سائنس وٹکنالوجی کے پیدا کردہ سنگین مسائل پر لکھ رہے تھے مگر علامہ اقبال ان مباحث سے ناواقف تھے مغرب جس نے جدید سائنس وٹکنالوجی کو جنم دیا وہاں اس پر شدید تنقید ہورہی تھی اور علامہ اقبال خطبات میں اسی سائنس وٹکنالوجی کو اسلام کی میراث ثابت کررہے تھے اور اسی سائنس وٹکنالوجی سے اسلامی عقائد کی حقانیت کے مستقبل میں امکانات بھی تلاش کررہے تھے بعد میں علامہ اقبال نے اپنے اخلاص، علم، راسخ العقیدگی کی بنیاد پر اپنے خطبات سے رجوع کرلیا کیونکہ وہ ایک صاحب ایمان عاشق رسول اور ایک درمند امتی تھے اقبال، ہزرل، ہائیڈیگر سے عدم واقفیت کے باوجود اپنے کشف اور قوت ایمانی سے ان حقائق سے واقف ہوکر خطبات کے موقف سے رجوع کرچکے تھے مگر عہد حاضر کے جدیدیت پسندوں کو یہ اطلاع بھی نہیں ہے کہ خطبات اقبال جس پر وہ اپنے تجدد کا شور مچارہے ہیں اس سے اقبال رجوع کرچکے تھے وہ امالی غلام محمد پڑھ لیں پھر بات کریں۔ اکثر متجددین سائنس کے بارے میں اب بھی علامہ اقبال کے خیالات کو سرقہ کرکے اپنے نام سے پیش کررہے ہیں جبکہ اقبال ان خیالات سے خود اپنی زندگی میں رجوع کرچکے لہٰذا اس موضوع پر اب گفتگو کا خاتمہ ہونا چاہیے اور سائنس کے بارے میں زیادہ جامع، عالمانہ نقطۂ نظر اختیار کرنا چاہیے اور سب مل کر تبادلہ خیال کرنے پر آمادہ بھی ہوجائیں اور صرف رسالوں میں یک طرفہ نامکمل گفتگو نہ کریں۔

حیرت ہے کہ آج سو سال بعد جب ہم سائنس وٹکنالوجی پر ہزرل، ہائیڈیگر سے کم تر درجے کی تنقید کرتے ہیں تو متجددین گالم گلوچ پر اتر آتے ہیں سائنس ایک علم عقلی ہے اس پر تنقید برداشت نہ کرنا غیر عقلی رویہ ہے مگر متجددین اس بارے میں قوت برداشت کھو چکے ہیں وہ بلاوجہ سائنس کے عشق میں مبتلا ہیں۔

سائنس ٹکنالوجی تسخیر کائنات کے نام پر اس بسیط خلاء، اسباب، وسائل، فطرت کو کالونائز [Colonization of space/ nature/ resources] کررہی ہے یہ اصلاً تسخیر کائنات نہیں تجہیز وتکفین وتدفین کائنات کا کام ہے ماحولیات سے متعلق تمام مباحث مسائل اسی استحصالی رویے سے پیدا ہوئے ہیں۔

Colonization of science ایک اہم موضوع ہے جدید سائنس صرف لوگوں کی سہولیات ضروریات تعیّشات کے لیے نہیں صرف سرمایہ میں اضافہ کے لیے اور اس اضافے کی خاطر وسائل کو استعمال کرنے کے بجائے ان کے استحصال کے سفر پر ہے انسان اس سائنس وٹکنالوجی کو اپنا خادم بنانے کے بجائے اس کا غلام بن چکا ہے اور اس غلامی سے نکلنا اس انسان کے لیے محال ہوگیا جو اس طرز زندگی کا عاشق ہے عاشق کبھی معشوق کی خامیوں کمزوریوں کے بارے میں نہیں سوچتا اسے اس کا عیب وصف حمید نظر آتا ہے ہم سائنس کی پرستش کے خلاف ہیں۔ اسلامی تاریخ کے پندرہ سو سالوں میں سائنس اور سائنس دانوں کی جو حیثیت تھی انھیں اسی مقام پر رکھا جائے۔ ابن سینا، ابن الہیثم اور فلسفی رازی مقتول کی خلافت اسلامیہ میں کیا حیثیت تھی؟ کیا ان کی سائنس ریاستی سرپرستی میں پھیلتی پھولتی تھی آج جس

طرح سائنس دانوں کو ایک عظیم ہستی کے طور پر پیش کیا جا رہا ہے کیا کسی روایتی تہذیب میں —— سائنس دانوں کی یہ حیثیت تھی۔

تاریخ عالم میں تئیس بڑی تہذیبیں موجود رہی ہیں ان میں کبھی کسی سائنس داں کو عزت نہیں دی گئی بلکہ ہمیشہ ان تہذیبوں میں الہیات، مابعد الطبیعیات کے علماء کو عزت دی جاتی تھی آخرت کا علم علم سمجھا جاتا تھا عالم اسی کو کہتے تھے بادشاہ انہی علماء کو پاس بٹھاتا تھا آج وہی مقام سائنس داں کو دینے کی کوشش کی جارہی ہے کیوں کہ اب اصل علم بلکہ العلم سائنس ہے اس کے سوا علم کا کوئی ماخذ اور ذریعہ نہیں ہے۔ سائنس دانوں کے بارے میں ہمارے متجددین بہت خوش فہمی میں مبتلا ہیں جبکہ مغرب میں بھی سائنس دانوں کی کوئی عزت نہیں وہ بہت چھوٹے حقیر گھٹیا انسان سمجھے جاتے ہیں:

سائنس دانوں کی عزت کا حال یہ ہے کہ ان کی تحقیقات جو سرمایہ دارانہ نظام اور کارپوریشن کے مفادات کے خلاف ہوں ان کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کیا جاتا اور ایسی تحقیقات پیش کرنے والے سائنس دانوں کو گرفتار کرلیا جاتا ہے۔ ہارورڈ یونیورسٹی کی پروفیسر Noamiorsekes اپنی کتاب Collapse of Western Civilization میں لکھتی ہے

A crucial but under-studied incident was the legal seizing of notes from scientists who had documented the damage caused by a famous oil spill of the period, the 2011 British Petroleum Deepwater Horizon. Though leaders of the scientific community protested, scientists yielded to the demands, thus helping set the stage for further pressure on scientists from both governments and the industrial enterprises that governments subsidized and protected. Then legislation was passed (particularly in the United States) that placed limits on what scientists could study and how they could study it, beginning with the notorious House Bill 819, better known as the "Sea Level Rise Denial Bill," passed in 2012 by the government of what was then the U.S

. state of North Carolina (now part of the Atlantic Continental Shelf) Meanwhile the Government Spending Accountability Act of 2012 restricted the ability of government scientists to attend conferences to share and analyze the results of their research. Though ridiculed when first introduced, the Sea Level Rise Denial Bill would become the model for the U.S. National Stability Protection Act of 2025, which led to the conviction and imprisonment of more than three hundred scientists for "endangering the safety and well-being of the general public with unduly alarming threats." By exaggerating the threat, it was argued, scientists were preventing the economic development essential for coping with climate change. When the scientists appealed, their convictions were upheld by the U.S. Supreme Court under the Clear and Present Danger doctrine, which permitted the government to limit speech deemed to represent an imminent threat. Had scientists exaggerated the threat, inadvertently undermining the evidence that would later vindicate them? [Nomi Oreskes & E. Mcnway The collapse of western civilization: a view from the future , Columbia University Press. New York, 2014, p. 13, 14]

Naomi Oreskes نے ریاست نارتھ کیرولینا کے ساحلوں سے متعلق جس بل House Bill 189 کا ذکر کیا ہے اس بل کے نفاذ کا مقصد سمندر کی سطح بلند ہونے کی سائنسی حقیقت کو قانون کی طاقت سے نظر انداز کرنا تھا اس قانون کی غیر منصفانہ منظوری پر تبصرہ کرتے ہوئے امریکا کے ایک مسخرے [Comedian] اسٹیفن کولبرٹ نے اپنے مزاحیہ پروگرام میں عجیب وغریب جملہ کسا۔ اگر سائنس آپ کو کوئی ایسا حل پیش کرتی ہے جو آپ کو پسند نہیں تو آپ اس کے خلاف ایک قانون منظور کرلیں کہ سائنسی نتائج غیر قانونی ہیں مسئلہ حل ہوجائے گا۔ قانون دانوں کی یہ کوشش سائنس کو غیر قانونی قرار دینے کے مترادف ہے

"If your science gives you a result you don't like, pass a law saying the result is illegal. Problem solved, "the Joked. lawmakers' efforts as an attempt to outlaw science.

امریکا میں سائنس اور سائنس دانوں کے ساتھ قانون دانوں نے وہی سلوک کیا جو پاکستان میں اینکر پرسن ،لبرل مفکر اور رنڈیاں اسلامی پروگرام میں اسلام کے ساتھ کرتی ہیں لہٰذا بلڈروں کے ایک نمائندے نے بل کی حمایت میں کہا

Fom Thompson, president of NC- 20, a coastal development group and a key supporter of the law, said the science used to make the 39 - inch prediction was flawed, and added that the resources commission failed to consider the economic consequences of preparing the coast for a one - meter rise in sea level, under which up to 2,000 sequre miles would be threatened.
The endeavor would cost the state hundred of millions of dollars, Thompson said.
"I don't want to say they're being dishonest, but they;re pulling data out of their hip pocket that arn't working,"

بل کا متن لکھنے والی رکن اسمبلی نے ارشاد فرمایا:

Republican State Rep. Pat McElraft, who drafted the law, called the law a "breather" that allows the state to "step back" and continue studying sea - level rise for the next several years.with the goal of achieving a more accourate prediction model.
"Most of the environmental side say we're ignoring science, but the bill actually asks for more science," she said "We"re not ignoring science, we're asking for the best science possible, the best extrapolationpossible, looking at the historical data also. We just need to make sure that we're getting the proper answers."

[http://abcnews.go.com/US/north-carolina-bans-latest-science-rising-sea-level/story?id=16913782]

جدید دور میں سب سے زیادہ آمدنی [Incom] سٹے باز [Risk manager] کی ہوتی ہے اس کے پاس صرف قیاس، گمان، ظن تخمین کا علم ہوتا ہے اس کے پاس ایک خاص حس، جذبہ، حوصلہ اور ولولہ ہوتا ہے جس کا علم اور سند کسی تعلیمی ادارے سے نہیں ملتی دنیا کا سب سے بڑا سٹہ باز جارج سوروس [J. Soros] بس اندازے پر کھیلتا ہے وہ کھرب پتی ہے اس نے ملیشیا کی معیشت کو اسٹاک مارکیٹ کے ذریعہ تباہ کر کے ایشین ٹائیگر کو ایک رات میں پیپر ٹائیگر بنا دیا تھا اس عالمی سٹے باز کی بے پناہ آمدنی اور علم سے متعلق تفصیلات کے لیے نائیل فرگوسن کی کتاب The Ascent of money پڑھ لیجیے۔

جدیدیت [Modrenism]، لادینیت [Secularism] اور سرمایہ داری و جمہوریت [Capitalism & Democracy] کی پیدا کردہ جدید دنیا میں شہرت عزت اور دولت کا معیار علم نہیں ہے بلکہ سائنسی علم بھی نہیں بلکہ علم کا معیار یہ ہے کہ کون اپنے کام، فن سے سب سے زیادہ سرمایہ پیدا کر سکتا ہے کیونکہ آزادی صرف سرمایہ سے حاصل ہوتی ہے اسی لیے مغرب میں کام [Work] کی تعریف یہ ہے کہ جس سے سرمایہ حاصل ہو۔ کام کا نہ ہونا پاگل پن ہے یعنی جو شخص کام نہیں کرتا سرمایہ نہیں کماتا وہ اپنی آزادی کا انکار کرتا ہے۔ آزادی مغرب کا بنیادی ایمان و عقیدہ ہے لہٰذا آزادی اور سرمایہ کا منکر پاگل ہے فوکالٹ لکھتا ہے The absence of work is madness اسی لیے گھر میں تیرہ بچوں کو پالنے والی عورت کے کام کو مغرب کام تسلیم نہیں کرتا کہ اس سے سرمایہ نہیں پیدا ہوتا یہ عورت باہر جائے کمائے تو اسے working woman کہتے ہیں رنڈی اپنی ملکیت جسم کو بیچ کر سرمایہ کما کر اپنی آزادی میں اضافہ کرتی ہے لہذا اسے طوائف نہیں sex worker کہتے ہیں محنت کے ذریعے آزادی اور سرمایہ جیسے عظیم کام انجام دینے والی عورت ۔ جدید سیاسی فلسفے کا سب سے بڑا مفکر جان رالز جس کی کتاب Theory of Justice جدید ریاستوں میں عدل کے موضوع پر انجیل سمجھی جاتی ہے وہ لکھتا ہے کہ ہر انسان کو چار بنیادی خیر [Four Primary Goods] حاصل ہونے چاہئیں آمدنی، دولت، قوت اور اقتدار [Incom/ Wealth/ Power/

[Authority] ان چار بنیادی خیر کے بعد ہی کوئی شخص اپنی آنکھوں میں عزت وتکریم [Self Respect] کے قابل ہوسکتا ہے دوسرے معنوں میں کوئی شخص اپنی نگاہ میں بھی ان چار بنیادی اسباب کے بغیر عزت کے قابل نہیں، جس شخص کو اپنی نگاہوں میں ان چار عقائد کے بغیر عزت حاصل نہیں اسے دوسرے کی نگاہوں میں عزت کیسے مل سکتی ہے؟ جدید نظام تعلیم ہمیں یہی عزت دلانے کا فریضہ انجام دیتا ہے کہ عزت کے پیمانے تبدیل ہوچکے ہیں دوسرے معنوں میں ہمارے عقیدے، ایمانیات اور مابعد الطبیعیات بھی غیر شعوری طور پر بدل چکے ہیں لہٰذا جس کے پاس مال و دولت اور اسباب کی فراوانی نہیں ہے وہ عزت کے قابل ہی نہیں ہے افسوس کہ دنیا کی تاریخ کے بڑے بڑے لوگ اس پیمانے پر پورا نہیں اترتے۔

دنیا بھر میں عموماً اور عالم اسلام میں خصوصاً سائنس کو برتر علم جانا جاتا ہے لیکن سائنس دان [Scientists] کی مغرب میں اتنی عزت نہیں کی جاتی جتنی عزت سٹے باز Risk Managers رنڈیوں، مراثیوں، بھانڈوں [Showbuisness Stars] اور کھلاڑیوں [Sports men] کی ہوتی ہے۔عزت کا پیمانہ مغرب اور دنیائے جدید [Modren Age] میں صرف مادی ہے اور وہ ہے پیسہ۔ جو زیادہ کماتا ہے وہ زیادہ عزت پاتا ہے سب سے زیادہ پیسہ سٹے باز کماتے ہیں اس کے بعد رنڈیاں اور کھلاڑی وغیرہ اس کے بعد سائنس دانوں کا نمبر آتا ہے کیونکہ سٹے باز اور رنڈیاں سرمایہ کی پیداوار میں سائنس دانوں سے زیادہ بہتر ہیں مثلاً عالمی اولمپکس کے ایک ہفتے کے کھیل سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے امریکہ کی تمام یونیورسٹیاں سال بھر میں اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرسکتیں۔صرف امریکہ میں عریانی فحاشی کی صنعت ایک سال میں جتنا سرمایہ پیدا کرتی ہے دنیا کی کئی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں (جن میں مائیکروسافٹ جیسی کمپنی بھی شامل ہے) اجتماعی طور پر بھی اتنا سرمایہ پیدا نہیں کرتیں کرس ہیجز کی کتاب دیکھ لیجیے۔

World wide porn revenues topped 97 billion Dollar in 2006. That is more than the revenues of Microsoft, Google. Amazon, e Bay, Yahoo, Apple, Net flix & Earth link combined. [Chris Hedges., *Empire of illusion : The end of literacy & the triumph of spectalce* , Nation Books USA 2009, p. 58]

لہٰذا زیادہ اجرت [Salaries/wages] اسے ملے گی جو زیادہ سرمایہ پیدا کرے گا۔ برکلے یونیورسٹی کے وائس چانسلر کی تنخواہ یونیورسٹی کے فٹبال کوچ سے کم ہے فٹبال کوچ سالانہ تین ملین ڈالر کماتا ہے اور وائس چانسلر تین لاکھ ڈالر بھی نہیں کماتا۔ ایک فٹبال میچ سے جتنا سرمایہ پیدا ہوتا ہے برکلے اتنا سرمایہ کئی سالوں میں نہیں پیدا کرسکتی۔ کرس ہیجز اپنی کتاب *The impire of illusion* میں لکھتا ہے

The football coach is Berkeley's highest paid employee. He makes about 3 million dollar. [p. 94]

کرس ہیجز اسی کتاب کے باب Illusion of Love میں لکھتا ہے کہ امریکہ میں ایک اعلیٰ ترین رنڈی تین ہزار ڈالر فی گھنٹہ کماتی ہے۔

آج کل اسے آرٹسٹ، فلم اسٹار، فلمی ستارہ sex worker کہا جاتا ہے لیکن اس پیشے کے عیوب ظاہر کرنے کے لیے سب سے بہترین لفظ یہی ہے۔

The porn stars make anywhere from 1500 dollar to 3000 dollar an hour as prostitute. [p. 68, ibid]

اگر یہ رنڈی روزانہ بارہ گھنٹے کام کرے تو اس کی روزانہ کی آمدنی ۳۶ ہزار ڈالر ہے جو ایک امریکی استاد کی سالانہ آمدنی ہے یہ رنڈی ماہانہ دس لاکھ اسی ہزار ڈالر کماتی ہے جبکہ امریکی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے رنڈی کا لفظ اب متروک ہوگیا ہے کیونکہ معاشرے میں گناہ اور گناہ گار کو پسند کیا جارہا ہے۔ اسے برداشت [tolerance] کہتے ہیں یہ آزادی کے عقیدے کا نتیجہ

ہے ہر پھول کو کھلنے دو۔ آپ نیک کام کریں دوسرے کو برے کام کرنے دیں دونوں کا حق ہے عہد حاضر حق [Right] کے منہاج کا عہد ہے آپ جو چاہے کریں کہ حق [Good] کچھ نہیں ہوتا یہ ہر شخص کا محض دعویٰ ہوتا ہے ہر شخص کو حق [Right] ہے کہ جسے خیر [Good] سمجھے اپنی ذاتی زندگی میں اسے خود اختیار کرے دوسرے کو اختیار کرنے پر مجبور نہ کرے اپنی مرضی آزادی اختیار مطلق سے آپ جس خیر کو اختیار کرنا چاہیں کر سکتے ہیں۔ دوسرے معنوں میں خیر کی بحث بے معنی ہے خیر کچھ نہیں ہوتا اصل چیز پیسہ ہے بس پیسے کماؤ جدید نظام تعلیم اور تعلیمی اداروں کا یہی مقصد ہے۔

حسین نصر نے بھی یہ بات لکھی ہے کہ مغرب میں اسپورٹس ہیرو کی ایک سال کی آمدنی ایک بہت بڑے سائنس داں اور عظیم مفکر کی پوری زندگی کی آمدنی سے زیادہ ہوتی ہے۔

There are now sports heroes who make more of a salary in one year than the greatest westren scientists or scholars will do in his or her life time. [S. H. Nasr: *A Young Muslim's guide to the modern world*, Suhail Academy Lahore, 1988, p.232]

مشہور فلسفی مائیکل سانڈل لکھتا ہے کہ امریکہ میں اسکول کا ایک عام استاد ایک سال میں ۴۳ ہزار ڈالر کماتا ہے لیکن ڈیوڈ لیٹرمین جو رات گئے فحش گوئی کے پروگرام کی میز بانی کرتا ہے اس کی سالانہ آمدنی اکتیس ملین ڈالر ہے امریکہ کا سب سے عاقل اہم ترین آدمی سپریم کورٹ کا چیف جسٹس ایک سال میں صرف دو لاکھ سترہ ہزار چار سو ڈالر کماتا ہے اور ایک ٹیلی ویژن شو کی جج جوڈی ایک سال میں ۲۵ ملین ڈالر کما لیتی ہے

☆The average schoolteacher in the United States makes about $43,000 per year. David Letterman, the late-night talk show host, earns $31 million a year.

☆John Roberts, chief justice of the U.S. Supreme Court, is paid $217,400 a year. Judge Judy, who has a reality television show, makes $25 million a year. [*Justice, What's The Right Thing To Do?*, Michael J. Sandel ,p.162]

جب آپ مغربی تصور خیر زیادہ آمدنی بہترین معیار زندگی بلکہ معیار زندگی میں مستقل اور مسلسل اضافے کو بھی اسلامی تصور خیر کے طور پر قبول کریں گے کہ اس میں کیا حرج ہے تو آپ کی بیٹی شریف عورت بیوی، ماں نہیں سپر اسٹار بننا پسند کرے گی آپ کے بچے عالم دین نہیں بنیں گے کیوں کہ یہ ترقی کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ نہ وہ کسی ایسے پیشے اور فن کو اختیار کریں گے جس میں کم پیسے ملتے ہوں۔ کیونکہ زندگی کا مقصد آزادی [Freedom]، سرمایہ کا ارتکاز [Accumalation of Capital] معیار زندگی کے خدا کی پرستش [Worship of standard of Living]، HDI میں اضافہ اور عیش و عشرت لذت پرستی [Hendonism] ہے۔ علم وہ ہے جس سے ترقی اور اچھی نوکری ملے۔ اتنا پڑھ لکھ کر اگر اتنے کم پیسے ملتے ہیں تو ایسے علم کا کیا فائدہ؟ جب زندگی کا مقصد معیار زندگی میں اضافہ ہے تو اس مقصد کی خاطر دین، اخلاق، تہذیب، تمدن، اقدار روایات سب کچھ قربان کی جا سکتی ہیں ہر عقیدہ اور ایمان خواہ صحیح ہو یا غلط اس کی ایک قیمت ہوتی ہے دنیا پرستی کی ایک قیمت ہے جو نئی نسل ادا کرنا چاہتی ہے دین و دنیا کو یکساں سطح پر رکھنے کی بھی ایک قیمت ہے۔ بالکل اسی طرح توحید پرستی کی بھی ایک قیمت ہے جو سب کو معلوم ہے مگر ہم اسے ادا کرنا نہیں چاہتے لہٰذا مذہبی تاویلوں میں الجھے رہتے ہیں۔

سائنس کے چوبیس مغالطہ آمیز جھوٹے دعووں کا جائزہ Peter wilberg نے اپنی کتاب The Science Delusion میں لیا ہے۔ ان دعووں کی حقیقت اس کتاب میں پڑھی جا سکتی ہے۔

سائنس کی حقیقت جاننے کے لیے Ruterd Sheldrake کی کتاب The Science Delusion کا مطالعہ کیجئے۔ سائنس کے تمام دعووں، مفروضات کو سائنسی بنیادوں پر ہی رد کر دیا گیا ہے وہ بتاتا ہے کہ سائنس مفروضات پر تعمیر ہوئی جو عقائد بن چکے ہیں۔ سائنسی تصور کائنات عقیدوں کا

نظام بن گیا ہے۔حقیقت صرف مادی اور طبعی سانچوں میں ڈھل گئی ہے۔

Science is being constructed by assumptions that have hardende into dogmas

.The"scientificview"

Science has become a belief system.All reality is material or physical.

سائنٹفک میتھڈ پر فیرا ربینڈ کی کتاب Against Method بھی دیکھ لیجیے۔ یہ کتاب بھی کلاسیک میں شمار ہوتی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ سائنٹفک میتھڈ اور افریقہ کے کالے جادو میں کوئی فرق نہیں ہے۔ فیرا ربینڈ سائنس کو Chimera لکھتا ہے اس لفظ کے معنی اوکسفر ڈاردو لغت کے مطابق ''یونانی دیو مالا کا یک کردار جس کا سر شیر ببر کا، جسم بکری کا اور دم سانپ کی، عجیب وغریب واہمہ، ذہنی تخلیق، ہوّا۔

حسین نصر نے تو اپنی کتاب Sciece and Civilization in Islam میں اعداد وشمار سے ثابت کر دیا ہے کہ تمام بڑے اور اکثر سائنس داں معتزلی یا شیعہ تھے لیکن خلافت ۱۹۲۶ء تک سنیوں کے پاس رہی صلیبی جنگوں کی تاریخ پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں یہ واقعہ بھی موجود ہے کہ سلطان صلاح الدین نے عیسائیوں کو اپنے علاقوں میں تجارتی کوٹھیاں بنانے کی اجازت دی تھی اور خلیفہ کی جانب سے استفسار اور تشویش پر صلاح الدین نے جواب دیا تھا کہ اس سہولت کے بدلے ہم ان سے اسلحہ خریدتے ہیں یعنی مسلمان اسلحہ کے معاملے میں اس وقت بھی مغرب سے استفادہ کرتے تھے پوپ کی جانب سے کفر کے فتووں کے باوجود لالچی عیسائی اپنا اسلحہ صلاح الدین کو فروخت کرتے تھے۔لہٰذا سائنس کے بارے میں بہت زیادہ فکرمندی جدیدیت کی پیدا کردہ حساسیت ہے اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

بنیادی اصول یہ ہے کہ ہر تہذیب میں علم کا مقصد کیا ہے علم کا موضوع کیا ہے؟ Status of knowledge determin the status of the object of knowledge. لہٰذا بنیادی سوال یہ ہے کہ اسلامی علمیت میں کیا چیز اہم ہے ترقی، دنیا، علوم عقلیہ، معاشی ترقی، چیونٹی سے متعلق علوم یا ارادہ خداوندی کو معلوم کرنے کا علم، آخرت اور نجات حاصل کرنے کا علم۔

اسلامی تہذیب اور تمام روایتی تہذیبوں میں اصل علم خالق حقیقی کی معرفت اور نجات کا علم رہا۔لہٰذا علوم عقلیہ ان تہذیبوں میں علوم کی تلچھٹ شمار ہوتے رہے معاشرے کے ذہین لوگ دینی علوم پر توجہ دیتے تھے کیونکہ دنیا تو عارضی تھی اس سے دلچسپی کم تھی عہد حاضر میں اصل علم انسان کی مادی ترقی معیار زندگی میں مسلسل ومستقل اضافے کا علم ہے لہٰذا ___ ارادہ خداوندی، معرفت رب، نجات کے علوم۔علوم کے دائرے میں نہیں آتے کانٹ نے تجربیت اور عقلیت کے ملاپ سے علم کا جو نیا دائرہ پیدا کیا Trancendal Idealism اس کے بعد آسمانی نبوی علوی علوم ___ علوم کے دائرے سے خارج ہو گئے۔

مذہب اور مابعد الطبیعیات کو اب کوئی علم ہی نہیں سمجھتا یہ عقلیت وتجربیت ریاضی [Mathematics] کے پیمانوں پر پورا نہیں اترتا اصل علم وہ ہے جو باقی رہنے والا ہے سائنسی علم اس معیار پر بھی پورا نہیں اترتا۔ اسلام سائنس نہیں ہے کیونکہ سائنس صرف Methadological understanding of reality ہے جس کا حقیقت اصلی سے کوئی تعلق نہیں سائنس کبھی کُل (whole) کا جائزہ لے ہی نہیں سکتی لہٰذا وہ Reductionist ہوتی ہے۔

سائنس ایک خاص طریقہ سائنٹفک میتھڈ کے ذریعے ظہور کرتی ہے اس طریقہ کار کے بنیادی مقدمات ہیں کہ ہر شخص اس علم کو اسی ذریعے اسی طریقے سے حاصل کر سکے جس نے پہلی مرتبہ یہ علم حاصل کرنے کا دعویٰ کیا اس علم کی تردید تکذیب کی جا سکے اس میں اضافہ کیا جا سکے اسے بار بار دہرایا جا سکے اس علم میں شک کیا جا سکے اس کا انکار کیا جا سکے وغیرہ وغیرہ ظاہر ہے اسلام سائنٹفک میتھڈ کے طریقے پر ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

سرسید احمد خان علامہ اقبال مفتی عبدہ رشید رضا شبلی نعمانی احمد دین امرتسری غلام احمد پرویز سے لے کر آج تک تمام مخلص راسخ العقیدہ اور غیر مخلص جدیدیت پسندوں کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ سائنس کے بارے میں التباس کا شکار ہیں اور اسلام کو مغرب کی سائنس زدگی کے مساوی لانے کے لیے ایسے ایسے انکشافات کرتے ہیں کہ انسان حیرت زدہ رہ جاتا ہے علامہ اقبال اس فہرست میں واحد استثناء ہیں انہوں نے سائنس اور مذہب میں تطبیق پیدا کرنے سائنس کو حقیقت جاننے والا علم ثابت کرنے کا دعویٰ کرنے کے بعد رجوع کر لیا تھا تفصیل کے لیے امالی غلام محمد کا مطالعہ کیجیے ——اقبال اکیڈمی لاہور کے سابق ڈائریکٹر جناب سہیل عمر نے اپنی کتاب خطبات اقبال نئے تناظر کے باب "اسلامی ثقافت کی روح" میں جدید سائنس کے بارے میں علامہ اقبال کے خیالات کی کم زوری اور بے ترتیبی کے بارے میں نہایت خوبصورتی سے تنقید کی ہے اسے پڑھیے تا کہ فکر و نظر کے نئے دریچے کھل سکیں۔ حیرت ہے کہ اقبال اکادمی نے اس کتاب کو شائع کر دیا ایک ایسی کتاب جس نے خطبات اقبال میں مستور غلطیوں کو آئینے کی طرح واضح کر دیا۔ عالم اسلام کے جدیدیت پسندوں میں ابھی تک اقبال جیسا فلسفی پیدا نہیں ہو سکا لہٰذا اقبال کے خیالات کا نقد جدیدیت پسندوں کے نقد کے لیے کافی سامان مہیا کرتا ہے۔

خطبات میں علامہ اقبال کی سائنس پرستی بھی ہمارے مسلم جدیدیت پسند سائنس پرستوں کو بہت پسند ہے مگر اس میں بے شمار فکری کم زوریاں ہیں سہیل عمر پہلے ان کم زوریوں کی فہرست پیش کرتے ہیں۔

''علامہ اقبال نے مغربی مفکرین کی تردید کی ہے جن کی تحریروں میں اسلامی ثقافت کی بنیاد کو یونانی فکر سے مستعار بتایا گیا ہے کیونکہ اس طرز فکر سے اسلامی تہذیب کی قدر و قیمت اور اہمیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ علامہ کے بیان کے مطابق یونانی تہذیب کی روح عقلیت پرستی سے عبارت تھی جبکہ اسلامی تہذیب کی روح اختباری اور سائنسی تھی۔ ان دونوں میں تخالف کی نسبت تھی۔ علامہ نے اختباریت کے اس رویے کے ثبوت کے طور پر یہ بھی بیان کیا ہے کہ نظام نے ارتیاب یعنی شک [Doubt] کو حصول علم کے اصول کے طور پر پیش کیا غزالی نے اسے وسعت دی اور دے کارت کی فکر کی راہموار کی۔ ابوالحسن اشعری نے یونانی منطق پر تنقید کی، ابن تیمیہ نے الرد علی المنطقیین کے ذیل میں استقراء کو واحد قابل اعتماد طرز استدلال قرار دیا، ابن مسکویہ نے دنیا کو پہلی بار نظریہ ارتقاء سے روشناس کروایا اور ابن خلدون نے کائنات کا حرکی تصور پیش کیا اور تاریخ کو ایک سائنٹفک علم بنا دیا۔ اسی طرح عراقی نے اسلام کی اس روح اختباریت کے زیر اثر مکان Space کے بارے میں تعدد انواع کا نظریہ قائم کیا۔ یہی رجحانات اور یہی اختباریت کی روح مغرب کے Scientific Methods کے ماخذ ہیں مندرجہ بالا مثالوں اور دیگر تفصیلات کا موازنہ مغرب میں پیدا ہونے والے رویوں اور ان کی سائنسی فتوحات

کہنے کا مطلب یہ کہ کوئی ایک منہاج علم ایسا نہیں ہے جس کے بارے میں دعویٰ کیا جاسکے کہ یہ مسلمانوں کا امتیازی منہاج ہے۔مسلمان اہل علم، فلاسفہ اور سائنس دان کئی طریق کار استعمال کرتے رہے ہیں اور جس چیز کو مغرب کے معنی میں Scientific Method کہا جاتا ہے وہ بھی یکے از طریقہ ہائے کار تھا لیکن اسے واحد امتیازی طریق کار قرار دینا مشکل ہے۔

مغرب کے بڑے اہل علم بھی یکتا منہاج تحقیق کے خلاف ہو چکے اور Pluralistic Methodology کا تصور فروغ پا رہا ہے اس کی تفصیل میں جانا ممکن نہیں تاہم اتنا ضرور کہا جانا چاہے کہ نہ صرف اسلامی تہذیب وعلوم کا منہاج علم وتحقیق کسی ایک طریقے تک محدود نہیں رہا اور مسلمان کئی متوازی طریقے برتتے رہے بلکہ مغرب کے علوم کے مقابلے میں ان کا منہاج ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے کیونکہ اس کی جڑیں اسلام کے علمیاتی تناظر میں پیوست ہیں اور یہ تناظر مغرب جدید کے کارتیسی تناظر سے جدا ہے۔

یہاں مناسب ہوگا کہ (علامہ اقبال کی جانب سے) امام غزالی سے منسوب کردہ تشکیک کے بارے میں بھی چند باتیں عرض کردی جائیں۔مغرب کا علمیاتی تناظر کارتیسی ثنویت پر مبنی ہے اور بہت سی مخالفتوں کے باوجود سرکاری پالیسی کے طور پر اب بھی مقبول ہے۔

غزالی کی تشکیک بظاہر دےکارت کے نظریے اور ارتیابیت سے مشابہ معلوم ہوتی ہے۔لیکن ان دونوں کے علمی تناظر میں اتنا زیادہ بعد ہے کہ غزالی کو دیکارت کا پیشرو قرار دینا تقریباً ناممکن ہے۔**المنقذ من الضلال** میں کہیں بھی کوئی بیان یا عبارت ایسی نہیں جو دیکارت کے مندرجہ ذیل فقرے کے ہم معنی ہو۔

It is necessary once in one's life to doubt all things, so far as this is possible.

دیکارت کی تشکیک خود ماہیت علم اور نفس علم کے بارے میں ہے جبکہ غزالی زندگی کے اس بحرانی دور میں جس چیز کو شک کی نظر سے دیکھ رہے ہیں وہ حصول علم کے مختلف ذرائع اور منہاج ہیں۔ان کی تشکیک نہ فلسفیانہ ہے نہ لا ادریت اور اضافیت کی شکار۔اس کی نوعیت مختلف دعویداروں کے دعاوی کو پرکھنے کی ہے اس پس منظر کے ساتھ کہ حقائق الامور اور علم الیقین کس طبقے یا کس منہاج علم سے حاصل ہوتا ہے؟ اس طرح غزالی کبھی بھی مذہبی تشکیک میں مبتلا نہیں ہوئے۔غزالی المنقذ میں لکھتے ہیں I had already acquired a sure and certain faith in God Motst high.

جس طرح اسلامی تہذیب کے منہاج علم کے ضمن میں ہم نے کہا کہ اسے کسی ایک طریقے تک محدود کرنا درست معلوم نہیں ہوتا، اسی طرح یونان کے بارے میں یہ دعویٰ بھی (علامہ اقبال کا دعویٰ) جدید تحقیقات پر پورا نہیں اترتا کہ اس کی روح فکر سراسر عقلیت پرستی پر مبنی تھی۔یونان کے بعض مکاتیب فکر اور بعض ادوار زوال کے بارے میں یہ بیان درست ہے لیکن یونان کے اولین ادوار خصوصاً ان کے دین کے بارے میں جو تحقیقات اور مطالعات سامنے آئے ہیں ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ وہاں بھی کئی مناہج علمی مروج تھے اور ایک طریقہ عقلیت پرستی بھی تھا جسے آخری ادوار اور تہذیب یونان کے مٹنے کے عمل میں ایک برتری حاصل ہوگئی تا آنکہ اسی کو یونانی فکر کی شناخت بنالیا گیا۔مسلمانوں نے جب دیگر اقوام وملل کے علوم سے اعتناء کیا تو اپنے توحیدی مشرب کے مطابق ردوقبول کا فیصلہ کیا اس کی نمایاں مثال ہم ابن سینا کے قول کے

سلسلے میں دے چکے ہیں۔اس کے برعکس جب مغرب کی علمی دنیا نے مسلمانوں کے توسط سے یونانی علوم ترجمہ کیے تو زیادہ تر صرف انہی کتب و علوم کو منتخب کیا جو عقلیت پرستی سے معمور تھے۔اس سلسلے میں یہ بات قابل غور ہے کہ صدیوں تک اسلامی دنیا سے مغرب کو جو علوم منتقل ہوئے وہ صرف ایک مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے یعنی اسلام کے فلسفی سائنس دان Philosopher/scientist مکتب فکر سے متعلق شخصیات کے افکار۔پھر ان افکار کی تفہیم بھی اکثر ناقص تھی یا اصل مدلول و مدعا سے ہٹ چکی تھی۔نیز جو علوم منتقل ہو رہے تھے وہ اسلام میں علوم کی تلچھٹ سے عبارت تھے یا ثانوی حیثیت کی چیزیں تھیں جبکہ مغرب نے ان کو مرکزی بنالیا۔نیز ثانوی علوم اپنے اصل مرکز سے ہٹ کر اور بنیادی تناظر سے کٹ کر ایک غیر فطری نمو کی طرف بڑھنے لگے۔جس نے آگے چل کر مغرب کی علمی دنیا کو ایک خاص انداز میں متاثر کیا۔

بنابریں یہ کہنا چاہیے کہ علوم میں اسلامی تہذیب کا اپنا منہاج و طریق تھا۔اس میں استقرائی طریقہ بھی تھا اور دیگر انداز بھی۔مغرب نے اسلام سے جزواً سیکھا اور پھر ایک ایسی سمت اختیار کی جو اسلام ہی کیا دیگر تمام روایتی تہذیبوں سے الگ تھی۔مغرب کی اس غلط سمت اور انحراف کو اسلامی تہذیب سے کوئی تعلق نہیں۔[سہیل عمر،خطبات اقبال نئے تناظر میں ص۱۲۵تا۱۲۹]

سائنس ٹکنالوجی تسخیر کائنات کے نام پر خلا، اسباب، وسائل، فطرت کو کالونائز [colonization of space/nature/resources] کررہی ہے یہ اصلاً تسخیر کائنات نہیں تجہیز و تکفین و تدفین کائنات کا کام ہے ماحولیات سے متعلق تمام مباحث مسائل اسی سے پیدا ہوتے ہیں۔جدید سائنس صرف لوگوں کی سہولیات ضروریات تعیّشات کے لئے نہیں صرف سرمایہ میں اضافے کے لئے اور اس اضافے کی خاطر وسائل کو استعمال کرنے کے بجائے ان کے استحصال کے سفر پر ہے انسان اس سائنس و ٹکنالوجی کو اپنا خادم بنانے کے بجائے اس کا غلام بن چکا ہے اور اپنی اس غلامی سے نکلنا اس انسان کے لئے محال ہو گیا جو جدید طرز زندگی کا عاشق ہے عاشق کبھی معشوق کی خامیوں کم زوریوں کے بارے میں نہیں سوچتا اسے اس کا ہر عیب۔وصف حمید نظر آتا ہے ہم صرف سائنس کی پرستش کے خلاف ہیں سائنس کے معبود کی عبادت کے قائل نہیں رہ گئی ترقی تو دنیا کی تیئیس تہذیبوں میں کبھی ترقی مقصود، ہدف نہیں رہی ترقی کے حامی پہلے اس اصطلاح کا تاریخی تحقیقی مطالعہ کریں پھر ہمیں گالیاں دیں ترقی کا مقصود ہونا ایک عقیدہ ہے دین میں نئے عقیدہ کی اجازت نہیں۔

سائنس اور قرآن کے تعلق کی نوعیت کے بارے میں جناب عمار ناصر صاحب اور شہباز شیخ صاحب بھی بہت سے التباسات کا شکار ہیں ان کی خدمت میں انہی کے پیرو مرشد غامدی صاحب کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے۔

اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کے لیے وہ (قرآن) عالم طبیعی کے بارے میں بھی اگر کچھ کہتا ہے تو اس کا بیان کبھی حقیقت کے خلاف نہیں ہوتا لیکن اس عالم کے متعلق جو علوم و فنون انسان کی عقل نے دریافت کیے ہیں اور جو وہ آنے والے زمانوں میں دریافت کرے گی انھیں قرآن مجید کبھی زیر بحث نہیں لاتا اس طرح کی کوئی چیز سرے سے اس کا موضوع ہی نہیں ہے۔

لیکن اسے کیا کہیے کہ اس امت کی تاریخ میں بار ہا لوگ اس کتاب کو اس کی اس اصلی صورت میں قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوئے۔چنانچہ انھوں نے پہلے یہ مقدمہ قائم کیا کہ یہ چونکہ اللہ کی کتاب ہے اس لیے دنیا کے سارے علوم و فنون اس میں لامحالہ ہونے چاہئیں۔

اس کے بعد وہ اپنے اس مقدمے کو ثابت کرنے کے لیے اس بات کے درپے ہوئے کہ کسی طرح ان علوم وفنون کے ماخذ اس کی آیات میں کسی طرح ڈھونڈ نکالے جائیں۔ چنانچہ زبان و بیان اور نظم کلام کی ہر دلالت کو نظر انداز کر کے کبھی فلسفہ یونان کے اوہام اس سے ثابت کیے گئے کبھی ایک خاص زمانے کی سائنسی معلومات کے بارے میں دعویٰ کیا گیا کہ وہ درحقیقت اس کی فلاں اور فلاں آیت سے اخذ کی گئی ہیں کبھی علم طب اور نجوم وفلکیات کے بعض عقائد اس سے برآمد کیے گئے اور کبھی انسان کے ایٹم بم بنانے اور چاند پر پہنچنے کا ذکر اس میں سے نکال کر دکھایا گیا۔ یہ ساری زحمت لوگوں کو صرف اس لیے اٹھانا پڑی کہ انھوں نے اس کتاب کے بارے میں بالکل غلط تصور قائم کرلیا۔ ہم اگر قرآن مجید سے فی الواقع ہدایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو لازم ہے کہ اس کی طرف صرف دین کے حقائق ومعارف جاننے کے لیے رجوع کریں اپنے سونے کے لیے چارپائی بنانے اور اپنی آواز زہرہ ومریخ تک پہنچانے کے لیے ہمیں اپنی عقل کی طرف سے رجوع کرنا چاہیے۔

قرآن مجید ہم کو یہ بتانے کے لیے نازل کیا گیا ہے کہ اپنے پروردگار کی رضا ہم اس دنیا میں کن چیزوں کو مان کر اور کن چیزوں پر عمل کر کے حاصل کر سکتے ہیں۔ ہمیں اس کی آیات میں اپنی خواہشوں کا مضمون پڑھنے کے بجائے اپنی خواہشوں کو اس کی پیروی کے لیے مجبور کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بات قرآن میں جگہ جگہ واضح کی ہے کہ اس سے ہدایت حاصل کرنے کی پہلی شرط یہی ہے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی شخص دنیا کے سارے علوم وفنون اسی ایک کتاب میں دیکھنے کی خواہش رکھتا ہو لیکن اس کی یہ خواہش اس حقیقت کو نہیں بدل سکتی کہ اس میں صرف اس علم کا بیان ہے جو انسان کی ابدی فلاح کے لیے ضروری ہے۔ [غامدی، مقامات ۲۰۱۴ء، ص ۳۰۶، ۳۰۷، ۳۰۸]

اگر سائنس اور اسلام یا سائنس اور قرآن کے مسئلے پر کسی کو برا بھلا کہنا ضروری ہے تو اس کارخیر کا آغاز غامدی صاحب سے ہونا چاہئے کہ غامدی صاحب نے قرآن اور سائنس کے تعلق کو بالکل منقطع کیسے کردیا

ژی ژیک کے علمی رفیق حامد دباشی سے ترکی میں ایک کانفرنس میں ہمارے دوست فصیح صاحب نے سوال کیا کہ آپ Multiplicity of Disccourse کی بات کرتے ہیں مگر یہ کیسے ممکن ہے سرمایہ داری اور اس کے نظام کا جبر اتنا زیادہ ہے کہ وہ کسی متبادل نظام کو نہ چلنے دیتا ہے نہ زندہ رہنے دیتا ہے لہذا اگر کوئی تہذیب مغرب سے اس اصول کی بنیاد پر معاملہ کرتی ہے کہ اچھا لے لو خراب چھوڑ دو۔ یہ عملاً ممکن ہی نہیں کیپٹل ازم میں تو ہم Pick & Choose کر ہی نہیں سکتے غالب علمیت تو مغرب کی ہے جو تمام مذاہب اور ثقافتوں کو اپنے نظام میں تحلیل Reduce کر رہی ہے کیا ہم کیپٹل ازم کو اپنے نظام تہذیب میں Reduce کر سکتے ہیں کیا خذ ماصفا ودع ماکدر کا اصول یہاں چل سکتا ہے تو حامد دباشی نے اعتراف کیا کہ ہاں یہ بہت اہم مسئلہ ہے اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے عملاً تو ایسا ہی ہے کہ ہم اپنی مرضی سے اس نظام میں سے کچھ منتخب کر کے نہیں لے سکتے ___ افسوس ہے کہ اسلامی جدیدیت پسند ان بنیادی مباحث سے واقف ہی نہیں ہیں ژی ژیک اس صدی کا خطرناک فلسفی سمجھا جاتا ہے اس کے علمی رفیق کو مغرب کے نظام کے بارے میں سوچنا پڑ رہا ہے اور ہمارے متجددین مغرب کی محبت میں اتنے مبتلا ہیں کہ ان سے مغرب پر کوئی علمی تنقید برداشت ہی نہیں ہوتی۔ وفاداری کی ایسی قسمیں آج سے پہلے مفقود تھیں متجددین ابھی تک خلافت اسلامیہ کی قوت شوکت کو پس منظر میں رکھ کر یہ دعوی کرتے

ہیں کہ مغرب سے خذما صفا ودع ما کدر کے اصول پر معاملہ کیا جائے ___ اس کے لئے حوالہ یونانی فلسفے وسائنس سے اخذ و استفادہ کالاتے ہیں بیت الحکمت کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں ان کی دلیل یہی ہے کہ جس طرح ہم نے یونانی تہذیب سے ڈرامہ نہیں لیا صرف منطق ،عقلیت وغیرہ لی اسی طرح مغرب سے استفادہ کیا جاسکتا ہے لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ یونانی تہذیب غالب نہیں تھی وہ ایک مردہ تہذیب تھی مغرب ایک زندہ غالب تہذیب ہے اور اس کی علمیت بھی غالب ہے یونان اور مغرب میں زمین آسمان کا فرق ہے اور عالم اسلام بھی اب وہ نہیں جو پہلی صدی ہجری میں تھا۔لہذا یونان پر مغرب کو قیاس کرنا اصلاً قیاس مع الفارق ہے خط بہت طویل ہوگیا آپ نے فیس بک پر صرف دو صفحہ کے اشارات پیش کئے تو اس کی وضاحت کے لئے ۶۴ صفحات لکھنے پڑے اسی لئے میں فیس بک کو استعمال نہیں کرتا خط کے چند اور نکات کا جواب بھی جلد دوں گا ایک زبانی روایت سے متعلق ایک فرد اور جدید کارپوریشن ،جدید ادارے سے متعلق کیوں کہ صرف دوسطری بیان اصل مسئلے کو واضح ہی نہیں کرسکتا مودودی صاحب کے بارے میں آپ نے جو کچھ لکھا ہے وہ نامکمل ہے اور غلط ترجمانی ہے عالم اسلام میں وہ واحد شخص ہیں جنہوں نے مغرب کا علمی سطح پر رد کیا اس کے باوجود تعقل غالب کے زیر اثر ان کے یہاں بھی مغرب سے اثر پزیری کے رجحانات ملتے ہیں۔

مشال کے قتل پر چند علماء چند لبرل اہل علم سے مکالمہ

اپریل مئی میں آزادی کے عقیدے کے خلاف چار عوامی بغاوتیں

سید خالد جامعی

لبرل ازم کی دہشت گردی اور لبرل احباب کا ردعمل

مشال کے قتل پر ایک عالم دین سے مکالمہ بہت سے احباب کی نظر سے گزرا_____ اب یہ مکالمہ جاری ہے اور جاری رہے گا۔اس مکالمے میں ہمارے بہت سے فاضل مخلص، نہایت پرہیز گار علماء، مفتیان کرام اور ایک مفکر صاحب بھی شریک ہو گئے بعض سنجیدہ لبرل علمی احباب نے بھی اس مکالمے میں دلچسپی ظاہر کی اور تسلیم کیا کہ ہم تو لبرل ازم کو ایک پُر امن نظریہ سمجھتے ہیں جو دنیا میں امن کے قیام کا واحد طریقۂ کار معلوم دیتا تھا۔لیکن لبرل ازم کا جو چہرہ آپ نے انتہائی تحقیق کے ذریعے ظاہر کیا ہے وہ خود ہمارے لیے چونکانے والی خبر ہے ہم نے کبھی لبرل ازم کا تنقیدی مطالعہ [Critical Study] اس طرح نہیں کیا صرف یہ یقین کر کے کہ یہی واحد پُر امن طریقہ ہے اس کی حمایت کی مگر واقعتاً لبرل ازم یہی ہے جیسا کہ آپ کے دلائل اور حوالوں سے ظاہر ہے تو بہر حال پاکستان میں اس کی گنجائش اگلے دو سو سال تک پیدا نہیں کی جا سکتی اور اس آئیڈیالوجی کو قبول کرنے کے لیے کوئی بھی مذہبی گروہ تیار نہیں ہوگا جس کے نتیجے میں تصادمات بڑھیں گے۔ اپریل اور مئی کے اندر مردان یونیورسٹی، سیالکوٹ، چترال اور حب میں شاتم رسول کے خلاف چار عوامی بغاوتیں واقعتاً خطرے کی علامت ہیں جن پر سنجیدہ بحث و مباحثے کی ضرورت ہے۔

جان رالس جیسا فلسفی اتنا متشدد اور جارح ہے!

انہی لبرل احباب کا خیال تھا کہ چترال میں جس عالم دین نے توہین رسالت کرنے والے شخص کو پولیس کے حوالے کر دیا لوگ اس کو بھی مارنے کے لیے گئے تھے کہ تم نے اسے کیوں پولیس کے حوالے کیا____ تھانے کو گھیرا گیا فوج کو بلانا پڑا حب میں بھی یہی صورت حال تھی وہاں بریلوی عالم مولانا نوزیر کو بلایا گیا سنی فورس کے لوگ بھی مشتعل تھے ہجوم کا بس ایک ہی مطالبہ تھا کہ اس شاتم کو ہمارے حوالے کر دیا جائے ہم ہی اس کا حساب کریں گے عوام علماء کے قابو میں نہیں تھے ظاہر ہے یہ حیران کن صورت حال ہے اسے جب ہم آپ کے

تجزیے اور آزادی کے لبرل عقیدے کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو بظاہر ایسا ہی لگتا ہے کہ مشال خان واقعے سے حب میں شاتم رسول پر کاش کمار تک کے معاملات آزادی کے لبرل عقیدے کے خلاف عوامی بغاوتیں ہی نظر آتی ہیں ان لبرل احباب نے جان رالس [John Rawls] کے حوالے پڑھ کر نہایت حیرت کا اظہار کیا کہ رالس بھی آزادی کے عقیدے کے مخالفین کو جراثیم اور جنگوں کی طرح قتل کرنا چاہتا ہے ایک لبرل فلسفی اتنا جارح، متشدد، ہوسکتا ہے ہم تو صرف مولویوں کو متشدد اور قاتل سمجھتے تھے مگر ایک فلسفی مولوی کی طرح ہو جائے یہ ہمارے لیے حیران کُن بات ہے۔ لبرل ازم کی دہشت گردی، قتل و غارت گری کے جو اعداد و شمار آپ نے دیئے ہیں وہ بھی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہیں۔ مشال خان واقعے والے دن افغانستان میں امریکا کے وزنی ترین بم سے ہزاروں لوگوں کی ہلاکت پر تمام لبرل عناصر کی خاموشی یہ بھی حیران کن بات ہے آخر یہ کونسی انسانیت ہے ہزاروں لوگوں کے مرنے پر ہم کیوں چپ رہے۔ میڈیا ہمارے ذہن کو اس حد تک کالونائز کر چکا ہے ہمیں خود اندازہ نہیں تھا آپ کا مضمون پڑھ کر ہم سوچ رہے تھے کہ مشال خان ایک انسان کے قتل پر ہم لبرلز کے جو جذبات تھے ہزاروں انسانوں کے قتل پر وہ جذبات کیوں نہیں تھے وجہ صرف ایک ہی تھی کہ مشال کی ویڈیو فلم ہم نے دیکھی افغانستان پر حملے کی فلم نہیں دیکھی یعنی ہم اپنی آنکھ سے دیکھنے اور اپنے ذہن سے سوچنے کے بھی قابل نہیں رہے ہیں۔

ان لبرل احباب کا یہ نقطۂ نظر ایک سچے انسان کا نقطۂ نظر ہے ہائیڈیگر نے ۱۹۲۶ء میں Question Concerning Technology لکھ کر اس خطرے کی نشان دہی کر دی تھی۔ فرانسیسی فلسفی جے الول نے اپنے کتاب Technological Society میں یہ تمام خطرات بیان کر دیئے تھے۔ ٹکنالوجی انسان کی غلام نہیں رہی انسان ٹکنالوجی کا غلام ہو چکا ہے اس نے ہماری فکر و نظر، عقل و شعور، روح و بدن، ظاہر و باطن ہر گوشے کو کالونائز کر لیا۔

ان تمام علماء اور مفتیان کرام نے اس مکالمے سے متعلق بہت اہم نکات پیش کئے، سوالات اٹھائے، اشکالات ظاہر کیں اور نہایت مفید مشورے دیئے۔ ہم ان سب مخلص اور فاضل لوگوں کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ زمین کا نمک اور پہاڑی کا چراغ ہیں، انہی کے وجود سے بزم ہستی قائم ہے۔ یہ قدسی نفوس ہی ہماری علمیت، تہذیب، تاریخ، ثقافت اور قوت کے اصل محافظ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے وجود کی برکت سے ہم سب کو فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ ایک محترم عالم نے بعض تنقیدی اشارات بھی پیش کئے_____ راقم کا ایمان ہے کہ جو شخص آپ کی تنقید کرتا ہے وہ آپ کا سب سے مخلص اور سب سے زیادہ آپ کا خیر خواہ ہوتا ہے۔ تنقید پر جز بز ہونے اور تنقید کا جواب دینے سے گریز_____ یہ دونوں رویے دینی اور علمی مزاج کے منافی ہیں_____ ناقد ہمیں ان امور کی

طرف متوجہ کرتا ہے جو قصداً یا سہواً بیان نہیں ہوئے______ ناقد علم و عمل میں توسیع کا سبب بنتا ہے اس کی تنقید تصحیح کا دروازہ کھولتی اصلاح کا دائرہ وسیع کرتی اور خود احتسابی کی ترغیب دیتی ہے۔ ناقد کے نقد سے واضح ہوتا ہے کہ اس زمین پر ہم ناقص انسانوں میں کوئی عقل کل نہیں ہے، یہ مرتبہ تو صرف ذات پیغمبر ﷺ کو حاصل تھا جن کی قبر مبارک کی طرف اشارہ کر کے امام مالکؒ نے فرمایا تھا کہ یہ مقام و مرتبہ تو صرف خاتم المعصومین ہی کو حاصل ہے۔ آپ کا ہر قول حجت ہے آپ ہی اللہ کی میزان، برہان، اور فرقان ہیں آپ کے لبِ مبارک سے نکلنے والا ہر حرف ہمارے لیے اس زمین پر پہلی اور آخری سند ہے۔ لہٰذا ہم اپنے ہر ناقد کا نہایت فراخ دلی سے استقبال کرتے ہیں ان کی تنقید سے بہت کچھ سیکھتے ہیں۔ ایسے مخلص ناقدین ہمارا اصل سرمایہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سرمایے کی حفاظت اور اس سے محبت کی توفیق عطا فرمائے۔

پاکستانی ریاست اور علماء کا مکالمہ ناکام کیوں ہے؟

غامدی صاحب مساجد مدارس سے علماء کو بے دخل کرنا چاہتے ہیں

افغانستان پر امریکی حملے کے بعد پاکستان کو جس صورتِ حال کا سامنا ہے وہ نہایت گھمبیر ہے۔ پاکستانی ریاست، حکومت، فوج، رائے عامہ کے نمائندے، مذہبی جماعتیں ابھی تک بامعنی حل تک نہیں پہنچ سکی ہیں کیوں کہ یہ مکالمہ کبھی یک طرفہ ہوتا ہے کبھی عالمی اداروں کے دباؤ کے تحت ان کے مقررہ اہداف مقاصد کے لیے کیا جاتا ہے____ اس مکالمے کی ناکامی کا اصل سبب یہ ہے کہ ریاست اسلامی علمیت کے مباحث میں ان لبرل لوگوں کو شریک کر لیتی ہے جو اس علمیت کے بنیادی مقدمات سے واقف ہی نہیں اور یہ مذہب دشمن عناصر ہیں جن میں یہ جرأت تو نہیں ہے کہ مذہب کا صاف صاف انکار کر دیں لہٰذا یہ مذہب کی تشریحات نو کی آڑ میں اس مکالمے کو پیچیدہ، دشوار اور ناممکن بنا دیتے ہیں ان لبرل عناصر کا سب سے بڑا حملہ یہ ہوتا ہے کہ پاکستان ملٹری ملّا اتحاد کے سائے میں ہے اور پاکستانی فوج اسلامی قوتوں کی پُشت پناہی کر رہی ہے لہٰذا تمام لبرل سیکولر عناصر سب سے زیادہ پاکستانی فوج کو ہی بُرا بھلا کہتے ہیں۔

لبرل متجددین کا ریاست کے بارے میں نقطۂ نظر

اسلامی لبرل مفکرین اور متجددین کو بھی یہی شکوہ ہے کہ ریاست ان کے سیکولر بیانیے کے بجائے علماء کے مذہبی بیانیے کو اہمیت دیتی ہے اور شدت پسند تنظیموں کی خاموش سرپرستی کرتی ہے۔ جناب عمار خان ناصر صاحب، جناب جاوید غامدی صاحب، اور جناب سلیم صافی صاحب تو بار بار یہی کہتے ہیں کہ پاکستانی ریاست اور فوج نے TTP اور تمام عسکری مذہبی تنظیموں کی سرپرستی کی اور کر رہے ہیں۔ عمار ناصر

صاحب کا نقطۂ نظر الشریعہ کے جہاد نمبر "جہاد کلاسیکی و عصری تناظر میں" مارچ ۲۰۱۲ء میں اور غامدی صاحب کا نقطۂ نظر ان کی کتاب "مقامات" ان کے مضمون "مذہبی انتہا پسندی" میں پڑھا جا سکتا ہے ریاست سے ان کا مطالبہ یہی ہے کہ وہ جن کی سرپرستی کر رہی ہے ان کو شدت سے کچل دے ختم کر دے بات چیت نہ کرے۔ سلیم صافی بھی بار بار تمام قومی اداروں پر اپنے کالموں میں یہی الزام لگاتے ہیں۔

غامدی صاحب کے یہ الزامات کتنے سچ ہیں اور ان میں کتنا جھوٹ ہے اس کے لیے نادر عقیل انصاری کا مضمون رسالے "جی" میں پڑھ لیا جائے۔ نادر عقیل انصاری صاحب جاوید غامدی صاحب کے شاگرد رشید پاکستانی سول سروس کے بہت اعلیٰ افسر اور غامدی صاحب کے ادارے "المورد" کے صدر رہ چکے ہیں لہٰذا پاکستانی ریاست فوج وغیرہ کے بارے میں غامدی صاحب کی آراء کی حقیقت اور واقعیت وہی بیان کرنے کے اہل ہیں اور ان امور میں ان کا بیان حجت ہے غامدی صاحب کے حلقے سے ابھی تک "جی" اقبال اکادمی کے کا جواب نہیں دیا گیا۔ "جی" احمد جاوید صاحب کی سرپرستی میں شائع ہوتا ہے۔

غامدی صاحب بار بار حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ علماء سے مکالمہ نہ کرے مدارس کو ایک خاص طریقے سے بند کر دے ان کے اسلام کو رد کر دے مساجد پر قبضہ کر کے مساجد میں غامدی صاحب کے خطیب مقرر کر دے اور ملاؤں کے اسلام کو ہمیشہ کے لیے ریاست سے بے دخل کر دے۔ مقامات میں ان کا مضمون "مذہبی انتہا پسندی" پڑھ لیجیے۔

۲۰۰۷ء میں جب لال مسجد کا سانحہ پیش آیا اور اسی دور میں TTP والے خودکش دھماکوں میں مصروف تھے تب ہم نے لال مسجد اور TTP کے حامیوں سے پچاس سوالات پوچھے تھے ان کا کوئی جواب نہیں ملا ہمارے زاہد صدیق مغل بھی اس زمانے میں پاکستان کی ہر مسجد کو لال مسجد بنانے کا سوچ رہے تھے پاکستانی ریاست کے خلاف طالبان کی سرگرمیوں کے دینی، شرعی، عقلی دلائل مہیا کر رہے تھے الشریعہ مارچ ۲۰۱۲ء میں ان کا مضمون اور مباحثے میں ان کی گفتگو پڑھی جا سکتی ہے۔ زاہد صدیق مغل صاحب نے ۲۰۰۷ء کے سوالنامے کا جواب حال ہی میں غلط طریقے سے دینے کی کوشش کی ہے۔

لبرل مفکرین کا نقطۂ نظر: پاکستانی ریاست

حال ہی میں لبرل سیکولر مفکرین کے ایک حلقے میں حالاتِ حاضرہ کے لبرل تجزیات سننے کا موقع ملا تو ان سب کا مشترکہ اعتراض یہی تھا کہ جیش محمد کے مولانا مسعود اظہر کے خلاف چین نے دو مرتبہ ویٹو کیوں استعمال کیا اس کا مطلب یہی ہے کہ پاکستانی ریاست اسلام

سے پیچھا چھڑانا نہیں چاہتی۔ ہمیں یہ اِشارے دیئے جاتے ہیں کہ اسلام ریاست کی اولین ترجیح کسی صورت میں نہیں ہے اسلام ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہےاور غامدی اسلام ہی ریاست کے لیے کسی درجے میں قابل قبول ہوسکتا ہے ریاست لبرل ازم کے فوائد ترقی کے لیے حاصل کرنا چاہتی ہے۔ مگر اسلام کے ذریعے اپنا دِفاع بھی لازمی سمجھتی ہے ایک مقرر کے الفاظ یہ تھے کہ پاکستانی ریاست کے لیے اسلام ایک کمبل بن چکا ہے یہ کمبل پیچھا ہی نہیں چھوڑتا۔ ریاست نے پہلے روس کے خلاف جہاد اسلامی کو کامیابی سے استعمال کیا آخر کار یہ جہاد ریاست اور علماء دونوں کے ہاتھ سے نکل گیا ریاست نے بڑی کوشش کی کہ جہاد صرف افغانستان کی سرحدوں تک محدود رہے یا زیادہ سے زیادہ یہ جہاد مقامی، علاقائی، قومی اور ہندی ہی رہے مگر ایک عالمی تصور کو مقامی علاقائی تک کیسے محدود کیا جاسکتا تھا۔ ریاست نے بلا وجہ توہین رسالت کے قانون کو اختیار کیا اور اپنے مخالفین بلاگرز کو قابو کرنے کے لیے نہایت خوبصورتی سے اس قانون کو استعمال کیا اسلام آباد ہائی کورٹ اچانک متحرک ہوگئی۔ جسٹس شاہد عزیز کو اچانک سول وار کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ عامر لیاقت اچانک ایک ایک لبرل مفکر کا نام لے کر اسے توہین رسالت کا مجرم ثابت کرتے رہے جس کے نتیجے میں تمام آزاد خیال لبرل حلقوں پر موت کی تلوار لٹکا دی گئی ریاست نے اپنے خلاف لبرل عناصر کی تنقید کا منہ تو کامیابی سے بند کردیا لیکن اس کے نتیجے میں عشق رسول کا جذبہ____ پاکستانی ریاست، عدالت، اور علماء کے ہاتھ سے بھی نکل گیا____ مشال خان واقعہ، سیالکوٹ میں تین عورتوں کے ہاتھوں شاتم کا قتل چترال میں عوامی بغاوت اور حب میں عوامی بغاوت ریاست کی غلطیوں کا نتیجہ ہے ریاست اسلام کو اپنے مفاد کے لیے استعمال کررہی ہے غلطی کررہی ہے۔ لبرل حضرات کے اس نقطۂ نظر میں کتنی صداقت ہے وہ فی الحال ہمارا موضوع نہیں سر دست ہم صرف ان کا نقطۂ نظر پیش کررہے ہیں۔

پاکستانی ریاست اسلام سے متعلق مسائل میں PIPS,NGO's کے عامر رانا، عمار ناصر خان، جاوید غامدی، ریاست کے حامی بعض ریاست پسند علماء، بعض سرکاری درباری مولوی اور سلیم صافی، زاہد حسین، افضال ریحان، یاسر پیرزادہ، وجاہت مسعود اور فاروق ندیم پراچہ جیسے لوگوں کے ذریعے اسلام کی جدیدیت کاری کی کوشش کررہی ہے جس کے نتیجے میں دینی حلقوں میں بے چینی اور عوام میں ردعمل کی نفسیات پیدا ہورہی ہے آزادی کے عقیدوں کے خلاف اپریل اور مئی کی چار عوامی بغاوتیں ریاست سے تقاضہ کرتی ہیں کہ وہ ایک بامعنی مکالمے کو ممکن بنائے اور اس میں غیر متعلق لوگوں کو شریک کرکے صورتِ حال کو پیچیدہ نہ کرے۔ ملک کے تمام اہم اداروں کو اس سلسلے میں ان لوگوں سے مکالمہ کرنا چاہیے جو جدید ریاست کی مابعد الطبیعیات سے واقف ہوں جنھوں نے جدید مغربی فلسفے کا مطالعہ کیا ہو جو سرمایہ داری [Capitalism] اور سائنس [Science] و ریاست کے تعلق سے واقف ہوں جو اسلام کی حرکیات اور اسلامی شریعت کے

مباحث سے بھی شد بد رکھتے ہوں اس کے بغیر جعلی مفکرین کو مکالمے میں شریک کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا مکالمے میں شرکت کے لیے تمام اہل علم کو دعوت عام دی جائے ان کے نقطۂ نظر کو سنا جائے سوالات کیے جائیں اور سوالات اُٹھائے جائیں مکالمے میں جسٹس منیر، جسٹس کیانی، پروفیسر عزیز احمد اور تصدق جیلانی جیسے حقیقی لبرلز کو مدعو کیا جائے تا کہ وہ لبرل نقطۂ نظر دو اور دو چار کی طرح بیان کریں۔

ان تمہیدی نکات کے بعد علماء کے سوالات اور ان کے جوابات اگلی قسط میں ملاحظہ کیجئے اس سے پہلے مشال خان کے واقعے پر عمار ناصر صاحب اور زاہد مغل صاحب کے اعتراضات، شبہات سوالات کا تفصیلی جواب دیا جائے گا اس جواب میں علماء کے اکثر سوالات کا جواب بھی خود ہی آ جائے گا جو سوالات باقی رہ جائیں گے اُن پر ہم دوسری قسط میں روشنی ڈالیں گے۔

مشال کے قتل پر ایک عالم دین سے مکالمہ

سید خالد جامعی

فلم کا اثر Video Impact کتنا خطرناک ہوتا ہے؟ بڑے بڑوں کا ایمان خطرے میں پڑ گیا

لبرل ازم کی درندگی اور قتل عام کی تاریخ مشال واقعے سے بھی زیادہ بدترین اور ناقابل بیان ہے

لبرلز، سیکولرز کو اپنے جھوٹ پر یقین تھا، علماء کو عاشقان رسول کے ایمان پر یقین نہیں تھا!

قرآن نے انتباہ کردیا تھا کہ اہل ایمان کے خلاف جب بھی کوئی شہادت کفار اور منافقین کی طرف سے آئے تو اسے سنتے ہی مسترد کردو اور کہہ دو کہ یہ الزام صریح بہتان ہے اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْا بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ لَا تَحْسَبُوْهُ شَرًّا لَّكُمْ بَلْ هُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ مَا اكْتَسَبَ مِنَ الْاِثْمِ وَالَّذِيْ تَوَلّٰى كِبْرَهٗ مِنْهُمْ لَهٗ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ...... لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا وَّقَالُوْا هٰذَآ اِفْكٌ مُّبِيْنٌ [۲۴:۱۱،۱۲]

مشال والے واقعے کے دن امریکہ نے دنیا کا سب سے بھاری بم پھینکا بم نے تین بستیوں کو تباہ اور ہزاروں لوگوں کو قتل کر کے جو تباہی پھیلائی اسکی Video Film امریکہ نے کسی کو بنانے نہیں دی۔ لہٰذا اس بم کی تباہی کسی کو محسوس نہیں ہوئی

عاشقان رسول ﷺ کا غصہ، ویڈیو فلم نے محفوظ کر کے حقیقت حال کو مسخ کر کے رکھ دیا۔ افلاطون نے اسی لیے کہا تھا کہ میری ریاست سے آرٹسٹوں کو نکال دو یہ Third Order Reality تخلیق کرتے ہیں

امریکہ اسی لئے ڈرون حملوں کی فلم جاری نہیں کرتا، بنانے والے کو اسی وقت گولی مار دیتا ہے کیوں؟

مشال کو مارنے والے اسکے قریبی دوست عمران علی نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ مشال، مذہب، رسالت، اسلام سب کی توہین کرتا تھا، اس سے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ واقعے والے دن یونیورسٹی میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ، طلباء اور یونیورسٹی کے عملہ کی ایک ہی آواز تھی گستاخ رسول کی ایک سزا، سر تن سے جدا۔ سر تن سے جدا____ جس پر میرا ایمان ہے اس پر لبیک کہتے ہوئے میں اسکی تلاش میں نکلا میں نے اسے مارا بعد میں حالات یہ تھے کہ ہر بندے نے اسے مارا (جنگ کراچی ۳۰ اپریل ۲۰۱۷)____ عمران علی ان تمام علماء پر بازی لے گیا جنہوں نے یہ نعرے تخلیق کئے تھے وہ خود اس تخلیق کے ایمانی نتائج کا بوجھ نہ اٹھا سکے، ہر عقیدہ قربانی مانگتا ہے، آپ قربانی دینے پر تیار نہیں۔ آپ سے اچھا تو لبرل ازم کا سب سے بڑا فلسفی John Rawls اور، اس کا شارح Derben ہیں جنہوں نے لکھا کہ جو آزادی کے عقیدے، جمہوریت، آئین، دستور کو نہیں مانتا اس کی عقلی دلیل مانگتا ہے اسے گولی مار کر جان سے مار دو، اسے اس طرح ختم کردو جس طرح جنگوں اور جراثیم کو ختم کردیا جاتا ہے۔

That there are doctrines that rejects one or more democratic freedom is itself a permanent fact of life, or seems so. This gives us the practical task of containing them__like war and disease __ so that they do not overturn political justice [John Rawls, Political Liberalism, New York : Columbia University Press, 2005, p.64]

if one does not see the virtue of that .ideal, then I do not know how to convince him. To be perfectly blunt,sometimes I am asked,when I goaround speaking for Rawls, What do you say to an Adolf Hitler? the answer is [nothing]. You shoot him. You do not try to reason with him. Reason hasno bearing on this question. So I do not want to discuss it (Burton Derben on Rawls & Political Liberalism *in the cambridge companion to Rawls* [ed.S.R.,Freeman] UK: Cambridge University Press USA 2003 Page 328-329)

افغانستان میں دنیا کا سب سے بڑا بم مشال والے واقعے کے دن گرایا گیا

ہزاروں لوگوں کے مرنے کا واقعہ غیر اہم ہو گیا! مشال خان کا واقعہ سب سے اہم ہو گیا۔ کیوں؟

(ایک محترم عالم دین سے مشال خان واقعے کے بارے میں تفصیلی گفتگو ہوئی اس گفتگو کو لفظ بہ لفظ یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔ گفتگو کے بعض اہم تاریخی اشارات کی تفصیل اور حوالہ جات معہ انگریزی عبارات کا اضافہ قارئین کی معلومات کے لیے کیا گیا ہے۔ تاکہ گفتگو ایک مضمون کی شکل اختیار کرلے اور لبرل ازم کی درندگی وحشت بربریت اپنے تاریخی تناظر میں نکھر کر سامنے آئے)

ایک بہت بڑے عالم دین نے مشال خان واقعے پر ایک بیان دیا اور ایک مضمون لکھا جس میں کہا گیا تھا کہ "مردان یونیورسٹی کے ہولناک واقعے نے دنیا بھر میں پاکستان کو بدنام کیا اور ہمارے سر شرم سے جھکا دیے۔اسلام کسی کو اس طرح مارنے کی اجازت نہیں دیتا۔حکومت کو سوچنا چاہیے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے؟اسکی وجہ کیا یہ تو نہیں ہے کہ حکومت نے آج تک توہین رسالت کے کسی سزا یافتہ مجرم کو پھانسی کی سزا نہیں دی ۔آسیہ بی بی کی سزا ملتوی ہو رہی ہے ،جیلوں میں کئی مجرم پھانسی کے منتظر ہیں"۔

راقم نے اپنا مضمون "پاکستانی میڈیا کیا کام کرتا ہے،اسکا علاج کیا ہے؟" حضرت والا کو ارسال کیا تو ان کا فون آیا اور حضرت نے کہا کہ یہ مضمون بہت اہم ہے ،ہم نے قندیل بلوچ اور مشال خان واقعے کو آپ کے مضمون میں اٹھائے گئے سوالات کی روشنی میں سرے سے نہیں دیکھا _____ آپ کے تمام دلائل سب کی آنکھیں کھولنے کے لئے کافی ہیں لیکن مشال خان کی جو فلم ہے اس کا کیا جواب دیا جائے۔ لوگ پوچھتے ہیں یہ فلم دیکھی ہے،اتنی بہیمیت ،اتنی بربریت ۔راقم الحروف نے عرض کیا جس دن مشال خان کو مردان یونیورسٹی میں قتل کیا گیا ٹھیک اسی دن ،اسی وقت امریکہ نے افغانستان کے صوبے ننگرہار کے ضلع آچن میں دنیا کا سب سے بڑا وزنی بم GBU-43/B گرایا جس کی آواز چار ملکوں میں سنی گئی۔

US forces in Afghanistan on Thursday struck a militant Islamic State (IS) tunnel complex in eastern Afghanistan with "the mother of all bombs," the largest non-nuclear weapon ever used in combat by the US military, Pentagon officials said.The bomb, known officially as a GBU-43B, or massive ordnance air blast weapon, unleashes 11 tons of explosives.

In its 2003 review of the legality of using the bomb, the Pentagon concluded that it could not be called an indiscriminate killer under the Law of Armed Conflict.

"Although the MOAB weapon leaves a large footprint, it is discriminate and requires a deliberate launching toward the target," the review said, using the acronym for the bomb.

Adam Stump, a Pentagon spokesman, said the bomb was dropped from a U.S. MC-130 special operations transport. He said the bomb had been brought to Afghanistan "some time ago" for potential use.

"This is the right munition to reduce these obstacles and maintain the momentum of our offensive against ISIS-K," he added, using the US military's acronym for the IS affiliate.

White House spokesman Sean Spicer said IS fighters had used the tunnels and caves in Achin to maneuver freely.[Dawn/AFP 14.04.2017]

داعش کے چھتیس جنگجوؤں کو قتل کرنے کے لئے ایک پوری بستی ،ایک پوری ہنستی بستی آبادی ،درختوں ،پودوں ،جانوروں ،عورتوں ،بچوں کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ،اس بستی کے چشمے ،دریا ،ندی ،نالے ،ماحولیات سب زہریلے مادوں سے سو سال تک کے لئے آلودہ ہو گئے ۔سینکڑوں یا شاید ہزاروں لوگ مارے گئے ،مرنے والوں میں تیرہ ہندو بھی ہیں جن کا داعش سے کوئی تعلق نہیں تھا لیکن ہندوستان نے بھی اس پر احتجاج نہیں کیا ،آگ لگنے کے بعد جلتے ہوئے

جانور، آگ میں جلتے ہوئے گھر، دھماکے سے مجروح مضروب ہونے والی عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جانوروں، پرندوں کی چیخ و پکار ــــــ یہ سب چھپا دی گئی ــــــ ابھی تک امریکی فوجی حکام اور افغان حکومت نے دنیا کے سب سے بڑے بم کو گرائے جانے کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کو دنیا سے چھپایا ہوا ہے۔ ناٹو ہیلی کاپٹروں کے آپریشن کے ذریعے تمام لاشوں کو بمباری کے مقام سے ہٹا دیا گیا ہے مگر کسی کو معلوم نہیں کہ یہ لاشیں افغانستان میں ہی موجود ہیں یا پھر ان پر بم کے اثرات جانچنے کے لئے انہیں کسی دوسرے ملک میں پہنچا دیا گیا ہے۔ تمام لاشوں کو جائے وقوع سے ہٹانے کے بعد وہاں کی تصاویر اور ویڈیو جاری کر دی گئی ہے جس میں متاثرہ علاقے میں جلے ہوئے درخت اور فصلیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ افغان اور امریکی حکومت اور ان کے زیر اثر میڈیا صرف اور صرف GBU-43/B کی تعریفوں میں رطب اللسان ہے۔ امریکی حکام کی جانب سے جاری کی گئی تصاویر اور ویڈیو کے مطابق زرعی پیداوار اور درختوں کی تباہی واضح طور پر دیکھی جا سکتی ہے جبکہ کئی احاطوں اور گھروں کی چھتوں کی تباہی بھی واضح ہے گھر کے مکینوں کا کسی کو علم نہیں ہے۔ امریکی اور افغان حکام صرف اور صرف سرنگوں کی بات کرتے ہیں مگر اسد خیل، تنگائی اور لانسائی احمد میں رہنے والے افغان دیہاتیوں کے بارے میں سب خاموش ہیں۔ پہلے امریکی حکام نے کہا تھا کہ اس بم سے ۳ کلومیٹر قطر میں آئی ہوئی ہر شے ختم ہو جاتی ہے مگر اب کہا جا رہا ہے کہ یہ ہلاکت آفرینی ۲ کلومیٹر تک تھی۔ بھارتی میڈیا کے مطابق مارے جانے والوں میں ۱۳ بھارتی باشندے بھی تھے۔

<u>افغانستان میں ہزاروں لوگ مرے مگر اس کی ویڈیو فلم جاری نہیں کی گئی</u>

لہٰذا یہ بدترین دہشت گردی نہ لبرل مفکرین کو نظر آئی نہ اسلام پسندوں کو

امریکہ نے اس حملے کے بعد تباہی کی کوئی ویڈیو فلم جاری نہیں کی، اسی لئے دنیا کے کسی مفکر اسلام، کسی عالم دین، کسی لبرل، سیکولر کو یہ واقعہ اہم نظر نہیں آیا مگر اسی دن مشال خان کا واقعہ پوری دنیا کا مرکزی موضوع بن گیا۔ علماء نے بھی اسی واقعے کو اہمیت دی کیونکہ ضلع آچن میں ہونے والی دہشت گردی کی امریکہ نے کوئی ویڈیو جاری نہیں کی نہ کسی کو اسکی ویڈیو بنانے دی گئی لہٰذا آپ جیسے عالم دین کو بھی تاریخ انسانی کا اتنا بڑا واقعہ غیر اہم نظر آیا، اسکے بارے میں آپ کا اور دیگر جدیدیت پسند علماء کا جو مشال کے حامی بن گئے ہیں کوئی بیان نہیں آیا سب کو صرف اور صرف مشال خان کا واقعہ یاد رہ گیا ــــــ صرف اس لئے یاد رہ گیا کہ اس کی ویڈیو فلم بن گئی تھی۔ اگر وہ فلم نہ بنتی تو کبھی ــــــ آپ مشال خان کو شہید نہ کہتے۔

مشال خان والے واقعے کی سفاکی کا افغانستان میں ہونے والی درندگی، سفاکی سے کوئی موازنہ نہیں لیکن دنیا کو دنیا کے سب سے وزنی بم کے گرنے سے ہونے والے نقصانات کا کوئی علم نہیں لیکن پوری دنیا کو مشال خان واقعے کا علم ہے۔ اس واقعے کی ہر ایک مذمت کر رہا ہے جس میں صرف ایک شخص ہلاک ہوا ہے اور بم والے واقعے کی کوئی مذمت نہیں کر رہا جس میں سینکڑوں، ہزاروں لوگ ہلاک ہوئے اسکی وجہ آزادی کا پجاری میڈیا اور عالمی استعمار ہے وہ جسے دہشت گرد کہنا چاہیں گے ثابت کر دیں گے جس موضوع کو اہم بنانا چاہیں گے اہم ثابت کر دیں گے اور بڑے سے بڑے حادثے اور سنگین دہشت گردی کو ایک معمولی واقعہ ثابت کریں گے یہ میڈیا وار ہے میڈیا عالمی استعماری قوتوں کا ایجنٹ ہے اس کا مقصد صرف اپنے منافع میں اضافہ ہے اور اسلام کی حمایت سے منافع میں اضافہ نہیں ہو سکتا البتہ منافع میں یقیناً کمی ہو سکتی ہے۔ کیوں کہ اسلامی علمیت کی use value تو ہے مگر اس علمیت کی کوئی Exchage Value نہیں ہے لہٰذا کسی کو اس سے دلچسپی نہیں ہے۔

افسوس ہے کہ عالم اسلام ابھی تک ان مسائل و مباحث کو سمجھ ہی نہیں سکا۔ ہم نے محترم عالم دین سے عرض کیا کہ آپ سے کیا شکوہ کیا جائے ہمارے عالم اور فلسفی دوست تک اسی ویڈیو فلم کو دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے جنہوں نے ساری زندگی فلسفہ پڑھنے، پڑھانے اور میڈیا کی مابعد الطبیعات پر غور و فکر میں گزار دی وہ بھی میڈیا اور فلم کی پیدا کردہ Third order reality سے اتنے متاثر ہوئے کہ فلسفہ، منطق اور میڈیا پر تنقید کے اصول سب ہی بھول گئے تو

ہم ،آپ سے کیا شکوہ کریں۔

ایک ویڈیو فلم نے بڑے بڑوں کے عشق رسول کا خاتمہ کر دیا

ویڈیو فلم اگر نہ بنتی تو ہمارے دوست عالم دین زاہد صدیق مغل جیسے فلسفی کو یہ کہنے کی ضرورت نہ پڑتی کہ مشال خان واقعے کے قاتلوں کو ہیرو نہ بننے دیا جائے۔ ہمارے محترم فلسفی اور عالم دین محبوب الحسن بخاری یہ سوال نہ اٹھاتے کہ مشال خان کو قتل کرنے والوں کے پاس توہین رسالت کا کیا ثبوت تھا۔ثبوت کے بغیر تو کسی کو نہیں مارا جا سکتا یہ قرآن کا حکم ہے۔صوفی احمد جاوید صاحب فرما رہے تھے کہ درندوں کو عشق رسالت کی نگہبانی نہیں دی جاسکتی۔انہیں دکھ تھا کہ وہ مردان یونیورسٹی کے بہیمانہ واقعے پر کھل کر آزادانہ اظہار خیالات کر کے ان دہشت گردوں کی مذمت نہیں کر سکے۔اپنے دکھ کا اظہار انہوں نے اپنے فیس بک پیج پر ایک پوسٹ میں کیا کہ "میں کبھی کبھی دعا کرتا ہوں کہ اللہ مجھ ناچیز کو ایمان وعمل کی سلامتی کے ساتھ ڈاکٹر پرویز ہود بھائی کی سی جرات اور درویشی عطا کرے "۔ہود بھائی کو درویش کہنا اس اصطلاح کی توہین ہے لیکن مشال خان کی حمایت میں احمد جاوید صاحب بہت آگے چلے گئے ہیں۔ یہ سب اس فلم کا ردعمل ہے جس نے ان فلاسفہ اور علماء کی سوچنے ،سمجھنے کی صلاحیتوں کو سلب کر لیا ہے یہ تصویر کا اثر ہے اسی لئے تصویر امت کے جماع سے حرام ہے اور تمام الہامی مذاہب میں تصویر حرام رہی ہے۔تصویر کے حامیوں کو اس اجماع اور حکم کی حکمت اب سمجھ میں آ گئی ہوگی۔

ہم نے حضرت سے عرض کیا کہ تین ہزار عاشقان رسول ﷺ کے ساتھ کوئی کھڑا نہیں ہوا، دومنٹ کی ایک فلم نے بڑے بڑوں کا عشق رسول نکال دیا ۔اگر ،مگر ،چونکہ ،چنانچہ ،کیا حکم ہے لیکن ،ولیکن سب کی زبانیں لڑکھڑا گئیں ،ہاتھ پاؤں پھول گئے ،یہ تصویر کی طاقت ہے تمام تہذیبوں میں تصویر اسی لئے حرام تھی کہ یہ حقیقت کو مسخ کر دیتی ہے۔افسانے کو حقیقت بنا دیتی اور ظالم کو مظلوم اور تمام مظلومین کو ظالم ٹھہرا دیتی ہے۔مشال واقعے میں ایسا ہی ہوا۔وہ علماء جو تصویر کو حلال کر رہے ہیں وہ جان لیں کہ تصویر کتنا خطرناک کام کرتی ہے۔

آزادی پر ایمان رکھنے والے میڈیا نے بغیر ثبوت کے اعلان کر دیا کہ مشال بے گناہ تھا اس نے توہین رسالت کا ارتکاب نہیں کیا اور ہمارے بعض علماء ،تین ہزار عاشقان رسول سے توہین رسالت کا ثبوت مانگ رہے تھے۔میڈیا کا ایمان ان علماء سے ہزار درجہ بہتر تھا۔توہین رسالت ﷺ کے اتنے بڑے مجرم کی بے گناہی کا انہیں یقین تھا،تین ہزار لوگوں کے عشق رسول کا یقین نہیں تھا۔

لبرل ازم ،انسانی حقوق کے منشور کے ذریعے ____ ہر شخص کو بکواس کرنے کی آزادی دیتا ہے مگر اس بکواس کو سن کر مشتعل ہونے والوں کو مشتعل ہونے کی آزادی نہیں دیتا وہ بکواس کرنے والے کے تمام جذبات کو اظہار کے مواقع دیتا ہے اور اس بکواس پر مشتعل ہونے والوں کو اپنے جذبات کے اظہار کے مواقع نہیں دیتا ،اسے انسانیت دشمنی ،بہیمیت ،سفاکی قرار دیتا ہے اور اس طرح آزادی کے عقیدے کو الحق ثابت کرتا ہے اگر ہر شخص کو اپنے گندے جذبات و خیالات کے اظہار کا حق حاصل ہے تو تین ہزار طلباء کو بھی اپنے جذبات کے اظہار کا حق حاصل ہے اگر مشتعل کرنے کی آزادی ہے تو مشتعل ہونے والوں کو بھی سب کچھ کرنے کی آزادی ہونی چاہیے۔ یہ منطقی اصول اور عقلی رویہ ہے یا نہیں؟ تمام لبرل اور متجدد مولوی جدیدیت کے ڈسکورس میں اس سوال کا جواب دینے کے پابند ہیں یہ سوال ہی ___ اصلاً سوال کا جواب ہے۔

اگر رجم کی سزا کی ویڈیو جاری ہو جائے تو لوگ رجم کی سزا کے بھی خلاف ہو جائیں گے

افلاطون نے اسی لیے کہا تھا کہ اپنی ریاست سے آرٹسٹوں کو نکال دوں گا

افلاطون [Plato] نے Republic میں کہا تھا کہ میں اپنی ریاست سے آرٹسٹوں کو نکال دوں گا یہ Third order Reality تخلیق کرتے ہیں۔افلاطون کا ایمان و یقین ہمارے بہت سے اہل ایمان سے اچھا تھا۔

اگر حضرت غامدیہ کو رجم کرنے کی فلم جاری کردی جاتی تو بہت سے جدیدیت پسند علماء جو مشال خان کی ایک منٹ کی فلم سے متاثر ہو گئے وہ رجم کی سزا کو بھی (نعوذ باللہ) ظلم عظیم، انسانیت دشمنی اور آزادی کے عقیدے کے خلاف ورزی قرار دیتے اور پوچھتے کہ اس فلم کا ہم جواب کیا دیں؟ دوسرے معنوں میں جس چیز کا جواب نہ ہو وہ چیز مذہب کا حصہ ہی نہیں ہوتی اس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر سوال کا جواب جاننا یا دینا لازمی ہے۔ توقف، لاادری کہنا غلط ہے۔

اللہ تعالیٰ کو یہ علم تھا کہ زانی، زانیہ کو رجم، سنگسار کرتے ہوئے یا اسی کوڑے مارتے ہوئے بڑے بڑوں کا دل دہل جائے گا لہذا سورۃ نور کی دوسری آیت میں تمام اہل ایمان کو حکم دیا گیا کہ مجرموں، بدکاروں پر یہ سزا نافذ کرتے ہوئے تمہارے دل میں مجرموں کے لئے ہمدردی اور ترس کے جذبات ہرگز پیدا نہ ہوں۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِي فَاجْلِدُوا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَّلَا تَأْخُذْكُمْ بِهِمَا رَأْفَةٌ فِي دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ [24:2]۔ رجم ایسا عمل ہے کہ بڑے بڑوں کا دل دہلا سکتا ہے۔ ایک عورت کو مٹی میں نصف دبا دیا گیا ہے، اسکو پتھروں سے قتل کیا جا رہا ہے، ایک پتھر اسکی آنکھ پر پڑتا ہے اور خون کا فوارہ بہنے لگتا ہے، ایک پتھر اسکے سر پر پڑتا ہے اور اسکا بھیجا باہر نکل آتا ہے، ایک پتھر اس کے ہونٹ پر پڑتا ہے اور فضاء میں اس کے دانت اڑتے ہوئے چلے جاتے ہیں، اسکا پیٹ، اسکے اعضاء پتھروں سے ریزہ ریزہ ہو رہے ہیں۔ خون کی ندی بہہ رہی ہے، فوارے ابل رہے ہیں، جسم لہولہو ہے۔ کیا اللہ کی شریعت پر یہ عمل بہیمیت ہے، وحشت ہے، درندگی ہے؟ یا اللہ کے حکم کی خلاف ورزی، زنا کرنا سب سے بڑی بہیمیت، درندگی ہے؟ افسوس ہے کہ ہمارے جدیدیت پسند علماء مشال خان کی ویڈیو فلم دیکھ کر جذبات کی رو میں بہہ گئے ایسے ہی کمزوروں کی ایمان کی سلامتی کے لئے شریعت نے تصویر کو حرام کیا تھا_____ انہیں تین ہزار طلباء کا جرم بہیمیت و درندگی نظر آیا_____ اسکے مقابلے میں توہین رسالت کا جرم بہت معمولی، کمزور نظر آیا_____ یہ امت اپنے عقیدے کی جنگ ہار گئی ہے۔ رحم، ترس اور رافت کے جذبے نے خالق کے حکم اور محبت پر مخلوق کی محبت کو ترجیح دلا دی ہے یہی انسانیت پرستی Humanism ہے۔ اسی لئے سب کہہ رہے ہیں ہمارا مذہب انسانیت پرستی ہے۔ مشال بھی خود کو Humanist لکھتا تھا۔

انسانیت پرستی کا جدید مغربی عقیدہ آزادی کے باطل عقیدے کے ساتھ ہمارے راسخ العقیدہ حلقوں میں بھی سرایت کر رہا ہے یہ توبہ، استغفار، اور تجدید ایمان کا وقت ہے۔

<u>کسی کو قتل کرنا اتنا بڑا جرم نہیں اصل جرم اللہ اور اس کے رسول کی توہین ہے:</u>

اسلام نے اسی لیے فتنہ کو قتل سے بدتر جرم قرار دیا ہے

سب سے بڑا ظلم اللہ اور اسکے رسول ﷺ کے احکامات کی خلاف ورزی ہے۔ اس سے بڑا ظلم کوئی نہیں۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے شرک کو "ظلم عظیم" قرار دیا ہے، شرک کی بدترین شکل یہ ہے کہ کسی مسلمان کو اللہ اور اسکے رسول کے کسی حکم پر عمل بہیمیت، درندگی، وحشت، انسانیت دشمنی نظر آئے اور شریعت کے کسی حکم یا ایمانی غیرت کی پکار___ پر عمل کرنے والا ان کی نظروں میں قاتل، ظالم، ذلیل وحقیر، مجرم، ملزم قرار پائے_____ شرک کی بدترین شکل یہ ہے کہ اللہ اور اسکے رسول ﷺ سے شدید محبت رکھنے والا، اللہ اور رسول ﷺ کی بے پناہ محبت میں اسکے رسول ﷺ کی اہانت کرنے والے کسی شخص کو کوئی قتل کردے تو اجماع امت کی پیروی میں اس شخص کو قصاص میں قتل ہونے سے بچانے کے بجائے عاشق رسول کو_____ درندہ، وحشی قرار دیا جائے۔ جو عاشق رسول سے محبت نہیں رکھتا اس کا ایمان کیسے معتبر ہو سکتا ہے۔ تین ہزار لوگ مجرم، درندے تھے صرف ایک شخص انسانیت اور شرافت کا پیکر تھا یہ معاملہ ہی منطقی طور پر غلط ہے اور عقلاً محال ہے۔ مردان یونیورسٹی کے تین ہزار لوگ اتنے وحشی نہیں ہو سکتے کہ بلاوجہ ایک شخص پر پل پڑے ہوں۔ مشال خان کی زندگی اور افکار، اسکے کمرے کا ماحول اور تصویریں اسکی مذہب دشمنی کا چلتا پھرتا اشتہار ہیں۔ وحشی وہ تھا جو اہانت رسول کا مجرم تھا۔ وحشی عاشقان رسول نہیں تھے۔

اللہ کے رسول ﷺ کی اہانت، توہین اتنا بڑا جرم ہے کہ اس سے ارض وسماء میں زلزلہ آجاتا ہے، اسی لئے عہد رسالت ﷺ سے لیکر خلافت عثمانیہ تک جس صحابی

اور جس شخص نے توہین رسالت کے مجرم کو عدالت اور استغاثہ و قاضی کے بغیر خود قتل کر دیا اس پر نہ رسالت مآب ﷺ نے حد جاری کی نہ کسی قاضی نے اسے قصاص میں قتل کیا۔ خون کو ھـــدر کر دیا گیا اس امر پر امت کا ___ رسالت مآب ﷺ کی زندگی سے لیکر خلافت عثمانیہ کی موت تک۔ ایمانی روحانی، نورانی، عملی، علمی اجماع ہے یہ باب حدود و تعزیرات اور باب قضاء کا مسئلہ ہی نہیں ہے یہ باب ایمان کا مسئلہ ہے مارنے والے سے کبھی نہ رسالت مآب ﷺ نے ثبوت مانگا نہ قاضی نے۔

اسلامی علمیت میں اہل سنت والجماعت کی علمی روایت میں توہین رسالت ﷺ کے سلسلے میں توہین کے الفاظ کو سننے والے اور اس پر مشتعل ہو کر قتل کرنے والے _____ کا اثر ہی موثر مانا گیا۔ عاشق رسول کا عمل ہی حجت ہے، اس کا فعل ہی ثبوت ہے یہ فقہ کا نہیں بابِ ایمان کا مسئلہ ہے۔ جس پر فقہی اعتراضات وارد نہیں ہوتے۔ کوئی مسلمان توہین کا جھوٹا الزام لگا کر کسی مسلمان تو کیا کسی کافر کو بھی قتل نہیں کر سکتا۔ امت کا اجماع اسی نقطہ نظر کی ترجمانی کرتا ہے، اجماع ماخذ دین ہے ہم اپنے ماخذ دین کو رد نہیں کر سکتے۔ اسی لیے غامدی صاحب اپنے ''جوابی بیانیے'' میں یہی لکھتے ہیں کہ اسلام کی وہ تعبیر جو مدارس میں علماء پڑھا رہے ہیں اصل فتنہ یہ ہے کہ اس مذہبی تعبیر کو غامدی صاحب کی جدید تعبیر سے بدل دیا جائے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ مدارس میں پڑھائی جانے والی دینی علمیت ہی ضلالت و جہالت ہے اس کا خاتمہ کئے بغیر دنیا پر امن نہیں ہو سکتی۔

ہم نے عرض کیا علماء نے جو اسلام ہمیں بتایا ہے اور جو اسلام امہات کتب میں بیان ہوا ہے۔ جس پر امت کا اجماع ہے اس میں توہین رسالت صرف گناہ جرم ضلالت اور گمراہی نہیں ہے بدترین فتنہ ہے اس کے مقابلے میں کسی کو قتل کرنا بھی اتنا بڑا جرم نہیں ہے اسی لیے اسلام نے واضح کر دیا ہے کہ فتنہ قتل سے بھی بدترین اور نا قابل معافی جرم ہے ''الفتنه اشد من القتل''

حضرت عمرؓ کے بیٹے حضرت عبیدؓ نے حضرت عمرؓ کے قاتل ابو لولو کو قاضی کی اجازت کے بغیر قتل کیا حضرت عبید کے اس عمل کو درست تسلیم نہیں کیا گیا کیوں کہ یہ قتل شاتم رسول کا قتل نہیں تھا لہٰذا اس کے احکامات شاتم رسول کے قتل سے یکسر مختلف تھے حضرت عبیدؓ کو قصاص میں قتل کرنے کی اجازت حضرت عثمانؓ نے ابو لولو کے ورثا کو دی مگر توہین رسالت پر قتل کرنے والے کسی غیرت مند فرد کو کبھی قصاص میں قتل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی بلکہ کبھی رسالت مآب ﷺ نے۔ خلفائے راشدین نے اور عثمانی قاضی نے یہ بھی نہیں کہا کہ تم نے یہ قتل کیوں کیا، ہمیں بتاتے آئندہ احتیاط کرنا ورنہ سزا ملے گی، ہم موجود ہیں ہم خود اسے سزا دے دیتے، اسے پکڑ کر لے آتے۔۔۔۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ یہ امت جناب رسالت مآب ﷺ کی امت ہے آپ آخری پیغمبر ہیں، آپ کے بعد کوئی رسول نہیں آئے گا لہذا ذات رسالت مآب ﷺ کے پیغام، کلام کی حفاظت ہی نہیں آپ کی حرمت، عزت کی حفاظت بھی قیامت تک فرض ہے۔ اسلام نے لوگوں کو توہین کے مجرم کو مارنے کا حکم نہیں دیا لیکن اگر کوئی صاحب ایمان اس فریضہ کی ادائیگی میں عشق رسول ﷺ کے جذبے کے تحت کسی شاتم رسول کو قتل کر دیتا ہے تو امت کا اجماع اس عاشق رسول کی زندگی کی حفاظت کرتا ہے اگر عاشق رسول کی زندگی محفوظ نہیں ہے تو اس زمین پر عشق رسول کے تمام علمی عملی ماخذات بھی خطرے ہیں ہیں۔ جب یہ سب خطرے ہیں ہیں تو اس امت کا ایمان بھی خطرے میں ہے۔

مشال کو مارنے والے اسکے قریبی دوست عمران علی نے عدالت کے سامنے بیان دیا کہ مشال، مذہب، رسالت، اسلام سب کی توہین کرتا تھا، اس سے تعلقات منقطع کر لئے تھے۔ واقعے والے دن یونیورسٹی میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ، طلباء اور یونیورسٹی کے عملہ کی ایک ہی آواز تھی گستاخ رسول کی ایک سزا، سرتن سے جدا ۔سرتن سے جدا ____ جس پر میرا ایمان ہے اس پر لبیک کہتے ہوئے میں اسکی تلاش میں نکلا میں نے اسے مارا بعد میں حالات یہ تھے کہ ہر بندے نے اسے مارا (جنگ کراچی ۳۰ اپریل ۲۰۱۷) دوسرے اخبارات میں یہ جملہ بھی آیا ہے کہ اگر میرا باپ بھی رسالت مآب کی توہین کرتا تو میں اسے بھی قتل کر دیتا ____ عمران علی ان تمام علماء پر بازی لے گیا جنہوں نے یہ نعرے تخلیق کئے تھے وہ خود اس تخلیق کے ایمانی نتائج کا بوجھ نہ اٹھا سکے، ہر عقیدہ قربانی مانگتا ہے، آپ قربانی دینے پر تیار نہیں۔ آپ سے اچھا تو لبرل ازم کا سب سے بڑا فلسفی John Rawls اور، اس کا شارح Derben ہیں جنہوں نے لکھا کہ جو آزادی کے عقیدے، جمہوریت، آئین، دستور کو نہیں مانتا اس کی عقلی دلیل مانگتا ہے

اسے گولی مار کر جان سے ماردو، اسے اس طرح ختم کردو جس طرح جنگوں اور جراثیم کو ختم کردیا جاتا ہے۔

لبرل ازم ہر شخص کو بکواس کرنے کی مکمل آزادی دیتا ہے

مگر اس بکواس پر مشتعل ہونے کی آزادی کسی کو نہیں دیتا

قرآن وسنت کے تمام احکام سب کو مشال خان واقعے پر یاد آگئے لیکن قرآن وسنت کا کوئی حکم کسی کو افغانستان کے صوبے میں ہونے والی تازہ ترین ،بدترین دہشت گردی پر یاد نہیں آیا ہم نے ان عالم دین کی خدمت میں عرض کیا کہ آپ تمام حضرات کے سوالات اور اعتراضات غالب ڈسکورس کی غالب عقلیت Dominant Discourse کے پیدا کردہ سوالات ہیں آپ مغرب کے منہاج علمی ،مغرب کے پیدا کردہ ڈسکورس میں کھڑے ہو کر تعقل محض Pure Reasoning کے ذریعے اسلامی علمیت ،اسلامی منہاج اور اسلامی ڈسکورس کے بارے میں سوالات اٹھارہے ہیں یہ طریقہ کار ہی بنیادی طور پر غلط ہے یہ Idea of incommensurability ہے۔اصولی طور پر جب ایک ڈسکورس یعنی اسلام غالب ہی نہیں ہے اس مغلوب ڈسکورس کی حرکیات ،احکامات پر غالب ڈسکورس کی روشنی میں سوال اٹھانا ہی غلط ہے وہ ڈسکورس جب موجود ہی نہیں کسی ریاست میں علماً اور عملاً نافذ العمل ہی نہیں اس پر اعتراضات کرنا بھی غیر علمی رویہ ہے۔

دو مختلف مناہج و ڈسکورس کو ملایا نہیں جاسکتا یہ تو اصطفائیت اور انتخابیت [Eclecticism] ہے جسے فلسفے کی دنیا میں کمزور ترین فلسفہ سمجھا جاتا ہے۔خطبات اقبال اسی اصطفائیت کا شاہکار ہے اسی لیے فلسفے کی دنیا میں اس کتاب کی کوئی اہمیت نہیں کوئی فلسفی اس کتاب کا حوالہ فلسفے کے مباحث کے سلسلے میں نہیں دیتا۔خود علامہ اقبال مرحوم نے جو سچے عاشق رسول تھے اپنی زندگی میں اس اکتاب کے تمام مباحث سے رجوع کرلیا تھا لیکن آج بھی تمام لبرلز اسی کتاب کے خطبہ اجتہاد کا حوالہ دے رہے ہیں تفصیلات کے لیے امام غلام محمد میارا بزم بر ساحل که آنجاامالی غلام محمد پر اقبال اکادمی اور ساحل کے مباحث اور سہیل عمر کی کتاب ''خطبات اقبال نئے تناظر میں'' ملاحظہ کیجیے۔آپ اسلام اور مغرب کے دو متضاد مخالف مناہج کو مخلوط نہیں کرسکتے یہ طریقہ کار غلط ہے۔

رچرڈ رارٹی نے لکھا امریکہ نے جرائم کیے ہیں مگر ہم نے اپنے آپ کو معاف کردیا ہے

ہم نے حضرت سے عرض کیا اگر آپ حضرات اسلامی علمیت ،اسلامی تہذیب و تاریخ میں کھڑے ہوتے تو کبھی یہ سوالات اٹھا ہی نہیں سکتے تھے۔آپ نے اسلامی شریعت ،اجماع امت ،اسلامی تاریخ میں توہین رسالت کے واقعات کو اسلامی علمیت کی روشنی میں دیکھنے ،پڑھنے ،جانچنے ،پرکھنے کی کوشش ہی نہیں کی ،آپ نے میڈیا اور لبرل ازم کے زیر تسلط آزادی کے عقیدے کے منہاج اور ڈسکورس میں کھڑے ہو کر غامدی صاحب کی طرح توہین رسالت کے اس واقعے پر سوالات اٹھارہے ہیں جو بالکل باطل اور فاسد طریقہ کار ہے۔اسلام تو مغرب کے عقیدہ آزادی کو تسلیم ہی نہیں کرتا اسلام میں صرف بندگی ،عبدیت اللہ کی غلامی کا عقیدہ پایا جاتا ہے ،آزادی کا عقیدہ تو انسان کو خدا کے مقام پر فائز کرتا ہے اسی لئے رچرڈ رارٹی نے اپنی کتاب Achieving our Country میں نہایت بے شرمی سے لکھا ہے کہ

وہ لوگ جو امریکہ کی خونی تاریخ پر شرمندہ ہیں ماضی میں اس کے جبر ظلم بہیمیت درندگی پر شرم سار ہیں ان کو شرمندہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہم نے غلطیاں کی ہیں لیکن ہم نے اپنے آپ کو معاف کر دیا ہے ۔امریکہ اپنی خدائی کا اعلان کررہا ہے اور آزادی کا عقیدہ ہر فرد کو خدائی کے مرتبے پر فائز کررہا ہے۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ تعقل غالب کے تسلط نے آپ کے سوچنے ،سمجھنے کے پیمانے تک غیر شعوری طور پر تبدیل کردئے ہیں۔آپ اسی طرح سوچ رہے ہیں جس طرح مغرب سوچ رہا ہے______ آپ نے مغرب کے تخلیق کردہ پیمانوں کو اختیار کرلیا ہے ان پیمانوں پر آپ کو اسلام ،اسلامی علمیت ،عشق رسول ﷺ اور توہین رسالت پر لوگوں کا اشتعال غیر فطری ،غیر عقلی ،غیر منطقی نظر آرہا ہے ظاہر ہے مغرب کے منہاج ،ڈسکورس کے تناظر میں تو یہ نتائج بالکل

درست ہیں مگر اسلامی علمیت اور اجماع امت کی روشنی میں آپ حضرات کے نتائج سو فیصد غلط ہیں۔مغرب کو پڑھتے پڑھتے ،مغرب پر تنقید کرتے کرتے آپ حضرات خود مغرب کے رنگ میں رنگے جاچکے ہیں۔نطشے نے بالکل درست کہا تھا کہ بھوت سے لڑنے والے،بھوت سے لڑتے لڑتے آخر کار خود ہی بھوت میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔یہ مغرب کے غلبے کی طاقت ہے۔

"The who fights with monsters might take care lest the thereby become a monster. And if you gaze for long into an abyss, the abyss gazes also into you" Nietzsche, Friedrich

امریکہ ڈرون حملوں کی ویڈیو فلم کیوں جاری نہیں کر رہا؟

ڈرون حملے کی فلم بنانے والوں کو کیوں قتل کر دیتے ہیں

ہم نے حضرت والا سے چند سوالات کئے:

(۱) کیا یہ بات آپ کے علم میں ہے کہ امریکہ ڈرون حملوں کی فلم کیوں جاری نہیں کرتا؟ کیا آپ نے کبھی ڈرون حملوں کے بعد کسی بستی میں لگنے والی آگ، پھیلنے والی تباہی و بربادی کی کوئی ویڈیو فلم دیکھی ہے؟ جواب ملا کوئی ویڈیو نہیں دیکھی ______ ہم نے عرض کیا امریکہ کیوں فلم جاری نہیں کرتا صرف فلم ہی جاری نہیں کرتا بلکہ ڈرون حملے کے وقت کوئی شخص رپورٹر کیمرہ موبائل اگر اس دہشت گردی کی فلم بنانے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دیتا ہے آخر کیوں؟ ______ اسی لئے کہ اگر اس حملے کی فلم بن گئی اور آپ نے دیکھ لی تو آپ جیسے لوگ فوراً امریکہ کی مذمت شروع کر دیں گے اور اگر فلم جاری نہیں ہوگی تو بڑے سے بڑے دہشت گردی پر بھی آپ جیسے لوگ چپ رہیں گے۔آپ کو اس کا اندازہ ہی نہیں ہوگا۔اور اندازہ ہو بھی جائے تو میڈیا پر کچھ نشر نہیں ہوگا لہٰذا جب ویڈیو فلم ہی نہیں ہوگی تو کسی قسم کا کوئی ردعمل غصہ اشتعال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوگا۔

(۲) ہم نے پوچھا افغانستان میں امریکہ نے آپریشن فریڈم کے نام سے جو جنگ مسلط کی ،نو دس سال تک اس نے کسی مرنے والے امریکی سپاہی کی لاش کی تصویر کیوں جاری نہیں کی۔امریکی سپاہیوں کی رسم تجہیز و تکفین و تدفین کی کوئی ویڈیو جاری نہیں ہونے دی۔سپاہیوں کے اہل خانہ،بیوی،بچوں کے آہ و بکا کی کوئی ویڈیو نہیں بننے دی۔آخر کیوں؟

انہوں نے کہا نہیں ہم اس بات سے واقف نہیں راقم نے عرض کیا اسے معلوم تھا کہ امریکی عوام اس جنگ کے خاتمے کا مطالبہ کریں گے اور سپاہی لڑنے مرنے سے انکار کر دیں گے کہ یہ کونسی آزادی کی جنگ ہے جس کے نتیجے میں ہمارے باپ،بھائی،ابو،بیٹے کی آزادی ختم ہو رہی ہے کیونکہ مغرب کا عقیدہ آزادی ہی مغرب سے قوم پرستی کا خاتمہ کر رہا ہے۔لوگ زندگی سے آزادی سے،لذت سے،افادیت پرستی سے اور صرف اپنے آپ سے محبت کرنے لگے ہیں انکے لئے انکے سوا سب others ہیں اور فرانسیسی مفکر سارتر کے الفاظ ہیں جو other ہیں وہ جہنم میں جائیں مجھے ان سے کیا غرض۔لہٰذا کوئی اپنی آزادی قربان کر کے آزادی کے عقیدے کی جنگ لڑنا نہیں چاہتا۔امریکہ اور فرانس کی فوج میں غیر ملکیوں کی تعداد بڑھ رہی ہے،فرانس کی فوج میں ۲۵ فیصد غیر ملکی ہیں ۔سانڈل کی کتاب Justice پڑھ لیجیے۔قوم پرستی ختم ہوگئی ہے لہٰذا تمام قومیں اپنی شہریت ڈالروں کے عوض فروخت کر رہی ہیں آپ ایک رات میں کسی بھی ملک کی شہریت خرید سکتے ہیں تفصیلات Justice میں پڑھ لیجیے مساوات کا دعویٰ کرنے والے مغرب کی قومی سرحدیں تمام انسانوں کے لیے بند ہیں لیکن صرف ان انسانوں کے لیے کھلی ہیں جو سرمایہ دار ہیں سرمایہ عالمی ہے اس کا کوئی مذہب نسل شناخت زبان رنگ نہیں ہے آپ اگر سرمایہ دار ہیں تو دنیا کا ہر ملک حتیٰ کہ امریکہ بھی دو گھنٹے میں آپ کو اپنی شہریت دے دے گا UNO کے منشور انسانی حقوق میں آزادی اور مساوات کا عقیدہ شامل ہے لیکن اگر آزادی اور مساوات جدید عقیدے ہیں تو قومی سرحدیں کیوں قائم ہیں اور قومی سرحدیں صرف غریبوں کے لئے کیوں بند ہیں امیروں کے لیے کیوں بند نہیں؟

انہی معنوں میں عصر حاضر کا خدا سرمایہ ہے جدیدیت اور جمہوریت آزادی کا مطلب سرمایہ ہی بتاتی ہے۔جدید مغربی فلسفے اور انسانی حقوق کے

منشور میں آخرت، خدا، جنت وغیرہ کا کوئی ذکر نہیں۔ اس فلسفے میں یہ دنیا ہی ابدی Eternal ہے تو ایک امریکی سپاہی اپنی جان قوم پرستی کے لئے کیوں دے اور کیوں اپنی آزادی کو قربان کردے۔ امریکہ دنیا بھر میں آزادی کا علمبر دار ہے وہ آزادی اظہار رائے، آزادی صحافت کا بھی علمبر دار ہے مگر اس نے افغانستان کے آپریشن فریڈم میں ـــــــ تصویر، فلم کی فریڈم پر پابندی لگادی ـــــــ بہت سے لوگوں نے اس پر یہ اعتراض کیا تھا کہ امریکہ خود آزادی کے اصول کا انکار کررہا ہے حالانکہ امریکہ آزادی کے اصول کا انکار نہیں کررہا تھا وہ مستقبل میں آزادی کے دائرے میں اضافے کے لئے عارضی طور پر تصویر اور فلم کی آزادی چھین رہا تھا کیونکہ یہ آزادی امریکہ کے آپریشن فریڈم پر براہ راست اثر انداز ہوتی اور ویت نام جنگ کی طرح امریکہ میں افغانستان کے خلاف جنگ کے خلاف شدید مزاحمت کھڑی ہوجاتی۔ فوج بغاوت کردیتی، رائے عامہ امریکی حکومت کے فیصلے کے خلاف احتجاج کرتی لہذا آزادی کے تحفظ، آزادی میں اضافے کے لئے فلم، تصویر، وڈیو فلم کی آزادی چھین لی گئی۔ ہم نے عالم دین سے عرض کیا حضرت والا آپ نے کبھی ان پہلوؤں پر غور فرمایا تو کہنے لگے ہرگز نہیں۔ ہم نے عرض کیا حضرت عمرؓ نے اسی لئے فرمایا تھا کہ وہ شخص دین کی کڑیاں بکھیر دے گا جو جاہلیت کی حقیقت سے واقف نہ ہو۔ اگر آپ ان تمام مباحث سے واقف نہ تھے اگر آپ کو میڈیا کی مابعد الطبیعات کا علم نہ تھا اگر آپ کو فریڈم کے عقیدے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا تو آپ چپ رہتے، توقف اختیار کرتے یا کہہ دیتے لا ادری آپ نے فتویٰ دے کر مضمون لکھ کر آزادی کے کافرانہ عقیدے کو مضبوط کیا اور اسلامی علمیت کا مقدمہ کمزور کردیا۔

فلم اور تصویر افسانے کو حقیقت اور حقیقت کو افسانہ بنادیتی ہے

تصویر کلیت میں سے ایک جزو کو محفوظ کر کے کلیت کو باطل کردیتی ہے

(۳) ہم نے سوال کیا کہ ایمانداری سے بتایئے کہ اگر یہ وڈیو فلم جاری نہ ہوتی تو آپ کے وہی تاثرات، جذبات اور تعصّبات ہوتے جو آپ کے بیان اور مضمون میں چھلک پڑے؟ انہوں نے فرمایا کہ وڈیو فلم نہ ہوتی تو ہمارے جذبات یقیناً بالکل مختلف ہوتے بلکہ وہی جذبات ہوتے جو عاشق رسول حضرت ممتاز قادری کی شہادت پر تھے راقم نے ان کی خدمت میں عرض کیا کہ

یونانی فلسفی افلاطون اپنے مکالمے Republic میں کہتا ہے کہ میں اپنی ریاست سے تمام آرٹسٹوں، مصوروں کو نکال دوں گا کیونکہ یہ Third order reality تخلیق کرتے ہیں۔ حقیقت یہی ہے کہ تصویر جو کچھ منظر کھینچتی ہے اگر آپ حقیقت میں خود وہ منظر دیکھیں تو وہ اتنا خوبصورت نہیں ہوگا جتنا تصویر میں نظر آرہا ہے۔ بعض چہرے Photogenic ہوتے ہیں یعنی وہ تصویر میں نہایت خوبصورت نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں وہ خوبصورت نہیں ہوتے۔ تصویر افسانے کو حقیقت بنا دیتی ہے اور حقیقت کو افسانہ بنا دیتی ہے۔ تصویر کلیت Totality کا بیان نہیں ہے بلکہ اس کلیت کے ایک جزو (one part) کا بھی جزوی بیان ہے۔

تصویر کسی حقیقت کو بیان نہیں کرتی مگر حقیقت کے ایک جزو کو محفوظ کر کے حقیقت کو مسخ کردیتی ہے اس لیے میڈیا سے نشر ہونے والا علم۔ علم نہیں رہتا جہل میں تبدیل ہوجاتا ہے کیوں کہ میڈیا ترسیل کا ذریعہ ہے تحصیل علم کا ذریعہ نہیں میڈیا آپ کے صرف دو حواس کو مخاطب کرتا ہے آپ کی کلیت آپ کے پورے وجود کو مخاطب نہیں کرتا۔ کسی وجود کو کلیت [Totality] میں مخاطب کرنے کے لیے کوئی وجود ضروری ہے پیغمبر اسی لیے لوگوں کو براہ راست دعوت دیتے ہیں یا اپنے خط اور خط کے ساتھ اپنے نمائندے یعنی ایک زندہ وجود کو بھیجتے تھے تاکہ پیغام صاحب پیغام کے نمائندے کے ذریعے ایک وجود کے ذریعے منتقل ہو۔

لہٰذا قیصر و کسریٰ کے دربار میں جب صحابہ رسالت مآب کا خط لے کر گئے تو صرف خط نہیں رسالت مآب کے تربیت یافتہ لوگوں کی تہذیب عقلیت علمیت ثقافت تاریخ روحانیت سب کو اپنے وجود میں سمو کر لے گئے تھے وہ اس کے دربار میں داخل ہوئے تو اس دربار کی شان و شوکت سے ذرہ بھر مرعوب نہیں ہوئے وہ اپنے نیزے دبیز قالین میں گاڑتے ہوئے گئے اور مسند شہنشاہ پر چڑھ کر بادشاہ کے زانو سے زانو ملا کر بیٹھ گئے۔ یہ سب کام تصویر اور فلم سے نہیں ہوسکتے وجود کا جواثر ہوتا ہے وہ دوسرا وجود ہی جانتا ہے۔ کوئی سائنسی تکنیکی ذریعہ Medium یا میڈیا Media یا تصویر یا فلم کسی حقیقت کے وجود یا کسی وجود کا

متبادل نہیں ہوسکتے اس بات کو آپ اس طرح سمجھیے کہ اگر کوئی شیر آپ کے اردگرد دھاڑ رہا ہوں تو اس کی دھاڑ سن کر بڑے بڑوں کا پتہ پانی ہوجائے گا کیوں کہ شیر کا زندہ وجود آپ کے پورے وجود سے ہم کلام ہے آپ کی کلیت پر اثر انداز ہو رہا ہے لیکن اسی شیر کی دھاڑ کو ڈسکوری چینل پر منتقل کردیا جائے اور اس کی دھاڑ اس چینل سے سنی جائے TV پر شیر کو چھلانگ لگاتے دیکھا جائے تو آپ کے ذہن جسم قلب پر کسی قسم کا کوئی خوف اور اثر نہیں ہوگا ایک حقیقت جب میڈیا سے نشر ہوتی ہے تو وہ حقیقت نہیں رہتی وہ کچھ سے کچھ ہوجاتی ہے۔

تصویر کسی Process کے کسی خاص واقعے، منظر، event کا بیان ہے لہذا یہ اس پورے Process کو مسخ کرسکتی ہے جس طرح H2O آکسیجن اور ہائیڈروجن اپنی کلیت میں ہوں تو آگ پانی بن جاتا ہے لیکن اگر ہائیڈروجن گیس کو آکسیجن سے الگ کردیا جائے تو وہ آگ لگا دیتی ہے اسی طرح NACl نمک، سوڈیم کلورائیڈ میں کلورین زہر ہے جو کوئی اسے کھالے تو مر جائے گا لیکن یہی کلورین جب سوڈیم کے ساتھ مل جاتی ہے تو اسکا زہر ختم ہوجاتا ہے جب ہم تصویر کھینچ لیتے ہیں، کسی واقعے کی فلم بنا لیتے ہیں تو ہم اس پورے process کو نظر انداز کرکے اسکے کل کے کسی جزوی جزو کے بھی کسی بہت چھوٹے سے جزوی حصے کی عکاسی، نقاشی کرتے ہیں جس کے نتیجے میں حقیقت التباس Blure کا شکار ہوجاتی ہے۔ یہ جزوی حقیقت۔ جو کیمرے اور فلم کی آنکھ نے محفوظ کی ہائیڈروجن کی طرح آگ لگا سکتی ہے اور کلورائیڈ کی طرح سب کو ہلاک کرسکتی ہے مثال کی فلم کے حوالے سے بھی یہی ہوا ہے۔

تصویر اصل حقیقت کو ضائع کردیتی اور کسی خاص جز کو نمایاں کرتی ہے

تمام روایتی الہامی تہذیبوں میں تصویر کو حرام قرار دیا گیا

تمام روایتی، الہامی تہذیبوں میں تصویروں کو اسی لئے حرام قرار دیا گیا لہذا ان تہذیبوں میں علم تصویر سے نہیں عموماً اور اکثر روایت Oral) (Tradition سے تحریر Writing سے منتقل ہوتا ہے الہامی تہذیبوں کے لیے زبانی روایت سب سے اہم ہوتی ہے آخری نبی رسالت مآب امی تھے اس لیے کہ اصل علم علم آخرت ہے جو یہ علم نہیں رکھتا وہ عالم نہیں جاہل ہے اس لیے قرآن نے عاد ثمود فراعنۂ مصر کو سائنس و ٹکنالوجی میں عظیم الشان کامیابیاں حاصل کرنے کے باوجود جاہلیت اور جاہلیہ کا شاہکار قرار دیا اور ان کی پوری تاریخ تہذیب علوم وفنون سب کو مسترد کردیا انبیاء نے ان کی عمارات فنون سائنس و ٹکنالوجی کو تک محفوظ نہیں کیا نہ استعمال کیا کیوں کہ وہ عذاب رسیدہ بستیاں ہی نہیں عذاب رسیدہ فنون بھی تھے جن کو اختیار کرنے کی اجازت نہیں تھی انبیاء کی قوموں نے عاد وثمود کی عمارتوں میں نہ قیام کیا نہ ان قوموں کے علوم وفنون کی تاریخ کو محفوظ کیا مسلمانوں نے کبھی فراعنۂ مصر کے آثار سے سیاحت کی صنعت کے ذریعے مال کمانے کی کوشش نہیں کی ان کو آثار عبرت کے طور پر باقی رکھا گیا تاکہ بتایا جائے کہ لافانی صرف اللہ ہے۔

جو فانی انسان اور جو تہذیب لافانی بننے کی کوشش کرتی ہے اس کے آثار مظاہر لافانی عمارات فنون کو محفوظ کردیا جاتا ہے مگر اس قوم کو فانی بنا دیا جاتا ہے اللہ کی سنت یہی ہے۔

اندلس کے مسلمانوں کے ساتھ بھی اللہ نے اسی سنت کو اختیار کیا ان کے آثار باقی رکھے۔ مسلمان باقی نہ رہے اس دنیا میں انبیاء کی کوئی لافانی یادگار نہیں ان کی یادگاریں صرف دو ہیں خانہ کعبہ اور حجرہ نبوی اور رسالت مآب کے مکتوب جن پر مہر رسالت کا عکس نقش ہے لہٰذا اسلامی آرٹ خطاطی فن تعمیر پر لکھی گئی بے شمار کتابوں میں رسالت مآب کے خطوط، مہر نبوت، خانہ کعبہ اور حجرہ نبوی کو کبھی اسلامی تاریخ کے شاہکار کے طور پر نہیں پیش کیا جاتا۔ خود مسلمانوں کو ان آثار پر شرم آتی ہے کیوں کہ یہ جمالیات کے جدید معیارات پر پورے نہیں اترتے۔

حدیث آج بھی روایت اور سند کے ذریعہ منتقل ہو رہی ہے الاسانید من الدین ۔ روایتی اسلامی مذہبی تہذیبوں میں سند سب سے اہم ہوتی ہے۔ تصویر اہم نہیں ہوتی لیکن تحریر اہم ہوتی ہے اگر تصویر اہم ہوتی تو قرآن مصور ہوتا اگر ابلاغ کا بہترین ذریعہ تصویر تھا تو اللہ تعالیٰ خود مصور قرآن نازل فرماتے لیکن اس ذریعہ ابلاغ کی آفتوں کو خالق ارض وسماء خوب جانتے تھے لہٰذا اس امت کی علمی روایت میں پندرہ سو سال تک تصویر کو ذریعہ ابلاغ کے طور پر استعمال کرنے کی کوئی روایت نہیں ملتی آج مغرب سے متاثر متجددین تصویر کے فوائد بتا رہے ہیں مگر وہ اس کے نقصانات سے ناواقف ہیں ہر چیز میں فائدہ ہوتا ہے شراب اور جوئے میں بھی نفع ہے مگر قرآن نے بتا دیا کہ اس کا گناہ یعنی اس کا نقصان اس کے نفع سے زیادہ ہے یعنی قرآن نے شراب کا بیان کرتے ہوئے

فائدے اور نقصان کا تقابل نہیں کیا بلکہ گناہ اور فائدے کا تقابل کیا ہے اصل چیز مادی نقصان نہیں اصل نقصان آخرت کا نقصان اور آخرت کا خسارہ ہے یعنی گناہ سے بچنا ہی اصل کام ہے۔

لہٰذا اسلامی علمیت میں خطاطی، علم اور عشق کے اظہار کا ذریعہ، وسیلہ رہی ہے۔ تصویر، مجسمہ، مصوری، کبھی علم و عشق کے اظہار کے وسیلوں کے طور پر اختیار نہیں کیے گئے ___ امت کا ان امور پر اجماع ہے حیرت ہے کہ ہمارے جدیدیت پسند طبقات بلکہ متجدد علماء میں بھی افلاطون ___ یونانی کی حرارت بھی نہیں جو اسلام کی آمد سے کئی سو سال پہلے تصویر کے حرام ہونے کا قائل تھا اور مصور کو اپنی ریاست میں برداشت کرنے پر تیار نہیں تھا اس نے اپنے چشم تصور اور چشم تخیل سے فن مصوری، سنگ تراشی مجسمہ سازی، کی آفتیں دیکھ لی تھیں ___ عہد حاضر میں لبرل آرٹس اور فنون لطیفہ مصوری، موسیقی، رقص، مجسمہ سازی کی آفتیں اپنی آنکھوں سے دیکھنے کے باوجود بعض متجدد علماء اس کے جواز کے فتوے دے رہے ہیں عوام ان سے پوچھ سکتے ہیں کہ اگر یہ اتنے اچھے اور نیک پیشے اور فنون تھے تو انبیاء اور صحابہ (نعوذ باللہ) میں کوئی مصور، آرٹسٹ، فن کار کیوں پیدا نہیں ہوا اور اسلامی علمیت کی پندرہ سو سالہ تاریخ نے ان عظیم مصادر علمی پر کیوں قدغن عائد کردی اور کسی خلافت امارت نے ان فنون کی سرپرستی کیوں نہیں کی؟۔ دنیا میں معتزلہ، مالکیوں، خوارج کے اباضی فرقے، اہل تشیع، زیدی شیعہ، فاطمیین مصر صفویوں کی حکومت رہی مگر کسی نے تصویر اور فنون لطیفہ کی اسلام کاری کیوں نہیں کی حالانکہ ان میں بعض مکاتب فکر دین کی عقلی تعبیر اور پیغمبر باطن عقل کی عظمت کے بھی قائل تھے۔ اسے ماخذ دین بھی سمجھتے تھے اسکے باوجود وہ گمراہی کی اس سطح پر نہیں پہنچے جس سطح پر عہد حاضر کے متجددین پہنچ چکے ہیں۔

<u>تمام روایتی، الہامی تہذیبوں میں تصویر حرام رہی ہے</u>

یہودیت، عیسائیت، اسلام میں ڈرامے کی روایت موجود نہیں

یہودیت عیسائیت اور اسلام میں ڈرامے کی روایت سرے سے ناپید ہے۔ جس پر سوشل سائنٹسٹ بہت حیران ہوتے ہیں کہ ان تہذیبوں کے لوگوں کا وقت کیسے گزرتا ہوگا؟ مذاہب عالم نے تصویر کو اپنی علمیت، روایت اور تہذیب و ثقافت سے خارج کرکے خالص علم کی روایت کو مستحکم کیا جب الفاظ کی جگہ تصویر اور تقریر کی جگہ شبیہیں، چہرے اور جمالیاتی مناظر لے لیتے ہیں تو علم تحریف، تدلیس، کا شکار ہو کر وقار، حلم کی روایت سے الگ ہو جاتا ہے امریکہ میں صدارتی الیکشن میں کامیابی کا راز صرف صدر کا خوبصورت چہرہ [Photenic Face] ہے۔ اس موقف کی تفصیل جاننے کے لئے صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن News Week اور Times کے سابق مدیر فرید زکریا کی کتاب The Future of Freedom کا امریکہ سے متعلق باب پڑھ لیجئے۔

افلاطون نے اپنے مکالمے جمہوریہ [Republic] میں کہا ہے کہ مصوروں کو اس کی ریاست سے نکال دیا جائے کیونکہ یہ حقیقت کی سب سے نچلی تیسری سطح [Third order Reality] کی عکاسی و نقاشی کرتے ہیں حیرت ہے کہ افلاطون کی ریاست میں مصوروں، آرٹسٹوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے اور بعض جدیدیت پسند اسلامی تحریکیں، تصویر کو ایک ناگزیر معصیت [Unavoidable Evil] کے طور پر قبول کر چکی ہیں جو اجماع امت کے منافی طرز عمل ہے۔ اصلاً ہم سب مغرب کے مسلط کردہ میڈیا ڈسکورس سے خواہ مخواہ رعب میں آگئے ہیں اس رعب سے نکلنے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ہم اسلامی ڈسکورس پر کامل یقین رکھیں ہمیں امید ہے کہ مشال خان واقعے سے انہیں شریعت کے حکم اور تصویر کے حرام ہونے کے فتوے پر اجماع امت سے متعلق شرح صدر حاصل ہو گیا ہوگا۔ میڈیا استعمال کرنے والی تمام جماعتیں، میڈیا استعمال نہ کرنے والی جماعت (تبلیغی جماعت) جیسا بڑا تبلیغی اجتماع کیوں منعقد نہیں کر سکتیں؟ یہی استدلال میڈیا کے ڈسکورس سے باہر نکلنے کا جواز فراہم کرتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ علماء کو اپنے محراب، منبر، مسجد، مدرسے، وعظ و نصیحت، درس و تدریس پر اعتماد نہیں ہے وہ میڈیا کے ذریعے دین کا ابلاغ چاہتے ہیں میڈیا ایک غیر مقدس ذریعہ Profane Medium ہے اسکے ذریعے دین جب بھی بیان ہوگا اپنی تاریخ، پس منظر، تہذیب، ثقافت سے الگ ہو کر مجرد، ایک واقعے کے طور پر بیان ہوگا اور اپنی صداقت، روحانیت خود کھودے گا۔ اس ذریعے سے نشر

ہونے والے علم کے بارے میں بعض اہم اشارات ہم پہلے ہی پیش کر چکے ہیں۔

Niel Postman نے اپنی کتاب Amusing ourselves to death کے دیباچے میں برقی ابلاغی ذرائع سے نشر ہونے والے علم کے بارے میں بہت اہم نکات بیان کیے ہیں جو علماء اور اسلامی تحریکوں کے لیے غور و فکر کا سامان مہیا کرتے ہیں

The shape of a man's body is largely irrelevant to the shape of his ideas when he is addressing a public in writing or on the radio or , for that mater, in smoke signals. But it is quite relevant on television.

For on television, discourse is conducted largely through visual imagery which is to say that television gives us a conversation in images, not words. The emergence of the image-manager in the political arena and the concomitant decline of the speech writer attest to the fact that television demands a different kind of content from other media. You cannot do political philosophy on television. Its form works against the content.

پوسٹ مین لکھ رہا ہے کہ آپ ٹی وی پر سیاسی فلسفہ بیان نہیں کر سکتے اس کا سانچہ ڈھانچہ کسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے تعمیر نہیں کیا گیا میڈیا کی صورت [Form] سے نشر ہونے والے پیغام کی ماہیت، حقیقت جوہر اور مافیہ [Content] کو تبدیل کر دیتی ہے اس ذریعے سے آپ اگر حق بیان بھی کریں گے تو سننے والے کو وہ باطل محسوس ہوتا ہے۔ کیوں کہ یہی میڈیا کے ذریعے کا کمال ہے۔ جس طرح منشور Prism میں سے جب روشنی گزرتی ہے تو وہ انعطاف نور کے باعث ٹیڑھی ہو جاتی ہے وہ روشنی نہیں رہتی سات رنگوں کی بہار دکھانے لگتی ہے، جمال کا ایک اعلیٰ نمونہ بن جاتی ہے میڈیا بھی یہی کرتا ہے، میڈیا کے منشور سے جب بھی کوئی حقیقت بیان ہوتی ہے تو وہ جمالیاتی تاثر کے ساتھ افسانہ بن جاتی ہے اور اگر افسانہ بیان ہوتا ہے تو وہ حقیقت بن جاتا ہے۔ مشال خان کے واقعے میں یہی ہوا جب مشال کی واقعے کی فلم کی ویڈیو بنی تو وہ فلم مشال کی موت کے تین سالہ پس منظر کے Process کو اپنا حصہ نہیں بنا سکی تھی جس کے نتیجے میں مشال کا قتل ہوا یہ Process گزشتہ تین سال سے جاری تھا اس کے آخری مرحلے میں تین ہزار طلباء کا غصہ، اشتعال بھی شامل تھا۔ فلم کی محدودیت [Limitation] اس تاریخ، تناظر پس منظر، کو اپنی زبان سے بیان کرنے کی اہلیت ہی نہیں رکھتی۔ فلم نے اس حادثے کے صرف آخری حصے، اختتام End event کو دکھا کر پوری حقیقت کو مسخ Distort اور تباہ و برباد کر کے رکھ دیا۔

میڈیا کی مابعد الطبیعیات سے مختلف مابعد الطبیعیات کا خیر جب اس میں سے گزرتا ہے تو وہ prism میں سے گزرنے والی سورج کی شعاع کی طرح خود بخود ٹیڑھا ہو جاتا ہے صراط مستقیم سے بھٹک جاتا ہے۔ اسی لیے ہم بار بار کہتے ہیں کہ صرف پیغام نہیں پیغام سے زیادہ وہ ذریعہ [Mean] اہم ہے جس کے ذریعے پیغام بھیجا جا رہا ہے کیونکہ ذریعہ خود پیغام ہے [The Medium is Message]۔ اس کا ثبوت شہید ممتاز قادری کی شہادت کے موقع پر دعوت اسلامی کے چینل کا طرز عمل ہے۔ ممتاز قادری، مولانا الیاس قادری کے مرید تھے ان کی وصیت تھی کہ قادری صاحب ان کی نماز جنازہ پڑھائیں۔ وہ تشریف نہیں لائے۔ دعوت اسلامی کے چینل نے ممتاز قادری شہید کی شہادت کی خبر نشر نہیں کی، نہ ان پر کوئی پروگرام کیا۔ دلیل یہ تھی کہ چینل بند کر دیا جائے گا تو عشق رسول ﷺ کا ابلاغ کیسے ہوگا؟ عاشق رسول ﷺ کی شہادت کا اتنا بڑا سانحہ غیر اہم ہو گیا صرف چینل کا برقرار رہنا اہم ترین کام ہو گیا۔ جو چینل عاشق رسول ﷺ کی شہادت کے جلوس کو نہیں دکھا سکتا اس کے باقی نہ رہنے کے لئے یہی دلیل کافی ہے۔ چینل جو عشق رسول ﷺ کا انقلاب لانے کے لئے کھولا گیا تھا عاشق رسول کی شہادت کے انقلاب کی خبر دینے بھی معذور تھا جو ذریعہ اس قدر کمزور، ڈرپوک اور بزدل ہو اس سے اسلامی انقلاب کیسے آ سکتا ہے۔ چینل نے انکو بدل دیا ،ان کی سمت سفر بدل دی جو عشق رسول کے ذریعے دنیا بدلنے کے جہاد پر نکلے تھے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ذریعہ ٹی وی خود پیغام ہے جو آپ کے اصل پیغام کی راہ میں خود سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ مغرب میں بھی جو چینل چلائے جاتے ہیں ان پر اسلام کی صرف وہ تعلیمات پیش کی جا سکتی ہیں جو انسانی حقوق کے منشور سے ہم آہنگ ہوں۔ اس منشور سے متصادم قرآنی، دینی تعلیمات نشر کرنے پر آپ کا چینل ہی بند کر دیا جائے گا۔ ہمارے متجددین ان مباحث سے واقف

ہی نہیں وہ یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس کے فیصلے پڑھ لیں جو مذہبی آزادی سے متعلق ہیں سو سے زیادہ فیصلوں میں لکھا ہے کہ مغرب کے نزدیک مذہبی آزادی سے مراد صرف اور صرف وہ آزادی ہے جو انسانی حقوق کے منشور کے عین مطابق ہو اس کی روح، خلاصے، جوہر Freedom کے عقیدے کے خلاف نہ ہو ورنہ آپ کی مذہبی آزادی چھین لی جائے گی۔ یہ مطلق آزادی نہیں منشور انسانی حقوق کی چھتری تلے محدود آزادی [Limited Freedom under the umbrella of HR Decleration] ہے۔

نیل پوسٹ مین نے اپنی کتاب کے مقدمے میں الہامی تہذیبوں میں تصویر کی حرمت سے متعلق جو استدلال پیش کیا تمام متجددین کے لئے روشنی کے راستے مہیا کرتا ہے۔

This idea that there is a content called the news of the day- was entirely created by the telegraph (and since amplified by newer media) which made it possible to move decontextualized information over vast spaces at incredible speed. The news of the day is a figment of our technological imagination.

I found intimations of the idea that forms of media favor particular kinds of content and there fore are capable of taking command of a culture. I refer specifically to the Decalogue the second commandment of which prohibits the Israelites from making concrete images of anything. "Thou shalt not make unto thee any graven image, any likeness of any thing that is in heaven above or that is in the earth beneath or that is in the water beneath the earth" I wondered then as so many others have, as to why the God of these people would have included instructions on how they were to symbolized, or not symbolize, their experience. It is a strange injunction to include as part of an ethical system *unless its author assumed a connection between forms of human communication and the quality of a culture*. We may hazard a guess that a people who are being asked to embrace an abstract, universal deity would be rendered unfit to do so by the habit of drawing pictures or making statues or depicting their ideas in any concrete iconographic forms. The God of the Jews was to exist in the Word and through the Word, an unprecedented conception requiring the highest order of abstract thinking. Iconography thus became blasphemy so that a new kind of God could enter a culture. [Amusing Ourselves to death, Neil Postman, pg. 7 to 10]

علمائے کرام اور دینی تحریکوں کو درج ذیل کتابوں کا مطالعہ کرنا چاہیے تا کہ وہ میڈیا کے سحر سے باہر آسکیں جو ان کی رہی سہی علمیت، روحانیت، طاقت، قوت اور اثر کو مسلسل تہس نہس کر رہا ہے۔ وہ اس ڈسکورس کو ترک کرکے اسلامی ڈسکورس کو اختیار کریں جس کے ذریعے دنیا کے پانچ براعظموں تک اسلام کی دعوت پہنچی تب میڈیا، انفارمیشن ٹیکنالوجی موجود نہ تھی۔

Laws of Media: ،Understanding Media: The Extensions of Man کی کتاب Marshall McLuhan(۱)

Media Today: Mass Communication in a کی کتاب Joseph Turow(۲)،The New Science

The Digital Divide: Arguments for and کی کتاب Mark Bauerlein(۳)،Converging World

The Digital Divide: Facing a Crisis کی کتاب Benjamin M. Compaine(۴)،Against Facebook, ...

Digital Divide: Civic Engagement, Information کی کتاب Pippa Norris (۵)،Or Creating a Myth?

Digital Divide: Computers and کی کتاب David B. Bolt (۶)،Poverty, and the Internet Worldwide

Technology and Social Inclusion: کی کتاب Mark Warschauer (۷)،Our Children's Future

Virtual Inequality: Beyond the کی کتاب Karen Mossberger(۸)،Rethinking the Digital Divide

Digital Divide

(۹)EVGENY MOROZOV کی کتاب The Dark side of Internet Freedom بتاتی ہے کہ انٹرنیٹ کے ذریعے ریاست کا سانچہ کیسے مضبوط ہوتا ہے(۱۰) All to gether(۱۱) Sherry Trukle کی کتاب ALONE TOGETHER: why we expect more from TECHNOLOGYand less from each other

فیس بک کی آفتوں کے سلسلے میں ہم پہلے سمیع اللہ سعدی صاحب کے نام مکتوب میں ایک تفصیلی مضمون لکھ چکے ہیں۔اس کا مطالعہ بھی مفید رہے گا۔یہ مضمون سعدی صاحب سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

(۴)ہم نے حضرت والا سے سوال کیا کہ ویڈیو کا جو اثر ہوا یا فلم کا جو اثر نفوس انسانی پر ہوتا ہے اس کے بارے میں آپ کی نظر سے کتابیں کیا گزری ہیں اور میڈیا کے اثرات پر آپ نے اس فن کے ماہرین کی تحقیقات دیکھی ہیں؟ تو انہوں نے اس سے لاعلمی ظاہر کی ہم نے عرض کیا کہ

علماء نے غور ہی نہیں کیا کہ مشال خان کی وہ ویڈیو جو جاری ہوئی وہ Complete Information ہے یا Missinformation ہے یا Disinformation۔ میڈیا کے تمام ماہرین تسلیم کرتے ہیں کہ vedio impact خطرناک ہوتا ہے یہ عموماً counter productive ہوتا ہے یہ کسی واقعے،حادثے،سانحے کی سچی حقیقی مکمل ترجمانی نہیں کرتا یہ اس Process کی نہیں اس Process کے ایک خاص Event کے جزوی حصے (Partial part) کی نمائندگی کرتا ہے لہٰذا ویڈیو امپیکٹ Reality کو Representation میں تبدیل کرتا رہتا ہے اور آخر کار Representaion کو ہی وہ حقیقت Reality ثابت کردیتا ہے۔

میڈیا کا فوٹیج،تصویر،فلم حقیقت کی مکمل ترجمانی نہیں کرسکتی۔جو شے حقیقت کی مکمل ترجمان ہی نہیں ہے اس کی بنیاد پر رائے کیسے قائم کی جارہی ہے؟ بعض علماء نے مردان واقعے پر پہلے ہی دن۔ویڈیو دیکھتے ہی۔حتمی رائے کس اصول کے تحت قائم کی اس کے بارے میں بھی انہوں نے کچھ نہیں بتایا۔یہ میڈیا کی جمالیات کا زہر ہے جو علماء تک میں اثر کرچکا ہے۔ہمارے بعض عجلت پسند علماء اگر Bill Mckibben کی کتاب The Age of Missing Information پڑھ لیتے تو اپنی زبان کو قابو میں رکھتے فوری اجتہاد نہ کرتے اور اسلامی علمیت اور تاریخ وتہذیب اور اجماع کو برا بھلا نہ کہتے۔علماء کرام Julie Anne Boudreau کی کتاب Public Space اور Urban Revoluation بھی پڑھ لیں تو شاید اس سے انہیں کچھ فائدہ ہو۔

(۵)ہم نے حضرت سے نہایت ادب سے پوچھا کہ اٹھارہویں صدی سے پہلے روایتی عسکری طریقوں اور اٹھارہویں صدی کے بعد کے جدید عسکری طریقوں، توپ خانہ،بم،ہوائی جہاز،بحری جہاز،بین البراعظمی میزائل،ڈرون حملے وغیرہ کے استعمال کے بعد قدیم اور جدید طریقہ جنگ میں فرق پر۔اور قدیم وجدید تشدد کی نوعیت ماہیت حقیقت پر آپ نے کچھ مطالعہ کیا ہے جدید تشدد کیا ہے اور روایتی معاشروں کا تشدد کیا تھا کیا قدیم تشدد بھیانک تھا یا جدید تشدد بھیانک ترین ہے؟ کیا آپ نے Max Webier کا فلسفہ پڑھا ہے جو بتاتا ہے کہ تشدد پر صرف اور صرف جدید ریاست کا اجارہ [Monopoly of violence] ہے۔جدید ریاست جو بھی تشدد کرے وہ ایک جائز قانونی کام ہے حضرت نے ان مباحث سے عدم واقفیت ظاہر فرمائی۔

<u>مشال کا تشدد نظر آ گیا امریکی بم کا تشدد نظر نہیں آیا کیوں؟:</u>

ہم نے حضرت کی خدمت میں نہایت ادب سے عرض کیا کہ ہمارے لوگوں کو یہ تک معلوم نہیں کہ روایتی مذہبی معاشروں کا تشدد subjective (موضوعی)ہوتا تھا Objective (معروضی)نہیں ہوتا لہٰذا وہ سب کو نظر آجاتا تھا مشال خان کا واقعہ اس کی مثال ہے یہ تشدد سب کو نظر آ گیا کیوں کہ اس کی فلم بھی بنائی گئی اگر فلم نہ بنائی جاتی تو یہ تشدد بھی اتنا شدید نظر نہ آتا۔مگر اسی دن افغانستان پر دنیا کی تاریخ کا سب سے وزنی بم پھینکا گیا جس کی

آواز چار ملکوں میں سنی گئی اس بم پھینکنے کے بعد کیا تباہی آئی اس کی کوئی تصویر فلم جان بوجھ کر جاری نہیں کی گی۔ لہٰذا جدید تشدد کسی کو محسوس نہیں ہوا اسے نقاب پہنا دی گئی کسی نے اس پر نہ شور مچایا نہ احتجاج کیا نہ ہنگامہ کیا اگر اس تشدد کی فلم آجاتی کہ صرف داعش کے چھبیس لوگوں کو قتل کرنے کے لیے سینکڑوں لوگوں کو قتل ہزاروں کو زخمی اور تمام علاقے کو تباہ و برباد کر دیا گیا خون میں لت پت لاشیں، جلے ہوئے گوشت کے ٹکڑے، جلتے ہوئے انسان، عروسی لباس میں چیختی چلاتی بھاگتی جلتی ہوئی دلہن۔ جلے ہوئے کپڑے اتار کر بھاگتی ہوئی ننگی لڑکیاں، چیختے پکارتے خون میں نہاتے ہوئے معصوم بچے، جلتے اور مرتے بھیڑ بکریوں جانوروں کی ہولناک چیخ و پکار اگر مشال خان کی فلم کی طرف یوٹیوب پر نشر ہوتی تو لوگ مشال خان کے واقعے کو بھول جاتے اور کہتے کہ درندگی تو یہ ہے سفاکی کی تو انتہا یہی ہے اور یہ درندگی سفاکی بلاوجہ ہے اسی لیے علماء کو بھی صرف مشال والا واقعہ متشدد نظر آیا افغانستان پر امریکہ کا بم پھینکنا ایک عام واقعہ تھا جدید ٹکنالوجی حقیقت کو التباس Blure سے بدل دیتی ہے۔ علماء نے بم پر کوئی بیان نہیں دیا امریکہ کے بارے میں وہ الفاظ ادا نہیں کیے جو مردان یونیورسٹی اسلام اور مسلمانوں کے بارے میں ادا کیے اس سے اندازہ کیجیے کہ ہماری رگوں میں لبرل ازم کا زہر میڈیا کی طاقت اس کی جمالیاتی قوت کے ذریعے۔ کس حد تک سرایت کر چکا ہے۔

روایتی قدیم تشدد اور جدید تشدد کا تقابلی مطالعہ

روایتی الہامی مذہبی تہذیبوں میں تشدد، سزا، تکلیف کسی خاص فرد یا خاص گروہ (Particular Person or group] تک محدود ہوتی تھی جنگ صرف محاربین [Combanant] کے خلاف لڑی جاتی تھی لہٰذا جو ہتھیار اوزار ایجاد ہوتے تھے ان کی تباہی محدود ہوتی تھی غیر محاربین [Non combatant] اس سے محفوظ رہتے تھے جنگیں شہر سے باہر غیر آباد جگہوں میں لڑی جاتی تھیں لہٰذا جدیدیت (ماڈرن ازم) سے پہلے تشدد موضوعی Subjective violence تھا تلوار تیر خنجر نیزے منجنیق کسی فرد یا عمارت کو نشانہ بنانے کے لیے تھے وہ غیر محارب آبادیوں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے نہیں تھے اس ٹکنالوجی کا نشانہ صرف اور صرف فرد تھا جنگ صرف محاربین کے درمیان ہوتی تھی۔ عموماً جنگ آبادیوں سے باہر خالی جگہوں پر ہوتی تھی۔ قدیم جنگی ٹکنالوجی اشیاء کو نشانہ نہیں بناتی تھی۔ لہٰذا قدیم تشدد۔ عہد حاضر کے جدید انسان کو بہت بھیانک خوفناک لگتا ہے کیوں کہ اس میں تشدد کرنے والا اور سہنے والا آمنے سامنے ہوتے ہیں لیکن جدید ٹکنالوجیکل تشدد جو روایتی تشدد کے مقابلے میں کئی ہزار گنا بھیانک، بہیمانہ، جابرانہ اور نہایت سفاک ہے اپنی جمالیات، تکنیک، واردات کے ذریعے بہت پر امن بہت شریف اور بہت معصوم لگتا ہے۔ جدید مغربی عسکری طریقے فرد Person Killing نہیں اشیاء عمارتوں، آبادیوں اور چیزوں کو مارتے ہیں یہ Thing Killing طریقہ جنگ ہے۔ ایک میزائل سے سوڈان میں دواؤں کی فیکٹری تباہ کر دی گئی۔ بہ ظاہر صرف شے Thing عمارت Building تباہ ہوتی ہے مگر اصلاً لاکھوں لوگ دوائیں نہ ملنے سے مر جائیں گے ہسپتال، پانی کے ذخائر، بجلی گھر، کھیت تباہ کر دیے جاتے ہیں لاکھوں لوگ بھوک، پیاس اور علاج نہ ہونے سے مر جاتے ہیں مگر اس کی ذمہ داری قاتل تہذیب پر عائد نہیں ہوتی اس نے انسانو کو قتل نہیں کیا اس نے تو انسانوں کو بچانے کے لیے انسانیت کے فروغ کے لیے صرف اور صرف چیزوں اداروں عمارتوں کو تباہ کیا ہے اور انسان کو زندگی بخشی ہے۔

جدیدیت ریاست کا تشدد چنگیز و ہلاکو سے زیادہ خطرناک و مہلک ہے

جدیدیت کی سفاکی خود کو ان طریقوں سے چھپا دیتی ہے۔ روایتی معاشروں میں لوگ اپنی ضروریات زندگی کے خود ذمہ دار تھے وہ اپنے زور بازو سے اپنے لیے رزق اور زندگی کے وسائل خود پیدا کرتے تھے۔ جدید ریاست نے لوگوں کی اس معاشی خود مختاری خود کفالتی زندگی کو تباہ و برباد کر کے ان کو اپنا غلام بنا لیا لہٰذا جب جدید طریقہ جنگ میں کسی ریاست پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں اس کے معاشی وسائل روک دے جاتے ہیں اس کے ادارے تباہ کر دیے جاتے ہیں تو لوگوں کے پاس موت قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ کار نہیں رہتا۔ کیوں کہ لوگ ریاستی مدد اور ریاستی اداروں کے بغیر اپنا کوئی فریضہ انجام نہیں دے سکتے وہ ہر معاملے میں ریاست کے محتاج ہوتے ہیں لہٰذا جب بھی کسی ریاست پر UNO امریکہ یا کوئی طاقت ور ملک پابندی لگاتا ہے لاکھوں لوگ مر جاتے ہیں

جدید ریاستوں، UNO، NATO اور انسانی حقوق کے منشور کا تشدد چنگیز و ہلاکو خان سے زیادہ خطرناک تشدد ہے مگر یہ کسی کو نظر نہیں آتا کیوں کہ اس تشدد میں لوگوں کے سروں کے مینار نہیں بنائے جاتے اسے چھپا دیا جاتا ہے۔

۱۹۹۶ء میں شمالی کوریا میں قحط سے چھبیس لاکھ لوگ ہلاک ہو گئے مگر کسی کو اس حادثے کی خبر بھی نہیں ملی۔ غامدی صاحب مغرب کی متشدد ترین تہذیب کے مقابلے میں مردان کے واقعے سے اسلام، مسلمانوں، اسلامی تہذیب کو دہشت گرد قرار دے رہے ہیں تو یہ ان کی جہالت ہے اور کچھ نہیں۔ تاریخ یہ ہے کہ لبرل ازم جتنے سفاک قتل عام کرتا ہے دنیا کی کوئی تہذیب اتنے قتل عام نہیں کرنے کی صلاحیت ہی نہیں رکھتی۔ کیوں کہ وہ انسان تھے وہ شریف لوگ تھے لہٰذا ان کی مابعد الطبیعیات صرف انہی اوزاروں کی تخلیق کا ذریعہ تھی جو فرد دشمن تھے اجتماعیت دشمن نہیں تھے جدیدیت کا پیدا کردہ تشدد New Violence پوشیدہ ومخفی ہے آپ ایک براعظم میں بیٹھ کر دوسرے براعظم میں میزائل سے قتل عام کر دیتے ہیں اس عمل میں اتنے لوگ اتنے ادارے شریک ہوتے ہیں کہ قاتل کی ذمہ داری کا تعین ہی نہیں ہوتا۔ فاصلہ ہونے کی وجہ سے اس قتال میں حصہ لینے والا انسانوں کو قتل کرتے ہوئے کوئی دکھ افسوس ملامت تک محسوس نہیں کرتا لہٰذا جدید جنگ انسانی جذبات، احساسات رویوں سے لاتعلق کر دی گئی تاکہ اس جنگ کو سفاکی کی اعلیٰ ترین حدوں تک پہنچا دیا جائے چونکہ اس سفاکی کو کوئی انسان برداشت نہیں کر سکتا لہٰذا اس عمل سے انسان کو بے دخل کر دیا گیا تاکہ اس کا ضمیر اس کا تجربہ ویت نام جنگ کی طرح بغاوت پر آمادہ نہ کر دیا فغانستان عراق میں زمینی جنگ لڑنے والے تمام امریکی فوجی بدترین نفسیاتی مریض بن چکے ہیں ان کے انٹرویوز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ معصوم لوگوں کو قتل کر کے اپنے ضمیر کو نہایت شرمسار محسوس کرتے ہیں۔ قدیم طریقہ جنگ میں جنگ خون تشدد کے اثرات انسانوں کو بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتے تھے۔ وہ انسان کو کم از کم اپنی نظروں میں حقیر، کمتر، ذلیل، ظالم، خونی ثابت کرتے تھے لوگ اپنے آپ کو ملامت کرتے ہوئے زندگی بسر کرتے، قدیم جنگی طریقے لوگوں میں ضمیر، ایمان، اور صداقت کے دیے روشن رکھتے تھے، جدید طریقہ جنگ، صداقت، سچائی کا سب سے پہلے خون کرتی ہے، اسے سچائی کی ضرورت نہیں وہ میڈیا کے جھوٹ اور میڈیا سے پیدا کردہ Third order Reality کے سائے میں اپنی زندگی بسر کر دیتی ہے۔

<u>لبرل ازم نے اپنے بدترین تشدد کو بھی جمالیاتی رنگ دے دیا ہے</u>

لبرل ازم کا کمال یہ ہے کہ اس نے تشدد، دہشت گردی انسانیت دشمنی کو جمالیاتی رنگ دے دیا لہٰذا اس کے جمال کی رنگینی تشدد کی سنگینی کی طرف لوگوں کو متوجہ نہیں ہونے دیتی۔ ترقی کو ایک عقیدے کے طور پر قبول کرنے کے بعد ترقی بھی جمالیاتی ہو گئی حالانکہ اس ترقی کے نتیجے میں روزانہ ہزاروں لوگ ہلاک ہوتے ہیں ہزاروں لوگ زخمی ہوتے ہیں اور ہزاروں لوگ عمر بھر کے لیے معذور ہو جاتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ جمالیاتی تشدد جو ترقی کا نتیجہ ہے کسی کو تشدد ہی محسوس نہیں ہوتا فضائی آلودگی، آلودہ پانی، صنعتوں کے فضلے، صنعتی کاموں میں روزانہ کتنے لوگ مر رہے ہیں زخمی ہو رہے ہیں انٹرنیٹ اور New left میں اس سلسلے کے اعداد و شمار پڑھ لیجیے آپ حیران رہ جائیں گے مگر جدید تشدد کو کوئی تشدد ہی نہیں سمجھتا صرف مشال خان پر حملے کا واقعہ ہی تشدد کہلاتا ہے۔ غالب مسلط نظام زندگی جسے تشدد کہہ دے ظاہر ہے وہی تشدد سمجھا جائے گا یہ میڈیا اور سرمایہ دارانہ نظام کی طاقت ہے جس سے ہم ناواقف ہیں۔

جدید تشدد کی جمالیات کے چند مظاہرے دیکھیے جاپانیوں نے اپنے ظلم سے اتنے چینیوں کو ہلاک نہیں کیا جتنے چینی خود چین کے رہنما ماؤزے تنگ کے مظالم، غلط فیصلوں اور ترقی یافتہ منصوبوں کی وجہ سے قحط، بھوک، بے روزگاری، جبری منتقلی کے ذریعے ہلاک ہو گئے ان کی تعداد لاکھوں میں ہے مگر کوئی چینی اسے تشدد بربریت ظلم تسلیم نہیں کرے گا لیکن جاپان کے ہاتھوں چند ہزار چینیوں کے قتل کو قیامت تک بدترین جارحیت کے طور پر پیش کیا جاتا رہے گا۔

<u>دنیا میں سب سے بدترین تشدد اسکول جانے والے بچوں پر</u>

شرمین عبید چنائے کبھی بچوں پر تشدد کی فلم نہیں بنائے گی

گا شو بزنس کی صنعت میں عورت اور مرد کا میک اپ ایک بہیمانہ عمل ہے یہ Torture ہے یہ بد ترین violence ہے کسی ڈرامے، فلم میں اداکاری کے لیے تین گھنٹے تک میک اپ کیا جاتا ہے پھر اسے اتارنے کے لیے مزید تین گھنٹے لگتے ہیں عورت مرد روزانہ یہ تکلیف Pain جبر Torture تشدد Violence برداشت کرتے ہیں کیوں کہ اس کا جمالیاتی پہلو اتنا دل فریب ہے کہ اس کی تکلیف خود رفع ہو جاتی ہے کوئی اسے ظلم تشدد نہیں کہتا۔

ہر گھر میں روزانہ بچوں پر شدید ظلم، تشدد، بہیمانہ سلوک ہوتا ہے انہیں جوتے، ٹھڈے، مکے، گھونسے تھپڑ، لاتوں، ڈنڈوں سے مار مار کر۔ ان کا کچومر نکال کر بھرتا بنا کر سگے ماں باپ انہیں اسکول بھیجتے ہیں، ہر گھر سے صبح سویرے دل دوز چیخیں، رونے پیٹنے کی آوازیں آتی ہیں، ماں باپ، نیند سے مغلوب، بند آنکھوں والے معصوم بچوں، سوتے، منہ بسورتے، روتے، بلکتے نونہالوں کو بستروں سے کھینچ کھینچ کر، پکڑ پکڑ کر باہر نکالتے، مارتے پیٹتے اور جگا کر جبراً اسکول بھیجتے ہیں اس ظلم کی فلم کوئی NGO نہیں بناتی۔ شرمین عبید چنائے جو امن عالم کی سفیر ہے وہ بھی اپنے گھر، خاندان، ارد گرد، بچوں پر ہونے والے اس تشدد جبر کی فلم کبھی نہیں بنائے گی۔ کیونکہ اس فلم پر کوئی آسکر ایوارڈ نہیں ملے گا یہ فلم لبرل ازم کے عقیدے، آزادی بذریعہ تعلیم، بذریعہ سرمایہ داری کے جدید ڈسکورس کی بہیمیت، سفاکی، درندگی، وحشت واضح کردے گی لہذا آپ کو یوٹیوب پر بھی دنیا میں اس ظلم کی کوئی ویڈیو فلم نہیں ملے گی اس ظلم کا شکار ہونے والے بچے اولاد بھی اس ظلم کی تصویر بنا کر یوٹیوب پر نہیں ڈالتے۔ کیونکہ کوئی بھی جدید انسان جو آزادی، ترقی کے عقیدے کو قبول کر چکا ہے اس ظلم کو ظلم ہی نہیں سمجھتا۔ آدمی جس عقیدے پر ایمان لاتا ہے اس عقیدے کی خاطر، عقیدے کا ظلم، جبر بھی خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ جبر کو برداشت کرنے کے لئے فرد کی رضامندی اس کے عقیدے کا اظہار ہے لہذا آزادی کے عقیدے پر۔ مذہبی، غیر مذہبی سب لوگوں کا اس قدر ایمان ہے کہ کسی نے آج تک اپنے بچوں پر اپنے ہاتھوں روزانہ ہونے والے ظلم کی فلم بنا کر فیس بک پر Upload نہیں کی کیونکہ سب اس ظلم، جبر، تشدد کو آزادی کے لئے، سرمایہ کے لئے، معیار زندگی کے لئے، بچے کی دنیا بہترین بنانے کے لئے ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح مذہب میں بھی جبر ہوتا ہے، مذہب بھی اپنے عقیدے، ایمان کا اظہار کرتا ہے۔ مردان یونیورسٹی کے تین ہزار طلباء نے اپنے عقیدے، ایمان کا اظہار کیا یہ مذہب کا جبر تھا۔ مگر یہ جبر بہت سے لوگوں کو پسند نہیں آتا حتی کہ بہت سے مذہبی لوگوں کو اور آپ جیسے علماء کو بھی پسند نہیں آیا کیوں کہ صرف مذہب کا جبر انسانی حقوق کے منشور کی روشنی میں سب کو جبر نظر آتا ہے مگر تعلیم کا جبر سرمایہ کا جبر کسی کو جبر نظر نہیں آتا چونکہ معاشرہ عملاً سیکولر ہو رہا ہے لہذا ان تین ہزار عاشقان رسول کے جذبہ ایمانی کی حمایت کے لئے کوئی کھڑے ہونے کی جرات نہ کر سکا۔ بڑے بڑوں کے قدم ڈگمگا گئے، دل ڈول گئے، روح فنا ہوگئی، خون خشک ہوگیا۔ سرتن سے جدا۔ کا نعرہ تخلیق کرنے والے۔ اور عشق رسالت کے لیے نعتیں پڑھ کر جان دینے کا دعویٰ کرنے والے بڑے بڑے ٹی وی کے مفتی اور چینل کے عالم مشال کے مسئلے پر دس سطریں لکھنے کے قابل نہ رہے سب کے سب شرمندہ، خجل اور نہایت خوف زدہ تھے۔

جس جبر و ظلم کے ساتھ جمالیات اور ترقی ہو وہ قبول ہے

عصر حاضر میں مذہب کا ہر حکم سب کو جبر نظر آتا ہے مگر آزادی کا جبر کسی کو نظر نہیں آتا بچوں کو صبح صبح درندگی کے ساتھ اسکول بھیجنے کا جبر ترقی کی وجہ سے قابل قبول ہے یہ آزادی کے عقیدے کا جبر ہے۔ عورت گھر میں شوہر ساس کا کام کرے اور اس دوران اسے ڈانٹ ڈپٹ سننی پڑے تو یہ ظلم، عورت کی آزادی پر ڈاکہ، ان کی شخصیت پر جبر سمجھا جاتا ہے مگر یہی عورت جب ہسپتال میں نرس ہوٹل میں ویٹر ہوائی جہاز میں ایر ہوسٹس بن کر جاتی ہے اور اس سے صارفین clients جو کچھ کرتے ہیں اس پر یہ مسکراتی رہتی ہے برداشت کرتی ہے شکایت تک زبان پر نہیں لاتی لڑائی جھگڑا نہیں کرتی نوکری نہیں چھوڑتی یہ اس کے پیشے اور پیسے [Capital] کی جمالیات ہے جس نے اسے اس درد دکھ تکلیف تشدد ظلم کو قابل برداشت بنالیا ہے۔ ہر ایک ترقی چاہتا ہے لہذا ترقی کی جمالیات تشدد کی بہیمیت پر غالب آجاتی ہے کوئی اس جبر ظلم کو جبر ظلم نہیں کہتا عہد حاضر جمالیات کا عہد ہے میڈیا کی جمالیات کے سحر میں بہت سی حقیقتیں بلکہ تلخ ترین حقیقتیں بھی او جھل ہو جاتی ہیں یہی صورت حال Terror اور Violence کی ہے اس کا سحر سب کچھ چھپا دیتا ہے ڈرون حملے کی صرف اطلاع آتی ہے ایسا لگتا ہے جیسے بس یہ امن کا کوئی پیامبر ہے ڈرون بھی جمالیاتی منظر بن گیا ہے اور علم تحقیق ترسیل تصویر، معلومات اور ابلاغ کی ایک علامت کے طور پر تسلیم کرلیا گیا ہے زندگی کا حصہ بنا دیا گیا ہے۔

لبرل ازم کا تشدد مشال واقعے کے مقابلے میں ہزاروں گنا بڑا تشدد ہے

لبرل ازم کے تشدد کی تاریخ۔حوالوں کی روشنی میں

لبرل ازم کے بارے میں عالم اسلام کا خیال یہی ہے کہ یہ بہت پر امن نظام زندگی ہے بہت سے اسلامی مفکرین اسلام اور لبرل ازم میں مماثلت ،مشابہت ثابت کر رہے ہیں اور اسلامی علمیت اور لبرل اقدار میں اختلاف تضاد نظر نہیں آ رہا مگر خود لبرل اپنی دہشت گردی کے بارے میں کیا کہتے ہیں اس پر بہت کچھ لکھا گیا ہے ہم نے حضرت والا کی خدمت میں لبرل ازم کے تشدد بہیمیت کے واقعات اختصار سے پیش کیے اب اس گفتگو کو مصادر و ماخذات کے حوالوں سے مزین کر کے آئندہ سطور میں پیش کیا جا رہا ہے تا کہ آئندہ جب لبرل ازم کے حامی اسلام کو،اسلامی جہاد کو اور مشال خان کے واقعے کو ظلم تشدد دہشت گردی کے طور پر پیش کریں تو ہمارے قارئین لبرازم کی درندگی کے حوالے سے یہ تمام تاریخی واقعات اور شہادتیں ان کی خدمت میں پیش کر دیں۔اور تمام پاکستان لبرل کو لبرل ازم کا اصل چہرہ دکھا دیں

مشال کا واقعہ تاریخ کی بدترین دہشت گردی ہے:غامدی

لبرل ازم کی دہشت گردی سفاکی کا حضرت کو علم ہی نہیں

ہمارے غامدی صاحب نے عاصمہ چوہدری کو انٹرویو دیتے ہوئے مردان یونیورسٹی کے واقعے کو تاریخ انسانی کی سب سے بڑی دہشت گردی قرار دیا ہے اولاً یہ واقعہ دہشت گردی نہیں ثانیاً غامدی صاحب کو دہشت گردی کی اصطلاح کا جدید مطلب ہی نہیں معلوم۔وہ دہشت گردی پر ایک اہم کتاب Global Terrorism پڑھ لیں ان کو اپنی جاہلیت کا اندازہ ہو جائے گا۔ثالثاً عشق رسول کو دہشت گردی کہنا ضلالت کے سوا کچھ نہیں رابعاً غامدی صاحب لبرل ازم ،سیکولرازم ،سوشلزم ،نیشنل ازم ،کمیونزم اور جدید عالمی استعمار امریکہ ،فرانس ،برطانیہ ،چین ،روس کی دہشت گردی کی تعریف سے واقف ہی نہیں اگر وہ یہ تاریخ پڑھ لیتے تو کبھی اسقدر جاہلانہ دعویٰ نہ کرتے۔لبرل ازم کا سب سے بڑا فلسفی جان رالس جس نے مرتے ہوئے لبرل ازم کو دوبارہ زندہ کیا خود دہشت گرد ہے اسکی کتاب اور Theory of JusticePolitical Liberalism پڑھ لیجیے۔

لبرل ڈربن کہتا ہے جو آزادی جمہوریت کی دلیل مانگے اسے گولی مار دو:

اس صدی کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی John Rawls نے لبرل ازم کو زندہ کرنے کے لیے جتنی بھی دلیلیں دی ہیں وہ سب کی سب ایمانی دلیلیں ہیں ان میں کوئی عقلی دلیل نہیں ہے رالز کے تمام دعوے صرف مفروضات ہیں۔سوال یہ ہے کہ سرمایہ داری کے نظریہ لبرل ازم اور سرمایہ داری کے بنیادی عقیدوں ،آزادی ،مساوات ،دستوری آئینی جمہوریت اور ترقی ،پر ہم کیوں ایمان لائیں۔

جاوید غامدی امت کو لبرل ازم تمام عقیدوں پر ایمان لانے کی دعوت دے رہے ہیں سوال یہ ہے کہ ان عقیدوں کی عقلیت [Rationality of Faith] ان عقائد کی عقلی توجیہ کیا ہے تو اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جان رالس کا شارح ڈربن اپنی کتاب "On Rawls & Political Liberalism" میں صاف صاف لکھتا ہے آئینی دستوری لبرل جمہوری روایات اور ریاست عہد جدید کا الحق اور الخیر [Suprem Good] ہے جس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں اگر کوئی جاہل شخص لبرل دستوری جمہوریت جیسے معیاری ،مثالی نظام میں زندگی بسر کرنے کے فوائد اپنی آنکھ سے نہیں دیکھ سکتا تو میں یہ بات سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ایسے جاہل کو کس طرح سمجھایا جائے۔اس مسئلے کا حل یہ ہے کہ ایسے شخص کو گولی ماردی جائے ایسے احمق جاہل شخص کے ساتھ مکالمے کی ضرورت نہیں ان موضوعات پر کسی کو دلیل دینے کی ضرورت نہیں کیوں کہ جمہوریت آزادی مساوات دستوری ریاست کو ہم بدیہی حقیقت ،ناقابل تردید سچائی ،امر لازم taken for granted سمجھتے ہیں ایسی آفاقی حقیقتیں جن میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں اس کے لئے دلائل کی ضرورت

نہیں ڈربن لکھتا ہے:

What Rawls is saying is that there is in a constitutional liberal democracy a tradition of thought which it is our job to explore and see whether it can be made coherent and consistent... We are not arguing for such a society. We take forgranted that today only a fool would not want tolive in such a soceiety... If one cannot see the benefits of living in a liberal constitutional democracy, if one does not see the virtue of that .ideal, then I do not know how to convince him. Tobe perfectly blunt,sometimes I am asked,when I goaround speaking for Rawls, What do you say to an Adolf Hitler? the answer is [nothing]. You shoot him. You do not try to reason with him. Reason hasno bearing on this question. So I do not want to discuss it (Burton Derben on Rawls & Political Liberalism *in the cambridge companion to Rawls* [ed.S.R.,Freeman] UK: Cambridge University Press USA 2003 Page 328-329)

لبرل ازم کے دشمنوں کو جراثیم کی طرح ختم کردیا جائے:John Rawls

ممکن ہے غامدی صاحب فرمائیں کہ یہ جان رالز کے شارح ڈربن کا بیان ہے رالز کا نقطۂ نظر نہیں ہے مگر یہ بات بھی درست نہیں ہے خود رالز اپنی کتاب Political Librealism میں یہی جارحانہ، متشددانہ، دہشت گردانہ نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ لبرل ازم کے پیش کردہ آفاقی تصور عدل اور لبرل سرمایہ دارانہ معاشرے کی اقدار کے مخالفین ومنکرین جو اس اعلیٰ ترین نظام زندگی کو تلپٹ کرنا چاہتے ہیں ان کو نہایت بے رحمی کے ساتھ پوری طاقت سے۔اس طرح کچل دینا چاہیے جس طرح جنگوں کو اور جراثیم کو ختم کردیا جاتا ہے۔تاکہ یہ وحشی اور جنونی لبرل نظام عدل کو تہس نہس نہ کرسکیں۔

رالس کے الفاظ پڑھیے:

That there are doctrines that rejects one or more democratic freedom is itself a permanent fact of life, or seems so. This gives us the practical task of containing them__like war and disease __ so that they do not overturn political justice [John Rawls, Political Liberalism, New York : Columbia University Press, 2005, p.64]

مغربی تہذیب درندگی و بربریت کی تہذیب ہے:Enzo Traverso

میڈیا لبرل سیکولر نظام تعلیم کے بعد سرمایہ دارانہ جمہوری سیکولر، لبرل علمیت، انفرادیت، معاشرت، تہذیب کے غلبے کا سب سے بڑا ذریعہ ہے یہ لبرل انفرادیت تعمیر [Construction of Libral Self] کرنے کا اہم ترین وسیلہ ہے۔میڈیا کے ذریعے لبرل ازم کے تمام مخالفین کو اس نظام میں ضم کرلیا جاتا ہے جو اس نظام میں ضم نہیں ہوسکتے ان کو یا تو اچھوت بنادیا جاتا ہے یا ان کو ایک اقلیت کا درجہ دے دیا جاتا ہے اگر یہ اقلیت اس نظام کے لیے خطرہ بنے تو اس اقلیت کو نظام کے تحفظ کے لیے قتل بھی کردیا جاتا ہے [Black Pathor Movment] کو امریکی حکومت نے ایک رات میں قتل کرکے ہمیشہ کے لیے ختم کردیا تھا____ لبرل ازم اور اس کی جمہوریت زبردست بہیمیت، بربریت اور وحشت و دہشت گردی کے ذریعے دنیا پر مسلّط ہوئے آج لبرل ازم آپ کو جتنا شریف نظر آتا ہے اتنا شریف نہیں ہے اس کی پوری تاریخ دہشت گردی، بہیمیت، درندگی، ظلم وستم کی تاریخ ہے اس کے چند حوالے اس مضمون میں موجود ہیں طلال اسد کی کتاب On Sucide bombing پڑھ لیجیے۔جان لاک نے سرخ ہندیوں کے قتل عام کا جو فلسفیانہ جواز پیش کیا تھا وہ بھی لبرل ازم کی تاریخ کا سیاہ ترین باب ہے۔لاک نے کہا تھا کہ یہ انسان نہیں بن سکتے یہ کسی ملکیت کے قائل نہیں لہٰذا ان کا مجبوراً خاتمہ ضروری ہے جو شخص سرمایہ جمع کرنے اور سرمایہ سے سرمایہ میں اضافہ کرنے کے لئے تیار نہ ہو لبرل ازم کی نظر میں وہ انسان ہی نہیں ہے کیونکہ آزادی کا حصول سرمایہ کے بغیر ممکن نہیں اور آزادی کی ٹھوس شکل بس سرمایہ ہی تو ہے۔ہولوکاسٹ کے حوالے سے Enzo Trave so مغرب اور لبرل ازم کی بہیمیت کی کامل نمائندگی کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ بہیمیت اور بربریت کوئی اتفاقی حادثہ یا مغرب کا اپنی تاریخ سے انحراف نہیں تھا بلکہ یہ واقعہ مغربی تہذیب کی مستند ترین تخلیق [Product] تھا۔دوسرے معنوں میں

درندگی بربریت مغرب کی تہذیب کا خاص کارنامہ ہے۔

Holocaust was not abervation of History it was an authentic Product of Westren Civilization

اس بہیمیت کی ایک انتہائی شکل نیمبیا کے Herero گروہ کی ملک بدری اور قتل عام تھا جسے سیاسی فلسفی FriedrichRatzel کے فلسفے نے ممکن بنایا وہ کہتا تھا

Migration being Crucial to the Survival of Human Races

اسی فلسفی نے ایک اصطلاح Lebensraum تخلیق کی Herero کو ملک بدری کا حکم دے کر انھیں دور دراز پھینکا گیا عورتوں کے کیمپوں میں بھوک افلاس کا نتیجہ یہ تھا کہ وہ مردہ لوگوں کے سروں کی کھالوں کو چھیل کر اور اُبال کر کھا رہی تھیں۔ غامدی صاحب بتائیں کہ اس درندگی پر وہ کیا فرماتے ہیں؟

مؤرخ Dennis Luaman نے لکھا ہے

Boiled & Scraped the skin off the heads of Heroero who had been Killed. Those skulls were then shipped off to Germany for museum displays and eugenics research.

فرانز فینوں [Frantz Fanon] نے اپنی کتابوں میں استعماری دہشت گردی اور اس کے مدمقابل مزاحمتی تحریکوں کی تاریخ پر بہت لکھا ہے اس کی اہم کتابیں درج ذیل ہیں

(1) Black Skin, White Masks
(2) A Dying colonialism
(3) The wretched of the Earth

وہ لکھتا ہے کہ استعمار کی مزاحمت کرتے کرتے غلام قوموں میں باہمی تشدد اور جنگ وجدال کا جذبہ بھی غیر معمولی حد تک قوی ہو جاتا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ تمام یورپی استعماری قوتوں نے تشدد کے ذریعے ہی اپنا اقتدار قائم کیا کالونیل ازم کی تاریخ اس کا ثبوت ہے۔

غامدی صاحب نے حنا آرنیڈٹ Hannah Arendet کی کتاب The Origions of Totalitarianism نہیں پڑھی جس میں وہ بتاتی ہے کہ یورپی استعماریت کو روح اور خوراک مہیا کرنے والی نسل پرستی پلٹ کر یورپ میں بڑے پیمانے پر قتل عام [Genocide]، دہشت گردی اور یہودیوں کی بدترین نسل کشی کا سبب بنی ہاریرو Harero اور ناما [Nama] قبائل کے ایک لاکھ لوگوں کا قتل عام نسل پرستی کی بربریت کا معمولی ثبوت ہے۔

البرٹ میمی کی کتاب The Colonizer & the Colonized شمال افریقہ میں فرانسیسی استعمار کی دہشت گردی کی ہولناک کہانی سناتی ہے۔ عسکری، اقدامی دہشت گردی سے قطع نظر __ مغرب نے علمی ثقافتی، سائنسی، لسانی، ماحولیاتی اور معاشرتی دہشت گردی کے ذریعے پوری دنیا کو جغرافیائی اور جسمانی طور پر آزاد کرنے کے بعد __ اپنی ذہنی، علمی اور روحانی غلامی میں لے لیا ہے غلام اپنے آقا کے عشق میں گرفتار ہیں۔

استعماریت کی طاقت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے معاشرت اور فطرت، معاشرتی تعلقات کے قانون بانوں اور انسانی معاشرت کو جدید نظم وضبط اور تنظیم کے ذریعے ختم کر دیا ولیم وائٹ کی کتاب The Organization Man اور فوکالٹ کی کتاب Discipline & Punish ہمیں بہت سے اہم مباحث سے آگاہ کرتی ہے۔ مشین اور ٹیکنالوجی نے خدا کی جگہ لے لی ہے ہائیڈگر، ممفر ڈ اور جے الول [Heidegger, Mumford & J. Illul] نے ان مباحث پر بہت کچھ لکھا ہے یہ جدید خدا مغربی، یورپی، امریکی استعماریت کی عالمگیریت قائم کر رہے ہیں اور فطرت کو مسخ کر رہے ہیں یرگن ہابر ماس [Jurgen , Haberas] نے جدید ایجادات کے ذریعے قائم ہونے والی استعماریت کا ذکر The

Philosophical Discource of Modernity میں کیا ہے وہ بتاتا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں ریلوے کے نظام نے یورپی انسان کے زمان ومکان کے ادراک کو اس کی جڑوں اور بنیادوں تک تبدیل کر کے رکھ دیا۔

میڈیا، انٹرنیٹ، فیس بک، موبائل فون نے تو ہر انسان کو کالونائز کر لیا ہے تاریخ انسانی کی ایسی جابر تہذیب کے جبر کے مقابلے پر غامدی صاحب اسلام کو ایک جابر تہذیب ثابت کر رہے ہیں یہ جہالت کی آخری انتہا ہے۔

غامدی صاحب لبرل ازم کس قسم کی درندگی اور سفاکی کرتا ہے: چند ہولناک مثالیں

عورت نے مزاحمت کی تو اسے خونخوار کتوں کے سامنے کھانے کے لیے پھینک دیا گیا

غامدی صاحب توہین رسالت کے مسئلے پر مسلمانوں کی جانب سے چند متشدد واقعات کی بنیاد پر فرماتے ہیں کہ مسلمان دنیا کے سب سے بڑے دہشت گرد ہیں اور اسلامی علمیت مدارس، مساجد، ملا اس دہشت گردی کا اصل سبب ہے یہ تاریخی جھوٹ ہے مسلمانوں کا تشدد لبرلز کے تشدد کا مقابلہ ہی نہیں کر سکتا۔ ہم لبرل ازم کی تاریخ سے اس کی درندگی کے چند واقعات پیش کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ مثال کا واقعہ درندگی کی انتہا ہے یا نہیں۔

ٹوٹیان ٹوڈوروف Todorov اپنی کتاب میں لکھتا ہے

باکلان کی جنگ میں ایک خوب رو مقامی عورت کو گرفتار کر لیا۔ اس عورت نے اپنے شوہر سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ لڑتے ہوئے مارا گیا، تو وہ کسی اور مرد کو اپنے قریب نہ آنے دے گی، چنانچہ کسی قسم کا اصرار بھی اس عورت کو، اپنا یہ رویہ بدلنے پر مجبور نہ کر سکا کہ وہ اس خوف سے، کہ کوئی یورپی اس پر دست اندازی کرے، اپنی جان لے لے گی۔ چنانچہ اسے کتوں کے آگے ڈال دیا گیا۔ ٹوڈوروف نے اپنی کتاب اس گمنام عورت کے نام منسوب کی ہے ''جسے کتوں نے پھاڑ کھایا تھا''۔(The Conquest of America: The Question of the Other (New York: Harper & Row, 1984]

کیا اس قسم کی سفاکی کا مظاہرہ کسی مسلمان کی جانب سے کبھی ہوا؟

امریکی کانگریس میں سرخ ہندیوں کے قتل عام کی شہادت Report on the conduct of the war میں ایک فوجی افسر کی شہادت موجود ہے۔

تین سالہ بچے کو تین لبرلز فوجیوں نے بے دردی سے قتل کیا:

یہ لڑکا مشرقی کالوراڈو کی ایک ندی کے پرسکون کنارے پر کھیلا کرتا تھا، یہاں تک کہ سنہ ۱۸۶۴ء کی ایک صبح امریکی فوجی وہاں پہنچے۔ ایک گھوڑسوار امریکی فوجی بیان کرتا ہے، کہ جب اس کے ساتھ کے دوسرے فوجی وہاں کی تمام عورتوں اور بچوں کو پکڑ کر انہیں ذبح کر رہے تھے اور ان کے جسموں کے ٹکڑے کر رہے تھے تو اس نے دیکھا کہ ایک لڑکا فرار ہونے کی کوشش کر رہا ہے: ''یہ ایک بچہ تھا جو شاید تین برس کا ہوگا اور بس ریت میں چلنے کے قابل ہو گیا تھا۔ یہ بچہ فرار ہونے والوں کے پیچھے پیچھے جا رہا تھا۔ اس بچے کے تن پر کوئی کپڑا نہ تھا، اور وہ ریت پر چل رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک فوجی جوان گھوڑے سے اترا، اور بچے سے کوئی پچھتر گز کے فاصلے سے اس نے اپنی رائفل سے نشانہ باندھ کر گولی چلا دی۔ نشانہ خطا ہوا۔ ایک اور فوجی جوان یہ کہتا ہوا آگے بڑھا: مجھے اس کتیا کے بچے پر نشانہ آزمائی کرنے دو، میرا نشانہ خطا نہیں ہوگا۔ وہ اپنے گھوڑے سے اترا، جھکا، اور ذرا سے بچے پر گولی چلا دی۔ یہ نشانہ بھی خطا ہو گیا۔ اب تیسرا فوجی بھی یہی کہتا ہوا آگے بڑھا، گولی چلائی، اور بچہ وہیں ڈھیر ہو گیا''۔

Report on the conduct of the war (38th Congress, second session 1865), p.27

غامدی صاحب بتائیں کہ درندگی کی ایسی کوئی مثال انھیں اسلامی تاریخ میں ملتی ہے؟

امریکہ کی حمایت سے امریکہ کی مقامی قدیم مایا تہذیب کے لوگوں کے ساتھ گواٹیمالا میں کیا درندگی ہوئی اس کی تفصیل Mayas Aiding Mayas: Guatemalan Refugees in chiapas Mexico میں پڑھیے یہ مقالہ Havvert of viloence میں موجود ہے D.M. Earler لکھتا ہے

<u>لبرلز نے چھ ماہ، نوماہ، دوسال کے بچوں کو گلا گھونٹ کر قتل کر دیا</u>

بچوں کے قتل سے سکون نہ ملا تو انھیں جلا دیا گیا

سنہ ۱۹۸۲ء میں گواٹیمالا میں فوج کے ہاتھوں واقع ہونے والے قتل عام کے بارے میں ایک گواہ کا بیان ہے: ''انہوں نے دو دو، اور چار چار سالہ بچوں کو گھسیٹا اور انہیں دو ٹکڑے کر دیا۔

''انہوں نے دو دو سال، نو نو ماہ، اور چھ چھ ماہ کے بچوں کو ٹورنیکے سے گلے گھونٹ گھونٹ کر قتل کیا، اور قتل کرنے کے بعد سب کو زندہ جلا دیا۔ میرے باپ کے ساتھ انہوں نے یہ کیا کہ اس کے سینے پر مگدر سے کئی وار کیے اور اس کا دل نکال کر اسے شق کیا، اور جلتا ہوا چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ وہ دکھ ہے جو ہم کبھی نہیں بھول سکیں گے۔۔۔ بہتر ہے کہ ہمیں ایک گولی مار کر قتل کر دیا جائے، بجائے اس کے کہ ہم اس طرح مارے جائیں جیسے میرے باپ کو قتل کیا گیا۔''[Harvest of Violence 263] اس کتاب میں دیے گئے دیگر بشریاتی بیانات سے یہ امر بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ گواٹیمالا کی حکومت کا مایا قبیلوں کا مسلسل قتل عام امریکی حکومت کی رضامندی اور ان کی مالی معاونت ہی سے ممکن ہوا۔

تفصیلات کے لیے The Battle for Guatemala: Rabels, Deaths squads and US Power دیکھیے اسی کتاب میں یہ شرمناک واقعہ بھی درج ہے

<u>لبرلز نے چھریوں سے بچوں کے پیٹ کاٹ دیے یہ انسانیت ہے</u>

دوپہر ایک بجے کے قریب، فوجیوں نے چرچ کے اندر موجود خواتین پر فائرنگ شروع کر دی۔ ان میں سے اکثر کی موت موقع پر ہی واقع نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے انہیں ان کے بچوں سے الگ کر کے گروہ در گروہ ان کے گھروں کو لے جایا گیا، وہاں انہیں مگدروں سے قتل کر دیا گیا۔ پھر وہ بچوں کو مارنے کے لیے لوٹے، جو اپنی ماؤں سے الگ ہونے کے بعد چیخ و پکار کر رہے تھے۔ ہمارے لوگ برابر میں ایک عمارت کے اندر بند کر دیے گئے تھے لیکن وہ سوراخوں اور دروازوں سے جھانک کر اس منظر کو دیکھ رہے تھے۔ فوجیوں نے چھریوں سے بچوں کے پیٹ کاٹ دیے۔ بعض بچوں کو پاؤں پکڑ کا لٹکایا اور لٹھ مار کر ان کے سر توڑ دیے۔ پھر انہوں نے مردوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ انہیں باہر نکال کر ان کے ہاتھ باندھے، اور زمین پر پھینک کر گولی ماردی۔ علاقے کے سربرآوردہ لوگوں کو سرکاری دفاتر میں پہلے ہی قتل کر دیا گیا تھا۔ اس بستی کے قتل عام میں ۳۵۲ سرخ فاموں کے قتل ہوئے۔ لیکن اس مہم میں سرکاری افواج نے اسی طرح کی ۴۴۰ بستیاں تہ تیغ کیں۔ اس دور میں ہر سال دس ہزار پرامن شہری ''غائب'' ہوتے رہے۔[The Battle for Guatemala p. 145]

S. F. Cook کا مقالہ The Abriginal population of Hispaniola Essays in Population History Volue I میں شامل ہے براعظم امریکہ میں سرخ ہندیوں کے قتل عام کی کہانی سناتا ہے کوک نے امریکہ کو ہسپانولیہ کا نام دیا تھا وہ لکھتا ہے

اسی لاکھ مقامی باشندے تشدد، بیماری اور بدحالی سے ہلاک ہو چکے تھے۔ جو کچھ امریکہ میں ہوا وہ ہیروشیما جیسے پچاس واقعات کے برابر تھا اور ابھی یہ مقامی آبادی کی نسل کشی کی ابتدا ہی تھی۔

یورپی اقوام سے سامنا ہونے کے چند نسلوں بعد، مغربی کرۂ ارض کی مقامی آبادی کی اکثریت صفحۂ ہستی سے مٹ چکی تھی۔ برسوں کی تحقیق کے

بعد آبادی کا مطالعہ کرنے والے مورخین نے ایک کے بعد ایک علاقے کا مطالعہ کیا اور دکھایا کہ یوروپی حملے کے بعد مقامی آبادی میں کمی کی عمومی شرح نوے اور اٹھانوے فیصد کے درمیان تھی۔ اور اب علمی دنیا میں کولمبس کی آمد کے بعد سرخ فاموں کی آبادی میں کمی کے لیے پچانوے فیصد کی شرح بطور معیار قبول کی جاتی ہے۔ کولمبس سے قبل امریکہ کی مقامی آبادی کئی ملین تھی۔ لیکن یوروپی اقوام کی آمد کے بعد بمشکل پانچ فیصد زندہ بچے۔ یعنی قتل عام کے بعد ہر بیس سرخ فاموں میں سے بس ایک زندہ بچ رہا[p. 376-410]

<u>سرخ ہندیوں کی عبرت ناک اموات: مائیکل مین کی شہادت پڑھیے:</u>

۱۸۴۸ء میں کیلی فورنیا کو ملک میکسکو سے کاٹ کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں سرخ ہندیوں کے بالارادہ قتل میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، اس قتل عام کی سب سے بڑی وجہ جبری امراض اور بھوک سے زوال پذیر قوت مزاحمت کے باعث بیماریاں تھیں، صرف دس فی صد سرخ ہندی براہ راست قتل کیے گئے جب کہ ساٹھ سے ستر فی صد مقامی آبادی کو بھوک، قحط، نسل کشی، عورتوں مردوں کی شادیوں پر قدغن، کم شرح افزائش اور خطرناک بیماریوں کے ذریعے جو محض اتفاقی اور حادثاتی نہیں تھیں، قسطوں میں ہلاک کر دیا گیا۔ جبری غذائی قلت کا شکار یہ سرخ ہندی جو سالوں سے قوت مزاحمت کھو رہے تھے، ان بیماریوں کا خاص نشانہ تھے، اگر ان کے جسم تنومند ہوتے، انھیں پیٹ بھر کر مناسب خوراک وقت پر ملتی ان کی صحت قابل رشک ہوتی تو یقیناً یہ بیماریوں کا مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن ان کو لاغر، کمزور، ناتواں شاید اسی لیے رکھا گیا تھا تاکہ یہ بیماریوں کے پھیلائے جال میں آسانی سے لقمہ اجل بن سکیں اور ان کی موت کا ذمہ دار گردش سماں کو ٹھہرایا جائے اور قاتل ہر الزام سے بری ہو جائیں۔ بیماریوں، وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے حکمراں طبقات اور یوروپی آبادکاروں نے کوئی اقدام نہیں کیا، سرخ ہندیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، یہ مہذبانہ قتل عام تھا، پہلے عیسائی بنایا گیا پھر بھوکا مارا گیا، پھر بیماریوں کے علاج کے لیے سہولت مہیا نہ کی گئی۔ اس کے برعکس حبشی غلاموں کو بیماریوں سے تحفظ کے لیے سفید فام یوروپی آبادکاروں نے بھرپور رہنمائی کی، انھیں چیچک سے بچایا گیا کیونکہ وہ قیمتی اور کارآمد تھے، اس کے برعکس سرخ ہندیوں کو مرنے دیا گیا بلکہ حبشیوں کے اتارے ہوئے کمبل سرخ ہندیوں کو دیئے گئے تاکہ وہ چیچک سے مرجائیں۔ امریکی دہشت گردی کی تفصیلات مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy میں دیکھی جاسکتی ہیں

مائیکل مین کے الفاظ میں اس المناک باب کو پڑھیے:

In California the interlinked categories of disease, malnutrition, and starvation killed somewhere around 60-80 percent of natives, direct killing about 10 percent, with most of the remainder attributable to reproductive failure. Deliberate killings were usually in cold blood or in situations of such an imbalance of force that the appellation murder is applicable. But none of these categories are entirely separable from each other. Malnutrition, starvation, and low fertility often resulted predictably from settler policy, while diseases were not entirely accidental. Diseases spread most rapidly where malnourished natives were herded closely together, as in California missions and the many U.S. Indian reservations located on marginal lands. The settlers were not ignorant of the disease mechanisms involved, yet they rarely took steps against epidemics to which they themselves were immune. Nor were they unhappy with the results. Nash (1992: 300-1) compares the white responses to the spread of disease among Indians and black slaves. Since slaves were valuable, the white community tried to combat epidemics among them. Slaves were inoculated against smallpox. Indians were not. Indeed, some settlers fomented disease. Reports of donations of disease-ridden blankets to Indians have become notorious, though rare. [Page No.89]

<u>کیلی فورنیا: سرخ ہندیوں کا قبرستان: The Dark Side of Democracy</u>

سرخ ہندی عورتوں کو مجبور کیا گیا کہ اپنے دشمنوں کو جنم دیں

کیلی فورنیا میں سرخ ہندیوں پر گزرنے والی شب ستم، آنسوؤں اور لہو سے تحریر کرنے کے قابل ہے۔ ان انسانوں کو براہِ راست قتل کرنے کے بجائے قسطوں میں موت کشید کرنے کے لیے کیسے کیسے طریقے اور تجربے کیے گئے اس کا تصور کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سرخ ہندیوں کی عورتوں کو مردوں سے الگ کردیا گیا تاکہ نسل میں اضافہ نہ ہو اور سرخ ہندی مرد لواطت کے ذریعے جسمانی عوارض میں مبتلا ہوجائیں۔ عورتوں کو طوائف بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر جن طوائفوں کو خطرناک جنسی بیماریاں منتقل ہوئیں انھیں جنسی خدمات انجام دینے کے لیے سرخ ہندی مردوں کے سپرد کردیا گیا تاکہ یہ بیماریاں ان میں منتقل ہوجائیں اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ سرخ ہندیوں کو شراب کا رسیا بنایا گیا تاکہ ان کی اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوجائیں اور ان کی ہلاکتوں میں مزید اضافہ ہو۔ یہ شراب مشنریوں اور حکومتی پابندیوں کے باوجود محنت کے عوض مہیا کی جاتی تھی۔ جنسی بیماریاں، کمزور صحت اور تولیدی صلاحیتوں کے خاتمے کا باعث بن گئیں۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۰ء تک کیلی فورنیا کی سرخ ہندی آبادی پندرہ لاکھ سے کم ہوکر صرف اکتیس ہزار رہ گئی جب کہ سفید فاموں کی آبادی ۲۵ ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہوگئی۔ ۱۸۶۰ء میں سرخ ہندیوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد میں کمی کا اہم عامل مردوں اور عورتوں کی بالجبر علیحدگی تھی۔ سرخ ہندی عورتیں اپنے دشمنوں کے بچوں کو جنم دیتی تھیں لیکن انھیں اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کو جنم دے سکیں اور اپنی نسل کو زمین و آسمان دیکھنے کے لیے دنیا میں آنے دیں نہ اپنے مردوں کے لیے راحت کا سامان بن سکیں، سرخ ہندی جنسی راحت کے لفظ سے ناآشنا ہوگئے تھے۔ ان کی زندگی بدترین زندگی تھی، انھیں محض اپنی زندگی کی بقاء کے لیے محنت کی اجازت تھی تاکہ وہ زندگی اور موت کے مابین معلق رہیں اور آقاؤں کی غلامی کا شرف حاصل کریں۔

گورنر برنٹ Burnett نے اعلان کیا:

A war of extermination will continue to be waged between the two races until the indian becomes extinct

the acts of these Savages are sometimes signalized by a ferocity worthy of. . . cannibals . . . They seem to cherish an instinctive hatred toward the white race, and this is a principle of their nature, which neither time nor vicissitude can impair. This principle of hatred is hereditary . . . The character and conduct of these Indians . . . [means] . . .that Whites and Indians cannot live in close proximity in peace[ibid pg. 93].

سرخ ہندیوں کے خلاف امریکیوں نے نعرہ لگایا Exterminate or Banish

امریکہ کے عظیم صدر جارج واشنگٹن نے کہا: سرخ ہندی بھیڑیے ہیں:

جارج واشنگٹن نے اپنے جنرل کو ہدیت کی تھی کہ وہ اِرُوکوا قبائل Iroquois پر حملہ کردے اور "Lay waist all settlement-that the country may not be over run but destroyed and not to listen any over tune of peace before the total ruin of their settlement is effected"

''ان کی آبادیوں کو تباہ و برباد کردیں ان کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نغمہ سننے کی ضرورت نہیں ہے''۔ اس نے سرخ ہندیوں کو بھیڑیوں سے تشبیہ دی کہ دونوں وحشی شکاری ہیں صرف شکلوں کا فرق ہے۔

Indians are wolves both being beasts of prey though they different in shape.

اس نے اعلان کیا کہ تمام سرخ ہندیوں کو مسی سپی کے مغرب کی طرف دھکیل دیا جائے اور مزاحمت کرنے والوں کو طاقت سے کچل دیا جائے۔

جیفرسن نے بھی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں اپنا لہجہ تبدیل کرلیا۔

امریکی صدر جیفرسن نے کہا: سرخ ہندیوں کی جڑیں کاٹ دو

the root-and-branch destruction of hostile tribes or driving them beyond the Mississippi: "nothing is more desirable than total suppression of their savage insolence and cruelties"; "This then is the season for driving them off"; their "ferocious barbarities justified extermination"; "if ever we are constrained to lift the hatchet against any tribe, we shall never lay it down till that tribe is exterminated, or driven beyond the Mississippi . . .. In war, they will kill some of us; we shall destroy all of them."

جیفرسن مسلسل حکم دیتا کہ دشمن قبیلوں کی جڑیں کاٹ دو یا پھر انھیں مسس پی کے پار دھکیل دو اس کا کہنا تھا کہ ان وحشی قبیلوں کے مکمل خاتمے کے سوا کوئی بات اہم نہیں ہے یہی ان کے نکال باہر کیے جانے کا وقت ہے ان کی وحشی حرکتیں قتل عام کا جواز ہیں۔ اگر ہم ان پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے تو ہم اسے ان کے مکمل خاتمے تک نیچے نہیں رکھ سکیں گے۔ جنگ کی

صورت میں وہ ہمارے چند افراد کو قتل کریں گے ہم ان کے تمام افراد کو قتل کر دیں گے۔ ۱۸۱۳ء میں اس کا خیال تھا کہ کریک قبیلہ شکست کے بعد معافی کی یہ شرط قبول کرلے گا کہ وہ اپنی تمام آبادی کو مسس پی سے باہر لے جائیں ورنہ ہم انھیں مجبور کر دیں گے۔ نہ تو جیفرسن اور نہ ہی واشنگٹن نے برطانیہ جیسے تہذیب یافتہ دشمن کے خلاف یہ زبان استعمال کی۔ جیفرسن نے سفید فاموں کے زمینوں پر قبضے کی مکمل پشت پناہی کی اس کے دور صدارت میں دو لاکھ مربع میل سرخ ہندی زمینوں پر اس کے کارندوں نے قبضہ کیا۔

جیفرسن کے خوں خوار احکامات: سرخ ہندیوں کی تحلیل، بے دخلی یا قتل

اس قبضے کے لیے جیفرسن کا فرمودہ تھا کہ وہ سرخ ہندیوں کو قرضے میں جکڑتے اور پھر اس کے بدلے وہ انھیں اپنی زیر ملکیت زمین بیچنے پر راضی کر لیتے، اس طرح سرخ ہندی اپنی آبائی شکار کی زمین سے محروم ہوتے گئے۔ سرخ ہندی سادہ لوگ تھے وہ کسی نجی ملکیت کے قائل نہ تھے تمام اشیاء زمین جنگلات خوراک ان کی اجتماعی ملکیت تھے وہ مل جل کر رہتے تھے وہ کھیتی باڑی کرنے ذاتی املاک بنانے اور پیسہ جمع کرنے یا مال سے مال کمانے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے لہٰذا وہ انسان نہیں تھے جان لاک نے اسی لیے مجبوراً ان کے قتل عام کا فلسفیانہ جواز پیش کیا تاکہ یہ تو ملکیت کے قائل ہی نہیں لہٰذا انسان نہیں بن سکتے لہٰذا انھیں قتل کیا جا سکتا ہے۔ جیفرسن نے اپنے حکام کو حکم دے رکھا تھا:

trick the Indians into debt, forcing them to sell their lands. With inadequate land left for hunting, they would have to learn agriculture and then assimilate. If they resisted this, they must be crushed; if they merely languished and starved, that proved the inevitability of their end.

اگر وہ اس پر مزاحمت کرتے تو ان کو کچل دیا جاتا اور اگر وہ فاقہ کشی کرتے تو ان کا خاتمہ لازمی تھا۔ جیفرسن کی ترجیح Assimiation تھا اس کے بعد وہ بے دخلی Deportation کا قائل تھا اگر یہ بھی ناکام ہو جائے اور مزاحمت ہو تو وہ قتل عام کا فیصلہ کرتا جیفرسن کا کہنا تھا کہ وہ ہندی نسل کی سفید فام نسل کے ساتھ برابری کا قائل ہے مگر اعلیٰ تہذیب ہمیشہ کمتر تہذیب پر غالب آتی ہے۔

he believed in the inherent racial equality of Indians (unlike blacks) with whites (Wallace, 1999: 78), but higher must triumph over lower civilizations.

امریکی صدر جیکسن کے زہریلے ارشادات: سرخ ہندی بھیڑیے

ایک اور موقع پر جیکسن نے سرخ ہندیوں کو "دھوکہ باز" اور اذیت پسند" کا طعنہ دیا اس نے اعلان کیا کہ "ہمارے مقتولین کا سر حفاظت سے رکھا ہے۔ وہ یہ کہتا تھا کہ ہندیوں سے ڈرنا ان سے محبت کرنے سے بہتر ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سرخ ہندی بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کر دیں۔ ایسا نہ کرنا بھیڑیے کو جھولے میں کھلانے کے مترادف ہوگا یہ جانے بغیر کہ وہ کب بھیڑیا بن کر کچھار میں جا پہنچے۔

"the blood of our murdered countrymen must be revenged. The banditt ought to be swept from the face of the earth." He boasted, "I have on all occasions preserved the scalps of my killed." In principle he believed that "fear is better than love with an Indian." He urged his soldiers to kill women and children. Not to do so would be like pursuing "a wolf in the hammocks without knowing first where her den and whelps were."

اس کے ان بیانات نے اس کے لیے صدارت کی راہ ہموار کی۔اس نے اپنے دورِ صدارت میں ہندیوں سے معاہدے کو توڑ ڈالا اور سرخ ہندیوں کی جبری بے دخلی کا عمل شروع کر دیا۔اس کا دعویٰ تھا کہ اس کا ۱۸۳۰ء کا Removal Act رحم دلانہ تھا۔جبکہ اس کے نتیجے میں مشہور ٹرائل آف ٹیرز (Trial of Tears) میں کریک قبیلے کے دس ہزار، چیروکی قبیلے کے چار ہزار اور چاکٹا قبیلے کے چار ہزار باشندے ہلاک کیے گئے۔

<u>سرخ ہندیوں کے بارے میں امریکی صدر ابراہام لنکن کے خونی ارشادات</u>

ابراہام لنکن نے پیلے اور سرخ ہندی چہروں میں فرق کرتے ہوئے کہا

''پیلے چہرے والے لوگ لاتعداد اور خوشحال ہیں وہ زمین پر کاشت کاری کرتے ہیں۔اور اپنی روٹی پیدا کر کے کھاتے ہیں اور وہ شکار کے کھیل کے بجائے زمین کی پیداوار پر انحصار کرتے ہیں۔وہ سرخ ہندی نسل کے برخلاف ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے سے لڑنا پسند نہیں کرتی''۔

the pale-faced people are numerous and prosperous because they cultivate the earth, produce bread and depend upon the products of the earth rather than wild game for a subsistence. This is the chief reason of the difference; but there is another . . . we are not, as a race, so much disposed to fight and kill one another as our red brethren. (Nichols, 1978: 187)

لنکن کی تقریر کے کچھ عرصے بعد امریکیوں کے درمیان ہی خانہ جنگی شروع ہوگئی یہ مہذب قوم اچانک غیر مہذب ہوگئی

<u>امریکی صدر روز ویلٹ کے خیال میں مردہ ہندی بہترین آدمی ہے:</u>

انیسویں صدی کے اختتام پر نسل کشی کا عمل ختم ہو رہا تھا امریکہ کے پانچویں عظیم جمہوریت پسند صدر تھیوڈور روز ویلٹ کو اس میں حصہ ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس نے قتل عام کے بارے میں کہا کہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔'' It was ultimately beneficial as it was inevitable ''اس نے مزید کہا'' تمام جنگوں میں سب سے عظیم جنگ وہ ہے جو وحشیوں کے خلاف ہے میرے خیال میں بہترین سرخ ہندی وہ ہیں جو مر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ دس میں سے نو ہلاک ہو چکے ہیں۔اور دسویں کے بارے میں مجھے کوئی جستجو نہیں ہے۔

that the noblest of all wars was one of extermination against savages. "I don't go so far as to think that the only good Indians are dead Indians, but I believe nine out of ten are, and I shouldn't like to inquire too closely into the case of the tenth."

جنرل شری دان نے ایک تقریر میں کہا مرا ہوا سرخ ہندی ہی میری نظر میں اچھا سرخ ہندی ہے

The only good indian I ever saw is dead Indian.

<u>چار امریکی صدور پر جنگی ٹربیونل پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے: مائیکل مین</u>

مائیکل مین نے ان پانچ امریکی صدور کے بارے میں عجیب بات لکھی ہے وہ لکھتا ہے کہ سرخ ہندیوں کے خلاف اس دہشت گردی بربریت بہیمیت کی وجہ سے پانچ میں سے چار امریکی صدور کے خلاف انٹرنیشنل وار کرائم ٹربیونل میں قتل عام کا مقدمہ چلایا جا سکتا ہے۔

How many of these presidents would be prosecuted today for genocide by an international

war crime tribunal? Four I think excluding Roosevelt. [Page No.91]

غامدی صاحب اس امریکہ اس مغرب کے مقابلے پر مسلمانوں کو دہشت گرد ثابت کرر ہے ہیں یہ بہت افسوس ناک ہی نہیں شرمناک صورت حال ہے۔

جمہوریت قومی ریاست سب سے زیادہ نسلی قتل عام کرتی ہے

مائیکل مین نے اپنی کتاب The Dark side of Democracy میں اعداو وشمار سے ثابت کیا ہے کہ دنیا کی تاریخ میں مغربی تہذیب سے پہلے کبھی نسلی [Ethinic] بنیادوں پر قتل عام نہیں ہوئے اور جوا کا دکّا اگر قتل عام ہوئے بھی تو۔ وہ مغرب کے قتل عام کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے اس نے واضح طور پر لکھا ہے کہ نسلی بنیادوں پر نہایت وحشیانہ قتل عام Murderous Ethnic Cleansing مغرب کا پیدا کردہ مسئلہ ہے ہم ہی اس کے خالق اور ذمہ دار ہیں وہ کہتا ہے کہ جب سے دنیا میں مغرب نے قومی ریاستیں قائم کیں اور جمہوریت کے ذریعے چلایا اس کے نتیجے میں Ethnic Murder قومی جمہوری ریاستوں کا عام رویہ بن گیا اس سے پہلے دوسری تہذیبوں میں اس طرح کی صورت حال نہیں تھی وہ قومی ریاست اور جمہوریت کو اس خونی قتل عام کا براہ راست ذمہ دار ٹھہراتا ہے وہ ثابت کرتا ہے کہ جمہوریت قائم کرنے کے لیے بھی بے شمار قتل عام کیے گئے اس کے بغیر جمہوریت قائم نہیں ہوسکتی ظاہر ہے جب سب لوگ قتل ہوگئے تو جمہوریت پُر امن ہوگئی یعنی۔ دشمنوں کے خاتمے کے بعد پُرتشدد جمہوریت پُر امن جمہوریت بن گئی____ یعنی تشدد دہشت گردی کے ذریعے ہی امن حاصل ہوتا ہے۔

As I will argue here, murderous ethnic cleansing has been a centralproblem of our civilization, our modernity, our conceptions of progress, and our attempts to introduce democracy. It is our dark side. As we will see, perpetrators of ethnic cleansing do not descend among us as a separate species of evildoers. They are created by conflicts central to modernity that involve unexpected escalations and frustrations during which individuals are forced into a series of more particular moral choices.The proposition underlying this book is that murderous ethnic cleansing comes from our civilization and from people, most of whom have been not unlike ourselves. [Michael Mann ., The Dark Side of Democracy Explaining Ethinic Cleansing 2005 Cambridge University Press UK, p ix ibid]

Change the names of people & places and the incident could have occured almost any where in the world over the part few centuries in Australia, Indonesia, India, Russia, Germany, Ireland, the United States, Brazil. Ethnic cleansing is one of the main evils of modern times. We now know that the Holocaust of the Jews – though unique in important ways – is not unique as a case of genocide.[p. 1,2 ibid]

1. My first thesis concerns the broad historical era in which murderous cleansing became common. Murderous leansing is modern, because it is the dark side of democracy.[p.2 ibid]

This thesis has two parts, concerning modernity and democracy. Ethnic cleansing is essentially modern. Though not unknown in previous history (and probably common among the very small groups who dominated prehistory), it became more frequent and deadly in modern times. [p.2 ibid]

The 20th-century death toll through ethnic conflict amounted to somewhere over 70 million, dwarfing that of previous centuries. Additionally, conventional warfare increasingly targeted entire peoples as the enemy. Whereas civilians accounted for less than 10 percent of deaths in World War I, they rocketed to over half in World War II and to somewhat above 80 percent in wars fought in the 1990s. Civil wars, mostly ethnic in nature, were now taking over from interstate wars as the main killers. Perhaps 20 million have died in them, though it is impossible to be precise (figures have been hazarded by Chesterman, 2001: 2; Fearon & Laitin, 2003; Gurr, 1993,

2000; Harff, 2003; Markusen & Kopf, 1995: 27–34).[p. 2 ibid]
Ethnic and religious conflicts continue to simmer as I write in 2003 – in Northern Ireland, the Basque Country, Cyprus, Bosnia, Kosovo, Macedonia, Algeria, Turkey, Israel, Iraq, Chechnya, Azerbaijan, Afghanistan, Pakistan, India, Sri Lanka, Kashmir, Burma, Tibet, Chinese Xinjiang, Fiji, the southern Philippines, various islands of Indonesia, Bolivia, Peru, Mexico, the Sudan, Somalia, Senegal, Uganda, Sierra Leone, Liberia, Nigeria, Congo, [Rwanda, and Burundi. Over half of these cases involve substantial killing.[p. 2 ibid]
Ethinic, Reigious conflicts involving cleansing between Israelis and Palestinians, Sunni and Shi'ite Muslims, Iraqis and Kurds, Russians and Chechens, Kashmiri Muslims and Hindus, and various Afghan tribes. In fact, some seem to be leading by the nose the foreign policies of the Great Powers. [p.3 ibid]
Thus, unfortunately for us, murderous ethnic cleansing is not primitive or alien. It belongs to our own civilization and to us. Most say this is due to the rise of nationalism in the world, and this is true. But nationalism becomes very dangerous only when it is politicized, when it represents the perversion of modern aspirations to democracy in the nation-state. Democracy means rule by the people. But in modern times the people has come to mean two things. The first is what the Greeks meant by their word demos.
This means the ordinary people, the mass of the population. So democracy is rule by the ordinary people, the masses. But in our civilization the people also means "nation " or another Greek term, ethnos, an ethnic group - a people that shares a common culture and sense of heritage distinct from other peoples. But if the people is to rule in its own nations state and if the people is defined in ethnic terms, then its ethnic unity may outweigh the kind of citizen deversity that is central to democracy. If such a people is to rule, what is to hapen to those of different ethnicity? Answers have often been unpleasnt– especially when one ethnic group forms a majority, for then it can rule "democratically" but also tyrannically. As Wimmer (2002) argues, modernity is structured by ethnic and nationalist principles because the institutions of citizenship, democracy, and welfare are tied to ethnic and national forms of exclusion. I concede that some other features of modernity play more subsidiary roles in the upsurge of cleansing.We will see that some modern professional militaries have been tempted toward wars of annihilation of the enemy, while modern ideologies like fascism and communism have been similarly ruthless. But underlying all this is the notion that the enemy to be annihilated is a whole people.[p.3 ibid]
Murderous ethinic cleansing is a hazard of the age of democracy since amid multiethnicity the ideal of rule by the people began to entwine the demos with the dominant ethnos generating organic conceptions of the nation and the state that encouraged the cleansing of minorities. Later, socialist ideals of democracy also became perverted as the demos became entwined with the term proletariat the working class creating pressures to ceanse other classes. These have been the most general ways in which democratic ideals were transmuted into murderous cleansing. [p.3,4 ibid]
1b. In modern colonies, settler democracies in certain contexts have beentruly murderous, more so than more authoritarian colonial governments. The more settlers controlled colonial institutions, the more murderous the cleansing. This will be demonstrated in Chapter 4. It is the most direct relationship I have found between democratic regimes and mass murder. Regimes newly embarked upon democratization are more likely to commit murderous ethnic cleansing than are stable authoritarian regimes (Chua, 2004, also makes this argument) [P 4 ibid]
But their past [Past of democracies]was not so virtuous. Most of them committed sufficient ethnic cleansing to produce an essentially mono-ethnic citizen body in the present. In their past, cleansing and democratization proceeded hand in hand. Liberal democracies were built on top of

ethnic cleansing, though outside of the colonies this took the form of institutionalized coercion, not mass murder.[p.4 ibid]
The dark side of democracy is the perversion through time of either liberal or socialist ideals of democracy.
across the world as it has It is historical and dynamic: murderous cleansing has been moving among Europeans, who invented the democratized. Its past lay mainly modernized and democratic nation-state. The countries inhabited by Europeans are now safely democratic but most have been ethnically cleansed. Now the epicentre of cleansing has moved into the south of the world inhabited by Europeans are now safely democratic but most have also been ethnically cleansed (as in thess id). Now the epicenter of cleansing has moved into the South of the world. Unless humanity takes evasive action it will continue to spread until democracies-hopefully not ethnically cleansed ones-rule the world. Then it will ease. But if we wish to ease it more quickly from the world we now have to face squarely up to the dark side of democracy.p. 4,5 ibid] . Ethnic social stratification, in the process hostility rises where ethnicity trumps class as the main form of toward ethnonationalism. Cleansing was rare in the capturing and channeling classlike sentiments oligarchies most big historic societies were class-divided. Aristocracies or other small past because ethnic identity with the common dominated them, and they rarely shared a common culture or often considering them barely human. The people did not people. In fact they despised the people, lines – class trumped ethnicity. [P 5 ibid] exist across class

۱۴۸۰ء سے ۱۹۴۰ء تک مغرب نے تین ہزار جنگیں لڑیں: ایرک فرام

غامدی صاحب نے کبھی ایرک فرام کو بھی نہیں پڑھا وہ مغربی اقوام کی بہیمیت کی تاریخ تفصیل سے بیان کر چکا ہے۔ مغرب کے ممتاز ماہر نفسیات ایرک فرام نے "The Anatomy of Human Destructiveness" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں ایرک فرام نے کہا ہے کہ انسان بھی دوسرے حیوانوں کی طرح ایک حیوان ہے، لیکن یہ حیوان دوسرے حیوانوں سے اس لیے مختلف ہے کہ دوسرے حیوان قاتل یا Killer نہیں ہیں مگر انسان قاتل یا Killer ہے۔ ماقبل تاریخ کا انسان بھی تباہی پسند یا Destrutive تھا مگر اس کی تباہی اپنے دفاع اور بقا سے متعلق تھی۔ جدید انسان [Moderen Man] حقیقی معنوں میں قاتل ہے ایرک فرام نے گزشتہ پانچ سو سال کے دوران لڑی جانے والی جنگوں کے اعداد و شمار پیش کیے ہیں۔ ایرک فرام کے مطابق مغرب نے گزشتہ تقریباً پانچ سو برس میں جو جنگیں لڑیں ان کی تفصیل یہ ہے:

(۱) ۱۴۸۰ء سے ۱۴۹۹ء تک ۹ جنگیں، (۲) ۱۵۰۰ء سے ۱۵۹۹ء تک ۸۷ جنگیں، (۳) ۱۶۰۰ء سے ۱۶۹۹ء تک ۲۳۹ جنگیں، (۴) ۱۷۰۰ء سے ۱۷۹۹ء تک ۷۸۱ جنگیں، (۵) ۱۸۰۰ء سے ۱۸۹۹ء تک ۶۵۱ جنگیں، (۶) ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ۸۹۲ جنگیں۔

اس طرح مغربی اقوام نے ۱۴۸۰ء سے ۱۹۴۰ء تک ۲۶۵۹ جنگیں لڑیں۔ [The anatomey of Human Destractiveness page. 243] جس مغرب کی یہ تاریخ ہو، وہ مغرب، اسلام کو دہشت گرد کیسے کہہ سکتا ہے؟ اور غامدی صاحب اس کی ہاں میں ہاں کیسے ملا سکتے ہیں؟ یہ تاریخ کا انکار ہے اور دنائت ہے۔

غامدی صاحب برنارڈ لیوس کی کتاب بلکہ اس کا خطبہ Islam in Europe، لبرل ازم کے سب سے بڑے سیاسی فلسفی جان رالس کی آخری کتاب Law of the people، صدر بش کی کچن کیبنٹ کے رکن فرید زکریا کی کتاب The future of Democracy اور مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of the Democracy اور J. E. B. Lumbard Islam, Fundamentalism & The Betrayal of Tradition پڑھ لیں۔ سب نے اسلام اور اسلامی خلافت اور مذہب اسلام کے بارے میں یہی لکھا ہے کہ یہ عظیم تہذیب تھی جہاں

اقلیتوں کے ساتھ نہایت بہترین سلوک کیا جاتا تھا۔ وہ تہذیب و تاریخ جو ہمیشہ بہترین رہی جس نے عشق رسول کے معاملے میں کوئی مفاہمت نہیں کی اس تہذیب پر آج غامدی صاحب اور مغرب مشترکہ طور پر حملہ آور ہیں۔

مائیکل مین نے اپنی کتاب The Dark side of the democaracy میں امریکہ پر لکھے گئے ۲۵ صفحات میں اعداد و شمار سے ثابت کیا ہے کہ امریکیوں نے دس کروڑ سرخ ہندیوں (Red Indians) کو پچاس سال میں کس طرح تڑپا تڑپا کر، سسکا کر، کتنی بے دردی سے ہلاک کیا اس درندگی کی تاریخ پڑھیں تو آپ کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں گے سرخ ہندیوں کو ایسے کمبل اوڑھنے کے لئے دیے گئے جس سے وہ چیچک کی بیماری میں مبتلا ہوگئے اور کھجا کھجا کر مر گئے غامدی صاحب اور لبرلز کو یہ درندگی وحشت نظر نہیں آرہی جو آزادی امن انسانیت کے نام پر کی گئی۔ تاریخ کے سب سے بڑے دہشت گرد کے قصیدے جناب غامدی صاحب پڑھ رہے ہیں۔ موصوف کو کچھ علم نہیں وہ کچھ نہیں جانتے۔ غامدی صاحب

(۱) D. E. Stannard کی کتاب American Holocaust: the conquests of the New World پڑھ لیں

(۲) وہ Richard Slotkin کی کتاب Regeneration through Violence: The Mythology of the American Frontier 1600-1680 کا مطالعہ فرمالیں

(۳) وہ S.F.Cook کا معرکۃ الآرا مقالہ The abroginal population of Hispaniola پڑھ لیں جس میں امریکیوں کے ہاتھوں اسی لاکھ سرخ ہندیوں کی سفاکانہ موت کی تاریخ آنسو اور لہو سے کفنائی گئی ہے۔

(۴) غامدی صاحب ٹوٹیان ٹوڈروف کی کتاب The Conquest of America: The Questionof the other کا مطالعہ کریں جس میں ۱۴۹۲ اور اس کے بعد کی خونی داستانیں محفوظ ہیں۔ امریکیوں نے کس طرح سرخ ہندیوں کا قتل عام کیا۔ بے چارے غامدی صاحب مغرب کی دہشت گردی، بدمعاشی، غنڈہ گردی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے وہ بس اسلام کو دہشت گرد مذہب ثابت کرتے ہیں جو جھوٹ در جھوٹ کے سوا کچھ نہیں۔ اس کی غالب ڈسکورس کا بیانیہ ہے غالب ڈسکورس نے بتایا ہے کہ اسلام دہشت گرد ہے لہٰذا غامدی صاحب نے اس ڈسکورس کے فرمان کو قبول کرلیا تحقیق کرنے کی زحمت ہی گوارا نہ کی ان کی تمام تحقیق صرف اسلام پر ہوتی ہے اس میں نقائص تلاش کرنا ____ اسلام کی تنقید کرنا ان کے تحقیقی کے منصوبے کا اصل مقصد ہے وہ اسلام کی تنقید سے فارغ ہوں تو مغرب کی تنقید کے قابل ہوں۔ عہد حاضر کی عقلیت پسند انسان تمام سوالات تنقیدی فکر و نظر ____ صرف مذہب کے لیے وقف کردیتا ہے۔ مغرب، سائنس، ٹکنالوجی ترقی کے بارے میں کبھی اس کی عقل اور تنقیدی نقطۂ نظر Critical Thinking استعمال نہیں کرتا کیوں کہ اس پر وہ ایمان لاچکا ہے جس پر ایمان ہوتا ہے اس کی تنقید نہیں ہوتی۔

<u>دنیا کی تاریخ کے کل ۱۵۰ ملین مقتولین میں سے چھیانوے فی صد لوگ مغرب نے قتل کیے</u>

تاریخ انسانی میں سب سے زیادہ قتل عام مغربی تہذیب کے گزشتہ پانچ سو سال میں ہوئے

Global Politics کا مصنف لکھتا ہے کہ مغرب کی پانچ صدیوں کی خوں ریز تاریخ میں سے انیسویں اور بیسویں ــــ گزشتہ دو صدیوں میں سب سے زیادہ جنگیں لڑی گئی ہیں ہم تاریخ انسانی کے بدترین دور میں رہ رہے ہیں یہ دور۔ جدیدیت (ماڈرن ازم) کا پیدا کردہ دور ہے جو نہایت سفاک، درندہ صفت اور وحشی ہے۔

گلوبل پالیٹکس کا مولف لکھتا ہے کہ تین ہزار برس قبل مسیح سے لیکر آج تک (اکیسویں صدی تک) ۱۵۰ ملین سے زیادہ افراد جنگوں میں ہلاک ہوئے ہیں۔ سولہویں صدی سے پہلے تک کی تمام جنگوں میں ۱۵۰ ملین کا صرف ایک فی صد لوگ ہلاک ہوئے۔ وہ لکھتا ہے کہ ۳ ہزار برس قبل مسیح سے لیکر اکیسویں صدی

تک کی جنگوں میں مارے جانے والے ۱۵۰ ملین افراد میں سے ۹۶ فیصد لوگ مغرب کی گزشتہ پانچ سو سال کی جنگوں کے درمیان ہلاک کیے گئے۔
وہ لکھتا ہے کہ تین ہزار قبل مسیح سے لیکر بیسویں صدی تک کی جنگوں میں ہونے والی اموات کی ۷۳ فیصد اموات صرف بیسویں صدی میں ہوئیں۔وہ لکھتا ہے کہ غیر محارب عام شہریوں کی سب سے زیادہ اموات مغرب کی پانچ سو سالہ جنگوں میں ہوئیں ہیں جو پندرہویں سے بیسویں صدی کے درمیاں ہوئیں۔ان جنگوں میں سپاہیوں سے زیادہ غیر محارب[Non Combant] عام شہری[Civilians] مارے گئے ان میں سے مرنے والے لوگوں کی آدھی تعداد بچوں پر مشتمل تھی۔مغرب کے غلبے کے بعد اس کے ایجاد کردہ اسلحہ سے لڑی جانے والی جنگیں اب فوجوں کے درمیان نہیں ہوتیں تمام جنگوں کا ہدف صرف اور صرف بے گناہ شہری اور شہری علاقے ہوتے ہیں یہ انسانیت کی پرستش کا عہد ہے مغرب کی عسکری دہشت گردی کے باعث ____ ساٹھ لاکھ لوگ ان جنگوں میں معذور اپاہج لاچار بنا دیے گئے۔

کتاب Global Politics میں دنیا کی بدترین امریکی، یورپی مغربی دہشت گردی کے اعداد و شمار کے مطابق دنیا کی تمام قوموں کی دہشت گردی ایک طرف مغرب کی عالمی دہشت گردی دوسری طرف: کتاب کے مطابق دنیا کی تاریخ اور مغرب کی تاریخ کے قتل عام ـــــ ان دونوں کے درمیان ۴(four) اور ۹۶(Ninty six) کی نسبت[Ratio] ہے ـــــ

یہ کتاب بتاتی ہے کہ تین ہزار سال قبل مسیح سے لے کر آج تک دنیا کی تمام جنگوں میں جتنے لوگ قتل ہوئے ان کا 96% مغرب کی پانچ سو سالہ جنگوں کے درمیان ہلاک ہوئے مغرب کی وہ جنگیں جو پندرہویں صدی سے لے کر دو ہزار عیسوی تک لڑی گئیں تاریخ انسانی کی خوں ریز ترین جنگیں تھیں دنیا کی تاریخ میں آج تک جتنا خون بہا ہے اس کا چھیانوے فی صد خون مغرب نے گزشتہ پانچ سو سال کے درمیان بہایا ہے۔

مغرب نے جب سے جنگوں کا آغاز کیا ہے ان جنگوں میں مرنے والے تین چوتھائی عام شہری ہوتے ہیں کیونکہ جدید ہتھیاروں کے باعث جو دور سے ہی دشمن کو اور دشمن کے علاقے کو نشانہ بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں دونوں طرف کے فوجیوں کا نقصان بہت کم ہوتا ہے شہریوں کا نقصان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔

واضح رہے کہ یہ کتاب کراچی یونیورسٹی کے شعبہ بین الاقوامی تعلقات[International Relation] کے نصاب میں شامل ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غامدی صاحب نے کبھی کوئی نصابی کتاب بھی نہیں پڑھی جو معلومات ایم اے کے طلباء نصاب میں پڑھ رہے ہیں غامدی صاحب اس سے بھی ناواقف ہیں یہ جہالت کی آخری انتہا ہے ان اعداد و شمار اور معلومات کو پڑھ کر اگر کوئی شخص مسلمانوں اور اسلام کو دہشت گرد کہتا ہے تو وہ دنیا کا جاہل ترین شخص بہت بڑا علمی دہشت گرد اور عالمی استعمار کا سب سے بڑا بلکہ سر سید سے بھی بڑا ایجنٹ ہے۔جو اس قدر سفاکی سے جھوٹ بول رہا ہے

It has been suggested that since 3600 B.C., there have been only 292 years without war, and each decade since 1816 has averaged twenty-two wars.It is estimated that more than 150 million people have died from war-related deaths since 3000 B.C.

"Each of the centuries prior to the sixteenth accounted for less than 1 percent of all war deaths. In fact all of them added together accounted for little more than 4 percent of these deaths, while almost 96 percent of war deaths were estimated to occur in the modern period of history, 1500-2000."Seventy-three percent of all war-related deaths since 3000 B.C. have occurred in the twentieth century A.D." Civilian deaths have been a large part of the increase in war deaths. According to UN Secretary General Kofi Annan, "UN sources estimate that at least three-quarters of the casualties of recent conflicts have been civilians, though the precise numbers are not known. " Over half of the civilians, though war victims of the past decade have been children, including two million dead and six million physically disabled since 1990.

Most of the war throughout history have occurred in the past two centuries. perhaps more disturbing.

from the point of global security, it is a shocking fact... that in some ways we are living through

one of the worst decades in modern history. The 1970s were the decade with the most war onsets of all types. This was not an insolated spike, as 1960s and 1980s were also worse decades than average. And while the data for the 1990s are not complete, the 1990s will likely win the dubious distinction of being one of the two most war-prone decades [along with the 1970s] since the Congress of Vienna.
Juliet Kaarbo . -James Lee Ray Global Politics, Wadsworth publishing 10 edition (Febuary 2010)chap 5 International Confilct p.162,163]

اس تمام گفتگو کے بعد حضرت والا نے پوچھا کہ توہین رسالت کے مسئلے کا حل کیا ہے؟ یہ جو تشدد کی صورت حال پیدا ہو رہی ہے اسے کیسے ختم کیا جائے؟ توہین رسالت کے قانون میں کیا کیا ترامیم ہوں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے اور لوگ قانون ہاتھ میں لینا چھوڑ دیں؟ کیا شرعی قوانین کے نفاذ کے ذریعے یہ مسئلہ ہمیشہ کے لیے حل نہیں ہو سکتا؟

ہم نے حضرت والا کی خدمت میں عرض کیا کہ گستاخی کے واقعات ماضی میں صرف کفار سے مخصوص تھے ـــــ لیکن ۱۹۸۰ء کے بعد گستاخی کے واقعات میں مسلمانوں کے نام کثرت سے آ رہے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ منشور انسانی حقوق کو تسلیم کیا گیا ہے اور اس منشور میں آزادی و مساوات عقیدے کو بھی ایک حق کے طور پر تسلیم کیا گیا ہے۔ میڈیا سیکولر تعلیمی ادارے آزادی کے عقیدے کا پرچار کر رہے ہیں اس کے نتیجے میں جدید ذہن جو میڈیا یا سیکولرازم و لبرل ازم سے متاثر ہو رہا ہے آزادی کے عقیدے کی اتباع میں دین، مذہب، مقدس شخصیات، دینی اقدار و روایات پر آزادانہ تنقید کرنے میں کوئی تردد محسوس نہیں کرتا علماء کا اثر ہوا ہے مذہبی دینی جماعتوں کی قوت کم ہوئی ہے اور بعض دینی جماعتوں نے سیاسی مصلحتوں کے باعث سیکولرازم کی بہت سی علامتوں کی اسلام کاری کی ہے لہٰذا اسلامی علمیت، عصبیت مسلسل کم زور ہو رہی ہے ـــــ رن لبرل ازم، کیپٹل ازم،، لبرل ازم جیسے جیسے اسلامی معاشروں میں جڑ پکڑ رہا ہے توہین کے واقعات میں اضافہ ہو رہا ہے لہٰذا ـــــ توہین رسالت پر مسلمانوں کے شدید ردعمل کا سبب اسلام نہیں ـــــ آزادی کا عقیدہ اور مغرب کا پیدا کردہ آزادی کا فتنہ ہے ـــــ یہ تمام تصادمات، تنازعات، اختلافات اور جھگڑوں کا سبب ہے لیکن کوئی عالم دین آزادی کے عقیدے کا انکار نہیں کر رہا اس پر تنقید نہیں کر رہا ـــــ لیکن عقیدے کے ردعمل پر تنقید ہو رہی ہے حتیٰ کہ مشال واقعہ جو اصلاً آزادی کے جدید مغربی عقیدے اور انسانی حقوق کے منشور کے خلاف سیکولر یونیورسٹی کے مذہبی طلباء کی پہلی اجتماعی بغاوت تھی اس ردعمل پر تو علماء نے خوب تنقید کی مگر اس ردعمل کے اصل محرک آزادی کے عقیدے کو کسی نے کفر قرار نہیں دیا جو بندگی کے عقیدے کا مخالف عقیدہ ہے۔

مردان یونیورسٹی کا واقعہ اصلاً آزادی کے عقیدے کے خلاف پہلی عوامی بغاوت تھی اس کے بعد سیالکوٹ میں تین لڑکیوں کے ہاتھوں ایک شاتم رسول کا قتل اور چترال میں ایک شاتم رسول کو قتل کرنے کے لیے ہزاروں لوگوں کا تھانے پر حملہ اس بغاوت کے مختلف رنگ ہیں اپریل ۲۰۱۷ء میں ہونے والے یہ تینوں واقعات بتا رہے ہیں کہ عوام آزادی کے عقیدے کے نتائج دیکھ کر مشتعل ہو گئے ہیں وہ اپنے جذبات پر قابو نہیں رکھ سکتے ان صاحبِ ایمان لوگوں کو برا بھلا کہنے کے بجائے ـــــ علماء، مذہبی جماعتیں آزادی کے عقیدے کا انکار کر دیں۔

حیرت ہے کہ آپ نے ان مباحث پر غور نہیں کیا اور صرف مردان کے واقعے کی مذمت کر دی ـــــ یہ نہایت غیر ذمہ دارانہ طریقۂ کار تھا جو آپ نے اختیار کیا۔

اسلامی تاریخ میں توہین رسالت کے مجرم کو عوام نے بھی سزا دی اور خلافت و امارت کے قاضی نے بھی سزا دی ـــــ اس جرم پر سزا کا اختیار صرف قاضی یا حاکم تک محدود نہ تھا لہٰذا عہد رسالت سے لے کر خلافت عثمانیہ کے خاتمے تک اگر کوئی شخص توہین رسالت کے مجرم کو قتل کر دیتا تو اسلامی خلافت و امارت اور قاضی اسے قصاص میں قتل کرنے کا حکم نہ دیتا نہ رعایا کو تلقین کی جاتی کہ آئندہ کبھی قتل نہ کرنا۔

اسلامی خلافت اور عدالت نے توہین رسالت کے جرم کی سزا پر حکومتی اجارہ داری قائم نہیں کی یہ خاص استثناء ہے جو ذات رسالت مآبؐ سے متعلق ہے ____ یعنی توہین رسالت کے مسئلے میں اسلامی خلافت میں دو قانونی دائرے ساتھ ساتھ چلتے رہے ہیں ۔ایک نجی [Private] دوسرا سرکاری [Public]

توہین رسالت پر قتل کرنے والے سے کبھی شواہد، ٹھوس ثبوت طلب نہیں کیا گیا توہین ہوتے ہی اس کا بدیہی علم غور وفکر، تفکر وتدبر وتعقل کے بغیر ایک صاحب ایمان کو اس کے ایمان ایقان وجدان کی بنیاد پر براہ راست حاصل ہو جاتا ہے اس معاملے میں تمام زمانوں میں اسلامی عدالت نے اثر کو مؤثر تسلیم کیا ہے اس کا ثبوت وہ غیر معمولی اشتعال ہے جو توہین رسالت کے نتیجے میں ایک فرد کے ذہن، قلب، روح، جان اور بدن میں پیدا ہوتا ہے ____ لہٰذا عوام کو اس معاملے میں اشتعال کے باعث کوئی اقدام کرنے یا سزا دینے کے اختیار پر کوئی پابندی عائد نہیں کی گئی لیکن حدود وتعزیرات میں کسی کے اشتعال کو نفاذ حدود کے لیے اجازت کا قرینہ نہیں بنایا گیا ____ توہین رسالت کے مسئلے میں عدالت کے بغیر سزا ____ اس پر امت کا معاشرتی، علمی، عملی، ایمانی، روحانی، نورانی اجماع ہے اس کے باوجود اس معاملے میں عدالت کا اختیار بھی برقرار رہا ____ جب توہین رسالت کے قانون کو جدید ریاست نے اسمبلی اور سینٹ کے ذریعے جدید قانون کا حصہ بنالیا تو شریعت کا حکم اب Codify ہوا اور Rigidify بھی ہو گیا۔ جدید ریاست، خلافت امارت سے یکسر مختلف تھی لہٰذا اس کی عدالت بھی قاضی عدالت سے بالکل مختلف ہے۔

میکس ویبر کے الفاظ میں تشدد، اور جبر پر صرف جدید ریاست کا اجارہ ہے Monoply of Violence صرف جدید ریاست کے پاس ہے۔ جدید ریاست جو Fedralist Papers کے بعد وجود میں آئی ____ خلافت، بادشاہت، امارت کے مقابلے میں ہزاروں گنا جابر Tyrrant ریاست ہے جو اپنے رِٹ قائم کرنے کے لیے کسی کی رِٹ تسلیم نہیں کرتی اور اپنے اختیارات میں کسی کو حصہ نہیں دیتی۔

جدید مغربی اس ریاست کی دہشت کے سامنے چنگیز وہلاکو کی دہشت بھی ماند پڑ جاتی ہے ان حکمرانوں کے پاس بھی جدید ریاست کی طرح بے انتہا اختیارات نہ تھے۔ جدید ریاست کے ان اختیارات کا ماخذ جدید سائنس اور لامحدود سرمایہ ہے قدیم ریاستیں ان دونوں ذرائع سے محروم تھیں۔

جدید ریاست نے انسانی زندگی کے ہر دائرے کو کالونائز کر لیا ہے ____ اسلامی خلافت میں (۱) تعلیم (۲) عدل (۳) تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب اور احسان وسلوک جسے تصوف بھی کہا جاتا ہے یعنی ایک فرد کا روحانی تزکیہ ____ صرف اور صرف علماء کی ذمہ داری تھی عالم ہی قاضی ہوتا تھا قاضی فیصلہ دینے سے پہلے عموماً مفتی اور مجتہد سے رجوع کرتا تھا لہٰذا عدل نیچے سے اوپر کی طرف جاتا تھا جدید ریاست میں عدل اوپر سے نیچے جاتا ہے اس کا معاشرے، معاشرت، معاشرتی حرکیات، معاشرے کی نبض، اقدار، روایات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے لہٰذا عدل مہنگا بھی ہو رہا ہے اور عدل کے نتیجے میں ظلم بھی عام ہو رہا ہے نظام عدل ہی ایسا ہے کہ مظلوم کے لیے دادرسی کے امکانات کم سے کم ہو رہے ہیں اور ظالم کے بچنے کے امکانات مزید بڑھ رہے ہیں۔

جدید ریاست نے تعلیم، عدل، فرد کی اخلاقی، روحانی تربیت کے ان تمام دائروں کو اپنے اختیار میں لے کر علماء کو زندگی کے تمام دائروں سے بے دخل کر دیا لہٰذا جدید ریاست توہین رسالت کے مسئلے میں عالم کے اختیار کو تسلیم نہیں کرتی توہین رسالت کا قانون اب مسائل پیدا کر رہا ہے اس کا حل صرف یہ ہے کہ اس قانون میں ایک شق کا اضافہ اجماع امت کی روشنی میں کر دیا جائے کہ توہین رسالت کے ارتکاب پر اگر کوئی شخص مرتکب توہین کو قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل نہیں کیا جائے گا۔ ظاہر ہے جدید ریاست اپنا اختیار کبھی کسی شہری کو منتقل نہیں کرے گی وہ Citizen کو جو اس کا Voter اور Consumer ہے ____ اسلامی علمیت کے دائرے میں دیکھنے کے قابل

ہی نہیں ہے۔

اصل فتنہ آزادی اظہار رائے کا عقیدہ ہے

طلباء نے صرف قتل کیا مگر فتنہ قتل سے شدید تر ہے

ہم نے عرض کیا آپ دیکھئے کہ مردان کے واقعے کی آڑ میں آزادی اظہار رائے کے جدید مغربی کافرانہ عقیدے کی میڈیا کے ذریعے اسلام کاری کی جارہی ہے یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ مشال کو کچھ بھی کہنے کا حق تھا مگر طلباء کو عاشقانِ رسول کو غصہ میں آنے، مشتعل ہونے قتل کرنے کا کوئی حق نہیں تھا____ مشال کو اپنے جذبات کے اظہار کی مکمل آزادی تھی عاشقانِ رسول کو اپنے جذبات کے اظہار کی آزادی نہیں ہے۔ ہر طرف عشق رسول ؐ کی مذمت ہورہی ہے توہین رسالت کو برداشت کرنے کا سبق دیا جارہا ہے کہا جارہا ہے کہ لوگ آزاد خیال ہوجائیں رواداری ہوجائیں، برداشت کرنا سیکھیں____ مگر کوئی یہ سوال نہیں اُٹھا رہا کہ رواداری، برداشت، صبر و تحمل، صرف رسالت مآب ؐ کی بے عزتی (استغفر اللہ) برداشت کرنے کے لیے کیوں؟ رواداری، برداشت، صبر و تحمل کا تقاضہ کیا یہ نہیں ہے کہ اگر تم ایک اسلامی معاشرے، معاشرت میں رہ رہے ہو تو اپنی زبان کو اور اپنے جذبات کو لگام دو، سوچ سمجھ کر بولو، اکثریت کے جذبات کی توہین، تضحیک، تذلیل و تحقیر نہ کرو زبان چلانا درندگی، بہیمیت،، وحشیانہ پن نہیں ہے بس ہاتھ چلانا ہی درندگی ہے۔ حیرت ہے کہ سب لوگ آزادی اور میڈیا کے پیش کردہ رواداری کے مغربی تخیل اور اس کے تعقل کو قبول کررہے ہیں۔

میڈیا نے مشال کی موت کی خبر سنتے ہی____ بغیر کسی تحقیق اور خوف کے کہہ دیا کہ مشال بے گناہ تھا یہ ان کا اعلان تھا____ آزادی کے عقیدے پر ایمان ایسا ہوتا ہے ایمان کے اعلان کے لیے کسی تحقیق کی ضرورت نہیں ہوتی مذہبی حلقے اس جرأت کے ساتھ یہ نہیں کہہ سکے کہ تمام عاشقان رسول بھی بے گناہ ہیں اصل گناہ آزادی کا عقیدہ ہے جس نے مشال کو دریدہ دہنی کی جرأت عطا کی دینی حلقوں کا اپنے ایمان پر یقین نہیں تھا فلم نے ان کا یقین متزلزل کر دیا۔ مشال نے آزادی کے عقیدے کو بلندی تک پہنچا دیا پہلی مرتبہ لوگوں کو یہ ہمت ہوئی کہ توہین کے مجرم کو ایک ہیرو کے طور پر پیش کریں کسی نے نہیں پوچھا کہ میڈیا جھوٹے دعوے کیوں کررہا ہے مذہبی حلقے آزادی کے عقیدے کی تنقید نہیں کررہے اسے مکمل طور پر مسترد نہیں کررہے یہ بہت بڑی غلطی ہے۔

اسلام نے واضح کر دیا کہ فتنہ قتل سے زیادہ شدید جرم ہے____ مردان یونیورسٹی میں فتنہ کا اصل سبب آزادی اظہار رائے کا جدید مغربی عقیدہ ہے____ اگر نوجوانوں نے قتل کر دیا تو یہ کوئی بہت بڑا جرم نہیں ہے____ توہین رسالت کی جرأت یہ سب سے بڑا جرم بلکہ فتنہ ہے اس فتنے کو ایک اسلامی معاشرے میں کسی صورت میں برداشت نہیں کیا جاسکتا۔ زبان میں ہڈی نہیں ہوتی لیکن جب یہ فتنہ انگیز زبان چلتی ہے تو یہ آپ کی ہڈی تڑوا سکتی ہے کسی کو زخم لگانا کیا شرافت ہے____ ژی ژیک کے الفاظ میں میڈیا اور ریاست صرف دوسرا سوال پوچھ رہے ہیں اور علماء سے، عوام سے صرف اور صرف دوسرے سوال کا جواب مانگ رہے ہیں عربی کا محاورہ ہے تلوار کا زخم بھر جاتا ہے زبان کا زخم نہیں بھرتا۔ ہڈی ٹوٹ جائے تو آپ میڈیا کے ذریعے سوال اُٹھاتے ہیں کسی کی ہڈی توڑنا کیا انسانیت ہے، تہذیب ہے، اخلاقیات ہے؟

دورِ فتنہ میں ایمان کا اقرار نہیں اظہار بھی لازمی ہے

خالد بن ولید نے اذان کے قائل مگر تارک کو قتل کر دیا تھا

ژی ژیک کے فلسفے کے تحت آج کل سب لوگ جب مشال خان کے واقعے پر گفتگو کرتے ہیں تو ہمیشہ دوسرا سوال پوچھتے ہیں پہلا سوال کوئی نہیں پوچھتا تاکہ اصل حقیقت کو چھپا دیا جائے۔ میڈیا ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب مانگتا ہے اور علماء بھی ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتے ہیں پہلے سوال کو نظر انداز کرنے کے نتیجے میں ہی آزادی کے باطل عقیدے کی اسلام کاری ممکن ہوتی ہے۔ ژی ژیک کہے گا

پہلا سوال یہ ہے کہ ہڈی کیوں توڑی گئی کیا لوگ پاگل ہو گئے تھے۔ تین ہزار سیکولر لبرل طلباء کو کیا ہو گیا تھا کہ ایک انسان کو مارنے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے یونیورسٹی انتظامیہ کے بھی کئی ملازمین اس عمل میں کیوں شریک ہوئے اگر مشال خان طلباء کے مسائل کی آواز تھا ان کی فیس معاف کرار ہا تھا ان کے حقوق کی جنگ لڑ رہا تھا تو طلباء اس کے ساتھ کیوں کھڑے نہیں ہوئے وہ اسے مارنے کیوں آئے۔

وہ پوچھے گا زبان کا زخم کیوں نہیں بھرتا اور تلوار کا زخم کیوں بھر جاتا ہے وہ اصل محرک Prime Morer کا سراغ لگائے گا تاکہ اس عمل ____ تشدد ____ یعنی دوسرے سوال کا جواب پہلے سوال کی روشنی میں تلاش کرے اور حقیقت حال کی تہہ تک پہنچے۔

میڈیا اور رائے عامہ اس وقت پہلے سوال کو دانستہ نظر انداز کر کے صرف دوسرا سوال پوچھ رہے ہیں اور لوگ صرف دوسرے سوال کا جواب دے رہے ہیں یہ دنائت اور ہٹ دھرمی ہے اس کا مقصد صرف یہ ہے کہ توہین رسالت کی آزادی کا راستہ ہموار کر دیا جائے ہر عہد میں یہ امت اپنے ایمان، عقیدے، روایات، اقدار کا دفاع کسی ایک نکتے، کسی ایک عقیدے اور کسی ایک محور کے تحت کرتی ہے۔ رسالت مآبؐ کے انتقال کے بعد جب مدعیان نبوت پیدا ہوئے تو امت نے ختم نبوت کے عقیدے کو محور و مرکز تسلیم کیا اس عہد فتن میں کسی شخص کے ایمان کی علامت یہ تھی کہ وہ مدعیان نبوت کے ساتھ ہے یا ان کے خلاف ہے۔ خالد بن ولید ایک علاقے میں مورچہ زن ہوئے جہاں مسلیمہ کذاب کا اثر تھا انھوں نے ایک قبیلے کے سردار کو طلب کیا اور پوچھا تم نے اذان کیوں ترک کی اس نے جواب دیا کہ میں اذان کا منکر نہیں ہوں لیکن مسلیمہ کذاب کے کہنے پر ترک کر دی تھی ____ خالد بن ولیدؓ نے فرمایا کہ تم نے اسلامی شعار کو ترک کر کے اپنے ایمان سے انحراف کیا ہے اور اس جرم میں اسے قتل کر دیا گیا فتنے کے زمانے میں صرف عقیدے پر ایمان کافی نہیں جب کفر و ایمان میں فاصلہ بتانا ضروری ہو ____ تو اس ایمان کا اظہار بھی ہونا چاہیے ایمان اگر اظہار سے انکار کرتا ہے تو وہ ایمان معتبر ہی نہیں۔

<u>کیا آپ پیغمبر کی توہین برداشت کر سکتے ہیں یہ ایمان سے متعلق سوال ہے</u>

عہد حاضر میں ایمان ماضی کی طرح ایک نکتے میں مرکوز ہو گیا ہے

امام احمد حنبل کے عہد میں اسلام کی علامت یہ تھی کہ آپ فتنہ خلق قرآن کے حامی ہیں یا مخالف آپ امام احمد حنبل کے ساتھ ہیں یا امام احمد حنبل کے خلاف ہیں ایمان اس ایک مسئلے سے مشروط ہو گیا تھا۔

مرزا غلام احمد قادیانی کے مسئلے میں بھی یہی صورت حال تھی آپ اسے نبی تسلیم کرتے ہیں یا نہیں کرتے آپ کا ایمان صرف اس ایک سوال کے درست جواب پر منحصر تھا اس مرحلے پر ایمان مجمل اور ایمان مفصل اسی ایک نکتے میں سما جاتا ہے اہل ایمان کی ایک ہی شناخت نمایاں ہوتی ہے کہ وہ مرزا صاحب کی نبوت کا رد کرتے اور ختم نبوت کا اعلان عام کرتے ہیں۔ یہ وہی صورت حال ہے جو گیارہ ستمبر پر حملے کے بعد پیدا ہوئی تھی جب جارج بُش نے دہشت گردی کے خلاف دنیا کے تمام دہشت گردوں کا اتحاد قائم کر کے پوری دنیا پر اپنی جنگ مسلط کرتے ہوئے پوری دنیا سے صرف ایک سوال کیا تھا تم دہشت گردی کے خلاف اس جنگ میں امریکا کے ساتھ ہو یا طالبان کے ساتھ ہو اس نے کسی کو یہ کہنے کی بھی اجازت نہیں دی کہ ہم دونوں کے خلاف ہیں ہم دونوں کو نہیں مانتے اس نے کسی کو اس جنگ میں غیر جانب دار رہنے کی بھی اجازت نہیں کہ یہ تم دونوں کا جھگڑا ہے تم خود ہی لڑ جھگڑ کر طے کر لو اس نے فیصلہ کر دیا کہ امن عالم کی ضرورت یہ ہے کہ تم امریکا کا ساتھ دو اگر امریکا کے ساتھ نہیں ہو تو اس کا صرف ایک مطلب ہے کہ تم طالبان کے حامی ہو تم دہشت گرد ہو پوری دنیا اس ایک نکتے پر ہی متحد ہوئی۔

عہد حاضر میں ایمان عشق رسالت کے ایک نکتے میں سمٹ گیا ہے آپ پیغمبر کی توہین برداشت کرنے کے لیے تیار ہیں یا نہیں ____ توہین رسالت آپ کی نظر میں جرم ہے یا نہیں ____ مردان کے طلباء نے اس ایک نکتے پر اپنے ایمان کا مظاہرہ کیا ہے اور آپ ان کا ساتھ دینے کے بجائے اگر مگر سے کام چلا رہے ہیں۔

جدید ریاست اگر شریعت کے اجماع کے اصول کے تحت اس قانون میں وہ ترمیم کر دے جو ہم نے تحریر کی ہے تو اس عدالت کا اور ریاست کا اختیار ہی ختم ہو جائے گا ـــــ جدید ریاست اور عدالت اپنے اختیارات میں کسی کی شرکت کی قائل نہیں ہے کیوں کہ وہ آزادی کے عقیدے کی محافظ ہے اور آزادی کے عقیدے کی حفاظت کے باعث وہ کسی فرد کو اپنا اختیار منتقل نہیں کر سکتی انہی معنوں میں شریعت کے احکامات جدید ریاست میں ناقابل عمل ہیں اور جب بھی شرعی احکامات جدید ریاست کی پارلیمنٹ اور سینٹ کے ذریعے اکثریت کی رائے سے یا سو فی صد تائید سے جدید قانون بن کر نافذ ہوتے ہیں تو وہ اپنی روح اور جوہر Assence کھو دیتے ہیں۔

جدید ریاست جیسے جیسے اسلامائز ہوتی ہے اسلام خود بخود سیکولرائز ہو جاتا ہے

جدید قانونی ڈھانچے میں احکام شریعت جیسے ہی ڈھلتے ہیں وہ اسلامی احکامات کی حقیقت، روح اور جوہر سے لاتعلق ہو جاتے ہیں مثلاً عورت کو اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا حق حاصل ہے یہ اسلامی قانون کا ایک جدید اثر ہے ـــــ اسلامی علمیت تہذیب، ثقافت و تاریخ میں نکاح کے لیے عورت کی رضا کے حصول ـــــ کا اصول تاریخ میں۔

کبھی اس طرح بیان نہیں ہوا اصول یہ تھا کہ نکاح کے موقع پر ولی عورت کی رضا معلوم کرے گا اور عورت کا اس موقع پر رضا سے متعلق سوال پر خاموش رہنا اس کی رضا سمجھا جائے گا۔ ـــــ

اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ عورت اگر ولی کے مجوزہ شوہر سے نکاح پر رضا مندی ظاہر نہ کرے تو یہ نکاح منعقد نہیں ہوگا اگر منعقد ہو جائے تو عورت اسے منسوخ کرنے کی درخواست کر سکتی ہے۔ اس سادہ سے اصول میں اسلامی علمیت، تہذیب، تاریخ، روحانیت سب کچھ سموئی ہوئی ہے مگر کیا جدید قانون میں جو شریعت سے اخذ کیا گیا ہے یہ تمام عناصر موجود ہیں جدید قانون کا ڈھانچہ ہی ایسا ہے کہ اس میں مذہبی، تہذیبی، روحانی عناصر کی شمولیت ممکن ہی نہیں۔ جدید ریاست کی طرح جدید قانون مجرد [Absrtract] قانون ہے جس کا جیتی جاگتی زندگی کی تلخ حقیقتوں انسانی رویوں کے تنوع، رنگا رنگی سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے وہ بس Yes، No، Right، Wrong کے پیمانوں کے تحت کام کرتا ہے۔

اسلامی علمیت و اسلامی امارت میں عورت کی رضا کے اس اصول کا مطلب کچھ اور تھا لیکن یہی حکم شرعی جب جدید قانون کے ذریعے ایک قانونی حکم بنا تو اس کا اثر اور دائرہ ہی تبدیل ہو گیا اور اس قانون نے عورت کو اسلامی شریعت کے بجائے آزادی کے عقیدے کے تحت ولی، عاقلہ، خاندان، کے بغیر اپنی زندگی کا اہم ترین فیصلہ بغیر کسی تجربے کے خود ہی کرنے کی کامل آزادی فراہم کر دی ـــــ عہد رسالت میں احادیث کے اندر عورت کی مرضی کے بغیر نکاح کو فسخ کرنے، مسترد کرنے یا رسالت مآبؐ کی طرف سے عورت کے انکار کو قبول کرنے کے جتنے بھی واقعات موجود ہیں ان میں بنیادی نکتہ یہ ہے کہ عورت رسالت مآبؐ سے یا اپنے باپ سے صرف یہ کہتی تھی کہ جس شخص کے نکاح میں مجھے دیا جا رہا ہے مجھے یہ شخص پسند نہیں ہے ـــــ ظاہر ہے اسلامی علمیت تہذیب میں عورت مردوں سے آزادانہ تعلقات قائم نہیں کر سکتی مخلوط تعلیم، مخلوط معاشرت کی عدم موجودگی میں اس کے مردوں سے تعلقات، دوستی، عشق و عاشقی کا کوئی امکان موجود نہیں ـــــ لہٰذا احادیث سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسالت مآبؐ نے عورت کی جانب سے مجوزہ شوہر کو قبول نہ کرنے یا ناپسندیدگی کے جذبات ظاہر ہونے کے باعث اس نکاح کی تجویز کو مسترد کر دیا یا اگر نکاح ہو گیا تو اسے فسخ فرما دیا پوری اسلامی تاریخ میں آپ کو یہی روایت ملے گی لیکن کبھی یہ واقعہ سننے میں نہیں ملے گا کہ کسی عورت نے ذات رسالت مآب کی بارگاہ میں کھڑے ہو کر یہ استغاثہ کیا ہو کہ اے اللہ کے رسولؐ مجھے یہ مرد پسند ہے میں اس سے شادی کرنا چاہتی ہوں میرا باپ مجھے یہ شادی نہیں کرنے دے رہا ـــــ یا کسی قاضی کی عدالت میں لڑکی نے یہ دعویٰ کیا ہو کہ یہ میرا محبوب اور معشوق یہ میری زندگی ہے میں نے اس مرد کو پسند کر لیا ہے میں اُسے اور یہ مجھے اپنا دل دے بیٹھے ہیں یہ میرا دوست ہے میرے اس کے ساتھ چھ سال سے تعلقات ہیں ہم نے ایک دوسرے کو پرکھ لیا ہے ماں باپ، خاندان ہمارے لیے صحیح

رشتہ مہیا نہیں کر سکتے مجھے صرف اس اجنبی پر اعتماد ہے ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر ہمارے خاندان کے لوگ ہمارے اس تعلق، رشتے کو نکاح کے دائرے میں آنے سے روک رہے ہیں اور ہماری جانوں کو خطرہ لاحق ہے۔

اس تاریخی تناظر میں آپ جدید ریاست میں اس حکم شرعی کے اطلاق کے منفی نتائج خود دیکھ سکتے ہیں۔عورت کی مرضی سے نکاح کی اجازت کا اسلامی حکم جب جدید قانون کا حصہ بنا تو اب لڑکی کا آوارگی کو نکاح کا رنگ دینا ممکن ہوا اب لڑکی کا گھر سے بھاگ کر اپنی مرضی کے لڑکے سے نکاح کرنا بھی جدید عدالت کی نظر میں عین اسلامی اور بالکل قانونی ہو گیا ____ اسلامی شریعت کا حکم اور اجازت ایک خاص تہذیب، تاریخ، مابعد الطبیعیات، ثقافت، علمیت کے تناظر میں بالکل مختلف معنی مہیا کرتا ہے ____ اور یہی حکم جدید پارلیمنٹ کے ذریعے Codify ہونے کے بعد بالکل مختلف اور یکسر متضاد معنی پیدا کرتا ہے ____ غالب اسلامی ڈسکورس میں عورت کی مرضی سے نکاح کے معنی صرف یہ ہیں کہ باپ، ولی، عاقلہ، خاندان، قبیلہ، لڑکی کا نکاح جس سے بھی طے کرے وہ نکاح اسی وقت مؤثر سمجھا جائے گا جب لڑکی کی رضامندی بھی شامل ہوگی اگر لڑکی انکار کر دے تو یہ نکاح منعقد نہیں ہو سکتا نکاح کے انعقاد کی شرط یہ بھی ہے کہ لڑکی ____ اپنے مجوزہ شوہر [Proposed Husband] کو قبول کرنے پر تیار ہے یا نہیں ____ عورت کو صرف یہ اختیار دیا گیا تھا ____ مگر عورت کا یہ اختیار نہیں تھا کہ وہ لڑکوں، مردوں سے دوستی، ناجائز تعلقات، خفیہ آشنائی قائم کر کے اپنے ولی یا قاضی کو مطلع کہ میں اس لڑکے سے شادی کرنا چاہتی ہوں ____ یہ رویہ اسلامی علمیت، روحانیت، عفت، عصمت وحیاء کے روحانی ایمانی دائروں کے منافی تھا اور اسلامی تاریخ میں کسی عورت کی جانب سے یہ طرز کبھی اختیار نہیں کیا گیا لیکن لڑکی کی مرضی سے نکاح کا اسلامی حکم جب اپنے تناظر، کلیت، تاریخ، تہذیب سے کٹ کر مجرد [Abstract] قانون یعنی ____ جدید قانون کا حصہ بنا تو لڑکیوں نے اسلامی قانون کی بنیاد پر عدالتوں سے اپنی پسند کے لڑکوں سے شادیوں کے مقدمات دائر کرنے شروع کیے اور عدالتوں نے ان کے دعوؤں کو اسلام کی بنیاد پر قبول کر لیا حتیٰ کہ گھر سے اپنے آشنا کے ساتھ بھاگنے والی لڑکی نے بھی عدالت سے اسلامی قانون کی بنیاد پر رعایت حاصل کر لی کہ شریعت نے اسے مرد سے دوستی کرنے اس کے عشق میں مبتلا ہونے اور اجنبی نامحرم مرد کے ساتھ بھاگ کر عدالت آنے اور اپنی مرضی سے نکاح کرنے کا اختیار دیا ہے ____

جب بھی شریعت جدید سیکولر قوانین کا حصہ بنتی ہے وہ خود سیکولرائز ہو جاتی ہے اسی لیے ہم بار بار یہ کہتے ہیں کہ جدید ریاست جیسے جیسے اسلامائز ہوتی ہے اسلام خود بخود سیکولرائز ہو جاتا ہے اس سیکولرائزیشن کا ایک ثبوت یہ ہے کہ مفتی منیب الرحمان صاحب نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ پاکستان میں اقلیتوں کا زمرہ ختم کر کے انھیں مسلمانوں کے مساوی شہری تسلیم کیا جائے صدر و وزیر اعظم کے عہدوں کے سوا تمام سرکاری عہدوں کے لیے صرف مسلمان ہونے کی شرط آئین میں بھی موجود نہیں ہے پاکستان ایک اسلامی ریاست ہے اور اسلامی ریاست کی عدالت کا چیف جسٹس کوئی غیر مسلم بھی ہو سکتا ہے ماضی میں کئی غیر مسلم کافر چیف جسٹس بنتے رہے ہیں۔[مفتی منیب الرحمان روزنامہ جسارت ۳۰/اپریل ۲۰۱۷ء]

مفتی منیب الرحمان صاحب کے اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ قادیانی بھی اس ملک کا چیف جسٹس بن سکتا ہے اگر کسی قادیانی کو اتنا اعزاز اکرام دینا تھا تو قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کی کیا ضرورت تھی علماء نے خواہ مخواہ بھٹو صاحب پر دباؤ ڈال کر قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوایا اور اب تو مفتی منیب الرحمان صاحب نے فرمایا ہے کہ اقلیتوں کا زمرہ ختم کر کے سب کفار کو ____ کو مسلم کے برابر کر دیا جائے اسلامی علمیت میں کبھی غیر مسلم، ذمی، کافر، معاہد مسلم کے برابر نہیں ہو سکتا قرآن نے واضح کر دیا ہے کہ اندھا اور نابینا عقل والے اور احمق جنگلی گدھے اور مسلم شر الدواب اور مومن جاہل اور ایمان والے کافر اور مسلم کبھی برابر نہیں ہو سکتے ____ مفتی منیب الرحمان صاحب نے یہ بھی نہیں بتایا کہ انھوں نے صرف صدر اور وزیر اعظم کے عہدوں کے لیے مسلمان ہونے کی شرط کیوں برقرار رکھی ہے یہ تو امتیازی سلوک ہے، چیف جسٹس اپنے حکم سے صدر اور وزیر اعظم کو برطرف کر سکتا ہے وہ تو صدر اور وزیر اعظم سے زیادہ طاقت ور ہے جب اس طاقت ور

شخص چیف جسٹس کے عہدے کے لیے مسلمان ہونا لازمی نہیں کافر، غیر مسلم، عیسائی، ہندو، قادیانی بھی چیف جسٹس ہوسکتا ہے تو صدر اور وزیراعظم کیوں غیر مسلم نہیں ہوسکتے۔علماء کی یہی کم زوری ہے جس کے باعث اسلام ریاست میں تحلیل ہوکر سیکولرائز ہورہا ہے اگر مسلمان اور کافر برابر ہیں ان میں کوئی فرق نہیں تو اسلامی ریاست کی کیا ضرورت ہے کیا اسلامی تاریخ میں کسی اسلامی عدالت کا قاضی کافر نامزد ہوا۔ اسلامی جہاد کرنے والا فوج کا کمانڈر انچیف کبھی کوئی کافر منتخب کیا گیا جدید ریاست اسلامی نہیں ہوسکتی وہ سیکولر ہوتی وہاں صرف Citizen ہوتا ہے لہٰذا وہاں کفر و اسلام کا مسئلہ ختم ہوجاتا ہے لیکن مفتی منیب الرحمان جو کچھ اسلام بیان کررہے ہیں اہل السنّت والجماعت کے اجماعی اصولوں کے تحت ان کا نقطۂ نظر بالکل غلط، باطل اور اسلام سے مکمل انحراف پر مبنی ہے۔

جدید ریاست کا جدید قانون ____ اسلامی شریعت کو اختیار کرتے ہوئے Pick & Choose کے فلسفے پر عمل کرتا ہے وہ اسلامی احکامات شریعت میں سے صرف ان احکامات کو قبول کرے گا جو اس کے دائرۂ جبر میں مزید وسعت پیدا کریں مگر وہ اسلامی احکامات جو اس کے دائرۂ اختیار کو کم کریں اس پر تحدید عائد کریں ان احکامات شریعت کو جدید قانون کبھی تسلیم نہیں کرے گا نہ اپنے قوانین کا حصہ بنائے گا۔

اس لیے ہم بار بار یہ کہتے ہیں کہ شرعی احکامات جب بھی جدید قانون کا حصہ بنیں گے اپنی روح کھودیں گے اپنے جوہر سے لازماً انحراف کریں گے بظاہر وہ اسلامی ہوں گے لیکن عملاً وہ سیکولر ہوں گے اور صرف آزادی کے دائرے کو وسیع کرنے کا سبب بنیں گے گزشتہ سو سال میں عالم اسلام کے تمام ملکوں میں عائلی قوانین کے نام پر جتنے شرعی احکامات جدید قوانین کے دائرے میں سموئے گئے ہیں انھوں نے مرد وعورت کو اسلامی علمیت کی روح کے منافی مساوی [Equal] برابر تصور کرکے تمام شرعی احکامات کی روح تبدیل کی اور وہ تمام اختیارات جو شریعت نے مرد کو دیے تھے عورت کو بھی عطا کیے اور اسلامی قانون کے نفاذ کے نام پر عملاً آزادی کے قانون کو نافذ کرکے عورت کو شریعت کے دائرے سے مکمل آزاد کرکے اسلام کے خاندانی، معاشرتی، روحانی نظام کو عملاً تہس نہس کردیا ____ افسوس ہے کہ علماء نے جدید ریاست کی ماہیت، اصلیت، حقیقت پر ابھی تک غور نہیں کیا وہ کیلسن Kelson، ہابر ماس Jurgen Habermass، اور کارل شمٹ Carl Schmith کے فلسفے پڑھ لیتے تو اس ریاست کی حقیقت سے واقف ہوجاتے لیکن وہ اس حقیقت سے واقف ہوئے بغیر نہایت اخلاص و نیک نیتی کے ساتھ اس جدید ریاست کو خلافت اسلامیہ پر قیاس کررہے ہیں جو درست طریقۂ کار نہیں ہے۔

توہین رسالت کے قانون کے ساتھ بھی یہی ہوا جب اسے جدید قانونی دائرے میں پارلیمنٹ اور سینٹ اور عوامی نمائندوں کی مرضی سے لایا گیا تو یہ شرعی حکم تنقید (Open to Criticism) کے دائرے میں آگیا۔توہین رسالت کا حکم مقدس سے خود بخود غیر مقدس [Profane] ہوگیا کیوں کہ آرڈیننس، ایکٹ، بل بننے کے ساتھ ہی شریعت کا حکم اب شریعت کا حکم ہی نہیں رہا اب یہ صرف اور صرف جدید ریاست کا قانون بن گیا اور جدید ریاست کا کوئی قانون حتمی قطعی نہیں ہوتا اراکین پارلیمنٹ اس کے ہر قانون پر تنقید کرسکتے ہیں اسے جب چاہیں منسوخ کرسکتے ہیں زرداری صاحب کے دور حکومت میں قومی اسمبلی میں ایم کیو ایم نے آئین سے اللہ کی حاکمیت کی شق کو ختم کرنے کے لیے ایک ترمیم پیش کی ترمیم کی قرارداد ایک کمیٹی میں ابتدائی جائزے کے لیے پیش ہوئی جس کے اراکین کی اکثریت پیپلز پارٹی کے لوگوں پر مشتمل تھی بحث و مباحثے کے بعد ترمیم پر رائے شماری کرائی گئی تو پیپلز پارٹی کے اراکین نے اس کے خلاف ووٹ دیا ۔روز نامہ جسارت نے خبر لگائی قومی اسمبلی میں خدا کی حاکمیت اعلیٰ دو ووٹوں سے برقرار رہی ایک اور اخبار نے سرخی لگائی خدا کی حاکمیت دو ووٹوں سے بچ گئی جناب مفتی منیب الرحمان صاحب نے اس خبر پر توجہ نہیں فرمائی۔ممتاز قادری شہید کا مقدمہ جناب سپریم کورٹ میں چل رہا تھا تو عدالت کے جج بار بار ممتاز شہید کے وکلاء سے صرف ایک سوال پوچھ رہے تھے کہ توہین رسالت کے قانون پر تنقید کیسے توہین ہوسکتی ہے یہ تو ہر پاکستانی شہری کا حق ہے اس حق کو اسلام کیسے چھین سکتا ہے مگر قادری صاحب کے وکلاء جو خود اسی جدید قانون کے ماہر تھے مگر اس

قانون اور اس جدید ریاست کی مابعد الطبیعیاتی اساسات تاریخ، پس منظر سے بالکل ناواقف تھے وہ اس سوال کا جواب ہی نہ دے سکے ____ اگر وہ یہ جواب دے دیتے تو علماء کو معلوم ہو جاتا کہ جدید ریاست کے قانونی ڈھانچے میں اسلام کبھی نافذ ہی نہیں ہو سکتا اور اگر نافذ ہو گا تو وہ لنگڑا لولا اسلام ہو گا جس میں اسلام کے سوا سب کچھ ہو گا اور یہ اسلام صرف اسلام کو مضبوط نہیں کرے گا بلکہ آزادی کے عقیدے ہی کو مضبوط کرنے کا سبب بنے گا۔

ہم نے عرض کیا مشال کے واقعے کی خبر/اطلاع DAWN اخبار نے ۱۴/اپریل ۲۰۱۷ء کو تین کالمی خبر کی صورت میں دی اور مشال والے دن افغانستان پر پھینکے گئے دنیا کے سب سے بھاری بم کی خبر صرف ایک کالمی دی گئی[DAWN 14 April 2017] یہ امتیازی سلوک کیوں؟ ایک آدمی مشال خان کے مارے جانے کی خبر سب سے اہم ____ سب سے بڑی ____ اور افغانستان کے ایک صوبے کے تین گاؤں میں مارے جانے والے ہزاروں انسانوں، جانوروں، چرندوں، پرندوں کے قتل عام کی بھیانک خبر انتہائی غیر اہم لبرل ازم لبرل میڈیا جسے الحق، الخیر سمجھتا ہے اسے اہمیت دیتا ہے اس کی تین چار کالمی سطریں لگاتا ہے اس کے لیے ایک فرد مشال کی موت اہم نظر آئی مگر افغانستان میں بم پھینکنے کے نتیجے میں مرنے والے ہزاروں لوگوں کی خبر غیر اہم نظر آئی ____ یہ لبرل ازم کا ایمان، عقیدہ اور یقین ہے اس کے مقابلے میں ہمارا عقیدہ یقین کتنا کم زور ہے کہ ایک فلم دیکھ کر ہی عشق رسول ختم ہو گیا اور عاشقان رسول کی حمایت کا اعلان کرنے کے بجائے ہم معذرت خواہی میں لگ گئے اس چھوٹے سے واقعے کو ہم نے خود ہی درندگی بہیمیت، وحشت، ظلم، دہشت گردی قرار دے کر لبرل لوگوں کا مقدمہ مضبوط کر دیا ____ DAWN نے افغانستان کے واقعے کی صرف ایک کالمی سرخی لگائی۔

Us drops mother of all bombs in Afghanistan

اس سرخی میں ہزاروں لوگوں کے مرنے کی اطلاع کو چھپا کر کس خوب صورتی سے اس حقیقت کو کفنایا اور دفنایا گیا ہے مگر مشال کی خبر کی سرخی کیسے نمایاں کی گئی ہے وہ

Student Lynched on Campus over allegations of blasphemy

لیکن خبر کی سرخی سے یہ بات واضح ہے کہ تین ہزار طلباء کا اشتعال بلاوجہ بلا سبب نہیں تھا اور اس قدر شدید اشتعال کی وجہ توہین رسالت کا جرم تھا اس طالب علم کے بارے میں بہت کچھ شائع ہو چکا ہے مولانا گوہر رحمان صاحب کے بیٹے ڈاکٹر عطاء الرحمان صاحب نے آزادانہ طور پر تمام طبقات کے لوگوں کی مجلس بنا کر اس واقعے کی تحقیقات کیں علماء کی ایک مجلس اور مختلف دینی جماعتوں کے رہنماؤں کی تحقیقات بھی سامنے آئی ہیں ڈاکٹر عطاء الرحمان صاحب کی تحقیقات سے تو ثابت ہو گیا کہ مشال توہین رسالت کا عادی مجرم تھا ____ مگر عطاء الرحمان صاحب کی رپورٹ میڈیا کے کسی نمائندے نے نشر نہیں کی کیوں کہ یہ آزادی کے عقیدے کو زبردست نقصان پہنچا سکتی تھی ____

بی بی سی کے نمائندے وسعت اللہ خان نے ایک چینل پر جب یہ کہا کہ ”مجھے نہایت افسوس ہے کہ بہیمیت، درندگی کا ایسا واقعہ کسی دینی مدرسے میں نہیں ہوا اور ایک ایسے ادارے یونیورسٹی میں ہوا جہاں اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا“ اس بیان پر مذہبی حلقوں نے مسرت کا اظہار کیا حالانکہ یہ بیان مسرت کا نہیں دکھ اور صدمے کا سبب بننا چاہیے تھا۔ اس بیان سے دینی لوگوں نے سوچا کہ چلو میڈیا نے دینی مدارس کا دفاع کیا ان پر حملہ نہیں کیا ان کی جان تو بچ گئی مگر ____ وسعت اللہ کا یہ بیان ان کی حماقت کا آئینہ دار ہے اتنے بڑے صحافی کو دینی مدرسے اور سیکولر یونیورسٹی کا فرق تک نہیں معلوم ____ اس جاہل صحافی کو یہ تک معلوم نہیں کہ دینی مدرسے کی پندرہ سو سالہ تاریخ میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی طالب علم نے توہین رسالت کا ارتکاب کیا ہو دینی مدرسے میں توہین رسالت کے ارتکاب کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کیوں کہ اس مدرسے کی مابعد الطبیعیات علمیت ____ دینی ہے وہ نقل کو العلم سمجھتی ہے ____ اس دینی تعلیم کا پورا سانچہ اور ڈھانچہ قرآن وسنت کی کامل تقلید پر منحصر ہے وہاں خدا اور رسول پر تنقید، اعتراض، استہزا، تضحیک، تحقیر، تذلیل کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا جو شخص

اللہ کے رسول کی تکریم کا قائل نہیں وہ کبھی دینی مدرسے میں داخلہ نہ لے گا لہٰذا اگر مثال جیسا واقعہ دینی مدرسے میں نہیں ہوا تو____ یہ کمال نہیں ہے____ یہ دینی مدرسے میں صرف ایک علمیت،[Epistomology] ایک الحق[Truth] ایک الخیر[Good] کی تعلیم وتدریس تلقین وتبلیغ کا نتیجہ ہے۔جس معاشرے،تہذیب، تمدن اور تعلیمی نظام میں صرف اور صرف ایک عقیدہ[Only one Faith] کی تعلیم دی جائے گی وہاں کبھی اس عقیدے کے خلاف بغاوت، احتجاج، تنقید، تضحیک کا تصور پیدا ہی نہیں ہوسکتا لبرل ازم اس طریقۂ کار اور طریقۂ تعلیم کو تنوع[Diversity] آزادی[Freedom] رنگا رنگی[Mutiplicity] کے خلاف سمجھتا ہے اور تنقید کے نام پر علمی ارتقاء کی تعلیم دے کر علمی ترقی کا دعویٰ کرتا ہے مگر حیرت انگیز طور پر ان تمام جدید سیکولر لبرل تعلیمی اداروں میں تمام تنقید صرف اور صرف مذہب پر ہوتی ہے اسے[Critical Thinking] سمجھا جاتا ہے حالانکہ مغرب میں کوئی[Critical Thinker] مذہب پر تنقید نہیں کرتا وہ جدیدیت کے پیدا کرتا نظام اور اس کے اداروں، اس کی ٹیکنو سائنس، سائنسٹر ازم، آزادی اور عقلیت کے عقیدے، سائنس اور سوشل سائنس وغیرہ پر تنقید کرتا ہے کیوں کہ وہ مذہب کو علم ہی تسلیم نہیں کرتے لہٰذا کسی غیر علمی چیز پر تنقید بھی نہیں کرتے لیکن پاکستان کے لبرل صرف مذہب پر تنقید کرتے ہیں۔ سائنس، جمہوریت، کیپٹل ازم، سوشل سائنس، عقلیت پرستی، آزادی کے عقیدوں پر تنقید نہیں کرتے ان سب کو یہ بدیہی صداقتوں کے طور پر لیتے ہیں ان کو وہ Taken for granted اور Self evedent evedence سمجھتے ہیں یہ رویہ صرف پاکستان میں نہیں ہے بلکہ یورپ امریکا اور پورے مغرب میں ہے۔ مذہب پر تنقید ہوتی ہے مگر کبھی سائنس، سوشل سائنس کی مابعد الطبیعیات پر تنقید نہیں ہوتی کبھی ترقی اور جمہوریت کے عقیدوں پر تنقید نہیں ہوتی کوئی تنقید کر دے تو سب اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔

گلبرٹ رسٹ جو فرانس میں خود پروفیسر ایمریطس ہے فرانس جیسے آزاد خیال لبرل معاشرے اور جدیدیت کے بہت بڑے بڑے فلاسفہ کے ملک میں رجعت پسندی کی حالت کے بارے میں اپنی کتاب[The Delusion of Economics] میں فرانس کی ایک یونیورسٹی کا واقعہ لکھا ہے جہاں طلباء، اساتذہ کے سامنے اس نے جدید اکنامکس کے عقیدوں، ایمانیات، مفروضات مابعد الطبیعیات اصولوں، قوانین قواعد پر تنقید کی اور دلائل سے ہی تنقید کو ثابت کر دیا لیکن طلباء اور اساتذہ نے اس کی تنقید سے اتفاق کرنے کے باوجود جواب یہ دیا کہ اگر ہمارے طلباء امتحانات میں یہ تنقیدی جوابات لکھیں گے تو انھیں ممتحن[Examiner] ناکام[Fail] قرار دے گا۔

A Little Story may not be out of place here. When I was invited to speak about the assumptions of economics to hundred pupils preparing for their baccalaureate exam at a French lycee, I decided to present some of the theses in this book and was rewarded with an attentive audience and a number of interesting questions. Still, I was ratheafraid of how the teachers accompanying the pupils would react. What did they think of my critical arguments?Their reply was disconcerting: 'Of course we largely agree with your point of view,they said, 'but we can't teach it. Our job is to get our pupils through the bac. And,as their papers will be corrected by external examiner, they would certainly fail if they deviated from the mainstream views in the syllabus. 'This is how a lack of critical spirit and ultimately, ignorance are transmitted. [Gilbert

Rist The Delusion of Econimics London Zed Book UK 2011 P 7]

جب فرانس کی یونیورسٹی میں سوشل سائنس کے مضمون اکنامکس کے عقیدے پرتنقید کی اجازت نہیں تو اسلام اور رسول پرتنقید کی اجازت کیسے دی جاسکتی ہے۔

Steve Keen اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ معاشیات کے کسی عالمی تحقیقی جریدے میں کوئی ایسا مضمون شائع نہیں ہوسکتا جو اکنامکس کے بنیادی اعتقادات، مفروضات مابعد الطبیعیات اور ایمانیات کے مطابق نہ ہو____ اگر آپ کا مضمون ان مفروضات کے خلاف ہوتو آپ کی تحقیق تسلیم نہیں کی جائے گی۔ مضمون شائع نہیں ہوگا۔

it is almost impossible to have an article accepted into one of the mainstream academic economics journals unless it has the full panoply of economic assumptions: rational behaviour (according to the economic definition of rational!).[Steve Keen, Debunking Economics: The Naked Emperor of the Social Sciences,London: Zed Book, 2007 (2004), p.154.]

مغرب کی تعلیم گاہوں میں اگر کوئی تصادم جھگڑا نہیں ہوتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ وہاں اسکول سے لے کر یونیورسٹی تک ایک ہی عقیدے کی تعلیم دی جاتی ہے آزادی کا عقیدہ اور اس کا نفاذ غلبے اور تسلط کے لیے اکنامکس کا علم اور ان پر کسی تنقید کی آزادی نہیں لہٰذا مغرب کی جامعات میں مدارس دینیہ کی طرح کوئی جھگڑا نہیں ہوتا سب ایک عقیدے کی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

پاکستان کی یونیورسٹی میں مستقبل میں مشال خان جیسے واقعے کے خاتمے کا طریقہ صرف یہی ہے کہ ان میں صرف اسلام کے عقیدے کی تعلیم دی جائے اور اس سے متصادم تمام عقیدوں، ماڈرن ازم، منشور انسانی حقوق وغیرہ کی تعلیم پر پابندی عائد کردی جائے۔

مشال جیسا واقعہ صرف اور صرف جدید سیکولر یونیورسٹی میں ہی پیش آسکتا ہے جہاں دو عقیدے، دو الخیر، دو الحق بیک وقت پڑھائے جاتے ہیں ایک جانب اسلامیات کے لازمی نصاب کے ذریعے اسکول سے یونیورسٹی تک طالب علم کو بندگی، اطاعت رب، ایمان بالرسل، آخرت، تقلید قرآن وسنت کا درس دیا جاتا ہے۔ مسجد، مدرسہ، معاشرت میں دینی علمیت غالب ہے پاکستان کی ریاست صرف آئین میں زبانی طور پر اسلام کی حاکمیت اور اسلامی شریعت کی بالا دستی کا دعویٰ کرتی ہے مگر عملاً جو صورت حال ہے سب جانتے ہیں۔ دوسری جانب سائنس کے ذریعے اسے خدا کی بندگی سے بے گانہ کرنے کے لیے Cause & Effect علت معلول کا قانون پڑھایا، سکھایا، بتایا اور رٹایا جاتا ہے۔ سوشل سائنس کے ذریعے انسانی حقوق____ عقیدہ آزادی اور مساوات کا سبق پڑھایا جاتا ہے لہٰذا ایک طالب علم جدید سیکولر یونیورسٹی میں علم اور عقیدے اور تاریخ وتہذیب کی دو کشتیوں میں سفر کرتا ہے دو ماخذات [Two Sources] سے علمیت حاصل کرتا ہے ایک علمیت اسے بندگی، سپردگی، اطاعت، تقلید، توحید رسالت، آخرت، حشر نشر کی دعوت دیتی ہے دوسری علمیت اسے کامل مطلق آزادی اور خدا بننے کی آزادی عطا کرتی ہے جب طالب علم دو کشتیوں میں سفر کرتا ہے تو اس کا انجام مشال خان کی صورت میں نکلتا ہے چونکہ پاکستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہے یہاں کی تہذیب، ثقافت، معاشرت، معاشرہ ابھی تک اسلامی ہے علماء، مدارس، خانقاہ، مساجد کا اثر عام آدمی کی زندگی پر بہت گہرا ہے لہٰذا طلباء خالص سیکولر کافرانہ تعلیم حاصل کرنے کے باوجود عملاً علماً مسلمان ہی رہتے ہیں اور لبرل ازم اور آزادی کے کفر کو سرے سے تسلیم ہی نہیں کرتے لیکن وہ طلباء جن کا مذہبی شعور بہت کم زور ہے جو پہلے سے الحاد، دہریت، اباحیت کا شکار ہیں جن کے گھرانے جدیدیت، سیکولرزم سے متاثر ہیں وہ جدید سیکولر تعلیمی اداروں میں آزادی کے عقیدوں کی فلسفیانہ مغربی تعبیروں

کو جب الحق سمجھ کر پڑھتے اور الخیر سمجھ کر قبول کر لیتے ہیں پھر آئین میں دیئے گئے حق اظہار رائے کی آزادی کے تحت ____ مذہب دشمنی پر مبنی اپنے افکار کا ابلاغ کرتے ہیں تو اس کا نتیجہ کشیدگی، کشمکش اور جنگ کی صورت میں نکلتا ہے تمام سیکولر یونیورسٹیاں اپنے احاطے میں مدارس کی طرح صرف ایک عقیدے ایک الخیر ایک الحق کا ابلاغ کریں اور آزادی کے عقیدے کو نصاب اور نظام تعلیم سے فارغ کر دیں تو یونیورسٹی میں کوئی مشال خان نہیں پیدا ہوگا جب مشال خان نہیں پیدا ہوگا تو مذہبی اکثریت کے طلباء کے جذبات کو بھی مشتعل نہیں کرے گا جب جذبات ہی مشتعل نہیں ہوں گے تو مردان یونیورسٹی کا واقعہ بھی پیش نہیں آئے گا۔

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ریاست ترکی کی طرح آئین سے ریاست سے زندگی سے اسلام، اسلامی شریعت، اللہ کی حاکمیت کے تمام زبانی دعووں کو بھی خارج کر دے اور خالص سیکولر ریاست بن جائے۔ تمام مدارس بند کر دیے جائیں ریاست کا کوئی ادارہ اور خود ریاست اپنے تحفظ، بقاء، دفاع کے لئے اسلام کا نام استعمال نہ کرے اسلامی قوم پرستی اور اسلامی قومی، ہندی علاقائی جہاد سے بھی ریاست دست بردار ہو جائے اور سب لوگوں کو تعلیم نظام کے ذریعے جبراً ترکی کی طرح سیکولر بنا دیا جائے تو امید ہے اس صورت میں بھی مشال خان جیسا کوئی واقعہ کبھی نہ ہوگا لیکن اس کی بھی ضمانت نہیں کیونکہ ترکی میں روس کے سفیر کو ایک پولیس آفیسر نے تقریب کے دوران قتل کر دیا روس شام کے مسلمانوں پر جو ظلم کر رہا تھا اس کا ردعمل تھا ترکی میں نہ مدرسے ہیں نہ روایتی اسلام صرف ماڈرن اسلام ہے۔

پاکستانی ریاست دو کشتیوں کی مسافر ہے اسے اپنی بقاء اور دفاع کے لئے __ ہندوستان کے خطرے سے بچنے کے لئے اسلام اور جہاد علماء اور مدارس اور مجاہدین کی بھی ضرورت ہے دہشت گردی کے خلاف ریاست کی پوری جنگ اسلام کے منہاج، اسلامی اصطلاحات اور اسلامی جہاد کے ذریعے لڑی جا رہی ہے ریاست اسلام کے بغیر اپنا دفاع کرنے سے قاصر ہے اس نقطہ نظر کو علمی طور پر بھارتی مفکر ایم جے اکبر نے اپنی کتاب Tinder Box میں تفصیل سے بیان کر دیا وہ کتاب آپ پڑھ لیں پاکستانی ریاست کی مجبوری ہے کہ وہ اسلام اور مدارس سے اپنے لئے قوت حاصل کرے کیونکہ تمام لبرل، قوم پرست، سوشلسٹ سیکولر، کمیونسٹ، آزاد خیال، دہریے، ملحد سب پاکستان کے دشمن ہیں پاکستانی فوج کے شدید مخالف ہیں اور امریکہ روس کے زبردست حامی ہیں غفار خان، فیض احمد فیض، فہمیدہ ریاض کو روس، بھارت، افغانستان میں پناہ بھی ملتی ہے اور قبر بھی لہٰذا ریاست جو لبرل، سیکولر ہونا چاہتی ہے وہ اپنے تحفظ کے لئے مسلمان رہنے پر مجبور ہے اس کے پاس کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ اتنی سی بات نہ ریاست کی سمجھ میں آ رہی ہے نہ حکومت کے، نہ عوام کے، نہ علماء کے، نہ مفکرین و مدبرین کے ____ تمام لبرل سیکولر __ اسلام کو الزام دے رہے ہیں، اسلام کو گالیاں دے رہے ہیں اور خود مذہبی حلقے بھی یہی سوچ رہے ہیں کہ ہمارے اندر کوئی مسئلہ ہے کوئی کمزوری ہے کوئی خلل ہے کوئی دریچہ کھلا رہ گیا ہے جو یہ مسئلے پیدا کر رہا ہے ہماری تاریخ میں کچھ گڑبڑ ہو گئی ہے حالانکہ حقیقت صرف یہ ہے کہ مسئلہ صرف اور صرف آزادی کا جدید کافرانہ عقیدہ پیدا کر رہا ہے [If & But کے سابقے لاحقوں کے ساتھ] جو منشور حقوق انسانی کے ذریعے ہمارے آئین کا حصہ بنا دیا گیا ہے جس کی تعلیم اب اسکول کالج یونیورسٹی میں عام ہے میڈیا اس کافرانہ عقیدے کا کھلم کھلا دفاع کر رہا ہے پاکستانی عدالت عظمیٰ بھی اسلام کے بجائے آزادی کے عقیدوں کے تحت فیصلے کر رہی ہے پاکستان

کے سابق لبرل چیف جسٹس تصدق حسین جیلانی نے اپنے تاریخی آخری فیصلے میں سب لوگوں کو ارتداد کی آزادی عطا کردی ہے وہ پہلے پاکستانی جج ہیں جنھوں نے جسٹس منیر اور جسٹس کیانی کے بعد ___ پہلی مرتبہ آئین کی اصل روح کے جوہر Assence کے عین مطابق آئین کی اسلامی تشریح کے بجائے لبرل تشریح کرکے پاکستانی آئین اور ریاست کی اصل حقیقت واضح کردی ہے کہ منشور انسانی حقوق اور آئین ہر فرد کو جو مذہب چاہے رکھنے، بدلنے اور اس میں تحریف کرنے کی آزادی دیتا ہے عدلیہ آئین کی تشریح کا واحد اور آخری ادارہ ہے یہ تشریح UNO اور UCHR یورپین کورٹ آف ہیومن رائٹس کی تشریحات کے عین مطابق ہے مگر دینی حلقے ابھی تک سو رہے ہیں وہ آزادی کے عقیدے کو رد کرنے کے بجائے اس کی اسلام کاری میں مصروف ہیں یہی اسلام کاری تمام مسئلے پیدا کررہی ہے کفر کی اسلام کاری ممکن نہیں۔ بندگی، اطاعت، شریعت کی تقلید اور آزادی کے عقیدے کبھی اکٹھے نہیں ہوسکتے ان کو جب مجتمع کرنے کی کوشش کی جائے گی مشال خان کی طرح کسی کی سر بریدہ لاش ہی برآمد ہوگی یہ آزادی کے فتنہ کا نتیجہ اور فتنہ قتل کے جرم سے زیادہ شدید جرم ہے یہ اسلام کی علمیت کا نتیجہ نہیں ہے جدید ریاست کا جوہر کسی مذہبی علمیت کو قبول نہیں کرسکتا یہ موقف وائل حلاق نے اپنی کتاب Impossible state میں ___ پروفیسر عزیز احمد نے اپنی کتاب Islamic Modernism In India & Pakistan میں جسٹس منیر احمد اور ایم آر کیانی نے منیر کمیشن رپورٹ میں یہی بات لکھی ہے کہ جدید ریاست مذہبی نہیں ہوسکتی پاکستان ریاست مذہب اور آزادی کے ساتھ آنکھ مچولی کھیل رہی ہے جس کا نتیجہ مردان یونیورسٹی کا واقعہ ہے ریاست ایک سمت اختیار کرلے علماء صرف بیانات دے کر عوام کو توہین رسالت کے مسئلے پر فطری ردعمل سے نہیں روک سکتے انھیں یہ بات معلوم ہونی چاہیے کہ ردعمل کا کوئی نظریہ نہیں ہوتا Reaction has no Ideology ____ ردعمل کو تلقین، تذکیر، تعلیم، نصیحت، فتویٰ بھی نہیں روک سکتا _____ لوگوں کے جذبات کو صرف تلقین سے نہیں روکا جاسکتا آپ کی غلطی یہ ہے کہ آپ آزادی کے عقیدے کا انکار نہیں کررہے اس کی تردید نہیں کررہے آپ اس عقیدے کا انکار کردیں اور اس عقیدے کے حاملین کو آزادی اظہار نہ دیں تمام مسئلہ خود حل ہوجائے گا آزادی کے باطل عقیدے کی تشریح اوباما نے UNO میں اپنی تقریر میں بیان کردی تھی۔

We have taken these positions because we believe that freedom and self-determination are not unique to one culture. These are not simply American values or Western values - they are universal values.

Here in the United States, countless publications provoke offense. Like me, the majority of Americans are Christian, and yet we do not ban blasphemy against our most sacred beliefs. As President of our country and Commander-in-Chief of our military, I accept that people are going to call me awful things every day - (laughter) - and I will always defend their right to do so. (Applause.)

Americans have fought and died around the globe to protect the right of all people to express their views, even views that we profoundly disagree with. We do not do so because we support hateful speech, but because our founders understood that without such protections, the capacity of each individual to express their own views and practice their

own faith may be threatened.
We do so because given the power of faith in our lives, and the passion that religious differences can inflame, the strongest weapon against hateful speech is not repression; it is more speech - the voices of tolerance that rally against bigotry and blasphemy, and lift up the values of understanding and mutual respect.

But in 2012, at a time when anyone with a cell phone can spread offensive views around the world with the click of a button, the notion that we can control the flow of information is obsolete.
[Remarks from President Barack Obama to the UN General Assembly, New York, 2012.09.26]

غیرت کے نام پر قتل کی اجازت شریعت نے نہیں دی لیکن جب پاکستانی کی ریاست، حکومت، عدالت_____ حیاء، عفت و عصمت کو غیر اہم بے کار اقدار سمجھے اور بے شرمی کرنے والی عورتوں کی آزادی کا دفاع کرے_____ تو ایک عام فرد ردِ عمل کے تحت اپنی بیٹی، بیوی کو قتل کر کے رہے گا علماء کوئی بھی فتویٰ دیں لوگ عزت کے نام پر قتل کریں گے کیوں کہ ریاست اور اس کی عدالت بھگوڑی عورت کو آزادی کے نام پر بے غیرتی کی اجازت دے کر اس کی بے غیرتی، بے حیائی، ڈھٹائی اور بے شرمی کو قانون کا تحفظ فراہم کرتی ہے اور مشتعل خاندان، قبیلے کے جذبات، احساسات، دکھ درد، غم کے ازالے اور اعادے کا کوئی میکانزم اس کے پاس موجود نہیں ہے۔ ریاست کی تعلیم اور حکمت عملی کے نتیجے میں مذہبیت ختم ہو رہی ہے اور آزادی کے عقیدے پر ایمان لانے والوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے جب بھی گھر سے کسی بھاگی ہوئی لڑکی کو اس کے ماں باپ خاندان مارنے کی کوشش کرتا ہے تو میڈیا، عدالت، ریاست مارنے والوں کو مجرم قرار دے کر بند کر دیتے ہیں وہ ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتے ہیں پہلے سوال کا جواب نہیں دیتے کہ یہ لڑکی گھر سے کیوں بھاگی اس کا ذہن کس نے تعمیر کیا وہ ایک اجنبی لڑکے کی خاطر اپنی اجتماعیت کو کیوں قربان کرنے پر آمادہ ہوئی؟

<u>میڈیا ہمیشہ دوسرا سوال کیوں پوچھتا ہے؟</u>

سوال یہ ہے کہ پہلا سوال کیا ہے اور دوسرا سوال کیا ہے؟ اس کا جواب اس صدی کے بہت بڑے فلسفی سلاوژی ژیک نے دیا ہے جو غامدی صاحب کے پسندیدہ ترین فلسفی ہیں اور غامدی صاحب اس کے فلسفے سے بہت متاثر ہیں ۱۹۹۸ء میں جب وہ کراچی کثرت سے آتے تھے تو سلاوژی ژیک کی کتابیں ان کے ساتھ ہوتی تھیں۔ سلاوژی ژیک ایک بدتمیز بدقماش فلسفی ہے جسے مغرب میں ایک خطرناک فلسفی سمجھا جاتا ہے جو اپنے فلسفیانہ نکات گالیوں کے ذریعے پیش کرتا ہے اس کا خیال ہے کہ دنیا میں سب سے موثر ترین ذریعہ ابلاغ گالی ہے جس کے ذریعے فی الفور [Immediate] ابلاغ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا غامدی صاحب کے پسندیدہ فلسفی کا اصول ان کے اور میڈیا والوں کے فوری ابلاغ کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔

ژی ژیک لکھتا ہے کہ ایک شخص روزانہ پانچ بجے اپنے دفتر سے گھر پہنچتا تھا ایک دن وہ حسن اتفاق سے چار بجے گھر پہنچ گیا اس نے دیکھا کہ اس کی بیوی ایک اجنبی مرد کے ساتھ خواب گاہ میں ہم کلام ہے اس نے اپنی بیوی سے پوچھا یہ کون ہے اور یہاں کیوں ہے

؟یہاں کیا کر رہا ہے؟(یہ پہلا سوال ہے)۔

بیوی نے جواب دیا یہ سوال غیر اہم ہے کہ یہ کون ہے اور یہاں کیا کر رہا ہے اصل سوال یہ ہے کہ تم یہاں چار بجے کیا کر رہے ہو تمہارے آنے کا وقت پانچ بجے ہے(یہ دوسرا سوال ہے)۔

ژی ژیک کہتا ہے کہ جدید دنیا میں ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیا جاتا ہے پہلے سوال کو اسی طرح نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔میڈیا اسی طرح ہمیشہ علماء سے دوسرے سوال کا جواب مانگتا ہے۔قندیل بلوچ کو بھائی نے قتل کر دیا،شریعت میں اس کا کیا حکم ہے؟ پہلے سوال کا جواب نہیں مانگتا کہ قندیل بلوچ اپنا جسم،عزت،عفت،عصمت میڈیا پر بیچ رہی ہے اسکا شریعت میں کیا حکم ہے؟ کیونکہ میڈیا والوں کو پتہ ہے کہ اگر شریعت سے قندیل بلوچ کی زندگی کا حکم پوچھا گیا تو شریعت کہہ دے گی اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے قتل کر دو۔ قتلو ا تقتیلا (اور ہماری عدالت اور شریعت کورٹ کبھی اس حکم پر عمل نہیں کرے گی)۔

جب کوئی لڑکی گھر سے ماں باپ کے پیسے، ان کی عزت وآبرو، زیورات لے کر اپنے آشنا کے ساتھ بھاگتی ہے تو پاکستانی ریاست اور عدالت اور میڈیا اس بھگوڑی عورت کے خلاف نہ کوئی خبر نشر کرتے نہ عدالت عظمیٰ سوموٹو ایکشن لیتی ہے نہ ریاست کو اس سے کوئی دلچسپی ہے کہ لڑکی گھر سے کیوں بھاگی ــــ یہ ریاست کا مسئلہ ہی نہیں یہ فرد کا مسئلہ ہے اور منشور انسانی حقوق کے تحت ہر فرد آزاد ہے جو چاہے کہہ دے جو چاہے کر گزرے ــــ ریاست اس کی عدالت اور اس مارکیٹ سوسائٹی کا میڈیا وہ علماء کے پاس اس سوال کا جواب مانگنے نہیں آتے کہ یہ عورت جو اپنے خاندان کی اسلام کی، ہماری تہذیبی اقدار اور روایات کی پامالی کر کے بھاگی ہے تو اس کا شریعت میں کیا حکم ہے؟ عورت کے بھاگنے کا نوٹس نہ حکومت لیتی ہے نہ عدالت لیتی ہے نہ میڈیا ــــ لیکن جیسے ہی کسی عورت کا خاندان، قبیلہ، رشتہ دار، باپ ماں، بھائی، بچا ردعمل کی نفسیات کے تحت کلہاڑی سے اس عورت کا خاتمہ کرتا ہے تو فوراً ریاست حکومت، عدالت، میڈیا متحرک ہو جاتا ہے اور علماء سے پوچھنے لگتا ہے ہے کہ کیا اسلام میں گھر سے بھاگنے والی عورت کو اس بے دردی سے قتل کر دینا جائز ہے؟ اسلام کیا کہتا ہے ماڈرن ازم ہمیشہ علماء سے دوسرے سوال کا جواب پوچھتا ہے کہ لڑکی کو قتل کرنا کیا جائز ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا لڑکی کا اجنبی لڑکے کے ساتھ گھر سے بھاگنا جائز تھا سپریم کورٹ، ریاست، میڈیا کبھی اس سوال کو نہیں اٹھائے گا کیوں کہ پھر بات سیکولر تعلیم، آزادی کے عقیدے، مخلوط تعلیم اور آزاد میڈیا کی آوارگی تک پہنچ جائے گی اور لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ ظلم کا اصل سبب ماں باپ نہیں لڑکی کا رویہ نہیں صرف اور صرف جدیدیت (ماڈرن ازم) کا آزادی کا عقیدہ ہے اس عقیدے نے تمام مسائل پیدا کئے ہیں اور ریاست اس عقیدے کو اسلام کے ساتھ ساتھ چلا رہی ہے۔مولوی کی ضرورت ریاست، میڈیا اور عدالت کو کسی کی موت پر ہی محسوس ہوتی ہے کسی کی زندگی میں ان کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی ایسا لگتا ہے کہ یہ کلہاڑی لڑکی کے ماں باپ کو مولوی نے فراہم کی تھی مولوی نے ہی لڑکی کو قتل کرنے کا حکم دیا تھا حالانکہ یہ سب کچھ آزادی کے عقیدے کی تلوار ہوا میں چلانے کے نتائج ہیں یہ آزادی کے عقیدے کا شدید ردعمل ہے مردان میں مشال کا واقعہ بھی شدید ردعمل ہے لیکن آزادی کے عقیدے پر یعنی پہلے سوال پر کوئی گفتگو نہیں ہوتی۔

پاکستانی عدالت بھی بھگوڑی لڑکی کے بھاگنے پر کوئی نوٹس نہیں لیتی پولیس کو کبھی نہیں کہتی کہ یہ لڑکی کی ماں باپ کا زیور، سونا،

روپیہ پیسہ چوری کر کے ان کی عزت، وقار، احترم، نام بدنام کر کے ایک اجنبی لڑکے کے ساتھ بھاگ گئی ہے لہٰذا اس لڑکی اور لڑکے کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کرو ماں باپ کا سونا روپیہ ان کی عزت وقار انہیں واپس کرو ___ پاکستانی عدالت اگر ایسا کرنا بھی چاہے تو نہیں کر سکتی نہ آج تک کسی چیف جسٹس نے اسلامی اقدار، حیاء عفت، عصمت کی لڑکی کے ہاتھوں پامالی پر کبھی کوئی سوموٹو نوٹس نہیں لیا کیوں کہ یہ عدالت آزادی کے عقیدے کے تحفظ اور دفاع کے لئے قائم کی گئی ہے اسلامی اقدار و روایت اور شرعی احکامات کے نفاذ کے لئے قائم نہیں کی گئی۔

اس کا ثبوت یہ ہے کہ آج تک کسی چیف جسٹس نے لڑکی بھگانے والے لڑکے، اس بے غیرتی پر اکسانے والے میڈیا، اس آوارگی کو عام کرنے والے مخلوط تعلیمی ماحول اور آزادی کے عقیدے کے خلاف کوئی سوموٹو نوٹس نہیں لیا چیف جسٹس نے سوموٹو نوٹس صرف اس وقت لئے جب ان بھگوڑوں اور بھگوڑنوں پر ردعمل کے جذبات کے تحت ان کی برادری، قبیلے، خاندان کسی رشتہ دار نے قاتلانہ حملہ کیا اور عدالت کو فوراً زندگی کا حق اور جان کا حق اور حق آزادی یاد آگیا۔ عدالت نے یہ بھی نہیں سوچا کہ Reaction has no Ideology ظاہر ہے جدید عدالت جو جدیدیت کے تصور عقلیت پرستی سے نکلی ہے وہ انسان کو جدیدا کناکمس کی طرح صرف ایک عقلی وجود [Rational Being] تصور کرتی ہے اس کے جذبات، احساسات اس کا موضوع ہی نہیں ہیں۔

عدالت نے لڑکی کی جانب سے شریعت کے احکامات، پردہ اور محرم کے احکامات، شرم و حیاء کے احکامات پامال کرنے پر سوموٹو نوٹس نہیں لیا عدالت نے کبھی اس لڑکے اور اس نظام کے خلاف بھی سوموٹو نوٹس نہیں لیا جو اس لڑکی کو اکسا کر مشتعل کر کے بھگا کر لے گیا ___ آخر کیوں؟ اس لئے کے شریعت اقدار، روایات، خاندان قبیلے کی عزت ___ منشور حقوق انسانی کے تحت حقوق Rights نہیں ہیں کیونکہ اس منشور میں حق Right صرف اور صرف فرد Person کو دیا گیا ہے اس کی انفرادی حیثیت میں Individual Capacity میں دیا گیا ہے۔ اس منشور میں فرد سے مراد صرف ایک فرد ہے اس میں اس کی بیوی بچے بھی شامل نہیں ہیں اس منشور میں کسی اجتماعیت Collectivity کا کوئی حق Right نہیں ہے فرد اگر اپنی مذہبی، تاریخی، دینی، الہامی، روحانی، تہذیبی، معاشرتی، خاندانی، نسلی لسانی عصبی اجتماعیت کے خلاف بغاوت کرتا ہے تو جدید ریاست کا فرض ہے کہ وہ اپنے Citizen کی اس بغاوت کا ساتھ دے اور اس اجتماعیت کے خلاف کھڑی ہو جائے لہٰذا عدالتیں ہر بھاگنے والی لڑکی اور بھاگ کر شادی کرنے کی آزادی دیتی ہیں ان کے حقوق کا تحفظ کرتی ہے مگر اسلامی اقدار، خاندانی روایت کا تحفظ نہیں کرتیں کیونکہ منشور انسانی حقوق میں ان کے حقوق موجود ہی نہیں ہیں اجتماعیت انسان نہیں ہوتی لہٰذا اجتماعیت کا کوئی حق بھی نہیں ہوتا۔

اسی اصول کے تحت بھارت کی عدالت نے ۹/مارچ ۲۰۱۷ء میں دریائے گنگا کے حقوق کی پامالی کے خلاف ایک درخواست کی سماعت کرتے ہوئے کہا کہ گنگا کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ آئین میں حقوق صرف انسان کو دیے گئے ہیں کسی غیر انسان کے لئے نہیں ہیں لہٰذا ___ عدالت نے گنگا کو گندگی، غلاظت، تعفن سے بچانے کے لئے گنگا کو Person کے طور پر تسلیم کر لیا اور اس کے حقوق

کے تحفظ کے لیے بھارتی حکومت کو ہدایات جاری کر دیں ____ لبرل ازم اور اس کے مذہبی دستور منشور انسانی حقوق کے تحت صرف اور صرف ایک فرد کی ملکیت، آزادی اور اظہار رائے کو تحفظ دیا گیا ہے اور یہ تمام حقوق ہمیشہ فرد کی مذہبی، تاریخی اجتماعیّتوں [Religious & Historical Collectivites] کو تحلیل کرنے، ان کا خاتمہ کرنے اور اس فرد کو اس کی تاریخ، مذہب، اقدار، روایات اور دین کے غلبے، تسلط سے نجات دِلانے کے لیے ہر جدید ریاست ہر فرد کو عطا کرتی ہے کیوں کہ جدیدیت کا اصل عقیدہ، اصل دین مذہب صرف اور صرف مطلق آزادی [Absolute Freedom] ہے مگر اس آزادی کے عقیدے کے تحت آزادی کے عقیدے کے خلاف کسی کو بغاوت کی آزادی نہیں ہے جو اس عقیدے کے خلاف بغاوت کرے گا جان رالس کے حکم کے مطابق اسے جنگوں اور جراثیم کی طرح ختم کر دیا جائے گا۔

جدید ریاست وعدالت صرف اور صرف فرد کی آزادی کے تحفظ کو ممکن بناتے ہیں اور اس آزادی کی راہ میں حائل ہر خاندانی، مذہبی، تاریخی، اجتماعی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے فرد کی ہر ممکنہ مدد کرتے ہیں۔ عدالت دستور آئین کے تحت کام کرنے کی پابند ہے اور اس دستور آئین کا ماخذ Fedralist Papers اور ان پیپرز سے نکلنے والے منشور انسانی حقوق ہیں جسے امریکی صدر روز ویلٹ کی اہلیہ ایلینا روز ویلٹ کی کوششوں سے مرتب و منظور کیا گیا۔ یہ منشور ہی عہد حاضر کا مذہب ہے۔ بہت سے سوشل سائنسدان اِس منشور انسانی حقوق کو مذہب انسانی Civil Religion قرار دیتے ہیں تمام سول سائینٹز کا مذہب یہی سول ریلیجن ہے جہاں بھی سول سوسائٹی قائم ہوگی اس کا ایک ہی مطلب ہوگا کہ وہاں کے معاشرے نے آسمانی مذہب کو مسترد کر کے اب صرف انسانی مذہب یعنی منشور حقوق انسانی کو قبول کر لیا ہے ایسے ہی معاشرے مہذب، متمدن معاشرے اور جدید معاشرے Civil Society کہلاتے ہیں ان کے مقابلے میں تمام مذہبی اور دینی معاشرے جاہلیت کا شکار جاہلیت زدہ قرار پاتے ہیں۔

افسوس یہ ہے کہ ہم ان مباحث سے واقف نہیں زاہد الراشدی اور امام خمینی جیسے لوگ انسانی حقوق کے منشور کو خطبہ حجۃ الوداع سے ماخوذ سمجھتے ہیں فیڈرلسٹ پیپرز لکھنے والے چوبیس گورے مرد امریکی مفکرین نے ان پیپرز کی بنیاد خطبے سے نہیں لی ____ اس منشور کے خالقین اور مفکرین خطبہ حجۃ الوداع سے بالکل ناواقف تھے ان بے چاروں نے کبھی اسلام کو بھی نہیں پڑھا تھا وہ اسلامی فقہ، اسلامی علمیت کے مباحث ہی سے ناواقف تھے مگر راشدی صاحب اور خمینی صاحب جیسے لوگ جو مغربی فلسفے سے واقف نہیں وہ بلاوجہ انسانی حقوق کے منشور کو چند ترامیم If اور But کے لاحقوں کے ساتھ آخری خطبے کا عکس قرار دیتے ہیں۔

ان بیچاروں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ خطبہ حجۃ الوداع کے اصل مخاطب مسلمان ہیں اور ان کے توسط سے تمام نوع انسانی ____ جب کہ منشور کا اصل خطاب اس انسان سے ہے جو اٹھارہویں صدی کے جدید مغربی فلسفے سے خلق [Create] ہوا جسے روشن خیال [Enlightend] انسان کہتے ہیں __ جو وحی الٰہی اور عالم دین کو سند تسلیم نہیں کرتا ان کا انکار کرتا ہے خارجی ذرائع علم کا انکار کرتا ہے اس کے بجائے وہ اپنے اندرون میں جھانک کر صرف عقلیت کو ماخذ علم تسلیم کرتا ہے اور زندگی کے تمام فیصلے عقلیت کی بنیاد پر کرتا ہے۔

ایسے انسان کو روشنی اور ہدایت کے لیے اپنے سے باہر، وحی کی طرف، آسمان کی طرف، پیغمبر یا عالم دین کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ ہدایت کے لیے اپنے آپ سے اپنی عقل سے اپنے اندرون سے رجوع کرنے کا پابند ہے اسی رویے کو جدید فلسفے میں روشن خیالی کا عہد کہتے ہیں جب صدیوں سے یہ خدا مرکز کائنات ڈیکارٹ اور کانٹ کے فلسفے کے بعد خدا مرکز سے انسان مرکز کائنات میں تبدیل ہوگئی خدا کی جگہ انسان کی خدائی نے لے لی روشن خیالی کا یہ فلسفہ کانٹ اور فوکالٹ کے مضامین What is enlighteinent میں پڑھا جا سکتا ہے۔
کانٹ نے اپنے مضمون میں صاف صاف لکھا ہے کہ روشن خیال وہ ہے جو وحی الٰہی سے عالم سے اور ڈاکٹر سے ہدایت نہیں لیتا اپنی زندگی کے فیصلے خود کرتا ہے کانٹ کے فلسفے کے بعد__ وحی الٰہی اور عالم دین تو انسانی زندگی سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہو گئے لیکن ڈاکٹر زندگی کے ہر دائرے میں آ گیا میڈیکلائزیشن کے بعد تو ہر شخص ڈاکٹر کو خدا سمجھتا ہے اور ہسپتال کے بارے میں عمومی رائے یہ ہے کہ یہ لوگوں کو زندگی دیتے اور موت سے بچاتے ہیں خدا کا اب زندگی اور موت سے تعلق بھی جدید میڈیکل سائنس نے منقطع کر دیا ہے لہٰذا MBBS کے طلباء پوسٹ مارٹم رپورٹ میں موت کا سبب Cause لکھتے ہیں وہ معلوم نہ ہو سکے تو لکھ دیتے ہیں Cause Not Known اس کا مطلب یہ ہوا کہ میڈیکل سائنس اس مرنے والے کی موت کا سبب ابھی تک معلوم نہیں کر سکی جب مزید ترقی ہوگی تو یقیناً اس موت کا سبب بھی معلوم ہو جائے گا اگر کوئی ڈاکٹر لکھ دے کہ یہ قضاء اور قدر کا فیصلہ ہے موت اللہ کے حکم سے آئی ہے اسے اللہ نے اپنے پاس بلا لیا ہے تو اس دلیل کو میڈیکل سائنس جہالت قرار دے کر مسترد کر دے گی جب تعلیم ہی علت و معلول کے سائنسی قانون پر رکھی گئی ہے تو اس کے بعد مشال خان جیسے لوگ پیدا ہو رہے ہیں تو یہ سیکولر تعلیم کا مسئلہ ہے اسلام کا مسئلہ ہی نہیں۔

بنیادی اور اُصولی بات جو تمام علماء اور اسلامی تحریکوں کو سمجھنی چاہیے کہ مغرب اسلام سے، علماء سے، اسلامی علمیت سے مکالمے کے لیے تیار ہی نہیں ہے وہ بس یہ چاہتا ہے کہ مسلمان مغرب کی غلامی قبول کر لیں امریکا کا سب سے بڑا فلسفی رچرڈ رارٹی صاف صاف لکھتا ہے کہ ہم نے پوپ سے مکالمہ نہیں کیا تو اسلامی جدیدیت پسندوں سے بھی مکالمہ نہیں کریں گے وہ غامدی، قرضاوی، طارق رمضان سے مکالمہ پسند نہیں کرتا تو علماء سے کیسے مکالمہ کرے گا مگر غامدی صاحب، وحیدالدین خان صاحب، قرضاوی صاحب اور طارق رمضان صاحب خواہ مخواہ مکالمے کی باتیں کر رہے ہیں۔
رارٹی کے اصل الفاظ پڑھیے:

There was no dialogue between the philosophers and the Vatican in the eighteenth century, and there is not going to be one between the mullahs of the Islamic world and the democratic West. The Vatican in the eighteenth century had its own best interests in mind, and the mullahs have theirs. They no more want to be displaced from their positions of power than the Catholic hierarchy did (or does). With luck, the educated middle class of the Islamic countries will bring about an Islamic Enlightenment, but this enlightenment will not have anything much to do with a "dialogue with Islam."[A dialogue between American State philosopher Richard Rorty and Gianni Vatimo from page 72 to 75 Columbia University Press, New York

سیکولر ازم ،الحاد اور مشعل خان کے قتل پر عمار ناصر سے ایک مکالمہ

جناب عمار ناصر کے پسندیدہ سیکولرازم کا منحوس چہرہ دیکھئے

مردان یونیورسٹی میں مشال واقعے پر عمار ناصر مدیر "الشریعہ" کا شرمناک اداریہ

عمار ناصر کو پتہ نہیں کہ سیکولر معاشرے میں ماں بیٹے اور بیٹی بھائی باپ سے محفوظ نہیں

امریکا سیکولر ملک ہے وہاں کروڑوں عورتوں مردوں سے جبری زنا ہوتا ہے

امریکا اور یوروپ کے سیکولر ملکوں میں جنسی دہشت گردی کی تاریخ

عمار ناصر صاحب کو سیکولرازم کی ضرورت ہے یعنی وہ پاکستان میں جنسی دہشت گردی چاہتے ہیں

سید خالد جامعی

مولانا سرفراز خان صفدر کے پوتے علامہ زاہد الراشدی کے بیٹے، جاوید غامدی کے علمی دست راست الشریعہ کے مدیر اور مغرب اور مغربی فلسفے سے ناواقف نام نہاد مفکر اسلام علامہ عمار ناصر نے الشریعہ مئی ۲۰۱۷ء کے اداریے میں مردان یونیورسٹی میں مشال خان کی ہلاکت پر ایک شرمناک اداریہ لکھا ہے اس اداریے کو پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ عمار ناصر صاحب سیکولرازم، سیکولرازم کی تاریخ اور سیکولر ممالک کے حال احوال سے بالکل واقف نہیں اداریے کا عنوان ہے

اگر مذہبی معاشرہ یہی ہے تو ہمیں سیکولر ازم کی ضرورت ہے

ہمیں مذہبی معاشرے کی نہیں سیکولرازم کی ضرورت ہے: عمار ناصر غامدی

عمار ناصر صاحب لکھتے ہیں مشال خان کے دل دوز واقعے کی کچھ تفصیلات سوشل میڈیا پر دیکھیں واقعہ یہ ہے کہ اس قوم کی اجتماعی اخلاقی پستی بالکل ننگی ہوکر سامنے آجاتی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا، اس نوعیت کا ہر واقعہ ہماری اجتماعی اخلاقی صورت حال کے حوالے سے آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہوتا ہے، لیکن اس واقعے نے تو اتمام حجت میں کوئی کسر باقی نہیں رہنے دی۔

ہمیں سیکولر ریاست اور سیکولر معاشرے سے اصولی اوور نظریاتی طور پر شدید اختلاف ہے لیکن اگر "مذہبی معاشرے" کا نقشہ یہی ہے تو خدا کو حاضرو ناظر جان کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمیں اب سیکولر ازم کی ضرورت ہے۔

عمار ناصر صاحب کے اس احمقانہ اداریے کا جواب تو ہم اپنے مضمون "مشال کے قتل پر ایک عالم دین سے مکالمہ" میں بالواسطہ طور پر دے چکے ہیں جس میں سیکولر، لبرل مغرب کی وحشت، دہشت، بربریت، سفاکی، بہیمیت کی داستان حوالوں کے ساتھ درج ہے۔ مشال خان کے قتل کے واقعے کا مغرب، لبرل ازم، سیکولرازم اور جمہوریت کی درندگی سے کوئی موازنہ نہیں کیوں کہ تشدد، دہشت گردی____ کا لبرل ازم اور جمہوریت کے ساتھ خلقی تعلق ہے____ یہ کوئی اتفاقی واقعہ____ اور اتفاقی حادثہ نہیں ہے____ دہشت گردی لبرل ازم اور سیکولرازم لازم وملزوم ہیں۔

سیکولر مغرب میں اور سیکولر امریکا میں کیا کچھ ہوتا ہے یہ ایک بہت تفصیلی موضوع ہے فی الحال ہم صرف عورت کا حشر بتا رہے ہیں جس عورت کو آزادی دلانے کا دعوے دار امریکا ہے ذیل میں ہم عمار ناصر کو دنیا کے سب سے عظیم سیکولر ملک امریکا کے سیکولرازم کا ایک چہرہ دکھا رہے ہیں۔

سیکولرازم کے اس منحوس چہرے کے لیے ہم نے صدر اوباما کی جاری کردہ وہائٹ ہاؤس کو ۲۰۱۴ء کی رپورٹ کا انتخاب کیا ہے یہ رپورٹ عظیم سیکولرازم کی ہلکی سی جھلک ہے کیا عمار ناصر صاحب پاکستان کو امریکا جیسا سیکولر ملک بنانا چاہتے ہیں اس عظیم امریکا اور اس کے

بعد یوروپ، کینیڈا، آسٹریلیا کے عظیم سیکولرازم کی جھلکیاں اسی مضمون میں ملاحظہ کیجیے۔

اگر عمار ناصر صاحب میں کچھ شرم، حیاء، غیرت، حمیت موجود ہے تو وہ فوراً اپنے ادارے سے رجوع کرلیں گے علمائے کرام اور دینی مدارس کی ذمہ داری ہے کہ وہ الشریعہ جیسے سیکولر رسالے کا مکمل سماجی مقاطعہ کریں اس قسم کے رسالوں میں علماء مضامین اشاعت کے لیے نہ بھیجیں اور سیکولر لوگوں سے کوئی مکالمہ نہ کریں مکالمہ صرف ان سے ہوسکتا ہے جو مسلمہ اسلامی عقائد، مسلمہ اسلامی اصول، کو تسلیم کرتے ہیں جاوید غامدی صاحب عمار ناصر صاحب جیسے لوگوں سے مکالمے کی ضرورت نہیں ان کو صرف دعوت دین دی جاسکتی ہے مکالمہ ان سے ہوسکتا ہے جن کے بنیادی اصول مشترکہ، متفقہ ہوں۔

جنسی دہشت گردی امریکا کے ہر شہر کے اسکول میں

وہائٹ ہاؤس نے جنوری ۲۰۱۴ء میں ۳۵ صفحات پر مشتمل ایک رپورٹ جاری کی ہے رپورٹ کا نام ہے Rape & Sexual Assualt: A Renewed Call to Action The White House Council on Women & Girls. یہ رپورٹ وہائٹ ہاؤس کی ویب سائٹ پر موجود ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ امریکہ کے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں لڑکے لڑکیوں کی عزت خطرے میں ہے ان کی آبروریزی کی جاتی ہے صرف پانچ میں سے ایک لڑکی اس حادثے کی اطلاع پولیس کو دیتی ہے ہر سال لاکھوں کروڑوں لڑکوں لڑکیوں کی عزت اعلیٰ تعلیمی اداروں میں لوٹی جاتی ہے۔ رپورٹ جاری کرنے والے افسر نے صحافیوں سے کہا کہ صدر اوبامہ نے یہ رپورٹ صرف امریکی صدر کی حیثیت سے جاری نہیں کی وہ دو بیٹیوں کے باپ بھی ہیں اور ان کی بیٹیاں اگلے سال کالج جانے والی ہو جائیں گی لہٰذا تمام تعلیمی اداروں کے لیے ایک فورس بھی بنائی جارہی ہے جو لڑکوں اور لڑکیوں کی عزت کی حفاظت کرے گی وہ ملک جو پوری دنیا میں امن قائم کررہا ہے جو دنیا بھر سے دہشت گردی ختم کررہا ہے اس کی تعلیم گاہوں میں جہاں سول سوسائٹی تیار ہوتی ہے جنسی دہشت گردی جاری ہے مگر اس کے پاس اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔

Obama launching New initiative To Tackle College Sexual Assault Epidemic

Obama planned to sign a presidential memorandum Wednesday creating a task force to protect students from sexual assault, with a new White House report declaring that no one in America is more at risk of being raped or assaulted than college women. The report, "Rape and Sexual Assault: A Renewed Call to Action," says that 1 in 5 women have been sexually assaulted at college but that only 12 percent of student victims report the assault.
Obama senior adviser Valerie Jarrett, chair of the Council on Women and Girls, said men must be involved to combat the problem and the president wants to lead a cultural shift of men speaking out. "The president is committed to solving this problem, not just as president of the United States, but as a father of two girls" who will soon be heading to college, Jarrett said in an interview.[https://twitter.com/nedrapickler]

امریکا میں عورت تنہا ہے صرف ریاست مشکل میں مدد کرتی ہے

تمام روایتی، خاندانی، مذہبی اجتماعتیں تحلیل ہوگئی ہیں

رپورٹ بتاتی ہے کہ امریکا کے اسکول کالج میں کوئی لڑکی کوئی لڑکا محفوظ نہیں سب جنسی ہوس کا شکار ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تعلیم، علم، اعتماد، سرمایہ، عزت حاصل کرنے کے لیے حاصل کی جارہی تھی اور تعلیم گاہ کے حالات کے باعث ہی لڑکیاں تعلیم ترک کردیتی ہیں نہ عزت ملی نہ سرمایہ نہ آزادی ____ جنسی دہشت گردی یا تشدد کا شکار ہونے والی عورتوں کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے اگر تشدد کرنے والا اس کا شوہر ہے تو شوہر سے علیحدگی کے نتیجے میں اس کے بچوں اور خود اس کا مستقبل کیا ہوگا؟ اگر وہ شادی کے بغیر ماں باپ سے الگ ہو

کرنا جائز شوہر کے ساتھ رہ رہی ہے تو اس کو چھوڑ کر وہ کہاں جائے گی؟ امریکی لڑکیاں عموماً تعلیم اور اعلیٰ تعلیم ماں باپ کے پیسے سے نہیں ریاست سے ملنے والے غیر سودی قرضوں کے ذریعے حاصل کرتی ہیں لہٰذا وہ اپنے خاندان سے الگ رہتی ہیں یا نا جائز خاندان بناتی ہیں جن کے مسائل Dating abuse کے نام سے سامنے آ رہے ہیں انسان تنہا نہیں رہ سکتا زندگی کا کٹھن سفر وہ اکیلے کیسے طے کرے —— آزادی کے عقیدے کے نتیجے میں مغربی مرد اور عورت نکاح کے بندھن میں بندھنے کے بجائے صرف لطف لیتے، مزے اٹھاتے اور وقت گزارتے ہیں —— وقت گزاری بہت سے مسائل کا سبب ہے لہٰذا جنسی دہشت گردی اور تشدد کا شکار ہونے والی عورت اس دنیا میں تنہا ہو جاتی ہے اور صرف اور صرف امریکی ریاست کے رحم و کرم پر ہوتی ہے اس کا خاندان، قبیلہ، رشتے دار، سب اس کے لیے اجنبی ہیں وہ آزاد ہے لہٰذا آزادی کا آزار یہی ہے کہ اپنے دکھ آپ کو تنہا اٹھانے پڑتے ہیں لہٰذا جنسی درندگی کا نشانہ بننے والی عورت لڑکی بچی کو سب سے پہلے نہایت سستی رہائش گاہیں فراہم کرنے کا مرحلہ ہے تا کہ وہ تنہا سکون سے رہ سکیں اور اس غم کو بھلا دیں۔

new protections for sexual assualt survivors in public & other subsidized housing [p.20] Among other housing protections the law requires that victims be permitted to transfer to other available housing if necessary. [p.20]

یہ کیسا معاشرہ ہے جہاں ایک زخمی، مضروب، مجروح، غم زدہ، لڑکی، عورت کے لیے اس کے خاندان کے گھر کے دروازے بند ہیں دکھ اور تکلیف کے لمحوں میں اس کے لیے صرف ریاستی اداروں کے سہارے موجود ہیں معاشرتی، روحانی، اخلاقی، مذہبی سہارے یہ عورت خود ختم کر چکی ہے یہ خوش نصیب عورت ہے یا بد نصیب عورت؟

رپورٹ بتاتی ہے کہ اکثر جنسی دہشت گردی کی وارداتیں لڑکیوں کے گھر کے اندر یا گھر سے قریب ہوتی ہیں پھر بھی مجرم پکڑے نہیں جاتے

--- most sexual assaults occour in or near the survivors residence. [p. 20]

مظلوم عورت مرد کا کوئی والی وارث نہیں لہٰذا ریاست نے اس کی دادرسی کے کئی طریقے تجویز کیے ہیں

--- from crises intervention, counseling legal advocacy, medical help, social service, & job & housing assistance. [p. 33]

اس فہرست میں صدر اوباما نے ماں باپ خاندان پڑوسی اور روایتی اجتماعیت کو شامل نہیں کیا آزادی نے تمام روایتی، تاریخی، مذہبی، خاندانی، سماجی، نسلی، عصبی، لسانی اجتماعیتیں ختم کر دی ہیں۔

<u>UNO کم عمری کی شادی ختم کرنا چاہتی ہے زنا نہیں</u>

حمل سے بچانے کے لیے جلد پولیو کی طرح ویکسین جبراً پلائی جائے گی

اقوام متحدہ کے سکریٹری جنرل بان کی مون نے گیارہ اکتوبر ۲۰۱۲ء عالمی یوم لڑکیوں پر بیان دیا کہ لڑکیوں کو کم عمری کی شادی کے جرم عظیم

[Great Crime] سے بچایا جائے اُس سال کا نعرہ تھا کم عمری کی شادی ختم کرو Ending Child Marrige مگر بان کی مون نے بچوں کے خلاف جنسی تشدد Ending child sex لڑکیوں کے خلاف جنسی جرائم بند کرو کا نعرہ نہیں دیا ـــــ وہ شادیاں روکنے کا مطالبہ کررہا ہے مگر لڑکیوں لڑکوں کے خلاف اسکول میں جبری اور رضامندی سے ہونے والے زنا کاری کے جرم کے خلاف کوئی مطالبہ نہیں کررہا کیوں؟ یہ تو عورت مرد کی آزادی ہے کہ وہ جس سے چاہیں زنا کریں مگر یہ رضامندی سے ہو ـــــ جبر سے نہ ہو ـــــ

اس مسئلے کا حل مغرب نے تلاش کرلیا ہے ایک نظری دوسرا عملی ـــــ نظری حل آزادی کا عقیدہ اور عملی حل یہ ہے کہ لڑکیوں کو حمل کے ضائع کرنے کی ویکسین پلا دی جائے یا انجکشن لگا دیا جائے تاکہ ان کی آزادی میں خلل واقع نہ ہو حمل نہ ٹھہرے اور وہ تعلیم حاصل کرتی رہیں مگر لڑکوں کا کیا ہوگا؟ اس کا حل سائنس کے پاس بھی نہیں ہے۔

ویکسین پلانے کا مقصد یہ ہے وہ ممالک جہاں جہاں سیکولر تعلیم عام ہورہی ہے ـــــ وہاں باپ لڑکیوں کو حمل کے خوف سے اسکول کالج سے نہ نکالیں افریقا کے اکثر ممالک کے ماں باپ نے لڑکیوں کو اسکول سے نکال لیا کہ لڑکیوں کو مرد اساتذہ نے جبراً یا رضامندی سے زنا کاری میں مبتلا کر کے حاملہ کردیا۔ حمل سے بچانے والی ویکسین جلد تمام ملکوں میں پولیو کے قطروں کی طرح جبراً پلائی جائے گی۔

<u>جبری زنا کاری کرنے والے عورت پر بے بہانہ تشدد کرتے ہیں</u>

اوباما کی وہائٹ ہاؤس کی ۲۰۱۴ء کی رپورٹ میں یہ بھی لکھا ہے کہ امریکا کے گھروں، محلوں، اسکولوں، کالجز، یونیورسٹیوں میں ـــــ جبری زنا کرنے والے لڑکے جو لڑکیوں کے جگری دوست بھی ہوتے ہیں ان سے محبت بھی کرتے ہیں ان کے عاشق بھی ہوتے ہیں ان سے گہری دوستی بھی رکھتے ہیں ان سے صرف زنا نہیں کرتے بلکہ جبراً زنا کرتے ہیں زنا بالرضا سے وہ مطمئن نہیں ہوتے جبر میں لذت محسوس کرتے ہیں ـــــ اس مقصد کے لیے وہ ان کو بہت سی شراب پلاتے یا نشہ آور اشیاء کھلا دیتے ہیں یا لڑکیاں دوستوں کی صحبت میں لذت سکون کے لیے خود نشہ آور اشیاء بلا تکلف استعمال کرتی ہیں کیونکہ وہ دوست سمجھ کر ان لڑکوں پر اعتماد کرتی ہیں لیکن نشہ کر کے جب وہ بے ہوش ہوتی ہیں تو ان کے ساتھ ان کے قابل اعتماد دوست جبری زنا کاری کرتے ہیں معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا۔ وہ ان پر جسمانی تشدد بھی کرتے ہیں۔ تشدد اس طرح کہ لڑکیوں کو اس بری طرح مارتے ہیں کہ اندرونی چوٹیں آتی ہیں اوپر چوٹیں نہیں ہوتیں۔ اکثر وحشی لڑکیوں کو بیرونی چوٹیں بھی لگاتے ہیں ان کے دانت، ان کی ہڈیاں اور ان کے جسم کے جوڑ توڑ دیتے ہیں چہرے پر خراشیں اور زخم ڈال دیتے ہیں ان کے جسم کو چیر پھاڑ دیتے ہیں ان کے سر اور ریڑھ کی ہڈیوں میں زخم لگاتے ہیں۔ یہ کام وہ لڑکے کرتے ہیں جو ان کے Boy Friend ہیں جگری دوست ہیں جن سے ان کی بڑی فکری، عقلی، حسی، علمی، ذہنی ہم آہنگی Mutual understanding ہے زنا کاری اور تشدد کی یہ وارداتیں عموماً اس وقت ہوتی ہیں جب یہ کسی رنگین دعوت یعنی پارٹی میں جمع ہوتے ہیں یعنی گناہ اور جرم بھی اجتماعی طور پر ہوتا ہے فطرت کے خلاف لڑکے اور لڑکیوں کی آزادانہ دوستی کا انجام یہی ہے۔

امریکی مردوں میں یہ تشدد ویڈیو گیمز، ریسلنگ کے پروگرام، فلموں، اور امریکی خونی تاریخ سے منتقل ہوا ہے دس کروڑ سرخ ہندیوں کو پچاس سال میں درندگی تشدد سے قتل کرنے کی ذلیل ترین تاریخ ہے جس کے بارے میں رچرڈ رارٹی Achieving our

Country میں کہتا ہے"ھمیں اس تاریخ پر شرمندہ ھونے کی ضرورت نھیں ھم نے غلطیاں کی ھیں لیکن ھم نے خود کو معاف کردیا ھے"۔

رپورٹ بتاتی ہے کہ ۲۰۰۵ء سے ۲۰۱۰ء کے درمیان جنسی تشدد کا شکار عورتوں کو زخمی بھی کیا گیا۔

Between 2005 - 2010 58% of all female victimes of sexual assault sustained an injury [p.15]

<u>سیکولر امریکا میں مرد عورتوں پر بہیمانہ تشدد کرتے ہیں</u>

امریکی اور مغربی عورت دنیا کی سب سے مظلوم عورت ہے

اس تشدد کی نوعیت کیا ہوتی ہے۔ یہ تشدد جو نہایت ظالمانہ، جابرانہ، بہیمانہ، اور سفا کانہ ہے امریکی معاشرے کے پڑھے لکھے مرد اسکول کالج یونیورسٹی جانے والے رشتہ دار، دوست کر رہے ہیں یہ کس قسم کے مرد کس قسم کے انسان ہیں جو ساری دنیا کو امن کا سبق دیتے ہیں اور اپنی سہیلیوں، محبوباؤں، دوستوں، بیویوں، بیٹیوں، بہنوں، لڑکیوں کے ساتھ اس قدر رذیل نا قابل بیان رویہ اختیار کرتے ہیں کاش امریکی عورتیں اردو شاعری میں محبوباؤں کے لیے بیان کردہ مردانہ جذبات پڑھ لیتیں تو انھیں فسق و فجور کے میدان میں بھی مشرق کی عظیم روایات کا پتہ چلتا——عورتوں کے خلاف جبر وتشدد اور ظلم کی تفصیل پڑھیے:

The injuries for initimate partner rapes range from scratches, burises, or welts to lacerations, broken bones, dislocated joints, head or spinal cord injuries, chipped or broken teeth, or internal injuries. [p. 15]

امریکہ میں کم عمر لڑکیاں اپنے گھروں میں اپنے گھر والوں سے بھی محفوظ نہیں ہیں لہٰذا بھاگی ہوئی لڑکیوں میں سے ۳۸ فی صد گھریلو جنسی تشدد سے بچنے کے لیے اپنے گھر چھوڑ چکی ہیں۔

رپورٹ کے مطابق

38% of runaway teens say that sexual abuse as one of the reason they left home [page 8]

<u>سیکولر امریکا میں عورت باپ بھائی سے بھی محفوظ نہیں</u>

جو عورت گھر میں محفوظ نہیں اسے کہاں پناہ ملے گی

اوباما رپورٹ مغربی بہیمیت کی تاریخ کا ایک نیا دریچہ ہے امریکا اور مغرب نے پہلے استعماری عزائم کے تحت پوری دنیا کو لوٹا کالونائز کیا اور اب اپنی عورتوں ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کی عزت لوٹ رہے ہیں۔

امریکا اور مغرب میں محرمات سے جنسی تعلقات، جبری زنا عام بات ہے باپ سے بیٹی، بھائی سے بہن، بیٹے سے ماں____

اپنے گھر میں محفوظ نہیں ہے محرمات سے زنا کاری [Incest Relations] مغرب میں عام بات ہے صرف امریکا نہیں یوروپ کے سیکولر معاشرے کا بھی یہی حال ہے جس مغرب میں عورت کو اپنے گھروں میں خونی رشتوں سے امان حاصل نہیں وہ گھر سے نکل کر کہاں جائے گی اس زمین پر اسے کون سائبان مہیا کرے گا جس عورت کی عزت ،عفت اس کے بھائی ، بیٹے ، باپ سے محفوظ نہیں ____ اسے امریکا کا کون سامرد پناہ دے گا؟ امریکی اور مغربی عورت دنیا کی سب سے مظلوم عورت ہے اور پاکستانی لبرل پاکستانی اور مسلمان عورتوں کو سب سے مظلوم ثابت کرتے ہیں ان کو شرم تک نہیں آتی عمار ناصر کو یہی سیکولر امریکا پسند ہے جناب عمار ناصر صاحب سیکولر ملک میں ایسا ہوتا ہے کیا یہ آپ کو پسند ہے۔ کیا مشال خان کی موت کے بدلے آپ پاکستان کو امریکا جیسا عظیم سیکولر ملک بنانا چاہتے ہیں۔
یہ کیسا معاشرہ کیسی تہذیب ہے جہاں لڑکیاں اپنے گھر میں محفوظ نہیں ہیں انہی تجربات کی بنیاد پر مار ماڈیوک پکتھال نے کہا تھا کہ مغربی تہذیب تہذیب نہیں بہیمیت [Savegry] کا اور وحشت وسفا کی کا نام ہے اور میں ایک سابق سفاک سابق وحشی ہوں

Westren civilization is nothing but savegry & I am an Ex savage.

<u>مساوات کے فلسفے نے بیٹی ماں سہیلی طوائف کو مساوی کر دیا</u>

جب سب برابر ہیں تو سب کے ساتھ جنسی تعلق قائم ہو سکتا ہے

مسئلہ صرف زنا پر ختم نہیں ہوتا اس کے ہولناک نتیجے بھی مظلوموں کا مقدر ہیں علاج معالجہ بھی اپنے خرچ پر کرنا پڑتا ہے لڑکیوں اور لڑکوں کو —— سنگین بیماریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ ساری عمر بیمار رہتے ہیں ان کی نفسیاتی ۔ جذباتی ، طبعی حالت کبھی بہتر نہیں ہوتی موٹاپا ، شوگر ، ہائی بلڈ پریشر ، خوف ، وسوسے —— ذہنی دباؤ سے بچنے کے لیے نشہ آور اشیاء شراب وغیرہ کا استعمال ان میں بڑھ رہا ہے یہ بچے جسمانی ، نفسیاتی ، روحانی بیماریوں کے باعث اعلیٰ تعلیم بھی حاصل نہیں کر سکتے ۔ اسی خوف کے باعث دنیا بھر میں لوگ اسکولوں سے اپنے بچوں کو خاص طور پر لڑکیوں کو نکال رہے ہیں اور ان کی جلدی شادیاں کر رہے ہیں امریکہ یورپ میں لڑکیاں اپنے بھائیوں باپوں رشتہ داروں سے تک محفوظ نہیں ہیں یہ مساوات کا نتیجہ ہے اس تعلق کو Incest relations کہتے ہیں یعنی محرمات حرام رشتوں سے جنسی تعلق وہاں عام ہے جب سب برابر ہیں مساوات [Equality] سب سے اچھی بات ہے ۔ تو باپ کے لیے بیٹی ، بیوی اور دوسری اجنبی عورت طوائف سب برابر ہو گئے یہ مساوات کے فلسفے کا نتیجہ ہے لیکن مغرب ان مسائل پر غور کرنے کے بجائے دنیا کو اپنی طرح بنانا چاہتا ہے وہ عورتوں کے خلاف جنسی دہشت گردی ختم کرنے کے بجائے ان کی شادیوں کو روکنا چاہتا ہے کیوں؟ تفصیلات پڑھیے

UN chief`s message on International Girl Child Day

UNITED NATIONS:

In his message for the International Girl Child Day Mr Ban said: `When They (girls) are able to stay in school and avoid being married early, girls can build a

foundation for a better lifefor themselves and their families.

October 11 was designated as the International Day of the Girl Child by a resolution adopted by the UN General Assembly in December 2011, to recognise girls` rights and highlight the unique challenges girls face worldwide.

The theme of this year`s observance is `Ending Child Marriage`. [Dawn, 12th Oct, 2012]

142m girls at risk of child marriage: UN report
ISLAMABAD, Oct 12: Calling for zero tolerance towards child marriage, a latest report of the United Nations has feared that the number of girl child marriages will increase dramatically over the next 10 years and more than 142 million girls are at risk of this human rights abuse.
The number of children marrying each year will grow by 14 per cent from 14.2 million in 2010 to 15.1 million in 2030 if current trends continue, warns the report titled `Marrying too Young: EndChild Marriage` released by the United Nations Population Fund (UNFPA).
In South Asia alone, the number of child brides is likely to increase from 24.4 million (4.9 million per year) in 2010 to 27.9 million (5.6 million per year) in 2030. South Asia has the highest prevalence of child marriages with 46 per cent followed by subSahara Africa with 37 per cent.[Dawn, Oct 12 2012]

مغرب کی ساری مخالفت کی وجہ لڑکیوں کی کم عمری کی شادی ہے مغرب شادی کا مخالف ہے زنا کاری کا مخالف نہیں ـــــ لڑکیوں کے ساتھ زنا کاری، اسکولوں کالجوں، یونیورسٹیوں میں تعلیم ترقی ملازمت دوستی، آزادخیالی کے نام پر ان کی عزت لوٹنا یہ اس کا مسئلہ نہیں ہے تعلیم ترقی ملازمت اہم ہے اور زنا کاری بس آپس کی رضامندی سے ہونا چاہیے جبر سے نہ ہو ـــــ وہ بس جبر کے خلاف ہے زنا کاری کے خلاف نہیں کہ یہ ہر مرد عورت کا حق ہے لیکن کم عمری کی شادی کے ذریعے یہ ـــــ جنسی تعلق ٹھیک نہیں آپس کی رضامندی سے یہ تعلق خواہ کسی عمر میں ہو جائز ہے۔

☆ وہائٹ ہاؤس کی جاری کردہ رپورٹ میں عجیب وغریب انکشافات کیے گئے ہیں مثلاً یہ کہ امریکہ میں معذور لوگوں (جن میں جسمانی ذہنی معذور بھی شامل ہیں اور زیادہ عمر ہو جانے کے بعد معذوری کا شکار بھی آجاتے ہیں) جیل خانے میں قید مردوں، عورتوں بے گھر لوگوں، غیر قانونی تارکین وطن کو جنسی دہشت گردی کا سنگین سامنا ہے

Other populations are also at high risk of being raped including people with disabilities, the LGBT Community prison inmate holmeless undocumented Immigrants. [page. 1]

ـــــ امریکہ کس قسم کا معاشرہ ہے جہاں لوگ جسمانی، ذہنی، طبعی طور پر معذور انسان سے خواہ وہ عورت ہے یا مرد ہمدردی کرنے کے بجائے اس کی عزت لوٹنے میں دلچسپی رکھتے ہیں؟

<u>سیکولر آسٹریلیا میں اسی سالہ بوڑھیوں سے جبری زنا کاری</u>

آسٹریلیا میں ۲۰۱۰ء میں تاریخ کا وہ عظیم اسکینڈل منظر عام پر آیا جب اولڈ ہوم سے اسی نوے سال کے بوڑھے بوڑھیوں کو اغوا کر کے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا صرف یہی نہیں ان بوڑھوں کو اغوا کرنے والے نوعمر لڑکوں نے ان پر زبردست تشدد بھی کیا مظلوموں کی تعداد ہزاروں میں تھی لہٰذا وزیر اعظم کو پریس کانفرنس کر کے معافی مانگنی پڑی اور نئے اقدامات کا اعلان کرنا پڑا۔ وزیر اعظم کا خیال تھا کہ ایسا صرف اس لیے ہوا کہ اولڈ ہوم میں حفاظتی اقدامات بہتر نہیں تھے کیونکہ ہمارے پاس فنڈ زکم ہیں یعنی یہ مسئلہ اخلاقی، تہذیبی، معاشرتی مسئلہ سرے سے نہیں ہے صرف قانون کا مسئلہ ہے اگر مجرم اولڈ ہوم کی عمارت میں داخل نہ ہوسکتے اور عمارت میں حفاظتی اقدامات اچھے ہوتے تو وہ اس جرم کا ارتکاب نہ کرتے —— سوال یہ ہے کہ بوڑھے لوگوں سے جنسی تمتع کرنے کا خیال جس خبیث ذہن میں آیا اس ذہن کی اصلاح اور تربیت کے لیے کیا سوچا گیا یہ خبیث ذہن کس نظام تعلیم، کس نظام تربیت نے پیدا کیا —— ظاہر ہے مغرب آزادی [Freedom] کے عقیدے پر یقین رکھتا ہے ہر انسان آزاد ہے اور انسان کو وہ صرف قانون سے کنٹرول کر رہا ہے مذہب کو وہ تسلیم نہیں کرتا خاندان، برادری اور روایتی اجتماعیت کا وہ قائل نہیں ہے۔ مغرب میں تزکیۂ نفس، تصفیۂ قلب، روحانیت، مذہبی تربیت، رذائل اخلاق وغیرہ کے مباحث بے معنیٰ ہیں عقل کے خلاف ہیں لہٰذا بچوں کے نفس کی اخلاقی، ایمانی، روحانی تعلیم و تربیت کا کوئی نظام موجود نہیں ہر نفس آزاد ہے جو چاہے کرے بس اس کا عمل عقل اور قانون کے خلاف نہ ہو اس کے سوا ہر عمل ایک جائز عمل ہے۔

<u>سیکولر امریکا میں عورت کا کیا حشر ہے؟</u>

☆ صدر اوباما کی رپورٹ بتاتی ہے کہ جنسی دہشت گردی کا شکار ہونے والے مرد عورت، لڑکے لڑکیاں ساری عمر جسمانی ذہنی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا رہتے ہیں ان بیماریوں کے باعث ان میں خودکشی کرنے کی آرزو سب سے زیادہ ہوتی ہے وہ زندہ نہیں رہنا چاہتے ظاہر ہے ایک ایسی ذلیل دنیا جس میں جگری دوست محترم عزیز ساتھی جس پر اعتماد تھا جس سے محبت تھی وہی عزت بھی لوٹتا ہے مارتا بھی ہے اور زخمی بھی کرتا ہے تو یہ کیسا شخص ہے اس رویے سے انسان کو اپنے وجود سے اور اس دنیا سے نفرت ہو جاتی ہے لہٰذا لڑکیاں اس دنیا میں زندہ نہیں رہنا چاہتیں۔

Wide range of physical & mental health problems that can follow them for life including depression, chronic pain diabetes, anxiety eating disorder and post tramatic stree order. They are also more likely than non victims attempt or consider sucide. [p.2]

☆ جنسی تشدد کا شکار ہونے والی لڑکی اور لڑکے کی دیکھ بھال، نگرانی، تحقیقات، عدالتی کارروائی، علاج معالجہ اور دیگر معاملات پر اٹھنے والے اخراجات فی کس ستاسی ہزار ڈالر سے لے کر دو لاکھ چالیس ہزار ڈالر تک ہوتے ہیں

---ranging from 87000 Dollars to 240776 Dollars. [p2]

☆ لڑکیوں کے ساتھ جنسی تشدد میں ملوث ان کے جگری دوست اس طرح کی حرکتیں صرف ایک لڑکی کے ساتھ اور صرف ایک بار نہیں کرتے عموماً وہ عادی مجرم ہوتے ہیں اور پکڑے جانے کے بعد اعتراف کرتے ہیں کہ وہ جنسی تشدد کی ایسی ہی کم از کم چھ وارداتوں میں ملوث رہے ہیں

---some 63% said they committed an average of six rapes each [p.2]

امریکہ جیسے ملک کا پولیس، تفتیش، عدالت کا نظام اتنا کم زور ہے کہ شکایت کرنے والی لڑکیوں اور لڑکوں کی شکایت کے باوجود اکثر ملزم نہ تو گرفتار کیے جاتے ہیں نہ ان کے خلاف مقدمات چلائے جاتے ہیں واضح رہے کہ رپورٹ کے مطابق لڑکیوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کے بدترین واقعات کے باوجود 88 فی صد لڑکیاں خوف کے مارے یا امریکی عدالتی تفتیشی نظام پر عدم اعتماد کے باعث مقدمات ہی درج نہیں کراتیں صرف 12% لڑکیاں پولیس کے پاس مقدمات درج کراتی ہیں اس کے باوجود ان بارہ فی صد کو بھی امریکہ کے عظیم نظام عدل سے انصاف نہیں ملتا یہ اس ملک کا حال ہے جو دنیا بھر کو عدل و انصاف مہیا کرنے کے ناقابل حصول مقصد [mission Impossible] میں ایک صدی سے مصروف ہے رپورٹ کے اصل الفاظ پڑھیے

--- many offenders are niether arrested nor procecuted. [p.2]

<u>امریکا کی پولیس عدالتی نظام پاکستان سے بدتر ہے</u>

دو ہزار ایجنسیاں کام کرتی ہیں نتیجہ صفر ہے

جنسی دہشت گردی اور جبری زنا کاری کے مجرموں کو پکڑنے کے لیے ہر تھانے، تفتیشی و شکایتی مرکز، ہسپتالوں میں لاکھوں Rapekits موجود ہیں تا کہ لڑکی کے طبی معائنے کے بعد فوراً تجربہ گاہ میں امتحان کر کے ملزم کے DNA کی شناخت کر کے اسے پکڑا جا سکے مگر یہ لاکھوں کٹ بھی بے کار پڑی ہیں ان کو کوئی استعمال نہیں کرتا جو استعمال ہو جاتی ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ لیبارٹری سے ان کے نتائج آنے میں مہینوں لگ جاتے ہیں۔ ظاہر ہے امریکی نظام عدل پر کسی لڑکی عورت مرد کو اعتماد نہیں ہے وہ سوچتے ہیں کہ عزت تو گنوا چکے ہیں اب عدالتوں اور تفتیشی مراکز میں وقت ضائع کرنے کا کیا فائدہ جو نقصان ہو چکا وہ تو ہو چکا۔ واضح رہے کہ امریکا میں پولیس کسی بھی جرم کی اطلاع پر تین منٹ میں پہنچ جاتی ہے دو ہزار سے زیادہ ایجنسیاں امریکا میں کام کرتی ہیں۔ کیمروں، انفارمیشن ٹکنالوجی کا کھربوں روپے کا نظام کام کر رہا ہے مگر امریکا کا حال پاکستان سے بھی بدتر ہے لیکن بے شرم لبرل اسی امریکا کے قصیدے پڑھتے ہیں لڑکیاں اپنی عزت گنوانے کے بعد انصاف کی تلاش میں کہیں نہیں جاتیں۔ ظاہر ہے تفتیش اور عدالتی عمل کے دوران انھیں پھر سینکڑوں مردوں کے ذریعے ہی انصاف حاصل کرنا ہوگا اور یہ کون سے شریف ہیں کہ ان سے خطرہ نہ ہو جب عورت اپنے گھر میں اپنے شوہر کے ظلم وستم اپنے سگے بھائی، باپ، ماموں، چچا، خالو پڑوسی، خاندانی دوستوں سے محفوظ نہیں لہٰذا وہ سمجھتی ہیں کہ —— فائدے کی امید نہیں ہے ویسے بھی جنسی آزادی کا نتیجہ یہی ہے اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کیونکہ جنسی تشدد اور زنا تو میرے جگری دوست نے گھر والے نے یا قابل اعتماد ساتھی

نے کیا ہے اس کے ساتھ اچھا وقت بھی گزرا ہے مزے بھی کیے ہیں اب شکایت کا کیا فائدہ —— یہ صورت حال عورت سے زندگی کی اُمنگ چھین لیتی ہے —— رپورٹ مظلوموں کی Rape kits کے نتائج میں تاخیر کے بارے میں بھی بتاتی ہے۔

---many rap kits are still sitting on the shelves either ignored or waiting to be tested. [p. 2]

☆ جو لڑکیاں اور لڑکے جنسی تشدد کے مجرموں کو کیفر کردار تک پہنچانے کے لیے Rap kit استعمال کرتے ہیں تاکہ ملزم DNA کے ذریعے پکڑا جاسکے اور سزا پائے ان کی خواہش بھی کبھی پوری نہیں ہوتی کیونکہ تمام لیبارٹیوں میں DNA ٹسٹ کے لیے ہزاروں نمونے آئے ہوئے ہوتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکی معاشرہ جو بلاشبہ دنیا کا سب سے زیادہ ترقی یافتہ، سولائزڈ، سب سے زیادہ تعلیم یافتہ، سب سے زیادہ آزادی کا دل دادہ معاشرہ ہے اس میں مجرموں کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کے جرائم پر ان کو پکڑنے کے لیے لیبارٹریاں چوبیس گھنٹے کام کرتی ہیں اس کے باوجود زنا کا نشانہ بننے والی لڑکیوں کی Rap Kit کے نتائج منظر عام پر ہی نہیں آتے جبکہ صرف ۱۲ فی صد لڑکیاں قانونی کارروائی کرتی ہیں لیکن امریکی نظام عدل ان بارہ فی صد لڑکیوں کو بھی عدل دینے سے قاصر ہے رپورٹ کے مطابق

---thousands of rape kits have either non been forwarded to crime labs or are back logged at the labs waiting to be tested. [p.17]

<u>سیکولر امریکا میں عدل کا کیا حال ہے</u>

جنسی دہشت گردی کا اصل محرک میڈیا ہے

نظام عدل پر امریکی لڑکے لڑکیوں کے عدم اعتماد کا کیا عالم ہے وہائٹ ہاؤس کی اپنی اطلاع، گھر کی شہادت اور گھر کی گواہی یہ ہے

many victims have lost faith in the system & believe they were ill treated by thoes who should be on their side. [p. 17]

Two thirds of survivors have had their legal cases dismissed & more than 80% of the time this contradicted her desire to prosecute. [p.17]

☆ جگری دوست [intimate boy friend] جنسی تشدد زنا کاری کے ساتھ ساتھ اپنی محبوباؤں لڑکیوں کو اس بری طرح مارتا پیٹتا اور زخمی کرتا ہے کہ اسی فی صد لڑکیوں کو طبی امداد کے لیے لازماً ہسپتال جانا پڑتا ہے اور پچاس فی صد لڑکیوں کو ہسپتال میں کم از کم ایک رات یا کئی راتوں تک قیام کرنا پڑتا ہے۔ انسان پرستی، آزادی اور اعلیٰ تعلیم کا اثر کیا ایسا ہی ہوتا ہے؟

Nearly 80% of thoes who recieve medical care are treated in a hospital & 43.6% of thoes victims spend one or more nights there. [p. 15]

<u>سیکولر بھارت چین میں ماں باپ کواولاد نے گھروں سے نکال دیا</u>

اس تشدد کا اصل سبب امریکی معاشرت ہے جہاں بچہ اوسطاً روزانہ ۶ سے آٹھ گھنٹے TV، وڈیو گیمز، کارٹون انٹرنیٹ اور موبائل کے ساتھ وقت گزار رہا ہے۔ وڈیو گیمز، فلمیں، ویب سائٹس، کمپیوٹر، موبائل فون سب انھیں تشدد، جرائم، جنسی دہشت گردی، آوارگی، عیاشی، فحاشی سکھا رہے ہیں۔ مغرب نے Entertainment Industry کے ذریعے گناہ کو ایک آرٹ بنا دیا ہے لوگ اس آرٹ کی جمالیات میں کھو چکے ہیں اس کا مزہ اپنی جگہ مگر اس کا خطرناک نقصان امریکی عورتیں بھگت رہی ہیں۔ امریکا اور پورے مغرب میں ماں باپ گھر پر نہیں ہوتے —— وہ معیار زندگی بلند کرنے ترقی کرنے کے لیے گھر سے صبح نکل جاتے ہیں۔ بچے ماں کی گود دادی کی آغوش کے بجائے Day Care میں پھینکے جاتے ہیں لہٰذا اماں باپ کے بڑھاپے میں یہی بچے ماں باپ کو Old Home میں پھینکتے ہیں۔ جدید مغرب کے گھر میں صرف چیزیں ہوتی ہیں انسان نہیں رہتے۔ انسان دفتر، مارکیٹ، ڈے سینٹر، اولڈ ہوم میں ہوتے ہیں گھروں میں صرف چیزیں ہوتی ہیں خالی گھر انسانوں سے محروم یہ گھر مغربی فلسفے کا خاموش ماتم کر رہے ہیں۔ تعلیم یافتہ، ترقی یافتہ نسل جدید عقیدوں آزادی ترقی معیار زندگی میں مسلسل مستقل اضافے ___ کے گٹھ جوڑ سے نکلی ہے مگر یہ ہدایت یافتہ نہیں ہے لہٰذا چین اور ہندوستان میں جدید تعلیم جدید ترقی آئی تو تمام ترقی یافتہ بچوں نے بوڑھے ماں باپ کو گھروں سے نکال کر پھینک دیا ہندومت اور کنفیوشس کی تہذیب کا خاتمہ تیس سال میں مغربی ترقی نے کر دیا لہٰذا ۲۰۱۰ء اور ۲۰۱۲ء میں بھارت اور چین کو Parents Protection Act بنانا پڑا جس کے تحت اولاد ماں باپ کو گھر سے نہیں نکال سکتی ان کی خدمت اولاد کی ذمہ داری ہے وہ ذمہ داری پوری نہ کرے تو ایک سال قید اور جرمانے کی سزا ہے۔ ماں باپ کی خدمت اب جبر سے قانون کی طاقت سے ہو رہی ہے یہی جدیدیت ہے یہی سیکولرازم ہے عمار ناصر صاحب پاکستان میں یہی چاہتے ہیں خاندانی نظام آزادی نے ختم کر دیا ہے لہٰذا عورت ساس، نانی، دادی کو گھر میں رکھنے پر تیار نہیں ہے کہ اس سے آزادی متاثر ہوتی ہے لہٰذا بچے انسان کے بجائے اشیاء کے رحم و کرم پر ہیں —— وڈیو گیمز، کارٹون اور ریسلنگ اس کو درندہ اور وحشی بنا دیتے ہیں شراب اور نشہ آور اشیاء کا استعمال اس کی درندگی میں غیر معمولی اضافہ کر دیتا ہے یہ آزادی کا نتیجہ ہے اب تو امریکہ میں مختلف نشہ آور چیزیں دکانوں پر فروخت کرنے کی بھی آزادی مل گئی ہے امریکہ سے پہلے یوروپ کے کئی ملکوں میں ''میری وانا'' دکانوں پر فروخت ہوتی تھی نوجوان لڑکے لڑکیاں آزادی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی زندگی کی پریشانیوں کا حل اس نشے میں ڈھونڈتے ہیں اور لڑکے اس کا حل لڑکیوں کی درگت بنانے میں تلاش کرتے ہیں۔

<u>امریکی فوج میں عورتوں مردوں سے جبری زنا</u>

جنسی تشدد، جنسی دہشت گردی کا مسئلہ صرف اسکول کالج یونیورسٹی گھر اور سڑکوں تک محدود نہیں ہے یہ امریکی فوج کے اندر بھی داخل ہو گیا ہے ہزاروں مردوں اور عورتوں کو فوج میں ملازمت کے دوران اعلیٰ افسران یا ساتھیوں نے جنسی دہشت گردی کا نشانہ بنایا ہے دو جنرل خواتین بھی اپنے سینئر جنرل مردوں کے ہاتھوں جنسی زیادتی کی شکایت کر چکی ہیں لڑکے لڑکی کا بھی مسئلہ نہیں ہے جس ملک کی فوج میں فوجی مردوں اور فوجی عورتوں کی عزت فوج جیسے عظیم ادارے میں محفوظ نہیں ہے اس ملک کی اخلاقی بدحالی کس انتہاء کو پہنچی ہوئی ہے رپورٹ کے مطابق

---adopted a series of executive actions to address sexual assualt in the Military

[P. 3]

☆ اس رپورٹ میں بار بار LGBT Community کا ذکر آیا ہے ساڑھے سات ہزار سال کی معلومہ تاریخ میں تیئس تہذیبیں دنیا میں موجود رہیں کسی تہذیب میں نہ ایسی کمیونٹی موجود تھی نہ اس قسم کے مجرموں کے کوئی حقوق تھے مگر مغرب میں آزادی کے عقیدے پر ایمان لانے کے بعد ایسی کمیونٹی بھی وجود میں آ گئی ہے جو ہم جنس پرست عورتوں مردوں یا ایسے عورتوں مردوں پر مشتمل ہے جو دونوں اصناف سے جنسی استفادے کو زندگی کا مقصد سمجھتے ہیں اس اصطلاح کی تاریخ کیا ہے پڑھیے۔

LGBT is an initialism that stands for lesbian, gay, bisexual, and transgender. In use since the 1990s, the term is an adaptation of the initialism LGB, which itself started replacing the term gay when in reference to the LGBT community beginning in the mid-to-late 1980s, as many felt the term gay community did not accurately represent all those to whom it referred. The initialism has become mainstream as a self-designation and has been adopted by the majority of sexuality and gender identity-based community centers and media in the United States and some other English-speaking countries. It is also used in some other countries in whose languages the initialism is meaningful, such as France. [for refrence see 1.^ Acronyms, initialisms & abbreviations dictionary, Volume 1, Part 1uu Gale Research Co., 1985, ISBN 978-0-8103-0683-7. ,2.^ Swain, Keith W. (21 June 2007). "Gay Pride Needs New Direction". Denver Post. Retrieved 2008-07-05]

<u>سیکولر امریکا میں جنسی دہشت گردی کے مسئلے کا حل</u>

☆ انسانوں کی تربیت تطہیر، تزکیہ نفس، تعمیر قلب، خاندانی جبر، معاشرتی دباؤ، اخلاقی قوت کے بجائے رپورٹ جنسی دہشت گردی کے علاج کے لیے درج ذیل طریقے ادارے، انسداد کے نئے اسلوب و اقدامات متعارف کراتی ہے۔

(1) 24 hours sexual assault hot line, (2) Medical & legal advocacy, (3) Circle of 6 app group of friends, (4) National Dating Abuse helpline, (5) Modernized the definitiion of rape, (6) Funded projects to reduce the rape kit backlog, (7) New penalties for spouse & intimate partner violence. (8) HUD Programs , (9) sexual assult service program (SASP), (10) Local rape crises centers , (11) sexual assault nurse examiner programs (SANE), (12) Specialize Lawenforcement units ,(13)Prison Rape Elimination Act 2003 (PREA), (14) Telemedicin Technology to improve the collection of evedence, (15) Multdisciplinary sexual assault response teams, (16) 24 hours sexual assault hotlines, (17) National Sexual assault tele nursing centre will provide 24 /7 year round remote expert consultation, (18) DNA backlog Reduction Program,(19) Improving the criminal justice system , (20) Specialized training for law enforcement & Prosecutors, (21) Clery Act safe street Act, (22) IACP international Association of Chiefs of Police will provide training to law enforcement agencies, (23) VAWA violence against women administers grants, (24) Compaign to focus on dating violence., (25) GPS map Technology to show exact location of crime, (26) Fedral Strategic Action Plan. (27) National protocol for sexual assault Medical Forensic Examinations. [SAFE], (28) Naional Crime victimization survey [NCVS]

ان طریقوں، اسالیب اور اقدامات میں فرد کے نفس کی تعمیر، تعلیم و تربیت و تطہیر کا سرے سے ذکر ہی نہیں ہے ان اقدامات و

اداروں کے قیام پر کتنے ارب ڈالر خرچ ہوں گے اس کا اندازہ رپورٹ سے ہی کیا جا سکتا ہے —— رپورٹ کے مطابق جنسی دہشت گردی کا شکار مرد عورت پر ستاسی ہزار ڈالر سے لے کر دو لاکھ چالیس ہزار ڈالر تک خرچ ہوتے ہیں [p.2] رپورٹ کے مطابق ۲۲ ملین لڑکیوں سے جبری زنا کیا گیا یہ کل جبری زنا کے حادثات کا صرف ۱۲ فی صد ہیں [p.14] اب ۲۲ ملین کو دو لاکھ چالیس ہزار ڈالر سے ضرب دیجیے جواب مل جائے گا —— آزادی کی خاطر آزادی کو ممکن بنانے کے لیے اتنا بڑا نظام، اتنے سارے ادارے، اتنے سارے اقدامات کے بجائے مخلوط تعلیم اور مخلوط معاشرت کا خاتمہ کیوں نہیں کیا جا رہا اس لیے کہ یہ آزادی کا انکار ہے آزادی ایمان ہے عقیدہ ہے اور ہر عقیدے کی ایک قیمت ہے مغرب اور امریکہ آزادی کے عقیدے کی قیمت ادا کرنے کے لیے تیار ہیں آزادی کے ایمان سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جدید مغربی فلسفے، سرمایہ داری اور لبرل ازم کے فلسفے میں انسان کا نفس آزاد خود مختار نفس ہے جو کسی خارجی ہستی کو جواب دہ نہیں ہے یہ نفس آزاد [Free Self] ہدایت رہنمائی رہبری روشنی کے لیے کسی خارجی، بیرونی، ذریعے [External source] کسی وحی [Reveled Text] کسی پیغمبر [Prophet] کسی روایت [Tradition] کا محتاج نہیں ہے اس کے پاس عقل موجود ہے جو پیغمبر باطن ہے جو اس کی رہنمائی ہدایت کے لیے کافی ہے یہ عقل ایک ایسی نعمت ہے جس کے بعد وہ کسی سے روشنی لینے کا محتاج نہیں یہ خیالات ہمارے نہیں جدید مغربی فلسفے کا خلاصہ ہیں کانٹ کا مضمون What is Enlightement آپ انٹرنیٹ پر پڑھ سکتے ہیں جس میں واضح طور پر لکھا ہے کہ روشن خیال انسان وہ ہے جو وحی، پادری، ڈاکٹر سے ہدایت لینے کے بجائے اپنی عقل سے رجوع کرتا ہے دوسرے معنوں میں انسان کو روشنی ہدایت کے لیے اپنے سے باہر دیکھنے کی نہیں اپنے اندر دیکھنے اپنے اندرون میں جھانکنے اور خود سے رجوع کرنے کی ضرورت ہے یہی خود کفالت آسمانی ہدایت، عالم، دین اور پیغمبر سے بے نیازی اصلاً روشن خیالی ہے جو اس اصول کو نہیں مانتا وہ انسان کہلانے کا مستحق نہیں۔ مگر یہ روشن خیال مرد و عورت امریکہ یورپ اور دنیا بھر میں کیا کر رہے ہیں یہ بھی آپ کے سامنے ہے۔

<u>سیکولر امریکا کے اسکولوں میں لڑکیاں جنسی دہشت گردی کا شکار</u>

☆ امریکہ کے اسکولوں میں بھی لڑکے اور لڑکیوں کی عزت آزادانہ میل جول کے باعث محفوظ نہیں ہے اسکول کی سطح پر بھی جنسی دہشت گردی عام ہے لہٰذا رپورٹ میں اسکولوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے

to hold schools accountable if they do not confront sexual violence on their campuses. [p. 5]

رپورٹ کے مطابق امریکہ میں جنسی دہشت گردی کے مجرموں کے خلاف آہنی ہاتھ حرکت میں نہیں ہے لہٰذا وہ ان جرائم کا بار بار ارتکاب کرتے ہیں رپورٹ میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ہمارا نظام ان مجرموں سے نمٹنے کی صلاحیت نہیں رکھتا اور تحقیقات کا طریقہ جرائم کو روکنے میں کار آمد نہیں لہٰذا تحقیق و تفتیش جرائم کے نئے نئے اسلوب، طریقے، تکنیک متعارف کرانے کی فوری ضرورت ہے۔

rapists and sex offenders are too often not made the pay for their crimes and

remain free to assault again. Arrests rates are low . [p.5]

<u>سیکولر امریکا میں جنسی دہشت گرد لڑکیوں کے دوست اور عاشق ہی ہوتے ہیں</u>

سیکولر مہذب عظیم امریکا میں دس سال سے کم عمر کے لڑکے اور لڑکیاں بھی محفوظ نہیں

☆ رپورٹ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ جنسی دہشت گردی کا نشانہ بنانے والے جنسی دہشت گرد لڑکیوں کے جگری، قلبی دوست، قابل اعتماد ساتھی اور خاندان کے لوگ ہوتے ہیں۔

---when the attacker is a friend a trusted colleague or a faimly member. [p.7]

سوال یہ ہے کہ جس سول سوسائٹی، سولائزڈ معاشرے میں عورت نہ اپنے جگری دوست پر اعتبار کرسکتی ہے نہ اپنے قابل اعتماد ساتھی پر نہ اپنے ساتھ کام کرنے والے پر نہ اپنے گھر والوں پر تو اس عورت کو رُوئے زمین پر کہاں عزت اور تحفظ مل سکتا ہے؟ پھر عورت کہاں جائے؟ کہاں پناہ لے، کس کو اپنے زخم دکھائے؟ کس کے دامن پر اپنے آنسو گرائے کون اس کی سنے اور اس کے غم کو اپنا غم سمجھے اسے حوصلہ ہمت اور محبت دے وہ کس پر اعتماد کرے کس کو اپنا سمجھے کس پر بھروسہ رکھے کس کا سہارا لے کس سے درد دل بیان کرے کون اس کے زخموں پر مرہم رکھے؟ جس عورت کو اس آسمان کے نیچے اپنے گھر میں اپنے باپ بھائی سے امان حاصل نہیں ہے اس مظلوم عورت کا نگہبان کون سا سائبان ہوسکتا ہے۔ امریکہ کی اس مظلوم عورت کو دنیا بھر میں آئیڈیل سمجھا جاتا ہے یہ میڈیا کا پیدا کردہ التباس ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں۔

انسانی زندگی رشتوں، محبتوں تعلقات کے اعتماد کا نام ہے جب یہ رشتے ہی ختم ہو جائیں تو پھر عورت کہاں جائے۔ جس معاشرے میں عورت اور لڑکی کو اپنے گھر میں اپنے بھائی، باپ، بیٹے، چچا سے عزت کے لوٹے جانے کا خطرہ ہو اس عورت کو پولیس اسٹیشن، ہسپتال، ایمرجنسی سینٹر میں اجنبی مردوں سے تحفظ کیسے مل سکتا ہے؟ جس عورت کو اپنوں نے عزت محبت اور تحفظ نہیں دیا اسے دنیا میں کون محبت عزت اور تحفظ دے سکتا ہے؟ رپورٹ اس سوال سے بحث ہی نہیں کرتی۔

<u>سیکولر امریکا میں جبری زنا جرم ہے رضامندی کا زنا جرم نہیں</u>

رپورٹ صرف جبری زنا کاری [Rape without consent] کو جرم سمجھتی ہے اور صرف جبری زنا کاری کو روکنے کے اقدامات تجویز کرتی ہے لیکن آپس کی رضامندی [Free will] سے ہونے والے زنا کو جرم نہیں سمجھتی بلکہ انسانی حقوق کے منشور کے تحت امریکی ریاست ایسی زنا کاری کو عورت اور مرد کا حق [Human Right] سمجھتی ہے امریکی ریاست اس حق کی حفاظت کرتی ہے لہٰذا امریکہ میں باہمی رضامندی سے جو زنا کاری ہو رہی ہے اس کا رپورٹ میں ذکر سرے سے نہیں ہے وہ تو حق Right ہے آزادی Freedom کا اظہار ہے انسان اپنی مرضی کا مالک ہے جو کام مرضی [Free will] سے ہوتا ہے وہ آزادی کا تقاضہ ہے جو جبراً ہوتا ہے وہ آزادی [Freedom] کی نفی [Negation] ہے لہٰذا جرم صرف وہ زنا ہے جو عورت کی مرضی کے بغیر کیا جائے ——

جبری زنا سے بچانے کے لیے صدر اوباما نے وہائٹ ہاوس میں ٹاسک فورس قائم کی ہے

--- a white house task force to protect students from sexual assault which will go even further to make our schools safer for all students. [p7]

رپورٹ تسلیم کرتی ہے کہ تمام تر قانونی انتظامی عسکری بندوبست کے باوجود تمام حفاظتی اقدامات کے ہوتے ہوئے بھی بہت سے دوست، بیویاں، بہنیں، لڑکیاں، بیٹے روزانہ جنسی دہشت گردی کا نشانہ بن رہے ہیں۔

--- too many of our friends, wives, sisters, daughters and sons are still raped or sexually assaulted every day . [p.8]

امریکی معاشرے میں گھروں میں اسکول کالج یونیورسٹی میں اور سڑکوں پر بھی دس سال سے کم عمر لڑکے اور ۱۸ سال سے کم عمر لڑکیاں جنسی دہشت گردی کا سب سے زیادہ نشانہ ہیں

---nearly half of female survivers were rapped befor they were 18 & over one quarter of male survivors were raped before they were 10. [p. 9]

The majority of rape and sexual assult victims are young between the ages of 16 &24, The CDS reports that 80% of female victims were rapped before they turned 25 [p10]

☆ رپورٹ کے مطابق ہائی اسکول کی بارہ فی صد لڑکیوں کے ساتھ جبری زنا کاری کی گئی

Some 12% of high school girls report having been forced to have sexual intercourse. [p10]

☆ امریکہ کے کالج میں ہر پانچ لڑکیوں میں سے ایک کے ساتھ جبری زنا کاری کی جاتی ہے واضح رہے کہ رپورٹ کے مطابق صرف 12% لڑکیاں جنسی دہشت گردی کی رپورٹ درج کراتی ہیں

On average only 12% of students victims report the assault to law enforcement. [p.14]

جس کا مطلب یہ ہوا کہ ہر پانچ میں سے چار لڑکیوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی جاری ہے

College students are specially at risk 1 in 5 women has been sexually assaulted while in college. [p. 10]

☆ شدید معذور مجبور بے بس بے کس عورتوں کو تندرست عورتوں کے مقابلے میں چار گنا زیادہ جنسی درندگی کا نشانہ بنایا جاتا ہے معذور

نہ بھاگ سکتا ہے، نہ چیخ سکتا ہے، نہ مدد کے لیے کسی کو طلب کر سکتا ہے۔ یہ اس امریکی معاشرے کا حال ہے جو دنیا بھر کو اخلاقیات، رواداری اور مساوات، انسانیت ومحبت کا درس دے رہا ہے۔ امریکہ کے نظام تعلیم وتہذیب نے کس قسم کے انسان تیار کیے ہیں؟

--- women with sever disabilities were four times more likely to be sexually assaulted than women with no disability.[p10]

<u>سیکولر امریکا کے مرد عورت فوجی بھی جنسی دہشت گردی کا شکار</u>

☆ امریکہ کی فوج میں جن عورتوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی کی جاتی ہے ان میں خودکشی کی شرح بہت زیادہ ہے ظاہر ہے فوج میں ایک عورت فوجی بن کر اپنی سرحدوں کی حفاظت کرتی ہے لیکن وہ خود اپنے جسم کی حفاظت نہیں کر سکتی۔ یہ صدمہ اتنا گھمبیر ہولناک داخلی بحران کا ایسا شاہکار ہے کہ اسے اپنے زندگی سے اس دنیا سے اور دنیا کی ہر شے سے نفرت ہو جاتی ہے جس کا نتیجہ صرف اس دنیا کے جہنم سے فرار یعنی خودکشی [Suicide] ہے رپورٹ کے مطابق

--- al most half of female veterans who were sexually assaulted in the military report suicide ideation. [p 13]

☆ امریکہ میں نظام عدل موثر بنانے کے لیے دو ہزار سے زیادہ قانون نافذ کرنے والے ادارے کام کرتے ہیں

--- in a survey of over 2000 law enforcement agencies 44% reported that [p. 18]

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں مجرموں اور ملزموں کی تعداد کتنی زیادہ ہے جن سے نمٹنے کے لیے کتنی بڑی تعداد میں سرکاری ادارے مصروف عمل ہیں ان دو ہزار ایجنسیوں میں سے 44% ایجنسیوں کی رپورٹ کے مطابق جب وہ Rape kit تجربہ گاہوں [Laboratries] میں امتحان کے لیے بھیجتے ہیں تو وقت پر نتائج نہیں ملتے۔

--- lab's inability to produce timely results. Even when law enforcement submit the kit to a crime lab in some jurisdication the evidence remain untested for many months. [p 18]

تجربہ گاہوں میں DNA ٹسٹ کے لیے مختلف اداروں سے آنے والی لاتعداد درخواستوں کے باعث جنسی دہشت گردی یعنی Rape kit والے معاملات التواء کا شکار رہتے ہیں لہٰذا جنسی دہشت گردوں کے خلاف امریکی نظام عدل غیر موثر ہو کر رہ گیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ امریکہ میں مجرموں کی تعداد کتنی زیادہ ہے اور جرائم کی رفتار کتنی تیز ہے رپورٹ میں لکھا ہے

And with demand continuing to out pace capacity the rape kit backlog may continue to grow. [p18]

☆ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں نوجوان نسل Teens اور سرخ ہندی ردیسی امریکی عورتوں [Native women] کی جنسی مقاصد کے لیے اسمگلنگ sex trafficking خرید وفروخت بھی ایک اہم مسئلہ ہے اس کی روک تھام کے لیے بھی بھاری مالی امداد مہیا کی جارہی ہیں۔

notably teens and native amarican women are particularly vulnerable to sex trafficking & authorizes funds to serve these victims. [p. 21]

<u>جنسی دہشت گردی کا علاج اصلاح نفس نہیں ٹکنالوجی ہے</u>

☆ صرف امریکہ ہی نہیں دنیا بھر میں جہاں بھی امریکہ کی سرپرستی میں مغرب کے فلسفے کے مسلط کردہ طرز زندگی سرمایہ دارانہ جمہوری و غیر جمہوری —— لبرل یا غیر لبرل سیکولر نظام حکومت کو مسلط کیا گیا اور مخلوط معاشرت اور مخلوط تعلیم کو ایک عالی مثالی معیاری طرز تعلیم اور معاشرت کے طور پر قبول کیا گیا وہاں جنسی دہشت گردی کی وہی داستان دہرائی جارہی ہے جس کا شکار امریکہ ہے لہٰذا اسکول کالج یونیورسٹی فیکٹری کارخانوں ہوٹل سڑکوں باغات عوامی مقامات عورت کی بے حرمتی اور جبری زنا کاری سے آباد ہو گئے ہیں امریکہ نے Dating violence اور sexual assault سے نمٹنے کے لیے مختلف قسم کی ٹکنالوجیز کا استعمال کیا جس میں سے ایک ٹکنالوجی circle of 6 app کے نام سے معروف ہے اس ٹکنالوجی کے تحت دوستوں کا ایک گروہ تیار کیا جاتا ہے جو SMS، ابلاغی پیغام اور دوسرے ذرائع سے ایک دوسرے سے مسلسل رابطہ میں رہتے ہیں اس گروہ کا کوئی بھی رکن کسی مشکل میں ہو یعنی جنسی دہشت گردی کا شکار ہو تو وہ فوراً ایک پیغام ارسال کرائے گا آؤ مجھے بچاؤ Come and get me یہ پیغام GP (SMAP) کے ذریعے نشر ہوگا جو پیغام دینے والے کے مقام کا تعین کرے گا۔ مقام کا تعین ہوتے ہی متعلقہ ادارے اس جگہ پہنچ کر ملزم کو گرفتار کرلیں گے۔ امریکہ میں عورتوں مردوں بچوں لڑکیوں لڑکوں کو جنسی دہشت گردی سے روکنے والی یہ ٹکنالوجی دنیا بھر میں مقبول ہوگئی اور جہاں جہاں مغربی تہذیب وثقافت کا تسلط ہے وہاں اس ٹکنالوجی کو استعمال کر کے جنسی درندوں تک رسائی حاصل کی جارہی ہے اس وقت تک دنیا کے ستائیس ملک اس سے استفادہ کررہے ہیں ان میں بھارت بھی شامل ہے لیکن کوئی ملک یہ سوچنے پر تیار نہیں کہ ایسے حالات کیوں پیدا ہورہے ہیں پچاس سال پہلے تو مغرب کے سوا دنیا کے کسی روایتی، مذہبی، دینی، الہامی معاشرے میں جرائم کی ایسی بدترین صورت حال قطعاً نہیں تھی رپورٹ میں بتایا گیا ہے۔

This app has been downloaded in 27 countries & was recently adapted for use in India. [p. 26]

بھارت میں ہالی ووڈ کی وجہ سے جنسی دہشت گردی عام ہے مگر آزادی کے عقیدے کو ترک کرنے پاکیزہ زندگی بسر کرنے کے بجائے بھارت میں جینز کی خاص پتلون لڑکیوں کے لیے تیار کی گئی ہے جیسے ہی کوئی پتلون اتارنے کی کوشش کرے گا پولیس موقع پر پہنچ جائے گی۔ سوال یہ ہے کہ پتلون اُتارنے والے ہاتھ کون پیدا کررہا ہے اور لڑکی کو پتلون کون پہنا رہا ہے یہ سب آزادی کے مظاہر ہیں اور جنسی دہشت گردی اس

آزادی کا نتیجہ ہے آپ آزادی کا عقیدہ ختم کرنا نہیں چاہتے صرف پتلون کو اترنے سے روکنا چاہتے ہیں ژی ژیک کے الفاظ میں ماڈرن ازم ہمیشہ دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے پہلے سوال کا جواب نہیں دیتا۔ وہ اس بات کا جواب نہیں دیتا کہ لڑکی کی پتلون اُتارنے والا مرد کون تیار کررہا ہے کہاں سے آرہا ہے وہ نظام کیا ہے وہ صرف دوسرے سوال کا جواب دیتا ہے کہ بس لڑکا لڑکی کی پتلون نہ اُتار سکے اس کے لیے قانون سخت تر کردو اسے پکڑلو لیکن اس لڑکے کی تعلیم، تربیت، تزکیہ نفس، اصلاح، قلب کی تعمیر کے لیے کچھ نہ کرو کیوں کہ وہ روشن خیال آزاد اور خود مختار مطلق وجود ہے اس کی آزادی کو بس قانون کے استعمال سے قابو میں رکھو کیوں کہ انسان صرف ایک عقلی وجود ہے وہ حسیاتی، روحانی، ایمانی وجود نہیں ہے۔

Dating Violence کیا ہے؟ تاریخ انسانی کی تیئس تہذیبوں میں ساڑھے سات ہزار سال تک ایسی کوئی اصطلاح نہیں ملتی یہ اصطلاح مغربی فلسفہ آزادی کے نتیجے میں اکیسویں صدی میں تخلیق ہوئی ہے۔

جنسی دہشت گردی لڑکے لڑکیوں کی دوستی آزادی کا نتیجہ ہے

نوجوان لڑکے اور لڑکیاں قانونی نکاح کے بغیر ازدواجی زندگی بسر کرتے ہیں اور ایک دوسرے پر فوقیت حاصل کرنے کے لیے ہمہ اقسام کے تشدد کا استعمال کرتے ہیں اسے Dating violence کہا جاتا ہے اس اصطلاح کی تاریخ پڑھیے:

Dating abuse or **dating violence** is defined as the perpetration or threat of an act of violence by at least one member of an unmarried couple on the other member within the context of dating or courtship. It is also when one partner tries to maintain power and control over the other through abuse/violence. This abuse/violence can take a number of forms: sexual assault, sexual harassment, threats, physical violence, verbal, mental, or emotional abuse, social sabotage, and stalking. It can include psychological abuse, emotional blackmail, sexual abuse, physical abuse and psychological manipulation.
Dating violence crosses all racial, age, economic and social lines. The Center for Relationship Abuse Awareness describes dating abuse as a "pattern of abusive and coercive behaviors used to maintain power and control over a former or current intimate partner.[http://www.ask.com/wiki/Dating_abuse]

امریکی اسکولوں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جنسی دہشت گردی نئی بات نہیں لیکن امریکی حکومت نے اس کی طرف سنجیدگی سے توجہ ۱۹۸۶ء میں اس وقت دی جب Lehigh University میں ایک انیس سالہ لڑکے کو کیمپس ریذیڈنس ہال میں جنسی درندگی کا نشانہ بنا کر قتل کردیا گیا پانی سر سے اونچا ہوگیا تو عوامی نمائندوں کو خیال آیا لہٰذا Clery Act 1990 ایوان نمائندگان میں پیش کیا گیا جسے منظور ہونے میں چار سال لگے یہ ایکٹ Crime awarness & Campus Security Act 1990 بھی کہلاتا ہے۔ اس ایکٹ کا ایک اور نام بھی ہے اس کے تحت فیڈرل گورنمنٹ سے امداد لینے والے تعلیمی اداروں کی ذمہ داری ہے کہ وہ تعلیم گاہوں کے اندر اور تعلیم گاہوں کے نزدیک ہونے والے جرائم کی اطلاع مہیا کریں اگر وہ ایسا نہ کرسکیں تو ہر جرم کی عدم اطلاع پر ان کو ۳۵ ہزار ڈالر جرمانہ ادا کرنا ہوگا۔

Clery Act

The Jeanne Clery Disclosure of Campus Security Policy and Campus Crime Statistics Act or Clery Act is a federal statute .
The Clery Act requires all colleges and universities that participate in federal financial aid programs to keep and disclose information about crime on and near their respective campuses. Compliance is monitored by the United States Department of Education, which can impose civil penalties, up to $35,000 per violation, against institutions for each infraction and can suspend institutions from participating in federal student financial aid programs.

سیکولر امریکی ثقافت جنسی دہشت گردی کا اصل سبب ہے

لیکن اس قدر سخت قانون کے باوجود کسی تعلیمی ادارے نے اس پر عمل نہیں کیا آخر کار امریکی صدر کو مداخلت کرنا پڑی اور وہائٹ ہاؤس نے ۲۰۱۴ء میں سخت اقدامات کا فیصلہ کیا۔

☆ امریکہ میں عورتوں کے خلاف بدترین جنسی دہشت گردی کا اصل سبب کیا ہے؟ امریکہ تو ایک سولائزڈ معاشرہ ہے آزادی ان کا ایمان عقیدہ ہے مساوات پر ان کا ایمان ہے عورت مرد سب برابر ہیں۔ لبرل نظام تعلیم کے تحت سب کو یکساں حقوق حاصل ہیں۔ تعلیم و تربیت کا نظام اسکول میڈیا سوشل گروپس کے ذریعے قائم ہے اس کے باوجود مرد عورت کے بارے میں نہایت منفی رائے رکھتے ہیں رپورٹ کے مطابق کم عمروں اور جوان لڑکیوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کو تعلیمی اداروں میں روکنے کے لیے قومی سطح پر لوگوں سے رائے لی گئی تو اکثریت کا جواب صرف ایک تھا جنسی دہشت گردی کے خاتمے کے لیے مردوں کو شریک کیا جائے۔ یعنی تمام امریکی مرد عورت کے خلاف جنسی دہشت گردی کو بری چیز نہیں سمجھتے۔

--- respondents said one thing Get Men involved.[p. 26]

رپورٹ میں اعتراف کیا گیا ہے کہ امریکی ثقافت جبری زنا کاری کی اجازت دیتی ہے جو ٹھیک نہیں اس ثقافت اور نقطۂ نظر کو بدلنا چاہیے اس کے لیے ہر شخص کو کوشش کرنا ہوگی اس جرم کے خاتمے کے لیے ہمیں نئے ثقافتی رویوں کی ضرورت ہے جبری زنا کاری کے ہر حادثے کو ہم ایک جرم سمجھیں نہ کہ اسے محض غلط فہمی سے پیش آنے والا حادثہ ایک ذاتی معاملہ، کسی مرد کا حق یا عورت کی غلطی نہ سمجھیں ہم اسے ایک جرم سمجھیں اور اس ثقافت کا خاتمہ کر دیں۔

Sexual assault is pervasive because our culture still allows it to persist [p. 33] we as a nation must seen it is a crime. Not a misunderstanding not a private matter not anyone's right or any woman's fault. [p.33]

سیکولر امریکہ میں مردوں کے خلاف عورتوں کی جنسی دہشت گردی

وائٹ ہاؤس سے جاری ہونے والی رپورٹ اصولاً تو مرد عورت کے خلاف جنسی دہشت گردی کا مطالعہ پیش کرتی ہے لیکن ان مسائل کا عملی حل پیش کرتے ہوئے رپورٹ صرف عورتوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کے اقدامات کا تذکرہ کرتی ہے اس لحاظ سے رپورٹ یک رخی، یک طرفہ، امتیازی [Discriminative] ہے Violence Against women act اس امتیازی سلوک کا ثبوت ہے

مردوں کے خلاف مردوں اورعورتوں کی جانب سے ہونے والی جبری جنسی دہشت گردی کے لیے نہ قانون بنایا گیا نہ ان لڑکوں مردوں فوجیوں کوہمدردی کا مستحق سمجھا گیا رپورٹ میں صرف عورتوں کے خلاف جنسی تشدد کوقوم کے اجتماعی اخلاقی تخیل اورثقافت،قوانین،قاعدوں ،ضابطوں کی ناکامی قرار دیا گیا ہے بے چارے مردوں کواس نازک موقع پرتنہا چھوڑ دیا گیا ہے مردکس سے فریاد کریں۔رپورٹ کے اختتامی جملوں میں امریکی قوم کے مردوں سے صرف عورتوں کی دادرسی کا مطالبہ کیا گیا ہےاورمردوں کوصرف مردوں اورعورتوں کے رحم وکرم پرچھوڑ دیا گیا ہےامریکی ریاست کامردوں لڑکوں بچوں کے خلاف جنسی دہشت گردی سے کوئی تعلق نہیں لہٰذا رپورٹ کے اختتامی جملے پڑھ لیجیے

--- violence against women reflect as much a failure of our nations collective moral imagination as it does the failure of our nations laws and regulations. we are helpless to change the course of this violence unless & until we achieve a national consensus that it deserves our profound public outrage. [p. 33, 34]

تمام سرکاری،غیرسرکاری،قومی،مقامی،وفاقی اداروں اورمعاشرتی گروہوں نےعورتوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کوروکنے کے لیےمردوں کومخاطب کرکے انھیں اس مہم میں شریک کرلیا۔ مگرمردوں کی مردوں لڑکوں کے خلاف جنسی دہشت گردی اورسات فی صد عورتوں کی مردوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کوروکنے کے لیے رپورٹ میں ایک سطر بھی نہیں لکھی گئی۔

--- to engage men in the effort to end violence against women [p. 26]

<u>سیکولرامریکی مردعورت کوبس جنسی کھلونا سمجھتے ہیں</u>

سوال یہ ہے کہ امریکی مردعورتوں سے اتنے بے پرواہ،لاتعلق کیوں ہیں انھیں امریکہ میں عورتوں کی عزت،حرمت،عفت،آبرو لوٹے جانے پرکوئی تشویش کیوں نہیں ہے؟ یہ کس قسم کے مرد ہیں جن کے لیے کم زورعورت کورگیدنا،لوٹنا جرم محسوس نہیں ہوااور یہ مردوں کو ان جرائم سے روکنے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں لیتے جدید تعلیم مرد کے ذریعےعورت کی مساوات کے سبق اسکول کالج میں پڑھنے اورمنشور انسانی حقوق کے مذہب پرایمان رکھنے کے باوجود یہ مرد اتنا بے حس،درندہ اوروحشی کیوں ہے۔یہ کیساامریکی مرد ہے جوعورت کے بارے میں اتنا سفاک ہے جولڑکوں کے بارے میں بھی وحشی ہے ظاہر ہے یہ مرد اپنے خاندان سے کٹا ہواآزادی کے سائے میں پلا ہواوجود ہے اسے نہ بچپن میں ماں کی محبت ملی ہے نہ نانی دادی کاقرب اس نے بہن،بیٹی،بیوی،بہو،بھابھی کوکبھی اپنے گھر میں اس طرح نہیں دیکھا جس طرح مشرق کےلوگ دیکھتے ہیں اس کاعورت کے ساتھ صرف حرص وہوس وحسد کارشتہ ہے یہ رشتہ آزادی کےعقیدے نے قائم کیا ہےاور آزادی ہرتعلق کی نفی[Negation of every Relation] کا نام ہے۔یعنی مغرب میں آزادی کی اصطلاح اصلاً محبت ،اخوت،ایثار،صلہ رحمی،قربانی،اخلاق،تہذیب اوراقدار سے آزادی کانام ہےاس کانتیجہ بھی سامنے ہےامریکی مردعورتوں سے اتنی نفرت

کیوں کرتے ہیں۔ رپورٹ اس مسئلے کی سماجی، تاریخی، معاشرتی حرکیات سے بھی آگاہ کرتی ہے

When men & boys believe that there peers accept sexist and abusive behavior they are much less likely to help. That in turn can lead perpetrators to think their actions are acceptable which of course perpetuates the violence, [p27]

<u>جنسی دہشت گردی سے بہتر ہے کہ چار شادیاں کرلی جائیں</u>

عورت کے بارے میں امریکی مردوں کا یہ رویہ کہ وہ ان کی طرف کوئی شریفانہ خیال ہی نہیں رکھتے مرد اور لڑکے عورت کے بارے میں نہایت منفی نفرت آمیز اور جنسی جذبات سے لبریز نقطۂ نظر رکھتے ہیں ان کے ہمجولی اور ہم عمر بھی عورت کے حوالے سے کوئی مثبت رائے نہیں رکھتے لہٰذا عورتوں کو جنسی اذیت پہنچانے میں انھیں کوئی تامل ہی نہیں ہوتا اسے وہ ایک مناسب جائز کام سمجھتے ہیں یہ حیران کن بات نہیں ہے بلکہ یہ آزادی کے عقیدے کا منطقی نتیجہ ہے عورت مرد کا لباس ہے اس لباس کو نکاح کی پابندی کے بغیر آزادی سے پہنا جائے تو معاشرہ جنسی درندگی کا شکار ہو جاتا ہے انسانی حقوق کے علمبردار جو اسلام میں چار شادیوں پر اعتراضات کرتے ہیں وہ بتائیں کہ چار شادیاں کرنا بہتر ہے یا عورتوں، لڑکیوں، لڑکی، اسی سال کے بوڑھے مردوں، معذور عورتوں، سہیلیوں، گھر کی لڑکیوں، بوڑھے مردوں، کمسن لڑکوں، بوڑھی عورتوں کی عزت لوٹنا ماں بہن بیٹی سے جنسی تمتع کرنا ان کو شدید زخمی کرنا اور زندگی بھر کے لیے ان کو اذیت، مصیبت میں مبتلا کر دینا زیادہ بہتر ہے؟ شادی کھیل تماشہ لہو ولعب نہیں ذمہ داری ہے یہ صرف لذت نہیں ایک پائیدار عہد ہے میاں بیوی کا رشتہ صرف اس زمین پر نہیں آسمان پر بھی قائم رہے گا یہ ایک مقدس ترین رشتہ ہے لہٰذا اس کا آغاز زندگی بھر ساتھ نبھانے کے عہد سے ہوتا ہے اگر یہ نیت نہ ہو تو ایسا نکاح شرعاً منعقد ہی نہیں ہوتا۔ طلاق اسلام میں اللہ کو ناپسندیدہ کاموں میں سب سے زیادہ ناپسند کام ہے اسلام میں چار شادیاں اس ذمہ داری، عدل، توازن، خیر خواہی اور خوف خدا کے ساتھ کی جاتی ہے مغرب نے نکاح کو اتنا مشکل بنا دیا ہے کہ وہاں شادی کرنا عذاب کو دعوت دینا ہے اس کا نتیجہ دوسرا عذاب ہے جس کی تفصیل آپ نے پڑھ لی۔

<u>سیکولر امریکی مرد سمجھتا ہے کہ عورت خود زنا کرنا چاہتی ہے</u>

☆ زنا کے بارے میں امریکی مردوں میں تسلیم شدہ اسطور یا دیومالا [Myth] یہ ہے کہ عورتیں خود زنا کرانا چاہتی ہیں اس کا تقاضہ ان کی طرف سے ہوتا ہے۔

--- women want to be raped & ask for it [p27]

امریکی مردوں میں عورتوں کے حوالے سے یہ دیومالا [Myth] بھی پائی جاتی ہے کہ وہ عورت یا لڑکی جو شراب پی رہی ہے اس کا شراب پینا اس بات کی علامت، نشانی اور دعوت [Sign/ Symbol/ invitation] ہیکہ وہ مرد سے جنسی تعلق قائم کرنا چاہتی ہے۔

And also more likely to think that a woman's drinking itself signals that she is intrested in sex.[p. 14]

رپورٹ یہ بھی بتاتی ہے کہ شراب پینے والے مرد کے جنسی جذبات بہت زیادہ مشتعل ہوتے ہیں ظاہر ہے شراب کا اگلا مرحلہ جنسی دہشت گردی ہی ہے اسی لیے تمام مذاہب عالم نے شراب کو حرام قرار دیا ہے جن مذاہب میں اس کی اجازت ہے وہ مذاہب کی محرف تعلیمات کا نتیجہ ہے۔

Prepetrators who drink prior to assault are more likely to believe that alcohol inereases their sex drive. [p. 14]

نشے کی اس حالت میں ہی ان زناکاروں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کا جسم طلب کرتا ہے نشہ کرنے والی عورت بھی اسی گناہ کی طالب ہے۔ خیر سے خیر پھوٹتا ہے اور شر سے شر۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کو جنم دیتا ہے اور گناہوں کے چراغ سے چراغ جلتے رہتے ہیں اسے ہم عذاب جاریہ کہتے ہیں۔

حیرت ہے کہ عورتوں کے بارے میں یہ اسطور [Myth] یا عورتوں کی عزت نہ کرنے کی خود ساختہ یا امریکی مردانہ مذہب کی مذہبی ممانعت [Taboo] پر دل و جان سے عمل کا جذبہ اُس ملک کے مردوں میں پایا جاتا ہے —— جو دنیا بھر کی عورتوں کو ان کے خاندان، قبیلے، مذہب، اقدار، روایات سے آزادی دلانے کی مہم چلا رہا ہے دنیا کی اصلاح کرنے سے پہلے امریکہ کو اپنے نظام تعلیم کی اصلاح اور اپنے مردوں کے دماغ کا علاج کرانا چاہیے جو اکیسویں صدی میں رہتے ہوئے بھی ایسے خیالات رکھتے ہیں جو دنیا کی کسی تہذیب کسی مذہب اور تاریخ انسانی کے کسی معاشرے میں کبھی نہیں سوچے گئے۔

رپورٹ تجویز کرتی ہے کہ مرد اس قسم کے اسطور یا دیو مالا [Myth] کے خلاف شعوری طور پر اٹھ کھڑے ہوں اور جنسی دہشت گردی کا شکار عورتوں کی بھرپور اخلاقی حمایت کریں۔

--- speaking out against rape acceptance myths [e.g women want to be raped and ask for it] & supporting survivors. [p. 27]

رپورٹ تجویز کرتی ہے کہ مردوں اور لڑکوں کو زناکاری کے خلاف مہم کا اتحادی بنایا جائے نہ کہ انہیں عورتوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کا مرتکب گردانا جائے۔

Bystander intervention tracing seeks to engage men and boys as allies rather than would be perpetrators. [p 27]

رپورٹ کے مطابق مردوں کو عورتوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کے خلاف قائم کردہ محاذ کا متحرک کردار بنایا جائے اس مہم جوئی میں انہیں اتحادی کا درجہ دیا جائے عورتوں کے خلاف گھریلو تشدد روکنے اور جنسی دہشت گردی کا خاتمہ کرنے کے لیے مردوں کو متحرک کیا جائے تاکہ مردان مردوں پر اثر انداز ہوسکیں جو عورتوں کے خلاف جرائم میں شریک ہیں یا مستقبل میں شریک ہوسکتے ہیں اس پروگرام کے تحت مردوں میں سے ایسی قیادت پیدا کی جائے گی جو عورتوں اور لڑکیوں کے خلاف ہر قسم کے تشدد کی مخالفت کرے دوسرے معنوں میں ۲۰۱۴ء تک امریکی معاشرے میں موجود مردوں میں ایسی قیادت بلکہ ذہنیت وجود ہی نہیں رکھتی جو مظلوم عورتوں کو اپنی ماں، بیٹی، بہن، بہو، بیوی یا

کم از کم ایک نازک وجود، صنف لطیف، ہمدردی کا خصوصی مستحق انسان ہی سمجھ کر اس کے خلاف مردوں کے بہیمانہ جرائم پر اپنے ضمیر کی آواز سن کر صدائے احتجاج و اصلاح بلند کرے یہ اس امریکی معاشرے کی حالت ہے جو دنیا کا سب سے زیادہ مہذب سولائزڈ معاشرہ ہے۔

--- engaging men in preventing sexual assault and domestic violence program which funds multifaceted stratagies to engage men as allies & influencers of other men. The program aims to develop new male leaders willing to speak up about violence against women & girls [p. 28]

☆ رپورٹ کے مطابق امریکہ میں اپنے جگری دوستوں کے ہاتھوں گھریلو تشدد اور جنسی دہشت گردی کا نشانہ بننے والی عورتوں میں سے چھپن فی صد عورتیں AIDS/ HIV کا شکار ہو جاتی ہیں رپورٹ کے مطابق 22 ملین عورتیں مردوں کی درندگی کا نشانہ بنتی ہیں اگر اس تعداد میں 56 فی صد عورتیں HIV کا شکار ہیں تو ان کی تعداد ۱۳ ملین بنتی ہے اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ امریکی مردوں کی بہت بڑی تعداد AIDS/HIV کا شکار ہے تبھی ان سے یہ جراثیم عورتوں کو لگتے ہیں رپورٹ کے اصل الفاظ یہ ہیں

Over half of women living with HIV in the USA have been raped by an intimate partner which is considerabley higher than the national rate among women overall (56% vs 36%) women & girls is a driving factor in the dom

☆ رپورٹ میں امریکی فوجیوں کو فوج کے اندر دوسرے فوجیوں کی جنسی دہشت گردی سے بچانے کے لیے بھی تجاویز دی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ مرد اور عورت فوجی جوان قوم کا تحفظ کرتے ہیں لہٰذا امریکی ریاست کی ذمہ داری ہے کہ وطن کی سرحدوں کے محافظوں کی جسموں کی سرحد اور ان کی عزت آبرو کا تحفظ کرے۔

Our military members contimue to face the threat of sexual assault within their ranks and the administration bears a unique responsibility to protect the women & men in uniform who dedicated their lives to protecting our nation the president is committed to addressing this corrosive problem which destroys trust among troops & undermines our readiness [29]

فوجی مردوں عورتوں کے خلاف جنسی دہشت گردی کے خلاف ڈپارٹمنٹ آف ڈیفنس مختلف اقدامات کر رہا ہے جس میں جنسی تشدد سے بچنے کے طریقے بتائے جائیں گے اس مقصد کے لیے باقاعدہ نصاب تیار کیا جائے گا فوج میں اصلاحات کا مقصد تمام سطحوں پر جنسی جرائم کا خاتمہ تاکہ فوجی مردوں عورتوں کی عزت کا تحفظ ممکن ہو جو ہماری قوم کا تحفظ کرتے ہیں۔

DOD has also developed a new curriculam for sexual assault prevention and response training. [p. 29]

--- additional reforms that may be required to eliminate this crime from the ranks and protect the men and women who serve our nation . [p29]

امریکا میں زنا کی تعریف بھی تبدیل کر دی گئی ہے

امریکہ میں زنا کی تعریف بھی بدل دی گئی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ زنا کاری اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے جدید طریقوں اور تنوعات سے کی جا رہی ہے کہ زنا کی قدیم مسلمہ تعریف کے تحت بہت سے مجرم زنا کے جرم سے بری ہو جاتے ہیں لہٰذا امریکی وزارت عدل

نے زنا کی نئی تعریف متعین کی ہے اس میں وسعت پیدا کی ہے اسے خاص صنف سے مختص نہیں کیا گیا کہ مرد ہی زنا کرے گا یعنی زنا اب دونوں طرف سے ہوسکتا ہے یہ gender specfic نہیں ہے لہٰذا امریکی قانون کے تحت اب عورت کے خلاف بھی زنا کا مقدمہ قائم کیا جاسکے گا تاریخی طور پر زنا کا مقدمہ ہمیشہ صرف مرد کے خلاف ہی قائم ہوتا ہے۔لیکن امریکی عورتیں ،لڑکیاں بھی مردوں کو زنا کرنے پر مجبور کرتی ہیں اس کے لیے وہ مردوں کو نشہ آور اشیاء پلاتی ہیں مختلف طریقوں سے اپنی طرف راغب کرتی ہیں ایسے انجکشن لگاتی ہیں جس سے مرد کی خواہش گناہ غیر فطری طور پر جاگ جائے۔اس نئی صورتحال سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ امریکی معاشرے میں صرف مرد ہی نہیں عورتیں بھی اخلاق باختگی کی آخری سرحدوں کو چھو چکی ہیں۔یہ سب آزادی مساوات [Freedom & Equality] کا حتمی نتیجہ ہے۔

روایتی تہذیبوں میں عورت عموماً حیاء کا پیکر ہوتی تھی اور اگر عزیز مصر کی بیوی زلیخا کی طرح کوئی عورت بدعمل بھی ہوتی تو اس کا معاشرہ اس کو قصوروار ٹھہراتا اور آخر کار وہ اپنے گناہ پر نادم ہوتی —— جدیدیت ،مغرب اور نفسیات میں گناہ [sin] کا تصور ہی نہیں پایا جاتا وہاں تو صرف [Guilt] ہوتا ہے کیونکہ گناہ ایک مذہبی تصور ہے جس کا تعلق توبہ سے اور اللہ سے ہے مغرب کا علم نفسیات نہ خدا کو مانتا ہے نہ گناہ کو جب گناہ ہی نہیں کیا تو معافی کا کیا سوال؟

---the definiation of rape used to collect data only forcible male penetration of a female vagina. [p. 31]

--- the justice department modernized its definition to include the various forms of assualt now under stood to be rape. Among other things the new defination covers instances where a victim is in capable of consent (because of drugs or alcohal) is not gender specific and includes oral & anal penetration. [p. 31]

رپورٹ کے مطابق زنا کی نئی تعریف متعین کرنے کے بعد زنا کاری کے مقدمات کی تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہوگا اس کا مطلب یہ ہوا کہ امریکہ کی ہر عورت جنسی دہشت گردی کا شکار ہے لیکن قانون کی کمزوریوں کے باعث زنا کاری کی شکایات سے آگہی نہیں ہوتی

--the new definition is more inclusive reported crimes of rape likely to rise in future. [p. 31]

<u>سیکولر مغرب میں لڑکی کی بلوغت کی عمر پانچ سال کم ہوگئی</u>

عورتوں پر مغرب میں کیا کیا ظلم ہو رہا ہے اس کا اندازہ ممکن نہیں کیمیائی غذاؤں اور ترقی کے باعث لڑکی کی بلوغت کی عمر پانچ سال کم ہوگئی لڑکی سے بچپن کے خوب صورت پانچ سال جدید ٹیکنو سائنس نے چھین لیے رپورٹ پڑھیے: عمار ناصر صاحب پاکستان کو سیکولر بنا کر یہی نتائج حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

Onset of puberty in girls has fallen by five years since 1920

The Observer, Sunday 21 October 2012

Today most doctors accept that the age of onset of puberty is dropping steadily. Consider the statistics provided by German researchers. They found that in 1860, the average age of the onset of puberty in girls was 16.6 years. In 1920, it was 14.6; in 1950, 13.1; 1980, 12.5; and in 2010, it had dropped to 10.5. Similar sets of figures have been reported for boys, albeit with a delay of around a year.

The trouble is that this drop, which was expected to stop, has simply continued at the same rate: a decline in four to five months in age of onset for each passing decade.

However, a Danish study released last year in the journal Paediatrics found puberty occurring earlier in children regardless of body mass index at age seven.

Other factors that may be involved include a diet that is increasingly high in sugar and fat and declining physical activity. The cause could also be environmental, say other researchers – in particular, exposure to endocrine disrupters, chemicals in the environment that act on hormones.

Widespread industrial and pharmaceutical pollutants have already been shown to harm the normal sexual development of fish and animals. By extension, they may also contribute to earlier or disrupted puberty in children, these scientists contend.

As to the likelihood that precocious puberty poses perils for young people, this is still debated – though many parents worry that early sexual development puts strain on children who are being robbed of years of innocent childhood.

http://www.theguardian.com/society/2012/oct/21/puberty-adolescence-childhood-onset/print

---

مغرب میں بلوغت کی عمر کم ہونے پر کسی کو کوئی دکھ نہیں ہوا کیوں کہ لڑکی کے جلدی بالغ ہونے سے لڑکی کی آزادی میں لذت میں پانچ سال پہلے اضافہ ہوگیا اس سے مارکیٹ میں کارپوریشن کی اشیاء کی فروخت میں اضافہ ہوا اس سے پیداوار میں اضافہ ہوا اس سے روزگار میں اضافہ ہوا اس سے بحیثیت مجموعی سرمایہ دارانہ نظام اور آزادی و ترقی میں اضافہ ہوا اگر لڑکی کی بچپن کے پانچ سال چھن گئے تو کیا غم ساری خوشیاں اس کے بدلے میں معاشرے کو مل گئیں۔

<u>سیکولر مغرب میں بچے پر اسکول کا ظلم</u>

ایک جانب ترقی اور معیار زندگی میں مسلسل اضافہ نے بچوں کو وقت سے بہت پہلے بالغ کر دیا ہے دوسری جانب ترقی اور معیار زندگی میں اضافے کے لیے بچوں کو جبراً اسکول، کالج، یونیورسٹی میں داخل کرایا جا رہا ہے بچے پر نماز سات سال میں فرض ہوتی ہے لیکن سیکولر تعلیم رحم مادر میں فرض ہو جاتی ہے رحم مادر میں اس کو دوسری زبانیں سکھائی جاتی ہیں اسی وقت اسکول میں رجسٹریشن ہو جاتا ہے اور ایک سال سے پہلے ہی اسے اسکول بھیج دیا جاتا ہے۔ قرآن نے حکم دیا کہ مائیں بچوں کو دو سال تک دودھ پلائیں مگر دو سال سے پہلے ہی بچے کو بستر سے کھینچ کر نکالا جاتا ہے وہ صبح صبح دھکے کھا کر قید خانے چلا جاتا ہے۔ معصوم بچوں کے ساتھ یہ بربریت، بہیمیت، ظلم، جبر کسی کو نظر نہیں آتا۔ اس پابندی سے ہی تو اسے آزادی حاصل ہوگی دنیا کے ہر گھر میں ہر روز سب سے زیادہ ظلم، تشدد، مار پیٹ، گالم گلوچ معصوم بچوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ سگے ماں باپ آزادی، سرمایے، نوکری، مستقبل، مادی ترقی کے لیے اولاد کو جوتے ٹھڈے مار کر اسکول بھیجتے ہیں کسی NGO کو یہ ظلم نظر نہیں آتا یہ آزادی کا جبر ہے یہ جائز ہے صرف مذہب کا جبر ناجائز ہے۔

اگر آزادی کے عقیدے کے تحت کسی کا بچہ اپنے باپ کے ساتھ کھیت میں کام کرے تو اسے Child Labour کہا جاتا ہے اسے آزادی نہیں جبر ظلم کہا جائے گا کیوں کہ آزادی کیا ہے اور ظلم کیا ہے یہ مغرب بتائے گا۔ خیر Good کا تعین ہر عقل مند نہیں کر سکتا صرف مغرب کے فلسفی کانٹ وغیرہ جسے خیر کہیں گے بس وہ خیر ہو گا مثلاً اگر کوئی جمہوریت سرمایہ داری آزادی کا انکار کرنا چاہے تو نہیں کر سکتا یہ خیر اعلیٰ Suprem Good ہے۔ General Will کے تابع ہے اسے تبدیل نہیں کیا جا سکتا یہ الحق ہے نا قابل تغیر ہے۔

اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں اور دفاتر، کارخانوں، دکانوں، مارکیٹ، کمپنیوں میں ترقی کے لیے جانے والی لڑکیوں عورتوں بلکہ لڑکوں مردوں کے ساتھ مغرب میں کیا ہو رہا ہے اس کی ایک جھلک وہائٹ ہاؤس سے جاری ہونے والی رپورٹ Rape & Sexual Assualt: A Reviewed Call to Action , Jan 2014 میں دیکھیے یہ رپورٹ وہائٹ ہاؤس کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔ رپورٹ کے مطابق ۲۲ ملین امریکی عورتوں سے، دو ملین لڑکوں سے جبری زنا کیا جاتا ہے رضامندی سے ہونے والے کروڑوں زنا اس فہرست میں شامل نہیں اسکول یونیورسٹی اور کالج میں جبری زنا کی وارداتیں سب سے زیادہ ہوتی ہیں جبری زنا کرنے والے تمام مرد لڑکیوں کے جگری دوست عشاق، ہم مشرب وہم مسلک قریبی رشتہ دار، اعتماد کے لوگ اور خونی رشتوں والے ہوتے ہیں ان اداروں میں صرف عورت ہی نہیں مرد بھی محفوظ نہیں ہے ان کی عزتیں بھی لوٹی جاتی ہیں۔

Nearly 22 Million have been raped in their life time, 1.6 million men have been raped during their lives. [p.1]

<u>سیکولر یوروپ میں کروڑوں عورتوں سے جنسی دہشت گردی</u>

FRA کی ویب سائٹ پر یوروپی یونین میں عورتوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی کے ہولناک اعداد و شمار دیے گئے ہیں 53% عورتوں کو شکایت ہے کہ مرد انھیں گھر سے باہر، بازار میں، اسکول، کالج، یونیورسٹی، دفاتر میں غلیظ نگاہوں سے گھورتے رہتے ہیں 38% عورتوں کے ساتھ کئی مرتبہ جبری زنا کاری کی گئی ہے ۱۳ سال کی لڑکی سے لے کر ۳۷ سال تک کی عورت کو ای میل کے ذریعے فحش اور گندے پیغامات موصول ہوتے ہیں۔

[FRA] یوروپین ایجنسی فار فنڈ امینٹل رائٹس نے یوروپی یونین کے ۲۸ ممالک میں عورتوں کی بے حرمتی، عزت، عصمت، عفت اور حرمت کی پامالی کی جو حیرت ناک، شرم ناک اور افسوس ناک کہانی [Violence against women: an Eu -wide survey. Main results] تحقیق کی روشنی میں بیان کی ہے —— رپورٹ کے مطابق ایک سال میں ایک کروڑ بیس لاکھ عورتوں کو جسمانی تشدد کا سامنا کرنا —— پڑا تشدد صرف جوان لڑکیوں پر نہیں پچھتر سال کی بوڑھی عورتوں پر بھی ہوا یہ کیسی انسانیت ہے کہ بوڑھے لوگ بھی اس ظلم سے محفوظ نہیں —— تشدد کرنے والے مسلمان، مولوی نہیں تھے یہ سارے مسٹر تھے گویا یوروپ کی سات فی صد عورتوں کو جسمانی عذاب سہنا پڑا یہ تعداد بہت کم ہے کیونکہ لاکھوں خواتین بے شمار وجوہات کی بنیاد پر تشدد کی رپورٹ درج نہیں کراتیں

An estimated 13 million women in the EU have experienced physical violence in the course of the 12 months before the survey interviews. This corresponds to 7% of women aged 18-74 years in the EU.

چالیس لاکھ عورتوں کے ساتھ جنسی دہشت گردی کی گئی—— درندوں نے ستر سال کی بوڑھی عورتوں کو بھی نہیں بخشا——
An estimated 3.7 million women in the EU have experienced sexual violence in the course of the 12 months. This corresponds to 2% of women aged 18-74 years in he EU.

یوروپ میں بیس میں سے ایک عورت پندرہ سال کی عمر میں جبری زنا کاری کا شکار ہو جاتی ہے یعنی یوروپی یونین کی ۵ فی صد عورتوں کو ہر سال جبری زنا کا سامنا کرنا ہوتا ہے لاکھوں عورتیں جو جبری زنا کا شکار ہوتی ہیں وہ رپورٹ درج نہیں کراتیں ان کی تعداد نا معلوم ہے لاکھوں عورتیں وہ ہیں جو رضا مندی سے زنا کرتی ہیں وہ قانون کے دائرے میں نہیں آتیں کیونکہ رضا مندی سے زنا جرم نہیں ہے یہ آزادی [Freedom] کا اظہار ہے——
One in 20 women (5%) has been raped since the age of 15. This figure is based on responses to the survey question Since you were 15 years old until now how often has somone force you into sexual intercourse by holding you down or hurting you in some way?

یوروپی یونین کے ۲۸ ممالک کی چار کروڑ عورتوں یعنی اٹھارہ فی عورتوں نے شکایت کی ہے کہ مرد انھیں گھورتے، تاکتے، اور جھانکتے ہیں ان کے گھر اور دفتر تعلیم گاہوں کے باہر راستے میں یہ مردان کو حریصانہ اور مریضانہ نظروں سے دیکھتے ہیں رپورٹ میں اٹھارہ فی صد عورتوں کی تعداد نوے لاکھ بتائی گئی ہے جو درست نہیں کیونکہ یوروپی یونین میں عورتوں کی کل آبادی اس رپورٹ کے مطابق انیس کروڑ ہے انیس کروڑ کا اٹھارہ فی صد چار کروڑ بنتا ہے——
In the EU-28 , 18% of women have experienced stalking since the age of 15 and 5% of women have experienced stalking. This corresponds to about 9 million women in the EU 28 experiencing stalking. To obtain this finding, women were asked in the survey interview whether they had been in a situation where the same person had been repeatedly offensive of threatening towards them with respect to a list of different actions for example whether the same person has repeatedly Loitered or waited for you outside your home workplace or school without a legitmate reason? or Made offensive threatening or silent phone calls to you?

سیکولر جرمنی میں جانوروں سے زنا کاری کے مراکز قائم ہیں

عمار ناصر صاحب آخر پاکستان کو سیکولر کیوں بنانا چاہتے ہیں

یوروپ میں جنسی دہشت گردی کا حال آپ نے پڑھ لیا مگر یوروپی یونین کا عظیم نظام عدل، ان کی برق رفتار پولیس ان کے موبائل فون، ان کے کمپیوٹر عورتوں سے ہونے والی مردوں کی ان ذلیل حرکتوں کو روکنے میں مکمل طور پر ناکام ہیں—— ظاہر ہے اخلاقیات کو آپ قانون کے ذریعے مسلط نہیں کر سکتے اخلاقیات کا دائرہ ایک الگ دائرہ ہے جس کے لیے ایک الگ تصور کائنات، تصور انسان، تصور اجتماعیت، تصور معیشت، تصور آخرت کی ضرورت ہے

آزادی کا عقیدہ اختیار کرنے کے بعد اخلاقیات کا دائرہ محض آزادی کے محور پر پرکھا جا سکتا ہے لہٰذا ہر وہ کام، عمل، کوشش جس سے آزادی کے دائرہ میں اضافہ ہو اخلاقی ہو جاتا ہے—— اگر آج نہیں ہے تو کل اخلاقی ہو جائے گا جس طرح امریکہ اور فرانس میں ۲۰۱۳ تک مرد

کی مرد یا عورت کی عورت سے شادی کو قانونی تسلیم نہیں کیا جاتا تھا اور دونوں ایک دوسرے کے وارث نہیں سمجھے جاتے تھے مگر امریکی سپریم کورٹ اور فرانس کی پارلیمنٹ نے آزادی کے فلسفے کے تحت یہ حقوق ۲۰۱۳ میں عطا کر دیئے فرانس نے تو Marrige for all کا قانون بنا دیا یعنی سب سے نکاح کرو جرمنی میں جانوروں سے زنا کاری کے مراکز قائم ہیں جن کو قانونی شکل دی جا رہی ہے جانور بھی پریشان ہیں کہ کس عہد میں پیدا ہو گئے۔ عمار ناصر صاحب پاکستان کو سیکولر بنا کر جرمنی جیسے جانوروں کے مراکز کیا پاکستان میں کھلوانا چاہتے ہیں آزادی کی تعریف یہی ہے کہ پابندیوں کا دائرہ کم سے کم ہوتا جائے سرمایہ دارانہ عدل اسی کا نام ہے منشور حقوق انسانی کا مقصد انسانی راہ میں حائل تمام قانونی، تہذیبی، مذہبی، روایتی، اخلاقی، دینی، الہامی، خاندانی، نسلی، گروہی، قبائلی حد بندیوں کا ختم کر کے انسانی کی آزادی میں لامحدود اضافہ کرتے چلے جانا ہے۔ جدیدیت Modernism میں نفس مطلق آزاد ہے اس کی تعمیر، تربیت، تطہیر، تشکیل، تصفیہ کا سرے سے کوئی انتظام نہیں ہے ہر انسان عقل رکھتا ہے لہٰذا لوگوں کے نفس کو پابند کرنا انسان کے جوہر آزادی کا انکار ہے۔

رپورٹ کے مطابق یوروپی یونین میں Sexual cyber harassment بھی عام ہے ۱۵ سال عمر کی عورت سے لے کر ۶۰ سال یا اس سے زیادہ عمر کی عورتوں کو بھی سائبر نیٹ کے ذریعے جنسی طور پر ہراساں کیا جاتا ہے پندرہ سال کی عمر والی گیارہ فی صد لڑکیوں کو سائبر جنسی دہشت گردی کا سامنا ہے جنسی جذبات پر مشتمل ای میل پیغامات جن کی عورت طالب [unwanted] نہیں ہے اسے وصول کرنے پڑتے ہیں یعنی مغرب میں آزادی کی اخلاقیات [Morality of freedom] کے تحت اگر عورت ان گندے، غلیظ، گھٹیا پیغامات کی طالب ہو تو مرد کو آزادی ہے کہ وہ اسے ایسے خبیث پیغامات ارسال کر سکے یہ آزادی کا ثمر [Fruit] ہے مغرب اس آزادی کا بے حد احترام کرتا ہے ——

Forms of sexual cyberharassment since the age of 15 and in the 12 months before the survey, including unwanted sexually explicit emails or sms messgaes that were offensiv.

سیکولر یوروپ میں دس کروڑ عورتیں جنسی درندگی کا نشانہ

لڑکیوں نے بتایا کہ انہیں پندرہ سال کی عمر سے پہلے ہی کسی بالغ مرد کی جنسی دہشت گردی کا نشانہ بننا پڑتا ہے ایسی مظلوم لڑکیوں کی تعداد یوروپی یونین میں دو کروڑ دس لاکھ [۲۱ ملین] ہے —— یوروپی یونین میں عورتوں کی کل تعداد 186590848 ہے اس تعداد کے بارہ فی صد حصے کو لڑکوں سے یہ شکایت ہے اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ دو کروڑ دس لاکھ لڑکے یوروپی یونین میں جنسی آوارہ گردی کے ذریعے لڑکیوں کو ہراساں کر رہے ہیں اور یوروپی یونین پولیس، قانون یا تعلیم کے ذریعے ان پر قابو پانے سے قاصر ہے ——

بیس فی صد لڑکیوں کو شکایت ہے کہ ان کے سابق یا موجودہ دوست، شریک کار [Partner] نے ان کو جنسی استحصال کا نشانہ بنایا۔

Some 12% of women indicate that they have experienced some form of sexual abuse or incident by an adult before the age of 15 which corresponds to about 21 million women in the EU. The results show that 30% of women who have experienced sexual victimisation by a former or current partner also experienced sexual violence in childhood. Of those women who have not experienced sexual victimisation in their current or former relationship 10 %

بادشاہ عورت کودیکھ کررک جاتا اسے خود راستہ دیتا تھا

جنسی دہشت گردی میں یہ اس یوروپ کا حال ہے جہاں ۱۶۶۵ء میں بادشاہ عورت کو راستے میں دیکھ کر عورت کے احترام میں گھوڑے کو روک دیتا تھا اور عورت کو نہایت اکرام سے گزرنے کا راستہ دیتا تھا اگر بادشاہ سواری کے بغیر ہوتا اور کوئی عورت نظر آتی تو سر سے ٹوپی اُتار کر عورت کی تعظیم کرتا (اس کا مطلب یہ ہوا کہ عورت کبھی کبھی نظر آتی تھی اگر جدید شہروں کی طرح ہر طرف عورتیں ہی عورتیں ہوتیں تو بادشاہ صبح سے رات تک عورت کے احترام میں کھڑا رہتا اور کبھی ایسے احترام سے فرصت نہیں ملتی) برنارڈ لیوس اپنی کتاب *What Went Wrong* میں ترک سفارت کار کے سفر آسٹریلیا کے مشاہدات کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتا ہے

The first comes from Evliya Çelebi, a famous Turkish writer of his time who visited Vienna in 1665 as partof an Ottoman diplomatic mission. In the course of a long and detailed account of the imperial capital and his adventures there, Evliya describes a "most extraordinary spectacle" that he saw."In this country I saw an extraordinary spectacle. Whenever the emperor meets a woman in the street, if he is riding, he brings hishorse to a standstill and lets her pass. If the Emperor is on foot and meets a woman, he stands in a posture of politeness. The womangreets the emperor, who then takes his hat off his head to show respect for the woman. After the woman has passed, the emperor continues on his way. It is indeed an extraordinary spectacle. In this country and in general in the lands of the unbelievers, women have the main say. They are honored and respected out of love for Mother Mary".[Bernard Lewis, *What Went Wrong: western impact and Middle Eastern response*, Oxford University Press 2002 Chapter 3, Social & Cultural Barriers, p. 64-65]

<u>زنا سے محفوظ علاقے نہیں شادی سے محفوظ علاقے چاہئیں</u>

صرف ۳۵۱ سال میں ترقی کرتے کرتے عورت مغرب میں اس حالت کو پہنچ گئی ہے کہ وہ اپنے گھر میں اپنے باپ سے بھی محفوظ نہیں ہے اس کے باوجود عالم اسلام مغرب کی ترقی کو نہایت للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہا ہے۔ مگر اس ترقی کے نتائج کو خذ ما صفا و دع ما کدر کے اصول کے تحت دانستہ نظر انداز کر دیتا ہے۔

امریکہ یوروپ میں عورتوں کے لیے زنا سے محفوظ علاقے Rape-free zones بنانے کے بجائے مغرب پاکستان میں شادی سے محفوظ علاقے Marriage-free zones بنانے کے لیے اربوں روپے خرچ کر رہا ہے برطانیہ کے سابق وزیر اعظم گولڈن براؤن نے پاکستان کے دورے میں اعلان کیا ہے کہ مغرب کو کمسنی کی شادی قبول نہیں ترقی کے ایمان اور عقیدے پر عمل کے لیے تعلیم ضروری ہے لڑکیوں کی شادی تعلیم کی تکمیل سے پہلے نہیں کرنے دی جائے گی اس کے لیے اربوں ڈالر کی امداد دی جارہی ہے مغرب کے لیے ترقی اہم ہے اس کے لیے تعلیم ضروری ہے کمسنی کی شادی مسئلہ ہے کمسن سے زنا کاری مسئلہ نہیں ہے دوسرے معنوں میں گورڈن براؤن کا پیغام یہ ہے کہ تعلیم کے حصول کے دوران لڑکیوں سے زنا کاری ہوتی ہے تو ہو کوئی فرق نہیں پڑتا ہر ایمان عقیدے یقین کی ایک قیمت ہوتی ہے زنا روکنے کا بھی انتظام کریں گے مگر پہلے شادی کو روکیں گے تاکہ لڑکی تعلیم حاصل کر سکے بعد میں جبری زنا کو روکیں گے کیونکہ زنا اگر مرد عورت کی آزادانہ مرضی (Free Will) سے ہو تو یہ جائز ہے لیکن مرضی کے بغیر ہو تو ناجائز ہے کیونکہ آپ نے دوسرے کی آزادی

چھینی ہے اصل جرم دوسرے کی آزادی کو پامال کرنا ہے عورت کی عفت عزت عصمت غیر اہم ہے اس کی تعلیم وترقی آزادی نوکری، خود مختاری، مردوں کے مساوی کام کرنے کی آزادی سب سے زیادہ اہم ہے اسی لئے ہم کہتے ہیں کہ مغرب سے جنگ ایمان اورعقیدے کی جنگ ہے وہ مذاہب عالم کی ہزاروں سال کی متفقہ اخلاقیات کوتسلیم نہیں کرتا وہ اپنے باطل عقیدے کو علمی، عقلی، منطقی طور پر بھی ثابت کرتا ہے اورعقیدے کے اطلاق ونفاذ کے لئے عسکری قوت بھی استعمال کرتا ہے براؤن مغرب کے عقیدے کا ایلچی ہے وہ کہتا ہے

Gordon Brown: Create Pakistan child marriage-free zones

Former prime minister Gordon Brown has announced that "child marriage-free zones" are to be set up in Pakistan.
Mr Brown, the UN's special envoy on global education, said the practice of forcing girls into marriage is "not acceptable in the modern world".
"It deprives a girl of her education and her childhood," he told the BBC.
Speaking on a visit to Islamabad, he revealed the UN is giving $10m (£6m), and the EU 100m euros (£83m), to get more Pakistani children into education.

"So as part of our campaign to get every child at school, we want to remind people that the world does not want girls to be married as girls, as brides when they should be at school." "[BBC News, 29 March 2014],[http://www.bbc.com/news/world-26801597?print=true

براؤن کے اس بیان کا مقصد کیا ہے؟ شادی سے محفوظ علاقوں کا کیا مطلب ہے؟ زنا سے محفوظ علاقوں کی ضرورت کیوں نہیں ہے عقل مند کو اشارہ کافی ہے۔امید ہے عمار ناصر صاحب سیکولر معاشرت اور سیکولر ریاست کا مطلب سمجھ گئے ہوں گے ____ وہ بہت عقل مند آدمی ہیں۔

تہذیبوں کے تصادم کا نظریہ: تاریخی تجزیہ

ایڈورڈ سعید مغرب و اسلام کی مغائرت سے ماوراء

سید خالد جامعی

جدید کے شمارہ ۴۹ میں "عالم اسلام میں جدیدیت اور روایت کی کشمکش" پر شائع ہونے والے تحقیقی مضمون میں صفحہ ۱۲۸ اور ۱۲۹ پر سہواً درست اور تفصیلی متن کے بجائے غلط اور نامکمل متن شائع ہو گیا۔ یہ متن آٹھ صفحات پر مشتمل تھا لیکن صرف دو صفحات لے لیے گئے جو نامکمل کتابت کے باعث غیر مربوط عبارت پر مشتمل تھے۔ صفحات کی ترتیب کے دوران اس مضمون سے متعلق کتابیات پر مبنی صفحات ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے عالمانہ مضمون کے بعد شامل کیے گئے جس کے باعث قارئین کو زحمت ہوئی۔ صفحہ ۲۴۷ سے ۲۵۸ تک درج فہرست کتب اسی مضمون کا تسلسل ہے۔ اس فہرست کا ڈاکٹر معین الدین عقیل صاحب کے مضمون سے کوئی تعلق نہیں۔ صفحہ ۱۲۸ اور ۱۲۹ کا اصل متن درج ذیل ہے۔ اس کے مطابق آپ اپنے نسخے میں مطالعے کا تسلسل قائم رکھ سکتے ہیں۔

[فلسفے کو قابل تغیر سمجھتے تھے جب کہ جدیدیت پسند مغربی تہذیب، اقدار اور فلسفے کو ناقابل تغیر اور ناگزیر سمجھتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مغربی تہذیب و فلسفے کی اقدار و روایات عالمگیر ہیں، زمان و مکان سے ماوراء ہیں۔ ناقابل تقسیم و ناقابل تغیر ہیں۔ اس کے برعکس اسلام کی ۱۵ سو سالہ قدیم تعلیمات، روایات، اقدار، خصوصیات، ثقافت، تہذیب، قرآن کی آیات، سنت رسولؐ، احادیث سب کچھ قابل تغیر و ترمیم ہیں، لہٰذا مغربی فلسفے کے تناظر میں اسلام کو تبدیل کر کے مغرب کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ تاریخی معنوں میں فرانسس فوکویاما کا موقف ہے کہ تاریخ کا سفر ختم ہو چکا ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کی ترکیب اس یقین کا اظہار ہے کہ اب کوئی تہذیب، کوئی فلسفہ، کوئی تاریخ، کوئی روایت، کوئی مذہب مغرب کی قائم کردہ عالمگیر اقدار، بنیادی حقوق اور انسانی

حقوق کے مقابلے پر کوئی نیا نظام یا اقدار و روایات پیش نہیں کر سکتا۔ ان مغربی روایات سے بہتر عالمگیر روایات کے پیش کیے جانے کا امکان ہے۔ لہٰذا تاریخ کا سفر ختم ہوگیا۔ اختتام تاریخ کے فلسفہ پر مبنی فوکو کا مضمون National Interest نامی رسالے میں شائع ہوا جو بعد میں ایک کتاب کا موضوع بن گیا۔ اسی فلسفے کی ایک دوسری شکل برنارڈ لوئس نے اٹلانٹک منتھلی کے ستمبر ۱۹۹۰ء کے شمارے میں اپنے مضمون "مسلم غیظ و غضب کا اظہار" میں پیش کی اور پہلی مرتبہ تہذیبوں کے تصادم کی خود ساختہ ترکیب استعمال کی۔ لوئس مسلم دنیا کے حاضر مسئلے پر اظہار خیال کرتا ہے "اب تک یہ بات بالکل صاف ہو جانی چاہیے کہ ہمیں ایک ایسے رویے اور ایک ایسی صورت حال کا سامنا ہے جو مسائل اور پالیسیوں کی سطح سے اور ان حکومتوں سے، جو ان کی تجویز رکھتی ہیں، کہیں بلند تر ہے۔ یہ تہذیبوں کے تصادم سے کم تر کوئی چیز نہیں۔ یہ شاید ایک قدیم حریف کا ہمارے یہودی۔ عیسائی ورثے، ہمارے سیکولر حال اور دونوں کے عالمی پھیلاؤ کے خلاف ایک نامعقول مگر بہر حال یقینی طور پر تاریخی ردعمل ہے۔ اب یہ حد درجہ ضروری ہے کہ اپنی طرف سے ہمیں اپنے حریف کے خلاف اسی سطح کے تاریخی اور اتنے ہی نامعقول اشتعالی ردعمل کا شکار نہیں ہونا چاہیے"۔ ہنٹنگٹن نے یہ اصطلاح برنارڈ لوئس سے مستعار لی اور اسی بنیاد پر تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے کو مستقبل کی مغربی حکمت عملی کے طور پر پیش کیا۔ ہنٹنگٹن بمارڈ لوئس فواد عجمی فوکو یاما فرید زکریا ایک ہی فلسفہ فکر کے قلم کار نظر آتے ہیں اس کے برعکس دوسرے مکتبہ فکر کی نمائندگی رورٹی، گرے، نیل میکفاؤز کرتے ہیں۔ یہ بھی مغربی تہذیب کے وفادار امریکا کے زبردست حامی ہیں لیکن اس درجہ پرجوش مبلغ نہیں جیسا کہ ہنٹنگٹن اور ان کا مکتبہ فکر ہے۔ تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے کی مختصر تاریخ ایڈورڈ سعید کے مضمون "تعریفوں کا تصادم" میں بیان کی گئی ہے جو ان کی کتاب Reflection on Exile میں شامل ہے۔] تاریخ کے سفر کے اختتام کے یہ دعوے نئے نہیں انیسویں صدی میں کانٹ نے Kingdoms of End کا تصور پیش کیا۔ ساٹھ کی دہائی میں فرانس کے پروفیسر Alexander Koggere نے اعلان کیا کہ تاریخ ختم ہوگئی ہے۔ تاریخ کے اختتام کے یہ نظریات ہیگل کے فلسفہ End of History کی توسیع تھے۔ جب ہیگل نے کہا تھا کہ تاریخ اس ذات مطلق کی خود تخلیقیت (Self Creation) اور خود تشکیلیت (Self Constitution) کا سفر ہے جب خود تخلیقیت کے اس عمل کے ذریعے ذات مطلق اپنے آپ کو مکمل کرے گی تو تاریخ ختم ہو جائے گی۔ [مذہبی زبان میں اس نظریے کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ ہیگل کے نزدیک خدا تاریخ کے ذریعے اپنے آپ کو خلق کر رہا ہے مکمل کر رہا ہے]۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مختلف تہذیبوں، نسلوں اور ثقافتوں کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دوسروں کی بہ نسبت اعلیٰ وارفع مقصد حیات رکھتے ہیں لہٰذا اس ارفع مقصد کو دنیا بھر میں رائج ہونا چاہیے۔ اسلام اسی نقطہ نظر کا دعویٰ

ہے، وہ دعوت کے ذریعے اپنے پیغام کے آفاق وسیع کرتا ہے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو جائے وہ تمام فوائد اور مناصب اور جنت کا حق دار ہوتا ہے جو معاہدہ کر کے مطیع ہو جائے اس کے ساتھ شرائط معاہدہ کے مطابق معاملہ کیا جاتا ہے جو جنگ مسلط کرنا چاہے اس سے طاقت کے ذریعے نمٹا جاتا ہے۔ اسلام اقدامی جہاد کا مدعی ہے، جہاں بھی فتنہ و فساد برپا ہوگا جارحیت ہوگی، اسلام اس کی مزاحمت کے لیے بھرپور اقدام کرے گا تا آنکہ جنگ ہتھیار نہ رکھ دے اور دشمن کی قوت کو اچھی طرح کچل نہ دیا جائے۔ اس عمل کے دوران زمین پر فتنہ و فساد پھیلانے والے کو نہ صرف قتل کیا جاتا ہے بلکہ غلام بھی بنایا جاتا ہے جو اللہ کی غلامی گوارا نہیں کرتے وہ اللہ کے بندوں کی غلامی اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

ہنٹنگٹن کی تحریر کے بین السطور میں تہذیبوں کے درمیان ایک آخری معرکہ عظیم کا امکان ابھرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور وہ آخری معرکہ ہندو، جاپانی، کنفیوشس، سلاوی راسخ العقیدہ، لاطینی امریکی اور افریقی تہذیبوں کے درمیان برپا ہوگا لیکن اصل معرکہ اسلام اور مغرب کے درمیان ہے کیونکہ اسلام کا نظریہ ریاست، ثقافت اور تہذیب تینوں دائرہ کار میں اثر و نفوذ رکھتا ہے جب کہ دیگر نظریات محض ثقافتیں ہیں جو ریاست سے تعلق خاطر نہیں رکھتے۔ ریاست سے اسلام کا خصوصی تعلق اسے طاقت کے مرکز میں بدل دیتا ہے اور مذہب صرف تہذیب و ثقافت پر اثر انداز ہونے کے بجائے ریاست میں داخل ہو کر معاشرے میں امتیازی تبدیلیوں کا باعث بنتا ہے جو مغرب کو قبول نہیں لہٰذا ہنٹنگٹن "تصادم کو طول دینے، اسے بڑھانے اور اسے گہرا بنانے کی حکمت عملی تجویز کرتا ہے اور دنیا کو بسر جنگ دیکھنا چاہتا ہے۔ ہنٹنگٹن کے اس تصور تصادم کا مستقبل میں خطرناک امکانی تصور ایچ جی ویلز کی تمثیل "دنیاؤں کی جنگ [The War of the Worlds] میں ملتا ہے۔

ایڈورڈ سعید نے اپنی کتاب Reflection on Exile میں تہذیبوں کے تصادم کے فلسفے پر تنقید کرتے ہوئے وہ تمام حوالے جمع کر دیے ہیں جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ دنیاؤں کے مابین آویزش اور تصادم پر مبنی تصورات و نظریات کے مباحث گستاولی بان کی کتاب "The World in Revolt" ایف ایس مارون کی کتاب Western Races and the World [1922]، جارج ہنری لین فوکس پٹ ریورز کی کتاب The Clash of Culture and the Contact of Races [1927] میں بخوبی ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔ یہ حوالے اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہیگل سے لے کر گستاولی بان اور ہنٹنگٹن تک آخری معرکہ عظیم کا تصور مغربی فکر و فلسفے کی تاریخ میں کارفرما رہا ہے اور یہ آخری معرکہ صرف اسلام سے ہوگا مغربی مفکرین اس معرکے میں امریکا کو کلیدی مقام دیتے ہیں کیونکہ وہ نظام سرمایہ داری کا سب سے موثر و متحرک محافظ ہے۔ امریکا خود کیا ہے اس سلسلے میں ایڈورڈ سعید لکھتے ہیں:

امریکہ میں یہ بحث، کہ کس شے کو امریکی کہا جا سکتا ہے، متعدد دیدنی تبدیلیوں اور عجیب صورتوں میں ڈرامائی تبدیلیوں سے دوچار رہی ہے۔ جب میں جوانی کی حدود میں قدم زن تھا تو اس زمانے میں ویسٹرن فلم امریکہ کے اصلی باشندوں کو لعین ابلیسوں کی شکل میں دکھاتی تھی جنھیں یا تو تہ تیغ کرنا یا مطیع بنانا لازم تھا۔ انھیں ریڈ انڈینز کہا جاتا تھا اور چونکہ ثقافت میں ان کا کوئی ایسا نول نہیں تھا سو یہ فلموں کے بارے میں بھی اتنا ہی درست تھا جتنا علمی تاریخ لکھنے کے باب میں۔ مختصر یہ کہ یہ طرزِ عمل سفید تہذیب کی پیش قدمی میں مضمر خوبیوں کو روشن تر کرنے کا ذریعہ تھا۔ آج صورتِ حال بالکل بدل چکی ہے۔ اب مقامی امریکیوں کو بدمعاشوں کے روپ کے بجائے مظلوموں کی شکل میں دکھایا جاتا ہے۔ کولمبس کے مرتبے میں بھی تبدیلی آ چکی ہے۔ امریکی حبشیوں اور عورتوں کے بیان میں اور زیادہ ڈرامائی تبدیلیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ ٹونی موریسن نے لکھا ہے کہ کلاسیکی امریکی ادب میں سفید رنگ سے مریضانہ حد تک وابستگی پائی جاتی ہے جیسا کہ میلول کی "موبی ڈک" اور پوکی "آرتھر گورڈن پم" سے بطریق احسن تصدیق ہوتی ہے۔ تاہم وہ کہتی ہے کہ انیسویں اور بیسویں صدی کے بڑے لکھنے والے مرد اور سفید رنگ مصنفین نے وہ لوگ جنھوں نے اس ادب کے اصولی قوانین وسالیب طے کیے جسے ہم امریکی ادب کا نام دیتے ہیں۔ اپنی تحریروں میں گورے پن (Whiteness) کو ہمارے معاشرے میں افریقی موجودگی سے بچنے، اس پر نقاب ڈالنے اور اسے غیر مرئی بنا ڈالنے کے لیے حربے کے طور پر استعمال کیا۔ عرف بھی امر کہ ٹونی موریسن اپنے ناول اور تنقید اس قدر کامیابی اور ذہانت کے ساتھ لکھتی ہے اب میلول اور ہیمنگوے کی دنیا سے دو ہوائے (Du Bois)، بالڈون، ہیگلسن ہیوز اور ٹونی موریسن کی دنیا تک ہونے والی تبدیلی کو نمایاں کرتی ہے۔ کس زاویۂ نگاہ کو اصل امریکہ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے اور کون شخص اس کی نمائندگی اور تعریف کا دعویٰ کر سکتا ہے؟ یہ سوال بہت پیچیدہ اور نہایت گہرا ہے لیکن اس سارے مسئلے کو چند فرسودہ فقروں تک محدود کر کے حل نہیں کیا جا سکتا۔ ان ثقافتی مقابلوں میں، جن کا مقصد کسی تہذیب کی تعریف متعین کرنا ہوتا ہے، کیا کیا مشکلات حائل ہوتی ہیں، اس کا اندازہ آرتھر شلیسنجر کی حالیہ چھوٹی سی کتاب "The Disuniting of America" (امریکہ کی تحلیل) سے کیا جا سکتا ہے۔ سوادِ اعظم کے مؤرخ ہونے کی حیثیت سے شلیسنجر کی پریشانی سمجھ میں آنے والی چیز ہے۔ سارے اس بات کی پریشانی ہے کہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ میں نسلی اور مہاجر گروہوں نے امریکہ کے اس مرکزی واحدانہ تصور کو معرضِ بحث میں ڈال دیا ہے جس کی نمائندگی اس ملک کے عظیم کلاسیکی مؤرخ مثلاً بنکرافٹ، ہنری ایڈمز اور بالکل حال میں رچرڈ ہوفسٹیڈٹر کرتے رہے ہیں۔ یہ گروہ چاہتا ہے کہ تاریخ اس طرح لکھی جانی چاہیے کہ اس سے نہ صرف اس امریکہ کے خدوخال واضح ہوں جس کا خواب دیکھنے والے اور اس پر حکومت کرنے والے امرا اور جاگیردار تھے بلکہ اس امریکہ کی بھی نمائندگی ہو جس میں غلاموں، خادموں،

مزدوروں اور غریب مہاجرین نے اہم مگر اب تک غیر تسلیم شدہ رول ادا کیا۔ اس طرح کے لوگوں کے بیانات نے سرکاری داستان کی سست رفتار ترقی اور پر سکون تحسین کو تہ و بالا کرنا شروع کر دیا ہے۔ جنہیں ان خطبات و مقالات کے ذریعے خاموش کر دیا گیا تھا جن کا منبع واشنگٹن، نیو یارک کے سرمایہ کار حلقے، امریکی دانشگاہیں اور غرب اوسط (Middle West) کی بڑی صنعتی دولت تھی۔ یہ وہ سوال اٹھاتے ہیں، معاشرے کے بد قسمت افراد کے تجربات کو بیچ میں لے آتے ہیں اور کم تر درجے کے افراد و اقوام مثلاً عورتوں، ایشیائیوں، افریقی امریکیوں اور متعدد دیگر اقلیتوں کے جنسی اور نسلی مطالبات کو آواز عطا کرتے ہیں۔ کوئی شخص خواہ شلیسنگر کی دل سے نکلی ہوئی چیخ سے اتفاق کرے یا نہ کرے، اس کے نسبتاً تنگ زاویہ نظر سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کہ تاریخ نویسی کسی ملک کی تعریف کے ضمن میں شاہراہ کی حیثیت رکھتی ہے نیز یہ کہ کسی معاشرے کا تشخص بڑی حد تک تاریخی تعبیر کا فرض ہوتا ہے اور یہ تاریخی تعبیر بہت سے متقابل دعووں اور جوابی دعووں کے خطروں سے گھری ہوئی ہے۔ [تفکرات ص ۲۵۔۲۶۳ تحسین فراقی]

اسلام: سب سے بڑا خطرہ:

ہنٹنگٹن لکھتا ہے کہ "ہلالی شکل کا اسلامی بلاک .... افریقہ کے کوہانی مائل ابھار سے وسط ایشیا تک خونیں سرحدوں کا حامل ہے" یہ جغرافیائی بیانیہ نہیں بلکہ وہ ذہنی تصویر ہے جو صلیبی جنگوں میں شکست کے زخموں کے بعد مستشرقین کے ذریعہ مغرب کے قلب و روح میں پیوست کی گئی ہے اور جب تک اس کا انتقام نہ لیا جائے۔ تاریخ کا سفر ختم نہیں ہوگا، اسلام اور مغربی تہذیب میں کیا فرق ہے اس کی حقیقت صلیبی جنگوں کی تاریخ میں سلطان صلاح الدین ایوبی کا کردار ہے۔ عیسائیوں نے کس طرح مسلمانوں کو تہ تیغ کیا اس کے برعکس صلاح الدین مخالفین سے کس طرح پیش آیا یہ واقعات مسلم مورخین نے نہیں عیسائی و غیر مسلم مورخین نے بھی لکھے ہیں۔

مستقبل کی مغربی حکمت عملی:

اسلام اور مغرب میں تصادم کے ضمن میں ہنٹنگٹن کا نظریہ مغربی حکمت عملی کا اظہار ہے ہنٹنگٹن کا مضمون سب سے پہلے فارن افیئرز میں ۱۹۹۳ء شائع ہوا۔ جس نے توسیع کے بعد ضخیم کتابی شکل اختیار کی۔ فارن افیئرز ایک ایسا جریدہ ہے جس میں مستقبل کی امریکی حکمت عملی کے مختلف خاکے اور نقشے پیش کیے جاتے ہیں اور بحث و مباحثے کی روشنی میں خاص حکمت عملی کو حتمی شکل دی جاتی ہے۔ ہنٹنگٹن جیسے غیر معروف مفکر کے ایک مقالے پر دنیا بھر کے اخبارات و رسائل و جرائد میں ہزاروں صفحات شائع ہوئے تب بڑے بڑے عالمی مفکرین اس بات پر حیرت کا اظہار کر رہے تھے کہ آخر اس مضمون میں ایسی کیا خاص بات ہے جس پر اس قدر شور و غلغلہ برپا ہے۔ وہ خاص بات یہی تھی کہ بڑے بڑے مفکرین اس خیال کو جذب نہ کر سکے کہ اسلام اور مغرب میں مکالمہ ممکن ہی نہیں اور اس

تصادم کو فکری سطح پر قابل قبول بنانے اور ہنٹنگٹن کی جارحانہ حکمت عملی کے منفی و مثبت پہلوؤں کو دنیا بھر کے سامنے نمایاں کرنا ضروری تھا، اسی لیے اس مضمون کو خاص اہمیت اور شہرت دی گئی ساس مضمون پر عالمی شور و غوغا ایک دانستہ حکمت عملی کے تحت برپا کرایا گیا تاکہ اس نظریے کو جو ہنٹنگٹن کی امریکی حکمت عملی کے طور پر افغانستان اور عراق میں نافذ العمل ہونے والا تھا۔ دنیا کے لیے ایک مانوس تصور اور مانوس حادثہ بنا دیا جائے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ایڈورڈ سعید جیسا محقق و مفکر بھی مغرب و اسلام میں کوئی مغائرت محسوس نہیں کرتا اور اسے ہنٹنگٹن کی تحریر بچکانہ نظر آتی ہے اور وہ علمی دلائل سے اس کے پرخچے اڑانا چاہتا ہے۔ وہ اس خطرے کا ادراک ہی نہیں کرسکا جو چھ سال بعد قیامت کی صورت میں برپا ہونے والا تھا اور جس کی علمی بنیادیں ایک منصوبہ بندی کے تحت برنارڈ لوئس اور ہنٹنگٹن کی تحریروں کے ذریعے رکھی جا رہی تھیں۔ ایڈورڈ سعید کی سادگی کا اندازہ ان کی اس تحریر سے کیجیے۔

ایڈورڈ سعید کی سادگی:

میری رائے میں ہنٹنگٹن جو کہتا ہے اور جس طرح معاملات کو پیش کرتا ہے بہت گمراہ کن ہے کیونکہ لگتا ہے کہ وہ تاریخ یا ثقافتی تشکیلات کے محتاط تجزیے کے بجائے پالیسی سازی کے ضمن میں نسخے پیش کرنے میں زیادہ دلچسپی رکھتا ہے۔ [اصل حقیقت یہی تھی]

برنارڈ لوئس کی طرح سیمؤل ہنٹنگٹن غیر جانبدارانہ، بیانیہ اور معروضی تحریر نہیں لکھتا [لوئس کو غیر جانبدار کہنا بہت مشکل کام ہے لیکن عیسائیت اور یہودیت کے مابین تازہ مفاہمت کی کوشش کے پس منظر میں سعید کو یہی لکھنا چاہیے تھا] بلکہ وہ ایک مناظرہ باز ہے۔ جس کی خطابت بے عرف "سب کی جنگ سب کے ساتھ" جیسے پہلے سے پیش کردہ دلائل کو کثرت سے برتتی ہے بلکہ پہنچتا انھیں تسلسل عطا کرتی ہے۔ گویا تہذیبوں کے مابین ثالث یا تحریر بننے کے بجائے ہنٹنگٹن ایک جانبدار شخص نظر آتا ہے جو باقی تہذیبوں کے مقابلے میں صرف ایک نام نہاد تہذیب کا وکیل نظر آتا ہے۔ لوئس کی طرح ہنٹنگٹن بھی مسلم تہذیب کو یک جہتی انداز میں متعارف کراتا ہے گویا اس تہذیب کے متعلق جو چیز سب سے اہم ہے وہ ہے اس کی مفروضہ مغرب دشمنی، لوئس اپنے موقف کی تائید میں کم از کم دلائل تو پیش کرتا ہے مثلاً یہ کہ اسلام کبھی جدت سے آشنا نہیں ہوا، یہ کہ اس میں دین و سیاست کبھی علیحدہ نہیں ہوئے یا یہ کہ یہ دوسری تہذیبوں کی تفہیم کا اہل نہیں لیکن ہنٹنگٹن اس طرح کے کسی خرخشے میں نہیں پڑتا۔ لیکن کیا یہ اس دنیا کو جس میں ہم رہتے ہیں، سمجھنے کا بہترین طریق کار ہے؟ کیا بحیثیت ایک دانشور اور ماہر عالم کے یہ زیبا ہے کہ دنیا کا ایک سادہ اور سطحی سا نقشہ تیار کرکے اسے جرنیلوں اور غیر فوجی قانون سازوں کے ہاتھ میں ایک نسخے کے طور پر تھما دیا جائے تاکہ پہلے وہ اسے سمجھیں اور پھر اس پر عمل کریں؟ کیا یہ طریقہ کار در حقیقت تصادم کو طول دینے، اسے بڑا بنانے اور اسے گہرا بنانے کا باعث نہیں بنتا؟ یہ تہذیبوں کے تصادم کو کم کرنے میں کیا فرض بجا لاتا ہے؟ کیا ہم

تہذیبوں کے تصادم کے آرزومند ہیں؟ کیا مذکورہ طریقہ کار سے وطن پرستانہ جذبات کو اور نتیجتاً قوم پرستانہ قتل و غارت گری کو شہ نہیں ملتی؟ کیا ہم یہ پوچھنے میں حق بجانب نہیں: کوئی شخص ایسا کیوں کر رہا ہے؟ سمجھنے بوجھنے کے لیے یا عمل کے لیے؟ تصادم کے امکان کو کم کرنے کے لیے یا بڑھانے کے لیے؟ چنانچہ تہذیبوں کے تصادم کے بارے میں پڑھ کر ہم تصادم کے تجزیے سے اتفاق کرنے کے بجائے یہ سوال کرنے میں حق بجانب ہیں: تم تہذیبوں کو ایک بے لچک معاملے میں کیوں جکڑتے ہو اور پھر تم ان کے تعلق کو ایک بنیادی تصادم کے رنگ میں کیوں پیش کرتے ہو گویا ان کے مابین اخذ و جذب اور شیر و شکر ہونے کا عمل زیادہ دلچسپ اور اہم نہیں؟ [تاریخ نے ثابت کر دیا کہ تہذیبوں کے تصادم کا مقصد مستقبل کی غارت گری تھا]۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ایڈورڈ سعید جیسا عالم فاضل شخص بھی مغربی فکر و فلسفہ اور تہذیب کی اصل حقیقت، حیثیت اور ماہیت سے ناواقف ہے اسی لیے اسے امریکا اور مغرب کے وکیلوں کی جانب سے تصادم کا "رجز" پڑھنے والوں پر حیرت، تعجب اور تاسف ہوتا ہے۔ وہ کئی جگہ اس کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "امریکہ نے بھی اپنے کندھوں پر "انسانی فلاح کا بوجھ لے رکھا ہے" "ہم امریکی انسان دوستی پر مبنی جنگیں لڑتے ہیں۔ ہم دوسروں کے بھلے کے لیے بم چلاتے ہیں"۔ یہ سلسلہ ختم ہونا چاہیے۔ یہ وہی خبط ہے جس کے اسیر انیسویں اور بیسویں صدی میں برطانیہ اور فرانس وغیرہ تھے۔ کپلنگ کی شاعری White Man's Burden میں بیان کردہ نوادرات اور دوسری قوموں کے بارے میں Half Devil and Half Child جیسے تصورات کو ختم ہونا چاہیے۔ ایڈورڈ سعید مغربی فکر کی وحشت و بہیمیت سے صرف نظر کرتے ہوئے حسن ظن کا شکار ہو گئے ہیں۔

تہذیبوں کا تصادم: تازہ تشریح: جمہوریت مذہب ہے:

تہذیبوں کے تصادم پر مبنی فلسفے کی تازہ شرح رچرڈ رورٹی نے اپنی کتاب Achieving Our Country میں بیان کی ہے جس میں وہ جمہوریت پر عمل کو مغرب کی بنیادی ایمانیات کا حصہ بتاتا ہے اور اس کی عقلی دلیل دینے سے انکار کرتا ہے۔ وہ ولیم جیمس کے حوالے سے لکھتا ہے کہ جمہوریت ایک قسم کا مذہب ہے اور ہر مذہب کی طرح جمہوریت بھی اپنی ناکامی کے امکان کو ماننے سے انکاری ہے۔ [page 9]

مغربی عقلیت: جواز کی دلیل بے کار ہے:

وہ لکھتا ہے کہ مغرب اور امریکا کو اپنے علوم و فنون اپنی اقدار، جمہوریت و سرمایہ داری کی علمی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا خیال ترک کر دینا چاہیے کیونکہ اس قسم کے جواز کی اسے کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مغربی عقلیت کی برتری اور اس برتری کے جواز کے لیے یہی دلیل کافی ہے کہ وہ آج ایک غالب قوت ہے۔ وہ افسوس کرتا ہے کہ عام امریکی شہری امریکی اقدار اور امریکی نظام کے بارے میں شرمسار ہیں۔ وہ لکھتا ہے کہ مغربی اقدار پر

ایمان لانے کے لیے کسی علمی دلیل کی ضرورت نہیں" کیونکہ "ان معاملات کا تعلق دلیل سے نہیں ہے 196 بلکہ ایمانیات سے ہے اور ایمانیات کا مرتبہ یہ ہے کہ ان کو پرکھنے کے لیے کوئی غیر جانبدار اناشاوزموضی پیانہ ہو ہی نہیں سکتا۔ [p.13] وہ لکھتا ہے کہ امریکا دنیا کی وہ حقیقی ریاست ہے جس کا بنیادی مقصد صرف اپنی رضا اور خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ امریکا اپنے سوا کسی کی خوشنودی نہیں چاہتا حتی کہ اس کو خدائی خوشنودی بھی درکار نہیں ہے۔ ہم آج دنیا کی سب سے عظیم الشان طاقت اس لیے ہیں کہ ہم نے خدا کو بتا کر اس کی جگہ خود لے لی ہے ہم آج دنیا کی عظیم الشان طاقت اس لیے ہیں کہ ہم خود خدا بن گئے ہیں۔ [p.22] وہ لکھتا ہے کہ حق اور سچائی اور اچھائی وہ ہے جس کے ذریعے انسان کی خواہشات کی تکمیل بہتر سے بہتر طریقے پر ہو سکے۔

تمام اسلامی جدیدیت پسند جمہوریت، بنیادی حقوق کی تائید وحمایت کے ذریعے اسی فلسفے کی تصدیق وتوثیق کر رہے ہیں۔ ہنگٹنن کا دعوی ایک بے بنیاد دعوی ہے۔ کیونکہ مغربی تہذیب کی شکست کا پہلا مرحلہ ماڈرن ازم سے پوسٹ ماڈرن ازم تک کا سفر ہے جب عقلیت پرستی عالمگیر اقدار [یونیورسل ویلیوز] عالمی قوانین، عالمی روایات [یونیورسل ٹریڈیشنز] سے ایمان اٹھ گیا ہے اور عقل حقیقت تک پہنچنے کا ذریعہ نہیں رہی، عقل کی بلا کتیں تحدیدات اور تناقضات اور تضادات مغرب پر عیاں ہو گئے ہیں۔

مغرب کو شکست ہو چکی ہے:

نشاۃ ثانیہ کی تحریک نے دعوی کیا تھا کہ وہ عقل کی بنیاد پر ایسے قوانین دریافت کر سکتی ہے جس کے نتیجے میں کسی ذی عقل کے لیے مغربی نظام اقدار وروایات کو مسترد کرنا ناممکن ہو جائے گا اور یہی عقلی نظام عالمگیری نظام ہوگا۔ پس جدیدیت پسند مفکرین Post Modernist Thinkers نے ثابت کر دیا کہ یہ دعوی جھوٹا ہے لیکن مابعد جدیدیت کے علمبردار مسترکا کنات، آزادی کے بنیادی آدرشوں سے دستبردار نہیں ہوئے۔ ان کا کہنا ہے کہ آزادی، جمہوریت سرمایہ داری کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے۔ ان معنوں میں مغرب کو شکست ہو گئی کہ وہ اپنے وجود کا علمی، عقلی، عملی، فلسفیانہ جواز فراہم نہیں کر سکا۔ پس جدیدیت پسند مفکرین کا موقف یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے کہ ہم کیوں سرمایہ دارانہ نظام کو بالادست کرنا چاہتے ہیں البتہ ہم اس پر مجبور ہیں کہ پورے عالم پر آزادی اور سرمایہ داری کو غالب کر دیں یہ عقل کا تقاضا نہیں بلکہ جو کچھ ہم کہتے رہے ہیں اس کا لازمی ذریعہ اظہار ہے ہمارے پاس سرمایہ دارانہ نظام، آزادی کے سوا کوئی اور متبادل نہیں ہے۔

اس صورت حال میں امام غزالی عالم اسلام کے لیے امید کی کرن بن کر طلوع ہوتے ہیں۔

The Ghazalian position is at loggerheads with these apologetic attitudes. It does not see the West as a morally,

epistemologically or ontologically superior civilization. There can be no 'scientific' proof of the superiority of Western thought. The Ghazalian approach does not see any of the streams of Western civilization as the continuation of the spirit of Islam.

ہنٹنگٹن کا فلسفہ: اس کے نتائج:

فرانسس فوکو یاما کے End of History کے فلسفے کو تسلیم کرنے کا مطلب دستوریت، آزادی، سرمایہ داری، جمہوریت، لبرل ازم، مساوات، کو عالمی مسلمہ غیر متنازعہ اقدار (Narratives) تسلیم کرنا ہے۔ ایک ایسا نظام اقدار جس کا کوئی متبادل نہیں جس سے فرار ممکن نہیں، اور ان اقدار کے سوا دوسری اقدار ناقابل قبول نہیں، اس فلسفے کے مداحین کے طور پر برنارڈ لوئس اور ہنٹنگٹن تہذیبوں کے مابین تصادم کو لازمی سمجھتے ہیں جس تہذیب کے پاس حق ہے وہی تہذیب زندہ رہے گی۔ اور اب آخری قطعی اور عالمی حق صرف مغرب کے پاس ہے لہٰذا صرف مغربی تہذیب کو زندہ رہنے کا حق حاصل ہے یہی تہذیب فائق، برتر، غالب، حاکم، نافذ اور رائج ہونے کا حق رکھتی ہے باقی تہذیبیں مطیع اور فرماں بردار بن کر اس تہذیب کا جزو بن جائیں یا اس میں ضم ہو جائیں یا جنگوں کے ذریعے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں اس فکر و نظر کو تسلیم کر کے مغرب اور مشرق کے مفکرین اس بات کا دعویٰ کر رہے ہیں کہ دستوری جمہوریت پر پوری دنیا ایمان لا چکی ہے بنیادی حقوق کو سب نے مسلمہ اقدار تسلیم کر لیا ہے لیکن کوئی یہ نہیں بتاتا کہ یہ تمام فلسفے کہاں سے آئے ہیں، دنیا کو ایسی مستند اور مسلمہ اقدار کس نے مہیا کی ہیں جو ناقابل تغیر ہیں۔ کوئی یہ سوال پوچھنے پر یہ نہیں بتاتا کہ اگر دستوری جمہوریت پر پوری دنیا ایمان لا چکی ہے تو کیا دستوری جمہوریت کا وجود و ارتقا فطری طور پر ہوا ہے۔ کیا سرمایہ دارانہ نظام فطری طور پر قائم ہوا ہے، کیا مارکیٹ، بینک اور دستوری ریاست دستوری جمہوریت خود بخود فطری طور پر وجود میں آ گئے اگر ایسا ہے تو واقعی تاریخ اختتام پذیر ہو چکی ہے لیکن اصلاً ایسا نہیں۔ قرآن کی آمد کے بعد تاریخ کا سفر ختم ہو چکا ہے۔ خیر وشر، حق و باطل کے جو پیمانے قرآن نے دے دیے وہ قیامت تک کے لیے ہیں وہ ابدی ہیں ان کے سوا کسی پیمانے، کسی قدر، کسی اصول کو ابدیت حاصل نہیں ہے، انہی معنوں میں مغرب اور اسلام میں فکر و نظر کے بنیادی اختلافات ہیں جو علمیاتی ہیں اور محض گفتگو کے ذریعے حل نہیں ہو سکتے۔ جمہوریت، دستوری جمہوریت و ریاست وغیرہ مغربی افکار اور دعوے ہیں مسلمہ حقیقت نہیں۔ علی محمد رضوی اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے بتاتے ہیں:

However this is too simplistic a genealogy of the emergence of constitutional democracy -

اقبال کی جدیدیت و خطبات کے ضمن میں، ایک نادر علمی بحث

خواجہ عبدالوحیدؒ: صاحب سیف و قلم کا روزنامچہ

خطبات، اقبالیات اور سید سلیمان ندویؒ

سید خالد جامعی

اردو میں روزنامچہ نگاری:

روزنامچہ کیا ہے؟ اس کے فوائد کیا ہیں؟ کیا اردو زبان میں روزنامچے کی روایت بہت قدیم ہے یا اس کے آغاز کو محض چند عشرے گزرے ہیں؟ کیا اردو کے قدیم روزنامچے تلف ہوگئے یا طاقِ نسیاں کی زینت بنے رہے ان سوالات پر جب کوئی محقق غور کرتا ہے تو اسے ان سوالوں کے مبہم، غیر تسلی بخش ناکافی جوابات ملتے ہیں۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں روزنامچے کی روایت پر کوئی اہم تحقیقی پیش رفت نہیں ہوسکی۔ عام طور پر خواجہ حسن نظامی اور مولوی مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے معروف ہیں اور انہی روزنامچوں کو اردو زبان میں روزنامچہ نگاری کا نقطۂ آغاز سمجھا گیا ہے لیکن یہ نقطۂ نظر تاریخی طور پر درست نہیں، اردو میں روزنامچہ نگاری کی روایت نہایت قدیم ہے جس کی بازیافت پر توجہ کی ضرورت ہے۔ مظہر علی سندیلوی کے روزنامچے کی شہرت کا ایک اہم سبب اس کی ضخامت تھی۔ ۹۹۷ صفحات پر مشتمل یہ روزنامچہ جو ۱۹۱۱ء میں تکمیل پذیر ہوا، نور الحسن ہاشمی نے تلخیص و تعارف کے ساتھ "ایک نادر روزنامچے" کے نام سے شائع کیا۔[۱]

اس روزنامچے کے تعارف میں نور الحسن ہاشمی نے لکھا تھا کہ

> "یہ بیک وقت ایک تاریخ بھی ہے ایک سوانح عمری بھی اور زندگی کی داستان بھی"[۲]

روزنامچہ کیا ہے؟ روزنامچہ نگاری کیا ہے؟

روزنامچہ نگاری کی حقیقی ضرورت و اہمیت کا اندازہ خواجہ حسن نظامی کی درج ذیل عبارت سے ہوتا ہے:

> "میں نے جب کبھی اپنی زندگی کا روزنامچہ لکھا تو محسوس ہوا گویا اپنے عرفانِ حق کا

کھاتہ لکھ رہا ہوں کیوں کہ جب اس کو دیکھتا ہوں آمد و خرچ کا حساب یاد آتا ہے۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ روزنامچہ نگار اپنی ہستی کے عرفان کا کھاتہ ہی نہیں لکھتا بلکہ اپنے عہد، معاشرت، ماحول، زمانے، ثقافت کا عرفان بھی ہمیں عطا کرتا ہے۔ روزنامچہ نگار اپنا روزنامچہ اس یقین کے ساتھ قلم بند کرتا ہے کہ یہ صفحات روئے زمین پر اس کے سوا کوئی نہیں پڑھے گا۔ لہٰذا یہ روزنامچے ایسے لافانی حقائق، ابدی سچ، بے لوث سچائی، بے چون و چرا صداقتوں پر مشتمل ہوتے ہیں جن پر کوئی انگلی نہیں اٹھا سکتا۔

ان روزنامچوں میں صرف روزنامچہ نگار کی باطنی حالت ہی تحریر نہیں ہوتی بلکہ اس کے خاندان، اس عہد اس زمانے اور اس خطے کے نفسانی، روحانی، جسمانی، انسانی معاملات بھی بلا کم و کاست تحریر کیے جاتے ہیں۔ بے شمار روزنامچہ نگار اپنی زندگی میں روزنامچے تلف کرتے رہتے ہیں اور لکھتے رہتے ہیں لیکن انھیں ہمیشہ روزنامچے تلف کرنے کی مہلت نہیں ملتی کیونکہ اچانک مہلت عمل ختم ہو جاتی ہے اور یہ روزنامچے ردی والوں کے ذریعے مورخین کی دسترس میں آ جاتے ہیں۔ روزنامچہ نگاری روزنامچہ نویس کی ذات کی تطہیر کا عمل بھی ہے، اس کے نفس کا تزکیہ اور تصفیہ بھی بلکہ اس عہد اس خاندان اور اس دور کا آئینہ بھی لیکن روزنامچہ نگار نہ مصلح مشفق بننا چاہتا ہے نہ واعظ مجریاں وہ ایک ناظر کی حیثیت سے جو کچھ دیکھتا، سنتا، محسوس کرتا ہے خون دل میں انگلیاں ڈبو کر آنسوؤں کے موتیوں سے اپنی تنہائیوں میں اجالا کر کے ان تجربات، مشاہدات، حادثات کو قلم بند کر دیتا ہے۔

روزنامچے، روزنامچہ نگاری: ردی والے

یہ موضوع بھی نہایت دلچسپی کا حامل ہے کہ روزنامچہ نگار کے گھر والے اپنے عزیز کی نجی باتوں کو عام کیوں کر دیتے ہیں؟ وہ ان روزنامچوں کو تلف کیوں نہیں کرتے؟ اس سوال کی مختصر تحقیق مختلف تہذیبوں اور معاشروں میں کی گئی تو یہ انکشاف ہوا کہ ردی والے ان روزنامچوں کو محفوظ کرنے میں کلیدی کردار ادا کرتے ہیں، گھر والے یہ روزنامچے ردی سمجھ کر پھینک دیتے ہیں انھیں اندازہ ہی نہیں ہوتا کہ جو سامان پھینکا جا رہا ہے اس میں ان کی رسوائی اور عزت افزائی کے کتنے سامان ارزاں ہیں۔ اہل علم انھیں ردی والوں سے خرید لیتے ہیں۔ علم و تحقیق کے فروغ میں ردی والوں کا کردار مغرب و مشرق میں نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ افسوس کہ اس جانب سنجیدگی سے توجہ نہیں دی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ "روزنامچہ ایک ایسی چیز ہے جو آپ بیتی، تاریخ نویسی، تاریخ نگاری، صحیفہ نویسی، صحافت نگاری کے قریب تر پہنچتی ہے اور اس میدان میں سفرنامہ، رپورتاژ، خطوط، ملفوظات وغیرہ کوئی اس کا ہم سر نہیں ہے۔ روزنامچہ ایک حد تک غیر مدون خود نوشت اور تاریخ کا خاکہ کہا جا سکتا ہے۔

آپ بیتی، خطوط نگاری روزنامچے میں فرق:

روزنامچہ فی الحقیقت عرفان ہستی کا یومیہ زائچہ ہوتا ہے جو ہر قسم کے تصنع، ملمع کاری، بناوٹ، نمود

نمائش سے پاک ہوتا ہے اسے ہم خالص تاریخ بھی کہہ سکتے ہیں جس میں ایک فرد نہ صرف اپنی ذات کا حساب کتاب رکھتا ہے بلکہ اپنے عہد اپنے معاشرے اپنے زمانے کی تاریخ معاشرت تمدنی حوادث، آفات، واقعات، سانحات کا دفتر بھی محفوظ کرتا ہے۔ عموماً روزنامچہ اشاعت کی غرض سے نہیں لکھا جاتا اس کا مقصد اپنی وضاحت کرنا برتری جتانا دوسروں کی رہبری کرنا بھی نہیں ہوتا اس کا محرک محض ایک خلش، اضطراب، بے چینی اور روح بے تابی ہے جو روزنامچہ نگار کے قلم کو متحرک کرتی ہے۔

کیا روزنامچہ آپ بیتی، سفرنامے، رپورتاژ، خطوط، ملفوظات، وقائع نگاری، تاریخ نویسی، تاریخ نگاری، تحیذ نگاری سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے؟ کیوں کہ روزنامچے کا زندگی سے بڑا گہرا تعلق ہے اس کا تسلسل اور بے ربطی اور نشیب و فراز بھی زندگی کی طرح ہوتے ہیں۔ یوں تو خطوط بھی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں مگر خطوط لکھتے وقت مخاطب کا تصور ذہن میں ضرور رہتا ہے لیکن روزنامچے میں لکھنے والا خود اپنی ذات سے مخاطب ہوتا ہے اس لیے آخر الذکر سے صحت بیان کی زیادہ توقع کی جاتی ہے۔[۴]

عموماً آپ بیتی، تاریخ نگاری، خود نوشت، خاکہ نگاری میں بہت سے واقعات ذہن سے اتر جاتے ہیں یا ان کی اصل تصویر نہایت دھندلا جاتی ہے۔ اور واقعات کچھ سے کچھ شکل اختیار کر لیتے ہیں مطالب بدل جاتے ہیں تفصیلات مٹ جاتی ہیں جزئیات محو ہو جاتی ہے یا قصداً بہت سے واقعات نظر انداز کر دیے جاتے ہیں۔ یا انھیں اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی اصل حیثیت کھو دیتے ہیں لیکن روزنامچہ ان عیوب و نقائص سے پاک ہوتا ہے کیوں کہ "ان میں روزانہ حرکات اور واقعات جو لکھنے والے کے مشاہدے یا علم میں آتے ہیں قلم بند کیے جاتے ہیں اس کی خوبی یہی ہے کہ یہ ذاتی تاثرات کو جبکہ وہ ابھی تازہ ہی ہوتے ہیں قلم بند کر کے اسے ایک نعمت غیر مترقبہ کے طور پر محفوظ کر لیتے ہیں اور تجربات مابعد کی روشنی میں ان کے از سر نو جانچنے کا موقع دیتے ہیں۔[۵]

خطوط میں کوئی مخاطب ہوتا ہے لہٰذا مکتوب نگار اس کی شخصیت، مزاج، عادات نفسیات کے مطابق بہت سی باتوں کو حذف کر دیتے ہیں یا قصداً بیان نہیں کرتے۔ یا گریز کا ایسا رویہ اختیار کرتے ہیں کہ اصل بات کہیں سے کہیں پہنچ جاتی ہے یا رنگین بیان سے اس معاملے کی اصل صورت بگڑ جاتی ہے آپ بیتی شخصیت کی جلوہ نمائی ہوتی ہے لہٰذا آپ بیتی لکھنے والے عموماً دروغ گوئی کو خوشگوار معصیت تصور کر لیتے ہیں اور اس تصور کو عقیدے کے طور پر برتتے ہیں۔ آپ بیتی بغرض اشاعت لکھی جاتی ہے اور اشاعت کی نیت اس کے خلوص کو کم کر دیتی ہے۔ آپ بیتی لکھنے کا مقصد اپنی وضاحت کرنا۔ برتری جتانا یا دوسروں کی رہبری کرنا ہو سکتا ہے۔[۶]

روزنامچوں کی اہمیت: ضرورت

روزنامچے سے ہم کسی بھی عہد کی روزانہ زندگی، زندگی کے معمولات اس میں برپا تغیرات کی جھلک صدیوں بعد بھی دیکھ سکتے ہیں۔ Arthur نے اپنی کتابوں They year of endurance [1]،

The Years of victory[2]، The age of elegance [3] میں اپنے عہد کے بے شمار مطبوعہ غیر مطبوعہ قلمی روزنامچوں سے استفادہ کیا ہے۔ روزنامچوں کے ذریعے صدیوں پہلے گزرے ہوئے زمانے کی معمولی باتیں، جزئیات کی تفصیل، نہایت باریک بینی سے معلوم کر سکتے ہیں۔ علم بشریات اور عمرانیات و سماجیات کے ماہرین کے لیے ان روزنامچوں کے بغیر عہد ماضی کا علمی تجزیہ ممکن نہیں ہے۔

Parson wood forde کے روزنامچے کے بغیر ہم اٹھارہویں صدی کی متوسط اشرافیہ کے حالات، ماحول، اخلاقیات، تہذیب، معاشرت سے آگاہ نہیں ہو سکتے۔ Parson Teonges کے روزنامچے سے ہمیں سترہویں صدی کی سمندری زندگی کے اسرار و رموز سے واقفیت حاصل ہوتی ہے۔ اس عہد میں سپاہی سمندروں میں کس طرح جنگ لڑتے تھے اور کس طرح شب و روز بسر کرتے تھے۔ ان کی امیدیں، تمنائیں، دعائیں، آنکھ کے آنسو، دل کی دھڑکنیں، آنکھوں کے حلقے، مچلتے ہوئے ہونٹ، ابلتے ہوئے جذبات، کس طرح ذات کی تنہائیوں میں اجالا کرتے تھے۔

Edard VI:The Chronical of Edward VI کا روزنامچہ ۱۵۴۷ء سے ۱۵۵۳ء کے حالات سے آگاہ کرتا ہے۔ اس عہد کی جنگیں قتل و خون اور اس کی شخصیت کے اسرار و رموز اس کے بین السطور میں جھلکتے ہیں۔ یہ انگریزی زبان کا قدیم ترین روزنامچہ ہے۔ James Boswell کا روزنامچہ Journal of a Tour to the Hebrides اور Macready کا روزنامچہ اپنے ہیرو اور اپنی ذات کے گرد گھومتے ہیں، ایک روزنامچہ میں دوسرے کی پرستش ہے دوسرے روزنامچے میں اپنی ہی پرستش کا صور پھونکا گیا ہے۔

Dr laver Morris ایک مقامی معالج تھا اس کا روزنامچہ طبی اور عمومی نوعیت کی نہایت قیمتی معلومات مہیا کرتا ہے۔ اس عہد کی بیماریاں علاج کے سادہ طریقے، صحت یابی کی شرح اور بیماروں کی اوسط تعداد ہمیں معلوم ہو جاتی ہے۔

Francis Kilvert کے روزنامچے سے وکٹورین دور کی بازیافت ہوتی ہے۔

King Edward اور Queen Victoria کے روزنامچے ہمیں اس عہد کی تاریخ، اخلاقیات، ثقافت کے مظاہر، اور متقدر طبقوں کے طرز زندگی و طرز معاملات سے آگاہ کرتے ہیں۔ HumphryDavy کا روزنامچہ جس میں نائٹرس اوکسائیڈ کے ابتدائی تجربات کی جزئیات تک محفوظ ہیں۔ سائنسی ایجادات کے حیرت انگیز طریقوں سے آگاہ کرتے ہیں۔ Fanny Burney کا روزنامچہ جو Geoge III کے دربار میں گزارے ہوئے دنوں کی یادوں کو تازہ کرتا ہے۔ سلاطین اور شہنشاہوں کے نازنخروں اور غیر فطری زندگی سے واقف کراتا ہے۔

General Godons کا روزنامچہ جو خرطوم سے چند روز پہلے لکھا گیا۔ بتاتا ہے کہ ایک بہادر

سیاسی سوجھ بوجھ کے سائے میں بھی اپنے معمولات ترک نہیں کرتا اور شب و روز معمول کے مطابق بسر کرتا ہے۔ بلنٹ کا روزنامچہ جاسوسی کی جدید شکلوں سے آگاہ کرتا ہے۔ بلنٹ برطانوی حکومت کے ایجنٹ کے طور پر عالم اسلام کے اہم لوگوں سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا جس میں جمال الدین افغانی، محمد عبدہ وغیرہ شامل تھے۔ بلنٹ کی اہلیہ بھی جمال الدین افغانی سے مانوس تھیں اور ان کے تعلقات گھریلو نوعیت کے بھی تھے۔ جمال الدین افغانی سفر ترکی، مہدی سوڈانی کے محاصرے سے جنرل گورڈن کی رہائی کے سلسلے میں لنٹ کا روزنامچہ اہم معلومات فراہم کرتا ہے۔ یہ روزنامچہ عالم اسلام کی اہم شخصیات کی گتھی کھولنے کے لیے کافی ہے۔

عمدہ روزنامچے کی خصوصیات:

Vicent Waite نے ایک عمدہ روزنامچے کی خصوصیات بتاتے ہوئے لکھا ہے:

In a good diary the more the writer reveals about himself the more we are interested.

عمدہ روزنامچہ نگار وہ ہے جو

Can reveal wonderful surprising and interesting adventure hopes, tears, reflections and dislikes to nobody.

A good diary does not need to be written in a literary style.

It need not even "Literature" It shall shown the leaving personality of the diarist.

مشہور زمانہ برطانوی سپہ سالار General Gordon خرطوم میں مہدی سوڈانی کی سپاہ کے ہاتھوں محصور ہونے پر مجبور ہو گیا تھا۔ محصوری کے ان دنوں میں اس نے روزنامچہ نگاری کا کام تسلسل سے جاری رکھا۔ روزنامچے کے آخری ورق پر ۱۴ دسمبر ۱۸۸۵ء کی تاریخ درج ہے۔ محصوری کی حالت میں ہی اس کا انتقال ہوا۔

The Diary of a Dean اپنی نوعیت کا واحد روزنامچہ ہے جو کیمبرج کے پروفیسر William Ralph نے تحریر کیا اور ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد خود شائع کیا۔

روزنامچہ نویسی کا جواز: والٹر اسکاٹ

روزنامچے کی اہمیت کا اندازہ سر Walter Scolt کے درج ذیل بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ چوالیس سال کی عمر میں جب اس نے کتاب زندگی کا پہلا روزنامچہ لکھا تو تاسف، دکھ اور دردکی یادوں نے اس کو جکڑا احاطہ کر لیا۔ وہ نہایت تجسس سے لکھتا ہے۔

I have all my life regretted that I did not keep a regular Journal I have my

selflost recollection of much that was interesting and I have deprived my family and the public of some curious information by not carrying this resolution into effect.

والٹر اسکاٹ کے اس قول سے زیادہ دکھ ہمیں ان روزنامچوں کا ہے جو لکھے گئے لیکن محفوظ نہ کیے جا سکے یا ابھی تک کتب خانوں کی زینت ہیں۔ یہ روزنامچے ہمارا اجتماعی ورثہ ہیں اور اس ورثے سے کسی کو محروم نہیں ہونا چاہیے۔ یہ ہماری تاریخ، تہذیب، مذہب، ثقافت کی بے لوث، پرخلوص اور سچی علامتیں ہیں جن سے ہم تاریخ کے مختلف ادوار میں اپنے وجود کی افادیت کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

روزنامچہ خود کلامی کی اعلیٰ ترین شکل:

روزنامچہ دراصل مجلس خلوت ہے، لیکن جلوت کے عیب سے خالی ہے یہ ایک آئینہ ہے جس میں روزنامچہ نگار کی شخصیت اس سے ہم کلام ہوتی ہے یہ خود کلامی کی اعلیٰ ترین شکل ہے جس کے ذریعے روزنامچے کے مباحث اور متن کے ذریعے بے شمار لوگ نہ صرف خود کلامی کی کیفیت کا صدیوں بعد بھی نظارہ کرتے ہیں بلکہ خود کلامی کا حصہ بن جاتے ہیں اور اس عہد میں اپنے آپ کو چلتا پھرتا محسوس کرتے ہیں جو تاریخ کے دریچوں میں ہمیشہ کے لیے کھو گیا ہے اور جس کی بازیافت تا قیامت بھی امکان نہیں۔

دلچسپی، جزئیات نگاری، قلندری، بے ساختگی، شگفتگی، چٹخارہ، برجستگی، بے لوثی، اور بے تکلفی روزنامچہ نگاری کے بنیادی خواص ہیں جس لمحے روزنامچہ نگار کو یہ اندازہ ہو کہ اس کی تحریر کوئی پڑھے گا اسی لمحے روزنامچہ کی تمام خصوصیات رخصت ہو جائیں گی۔ لیکن ایسی چند مثالیں موجود ہیں جب روزنامچہ نگار نے اشاعت کے ارادے سے روزنامچہ لکھا اور اس کے خصائص بھی برقرار رکھے۔ روزنامچے کا اصل حسن اخفاء ہے، یہ یقین کہ روزنامچے اور روزنامچہ نگار کے درمیان کوئی تیسرا شخص حائل نہیں حتیٰ کہ اس کے گھر کے قریب ترین لوگ بھی اس کے لیے بعید ترین بن جائیں تب ہی سچا روزنامچہ لکھا جاتا ہے۔ ایسا روزنامچہ لکھنا بہت مشکل ہے کہ جسے لکھنے والا اپنے قریبی لوگوں کو دکھانے میں تامل نہ کرے۔ واضح رہے کہ یہ نقطہ نظر صرف تہذیب جدید کے روزنامچوں کے لیے کفایت کرتا ہے اور تہذیب قدیم کے صرف ان روزنامچوں کے لیے جن کے لکھنے والے فسق و فجور کو جائز سمجھتے تھے اور خواہش نفس کے اللہ کی پرستش کے بدترین شرک میں مبتلا تھے۔

مذہبی تہذیبوں میں ایسے روزنامچوں کی روایت ملتی ہے جہاں روزنامچہ نگار اخفاء پر اصرار نہیں کرتے، کیونکہ یہاں فرد کا ظاہر اور باطن ایک ہوتا ہے۔ آخرت کا احساس اس فرد کے ظاہر و باطن میں حیرت انگیز مطابقت پیدا کر دیتا ہے لیکن سترہویں صدی کے بعد لکھے گئے روزنامچوں کا بنیادی وصف اس کا اخفاء ہے۔ روزنامچہ نگار اپنی شریک زندگی کی بھی شرکت روزنامچہ پڑھنے میں گوارا نہیں کرتا، سترہویں صدی کے بعد نجی اور ازدواجی زندگی کے دو

متوازی تصورات [Public and Private Life] نے ظاہر و باطن کی تفریق بہت بڑھا دی ہے۔ مختلف تہذیبوں میں روزنامچہ نگاری کے تقابلی مطالعے سے اس بیان کی تصدیق کی جا سکتی ہے۔ انگریزی میں ایولن [Evelyn] اور پیپس [Pepys] اور اردو میں ظہیر علی سندیلوی کے روزنامچے اس کی عمدہ مثال ہیں۔

مغرب میں روزنامچہ نویسی کی تاریخ:

انگریزی روزنامچہ: Diary Jounral

انگریزی میں روزنامچے کو Diary اور Journal بھی کہا جاتا ہے۔ ڈائری لاطینی لفظ dies سے اور journal فرانسیسی لفظ jour سے مشتق ہے۔ دونوں روزنامچے کے مفہوم کو ادا کرتے ہیں عموماً یہ سمجھا جاتا ہے کہ ڈائری نجی امور سے متعلق ہوتی ہے اور جرنل دفتری سرکاری دستاویزات کا مجموعہ ہوتا ہے لیکن عملاً انگریزی میں ڈائری اور جرنل دونوں مفہومات کا احاطہ کرتے ہیں اور دونوں کی خصوصیات ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتی ہیں۔ B.R. Haydon کا Journal اور James Boswell's کا London Jounral روزنامچوں کی تعریف پر پورا اترتے ہیں۔[۷]

جرنل اور ڈائری میں فرق:

جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ جرنل سرکاری دستاویزات یا دفتری دستاویزات کے باقاعدہ اندراج کا ثبوت ہے اس موقف کی تردید کے لیے مشہور سائنس دان Charles Darwen کا جرنل کافی ہے۔ اس جرنل کا نام Journal of Researches into the natural History and Geology of the countries visited during the voyage of H.M S. Beagle. ہے۔ اس جرنل کا نام بظاہر خشک سائنسی مضامین کی ترتیل کا تاثر قائم کرتا ہے لیکن Lawrene کے الفاظ میں:

It often includes delightful and amusing accounts of his own personal experiences during the voyage.

Pepy اور Evelyn کے روزنامچے Great Plauge اور Great Fire of London اپنے تاثرات واقعات کے باعث تاریخی اہمیت کی دستاویز بن چکے ہیں۔

انگریزی میں روزنامچہ نویسی کی توانا روایت: اہم روزنامچے

انگریزی میں روزنامچہ نویسی کی روایت نہایت مستحکم ہے۔[۱] انگریزی زبان کا پہلا روزنامچہ [۱۵۴۷ء۔۱۵۵۳] King Edward VI کا The Chronical of Edward VI ہے۔[۲] دوسرا اہم روزنامچہ [۱۷۰۶ء سے ۱۶۲۰ء] John Evelyn کا The Diay of John Evely ہے۔[۳] تیسرا اہم روزنامچہ [۱۶۹۰ء۔۱۶۲۱ء] Henry Teonge کا Diary of Henry Teonge ہے۔[۴] چوتھا اہم

روزنامچہ [۱۶۳۳ء–۱۷۰۳ء] Samuel Pepy کا Diary of Samnel Pepys ہے۔ [۵] پانچواں اہم روزنامچہ [۱۶۶۹ء–۱۷۲۶ء] Doctor Claver Morris کا The Diary of a West Country Physician ہے۔ [۶] چھٹا روزنامچہ ۱۷۰۷ء–۱۷۵۴ء Henry Fiedding کا The Journal of a Voyage to Lisbon ہے۔ [۷] ساتواں روزنامچہ [۱۷۴۰ء–۱۷۹۵ء] James Boswell کا The Journal of a Tour to the Hebrides ہے۔ [۸] آٹھواں روزنامچہ [۱۷۴۰ء–۱۸۰۳ء] Wood Forde کا Diary of a Country Parson ہے۔ [۹] نواں روزنامچہ [۱۷۵۲ء–۱۸۴۰ء] Fanny Burney کا The Diaries of Fanny Burney ہے۔ [۱۰] دسواں روزنامچہ اسکاٹ لینڈ کے سیاح Mungo Park کا The Travels of Mungo Park ہے۔

انگریزی روزنامچہ نگاروں کے پیشے:

انگریزی میں اس تسلسل و تواتر کے ساتھ روزنامچے لکھے گئے ہیں کہ حیرت ہوتی ہے لکھنے والوں میں صرف بادشاہ، درباری، خوشامدی، ادیب، شاعر، مصور، مصنف، معلم، سپاہی، فوجی افسر، اداکار، مسخرے ہی نہیں بڑے بڑے سائنس داں، سیاستداں، پادری، مذہبی مفکرین، صحافیین، مہم جو، کسان، لنگڑے، جادوگر، گھریلو خواتین، عام لوگ، اعلیٰ سرکاری عہدیداران، سپہ سالار، فوجی، مفکر، امیر لوگ، ادنیٰ خاندان کے افراد، متوسط طبقے سے وابستہ لوگ، مختلف پیشوں کے افراد، معلم، مصنفین، مخنث، مسخرے، اچھال چھکا قسم کی عورتیں، عزت دار خواتین، بیگمیں، کرشماتی، بازاری ہر طرح کے لوگ شامل ہیں۔ سائنس دانوں کے روزنامچوں میں [۱۷۷۸ء–۱۸۲۹ء] Humphsy Davy کی ڈائری Researches Chemical and Philosphical اہمیت کی حامل ہے۔ ڈیوی اپنی ایجاد Miner's Safety Lamp کی وجہ سے مشہور ہے۔ نائٹرس اوکسائیڈ کے موجد ڈیوی کا روزنامچہ ان دنوں اور ان لمحات کی نقش گری کرتا ہے جب ایک تاریخ ساز ایجاد ظہور پذیر ہو رہی تھی۔ یہ لمحات کتنے عجیب اور کتنے قیمتی ہوں گے اس کا اندازہ اس روزنامچے کے مطالعے سے کیا جا سکتا ہے۔

Laughing Gas کے موجد کا روزنامچہ:

نائٹرس اوکسائیڈ کی اتفاقی حادثاتی ایجاد نے عصر حاضر میں بے ہوشی کی دواؤں Anaesthetic Medican کی صنعتی ترقی کو ممکن بنایا۔ ڈائری سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس دوا سے مریض کا درد دور تو ختم ہو جاتا تھا لیکن رونا، کراہنا، بلکنا، چیخنا چلانا مریض ہنسنے مسکرانے لگتا۔ اس کے ہونٹوں پر ملکوتی مسکراہٹ بکھر جاتی لہٰذا اسے Laughing gas کا نام دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی میں نائٹرس اوکسائیڈ دانت کے شدید درد میں مبتلا مریضوں کے لیے مسکن دوا کا کام دیتا تھا۔ لوگ روتے ہوئے آتے اور ہنستے ہوئے جاتے تھے۔

انگریزی کے سب سے عمدہ روزنامچے:

انگریزی زبان کا سب سے عمدہ روزنامچہ Samuel pepys کا ہے جو ایک عمدہ ناول سے بھی عمدہ ہے اس روزنامچے میں اس کی شخصیت، افکار، احوال، لباس، رہن سہن، عادت اطوار کے ساتھ ساتھ اس کے گناہوں کی داستان اور اعتراف گناہ کے مرحلے بھی بیان ہوئے ہیں۔ صرف یہی نہیں اس عہد کے بڑے بڑے لوگوں کی خفیہ زندگی کے خوفناک گوشوں کی بھی نقاب کشائی کی گئی ہے اور روزنامچہ نگار نے اپنی ذات کے عیوب بھی بلا تردد بیان کر دیے ہیں۔ زبان و بیان کے اعتبار سے بھی یہ شاہکار روزنامچہ ہے۔

روزنامچے کا مقصد: ورثا کی کفالت

Heny.Fidlding کا روزنامچہ روزنامچوں کی تاریخ میں منفرد شے ہے اور واحد روزنامچہ ہے جس کے لکھنے کا مقصد موت کے بعد اس کی اشاعت تھی تاکہ اس کے ورثاء اس ذریعے سے مالی آسودگی حاصل کر سکیں۔ روزنامچے کے بین السطور سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اشاعت کی خاطر طول بیاں سے کام لے رہا ہے۔ یہ روزنامچہ اس عہد کے بحری اسفار اور اس سفر کو ممکن بنانے والے لوگوں کی اخلاقیات، نفسیات اور سفاکی کا بھرپور جائزہ پیش کرتا ہے۔ سمندر میں طوفانی ہواؤں اور طوفانی لہروں کے ساتھ ساتھ بے رحم سفاک کشتی رانوں کے ہاتھوں بیمار علیل fieldy پر کیا گزری بیماری ناتمں کس اذیت سے دوچار ہوئیں ان تجربات کا حاصل فیلڈنگ کا تبصرہ ہے۔ Lisbon is the nastiest city on the world

دنیا کے اس بدترین شہر میں فیلڈنگ تبصرے کے صرف دو مہینے بعد زندگی کی بازی ہار گیا اور آخرت کے سفر پر روانہ ہو گیا۔

Johny Evelyn اور Samuel Pepy کے روزنامچے جو سترہویں صدی کے مغرب کے اہم روزنامچوں میں شامل ہیں ان کی خاص بات یہ ہے کہ دونوں روزنامچہ نگار ہم عصر اور بہترین دوست تھے لیکن دونوں کے مزاج، عادات اطوار، قوت مشاہدہ، قوت تحریر میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

Evelyn ایک عالم فاضل امیر شخص تھا لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک بہترین باپ اور وفادار شوہر بھی تھا اس کی زندگی تقوی، پرہیزگاری کا نمونہ تھی اس عہد کی غیر اخلاقی زندگی سے وہ بالکل الگ تھلگ تھا۔ یہ روزنامچہ براعظم یورپ میں سترہویں صدی میں طرز زندگی، طرز معاشرت پر پڑے ہوئے پردے اٹھا دیتا ہے۔

انگلستان میں مذہبی روزنامچہ نگاری کی ابتداء:

انگلستان میں مذہبی روزنامچوں کا آغاز روحانی زمرے سے ہوا Jhon Beadls (وفات ۱۶۶۷ء) نے اپنے عقیدے کے مسیحیوں کو تلقین کی وہ اپنے روحانی تجربات کا ریکارڈ رکھا کریں۔ Beadla نے اپنے پیغام کی تشریح ایک کتاب میں کی یہ کتاب ۱۸۵۶ء میں شائع ہوئی یہ ذاتی ڈائری نہیں بلکہ Calvinish مسلک والوں

کے لیے مذہبی طرزِ عمل کا ہدایت نامہ ہے اس ہدایت نامے میں ساری باتیں مذہبی نوعیت کی ہیں لیکن ان کے اندراجات سے غیر مذہبی معاملات سامنے آ سکتے ہیں مثلاً ایک ہدایت یہ بھی ہے۔

''خدا نے تمہاری دعاؤں پر جو کچھ کیا ہو ان کو سپردِ قلم کیا جائے''

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مذہبی لبادے میں ذاتی نوعیت کی بہت سی باتیں احاطۂ تحریر میں آ سکتی تھیں اور واقعتاً آئیں۔ آرتھر ونسن نے دراصل ایک خودنوشت لکھ ڈالی اور یہ غیر مذہبی امور کا ایک ریکارڈ ہے جس پر اخلاقی غلاف چڑھانے کی کوشش کی گئی۔[۸]

اردو کا پہلا روزنامچہ فرمان سلیمانی ۱۸۸۲ء

اردو میں روزنامچوں کی تعداد اس قدر کم نہیں جیسا کہ تصور کیا گیا ہے اس کے باوجود یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ اردو کا پہلا روزنامچہ کس سن میں لکھا گیا۔ مشفق خواجہ نے لکھنؤ کے سید حسن لطافت کا روزنامچہ فرمان سلیمانی مرتب کیا تھا اس روزنامچے کا سال کتابت ۱۸۸۲ء ہے۔ حسن لطافت ریاست اودھ کے بارہ شاہزادوں کے استاد رہے یہ روزنامچہ شاہزادہ مرزا سلیمان قدر کے دربار سے متعلق ہے۔ جو واجد علی شاہ کے سوتیلے بھائی تھے یعنی ایک شہنشاہ کے بیٹے اور دوسرے شہنشاہ کے سوتیلے بھائی۔[۹] اس لحاظ سے اردو کا قدیم ترین روزنامچہ فرمان سلیمانی ہے جسے مشفق خواجہ نے حواشی اور مقدمہ کے ساتھ مرتب کیا ہے لیکن یہ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ یہ روزنامچہ عنقریب جریدہ میں شائع ہوگا۔ یہ سوال کیا جائے گا کہ مشفق خواجہ جیسے محقق نے اردو میں روزنامچے کی روایت پر کیوں نہ لکھا۔ یہ سوال بھی اٹھایا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے اس روزنامچے کا دوسرے روزنامچوں سے تقابلی مطالعہ کیوں پیش کیا ہے۔ راقم کے خیال میں دنیا کا سب سے سہل ترین کام سوال کرنا اور اعتراض وارد کرنا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ خواجہ صاحب اردو روزنامچے پر مبسوط کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتے تھے اسی لیے اس موضوع پر خامہ فرسائی سے گریز کیا گیا ہے۔ افسوس کہ ہم اب اس کتاب سے ہمیشہ کے لیے محروم ہو گئے اور سینکڑوں روزنامچوں کی تاریخ سے بھی جن سے صرف خواجہ صاحب واقف تھے۔ مجھے یاد ہے کہ خواجہ صاحب نے بعض قلمی روزنامچوں اور روزنامچروں کا ذکر کیا تھا جو ستر ہویں صدی کے اوائل کے تھے۔ ان میں سے کچھ روزنامچے سالم، دیمک زدہ، نامکمل و کٹے پھٹے، اوراق کے ساتھ، قلمی، قلمی نسخوں کی نامکمل نقول پر مشتمل تھے۔ اردو کے قدیم رسائل و اخبارات میں شائع ہونے والوں روزنامچوں کی عکسی نقول بھی خواجہ صاحب کے ذخیرے میں محفوظ تھیں۔ خواجہ صاحب کا طریقہ تحقیق یہ نہیں تھا کہ جو کچھ مل گیا اسے فوراً اپنے نام سے شائع کر دیا جائے وہ ریزہ ریزہ جمع کرتے تھے پھر خاکہ بناتے اس خاکے میں رنگ بھرتے اور جب اس رنگ سے وہ مطمئن ہوتے تو تحریر کا مرحلہ آ جاتا۔ جب تک اطمینان نہ ہوتا وہ قلم نہ اٹھاتے۔ افسوس کہ وہ روزنامچے ہماری دسترس میں نہیں رہے۔ اردو زبان اب نادر روزنامچوں کے تعارف سے محروم ہو گئی ہے۔ مشفق خواجہ نے راقم الحروف کو قدیم صوفیہ، مشائخ، علماء کے عربی، فارسی اور اردو کے

قلمی روزنامچوں کے بارے میں بعض حیران کن تفصیلات سامنے آئی ہیں جنہیں کسی مناسب موقع پر پیش کی جائیں گی۔ واقعات اظفری فارسی کا ہندوستانی روزنامچہ ہے جو ۱۸۱۵ میں لکھا گیا جب روزنامچہ نگار شہزادے نے دہلی سے مدراس کا سفر کیا اور اس سفر کے حالات تحریر کیے۔

اٹھارہ سو ستاون: جنگ آزادی کے روزنامچے:

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے حوالے سے بے شمار روزنامچے لکھے گئے جن میں اہم ترین روزنامچہ جنگ آزادی کے غدار اور بہادر شاہ ظفر کے معالج حکیم احسن اللہ خاں کا ہے جنرل بخت خان کے منصوبوں تجاویز اور حکمت عملی سے بہادر شاہ ظفر کو غافل رکھنے اور بخت خان سے ایک خاص فاصلے پر رکھنے کا کام انگریزوں نے حکیم احسن اللہ خان کے سپرد کیا تھا، جنہیں اس غداری کا صلہ ۲۰۰ روپے ماہانہ پنشن اور جاگیر کی مستقل زندگی کی صورت میں دیا گیا۔[۹] یہ روزنامچہ فارسی میں لکھا گیا تھا اس کا اصل متن گمشدہ ہے لیکن اس کا انگریزی ترجمہ محفوظ رہ گیا چنی لال کا روزنامچہ بھی اہمیت کا حامل ہے دہلی کے اس بنیے کی دکان سے بہادر شاہ ظفر کے محل میں ادھار سامان طلب کیا جاتا تھا اسی عہد کے مبارک شاہ کوتوال کا روزنامچہ بھی معروف ہے خواجہ معین الدین حسن کا روزنامچہ ''احسن الاخبار'' میں شائع ہوا تھا بعد ازاں خواجہ احمد فاروقی نے اسے ''ہنگامہ غدر'' کے نام سے شائع کر دیا تھا۔

راشد الخیری، خواجہ عبدالحئی، اور ''سیاحت ہند'' والے عبدالرحمان امرتسری کے روزنامچے بھی معروف ہیں ساختر انصاری کا روزنامچہ ایک طالب علم کی ڈائری بہت مقبول ہوا۔

عطیہ فیضی کا روزنامچہ: زمانہ تحصیل خاندان فیضی کے اردو روزنامچے:

عطیہ فیضی جن دنوں یورپ میں تعلیم حاصل کر رہی تھیں تہذیب نسواں کے لیے باقاعدگی سے روزنامچہ تحریر کرتی تھیں ایام طالب علمی کا یہ روزنامچہ ''زمانہ تحصیل'' کے نام سے کتابی شکل میں شائع ہوا۔ ان کی بہن کا روزنامچہ بھی شائع ہوا ہے لیکن ہمیں مل نہیں سکا۔[۱۰] عطیہ فیضی کا خاندان جسے ''بھائی میاں کی آپ بیتی'' سے شہرت ہی فی الحقیقت یہ آپ بیتی اردو کی پہلی آپ بیتی تھی جو ۱۸۶۷ء میں لکھی گئی یہ آپ بیتی بھائی میاں طیب جی کے سفر لندن کی روداد پر مشتمل ہے۔ بدرالدین طیب جی کا روزنامچہ بھی اہم ہے لیکن غیر مطبوعہ.........عطیہ فیضی کے خاندان میں روزنامچہ نگاری کی روایت نہایت مستحکم تھی ان کے خاندان کے تمام بزرگ اور خواتین بڑے بڑے رجسٹروں میں ٹوٹی پھوٹی اردو میں روزنامچے نہایت پابندی سے لکھتے تھے یہ تمام روزنامچے عطیہ فیضی کے نوادرات میں آج بھی محفوظ ہیں۔ ان روزنامچوں سے اس عہد کے بے شمار معاملات و واقعات پر صحیح روشنی پڑ سکتی ہے۔

اشاعت کے منتظر روزنامچے:

حسن نظامی اپنے سفر ناموں کو بھی روزنامچے قرار دیتے ہیں اپنے سفر نامہ ہند [۱۹۰۷ء] کو انھوں نے روزنامچہ لکھا ہے منادی میں ان کے روزنامچہ شائع ہوتے رہے ''دہلی کا آخری سانس'' کے نام سے بھی ان کا

روزنامچہ موجود ہے۔ "بہادر شاہ ظفر" کا روزنامچہ خواجہ صاحب نے فارسی سے اردو میں ترجمہ کر کے شائع کیا تھا حکیم محمد سعید کے کئی روزنامچے شائع ہو چکے ہیں علاوہ احدی، ایوب دہلوی، خواجہ شفیع دہلوی، سبزہ بیگانہ کے مصنف اور اشرف صبوحی کے روزنامچے اشاعت کے منتظر ہیں۔

خوف فساد خلق، کتابیں، روزنامچے

خوف فساد خلق کے باعث بے شمار روزنامچے ضائع کر دیے گئے یا ورثاء نے انھیں جلا دیا ایسے روزنامچوں کی ایک فہرست مشفق خواجہ کے پاس محفوظ تھی۔ خواجہ صاحب کے پاس ایسی کتابیں بھی محفوظ تھیں جن کے مالکان نے ان کتابوں کو مدتوں تک اپنی تجوریوں میں محفوظ رکھا، اپنے گھر والوں کو ان کتابوں کی زیارت سے محروم رکھا کہ ان کا متن اخلاقیات کے منافی تھا اور مرنے سے قبل اپنے اعمال نامے کے سیاہ باب خواجہ صاحب کے سپرد کر دیے۔ خواجہ صاحب کے ذخیرہ نوادرات میں ایسے سیاہ باب بہت ہوں گے۔ مرحوم جلیل قدوائی صاحب نے ایک فحش دیوان خواجہ صاحب کے سپرد کرتے ہوئے کہا تھا کہ عمر بھر اسے اپنی اہلیہ اور اپنے بچوں سے چھپایا نا رہا یہ نہیں چاہتا کہ انتقال ہو تو میرے ترکے سے یہ دیوان برآمد ہو، میرے بچے میرے بارے میں کیا سوچیں گے کہ ان کا باپ کس مزاج کا آدمی تھا۔ تحقیق کے لیے یہ کتابیں جمع کرنے پر مجبور تھا۔

روزنامچے، بیاض، کشکول، یادداشتیں

کیا روزنامچوں اور بیاض، کشکول یا یادداشتوں میں کوئی مماثلت تلاش کی جا سکتی ہے؟ اقبال کی Stray reflaction مولوی شفیع کی یادداشتیں، مولوی شفیع، یادداشتہائی مجیبی مینوی، کشکول مفتی شفیع، کشکول حکیم محمود احمد برکاتی کو روزنامچوں کا جزو سمجھا جا سکتا ہے کیا یہ جزوی روزنامچہ کی کوئی شکل ہے؟ یہ بھی تحقیق کا ایک موضوع ہے کیونکہ یہ یادداشتیں بھی روزنامچے کے مطالعے کے دوران آنے والے اہم واقعات، حوالوں، مطالعات کی ذیل میں بن جاتے ہیں لیکن بہر حال روزنامچے سے ان کا کوئی تعلق نظر نہیں آتا۔ لیکن ایک معروف جامعہ میں اس موضوع پر تحقیق جاری ہے دیکھیے کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ اردو میں روزنامچوں کے اس مختصر بیان سے ڈاکٹر صبیحہ انور کے اس مفروضے کی نفی ہو جاتی ہے کہ روزنامچے کو لوگ "مدافشی" سمجھتے ہیں لہٰذا اردو میں روزنامچوں کا ذخیرہ اس قدر قلیل ہے کہ اس کے بارے میں لکھنے کی کچھ گنجائش نہیں [11] حقیقت یہ ہے کہ روزنامچوں کا ذخیرہ بے حد وسیع ہے صرف تحقیق کی ضرورت ہے۔

افسانوی روزنامچوں کی صنف:

مغرب میں روزنامچہ مقبول ترین صنف ہے، لہٰذا افسانہ نگاروں نے اس جام سفال میں افسانے کی صہبا استعمال کی اور افسانوی روزنامچے کی صنف وجود میں آئی، ہندوستان میں قاضی عبدالغفار کی کتاب "مجنوں کی ڈائری" اسی مغربی صنف کی نقالی تھی۔ انگریزی میں اس صنف میں Deniel Defoe کی کتاب Ajournal

of the plague year اور Grossmiths کی Diary of a Nobody بہت معروف ہیں۔
Robinson Crusoe کے بعض حصے افسانوی روزنامچے کی صنف کے تتبع میں لکھے گئے ہیں۔

بوسنیا: سرایوو کی محصور لڑکی کا روزنامچہ: مقبول ترین روزنامچہ

عصر حاضر میں Dean Inge's کا روزنامچہ Diary of a Dean معروف ہے۔ سوتیلانا ہٹلر کے روزنامچے بھی مشہور تھے۔ گزشتہ چند برسوں تک سرایوو کی خوں ریز وادیوں میں ڈیڑھ سال تک تہہ خانے میں رضاکارانہ قید میں رہنے والی ایک کم عمر لڑکی کے روزنامچے نے عالمی شہرت حاصل کی جو آنسوؤں، خون کے قطروں، لہو کی بوندوں، دکھ درد، غم کے آنچل سے لکھا گیا تھا۔ یہ روزنامچہ چند دنوں میں لاکھوں کی تعداد میں فروخت ہوا۔ دنیا کی تاریخ میں کوئی روزنامچہ اس طرح پسند نہیں کیا گیا۔

خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کی اہمیت:

خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کا اردو روزنامچہ نگاری کی تاریخ میں کیا مقام و مرتبہ ہے؟ یہ اہم سوال ہے لیکن سردست اس کا جواب مشکل ہے۔ کیونکہ ابھی تک اردو روزنامچے کی تاریخ تحقیق کے مراحل سے نہیں گزری ہے۔ لیکن اردو انگریزی کے دستیاب روزنامچوں سے اگر خواجہ صاحب کے روزنامچے کا موازنہ کیا جائے تو اس کے نتائج کو کس طرح مرتب کیا جائے گا؟ ایک سرسری جائزے سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ حسن نظامی کی جزئیات نگاری، لطافت اور مظہر علی سندیلوی کی برجستگی نہیں رکھتا نہ ہی وہ انگریزی کے روزنامچہ نویسوں کی خصوصیات کا حامل ہے۔ اس روزنامچے کی سب سے اہم بات اس کا سادہ سپاٹ انداز بیان ہے جس میں جذبات، رنگینی بیان، زیب داستان کے لیے افسانہ نویسی سے احتراز واضح طور پر محسوس ہوتا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مورخ پیش آنے والے واقعات سانحات کو وقائع نویس کی طرح جمع کر رہا ہے اس روزنامچے پر روزنامچہ کے بجائے تاریخ نویسی کا گمان ہوتا ہے۔ روزنامچہ نگار کی شخصیت ایک عالم، حلیم، مؤدب، مخلص، شائستہ، شگفتہ، صاحب قال اور صاحب حال ہستی کی ہے لہذا ان کی تحریر میں سمندر کا ٹھہراؤ اور کہساروں کا جلال نمایاں نظر آتا ہے۔ اکثر مقامات پر روزنامچہ نگار کا قلم مورخ کے مشاہدات کا ترجمان بن جاتا ہے جو جذبات کی سطح سے اٹھ کر واقعات نگاری کو مرکزی اہمیت دیتا ہے۔ اس اعتبار سے یہ روزنامچہ برعظیم پاک و ہند کے کئی برسوں کی سچی تاریخ کا آئینہ بن جاتا ہے۔ روزنامچہ نگار کے ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں ہے لہذا انھوں نے اس روزنامچے کی اشاعت میں دلچسپی بھی ظاہر کی اور اسے محفوظ بھی رکھا جب کہ اس روزنامچے کے بعض حصے ان کی ذاتی زندگی کے تلخ مقامات کی یاد دلاتے ہیں۔ انھیں بآسانی حذف کیا جا سکتا تھا۔

خواجہ صاحب کا روزنامچہ خشک دستاویز نہیں اس میں ان کے جذبات بھی ہیں، گھریلو مسائل بھی، اس عہد کے ہنگامے اور مسائل بھی، بیان کا ذاتی زاویہ بھی ہے لیکن کہیں بھی مورخ کی سچائی اور غیر جانبداری کو مجروح

محسوس کرتے ہیں اس روزنامچے سے انیسویں صدی کے اوائل کا لاہور ہماری نظروں کے سامنے آجاتا ہے اور اس عہد کی سب سے اہم شخصیت علامہ اقبال کی تصویر بھی ان تحریروں سے ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کے محاسن یا نقائص ہمارا موضوع نہیں ہیں۔ لہٰذا اس سلسلے میں تفصیلی گفتگو کسی اور موقع پر پیش کی جائے گی۔ [اس مضمون کی پہلی قسط میں ہم نے انگریزی اردو روزنامچوں کا جائزہ لیا ہے، دوسری قسط میں ہم عربی، فارسی، ہندی، ہسپانوی اور فرانسیسی روزنامچوں کی روایت کا جائزہ لیں گے اور تیسری قسط میں ان کے تقابلی مطالعات پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس طرح روزنامچوں کے موضوع پر اہم زبانوں کی تاریخ مرتب ہو جائے گی۔]

خواجہ عبدالوحیدؒ صاحب سیف و قلم

خواجہ عبدالوحید مرحوم برعظیم پاک و ہند کے علمی مذہبی و تحقیقی حلقوں میں ایک محقق صحافی مفکر شارح اقبال، مفسر اسلام، بے شمار انجمنوں، تحقیقی و علمی اداروں کے روح رواں مدبر اسلام کے طور پر معروف ہیں، اس لیے یقیناً بے شمار لوگوں کو اس بات پر حیرت ہوگی کہ خواجہ صاحب جیسی صاحب قلم ہستی کا تلوار سے کیا تعلق؟ وہ قلم کار تو ہو سکتے ہیں لیکن مجاہد اسلام نہیں ہو سکتے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایک مومن جس کی ساری زندگی اقبالؒ اور مولوی احمد علیؒ لاہوری کی صحبتوں میں گزری ہو اور جو ذہنی و فکری طور پر مجلس خلافت اور مجلس احرار کے صاحب سیف و قلم بزرگوں کا خوشہ چیں رہا جن کے رگ و پے میں ولولہ جہاد خون کی طرح دوڑتا تھا۔ مولانا محمد علی جوہر کی تحریریں اور عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریریں سننے والا تمنا او زبان کے جہاد جیسے اعلیٰ ترین مذہبی فریضے سے کیسے غافل رہ سکتا تھا۔ خواجہ صاحب کی زندگی کا یہ روشن ترین اور مجاہدانہ پہلو ان کے سوانح نگاروں کی نگاہ سے اوجھل رہا ہے۔ ہماری نظر میں ان کی زندگی کا یہ پہلو سب سے زیادہ قیمتی ہے۔ ارشاد رسالت مآب ہے کہ شہادت کی آرزو کے بغیر مرنے والا مومن نہیں ہے لہٰذا یہ کیسے ممکن تھا کہ خواجہ عبدالوحید جیسا صاحب قلم اور صاحب کردار مجاہد نہ ہوتا اقبال مرحوم کی شاعری پڑھنے کے بعد بھی اگر دلوں میں ولولہ پیدا نہ ہو اور کٹ مرنے کی آرزو توانا نہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اقبال مرحوم کے شعر پڑھنے والا اس کے فہم سے قاصر رہا۔ خواجہ عبدالوحید کی مجاہدانہ زندگی کے یہ چھپے ہوئے گوشے پڑھنے کے لائق ہیں اور اقبال مرحوم ہی کی زبان میں ہمیں بتاتے ہیں کہ ع عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد۔

خواجہ عبدالوحید کے مجاہدے

خواجہ صاحب کے محلے میں طوائفوں کی کثرت نے ان کے جوش ایمانی کو متحرک کر دیا۔ مسئلے کا قانونی حل ناکام ہو گیا تو محلے کی فضاء کو پاکیزہ رکھنے کے لیے خواجہ صاحب نے عملی جہاد کا سلسلہ شروع کیا جس کے نتائج چند دنوں میں سامنے آ گئے اس کی تفصیل روزنامچے میں درج ہے۔

”تقریباً ایک ہفتہ ہوا میں نے اپنی ہمسایہ بیگم صاحبہ کے منشی کو بیادم رشید کی معیت میں خوب زدوکوب کیا تھا جس کا

_______________ _______________

نتیجہ یہ ہوا کہ دو روز کے بعد اُن کے مکان میں رہنے والی بعض بدمعاش عورتیں مکان چھوڑ کر چلی گئیں۔[۱۲]
۱۳ ستمبر: پرسوں رات ہم لوگوں نے شیخ عبدالحمید کے مکان پر پکٹنگ کیا اور رہنے والے بدمعاش کو شدید طور پر زد و کوب کیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک بجے شب پولیس آئی۔ لیکن ہم نے اُن لوگوں کی کوئی پروا نہ کی۔ کل دن بھر پولیس محلے میں تفتیش کے لیے پھرتی رہی۔ لیکن ہم لوگوں نے توجہ نہ کی۔ شام کے قریب تمام اہلِ محلہ کو اکٹھا کیا گیا اور رات کو ڈی ایس پی، انسپکٹر، سب انسپکٹر، ہیڈ کانسٹیبل آئے۔ مسٹر لشن ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس بڑی شرافت سے پیش آئے اور کہنے لگے کہ تم لوگ مشتبہ آدمی کو گرفتار کر لیا کرو۔ لیکن زد و کوب مت کرو۔ اُن کے جانے کے فوراً بعد ایک تانگہ دو بدمعاشوں کو لے کر آ گیا۔ ہم لوگوں نے اُنھیں گرفتار کر کے پولیس والوں کو فون پر اطلاع کر دی اور پولیس آ کر اُنھیں تھانے میں لے گئی۔ رات کے ایک بجے کے بعد سب لوگ اپنے اپنے گھروں کو گئے۔[۱۳]
۱۵ ستمبر: کل دوپہر کو حکیم صاحب کے مکان پر آنے والی دو عورتوں کو بھی زد و کوب کیا گیا۔ تمام گرد و نواح میں ایک دہشت طاری ہے۔ رات پولیس کے ہیڈ کانسٹیبل کی بڑی بے عزتی کی گئی۔ کل صبح محلے کے چند نمائندے چیئرنگ کراس پولیس سٹیشن میں پہنچے۔ لیکن ڈیڑھ گھنٹے کی مسلسل گفتگو اور بحث کا حاصل یہ تھا کہ سب انسپکٹر انچارج شہر کے بدمعاشوں کی امداد کرنا چاہتا تھا اور شرفا اور اہلِ محلہ کو پولیس سے کوئی امداد دلوانا نہ چاہتا تھا۔ دو تین روز کی شبانہ پکٹنگ کے بعد اب محلے میں خاموشی کا عالم طاری ہے۔ بڑی بڑی عمارتیں جن میں شب و روز ہنگامہ رہتا تھا، اب ویران پڑی ہیں۔[۱۴]

توہینِ رسالت مآب کا انتقام: سلسلۃ الاخوان کا قیام

جب شدھی اور سنگٹھن جیسی جارحانہ ہندو تحریکیں زور پکڑنے لگیں اور توہینِ رسول ﷺ کی شرانگیز مہم شروع کر دی گئی تو خواجہ صاحب نے ایک خفیہ سرفروش جماعت قائم کی۔ اُس کا نام سلسلۃ الاخوان تھا۔ اُس کی تاسیس کے لیے مقبرہ جہانگیر سے ملحق مسجد میں سترہ افراد کا ایک اجتماع رات بارہ بجے ہوا، جس میں ایک حلف نامہ مرتب ہوا جس پر حاضرین میں سے ہر شخص نے اپنے خون سے دستخط کیے۔ حلف نامے کا مضمون یہ تھا کہ توہینِ رسول ﷺ کو ہرگز برداشت نہ کیا جائے گا یہاں تک کہ اپنا خون پیش کرنے سے بھی گریز نہ کیا جائے گا۔ اِس حلف نامے کی ایک خاص بات یہ تھی کہ کسی اقدام سے پہلے الہام کو ضروری قرار دیا گیا تھا۔[۱۵] خواجہ صاحب نے اس تنظیم کے بارے میں روزنامچے میں صرف یہ تحریر فرمایا ہے کہ اس تحریک کا مقصد اپنے آپ کو عمل پر مجبور کرنے کے لیے کسی قوت کا قیام تھا تاکہ عزم کے ساتھ ساتھ عمل جو مطلوب ہے اس کے لیے قوت نافذہ مہیا ہو، لیکن حقیقتاً یہ تحریک ان کے جذبہ ایمانی کا اظہار تھی کہ رسالت محمدی کے لیے جان قربان کر دی جائے۔[۱۶] خواجہ صاحب نے روزنامچے کے ص ۱۱ پر اس ضمن میں تنظیم کے کچھ دوسرے مقاصد بیان کیے ہیں غالباً یہ اولین مقاصد کی توسیع ہیں۔

قادیانیوں کے خلاف جہاد:

☆خواجہ صاحب اپنے دفتر میں بھی "الفضل" کے خلاف تقریریں کرتے تھے جس پر ان کے قریبی دوستوں نے جو قادیانی تھے شدید ناخوشی کا اظہار کیا۔ اس کے جواب میں خواجہ صاحب نے فرمایا حقیقت یہ ہے کہ تحریک احمدیت کو اسلام مسلمانانِ ہند اور دنیائے اسلام کے لیے سخت خطرناک سمجھتا ہوں۔ اس لیے میرے خیال میں اس تحریک کو مٹا دینا چاہیے۔[۱۷]

خواجہ عبدالوحیدؒ کے سماجی تعلقات قادیانیوں سے بہت اچھے تھے۔ لاہوری قادیانی جماعت کے سربراہ محمد علی لاہوری سے بھی ان کے مراسم تھے۔ ان تعلقات کا اندازہ روزنامچہ سے ہوتا ہے۔ لیکن یہ تعلقات ان کے جہاد میں کبھی رکاوٹ نہ بنے۔ روزنامچے میں لکھتے ہیں:

☆"مولوی سعید اللہ صاحب کے پاس ایک حمائل دیکھی جس میں حکیم نورالدین صاحب کی تصویر پڑی تھی۔ یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا۔ اگر تصویر کو شریعت میں ناجائز قرار دیا گیا تو خاص اسی بنا پر کہ اس کی تعظیم شرک کا موجب ہو سکتی ہے۔ لیکن ایک ایسے شخص کی تصویر کو قرآن حکیم میں رکھنا ثابت کرتا ہے کہ اس شخص کی تعظیم نہایت نامحمود طریق پر کی جارہی ہے۔ میں اسے ایک بہت بڑا فتنہ سمجھتا ہوں۔ ارادہ ہے کہ مولانا محمد علی صاحب امیر صاحب جماعت احمدیہ لاہوری خدمت میں ایک عریضہ اس بارے میں تحریر کروں۔ اور اُن سے درخواست کروں کہ اپنی جماعت کو اس بارے میں مناسب ہدایات صادر فرمائیں۔"[۱۸]

لاہور کے مشہور معالج ڈاکٹر عبدالحق قادیانی مولانا عبدالمجید سالک کے قادیانی بھائی عارف سے خواجہ صاحب کی دوستی تھی۔ لیکن یہ سماجی تعلقات اور دوستیاں خواجہ صاحب کو قادیانیوں کے خلاف کلمۂ حق کہنے سے باز نہ رکھ سکیں۔ قلم کے ساتھ ساتھ ان کی گفتار کا شعلہ بھی روشن رہتا تھا۔ اس کی ایک جھلک روزنامچے میں درج ہے۔

☆کل دفتر کے ریفرشمنٹ روم میں عارف صاحب سے بحث چھڑ گئی اور میں نے مرزا [غلام احمد] کی ذات پر جی کھول کر حملے کیے۔ میری طرف سے متواتر جارحانہ اقدام ہی ہوتا رہا اور احمدیوں سے یہی سلوک ہو تو وہ دبے رہتے ہیں ورنہ سر پر سوار ہو جاتے ہیں۔ آج میں اپنے ساتھ مرزا صاحب کا رسالہ "برٹش گورنمنٹ اور مسئلۂ جہاد" دفتر لے جا رہا ہوں تا کہ سب کو دکھاؤں کہ مرزا صاحب کے اصلی خیالات کیا تھے۔[۱۹]

☆کل اتوار کا دن تھا۔ شیخ صوفی [تبسم] صاحب اور امرتسر کے بابو غلام علی صاحب تشریف لے آئے۔ اُن کے ہمراہ ڈاکٹر محمد یوسف صاحب کی طرف گئے۔ اُنھوں نے صوفی صاحب کو ملاحظہ کیا اور نسخہ تجویز کیا۔ میں نے اُن سے کہا کہ آپ نے مرزا آں جہانی کے بارے میں جو خط کتابت کسی زمانے میں یورپ کے کسی بہت بڑے ماہر امراضِ ذہنیہ سے کی تھی، وہ مجھے دیجیے تا کہ احمدیوں کے خلاف پروپا گنڈے کے لیے استعمال کیا جائے۔ اُنھوں

نے وہ میرے سپرد کردی۔

٭۱ اسلام کے دوسرے شمارے بابت ۲۲/جون ۱۹۳۵ء کے ایک اداریہ شذرے میں خواجہ عبدالوحید نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ دنیائے اسلام کے تمام علماء کی ایک کانفرنس لاہور میں منعقد کی جائے، جس میں واضح اور متفقہ طور پر یہ فیصلہ کیا جائے کہ قادیانی مسلمان نہیں ہے۔[۴۰] خواجہ صاحب کی یہ خواہش چالیس سال کے بعد ۱۹۷۴ء میں پوری ہوئی۔

تحریک اصلاح مقروضاں: قرض کی ادائیگی سے انکار کر دیا جائے:

مغرب تک تحریک اصلاح مقروضاں کے متعلق مشورہ ہوتا رہا۔ بالآخر قرار پایا کہ فی الفور لاہور کے مضافات میں زمانی حلقوں میں وعظ و نصیحت کا منظم سلسلہ شروع کیا جائے اور دیہاتیوں کو آمادہ کیا جائے کہ ان میں سے وہ لوگ جو قرضہ ادا نہیں کر سکتے ہیں قرضے اور سودی ادائیگی سے قطعاً انکار کر دیں۔ قرار پایا کہ شنبہ کے روز میں، برادرم سردار محمد، برادرم غلام دستگیر اور برادرم نذیر ڈھولن وال جائیں۔[۴۱] قرض دار کسانوں اور زمینداروں کے لیے یہ انقلابی اقدامات اور انقلابی جماعت کا قیام خواجہ صاحب کے مجاہدانہ کردار کی روشن مثال ہے۔

امارت شریعہ کا قیام: نیا انقلاب

خواجہ عبدالوحید نوجوانی میں مولانا احمد علیؒ لاہوری سے بیعت ہو گئے تھے۔ خواجہ صاحب اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے لیے علامہ اقبال مرحوم اور احمد علی لاہوریؒ کے مشورے سے نئے نئے منصوبے بناتے رہتے تھے۔ اس سلسلے میں امارت شریعہ کا قیام خواجہ عبدالوحید کا ایک دیرینہ خواب تھا۔ اس کی تفصیل روزنامچے سے درج کی جاتی ہے۔

٭ آج صبح دفتر "اسلام" میں حضرت مولانا احمد علی، مولوی سردار محمد صاحب اور مولوی خدا بخش صاحب کی موجودگی میں امارت شریعہ کے قیام کے مسئلے پر مفصل غور و فکر ہوا اور طے پایا کہ عنقریب اس چیز کی بنیاد رکھ دی جائے۔ اللہ العالمین ہم لوگوں کی نیتوں کو بار آور فرمائے اور کوئی ایسی صورت پیدا فرما دے جس سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کا عروج و اقبال مرحوم دوبارہ عود کر آئے۔ اس خالق کائنات کے لیے یہ کوئی بڑی چیز نہیں جس نے بارہا گرے ہوؤں کو اٹھایا اور مٹے ہوؤں کو ابھارا ہے۔ آج بھی اس کفرستان ہند میں اگر وہ چاہے تو آٹھ کروڑ نام لیوایان دین حق، جہالت و ناسمجھی کی ظلمتوں سے نکال کر علم و فہم و دانش کی روشنی میں ترقی فرما سکتے ہیں۔ امارت کے ابتدائی کام کے بارے میں خواجہ صاحب لکھتے ہیں:

٭ پرسوں حضرت امیر [مولانا احمد علی] نے سلسلہ احکام امارت کی پہلی قسط صادر فرمائی جس میں چند ابتدائی اہمیت کی چیزوں کی طرف ارکان جماعت کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہم لوگوں کو توفیق عطا فرمائے کہ ہم ان

چیزوں پر استقلال و استقامت کا ثبوت دیں۔ آمین۔ [۴۲] امارت شریعہ کا قیام ہماری اجتماعی زندگی میں کوئی تغیر پیدا نہ کر سکا، لیکن خواجہ صاحب کی زندگی انقلابی تجربات کی حدت سے پگھلتی رہی۔

خدام اسلام: نئی تنظیم کا قیام

☆ کل دفتر انجمن خدام الدین میں اپنے نئے سلسلے کا اجلاس ہوا جس میں ارکان اربعہ کے علاوہ ماسٹر عبدالعزیز اور میاں احمد علی صاحبان بھی شریک ہوئے حضرت استاذی المکرم [مولانا احمد علی] نے سلسلے کا نام "خدام اسلام" تجویز فرمایا ہے۔ [۴۳] خواجہ صاحب اس تنظیم کے مؤسسین میں شامل تھے۔ خدمت اسلام کے لیے نئے نئے راستے تلاش کرنا ان کی زندگی کا اولین مقصد تھا۔

مولانا احمد علیؒ لاہوری سے بیعت: بیعت نامہ

☆ آج صبح دفتر انجمن خدام الدین میں ایک مختصر اجتماع ہوا اور مندرجہ ذیل عہد نامہ مرتب ہو کر حاضرین کے اس پر دستخط ہوئے اور سب نے حضرت استاذی المکرم مولانا الحاج احمد علی صاحب کے دست مبارک پر بیعت کی۔

بیعت نامہ

"مسلمانان ہند کے عقائد، اخلاق، تمدن اور معاشرت کی اصلاح کے لیے جو جماعت بنام...... حضرت الحاج مولانا احمد علی صاحب کے زیر قیادت قائم ہوئی ہے، میں بطیب خاطر اس جماعت میں شامل ہو کر حضرت امیر کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کو حاضر و ناظر سمجھتے ہوئے اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ کتاب و سنت کے مطابق ہر حال، ہر وقت اور ہر کام میں بلا چون و چرا امیر کی اطاعت کروں گا"۔

جن ارادوں کے مد نظر ہم لوگوں نے اس جماعت کی بنا رکھی ہے، رب العالمین انھیں پورا کرنے کے سامان پیدا فرمائے۔

آج کا یہ مختصر اجتماع جو واقعات عالم میں شمار ہونے کے قابل بھی نہیں، کیا معلوم ہے کہ آئندہ زمانے میں کسی عظیم الشان تحریک کے لیے بیج کا کام دے جائے۔ [۴۴]

جمعیت شبان المسلمین کا قیام: حلف نامہ

روزنامچے کے مطابق اس تحریک کا نام کہیں جمعیت شبان المسلمین، کہیں شبان المسلمین ہند، کہیں جمعیت شبان ہند ہے۔ ایک جگہ اس کے محرک اور بانی خواجہ عبدالوحید نظر آتے ہیں لیکن نقوش میں خواجہ عبدالوحید کے مضمون اقبال مرحوم کے حضور سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تحریک علامہ اقبال مرحوم کے تجویز کردہ نظام شبان

المسلمین کا مظہر تھی۔ یا سکیم میر غلام بھیک نیرنگ اور ڈاکٹر ظفر الحسن کی تجویز کی ہوئی تھی۔ تحریک کا مقصد علامہ اقبال مرحوم کی قیادت میں ذہنی و فکری انقلاب کی تیاری تھا۔[۲۵]

خواجہ صاحب نے حاشیے میں وضاحت کی ہے کہ میرے احباب اس مسئلے پر سوچ بچار کر رہے تھے جب پہلی مرتبہ اقبال مرحوم سے گفتگو ہوئی تو انھوں نے فرمایا کہ نیرنگ اور سید ظفر الحسن بھی ان خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ اس تحریک کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہو سکا لیکن یہ تحریک احیاء اسلام کے لیے شروع کی گئی تھی اس کا اصل نام "شبان المسلمین" تھا۔ یہ تحریک کس مرحلے تک پہنچی۔ روزنامچہ میں جو معلومات درج ہیں وہ ذیل میں پیش کی جا رہی ہیں اس موضوع پر تحقیق کی ضرورت ہے۔ اس تحریک کا قیام بھی خواجہ عبدالوحید کے مجاہدانہ ذوق کا آئینہ دار ہے۔

☆ ۲۶/ مارچ کو صوفی [تبسم] صاحب کے ہاں اجتماع ہوا اور "جمعیت شبان المسلمین ہند" کے اصول اساسی کا مسودہ جو میں نے تیار کیا تھا، زیر غور آیا اور بعد چند ترامیم و تغیرات کے منظور ہو گیا۔ اب یہ مسودہ آج سر محمد اقبال کے سامنے پیش کروں گا اور اُس کے بعد کسی باقاعدہ مجلس کے سامنے آئے گا۔

☆ کل حسب الارشاد علامہ سر محمد اقبال مرحوم ایک مضمون مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تیار کیا اور دفتر جاتے ہوئے حضرت علامہ کو دکھایا۔ انھوں نے پسند فرمایا۔ دفتر میں مسٹر محمد افضل بھٹی سے اس مضمون کی چار نقلیں کرائیں۔ اب ان پر لوگوں کے دستخط کرائے جائیں گے۔ پھر دستخط کرنے والوں کا اجلاس ہوگا جس میں جمعیت کا قیام اور امیر کا انتخاب ہوگا۔ اور اس کے بعد اس کے قیام و انتخاب کا اعلان کیا جائے گا۔

☆ [تبسم] صاحب کی طرف گیا جہاں خود صوفی صاحب اور شیخ حسام الدین صاحب سے مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تبادلۂ خیالات ہوتا رہا۔[۲۶]

☆ جب سید صاحب کے ہاں سے اپنے گھر آ رہا تھا تو علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے مکان کے عین سامنے اُن کا ملازم علی بخش ملا جس سے معلوم ہوا کہ باہر سے دو اصحاب ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے تھے اور میرا پتا دریافت فرما کر میری تلاش میں دفتر کی طرف چلے گئے تھے۔ جب گھر پہنچا تو ایک لفافہ ملا جس میں ایک رقعہ خود حضرت علامہ کا لکھا ہوا تھا اور دوسرا ان نو وارد حضرات کا جس سے معلوم ہوا کہ علی گڑھ سے ڈاکٹر سید ظفر الحسن صاحب نے دو اصحاب کو لاہور اس غرض سے بھیجا ہے کہ وہ ہم لوگوں سے مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق تفصیلی طور پر تبادلۂ خیالات کریں۔ ان احباب نے اپنے رقعے میں لکھا ہوا تھا کہ مغرب کے وقت میں مع اپنے دوستوں کے ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] کے ہاں اُن سے ملاقات کروں۔[۲۷]

☆ تین بجے صوفی صاحب اور شیخ حسام الدین صاحب تشریف لائے ساڑھے تین بجے ابوالاثر صاحب اور ریاض صاحب آ گئے۔ پھر علی گڑھ والے اصحاب تشریف لائے۔ سوا پانچ بجے تک اجتماع رہا۔ مجوزہ جمعیت شبان المسلمین کے متعلق طویل گفتگو ہوئی اور ہر معاملے پر ہم سب لوگوں کی رائے متفق ہوئی۔

علی گڑھ سے جو بزرگوار تشریف لائے تھے، اُن میں سے ایک محمد محمود احمد صاحب مسلم یونی ورسٹی میں فلاسفی کے لیکچرار ہیں۔ اور دوسرے برہان احمد [فاروقی] صاحب دہاں ریسرچ سکالر ہیں۔ اول الذکر بہت ذہین اور سمجھدار ہیں، اُن کی گفتگو بہت دل پذیر اور پسندیدہ ہے۔ دوسرے صاحب بہت کم بات کرتے تھے۔ اگرچہ بات کرنا چاہتے ضرور تھے۔ ان لوگوں کا خلوص، ان کا جوش دیکھ کر حیرت ہوئی تھی۔ ان کا علی گڑھ سے لاہور آنا ہی ان کے خلوص اور جوش کا زبردست ثبوت تھا۔ [۴۸]

٭ جمعہ سے فارغ ہو کر ماسٹر کا لجیٹ مسلم ہائی سکول کے ارکان کے ساتھ مجوزہ جمعیۃ الشبان کے متعلق گفتگو کی اور اُن میں سے چار حضرات کے دستخط حاصل کیے۔ تین بجے وہاں سے فارغ ہو کر گھر آیا۔ پانچ بجے کے بعد مسٹر مولا بخش وہیں آ گئے۔

٭ کل پانچ بجے کے بعد پروفیسر منیر الدین تشریف لائے۔ میں نے ان کو اور راجہ حسن اختر صاحب کو مجوزہ جمعیۃ شبان المسلمین کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے بلایا تھا۔

٭ جمعیۃ شبان المسلمین ہند کے قیام کا مسئلہ آج تک حل نہ ہو سکا۔ اب میں اس فکر میں ہوں کہ اگر سر دست علامہ اقبال مرحوم کے زیر قیادت تعلیم یافتہ طبقے کی تنظیم شروع نہ ہو سکے تو فی الفور کسی عالم دین کے زیر قیادت مذہب سے شغف رکھنے والوں ہی کو منظم کر دیا جائے۔ میں نے کچھ مدت گزری حضرت مولانا احمد علی صاحب سے اس کا تذکرہ کیا تھا اور اُنھوں نے اس تجویز کو پسند بھی فرمایا تھا۔ اب مولوی امان صاحب چاہتے ہیں منشی نور احمد صاحب کے خسر مولوی سردار محمد صاحب اور اُن کے رفقا سے گفت و شنید کی جائے تا کہ اس سلسلے میں کوئی موثر عملی قدم اٹھایا جا سکے۔

٭ آج ہمارے ہاں مجوزہ جمعیۃ شبان المسلمین کے بانیوں کا اجتماع ہوا جس میں جمعیۃ کی بنا رکھ دی گئی۔ نیز ارکان نے تحریری طور پر امیر کی اطاعت کا عہد کیا، اور امارت کے لیے علامہ سر محمد اقبال مرحوم مدظلہ کا نام تجویز ہوا۔ پریذیڈنٹ سکریٹری کا کام ثاقب صاحب کے سپرد ہوا اور خزانچی [بدر الدین] بدر صاحب مقرر ہوئے۔

٭ آج صبح دفتر "اسلام" میں مولوی امان صاحب مع مولوی سردار محمد صاحب تشریف لائے اور اُن سے معلوم ہوا کہ کل انجمن خدام الدین کی مجلس منتظمہ نے حضرت مولانا کی تجویز دربارۂ قیام جمعیۃ شبان المسلمین سے اتفاق نہیں کیا۔ اب مولوی سردار محمد صاحب کی خواہش ہے کہ اس تجویز کے اُس حصے میں شمولیت کر لی جائے جس کا تعلق علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے ساتھ ہے اور دوسرے اُس حصے کو سر دست ترک کر دیا جائے جس کا علمائے کرام کے ساتھ تعلق قائم کرنا مقصود تھا۔ اس امر کا قلق ہے کہ موجودہ صورت میں افراد جمعیۃ کی اخلاقی اور روحانی تربیت نہ ہو سکے گی۔ [۴۹]

٭ علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے دل میں اسلام کا جو درد موجود ہے اور اسلام کو دنیا میں بااقبال مرحوم و بلند دیکھنے کا جو

جذبہ اُن کے قلب میں موجزن ہے، اگر اس کے بروئے کار آنے کی کوئی صورت ہے تو وہ یہی کہ اُن کے اردگرد فدائیوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو جائے جو اُن کے سپرد اپنے آپ کو کرنے پر آمادہ ہو۔ اس صورت میں ایک طرف یہ توقع ہے کہ خود حضرت علامہ کے دل و دماغ میں ایسی حرکت پیدا ہوگی جو قوم سے کام لے سکے، اور دوسری طرف اس جماعت میں قوت عمل پیدا اور ظاہر ہوگی جو اپنے آپ کو اُن کی ذات سے وابستہ کر چکی ہوگی۔ خدا کرے کہ میرا یہ خواب سچا ثابت ہو تو نوجوانانِ اسلام کا ایک کثیر التعداد گروہ ایک فعال جماعت کی صورت میں منظم ہو جائے۔ اگر اس بارے میں میری کوششیں کامیاب ہو جائیں تو میرے لیے بڑی ہی خوش نصیبی کا باعث ہوگا۔

☆ کل دفتر سے شیرانوالہ دروازہ گیا۔ وہاں حضرت مولانا سے ملاقات ہوئی۔ تنظیم ملت کے متعلق بہت طویل گفتگو ہوئی۔ انجمن خدام الدین کی مجلس عاملہ نے گزشتہ چہارشنبہ کے اجلاس میں مولانا کے کسی نئے ادارے میں کام کرنے کی مخالفت کی تھی، بنا بریں ہم لوگ بہت متاسف ہوئے تھے، اور اب خیال تھا کہ ادھر کا خیال چھوڑ کر سر محمد اقبال مرحوم کے زیر قیادت جو کام شروع کرنے کی تجویز ہے، اُس میں شمولیت کر لی جائے۔ [۳۰]

☆ کل میرے مکان پر مجوزہ جمعیۃ شبان المسلمین کا اجتماع ہوگا تاکہ ایک مجلس عاملہ مقرر کی جائے۔

☆ آج جمعیۃ شبان المسلمین کا اجلاس میرے مکان پر ہوا اور چھپے ہوئے فارم (رکنیت) حاضرین میں تقسیم کیے گئے۔ قرار پایا کہ کل ایک وفد حضرت علامہ کی خدمت میں پیش ہو کر اس جماعت کی طرف سے بعض معروضات پیش کرے اور کوشش کی جائے کہ جلد از جلد کام شروع کیا جا سکے۔ آج کے اجتماع میں راجہ حسن اختر صاحب بھی شریک ہوئے اور اجلاس کے اختتام کے بعد وہ دیر تک بیٹھے رہے۔ اُن کے جانے کے بعد میں نے کھانا کھایا اور پھر پی صاحب کی معیت میں تھوڑی دیر کے لیے سیر کو نکلا۔

☆ خواجہ صاحب کے روزنامچے میں تحریک شبان المسلمین کی رکنیت کا گوشوارہ بھی محفوظ ہے۔ اس کی عبارت درج ذیل ہے۔

ایک مطبوعہ فارم بھی خواجہ صاحب کے پاس محفوظ تھا، جس کا مضمون حسب ذیل ہے:

۱۔ ہندوستان میں مسلمانوں کے عروج و اقبال مرحوم کے حصول کے لیے جو جماعت قائم کی گئی ہے، میں اس کا رکن بننے کے لیے تیار ہوں، اور اس بات کا عہد کرتا ہوں کہ امیر کی اطاعت قرآن و سنت کے مطابق بہر حال اور ہر وقت بلا چون و چرا کروں گا۔

۲۔ میں متمنی ہوں کہ اس جماعت کی امارت علامہ سر محمد اقبال مرحوم مدظلہ کے دست مبارک میں ہو۔

نام .... پتہ .... دستخط

۴ اچھوتوں کو مسلمان کرنا: ڈاکٹر امبیدکر سے رابطہ

خواجہ صاحب مسلمانوں کے تہذیبی اور سیاسی غلبے کے لیے مختلف منصوبے سوچتے رہتے تھے۔ اس راہ

میں ان کے کماحقہ دانشگل علامہ اقبال مرحوم تھے۔جاپانیوں کے ساتھ ساتھ اچھوتوں کو مسلمان کرنے کی حکمت عملی کے بارے میں روزنامہ مخبر لکھتا ہے۔

☆☆ ملک صاحب کی یہ بھی رائے تھی کہ احمدیوں کا ذکر اخبار میں نہ آنا چاہیے۔ اخبار کے علاوہ اچھوتوں کا مسئلہ بھی زیرِ غور آ گیا۔ میں اس سے پیشتر حضرت مولانا سے گفتگو کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کر چکا تھا کہ ایک وفد انجمن کی طرف سے ڈاکٹر امبیدکار کے پاس بھیجا جائے۔ اب اس کی تائید ہو گئی۔ چنانچہ وفد کے ارکان سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالقادر قصوری اور خود خلیفہ صاحب قرار پائے۔ سید صاحب کو پرسوں رات چٹھی لکھ دی گئی اور ڈاکٹر امبیدکار کو کل دوپہر تار دے دیا گیا۔ ان کا جواب آنے پر قصور جاؤں گا اور سید سلیمان صاحب کو بھی بذریعہ تار اطلاع کر دی جائے گی۔ اگر آٹھ کروڑ اچھوت حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں تو ایک طرف اسلام کا بول بالا ہو جائے اور دوسری طرف ہندوستانی سیاست کی بساط بالکل بدل جائے۔[۳۱]

غداروں کو بے نقاب کرنے کی روایت: خواجہ صاحب کی خطابت

۳۶۔ ۱۹۳۵ء میں مسجد شہید گنج کا قضیہ رونما ہوا۔ اس ضمن میں جو واقعات پیش آئے، وہ عام مسلمانوں کی طرح حضرت علامہ کے لیے بھی دلی تشویش کا باعث تھے۔ وہ ان دنوں بہت بے چین رہتے تھے اور ہر وقت اپنے دلی اضطراب کا اظہار فرماتے رہتے تھے۔ اس مسجد کو حاصل کرنے کے لیے جب مسلمانوں کی تمام قانونی چارہ جوئیاں ناکام ہو گئیں اور ہائی کورٹ نے بھی ان کے خلاف فیصلہ دے دیا تو لاہور کے بعض لوگوں نے یہ تجویز پیش کی کہ پریوی کونسل میں اپیل کرنی چاہیے۔ اس تجویز کے حامی افراد نے علامہ اقبال مرحوم کی تائید حاصل کرنے کے لیے "جاوید منزل" میں ایک مشاورتی مجلس منعقد کی۔ پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کے لیے تقریباً تیس ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ شرکائے مجلس کا خیال تھا کہ یہ رقم عام مسلمانوں سے حاصل کی جائے۔ اس مقصد کے لیے سربرآوردہ مسلمان بازاروں میں گھوم پھر کر دکانداروں سے چندہ جمع کریں۔ علامہ اقبال مرحوم کو اس تجویز سے اتفاق نہیں تھا۔ ان کی رائے یہ تھی کہ پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا کیونکہ اپیل نامنظور ہو جائے گی اور اس طرح غریب مسلمانوں کا روپیہ ضائع ہو جائے گا۔ حاضرین میں سے بعض لوگ مصر ہوئے کہ وہ چندے کے لیے اپیل ضرور کریں گے۔ اس پر حضرت علامہ ناخوشی کے عالم میں مجلس سے اٹھ کر گھر کے اندر تشریف لے گئے۔ حضرت علامہ کے اٹھ جانے کے بعد بھی اجلاس جاری رہا، اور یہ فیصلہ ہوا کہ چندے کے لیے اپیل کی جائے اور اس غرض سے ایک اشتہار شائع کیا جائے جس میں مسلمانوں سے تیس ہزار روپیہ فراہم کرنے کے لیے کہا جائے۔ اگلے روز اخباروں میں ایک خبر شائع ہوئی جس کا مضمون اس قسم کا تھا "علامہ اقبال مرحوم کے مکان پر منعقدہ جلسے میں یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے پریوی کونسل میں اپیل کی جائے۔ اس کام پر تیس ہزار روپے صرف ہوں گے۔ اس لیے مسلمان دل کھول کر چندہ دیں۔" چند روز

کے بعد عید آرہی تھی۔ اپیل کرنے والے حضرات کو یقین کامل تھا کہ عید کے دن لاہور کی بادشاہی مسجد ہی میں مطلوبہ رقم بآسانی جمع ہو جائے گی۔ مذکورہ خبر کی اشاعت کے دوسرے روز اخبارات میں حضرت علامہ کی طرف سے بیان شائع ہوا کہ پچھلے روز کی خبر میں صحیح واقعات درج نہیں ہوئے۔ حضرت علامہ نے فرمایا ''اجلاس میرے مکان پر ضرور ہوا لیکن میں اس تجویز کے خلاف تھا۔ اس کا مقصد مسلمانوں کو مزید زیر بار کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ جب حاضرین مجلس نے میری رائے سے اختلاف کیا تو میں وہاں سے اٹھ کر اپنے گھر کے اندر چلا گیا۔ اجلاس میری عدم موجودگی میں بھی ہوا لہٰذا میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے''۔[۳۲]

شاہی مسجد لاہور: چندہ وصولی کی جھولیاں چھین لی گئیں

یہ امر قابل ذکر ہے کہ تیس ہزار روپے جمع کرنے کے لیے جو اپیل جاری کی گئی تھی وہ نواب صاحب ممدوح، نواب مظفر خان، خان سعادت علی خان اور خان بہادر حاجی رحیم بخش کی طرف سے تھی۔ ان میں سے ہر بزرگ تیس ہزار روپے بآسانی اپنی جیب سے دے سکتا تھا، لیکن یہ ''محبان قوم'' چاہتے تھے کہ ٹیپ ٹاپ تو ان کی ہو اور روپیہ قوم کی جیبوں سے نکلے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ مسجد شہید گنج کو گرانے کا فیصلہ گورنر پنجاب کی ایگزیکٹو کونسل نے کیا تھا۔ نواب مظفر علی خان جو پنجاب پراونشل سروس سے ریٹائر ہونے کے بعد گورنر کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن ہو گئے تھے، اس وقت اجلاس میں موجود تھے جب مذکورہ فیصلہ کیا گیا تھا۔ ظاہر ہے کہ نواب صاحب موصوف نے مسجد کو گرانے کی تجویز کی تائید یا مخالفت کی ہوگی۔ یہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا کہ ان کا موقف کیا تھا۔ بہرحال عید آگئی اور شاہی مسجد میں خطیب نے چندے کی اپیل بہت زور شور سے کی۔ اس وقت منبر کے قریب نواب مظفر خان کے سوا تمام اپیل کنندگان موجود تھے۔ خطیب صاحب کی اپیل سے پہلے متعدد اشخاص چندہ وصولی کی جھولیاں لے کر مسجد میں پھیل گئے تاکہ نمازیوں سے چندہ وصول کیا جا سکے۔ میں منبر کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ جونہی خطیب صاحب منبر سے ہٹے، میں وہاں پہنچ گیا اور مائیک کے سامنے کھڑا ہو گیا، سب لوگ سمجھے کہ میں خطیب صاحب کی تائید میں کچھ کہوں گا، اس لیے کسی نے میرے منبر پر جانے پر اعتراض نہ کیا۔ میں نے جو تقریر کی اس کا خلاصہ یہ تھا کہ گورنر کی ایگزیکٹو کونسل نے جب مسجد شہید گنج کو گرانے کا فیصلہ کیا تھا تو چندے کی اپیل کرنے والے بزرگوں میں سے ایک یعنی نواب مظفر خاں صاحب اس وقت اجلاس میں موجود تھے، انھوں نے یا تو مسجد کو گرانے کے حق میں ووٹ دیا ہوگا یا اس کے خلاف۔ لہٰذا چندہ وصول کرنے سے پہلے یہ بات واضح ہونی چاہیے کہ انھوں نے اس موقع پر کیا موقف اختیار کیا۔ انھوں نے مسجد کو گرانے کے خلاف رائے دی تھی تو بچشم ما روشن دل ما شاد مسلمانوں کو خوب دل کھول کر چندہ دینا چاہیے۔ اور اگر انھوں نے اس وقت مسجد کو گرانے کے حق میں رائے دی تھی تو اب ان کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ پریوی کونسل میں اپیل دائر کرنے کے لیے چندہ طلب کریں لہٰذا جب تک اصل حقیقت سامنے نہ آجائے کوئی مسلمان چندہ نہ دے۔[۳۳]

خواجہ وحید کی خطابت پر علامہ کی تحسین:

میری اس تقریر سے مسجد میں کھلبلی مچ گئی۔ خان سعادت علی خان صاحب اور خان بہادر حاجی رحیم بخش صاحب جو موقع پر موجود تھے، اور سالہا سال سے مجھے اچھی طرح جانتے تھے، انھوں نے میری تردید میں کچھ نہ کہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے چندہ جمع کرنے والوں کو بٹھا دیا اور صندوقچیاں ان سے چھین لیں۔ اس دن جو رقم جمع ہوئی وہ ایک سو دس روپے کے قریب تھی۔ میں نے چونکہ عید کے دن اور وہ بھی شاہی مسجد میں تقریر کی تھی، اس لیے سارے شہر میں اس کا چرچا ہوا۔ حضرت علامہ کو جب اس واقعے کی تفصیل معلوم ہوئی تو انھوں نے دلی مسرت کا اظہار کیا، اور بوقت ملاقات میری "جرأت" کی داد دی۔ میں نے دراصل بالواسطہ انھیں کے موقف کی تائید کی تھی۔[۳۴]

خواجہ عبدالوحید کے آباؤ اجداد: میاں محمد بوٹا:

خواجہ عبدالوحید کے آباؤ اجداد کا تعلق وادی سری نگر میں اسلام آباد کے قریب ایک گاؤں پام پور سے تھا۔ یہ گاؤں اور اس کے قرب و جوار کا علاقہ زعفران کی کاشت کے لیے معروف ہے۔ محمد دین فوق نے تاریخ اقوام کشمیر میں اس خاندان کا شمار وائیں ذات کے نمایاں خاندانوں میں کیا ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے دادا میاں محمد بوٹا کوئی دو صدیاں پیشتر انیسویں صدی کے اوائل میں تلاش معاش کی غرض سے لاہور آئے اور پھر یہیں کے ہو رہے۔ یہاں انھوں نے ایک عام مزدور کی حیثیت سے عمارت سازی کا فن سیکھا اور اپنی خداداد صلاحیتوں کی بدولت اس ہنر میں خوب مہارت بہم پہنچائی۔ جلد ہی ان کا شمار صف اول کے عمارت سازوں میں ہونے لگا۔ کچھ مدت بعد انھوں نے تعمیراتی ٹھیکے لینے شروع کر دیے۔ لاہور کے اکثر و بیشتر مکانات اور حویلیاں ان کی تعمیراتی مہارت کا نمونہ ہیں۔[۳۵]

میاں محمد بوٹا: فارسی کا اعلیٰ ذوق

علمی و ادبی ذوق کے باعث لاہور کے اہل علم سے ان کے قریبی روابط تھے اور ان کا گھر علمی مجالس کے لیے معروف تھا۔[۳۶] اپنے علم و فضل کے باعث لاہور کے ممتاز خاندانوں میں شمار ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تین بیٹوں سے نوازا تھا۔ خواجہ رحیم بخش [۳۷] دوسرے بیٹے خواجہ امیر بخش [۳۸] تیسرے بیٹے خواجہ کریم بخش [۳۹]

۱۹۱۸ء: للی لاج: اہم تہذیبی مرکز

میاں محمد بوٹا کے تینوں بیٹوں کی رہائش "للی لاج" محلہ بھابڑیاں میں تھی جو لاہور میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۸ء تک ادبی اور سماجی سرگرمیوں کا اہم مرکز تھا۔ ہر شام اس دور کی نامور ہستیاں للی لاج میں جمع ہوتیں۔ ان جامع کمالات ہستیوں میں علامہ محمد اقبال، سر عبدالقادر، مولانا ظفر علی خان، سر شہاب الدین، مولوی احمد دین وکیل

اور مولوی انشاء اللہ خان مدیر "اخبار وطن" تواتر سے شریک ہوتے تھے۔ یہ محفلیں آدھی رات تک گرم رہتی تھیں۔ حکیم احمد شجاع نے "خون بہا" میں سر عبدالقادر، شہاب الدین، احمد دین، عبداللہ ٹونکی کے ساتھ ساتھ ان تینوں بھائیوں کا ذکر نہایت عمدہ انداز میں کرتے ہوئے لکھا ہے کہ سر محمد اقبال مرحوم جب تک اپنا کلام پہلے ان بزرگوں کو سنا نہ لیتے تھے اسے کسی مجلس میں نہ پڑھتے تھے۔[۴۰]

ادب دوستی اور علم نوازی اس خاندان کا امتیازی وصف تھا۔ یہ حضرات لاہور کی ادبی مجالس کی روح رواں تھے۔ علامہ اقبال مرحوم نے انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں جو نظمیں سنائیں اس حویلی کے مکینوں کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ انھوں نے وہ نظمیں پہلے سنیں۔ بزرگوں نے بچوں کو اجازت دے رکھی تھی کہ جب تک وہ چاہیں ان محفلوں میں بیٹھے رہیں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ محفلیں کتنی پاکیزہ تھیں کہ بچے بلا روک ٹوک اس میں شرکت کرتے تھے۔

اس عہد کی تہذیب وثقافت:

خواجہ عبدالوحید کا بیان ہے کہ "اس زمانے کی محفلوں میں عموماً فرشی نشست ہوتی تھی، کرسیاں یا صوفے شاذونادر ہی دیکھنے میں آتے اور دستور یہ تھا کہ پہلے زمین پر بوریا بچھایا جاتا اس پر دری پھیلائی جاتی، اس کے اوپر چاندنی پھر قالین سہارے کے لیے گاؤ تکیے، سردیوں کے دنوں میں کمرے کے وسط میں لوہے کی انگیٹھی جس میں کوئلے دہکتے رہتے۔ ۱۹۱۸ء میں یہ محفل اجڑ گئی اور للی لاج ویران ہو گیا۔[۴۱]

للی لاج کے مکین: اقبال مرحوم سے خاص تعلقات

للی لاج کے مکینوں سے اقبال مرحوم کا خاص تعلق تھا۔ لہٰذا خواجہ وحید کے چچازاد بھائی خواجہ فیروز الدین کی شادی اقبال مرحوم کے مشورے پر ان کی خواہر نسبتی سے طے پائی۔ ۱۹۱۰ء میں برات لاہور سے گجرات گئی۔ گجرات کے ڈاکٹر شیخ عطاء محمد آئی تھے، برات کا استقبال کرنے والوں میں علامہ اقبال مرحوم بھی تھے۔ رواج کے مطابق برات کے ساتھ پانی پت کی مشہور طوائف بھی تھی جس نے رقص وسرود کی محفل گرمائی، آتش بازی کا زبردست مظاہرہ بھی ہوا۔

خواجہ عبدالوحید: ولادت

میاں محمد بوٹا کے تیسرے بیٹے خواجہ کریم بخش کے یہاں خواجہ عبدالوحید کی ولادت ۳/جنوری ۱۹۰۱ء بمطابق ۱۳/رمضان المبارک ۱۳۱۸ ہجری کو ہوئی اس وقت خواجہ وحید کے تمام چچا "للی لاج" میں ہی رہتے تھے۔ یہ حویلی اس خاندان کی محبت، اتحاد اس عہد کی تہذیب وثقافت کی علامت بن گئی تھی۔ خواجہ عبدالوحید نے اسلامیہ ہائی اسکول شیراں والا گیٹ، لاہور سے میٹرک تک تعلیم حاصل کی اس زمانے میں شیروں والا گیٹ کی مسجد حضرت مولانا احمد علی لاہوری کی برکت سے لاہور کی روحانی زندگی کا اہم ترین حصہ تھی لہٰذا خواجہ عبدالوحید نا تو طالب علمی

سے ہی مولانا احمد علی لاہوری کی صحبت سے استفادہ کرنے لگے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ کی شہادت ہے کہ وہ اور خواجہ عبدالوحید بعد نماز فجر مولانا لاہوری کے ولولہ انگیز درس قرآن اوائل عمر سے شریک ہوتے تھے۔[۴۲]

اقبال مرحوم کی سفارش پر گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ:

میاں محمد بوٹا کے خانوادے تمام بچوں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں تعلیم حاصل کی۔ لیکن خواجہ عبدالوحید علمی اشتغال، بے پناہ مطالعہ کی عادت اور غیر نصابی کتابوں میں انہماک کے باعث مطلوبہ نمبر حاصل نہ کر سکے۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ انھیں گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ نہ مل سکے لہٰذا اپنا مسئلہ خواجہ صاحب نے علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں خود پیش کیا۔ کالج کے پرنسپل جی اے سنٹین نے علامہ اقبال مرحوم کی سفارش پر انھیں گورنمنٹ کالج میں داخلہ عطا کر دیا گیا جس کے باعث اس خاندان کی روایت کا تسلسل قائم رہا۔[۴۳] اس واقعے سے اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وِلّی لاج کے مکینوں سے اقبال مرحوم کا تعلق کس درجے کا تھا اور اس گھر کے بچوں سے بھی علامہ اقبال مرحوم کی کس قدر بے تکلفی تھی کہ خواجہ صاحب نے اپنا مسئلہ خود علامہ اقبال مرحوم کی خدمت میں پیش کیا اور علامہ اقبال مرحوم نے سفارش میں تذبذب سے کام نہ لیا۔ لیکن خواجہ عبدالوحید مکتب کی رسمی تعلیم کے لیے پیدا نہ ہوئے تھے وہ کتاب فطرت کے مطالعے کے ساتھ ساتھ کتابوں کے مطالعہ سے خاص شغف رکھتے تھے۔ لہٰذا امر کے امتحان میں ناکام ہو گئے اور تعلیم ترک کر دی لیکن مطالعہ جاری و ساری رہا۔ مولانا احمد علی لاہوری کی صحبت نے انھیں قرآن حکیم، اسلام، تاریخ اسلام اور ملت اسلامیہ کا مداح بنا دیا۔ وہ قرآن میں ڈوب گئے اور پھر اسی کے ہو گئے اور ساری زندگی اسلام کی خدمت میں بسر کر دی۔ جوانی کے آغاز ہی میں مولانا احمد علی لاہوری کے دست حق پرست پر بیعت سے مشرف ہوئے اور ان کے درس میں باقاعدگی سے شریک ہوتے رہے۔ نہایت عالم و فاضل انسان تھے۔ اقبالیات، اسلامیات اور تاریخ آپ کی دلچسپی کے خاص میدان تھے۔ اردو، انگریزی پر قدرت رکھتے تھے۔[۴۴]

خواجہ عبدالوحید: مطالعے کا جنون:

خواجہ صاحب کو جنون کی حد تک مطالعے کا شوق تھا۔ سائیکل پر کپڑے کے دو تھیلے رکھتے تھے۔ ان تھیلوں میں کتابیں ہوتیں، یہ تھیلے سائیکل کے پیچھے کے دونوں طرف لٹکتے رہتے، جہاں مال روڈ پر ٹریفک رکتی وہیں کتاب تھیلے سے نکال کر مطالعہ کرنے لگتے، مطالعے کے دوران پنسل سے نشان لگاتے۔[۴۵] ۱۹۳۵ء میں خواجہ عبدالوحید دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل لاہور میں کلرک کے معمولی عہدے پر مقرر ہوئے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے آپ کو غیر معمولی ذہانت، صلاحیتیں اور علمی و تحقیقی مزاج عطا فرمایا تھا۔ بظاہر یہ معمولی سرکاری عہدیدار اس عہد کے عالمی سطح کے مفکرین و دانشوروں سے براہ راست رابطہ رکھتا تھا۔ ان روابط میں علامہ اقبال مرحوم کی شخصیت کو رہنما کی حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے علمی مرتبے کی رفعت کا اندازہ اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ خواجہ صاحب نے مولانا عبدالماجد

دریا بادی اور مولانا عبداللہ یوسف علی کے کیے گئے قرآن مجید کے انگریزی ترجموں کی تصحیح کی۔ مولانا ظفر علی خان نے مولانا شبلی نعمانی کی "الفاروق" کا انگریزی میں ترجمہ "Umar The Great" کے نام سے کیا۔ اس ترجمے کی نظر ثانی کے لیے ناشر نے خواجہ صاحب سے رجوع کیا۔ پی ایچ ڈی کے لیے لکھے گئے مقالات پر نظر ثانی کے لیے ڈاکٹر غلام جیلانی برق (موضوع: ابن تیمیہ) اور ڈاکٹر عبدالغنی [موضوع: عبدالقادر بے دل] نے خواجہ صاحب سے رجوع کیا اور ان مقالات کی تصحیح کے بعد انھیں داخل کرایا گیا۔ [۴۶]

کتابوں اور چائے خانہ کا کاروبار:

خواجہ صاحب کی ملازمت معاشی امور کے لیے کفیل نہ تھی، ۴۹ روپے کی معمولی تنخواہ گھریلو ضروریات، خواجہ صاحب کے ذوق مطالعہ، مطالعہ فطرت میرو فی الارض کی عملی تفسیر اور مہمان نوازی کے لیے ناکافی تھی لہٰذا شدید مالی دباؤ کے باعث انھوں نے کاروبار شروع کیا۔ روزنامچے کے مطابق

جناب اس عرصے میں مسٹر محمد ابراہیم [ساکن ساہیوال ڈی] کی شراکت میں کاروبار شروع کیا۔ اس کاروبار کے دو حصے تھے۔ ایک THE ORIENTAL PUBLISHING HOUSE دوم CAFE DE SHALAMAR۔ پہلے کام کے دو حصے ہیں ا۔ ایک بک ایجنسی یعنی لوگوں کے لیے کتابیں مہیا کرنا، دوم تالیف واشاعت۔ یعنی نئی نئی کتابیں شائع کرنا۔ اس آخری سلسلے میں سب سے پہلے خواجہ عبدالوحید کی کتاب "فضائے عالم کے عجائبات" کتابت کے لیے دی گئی ہے۔ اس کے بعد سید محمد عبداللہ صاحب کی کتاب متعلقہ ہندوؤں کی فارسی دانی شائع کرنے کا ارادہ تھا اور پھر انہی کے قلم سے ایک کتاب ہندوستان کی سیاسی تحریکات اور ان میں مسلمانوں کے عنصر پر لکھوانے کا ارادہ تھا"۔ لیکن اس ضمن میں کیا پیش رفت ہوئی اس بارے میں معلومات نہیں مل سکیں۔

کاروبار کا دوسرا حصہ زیادہ دلچسپ تھا۔ شالامار باغ کے سامنے ایک ہوٹل خیموں میں جاری کر دیا گیا، اسی قسم کا ایک ہوٹل مقبرہ جہانگیر کے قریب بھی کھولنے کا ارادہ تھا۔ غالباً یہ کاروبار ناکام رہا کیونکہ روزنامچے کے مطابق خواجہ صاحب کے مالی حالات سنبھل نہ سکے اور وہ فکر معاش سے وہ کبھی آزاد نہ ہو سکے۔ خواجہ عبدالوحید کی روایت کا احیاء مدیر چٹان شورش کاشمیری نے ۱۹۷۰ء میں کیا تھا۔ کشمیر ریسٹورنٹ کے نام سے چٹان بلڈنگ میں کھلنے والا یہ ہوٹل لاہور میں دائیں بازو کے دانشوروں کا مرکز بن گیا تھا۔

لٹی لاج سے قدیر منزل: نیا سفر

لٹی لاج کی محفلیں ۱۹۱۸ء میں اجڑ گئیں تھیں۔ علامہ اقبال مرحوم اپنے نئے مکان میں منتقل ہو گئے تھے خواجہ عبدالوحید نے بھی علامہ اقبال مرحوم کی نئی رہائش گاہ جاوید منزل کے قریب اپنا آشیانہ تعمیر کر لیا تھا۔ چار کمروں اور ایک وسیع و عریض دالان پر مشتمل یہ مکان ۱۹۳۳ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ "لٹی لاج" کی طرح "قدیر منزل" بھی

علمی و ادبی اور معاشرتی و ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز بن گئی۔ اس مکان کو اپنے دور کی جلیل القدر ہستیوں کے قدم چومنے کا شرف حاصل ہے۔ کمال اتاترک کے دست راست انور پاشا، ترکی کی خالدہ ادیب خانم، بلبل ہند سروجنی نائیڈو، مفتی اعظم فلسطین، حضرت امین الحسینی، حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ، مولانا سید سلیمان ندویؒ، ڈاکٹر حمید اللہؒ، ڈاکٹر نظام الدین، قاضی اختر میاں جوناگڑھی، مولانا مظہر علی اظہر، ڈاکٹر محمد احمد، ڈاکٹر ظفر الحسن، ڈاکٹر برہان فاروقی کے علاوہ بے شمار صاحبان کمال نے اس گھر کو رونق بخشی۔ سید سلیمان ندوی جب بھی لاہور تشریف لاتے، اسی مکان میں قیام فرماتے۔[۴۷]

خواجہ عبدالوحید علامہ محمد اقبال مرحوم کی رہائش "جاوید منزل" کے قریب "قدیر منزل" مکان نمبر ایک میں رہتے تھے۔ اس کے باوجود علامہ اقبال مرحوم سے ان کی ملاقاتیں بہت کم ہوتی تھیں، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "کل چار بجے کے قریب دوبارہ گھر سے نکلا اور بہت مدت کے بعد علامہ سر محمد اقبال مرحوم کے ہاں گیا۔ افسوس ہے کہ باوجود اس قدر قرب کے اُن سے شرف صحبت کا بہت کم موقع ملتا ہے جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ اُن کے پاس بیٹھنے کے لیے جس ذہنی یکسوئی اور قلبی اطمینان کی ضرورت ہوتی ہے" خستہ معاشی حالات کے باعث خواجہ صاحب کو یکسوئی حاصل نہ تھی، کتابوں کی خریداری، احباب کی خاطر مدارت، علمی و ادبی سرگرمیاں، عالم اسلام کے تمام مقتدر لوگوں سے تعلقات، خط و کتابت، گھریلو ذمہ داریوں کا بوجھ، مختلف احباب کی ذمہ داری، ۴۹ روپے کی قلیل تنخواہ میں اٹھانا بہت مشکل تھا، جس کے باعث خواجہ صاحب ہمیشہ تنگی میں رہے لیکن کبھی خودداری پر آنچ نہ آنے دی، اپنے احباب سے کبھی مالی امداد کا سوال کیا نہ انھیں مالی ابتری سے آگاہ کیا۔

خواجہ عبدالوحید: معاشی حالات

خواجہ صاحب نے خون دل میں قلم ڈبو کر اپنے معاشی حالات کا ذکر روزنامچے میں تحریر کیا ہے۔ روزنامچے کا یہ حصہ عہد حاضر کی نسل کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ ہمارے بزرگوں نے کن سخت حالات، مشکل معاشی مسائل میں وسائل کے بغیر دین کی کس قدر خدمت کی۔ روزنامچے کے اس حصے کو پڑھے بغیر خواجہ عبدالوحید کی عظمت کا نقش دل پر قائم نہیں ہو سکتا۔ ان سطور کو پڑھنے والا یقین نہیں کر سکتا کہ اس قدر تکالیف کے باوجود خواجہ صاحب نے اردو اور انگریزی میں ہزاروں صفحات کیسے لکھ ڈالے اور ایک بھرپور تہذیبی سیاسی معاشرتی زندگی کیسے گزاری؟ دین کا جذبہ ان پر سب سے غالب جذبہ تھا۔ اس کی خاطر انھوں نے کتنے دکھ جھیلے اور کیسے کیسے حالات میں دین کی شمع خون دل کی تحریروں سے روشن رکھی۔

"میری اپنی زندگی جس قدر عبرت ناک ہے، اس کی مثال بمشکل مل سکے گی۔ آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اس زندگی کا مقصد کیا ہے۔ اس وقت تک کوئی نصب العین قائم نہیں کیا۔ نصف عمر بھی گزر چکی اور زیادہ سے زیادہ نصف باقی ہے۔ خدا جانے اس بقیہ عمر میں گزشتہ کوتاہیوں کی تلافی ہو گی یا نامۂ اعمال اور بھی سیاہ ہو گا۔[۴۹]

☆☆میرے لیے اِس وسیع عالم میں جہاں ہر شخص محو و سرشار مسرت نظر آتا ہے، دلچسپی کا کوئی سامان نہیں۔ زمین باوجود اپنی وسعت کے میرے لیے اپنے اندر کوئی کشش نہیں رکھتی۔ سال آتے اور ختم ہو جاتے ہیں لیکن میری پریشانیاں اور تفکرات بدستور اپنے حال پر قائم ہیں۔

اے یاس تو نے آ کے اُسے بھی مٹا دیا
لذت سی کچھ جو شکوۂ رنج و محن میں تھی
چھپا لے دامنِ رحمت میں بے گناہوں کو
الٰہی تجھ کو غفور الرحیم کہتے ہیں
کہیں عدو نہ کہیں دیکھ کر ذلیل ہمیں
یہ بندے اس کے ہیں جس کو کریم کہتے ہیں

☆☆بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ یہ زمانہ میری انتہائی ذہنی پریشانیوں کا زمانہ ہے۔ جس قدر پریشانی مجھے اِن دنوں لاحق ہے وہ ایک کم ہمت شخص کے لیے حوصلہ شکنی بلکہ خودکشی تک کی نوبت لاسکتی ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میں اپنی زندگی کے اصلی مقصد (خدمتِ اسلام) میں مصروف رہتا ہوں۔ کاش میرے راستے سے مشکلات ہٹ جائیں اور میں کامل یک سوئی اور جمعیتِ قلبی کے ساتھ اسلام کی خدمت میں منہمک ہو سکوں۔

میں اِس بات کا بھی یقین رکھتا ہوں کہ اگر رب العالمین مجھے میری پریشانیوں سے نجات عطا فرما دے تو میں خدمتِ اسلام کا کام بیش از بیش انہماک و مستعدی کے ساتھ انجام دے سکوں گا۔

الٰہی اس گدائے بے نوا کی داستاں سن لے
نہ جائے آستانِ غیر پر جو التجا لے کر
کیا شمع کے نہیں ہیں ہوا خواہ اہلِ بزم
ہو غم ہی جاں گداز تو غم خوار کیا کریں[۳۹]

☆☆کیا خدائے رحمٰن و رحیم کی رحمتِ بے پایاں کی وسعت میرے گناہوں کی سیاہی کو ڈھانپنے کے لیے بس نہیں کرتی؟ کیا اُس غفور الرحیم ذات کے خزانہ ہائے غیب میری مشکلات کے حل کا سامان اپنے اندر نہیں رکھتے۔ کیا مجھے اُس کی دست گیری و حاجت روائی سے مایوس ہو جانا چاہیے؟

مرے گناہ زیادہ ہیں یا تری رحمت
مرے کریم بتا تو حساب کر کے مجھے

☆☆دوسری طرف میں اطمینان و یک سوئی سے یکسر محروم ہوں۔ دن رات کا کوئی وقت ایسا نہیں جب کہ مجھے بے فکری حاصل ہو۔ چوبیس گھنٹوں کا کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرتا کہ مجھے میری عزت اور میرا وقار محفوظ معلوم ہوتا ہو۔ خدا جانے

اس صورت حال کا نتیجہ کیا ہوگا۔

☆☆مالی پریشانیاں حد سے بڑھتی جا رہی ہیں اور مخلصی کی کوئی صورت پیدا ہوتی نظر نہیں آتی۔ سوائے اس کے وہ خدا جس کی ذات عظیم ہے، اپنی عظمت کے طفیل مجھے ذلت و رسوائی سے بچائے۔ وہ خدا جو حکیم ہے اپنی حکمت کاملہ سے میری سرخروئی کا سروسامان اپنے خزانہائے غیب سے پیدا فرمائے۔ وہ خدا جس کی رحمت بے پایاں ہے مجھے اپنے سایۂ رحمت میں پناہ عطا فرمائے۔[۵۰]

☆☆وہ عزیز ذات جو گرے ہوئے کو اٹھاتی ہے، یقیناً میری ذلت و رسوائی کو مبدل بہ سرخروئی فرما سکتی ہے۔

خوار ہوں، بیکار ہوں، ڈوبا ہوا ذلت میں ہوں
کچھ بھی ہوں، لیکن ترے محبوب کی امت میں ہوں

میری زندگی کا ہر لمحہ پریشانی و رسوائی میں بسر ہو رہا ہے۔ کسی وقت مجھے اطمینان و بے فکری میسر نہیں ہوتی۔ میرا دل ہر وقت خوف سے دھڑکتا ہے۔ میرا دماغ ہر لحظہ ہجوم افکار سے پریشان رہتا ہے۔ میں ہر وقت تقاضا کرنے والوں کے خوف سے بیمار رہتا ہوں۔ جب تک گھر پر رہتا ہوں، میری طبیعت اداس رہتی ہے۔ زبان ہر وقت خاموش ہوتی ہے۔ گویا کسی کو میری ہستی کا علم نہیں ہوتا۔ کسی کو میری موجودگی کا احساس نہیں ہوتا۔[۵۱]

☆☆اہلیہ ایک عرصے سے علیل ہیں۔ ایک طرف اُن کی علالت ہے، دوسری طرف ہر طرح کے کام کاج کا بوجھ اُن پر، تیسرے کامل بے سروسامانی، چوتھے ہر روز کے تقاضے۔ اُن کی حالت دیکھ دیکھ کر دل خون ہوتا ہے۔ بچے بے سروسامانی کی حالت میں دن گزارتے ہیں۔ اُن کی تعلیم و تربیت کا کوئی انتظام نہیں، اُن کی صحت غیر تسلی بخش، اُن کی ضروریات کی کفالت نابود۔[۵۲]

☆☆میں ایک مدت سے مالی پریشانیوں کے باعث مضمحل رہتا ہوں۔ ہر وقت اپنی ذمہ داریوں اور ذلت و رسوائی کا احساس انتہائی ذہنی تکلیف میں مبتلا رکھتا ہے۔[۵۳]

☆☆میں ایک خوفناک ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ ہر لمحہ جو مجھ پر گزرتا ہے ناقابل بیان و ناقابل برداشت تکلیف اپنے ساتھ لاتا ہے۔ میری زندگی سخت تلخ اور میرے اوقات انتہائی طور پر دشوار گزر رہے ہیں۔ خدا جانے اس کا نتیجہ کیا نکلنے والا ہے۔[۵۴]

☆☆میرے لیے ہر صبح ذلتوں اور رسوائیوں کا نیا سامان لے کر آتی ہے۔ جب صبح کو اٹھتا ہوں تو دل سہا ہوتا ہے کہ ابھی کسی قرض خواہ نے آواز دی۔ ابھی کسی تقاضا کرنے والے کی آمد کی اطلاع آئی۔ دل ہر وقت دھڑکتا رہتا ہے۔ گھر پر ہوں یا دفتر میں، مطالعے میں مشغول ہوں یا نماز میں، کسی وقت دل کو اطمینان اور چین نصیب نہیں ہوتا۔ حیران ہوں کہ زندگی کی یہ بدمزگی اور حالات کی ناساعدت کہاں پہنچ کر ختم ہوگی۔[۵۵]

☆☆عام لوگوں کے لیے یکم تاریخ روزِ عید کا حکم رکھتی ہے اور اس کی وجوہ ظاہر ہیں لیکن میرے لیے ہر مہینے کا پہلا روز

روزِ محشر کا حکم رکھتا ہے۔ میرا دل اس سے ایک روز پہلے دھڑکنے لگتا ہے۔ دل و دماغ پر خوف طاری ہوتا ہے اور میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ میں متاعِ حیات سے محروم ہو جاؤں تاکہ ذلت و رسوائی کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

☆ہمارا درمیانی چند روز ہوئے اس بحث میں پڑ رہے تھے کہ جب سے تمہاری شادی ہوئی ہے تمہارے تعلقات لوگوں سے بگڑ گئے ہیں۔ گویا بیوی کی وجہ سے میں لوگوں سے بگڑتا ہوں اور حالت یہ ہے کہ نومبر ۳۵ء سے اب تک ۳۷ء آگیا، اس تمام عرصے میں ۴۹-۳۰ روپے ماہوار سے زیادہ میں گھر میں نہیں لایا اہلیہ بیمار ہیں اور ان کا علاج محال ہے۔ بچوں کی صحت بگڑ رہی ہے۔ گھر میں کھانے کو نہیں۔ میرے پاس نہ ٹوپی ہے نہ کوٹ قمیص اور پاجامے سب پھٹے ہوئے ہیں۔ حجامت تک کے پیسے نہیں۔ بچے ایک ایک پیسے کے لیے روتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایک مریدِ زن کے گھر کا حال یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔[۵۶]

☆میری ذلت و رسوائی کا ہر روز نیا سامان پیدا ہو جاتا ہے جس کی بنا پر میں ہر روز نئے لوگوں کی نظروں میں گر جاتا ہوں۔ بعض مخلص احباب کہا کرتے ہیں کہ دنیا میں تکلیف و مصیبت آزمائش کے لیے آتی ہیں۔ قرآنِ حکیم نے جن مصائب کا ذکر کیا ہے۔

☆تو ان میں یہ کہیں نہیں کہ اللہ کے بندوں کو ذلت و رسوائی میں بھی مبتلا کیا جاتا ہے۔ خدا جانے میری ذلت و رسوائی کا اصلی باعث کیا ہے۔ کیا واقعی میں اپنے تمام ماحول میں اس قدر رذیل انسان ہوں کہ میرے لیے ہر طرح کی ذلت و رسوائی کا سر و سامان قدرت کو پیدا کرتے رہنا چاہیے۔ اس دنیا میں وہ لوگ بھی بستے ہیں جن کی زندگیوں کا کوئی لمحہ خدمتِ دین و خلق میں نہیں گزرتا۔ یہاں وہ لوگ بھی زندہ ہیں جن کا ہر روز عیش و عشرت یا جائز میں بسر ہوتا ہے۔ میں نے تو گزشتہ نو ماہ میں سینما بھی نہیں دیکھا۔ میری زندگی کا بیشتر حصہ خدمتِ دین و خلق میں گزرا ہے۔ اور میں نے اسی کو زندگی کا نصب العین سمجھا۔ میں نے اپنی دنیوی حالت کو بہتر بنانے کی کوئی کوشش نہ کی۔ میری زندگی کا بہترین حصہ دوسروں کی خدمت میں گزرا اور میں نے ہمیشہ خلوص و محبت سے اپنوں اور بیگانوں کی خدمت کی۔ اس کے بعد بھی میں دیکھتا ہوں کہ آوارہ و عیاش مرد اور عورتیں اپنی من مانی مرادیں اس دنیا میں پا رہے ہیں۔ اور میں اور میرے بچے کوڑی کوڑی کو ترستے ہیں۔[۵۷]

☆جس بے سر و سامانی اور ذلت و رسوائی کا سامنا آج کل میں کر رہا ہوں، اس سے مجھے یقین ہوتا ہے کہ اس وسیع دنیا میں مجھ ایسا گنہگار اور کوئی نہ ہوگا۔ کیا ایسے گنہگار کو زندہ رہ کر اپنی گنہگاری میں روز بروز اضافہ کرتے رہنا چاہیے؟

اقبال کے مردِ مومن کا عملی نمونہ: خواجہ عبد الوحیدؒ

مشکل معاشی حالات و قرض داروں کے تقاضوں سے پریشان خواجہ صاحب نے اپنی خودداری کو بر

حال میں برقرار رکھا۔ تنگی و ترشی کے باوجود فکری، علمی و قلمی محاذوں پر برطانوی استعمار کے خلاف ایمان کی مشعل روشن رکھی۔ اقبال مرحوم کے مرد مومن کی سچی اور چلتی پھرتی تصویر خواجہ صاحب کی سیرت کے سوا کہاں مل سکتی ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے اخلاص اور ایمان کی گواہی مولانا عبدالماجدؒ دریا آبادی کا وہ تبصرہ ہے جو خواجہ عبدالوحید کے رسالے ''اسلام'' کے لیے لکھا گیا۔ ماجدؒ صاحب نے لکھا تھا کہ اسلام کو ہندوستان کے ہر کتب خانے میں رکھا جائے۔ اور تشہیر کر کے اس کی اشاعت ہزاروں تک پہنچا دی جائے۔ آخر آٹھ صفحے کے ایک رسالے میں کوئی تو بات ضرور تھی جس کی قدر دانی ماجدؒ صاحب جیسے فاضل اجل کر رہے تھے۔ روزنامچے سے خواجہ عبدالوحیدؒ کی استقامت، بے لوثی کا نہایت عجیب احساس ہوتا ہے۔ ایک ایسا محقق، فاضل شخص جس کی تحریروں کی تحسین سید سلیمانؒ ندوی اور علامہ اقبالؒ جیسے عبقری فرماتے تھے۔ اس کا گھر بھوک سے نڈھال تھا۔ حجامت تک کے پیسے نہ تھے۔ بچے ایک ایک پیسے کے لیے روتے تھے لیکن اس مرد مومن نے کبھی کسی کے سامنے ہاتھ نہ پھیلایا، اس کا اجر اللہ تعالیٰ نے انھیں کیسے عطا فرمایا ان حالات میں مشفق خواجہ جیسے بیٹے کی پیدائش خواجہ عبدالوحید کے ایثار و قربانی کا ثمر تھا۔ اس خودداری کے باعث خواجہ صاحب کا پورا خانوادہ خوش حال اور پاکیزہ زندگی بسر کر رہا ہے اور معاشرے میں آج بھی عزت اور محبت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ خواجہ عبدالوحیدؒ کی اس خودداری اور اخلاص کا صلہ یہ ہے کہ ان کے خاندان میں سب سے زیادہ نامورئی خواجہ عبدالوحید کے حصے میں آئی اور ان کے صاحبزادے مشفق خواجہ کے ذریعے یہ خاندان تاریخ ادب اردو میں امر ہو گیا۔

خواجہ عبدالوحیدؒ: علمی و ادبی زندگی

ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں ہو گیا تھا لیکن سب سے پہلا مضمون ۱۹۲۷ء میں مخزن میں 'طبعی حالات کا اثر تاریخ و تمدن انسانی'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ شاعری سے دلچسپی تھی سینکڑوں اشعار کہے۔

پندرہ روزہ ''اسلام'' کا اجراء: علامہ اقبالؒ کی سرپرستی

خواجہ صاحب کی مجاہدانہ زندگی کا سب سے اہم کارنامہ رسالہ ''اسلام'' کی ادارت ہے۔ افسوس یہ ہے کہ اس موضوع پر کسی محقق نے کام نہیں کیا۔ اس رسالے نے برعظیم پاک و ہند کے انگریزی خواں طبقے میں اسلام کی شمع کس طرح روشن رکھی۔ اس رسالے نے علامہ اقبالؒ اور مولانا احمد علیؒ کے حسین امتزاج کے ذریعے جدید و قدیم کی کشمکش میں امت کی کیا رہنمائی کی۔ تحقیق کا نہایت اہم موضوع ہے۔

اسلام پر پابندی: خواجہ عبدالوحیدؒ کا مضمون

مجلس خدام الدین نے لاہور سے انگریزی زبان میں پندرہ روزہ ''اسلام'' نکالا تو خواجہ عبدالوحید کو اس کا مدیر مقرر کیا گیا۔ پہلا شمارہ ۷/جون ۱۹۳۵ء کو شائع ہوا، آخری شمارہ ۷/مارچ ۱۹۴۰ء کو شائع ہوا۔ اس رسالے پر بطور مدیر مسئول لاہور کے مشہور آسٹریلیا خاندان کے خواجہ محمد رشید دائمی کا نام شائع ہوتا تھا، کیونکہ خواجہ صاحب

سرکاری ملازم تھے اور ان کا نام شائع نہیں ہو سکتا تھا۔ رسالے میں حکومت پر شدید نکتہ چینی ہوتی تھی۔ خواجہ عبدالوحید قلم کی تلوار سے کوئی موقع جانے نہ دیتے تھے۔ خواجہ صاحب کے قلم کی کاٹ کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ انھوں نے ۷ مارچ ۱۹۴۰ء کے شمارے میں اخبار کے صفحہ اول پر ایک مرتبہ مضمون "ممالک مشرقی میں مغربی حکومتوں کے مظالم" کے عنوان سے شائع کیا جس میں مختلف انگریزی کتابوں کے اقتباسات جمع کر دیے تھے اور اپنی طرف سے کوئی اظہار رائے نہ کیا تھا۔ تمام کتابیں بازار اور کتب خانوں میں مہیا تھیں۔ لیکن اس کے باوجود حکومت نے اخبار کی ضمانت ضبط کر لی اور ہائی کورٹ نے اس پابندی کے خلاف درخواست مسترد کر دی۔ یہ شمارہ اسلام کا آخری شمارہ ثابت ہوا۔ سرکار کے حکم پر اسلام ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔ اس اخبار سے علامہ اقبال مرحوم کا خصوصی تعلق تھا علامہ اقبال مرحوم نہ صرف اسلام کا بغور مطالعہ فرماتے۔ بلکہ وقتاً فوقتاً مشورے بھی دیتے۔ خواجہ وحید جو اداریے لکھتے اشاعت سے پہلے علامہ اقبال مرحوم ان کی سماعت فرماتے اور ترمیم و اصلاحات بھی تجویز کرتے جس کے مطابق خواجہ صاحب اپنی تحریروں میں تبدیلی کر لیتے تھے۔ بارہا ایسا ہوا کہ علامہ اقبال مرحوم نے اداریے کے لیے موضوع کا تعین فرمایا اور خواجہ صاحب نے اس ارشاد کی تعمیل کی۔ اسلام آٹھ صفحات پر مشتمل اخبار تھا جس میں کوئی مضمون دو صفحات سے زیادہ ضخامت کا نہ ہوتا تھا۔[۵۹]

اخبار اسلام پر اعتراضات:

اسلام کی اشاعت کا اعلان ہوتے ہی لاہور سے دو ہفتہ وار انگریزی پرچے فوراً شائع ہو گئے۔ ایک فضل کریم خاں درانی کا پرچہ "دی ٹروتھ" اور دوسرا قادیانیوں کا "دی سن رائز"۔

اخبار "اسلام" نے جلد ہی مقبولیت حاصل کر لی لہٰذا رسالے پر مختلف افراد کی طرف سے زبانی تنقید شروع ہوئی، ایک اعتراض یہ تھا کہ پہلے پرچے میں ایک شیعہ کا مضمون کیوں شائع ہوا ہے۔ نیز یہ اعتراض بھی کیا گیا کہ ایک پرانی چیز اخبار میں شائع کیوں کی گئی، اخبار میں بعض ہندوؤں کے مضامین بھی شائع کیے گئے جس سے اخبار کی وسیع النظری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلام پر زیادہ اعتراضات ہوئے تو حضرت احمد علیؒ کے مشورے سے سید سلیمان ندوی اور ماجدؒ دریا آبادی سے رائے لی گئی۔ مولانا سلیمان ندوی نے لکھا:

اسلام کی تحسین: سلیمان ندویؒ، ماجدؒ

"ایجابی پہلو سے کسر اتنی ہے کہ حصۂ مضامین (ریڈنگ میٹر) ذرا کم ہوتا ہے اور تنوع بھی ذرا زیادہ ہونا چاہیے اور یہ بغیر اس کے ممکن نہیں کہ پرچہ یا تو ہفتہ وار کر دیا جائے اور یا پھر ضخامت دگنی کر دی جائے۔

ماجد دریا آبادی صاحب کی رائے تھی کہ

کاش ایک بار زبردست پروپیگنڈا کر کے اس کی اشاعت ۱۲-۱۵ ہزار

تک پہنچادی جائے اور کم از کم ہندوستان کے اندر تو انگریزی کی کوئی لائبریری،
ریڈنگ روم اور کلب اس سے خالی نہ رہنے پائے۔[۶۰]

٭ان آراء سے حضرت مولانا احمد علی کی کامل تشفی ہوگئی ہے اور انھوں نے نے خواجہ صاحب کے کام پر خوشنودی کا اظہار فرمایا ہے۔خواجہ صاحب روزنامچے میں لکھتے ہیں محض سعادتِ ایزدی ہے کہ مجھ ایسے تہی مایہ کے ہاتھوں خدمتِ اسلام کا ایسا کام انجام پا رہا ہے جس پر اکابرِ ملت اطمینان کا اظہار فرماتے ہیں۔سید[سلیمان ندوی] صاحب اور مولانا دریابادی دونوں انگریزی دان عالمِ دین ہیں اور اس لیے اُن کی آرا اس معاملے میں یقیناً سند کا حکم رکھتی ہیں۔[۶۱]

خواجہ عبدالوحید کی صحافت: لندن اسکول آف جرنلزم کی شہادت

٭رسالہ انگریزی میں نکلا تھا لہٰذا خواجہ عبدالوحید نے اپنے اور احبابِ مجلس خدام الدین کے اطمینان کے لیے اسلام کے مضامین کا ایک مجموعہ (غیر مکمل) لندن سکول آف جرنلزم کو اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ سر میکس میکمرٹن کی رائے اپنی مضمون نویسی کے متعلق حاصل کر سکیں۔[۶۲]

London School of Journalism کے ڈائریکٹر آف سٹڈیز Sir Max Pamberton نے خواجہ صاحب کی انگریزی تحریر اور اسلوبِ صحافت پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> It seems to me that you are doing reasonably well as a journalist already and I presume you have a more or less regular commission with this paper, and possibly with others as well.
>
> You certainly write very well and I hope you will pursue your gifts.[۶۳]

لندن اسکول آف جرنلزم کے تبصرے نے خواجہ صاحب کی انگریزی صحافت پر مہرِ تصدیق ثبت کر دی اور رسالے کے عقائد کی سند سید سلیمان ندوی اور ماجد دریا آبادی سے لی گئی اس طرح مخالفین کی جانب سے اڑائی جانے والی گرد جلد ہی بیٹھ گئی۔

اسلام میں پنڈت نہرو کے تبصرے کا جواب اقبال کے قلم سے:

اسلام نے علامہ سر محمد اقبال مرحوم کا وہ بیان جو پنڈت جواہر لال نہرو کے مضامین مطبوعہ "ماڈرن ریویو" کے جواب میں لکھا گیا تھا، "اسلام" کے پرچہ بابت ۲۲/جنوری میں چھوٹی تقطیع کے ۵۲ صفحات پر شائع کیا۔ تمام رسالہ اسی بیان پر مشتمل تھا۔یہ بیان مقالہ بن گیا تھا جس کا عنوان Islam Qadianism رکھا گیا تھا۔اس

مضمون میں احمدیت کے متعلق بہت سے اہم حقائق واضح کیے گئے ہیں۔ واضح رہے کہ اسلام صرف آٹھ صفحات کا اخبار تھا لیکن علامہ اقبال مرحوم کے بیان کی اہمیت کے پیش نظر اس کی ضخامت غیر معمولی طور پر بڑھا دی گئی۔ انجمن خدام الدین نے اسے کتابچے کی صورت میں بھی شائع کیا تھا۔

اسلام کے اداریے:

پندرہ روزہ "اسلام" کے تمام اداریوں کا مطالعہ کیا جائے تو علامہ اقبال مرحوم کے رجحانات، اس عہد کے مسائل، مشکلات، امت مسلمہ کے حالات، عالمی رفتار اور دیگر مباحث کا بخوبی اندازہ ہوگا۔ ہم اس مضمون کے دوسری قسط میں ان اداریوں کا محاکمہ پیش کریں گے۔

خواجہ عبدالوحید: انگریزی تصانیف

خواجہ عبدالوحید نے انگریزی زبان میں مندرجہ ذیل کتابیں اور کتابچے تحریر کیے:

[1] Bibliography of Iablq Published by The Iqbal Academy, Karachi 1965.

[2] The Islamic Background of Modem Science and Culture Published by National Book Foundation, Islamabad 1977.

[3] The Women's Place in Natinal Life in the Light of Holy Qur'an 1962.

[4] The Spirit of Islamic Culture.

[5] The National Solidarity and International Relations.

[۶] ببلوگرافی آف اسلامک اسٹڈیز: اس میں مغرب و مشرق کی اہم زبانوں میں اسلامیات، اسلامی تاریخ اور اسلامی تمدن پر شائع ہونے والی کتابوں اور مضامین کا تفصیلی اشاریہ ہے۔ یہ کلیات پانچ ہزار صفحات پر مشتمل تھی۔ ادارہ تحقیقات اسلامی نے اس کلیات کی اشاعت کا معاہدہ کیا تھا لیکن ابھی تک اس کی اشاعت ممکن نہ ہو سکی۔[۱۴]

خواجہ عبدالوحید: اردو تصانیف

خواجہ صاحب نے اردو زبان میں بھی مندرجہ ذیل تحریریں یادگار چھوڑی ہیں:

الف۔ "موضوعات قرآن اور انسانی زندگی" مطبوعہ ادارہ تحقیقات اسلامی، اسلام آباد ۱۹۸۹ء

ب۔ "تلاش سکوں" [افسانوں کا مجموعہ] مطبوعہ تاج کمپنی لاہور ۱۹۴۷ء

ج۔ "یاد ایام" [روزنامچہ]

د۔ انگریزی زبان میں قرآن حکیم کے ترجمے اور تفسیر پر بھی کام شروع کیا۔ انیس پارے کا ترجمہ اور تفسیر

ہوئی قرآن سوسائٹی کراچی کے پندرہ روزہ جریدے اسلام میں قسط وار شائع ہوا۔

د۔ حساس کے قلمی نام سے زمیندار اور انقلاب میں کالم لکھتے رہے۔ اردو انگریزی میں سینکڑوں مقالات لکھے بعض معرکۃ الآراء مضامین میں Was Iqbal Inspired by the West اور The West Enemy of the East شامل ہیں۔ Eney of East دراصل اقبال مرحوم کی مثنوی پس چہ باید کرد پر پہلا تبصرہ تھا جو علامہ اقبال مرحوم کے کہا گیا، یہ اسلام میں خواجہ صاحب کے قلم سے تحریر کیا گیا۔

ذ۔ انجمن خدام الدین لاہور کا ترجمان ''اسلام'' کے نام سے انگریزی میں نکالا، کراچی سے الاسلام انجمن اشاعت قرآن عظیم کے تحت نکالا گیا، اس کی ادارت بھی خواجہ صاحب کے سپرد تھی۔ خواجہ عبدالوحید قیام پاکستان کے بعد ۱۹۴۸ء میں کراچی منتقل ہوگئے، پریس انفارمیشن ڈیپارٹمنٹ میں افسر تعینات ہوئے۔ اقبال مرحوم اکیڈمی میں ریسرچ آفیسر اور اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں ریسرچ فیلو بھی رہے۔ خواجہ صاحب نے پی ای سی ایچ کالج برائے خواتین میں تدریسی فرائض بھی انجام دیے۔

خواجہ عبدالوحید: مجالس کی رکنیت

خواجہ صاحب نے ایک بھرپور علمی، ادبی، تحقیقی و تہذیبی زندگی بسر کی۔ وہ بے شمار انجمنوں، مجالس، تحقیقی اداروں کے سرگرم ذمہ داروں میں شامل رہے۔ چند کی تفصیل درج ذیل ہے:

ا۔ مجلس ثقافت اسلامیہ قائم کی۔

۲۔ جمعیت شبان المسلمین ہند اس کی قیادت علامہ اقبال مرحوم کی سپرد کی گئی لیکن عملاً کوئی پیش رفت نہ ہوئی۔

۳۔ خدام خلق اس میں خواجہ صاحب کے ساتھ ڈاکٹر محمد عبدالقوی اور قاضی ظہیر الدین شریک تھے۔

۴۔ علامہ کی تحریک پر ۱۹۳۱ء میں ادارہ معارف اسلامیہ قائم کیا گیا، اس کے سربراہ پروفیسر محمد اقبال، خواجہ عبدالوحید شریک معتمد تھے۔ اراکین عاملہ میں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، مولوی شفیع، حافظ محمد شیرانی ملک عبدالقیوم وغیرہ شامل تھے۔

۵۔ خدام اسلام حضرت احمد علی لاہوری کی سرپرستی میں تنظیم قائم کی گئی، خواجہ عبدالوحید مؤسسین بھی شامل تھے۔

۶۔ مجلس قرآنی کا قیام تا کہ لاہور کے امراء کو دین و قرآن سے واقف کرایا جائے بعد میں یہ انجمن اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ماتحت آ گئی تھی۔

۷۔ سلسلۃ الاخوان تنظیم۔ ۱۹۲۶ء میں چند احباب نے قائم کی تاکہ توہین رسالت کا سدباب کیا جائے۔

۸۔ معتمد مجلس جائزہ زبان اردو

۹۔ شریک معتمد یونسٹ کلب [۶۵]

اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ:

☆☆ ۱۹۲۸ء میں ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر عبدالقوی کے مشورے سے خواجہ صاحب نے اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ قائم کیا جس کے تحت اہم اجلاس ہوئے اور بے شمار اہم موضوعات پر مقالے پڑھے گئے۔

☆☆ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ہر سال ایک ایسا جلسہ بھی منعقد ہوتا تھا جس میں کسی ایک اہم موضوع پر مختلف مذاہب کے علم بردار اپنے اپنے مذہبی نقطۂ نگاہ سے روشنی ڈالتے ہیں۔ ان لیکچروں میں ہر شخص مجوزہ مسئلے کا حل اپنی مذہبی تعلیمات سے پیش کرتا ہے، دوسرے مذاہب کا ذکر بالکل نہیں کرتا۔ انسٹی ٹیوٹ نے Relegion on the Economic Troubles of Mankind کے موضوع پر سیمینار منعقد کیے۔

☆☆ علامہ سید سلیمان ندوی صاحب نے خواجہ صاحب کی دعوت پر ۱۹۳۵ء میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام "عرب اور امریکہ کی تلاش" پر تین خطبات دینے کا ارادہ کیا تھا۔ ان کی تفصیلات دستیاب نہ ہو سکیں۔ [۶۶] اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام اہم موضوعات پر مقالے پیش کیے گئے اور شائع بھی کیے گئے۔ اہم علمی، ملی، عالمی شخصیات کو مدعو کیا گیا۔ افسوس ہے کہ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کی خدمات، مطبوعات، کانفرنسوں پر ابھی تک کوئی تحقیق نہیں کی گئی۔ لاہور کی علمی و ادبی مجالس کے موضوع پر شائع ہونے والی اہم کے کے عزیز کی کتاب Public Life in Muslim India 1850-1947 میں اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا صرف دو سطری ذکر ہے۔ [۶۷] پروفیسر احمد سعید کی کتاب "پنجاب کی قدیم علمی و سیاسی جماعتیں" میں انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں ایک سطر بھی نہیں ملتی۔ ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہانپوری نے نیشنل کالج کا مجلہ "علم و آگہی" کے خصوصی شمارے میں برعظیم پاک و ہند کے علمی و تحقیقی اداروں میں خواجہ صاحب کے ادارے کا اجمالی ذکر کیا ہے۔ یہ درست ہے کہ یہ ادارہ خواجہ صاحب کی ذات وحید کے دم سے چل رہا تھا، لہٰذا خواجہ صاحب کراچی منتقل ہوئے تو یہ ادارہ ختم ہو گیا لیکن ایک زمانے میں لاہور کی علمی و تہذیبی زندگی اس ادارے کے تذکرے اور خدمات کے بغیر مکمل نہیں ہو سکتی۔

خواجہ عبدالوحید: سسرال

خواجہ عبدالوحید کے سسر میر امیر بخش مالک کریمی پریس غیر منقسم پنجاب کے سب سے بڑے ناشر کتب تھے انھیں مبالغہ پنجاب کا نولکشور کہا جا سکتا ہے۔ وہ صاحب علم و عمل تھے، ان کا ذاتی کتب خانہ ہزاروں کتابوں مخطوطات، نوادرات پر مشتمل تھا جو تقسیم ہند کے فوری بعد ماؤں کے بڑے سیلاب کی نظر ہو گیا۔ یہ بھی حسن

اتفاق تھا کہ خواجہ عبدالوحید کو سسرال بھی اعلیٰ علمی ذوق رکھنے والا ملا۔[۴۸]

خواجہ عبدالوحید: علامہ اقبال مرحوم سے وہرے تعلقات

خواجہ عبدالوحید کے والد خواجہ کریم بخش اور ان کے تایا خواجہ رحیم بخش بھی علامہ اقبال مرحوم کے قریبی احباب میں تھے۔علامہ اقبال مرحوم سے خواجہ عبدالوحید کی قریبی بلکہ وہری رشتہ داری تھی۔خواجہ عبدالوحید کے چچا زاد بھائی خواجہ فیروزالدین کی اہلیہ علامہ اقبال مرحوم کی پہلی بیوی کریم بی بی گجرات کی بہن تھیں،اس طرح فیروز الدین علامہ اقبال مرحوم کے ہم زلف تھے،خواجہ فیروزالدین کے داماد شیخ محمد مسعود کی صاحبزادی عذرا خواجہ عبدالوحید مرحوم کی بہو ہیں اس طرح علامہ اقبال مرحوم خواجہ عبدالوحید کے صاحبزادے خواجہ طارق کے سسر کے پھوپھا اور ساس کے خالو تھے۔خواجہ حیدی کی بھتیجی انوری بیگم کا نکاح شیخ محمد مسعود سے ہوا تھا جو علامہ اقبال مرحوم کے برادر نسبتی شیخ غلام محمد کے بیٹے تھے بھتیجی کی بیٹی عذرا خواجہ عبدالوحید صاحب کی بہو ہیں۔

اس عہد کی روایات: خواجہ صاحب کا تقویٰ

خواجہ صاحب کے تقویٰ اور تدین کا احترام تمام احباب کرتے تھے،اس کی وجہ خواجہ صاحب کی دین سے محبت،حمیت،دینی اور اخلاص عمل تھا۔وہ صرف صاحب قلم نہیں صاحب عمل بھی تھے۔ان کی زندگی قول و فعل کی مطابقت سے عبارت تھی۔فقر و فاقہ کے دنوں میں وہ صرف اللہ سے فریاد کرتے رہے اور دین کی خدمت سے کبھی غافل نہ ہوئے۔پھٹے پرانے کپڑوں میں ملبوس یہ شخص جو زندگی کی بنیادی ضرورتوں سے محروم تھا اس نے کبھی دنیا کی طرف نظر نہ کی اور دین کی خدمت کو شعار رکھا۔اگر وہ چاہتے تو اپنی علمی صلاحیت اور انگریزی استعداد کے ذریعے بہتر معاشی زندگی حاصل کر سکتے تھے لیکن انھوں نے دنیا کو اہمیت نہ دی ان کے اس کردار کا اعتراف احباب کرتے تھے۔اس سلسلے میں خواجہ صاحب کی بزرگی کے دو واقعات درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔خواجہ عبدالوحید چراغ حسن حسرت سے ملنے دلی گئے۔وقت مقررہ سے پہلے خواجہ صاحب حسرت سے اچانک ملاقات کے لیے پہنچ گئے۔چراغ حسن حسرت شراب پی رہے تھے۔حسرت صاحب نے نہایت تاسف اور دل گرفتگی کے ساتھ کہا خواجہ صاحب افسوس ۲۵ برس کا حجاب اٹھ گیا۔

۲۔خواجہ صاحب احباب سے ملاقات کے لیے ایک دن اچانک صوفی تبسم کے گھر پہنچ گئے۔صوفی تبسم ان دنوں امرتسر کے اہل قرآن جناب احمد دین امرتسری سے متاثر تھے اور ان کی تحریک امت مسلمہ کے رکن تھے۔وہ علامہ اقبال مرحوم اور احمد دین امرتسری کی ملاقات کے لیے بھی کوشاں تھے۔ان کے گھر پر محفل بادہ و جام جاری تھی۔حفیظ ہوشیارپوری بھی موجود تھے اچانک دستک ہوئی،اطلاع ملی کہ خواجہ تشریف لائے ہیں،محفل برخواست کر دی گئی بادہ و جام کے تمام آثار علامات مٹا دیے گئے،خواجہ صاحب کو طویل انتظار کرنا پڑا۔کمرے کی آلودہ فضا پاکیزہ ہوئی تو خواجہ صاحب کو خوش آمدید کہا گیا لیکن کسی نے محفل میں خلل ڈالنے کا اشارہ بھی نہ دیا۔

وہ واقعات اس عہد کی معاشرت، تہذیب، رکھ رکھاؤ، محبت اکرام احترام کی روایت سے آگاہ کرتے ہیں اور یہ بھی بتاتے ہیں کہ خواجہ صاحب اپنے ہم عمروں اور ہم عصروں میں حمیت اسلامی کے باعث کس قدر محبت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔[۶۹]

خواجہ عبدالوحید کو اللہ تعالیٰ نے کثیر قابل اولاد سے نوازا۔ ان کے نامور فرزند مشفق خواجہ علمی و تحقیقی حلقوں میں ممتاز ترین مقام کے حامل ہیں اور ادب کی تاریخ میں یہ مقام بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا ہے خواجہ عبدالوحید کے خانوادے کی تفصیل حواشی میں ملاحظہ فرمایئے۔[۷۰]

روزنامچے کی خصوصیات:

خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ اس عہد کی تاریخ، معاشرت، سیاست، مناقشات، قومی و تہذیبی زندگی، علمی و ادبی انجمنوں، علمی ادبی معرکوں، ذوقِ علمی، ہنگاموں، تحریکوں، شخصیات، حادثات، واقعات، سانحات کا نادر مجموعہ ہے۔ لاہور کو سیاسیات ہند میں مرکزی مقام حاصل تھا۔ اس عہد کے بڑے بڑے علماء اور سیاست دان لاہور سے تعلق رکھتے تھے۔ علامہ اقبال مرحوم جیسے عبقری لاہور میں مقیم تھے اس لیے لاہور کو امت مسلمہ کے مرکز کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔ خواجہ صاحب کا روزنامچہ اس عہد کے لاہور کی نقش گری کرتا ہے۔ یہ روزنامچہ ہمیں بتایا ہے کہ اس عہد میں ہندوستان کی معاشرت کیا تھی۔ لوگوں کے اخلاق کیسے تھے۔ سیاست دانوں کے طور اطوار کیا تھے؟ حکومت کے نظم و نسق کی کیا حالت تھی۔ لاہور کی معاشرتی زندگی کیسی تھی، اس عہد میں ماحولیات کا حال کیا تھا۔ مگر اس روزنامچے کا سب سے اہم حصہ وہ ہے جس میں برعظیم پاک و ہند میں برپا روایت و جدیدیت کی کشمکش بلکہ معرکہ ایمان مادیت کے بارے میں اہم معلومات مہیا کی گئی ہیں۔ روزنامچے کا یہ حصہ ہماری دلچسپی کا خصوصی موضوع ہے۔ اس سے پہلے کہ ہم خصوصی دلچسپی کے اس موضوع پر گفتگو کریں اس عہد کی سیاست معاشرت اور موسم کی جھلکیاں روزنامچے سے پیش کرتے ہیں۔ جب لاہور میں ژالہ باری ہوتی تھی کاغان کے راستے برف پوش وادیوں اور پھولوں میں گھرے ہوئے تھے لیکن اب صنعتی ترقی نے اس خوبصورت ماحول کو تباہ کر کے برف کی چٹانیں پگھلا دی ہیں۔

اس عہد کی معاشرت، سیاست اور ماحولیات کی جھلکیاں

شملہ: بچوں سے محبت کی روایت:

☆ شملہ میں مسلمان نوجوانوں کے مشاغل ذاتی عیش و عشرت کا عنصر بہت رکھتے ہیں اسلامی یا قومی معاملات میں چنداں دلچسپی نہیں۔ ایک اچھی چیز بہت عام ہے اور وہ بچوں سے محبت ہے۔ قریباً ہر شخص نہ صرف اپنے بچوں سے بلکہ دوسروں کے بچوں سے بھی بہت محبت کرتا ہے۔ اس میں ذرا افراط سے کام لیا جاتا ہے۔ مثلاً بچوں کا منھ چومنا بہت عام ہے۔ یہ چیز اصولِ صحت کے کسی حد تک منافی ہے۔[۷۱]

اس زمانے کی معاشرت۔ قراقرم میں سامان سفر

٭ یہ مہم ۱۵-۱۹۱۴ء میں زیر سرکردگی Fillipo de Filippi آئی تھی۔ تمام کتاب بہت دلچسپ ہے۔ قراقرم کی بلندیوں سے گزرتے ہوئے ان لوگوں کو بعض جگہ سامانِ تجارت برف میں دبا ہوا ملا جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں کہ یا تو ایسے مسافروں کا معلوم ہوتا ہے جو راستے کی دشواریوں سے تنگ آ کر سامان ساتھ نہ لے جا سکے یا راستے میں تکان کی وجہ سے منزلِ مقصود تک پہنچ نہ سکے اور مر گئے۔ پھر وہ لکھتے ہیں کہ ان دشوار گزار بلندیوں پر لوگ چلتے ہوئے سامان راستے میں ڈال دیتے ہیں اور پھر کسی سفر کے دوران اٹھا لے جاتے ہیں۔ اس عرصے میں کوئی ماہرو اس سامان کو نہیں چھیڑتا! [۷۲]

خالدہ خانم: تقریر کے لیے پیسے دینے ہوں گے

٭ خالدہ خانم بلانے کے لیے دہلی سے لاہور اور روانگی کا ٹکٹ اول درجے کا ریل کا کرایہ اور ۵۰۰ روپیہ فی لیکچر دینا پڑے گا۔ اگر ہم ان کو ایک لیکچر کے لیے لاہور بلائیں تو مندرجہ ذیل خرچ اٹھانا پڑے گا۔ کرایا ریل ۱۳۰ روپے۔ فیس لیکچر ۵۰۰ روپے۔ دعوت ۱۵۰ روپے۔ متفرق اخراجات مثلاً طباعت اشتہارات، دعوت نامے ۴۰ روپے۔ جملہ ۸۲۰ روپے۔

لاہور کی معاشرت: کوئی رئیس مہمان نواز نہ بنا

٭ آج بہت کوشش کی کہ شریف مراکش کی رہائش کا انتظام لاہور کے کسی مسلمان رئیس کے مکان پر ہو جائے لیکن سخت ناکامی ہوئی۔ ناچار یہی فیصلہ ہوا کہ انھیں نیڈوز ہوٹل میں ٹھہرا دیا جائے۔

انھیں نیڈوز ہوٹل میں پہنچایا گیا جہاں ایک سیٹ تین کمروں کا گیارہ روپے روزانہ پر لیا گیا۔

لینڈو باڈی والی موٹر کار کرائے پر لی گئی (بحساب پندرہ روپے روزانہ)

قادیانیت: امیر مراکش اور محمد علی لاہوری کا مباحثہ

٭ آج ہز ہائی نس کے قیام لاہور کا آخری دن تھا۔ دوپہر کو احمدی (لاہوری) جماعت کا ایک وفد ہوٹل میں بغرضِ ملاقات آیا۔ وہ لوگ اپنے ہمراہ مولانا محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور کی چند کتب اور دو صد روپیہ نقد لائے تھے۔ ہز ہائی نس نے ایک کتاب یونہی اٹھا کر کھولی تو جو صفحہ سامنے آیا، اسی پر احمدی جماعت کے عقائد کی فہرست تھی جس میں عقیدہ نمبر ۹ یہ تھا کہ عیسٰی علیہ السلام وفات پا گئے ہیں۔ اس عقیدے کو پڑھ کر ہز ہائی نس سخت ناراض ہوئے اور انھوں نے ان حضرات کو اپنی چیزیں لے کر باہر نکل جانے کو کہا۔ [۷۳]

شریف مراکش سے قادیانیوں کا مناظرہ:

٭ ہز ہائی نس کی مولوی محمد علی صاحب سے مذہبی بحث چھڑ گئی۔ آپ نے مرزائیوں کے عقائد پر بڑی عالمانہ تنقید کی اور رخصت ہونے کے وقت احمدی حضرات سے مصافحہ کرنے سے انکار کر دیا۔ ڈاکٹر غلام محمد سے آخری بار جو

گفتگو ہوئی وہ قابل غور ہے:

H.H. If you people are right, nothing will happen; but if you people are wrong something will happen to you within the next three months.

Dr. G. M. Please let me have your address so that I may write to you at the end of three months.

H. H. Perhaps you will not be able to write.[۴۷]

امیر مراکش اور احمدی جماعت کے مابین یہ مکالمہ ہمارے ذہنی افلاس کا ثبوت ہے۔ مراکش کے ولی عہد کی یہ گفتگو بتاتی ہے کہ مناظرانہ رنگ صرف ہندوستان پر غالب نہ تھا بلکہ عالم عرب وہاں کے اعلیٰ ترین طبقات حتی کہ مراکش کا شاہی خاندان بھی اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس قسم کے دعوے اس عہد میں علم کی زبوں حالی کا اظہار کرتے ہیں۔

کوئٹہ کا زلزلہ ۱۹۳۵ء:

☆ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ میں زلزلہ آیا، خواجہ صاحب انجمن خدام الدین کی طرف سے کوئٹہ خدمت کے لیے روانہ ہوئے، اس وقت ہند کے مسلمانوں کی جانب سے زلزلہ زدگان کی مدد کے لیے کیا اقدامات کیے گئے، نجی و سرکاری سطح پر کوئٹہ سے تمام لوگوں کو منتقل کرنے اور آرام پہنچانے کے کیا انتظامات کیے گئے؟ روزنامچہ اس پر روشنی ڈالتا ہے۔

☆ لاہور سے باوجود کوشش کے کوئی مسلمان ڈاکٹر ایسا نہ تھا جو ہمارے ساتھ رضاکارانہ طور پر کوئٹہ جاتا۔ یہ چیز نہ صرف قابل افسوس ہے بلکہ شرمناک بھی ہے۔ میڈیکل کے طلباء آئے تھے۔

☆ صبح جب ہم سبی سٹیشن پر کھڑے تھے تو لاہور سے میڈیکل کالج کے طلباء کی سپیشل ٹرین آ گئی۔ مسٹر مظہر الحق (ڈاکٹر عبدالحق کے بھتیجے) اور مسٹر نجم الثاقب ملے۔

☆ ہندو رضاکار کافی تعداد میں موجود بتائے جاتے ہیں لیکن مسلم رضاکار کوئی نہیں۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میں نے بہت کوشش کی کہ یہاں رہ جاؤں لیکن میں یہاں پہنچا ہی اتنی دیر سے ہوں کہ مارشل لا جاری ہو چکا ہے اور سرکاری طبی امداد ضرورت سے زیادہ آ چکی ہے۔ پناہ گزینوں کا بیشتر حصہ جا چکا ہے۔

☆ کوئٹہ سے لاہور تک تقریباً تمام ریلوے سٹیشنوں پر پناہ گزینوں کے لیے کھانے پینے کا اعلیٰ پیمانے پر انتظام تھا۔ ہر جگہ اپنے اپنے علاقوں کے لوگوں نے پلیٹ فارموں پر کیمپ لگائے ہوئے تھے اور شب و روز امداد بہم پہنچائی جاتی تھی۔ بہاولپور ریاست کی حدود کے اندر جس قدر سٹیشن ہیں، ان پر بھی قابل تعریف انتظام تھا اور نواب

صاحب خود دیرہ نواب کے سٹیشن پر پناہ گزینوں کی خدمت میں مصروف دیکھے جاتے تھے۔

شہید گنج تمام قیادت نا قابلِ اعتبار

☆ لاہور میں ان دنوں جو کچھ ہو رہا ہے۔ نہ صرف قابلِ افسوس ہے بلکہ تعجب انگیز بھی۔ مسلمان عوام انتہائی جوش، خلوص اور جاں فروشی سے کام لے رہے ہیں۔ پرسوں، چشم دید گواہوں کا بیان ہے کہ لوگ سچ مچ سروں سے کفن باندھ کر آئے اور پیچھے اچھا نا بھار کر گولیاں کھاتے رہے۔ ایک جگہ سے اُن کو ہٹا دیا جاتا تھا تو دوسری جگہ وہ جا موجود ہوتے تھے۔ لیکن افسوس ہے کہ اکابرین کا کوئی طبقہ اُن کی رہنمائی کے لیے سامنے نہیں آتا۔ خدا جانے ایسی قوم کا کیا حشر ہوگا۔ اس سلسلے میں ایک اور ایک ہی طرزِ عمل باقی رہ گیا ہے اور وہ یہ کہ پُر جوش نوجوان سعی و عمل کے ساتھ مشاورت و تنظیم کا بار بھی اپنے نا تجربہ کار کندھوں پر اُٹھائیں اور یوں لیڈروں کے بار احسان سے مستغنی ہو جائیں۔

مسجد شہید گنج: اکابرین کی غداری

☆ کل مسلم اکابرین لاہور کی طرف سے علیحدہ اور احرار کی طرف سے علیحدہ اعلان ہو گیا کہ مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مسلمانوں کو شور مچانا بند کر دینا ہی مناسب ہے لیکن دونوں اعلانات میں یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ حکومت کو بھی غیر ضروری تشدد ترک کرنا لازم ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ.

☆ اس وقت ہندوستانی مسلمانوں کے دو بڑے سیاسی گروہ ہیں۔ ایک کا مسلک یہ ہے کہ ہمارا سب سے بڑا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ہندوستان کو غیر ملکی اقتدار سے نکالا جائے اور جب تک یہ مقصدِ اولیٰ حاصل نہ ہو جائے اور کسی طرف توجہ نہ کی جائے۔ دوسرا گروہ یہ چاہتا ہے کہ سب سے پہلے مسلمانوں کے قومی حقوق کا تحفظ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد کسی متحدہ مقصد کے حصول کی طرف توجہ دی جائے۔[۴۵]

نامحرم عورت سے ملاقات: دل و دماغ کی کشمکش

☆ دوسرا غیر معمولی تجربہ یہ تھا کہ یہاں مشہور سینما سٹار ریجو آج کل فروکش ہیں۔ ابراہیم صاحب کے اُن کے شوہر سے مراسم ہیں، اس لیے وہ اُن سے ملنے گئے۔ شوہر تو موجود نہ تھے، اہلیہ موجود تھیں۔ اُنھوں نے کل سینما پر اکٹھے چلنے کا ارادہ ظاہر کیا۔ میرے لیے یہ پہلا موقع تھا کہ ایک نامحرم عورت کی ہمراہی میں ایسی جگہ جاؤں۔ خوش قسمتی سے اُنھیں آنے میں دیر ہو گئی، اس لیے میں اندر جا کر بیٹھ گیا اور ابراہیم صاحب بعد میں اُنھیں اندر لائے۔ میرے اور اُن کے درمیان خود ابراہیم صاحب بیٹھے تھے، اس لیے میں کسی قدر اطمینان سے بیٹھ سکا۔ وہ برقع پہنے تھیں اور جب روشنی ہوئی تو وہ نقاب الٹ دیتیں۔ فلم ختم ہونے پر میں فوراً باہر آ گیا اور وہ بعد میں سینما ہال سے نکلیں۔ اس معاملے میں میرے دل و دماغ میں ایک زبردست کشمکش رہی ہے۔ فطری طور پر دل چاہتا تھا کہ ایک ایسی عورت سے ملا جائے جس کی زندگی میں Romance اور Art کو بڑا دخل رہا ہو اور جس نے اب خانہ

داری کی زندگی اور دربان پردہ رہائش اختیار کر لی ہو لیکن دماغ اس سے دور رہتا تھا۔ بالآخر دماغ دل پر بفضلہ تعالے غالب رہا۔ الحمد للّٰہ علیٰ ذٰلک۔[۷۶]

اچھوتوں کو مسلمان کرنا: غلبہ اور تسلط کی خواہش

٭ ملک صاحب کی یہ بھی رائے تھی کہ احمدیوں کا ذکر اخبار میں نہ آنا چاہیے۔ اخبار کے علاوہ اچھوتوں کا مسئلہ بھی زیر غور آ گیا۔ میں اس سے پیشتر حضرت مولانا سے گفتگو کر کے انھیں اس بات پر آمادہ کر چکا تھا کہ ایک وفد انجمن کی طرف سے ڈاکٹر امبیدکار کے پاس بھیجا جائے۔ اب اس کی تائید ہو گئی۔ چنانچہ وفد کے ارکان سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالقادر قصوری اور خود خلیفہ صاحب قرار پائے۔ سید صاحب کو پرسوں رات چٹھی لکھ دی گئی اور ڈاکٹر امبیدکار کو کل واپسی تار دے دیا گیا۔ اُن کا جواب آنے پر قصور جاؤں گا اور سید سلیمان صاحب کو بھی بذریعہ تار اطلاع کر دی جائے گی۔

٭ اگر آٹھ کروڑ اچھوت حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں تو ایک طرف اسلام کا بول بالا ہو جائے اور دوسری طرف ہندوستانی سیاست کی بساط بالکل بدل جائے۔[۷۷]

مولوی دیدار علی: علامہ کے خلاف فتویٰ

٭ پرسوں شام مولوی سید دیدار علی صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ. اللہ العالمین مرحوم کو غریق رحمت کرے۔ آپ نے طویل عمر پائی۔ مولانا دیدار علی نے اقبال مرحوم کو کافر قرار دے دیا تھا۔ اس کے باوجود روزنامچے میں خواجہ صاحب نے ان کا ذکر نہایت ادب و احترام سے کیا ہے اور ان کے بارے میں کوئی منفی کلمہ نہیں لکھا۔[۷۸]

انگریزی پنجابی کی کشمکش: ڈاکٹر تاثیر

٭ جب ہم تاثیر صاحب اور میاں امیر الدین صاحب کے پاس بیٹھے تھے تو امین الدین صاحب آ گئے جو آئی سی ایس ہیں۔ وہ تاثیر صاحب سے اُن کے ولایت سے آنے کے بعد پہلی بار ملے تھے لیکن نہایت خشک طریق پر۔ اس کے بعد تقریباً دو منٹ کھڑے رہے۔ تاثیر صاحب پنجابی بولتے رہے اور وہ انگریزی۔ کسی دوسرے شخص سے انھوں نے بات نہ کی اور پھر سرعت کے ساتھ گھر میں چلے گئے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رٰجِعُوْنَ. [۷۹]

اہل علم کی ظاہری وضع قطع: ڈاکٹر حمید اللہ

٭ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب باوجود ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ ہونے کے ظاہری وضع قطع میں ٹھیٹھ مشرقیت اور اسلامیت کا مکمل نمونہ تھے۔ پھر صحیح اسلامی سپرٹ بھی اُن میں پوری تھی۔ سپرٹ کے لحاظ سے ڈاکٹر نظام الدین بھی قابل تعریف ہیں، اس لیے کہ ان کی ہر بات سے اسلام کی محبت کا اظہار ہوتا تھا۔[۸۰]

احمد علیؒ لاہوری: طریقِ تربیت

☆ کل دفتر جاتے ہوئے دفتر "اسلام" میں گیا۔ مسجد میں حضرت علامہ [مولانا احمد علی صاحب] نے طلب فرمایا۔ دیر تک اُن کی خدمتِ بابرکت میں بیٹھا۔ آپ نے تین باتوں کا حتمی عہد لیا:

(۱) پابندیٔ نماز (۲) ترکِ سینما (۳) ترکِ گراموفون۔

اللہ تعالےٰ آیندہ مجھے اپنے عہد پر قائم رہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین![۸۱]

مولانا مہر سے بدتمیزی: تاثیر کی تنقید

☆ تاثیر صاحب نے غالبؔ پر یہ اعتراض کیا کہ غدر ایسا ہولناک قومی سانحہ اُس کے سامنے وقوع پذیر ہوا اور اُس کا اردو دیوان یکسر اُس کے ذکر سے خالی ہے۔ معلوم ہوا کہ غالبؔ قومی شاعر نہ تھا۔ غزل گو اور جذباتِ انفرادیہ کا ترجمان محض تھا اور نا اچھا ترجمان تھا۔ [غلام رسول] مہر صاحب کے ساتھ بہت زیادتی ہوئی۔ اگرچہ خود انھوں نے بھی یہ غلطی کی کہ ایسا موضوعِ مضمون کے لیے چنا جس کا تعلق یومِ غالبؔ کی تقریب سے قطعاً نہ تھا۔ تاہم حاضرین نے یقیناً بدتمیزی برتی اور اُن کا مضمون ختم نہ ہونے دیا۔

صوفی تبسم: اِس عہد کی وضع داری کا نمونہ

☆ صوفی [تبسم] صاحب کے میل جول کا حلقہ حیرت انگیز طور پر وسیع ہے۔ اُن کی مہمان نوازی کی مثال لاہور میں میں نے نہیں دیکھی۔ نہ اُن کے اخلاص کا نمونہ کہیں نظر آتا ہے۔ کمزوریاں تقاضائے بشریت ہیں اور تھیک سے ٹھیک انسانوں میں ہوتی ہیں لیکن اُن کی کمزوریوں پر اُن کی جماعتی خوبیاں غالب ہیں۔ دوستوں کے لیے وہ ہر ایثار کر سکتے ہیں اور خاموشی کے ساتھ کرتے ہیں۔ اپنے دوستوں کے جذبات کی قدر کرنا، اُن کے دلوں کی گہرائیوں کا اندازہ کر لینا، اُن کا شیوۂ خاص ہے۔[۸۲]

تقریر کی ذمہ داری: احساسِ ذمہ داری

☆ آج جمعۃ المبارک کا روزِ مسعود ہے اور مجھے جامع آسٹریلیا میں نماز سے پیشتر تقریر کرنی ہے لیکن پریشانی کا یہ عالم ہے کہ میرا دماغ ماؤف ہو رہا ہے۔ آج کا دن میرے لیے روزِ محشر کی حیثیت رکھتا ہے۔ اگر خدائے رحمٰن و رحیم کا فضل و کرم اپنے گنہگار و بے سروسامان بندے کے شاملِ حال نہ ہوا تو نہ معلوم کیا نتیجہ نکلے۔[۸۳]

☆ ۱۹۳۵ء میں لاہور میں ۱۳ فروری کو بسنت کے تیوہار کی چھٹی ہوئی تھی۔

بزمِ احباب کا حال احوال:

☆ بزمِ احباب کا اجتماع اب اکثر اوقات بلکہ ہمیشہ مفید گفتگو سے خالی ہوتا ہے۔ کسی قسم کی علمی یا دوسری تفریح حاصل نہیں ہوتی۔ ضرورت ہے کہ احباب اس معاملے پر غور کریں۔ بہت دفعہ یہ خیال کیا ہے کہ کسی نئی سوسائٹی میں شامل ہوا جائے لیکن ایسی کوئی سوسائٹی نظر نہیں آتی جس میں شامل ہو کر علمی، روحانی اور تمدنی فوائد حاصل ہو سکیں،

جس میں داخل ہو کر اسلام اور ہندوستان کی خدمت کا اچھا موقع مل سکے۔[۸۴]

والدہ کی رحلت: باوقار تجہیز و تکفین

☆آج والدۂ جلال انتقال کر گئیں۔ مرحومہ میں ایک بہت بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ خاندان کے لوگوں کے اجتماع کی ہمیشہ خواہش مند رہتی تھیں اور انتشار کو وہ ہمیشہ ناگوار سمجھتیں۔ الحمدللہ کہ اُن کی موت سے چند روز پیشتر خاندان کے اکثر افراد اُن کے گرد جمع ہو گئے تھے اور معلوم ہوتا تھا کہ وہ اِس بارے میں مطمئن ہیں۔

دنیا میں اُسی انسان کے لیے واویلا کیا جاتا ہے جس کے ساتھ دوسروں کی ضروریات وابستہ ہوں۔ آج پہلا موقع تھا کہ ہمارے خاندان میں ایک ایسی موت ہوئی جس پر کوئی نوحہ نہیں ہوا۔ کوئی آہ و فغاں اور بکا کی آواز بلند نہ ہوئی۔ انتہائی خاموشی کا عالم طاری رہا، سوائے اِس حال کے کہ بھی باہر سے آنے والوں نے رسمی طور پر نوحہ شروع کر دیا۔[۸۵]

☆اِس سلسلے میں یہ بھی ظاہر ہے کہ باستثنا مولانا محمد علی تمام مسلمان نمائندگانِ گول میز کانفرنس میں سے کوئی ایسا بزرگ نہیں جو حقوق المسلمین کے حصول کے لیے کسی قسم کی قربانی کر سکتا ہو۔[۸۶]

اس عہد کے موضوعاتِ علمی:

☆"تاج محل" کے عنوان پر ڈاکٹر خواجہ علی اختر انصاری (محققہ آثارِ قدیمہ) نے دیے تھے۔

1- THE SCIENTIFIC THEORIES OF RELIGION AND REVELATION.

2- THE POETRY OF HASRAT MOHANI.

3- THE BAHAI RELIGION.

4- REFORM MOVEMENTS IN THE MUSLIM WORLD.[۸۷]

جماعتوں کا تجزیہ: ناکامی کے اسباب

☆چند روز ہوئے ڈاکٹر [عبدالقوی] صاحب اور سید [عبداللہ] صاحب سے اِس مسئلے پر گفتگو چھڑ گئی کہ مسلمان مغربیت پسند نوجوانوں کی اصلاح کیوں کر ہو۔ اِس میں ضمناً یہ بحث آ گئی کہ ایک جماعت اِس کام کے لیے بننی چاہیے۔ پھر سوال اُٹھایا گیا کہ پہلے "احباب" جو جماعتیں بناتے رہے، وہ کیوں ناکام رہیں۔ میں نے اُن کی ناکامی کا اقرار کرتے ہوئے دونوں حضرات کے اعتراضات کو صحیح تسلیم کر لیا۔

☆ان دونوں حضرات نے اِس بات کا بارہا اعلان کیا ہے کہ احباب کی پہلی جماعتیں خواہ وہ "بزم" ہو یا "سلسلہ" یا "انجمن" "تمام ناکام ہوئے اور سب سے بڑھ کر اِس لیے ناکام ہوئے کہ اُن کی باگ ڈور ایسے شخص کے ہاتھوں میں تھی جو دوسروں کا اشتراک حاصل نہ کر سکا۔[۸۸]

تنہائی کی زندگی: بزمِ احباب

☆ میرے متعلق لوگوں کی آرا میں تغیر بلکہ انقلاب پیدا ہو رہا ہے بعض حضرات ارادۃً مجھ سے دور رہنے لگے ہیں۔ وہ اپنے آپ کو مجھ سے دور رہ کر زیادہ محفوظ پاتے ہیں۔

احباب کے کرم: خواجہ صاحب پر

☆ آج کل مجھ پر مختلف اطراف سے نکتہ چینی ہو رہی ہے اور ایک جانب سے محض نکتہ چینی کی غرض سے ہو رہی ہے۔[۸۹]

انسٹی ٹیوٹ:

☆ ڈاکٹر [عبدالتوی] صاحب بار بار فرما چکے ہیں کہ انسٹی ٹیوٹ ختم ہو چکا ہے۔ تم اپنی شہرت کی انتہا کو پہنچ گئے ہو۔ تم تمام رفقا کی معیت کھو بیٹھے ہو۔ انسٹی ٹیوٹ کو تمھارا ذاتی کام سمجھا جانا چاہیے۔ اس میں کسی کو دخل نہ دینا چاہیے۔ [۹۰]

☆ کل ایک مقام پر مجھے دوسروں پر "نکتہ چینی" کرنے کے الزام میں بہت کوسا گیا۔ اور اپنی بے بضاعتی کا احساس دلانے کے لیے بار بار بہ بانگِ دہل اعلان کیا گیا کہ میں ایف اے فیل ہوں۔

احباب کے اختلافات: معاشرتی رویہ:

گزشتہ شب سید محمد عبداللہ صاحب اپنے وطن سکھو روانہ ہو گئے۔ میں انھیں ملنے کے لیے ریلوے اسٹیشن پر گیا۔ ٹرین چار گھنٹے لیٹ تھی، اس لیے لاہور سے نئی ٹرین وقت معینہ پر چلا دی گئی۔ سید صاحب سے ملنے کے لیے احباب میں سے کوئی دوسرا شخص موجود نہ تھا۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر [محمد عبدالتوی] صاحب جن کی سید صاحب کو توقع بھی تھی، وہ بھی نہ پہنچے۔ یہ اس بات کا قطعی اور یقینی ثبوت ہے کہ سلسلۂ احباب منتشر ہو چکا ہے۔[۹۱]

احباب سے تعلقات کی نوعیت:

☆ آج رخصت کا دسواں روز ہے لیکن میں تا حال لاہور سے باہر نہیں نکل سکا اور یہاں رہ کر بھی وقت نہایت بری طرح کٹ رہا ہے۔ بزمِ احباب مدت ہوئی منتشر ہو چکی ہے۔ کسی نئی سوسائٹی سے تعلق پیدا کرنے پر طبیعت آمادہ نہیں ہوتی اگرچہ جی چاہتا ہے کہ کوئی سوسائٹی ہو۔

میں ایک مدت سے محسوس کرتا ہوں کہ مجھے وہ "دوستی" حاصل نہیں۔ شاذ و نادر ہی ایسی دوستیوں میں اب وقت صرف ہوتا ہے۔ اب طبیعت چاہتی ہے کہ کسی ایسے دوست کا ساتھ میسر آ جائے جس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے اور رچنے پھرنے میں روح کی اشتہا پوری ہو۔

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اب کوئی شخص کھل کر مجھ سے بات نہیں کر سکتا۔ اگر کبھی میرے دوستوں نے آپس میں بے تکلفی کی باتیں کرنا ہوں تو وہ مجھ سے علیحدہ ہو کر کرتے ہیں۔ میری زندگی تو ایک زبردست Formalities کی زندگی ہے۔[۹۲]

☆ہماری "بزم احباب" مرحوم میں ایک مرض خوف ناک حد تک بڑھ گیا ہے اور وہ غیبت ہے۔ اس سے میں خود قطعاً بری نہیں بلکہ مجھ میں شاید یہ مرض کسی سے کم نہیں۔ کوئی بات ایسی نہیں جو ہم سے دو تین یا چار آدمی ایک جگہ کریں اور وہ مخمس متعلق تک نہ پہنچے اور پھر اس سے فساد پیدا نہ ہو۔

ایک طویل مدت سے احباب کا اجتماع منتشر ہو چکا ہے۔ شاذ و نادر ہی کوئی موقع ہوتا ہے کہ سب کے سب احباب جمع ہوں بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ گزشتہ چھ ماہ سے تو ایک بار بھی ایسا نہ ہوا۔ اور ایک موقع پر جب ڈاکٹر [محمد عبداللہ چغتائی] صاحب، سید [عبداللہ] صاحب، [محمد شریف] پی صاحب، مولوی [خدا بخش] اظہر صاحب، برادرم نذیر العابدین [عبداللہ] صاحب، اور میں مقبرہ جہانگیر پر اکٹھے ہوئے تھے بھی تھوڑا وقت ہونے کے برابر تھا۔

لاہور کی معاشرتی زندگی کا کریہہ منظر:

☆۲۱ اور ۲۲ جون کی درمیانی شب کو ہمارے ہاں دو توام بچوں کی ولادت ہوئی تھی۔ گزشتہ جمعرات کے روز دونوں کی طبیعت علیل ہوئی۔ لڑکے کو تو بفضلہ تعالیٰ آرام ہو گیا لیکن لڑکی کل صبح (۹ اگست) سات بجے ماں باپ کو داغ مفارقت دے گئی۔

احباب میں سے نہ کسی صاحب کو خبر ہوئی نہ کوئی آیا۔ اور اگر خبر ہوئی بھی تو ایک دو کے سوا کوئی آنے کا نہیں۔ اعزہ و اقارب میں سے میرے ہم زلف میر احمد بخش صاحب آج آئے۔ "کل نہیں آ سکے"۔

مرحومہ نے صبح سات بجے جان جان آفریں کے سپرد کی اور دس بجے جنازہ گھر سے لے جایا گیا۔[۹۳]

بزم احباب کے حوالے سے خواجہ صاحب کے تحفظات اور تنقیدات کے ساتھ ساتھ خواجہ صاحب کے بچے کی رحلت پر احباب اور عزیزوں کی بے رخی کا شکوہ لاہور کی معاشرتی زندگی کا کریہہ منظر پیش کرتا ہے۔ فی الحقیقت کیا لاہور اس حد تک مغرب زدہ تھا؟ راقم کے خیال میں صورت حال ایسی نہیں تھی، آج بھی لاہور میں معاشرتی زندگی اس صورت حال سے دوچار نہیں اور وہاں کی معاشرتی زندگی میں آج بھی بے شمار خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ خواجہ صاحب کے ان اندراجات کی کیا توجیہہ کی جائے اور قدیم لاہور اور جدید لاہور کی معاشرت میں کیسے تطبیق پیدا کی جائے اس کا جواب خود خواجہ صاحب نے روزنامچے کے صفحہ ۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶ پر دیا ہے اور اس کا خلاصہ صفحہ ۱۵۱ پر Adfred Adler کی کتاب What life should mean to you کے ذریعے پیش کیا ہے۔

☆میں آج کل Alfred Adler کی کتاب What Llife Should Mean to You پڑھ رہا ہوں۔ آج اس میں یہ فقرہ پڑھا:

"If an Individual cannot keep friends, It is because he wishes to Dominate others; he is really interested only in

himself and his goal is to show Personal Superiority"[۹۴]

اگر کوئی میری تحلیل نفسی کرے میری نفسیاتی حالت کا صحیح معائنہ کرے تو غالباً یہ چیز مجھ پر صادق آئے گی۔ اپنے علاوہ مجھے یہ چیز ڈاکٹر عبدالقوی میں بڑی حد تک نظر آتی ہے۔ ہماری رائے میں خواجہ صاحب کا یہ جائزہ بھی مزید جائزے کا تقاضہ کرتا ہے۔ یہ ان کی شرافت نفس تھی کہ انھوں نے دوسروں کو الزام دینے کے بجائے اپنے آپ کو مورد الزام ٹھہرا کر احباب کی ناراضگی کی خوبصورت توجیہہ فرمادی۔ یہ اس دور کی وضعداری، شرافت، اور احباب سے محبت کی روایت تھی، جسے خواجہ صاحب نے لہو کے گھونٹ پی کر بھی برقرار رکھا اور ذاتی روزنامچے میں بھی کسی کو ہدف ملامت بنانے کے بجائے عیب اپنی ذات میں تلاش کیے۔ شرافت کے ایسے مرقعے اب کہاں ملیں گے؟

۱۹۳۵ء میں ثقافت بدل رہی تھی:

☆ ہمارے سامنے ایک صوفے پر ایک ادھیڑ عمر کی سکھ عورت بھاری بھرکم مع اپنی دو سات سات آٹھ آٹھ سالہ لڑکیوں کے بیٹھی تھی۔ ان میں سے بڑی لڑکی جس کے کپڑے عمدہ ریشمی تھے، شروع سے لے کر آخر تک اس حال میں بیٹھی رہی کہ اس کا دو پٹہ اس سے پرے صوفے پر پڑا تھا اور اس کے پاؤں سامنے کے صوفے کی پشت پر تھے۔ بڑی بی نے اپنا اور بچوں کا کھانا وہیں تھیٹر میں منگایا اور طشت صوفے پر رکھ کر کھانا سپرد شکم کیا۔ یہ نظارہ میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار ہی دیکھا۔

محافل موسیقی:

ہم جیسے لوگوں کا ذوق موسیقی اسے سن کر تسکین پاتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اگر تمام محافل سرور میں گویوں کو اعلیٰ پائے کے شعراء کی غزلیں اور نظمیں سنانے پر مجبور کیا جائے تو ادب اردو کی بہت بڑی خدمت انجام پا سکتی ہے۔[۹۵]

فلم گھر اور فلمیں:

خواجہ صاحب فلم بینی کے شائق تھے اردو انگریزی فلمیں دیکھتے تھے۔ روزنامچے سے اس عہد کے سینما گھروں اور فلموں کی مختصر تاریخ مل جاتی ہے۔ خواجہ صاحب کی پسندیدہ فلم دیوداس تھی جو روزنامچے کے مطابق انھوں نے کئی مرتبہ دیکھی۔ وہ فلم کبھی تنہا نہیں دیکھتے تھے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ خواجہ صاحب انجمن خدام الدین میں شامل تھے مولانا احمد علیؒ سے بیعت تھے۔ مولانا احمد علیؒ کی لاہور سے غیر حاضری کے زمانے میں انجمن خدام الدین کی انتظامی ذمہ داریاں ان کے سپرد تھیں، خواجہ صاحب نے اس پر تعجب کا اظہار کرتے ہوئے روزنامچے میں لکھا ہے تمام من ولایت نذ قد حضرت کی نیابت میرے ایسے شخص کے سپرد۔[ص، ۲۵۵] جس سے ان کے مقام اور مرتبے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا احمد علی لاہوری نے اپنی تفسیر و ترجمہ کی نظر ثانی کے لیے خواجگان کو دیا تھا کی بناء

پر منتخب کیا تھا۔ان میں خواجہ عبدالحیؒ اور خواجہ عبدالوحید شامل تھے۔لوگوں نے حیرت ظاہر کی تو احمد علیؒ نے فرمایا مجھے خواب میں بشارت دی گئی ہے یہ میرا فیصلہ نہیں ہے۔مولانا احمد علیؒ خواجہ صاحب کی فلم بینی کی عادت سے بخوبی آگاہ تھے لیکن اس کے باوجود خواجہ صاحب سے درگزر کا معاملہ رکھا گیا اور تنبیہہ کے طور پر مولانا احمد علیؒ نے ان سے حلف نامہ لکھوایا جس میں فلم بینی اور گرامو فون سننے سے پرہیز کا عہد لیا تھا اس طرح ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ بزرگ خوردوں کی تربیت و تعلیم کس طرح فرماتے تھے اور ان کی صلاحیتوں سے کس طرح فائدہ اٹھاتے تھے۔[۹۶]

روزنامچے سے ہمیں اس دور کے ہوٹل اور سینما گھروں کے بارے میں آگہی حاصل ہوتی ہے۔لاہور ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ کے معاملے میں آج بھی پاکستان میں سب سے آگے ہے سینما گھروں کا دور سالوں پہلے اختتام کو پہنچ چکا ہے۔روزنامچے سے لاہور کے ہوٹلوں، سینماؤں اور فلموں کی فہرست پیش کی جاتی ہے۔

لاہور اور دیگر شہروں کے مشہور ہوٹل:

[۱] کریسنٹ ہوٹل، [۲] نیڈوز ہوٹل، [۳] لورینگ، [۳] تاج ہوٹل، [۴] Davico، [۵] مسلم ہوٹل، [۶] ہوٹل Deluxe، [۷] رائل ہوٹل، [۸] سیسل ہوٹل [۹] اصفہانی ہوٹل، [۱۰] تاج محل ہوٹل الہ آباد

سینما تھیٹر

[۱] انقلستان تھیٹر، [۲] نشاط سینما، [۳] پیلس تھیٹر، [۴] کماؤن، [۵] پلازا، [۶] روز سینما، [۷] ریگل تھیٹر، [۸] نشاط تھیٹر، [۹] ڈائمنڈ ٹاکیز

فلمیں:

[۱] Night Bird، [۲] ''دیوداس''، [۳] ''جوانی کی ہوا''، [۴] ''دیوداس''، [۵] A Tale of Two Cities، [۶] ''روپ لیکھا''، [۷] Tonight the Might، [۸] ''نادرہ''، [۹] ''چنڈی داس''

لاہور کا موسم: بیضہ مرغ کے برابر اولے

آج میں دفتر سے چار بجے سے پیشتر ہی نکل آیا اور ڈاکٹر [عبدالقوی] صاحب کی طرف چلا گیا۔ وہاں نوازش صاحب اور عبدالماجد صاحب موجود تھے۔میرے وہاں پہنچنے کے تھوڑی دیر بعد یک لخت ژالہ باری شروع ہوئی اور دیکھتے دیکھتے بیضہ مرغ کے برابر اولے پڑنے لگے اور اس کثرت سے کہ صحن و سقف تمام سفید ہو گئے بازاروں اور سڑکوں پر یہی نظر آتی تھی۔پرندے چرند ہلاک ہوئے۔ایک عجیب نظارہ تھا۔اکثر لوگوں کو اپنی تمام حیات میں ایسی ژالہ باری کے دیکھنے کا موقع نہ ملا تھا۔

کاغان: اس عہد کا موسم

۲۳ مئی صبح کو نوراں سے ہم لوگ روانہ ہوئے اور کاغان اور کشمیر کی درمیانی دیوار (درہ گلی) کو بیک جست پار کر گئے۔

میلوں تک جدھر نگاہ جاتی تھی پہاڑوں میں خوب صورت اور مختلف الالوان پھولوں کے فرش بچھے ہوئے تھے۔ بار بار جی چاہا کہ ایسے خوب صورت پھولوں کے گلدستے ہمراہ لے لوں تا کہ کسی کی نذر کیے جا سکیں لیکن ان پھولوں کی نزاکت اور رعنائی کہ گلدستہ ہاتھوں میں آتے ہی مفقود ہو جاتی۔ برف کے جو مناظر اس حصۂ دنیا میں دیکھے، حیرت انگیز تھے۔ میلوں تک جدھر نگاہ اٹھتی تھی، برف کے ڈھیر نالوں میں اور پہاڑوں کی چوٹیوں پر چمک رہے تھے۔ ہم نے پہلی مرتبہ آسمانی برف سیف الملوک کے راستے میں دیکھی تھی لیکن بہت کم۔ اب برف کی کثرت تعجب انگیز تھی اور بار بار ہمیں برف کے اوپر سے گزرنا پڑا۔

جدیدیت پسندوں کے دعوے

لاہور برِ عظیم کا مرکز تھا جہاں اقبال مرحوم جیسے فلسفی تھے جو مغربی تہذیب و فکر سے بخوبی واقف تھے اور شاعری کے عصا سے مغرب کا زبردست مقابلہ کر رہے تھے۔

غلبہ مغرب کے باعث برِ عظیم میں بے شمار جدیدیت پسند مفکرین کرامت جونپوری، سرسید، عبداللطیف خان، خدا بخش، امیر علی، چراغ علی، حالی وغیرہ منظرِ عام پر آ چکے تھے اور اسلام کے علوم اور ماخذات دین میں دراڑیں ڈال چکے تھے مثلاً اس عہد کے جدیدیت پسندوں کا دعویٰ کہ قرآن خدا کا کلام ہے۔ [word of God] اور کائنات خدا کا کام [work of God] دو قرآن ہیں ایک قرآن تیس پاروں میں [Holy Book] بند ہے۔ دوسرا قرآن کتاب فطرت ہے [Book of Nature] علم کا مطلب سائنس [Science] اور عمل کا مطلب ٹیکنالوجی [Technology] ہے۔ علوم کی قدیم اسلامی تقسیم، علوم نقلیہ [Real Knowledge] اور علوم عقلیہ [Rational Knowledge] ختم ہو چکی ہے۔ سائنس [Science] اور مذہب [Religion] میں کوئی فرق نہیں، سائنس داں [Scients] اور پیغمبر [Prophet] کے کام میں کوئی فرق نہیں، ایک مظاہر و آثار کائنات کے ذریعے خالق کائنات کا ادراک کرتا ہے، اور طبیعیات کے ذریعے مابعد الطبیعیاتی حقائق تک پہنچتا ہے۔ دوسرا عقلی وجدان [Rational Intution] اور روحانی وجدان [Spritual Intution] کے ذریعے خالق باری کا براہ راست مشاہدہ کرتا ہے، یعنی نبی مابعد الطبیعیات کے ذریعے مابعد الطبیعیات کے حقائق تک پہنچتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں سائنس دان پیغمبر سے افضل ہے جو طبیعیات سے مابعد الطبیعیات کی حقیقت جان لیتا ہے۔ پیغمبر تو مابعد الطبیعیات کے سہارے ہی مابعد الطبیعیات کو پہچان سکتا ہے۔ [نعوذ باللہ] دونوں کے اہداف، مقاصد، منازل میں کوئی فرق نہیں صرف طریقہ کار کا فرق ہے لیکن دونوں کے طریقہ کار کے نتائج یکساں ہیں یعنی حقیقت مطلقہ کی تلاش اور ادراک مغربی غلبے کے بعد نئی تقسیم علوم قبول کرنا ضروری ہے۔

سائنس داں عالم نبی سب برابر ہیں:

سائنس دان اور علما برابر ہیں بلکہ اصل علما تو سائنس دان ہیں جو مظاہر فطرت میں ڈوب کر فطرت کو

تسخیر بھی کرتے ہیں اور بے نقاب بھی ۔ اصل عبادت مظاہر فطرت کی تسخیر ہی ہے ۔ وہ شخص عالم ہی نہیں جو کچھ ایجاد نہ کر سکے اور انسانیت کی فلاح و بہبود میں ناکام رہے کیونکہ ایجادات تسخیر کائنات اور مادی فوائد کے بغیر فلاح کا کوئی تصور قابل قبول نہیں ہو سکتا ۔ علم نقلیہ کا دور جا چکا اگر انھیں برقرار رکھنا ہے تب بھی ان کی تشکیل جدید اور از سرِ نو تشریح ضروری ہے ۔ عہد حاضر کا سائنٹفک انسان اسلام کی متعین کردہ قدیم تقسیم علوم کو قبول نہیں کر سکتا کیونکہ اس کا ذہن تجربیت اور حواس پر انحصار کرتا ہے لہٰذا سائنس اور سوشل سائنسز کو علوم کی بنیاد سمجھا جائے حقیقی علوم کا ماخذ [Source of Knowledge] ذات خداوندی، وحی الٰہی، رسالت مآب کے بجائے اب صرف اور صرف [Human Rational and Human Mind] رہ گیا ہے کیونکہ سائنس اور سوشل سائنس انسان کی دریافت ہے ۔ اصل علم یہی ہے جس علم کے ساتھ ٹیکنالوجی نہ ہو اور تجربیت نہ ہو جس کی سائنسی بنیادوں پر تصدیق و تردید ممکن نہ ہو وہ علم علم نہیں جہل ہے ۔

جدید انسان کے لیے جدید زبان ضروری ہے:

اس عہد کا انسان پچھلے عہد سے مختلف ہے ۔ اس کے سانچے، ڈھانچے، طرزِ فکر، جذبات، احساسات، خیالات، محسوسات قدیم انسان سے یکسر مختلف ہیں لہٰذا اب قدیم علماء کی کتابیں ناکارہ ہیں، ان کو جدید پیرایہ میں پیش کرنا ضروری ہے، مثلاً قدیم علماء فقہاء دین کو حقوق العباد اور حقوق اللہ کے خانوں میں تقسیم کیا ہے ۔ یہ تقسیم جدید ذہن قبول نہیں کر سکتا لہٰذا اسے جدید ذہن کے مطابق پیش کیا جائے ۔ جیسے ضابطہ ایمانیات، قانون عبادات، قانون معاشرت کیونکہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اصطلاحات میں اللہ اور عباد کے الفاظ آتے ہیں ۔ جدید ذہن نہ اللہ کو تسلیم کرتا ہے نہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا بندہ سمجھتا ہے لہٰذا جدید ذہن کے لیے اسالیب، محاورہ، لغت، زبان، بیان، طرز سب بدل دیے جائیں، قرآن میں کہا گیا کہ سورج مشرق سے نکلتا ہے مغرب میں غروب ہوتا ہے ۔ یہ بات نئے اسلوب میں پیش کی جائے کیونکہ جدید ذہن اس غیر سائنسی منطق کو تسلیم نہیں کرے گا ۔ قرآن میں آسمان کا ذکر بار بار آتا ہے ۔ یہ سائنسی لحاظ سے درست نہیں ہے ۔ آسمان تو کوئی چیز نہیں لہٰذا اس اسلوب کو بدل کر نئے الفاظ میں پیش کیا جائے ۔ اس طرزِ عمل کو Reform، اصلاح، تجدید، تعبیر نو، تشریح نو، تعمیر نو کے خوبصورت عنوانات دیے گئے تاکہ دین کو جدیدیت کے نام پر تجدد دین کے حوالے کر دیا جائے ۔ جدیدیت کی اس لہر کا لاہور کی علمی و ادبی و تحقیقی فضاء پر خاص اثر تھا جس کی ایک جھلک ہمیں ان موضوعات میں نظر آتی ہے جو خواجہ عبدالوحید کے روزنامچے کے مطابق اس عہد میں لاہور کے افق پر روشن تھے اور مختلف حلقوں پر مباحث کی صورت پیدا کر رہے تھے ۔ ان موضوعات کی فہرست درج ذیل ہے:

ا۔ احکام قرآن پر حکومت کے بغیر عمل ممکن نہیں علماء جو کچھ احکامات بتاتے ہیں اس پر عمل کے لیے حکومت ضروری ہے ورنہ عمل ممکن نہیں ۔ [دوسرے لفظوں میں جب تک حکومت نہ ملے مسلمان بے

عمل رہ سکتے ہیں]

۲۔ اسلامی سوسائٹی جب تک عورتوں کو اپنی زندگی کا مالک نہ بنائے انھیں عشق و عاشقی میں نہیں پڑنا چاہیے کیونکہ کسی کے دام محبت میں گرفتار ہو کر وہ عورت نئی دنیا تعمیر نہیں کر سکتی لہٰذا عورت کے لیے فراق ہجر میں تڑپنے اور گھٹ کر مر جانے کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا۔[یعنی تہذیب مغرب کے نتیجے میں عورت اگر آزاد ہوگی تو عشق و عاشقی کے لیے آزاد ہوگی معاشرے کا اصل مسئلہ عورت کی آزادانہ محبت ہے]

۳۔ اس عہد میں جدیدیت کا عالم یہ تھا کہ علماء عجیب و غریب موضوعات پر خطاب فرماتے تھے، مثلاً مولانا غلام مرشد کا موضوع "دین اللہ تعالیٰ کا تجویز کردہ قانون امن ہے"۔

۴۔ مولانا احمد علی لاہوری نے اس موضوع پر درس قرآن دیا کہ "کس طرح مسلمانوں نے ترقی کے اصول ترک کیے اور نا کامی اٹھائی اور کیوں کر اہل مغرب نے انھیں اختیار کیا اور صفحۂ ہستی پر غلبہ پالیا [درس قرآن کا یہ موضوع مسدس حالی کے ان مصرعوں کی شرح ہے جس میں حالی کہتے ہیں۔

شریعت کے جو ہم نے پیمان توڑے — وہ لے جا کے سب اہل مغرب نے جوڑے

مدار اب حفظ علم پر ہے شرف کا — کہ باقی ہے تذکرہ بھی اک سلف کی

نہیں اب تلک اصلا خبر ہم کو یہ بھی — کہ ہے کون مردار کلیا ترقی

حالی اسی مسدس میں مسلمانوں کی ماضی میں ترقی کے اسباب کا بھی ذکر کرتے ہیں۔

نبرڈی میں جو آج فائق ہیں سب سے — بتائیں کہ نبرل بجے ہیں وہ کب سے

ارسطو کے مردہ فنوں کو جلایا — فلاطوں کو زندہ پھر کر دکھایا

ہر اک شہر و قریہ کو یونان بنایا — مزا علم و حکمت کا سب کو چکھایا

پڑی خاک اتنقر میں جاں جن سے — ہوا زندہ پھر نام یونان جن سے

[دوسرے لفظوں میں ماضی میں مسلمانوں کو غلبہ یونانی علوم و سائنس کے احیاء سے ملا تھا اور اب غلبہ مغربی علم و سائنس کو اختیار کرنے سے ملے گا نہ ماضی میں مسلمانوں کو اپنے علم کا کوئی ثمر ملا نہ مستقبل میں مسلمانوں کو اپنے علم کا کوئی ثمر ملا نہ مستقبل میں کچھ ملنے کا امکان ہے جو کچھ ملے گا وہ غیروں سے ملے گا اب یہ ثمر صرف مغرب سے ملے گا گویا مسلمانوں کے پاس نہ پہلے کچھ ان کا تھا اب کچھ ان کا ہے، پہلے عروج یونان کے فلسفہ و سائنس سے ملا تھا اب مغرب کے فلسفے و سائنس سے ملے گا اور مغرب کی سائنسی ترقی تو اصلاً مسلمانوں سے مستعار لی گئی ہے۔ان دلائل پر سوائے اس کے کیا کہا جائے کہ:

ترپن LIII

آنکھ نرگس کی دہن غنچے کا حیرت میری

اپنی تصویر پہ نازاں ہو تمہارا کیا ہے؟]

۵۔ مغرب کی سائنسی ترقی اسلام کے باعث ممکن ہوئی۔[یہ اس دور کا محبوب ترین موضوع تھا اور اس موضوع پر بے شمار مضامین لکھے گئے، مقالات پڑھے گئے، لیکن علامہ سلیمان ندوی کے سوا کسی نے اس سوال پر غور نہیں کیا کہ اسلام کی آمد سے ہزاروں سال پہلے چین، ہندوستان، ہڑپہ، موئنجوداڑو، یونان، مصر میں جو عظیم الشان سائنسی ترقی ہوئی وہ اسلام، قرآن اور رسالت مآبؐ کے بغیر کیسے ہوگئی؟]

۶۔ اسلام اور دنیوی ترقی۔

۷۔ ارتقاء اور اسلام۔

۸۔ گری ہوئی قوموں کو زندگی حاصل کرنے کے لیے کن اسباب کی ضرورت ہے۔[سبب کا ذکر ہے مسبب الاسباب کا ذکر نہیں]

۹۔ عروج و زوال قوم کا فلسفہ

۱۰۔ شادی شدہ زندگی میں رومانس پیدا ہوسکتا ہے یا نہیں؟

۱۱۔ مسلمان سائنس دان

۱۲۔ قرآن اور امن عالم

۱۳۔ قرآن حکیم اور انسانی ترقی کا معیار[مولانا احمد علی لاہوری کا درس قرآن]

۱۴۔ قرآن اور امیر غریب کی جنگ،[مظہر علی اظہر کا درس قرآن]

۱۵۔ قرآن اور حقوق نسواں[مولانا غلام مرشد کا درس]

۱۶۔ کیا قرآن حکیم عورتوں سے خطاب کرتا ہے۔

۱۷۔ عورتوں کی محبت ایک حد سے زیادہ بڑھ جانے پر مرد کو سوسائٹی کے لیے ناکارہ بنادیتی ہے۔

۱۸۔ نبوت محمدی کی حقیقت کو بزرگان سلف بھی نہ سمجھ سکے۔

۱۹۔ اسلام اور روحانی ترقی

۲۰۔ کیا اسلام تلوار سے پھیلا؟

۲۱۔ اسلام کا اقتصادی نظام[۱۹۲۴ء میں خلافت اسلامیہ کا زوال ہوا اور ۱۹۳۵ء میں اس موضوع پر گفتگو ہورہی ہے کہ کیا ہمارا نظام اقتصادی بھی تھا گویا صرف نو سال میں لوگ اسلام کے اقتصادی نظام کو بھول گئے۔]

۲۲۔ Development of Science under the inflience of Islam

۲۳۔ Religion and the solution of Modern Problem

۲۴۔ مفکرین اسلام

۲۵۔ تاج محل

26- THE SCIENTIFIC THEORIES OF RELIGION AND REVELATION.

27- THE POETRY OF HASRAT MOHANI.

28- THE BAHAI RELIGION.

29- REFORM MOVEMENTS IN THE MUSLIM WORLD.

۳۰۔ اسلام میں فکر سیاسی کی تاریخ

۳۱۔ مسلمان سائنس دان

۳۲۔ اسلام کی اولین صورت کو قائم رکھتے ہوئے اس زمانے میں دنیوی ترقی بھی کی جا سکتی ہے [کسی نے یہ موضوع منتخب نہیں کیا کہ اسلام کی صورت بگاڑ کر دین میں تحریفات کر کے دین کو ترک کر کے ۱۹۲۴ء تک مسلمانوں نے کتنی ترقی کر لی تھی۔]

۳۰۔ How Islam was lost to Islam

۳۱۔ عرب اور امریکہ کی تلاش

ان موضوعات میں مرکزی موضوع عورت کی آزادی، اسے اسلامی اقدار و روایات سے آزاد کرانا، ترقی، عروج، معاشی خوش حالی شامل تھا۔ ان موضوعات کا اصل محرک مغرب سے حد درجہ کی مرعوبیت تھی۔ یہ مرعوبیت ایک عامی سے لے کر فلسفی اور عالم تک چھائی ہوئی تھی۔ سرسید احمد خان جیسے مصلح لندن گئے اور اپنی رہائش گاہ کی خادمہ کے اعتماد کلام اور حسن کلام سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنے خط میں لکھا کہ اس خاتون کا جو اخلاق و کردار ہے، ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان میں بھی اس درجے کی عورت نہ ملے گی۔ جدید سائنسی رصد گاہوں، تجربہ گاہوں میں عورتوں کو آزادانہ کام کرتے ہوئے دیکھ کر وہ مغربی تہذیب پر ریجھ گئے۔ یہ حال سرسید کا تھا تو عام لوگ اس وباء سے کس طرح محفوظ رہتے۔ لہٰذا عورت کے حقوق، عورت کی آزادی، شادی کے لیے عورت کے آزادانہ ارادے، عشق و عاشقی کی آزادی، جیسے مباحث لاہور کے حلقوں میں کثرت سے اٹھتے رہے۔ افسوس کہ ان مباحث میں مغربی فکر و فلسفے کی تنقید و تائید سے متعلق مباحث شامل نہیں ہیں جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مغرب، اس کی سائنس اور اس کی ٹیکنالوجی سے متاثر ہونے والے مغرب کے فکر و فلسفے سے بالکل اسی طرح غافل

تھے جس طرح عربی مدارس کے فاضلین جب لاہور کا یہ حال تھا تو ہندوستان کے دیگر شہروں کی علمی مجالس کے مباحث و موضوعات کا بخوبی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ خواجہ عبدالوحید کے ادارے اسلامک ریسرچ اکیڈمی کے زیر اہتمام بھی مغربی فکر و فلسفے کی حقیقت پر کوئی مقالہ نہیں پڑھا گیا۔

اس روزنامچے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کے لاہور کے مذہبی اور غیر مذہبی حلقے مغربی فکر و فلسفے، مغرب کی الٰہیات، مابعد الطبیعیات، کونیات، وجودیات سے واقف نہ تھے اور مغرب کے بڑھتے چڑھتے ہوئے ترقیاتی انقلاب سے بے پناہ متاثر تھے اور مغرب کی اسلام کاری کے لیے کوششوں میں مصروف ہے۔ صرف علامہ اقبال مرحوم واحد استثناء تھے جو تہذیب مغربی پر تیشہ زنی کر رہے تھے۔

مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا مظہر علی اظہر جیسے علماء بھی ان موضوعات پر درس قرآن دے رہے تھے جن سے مرعوبیت مغرب کا پہلو نکلتا ہے لیکن ان مباحث اور دروس میں ایک موضوع بھی ایسا نہیں ملتا جس سے معلوم ہوتا ہو کہ اس وقت کے اہل دین و اہل علم مغرب سے مرعوب نہ تھے۔ علماء کرام ایسے ایسے موضوعات کو اظہار کے لیے منتخب کر رہے تھے۔ جن مباحث کی اسلامی منہاج میں کوئی جگہ نہ تھی وہ ترقی کو ایک غیر جانبدار قدر ز [Value Nutral] قدر کے طور پر برت رہے تھے اور ترقی ترقی کا گیت گا رہے تھے لیکن اس ترقی فروغ کی اصل سے قطعاً ناواقف تھے لہٰذا ایسے ایسے دعوے اور مکالمات ہو رہے تھے اور ان کو اسلامی تاریخ تہذیب سے ثابت کیا جا رہا تھا جن کا وجود اسلامی علمیات میں گمان نہیں کیا جا سکتا تھا۔

جدیدیت کے زیر اثر لاہور کے علمی حلقوں میں اٹھنے والے مخصوص سوالات اور موضوعات کے باوجود علامہ اقبال مرحوم ان مباحث سے قطعاً متاثر نہ تھے، وہ اسلام میں قائم کردہ عورت کی فطری حدود کو بالکل درست سمجھتے تھے۔ اس ضمن میں انھیں دل و دماغ کا ایسا یقین حاصل تھا جو بڑے بڑے متقین کو بھی مشکل سے حاصل ہوتا ہے۔ ان مباحث سے اقبال مرحوم سخت دل برداشتہ تھے۔ وہ ہندوستان میں تعلیم یافتہ لوگوں کے زبانی معرکوں سے تنگ آ گئے تھے۔ خواجہ عبدالوحید کا روزنامچہ علامہ اقبالؒ کے خیالات سے ہمیں آگاہ کرتا ہے۔ صحبت اقبال کا ثمر خواجہ وحید کے الفاظ میں ملاحظہ کیجیے۔ پڑھے لکھے جہلاء ان کے بارے میں اقبال مرحوم کہتے ہیں:

ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمانوں کو ہلاک کر دیا جائے: اقبال

حضرت علامہ نے ہندوستانی مسلمانوں کے متعلق یہ کہا کہ: "میرا مدت العمر کا مطالعہ اور مشاہدہ مجھے یقین دلا چکا ہے کہ یہ لوگ بالکل بے کار ہیں۔ بالخصوص ہندوستان کے تعلیم یافتہ مسلمان"۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر کبھی کام آ سکتے ہیں تو غریب مزدور، پیشہ یا دکان دار مسلمان جن کے لیے اُن کے دل میں محبت اور احترام ہے اور جن سے مل کر انھیں حقیقی خوشی حاصل ہوتی ہے لیکن تعلیم یافتہ مسلمانوں کا گروہ مستحق التفات نہیں۔ یہاں تک کہ اگر وہ قرون متوسطہ کے ڈکٹیٹر بن جائیں تو وہ اس گروہ کو "ہلاک" کر دیں۔

آپ نے فرمایا کہ اسلام کا مستقبل دنیا کے دوسرے مسلمانوں پر منحصر ہے نہ کہ ہندی مسلمانوں پر۔ [ص۲۰۴، اقبال مرحوم کے حضور] خواجہ عبدالوحید کے مطابق [جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں حضرت علامہ کی رائے اچھی نہیں تھی۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ ایک دوسرے موقع پر انھوں نے فرمایا تھا "ہمارے تعلیم یافتہ بات سن کر یاد نہیں رکھ سکتے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جب انھیں کوئی پیغام دے کر بھیجا جائے تو وہ کسی پیغام کو من و عن نہیں پہنچاتے بلکہ اس میں کچھ نہ کچھ کمی یا بیشی کر دیتے ہیں۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا: "میں نے اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ آدمی کو جب بھی کہیں پیغام دے کر بھیجا اس نے اس میں سے یا تو کچھ حذف کر دیا یا کچھ اپنی طرف سے بڑھا دیا۔" حضرت علامہ نے مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم کے نام ایک خط لکھا تھا "مسلمانوں کا مغرب زدہ طبقہ تحت پست فطرت ہے۔" ان الفاظ سے بھی جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے بارے میں حضرت علامہ کی رائے کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ [۲۱۸، اقبال مرحوم کے حضور]

جاپان میں اسلام ہفتوں میں پھیل سکتا ہے: اقبال

جاپان کا ذکر آیا تو آپ نے کہا کہ جاپان میں تبدیلیِ مذہب دنوں یا ہفتوں کا کام ہے نہ کہ یورپین ممالک کی طرح صدیوں کا۔ اگر اسلام کا چرچا اس ملک میں شروع ہو گیا تو چند ہفتوں میں تمام جاپانی قوم مسلمان ہو جائے گی۔ اس کی وجہ زیادہ تر سیاسی ہے۔ جاپان کے لیے مسلمان ہو جانے میں یہ فائدہ ہوگا کہ روس کے خلاف اُسے چین اور ترکستان میں زبردست اسلامی قوت کی امداد حاصل ہو جائے گی۔ [روزنامچہ، ص ۱۴۰] یہی موضوع ایک اور جگہ ان الفاظ میں بیان ہوا ہے:

علامہ اقبال مرحوم کا یہ خیال تھا کہ کسی بڑی آزاد قوم کا حلقہ بگوشِ اسلام ہو جانا دنیا میں اسلام کے لیے موجب احیا ہوگا اس لیے ان کی یہ آرزو تھی کہ جاپانی یا جرمن ایسی قوم مسلمان ہو جائے۔ ان کی یہ آرزو عین منشائے ایزدی کے مطابق تھی، اس لیے کہ قرآن میں کہہ دیا گیا ہے کہ اگر مسلمان اسلام کے لیے جدوجہد کرنے سے احتراز کریں گے تو اللہ تعالیٰ کوئی اور قوم کھڑی کر دے گا جو اللہ کی راہ میں مارنے اور مرنے سے گریز نہ کرے گی۔ ہم عصر مسلمان ملکوں اور قوموں کے متعلق بھی حضرت علامہ کی رائے بالعموم اچھی نہ تھی، اس لیے کہ بیشتر ممالک یا تو مغربی استعمار کے پنجے میں پھنسے ہوئے تھے یا مغربی تمدن کے مقلد ہو چکے تھے۔ ان کا یہ خیال بھی تھا کہ جب تک مسلمان قومیں مغربی اقوام کی غلامی سے آزاد نہ ہوں احیائے اسلام کا کام نہیں ہو سکتا۔

مرد دماغ سے تخلیقی کام لیتا ہے عورت رحم سے:

حضرت علامہ نے عورتوں کے متعلق متعدد باتیں کہیں۔ مثلاً: I have no faith in women ۔ عورتیں اپنے مخصوص مشاغل (مثلاً خانہ داری) میں بھی بلند ذہنیت کا ثبوت نہیں دیتیں۔ [علامہ اقبال مرحوم کی اس رائے سے اتفاق ناممکن ہے اس معاملے میں وہ مقامی معاشرتی ذہنیوں سے بلند نہ ہو سکے] اس پر میں نے کہا

کہ وہ شعبہ ہائے زندگی جن میں عورت کو اپنے کمالات دکھانے کی ہمیشہ آزادی رہی ہے، اُن میں بھی اس نے مجتہدانہ شان پیدا نہ کی۔ چنانچہ موسیقی میں اگرچہ عورتیں ہمیشہ بہ بر عام آتی رہیں، فنِ موسیقی میں دسترس بہت کم عورتوں نے پائی۔ اسی طرح باورچی کے کام میں ہمیشہ اور آج بھی مرد ہی پیش پیش رہے ہیں، حالانکہ یہ خالص نسوانی شغل تھا۔

پھر حضرت علامہ نے فرمایا کہ عورت کو دماغ کمزور ملا تھا، اس لیے کہ Creative Function اُس کے معاملے میں دماغ کی بجائے Womb سے تعلق رکھتی ہے۔ مرد دماغ سے تخلیق کا کام لیتا ہے اور عورت Womb سے۔ یہی وجہ ہے کہ جن عورتوں کا رحم اپنا طبعی کام کرتا ہے (یعنی جو بچے جنتی ہیں) وہ زیادہ ذہین اور سمجھ دار ہوتی ہیں، بمقابلہ اُن کے جنھوں نے کبھی بچہ نہیں جنا۔ [روزنامچہ، ص ۱۶۶]

اس سے مراد محض یہ تھی کہ قومی زندگی میں قیادت عورتوں کے بس کی چیز نہیں۔ بہ رشتہ حیات اجتماعی میں عورتوں کے مقام کے متعلق ان کے خیالات عالیہ ان کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں۔ انھوں نے جابجا عورت کے فرائض اصلیہ کی طرف توجہ دلائی ہے، اور ان فرائض میں ان کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت عورت کے ''تحفظ امومت'' کی ہے۔ عورت کو اولاد سے محروم کر دینے کو وہ تہذیب حاضرہ کے بدترین نتائج میں شمار کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک موقع پر آپ نے اس تہذیب کا خلاصہ ان الفاظ میں بیان کیا ہے: مرد بے کار و زن تہی آغوش۔

[اقبال مرحوم کے حضور، ص ۳۱۹]

اقبال مرحوم کا عشق ایمانی۔ طوائفیں:

اورنگ زیب عالمگیر نے، جو بڑا متشرع بادشاہ تھا، حکم دیا کہ ایک خاص مدت تک تمام طوائفیں نکاح کر لیں ورنہ کشتی میں بھر کر تمام کو دریا برد کر دیا جائے۔ جب تعمیل حکم میں ایک دن باقی رہ گیا تو ایک طوائف جو شیخ کلیم اللہ جہاں آبادی کے پاس آتی تھی، آخری سلام کے لیے حاضر ہوئی اور سارا ماجرا سنایا۔ شیخ نے کہا کہ تم حافظ شیرازی کا یہ شعر یاد کر لو:

در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند
گر تو نمی پسندی تغییر کن قضا را

اور کل جب تمھیں دریا کی طرف لے چلیں تو با آوازِ بلند اس شعر کو پڑھتی جاؤ۔ ان طوائفوں نے اس کو یاد کر لیا اور جب روانہ ہوئیں تو یاس کی حالت میں نہایت خوش الحانی سے بڑے درد انگیز لہجے میں اس شعر کو پڑھنا شروع کر دیا۔ جس جس نے سنا، دل تھام کر رہ گیا۔ جب بادشاہ کے کانوں میں آواز پہنچی تو بے قرار ہو گیا۔ ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ حکم دیا، سب کو چھوڑ دو۔

اس واقعے سے کلام حافظ کی تاثیر کا اندازہ فرمائیں۔ کیا ان معنوں میں حافظ کو ساحر کہنا کوئی بے جا

بات تھی؟ یہ حافظ کا حسن کلام نہیں ہے بلکہ اقبال مرحوم اس کو حافظ کا قبح قرار دیتے ہیں۔ اس لیے کہ اقبال مرحوم کے خیال میں اس شعر میں حافظ نے مسئلہ تقدیر کی غلط اور حیات کش تعبیر کی ہے۔ اقبال مرحوم فرماتے ہیں کہ:

''مسئلہ تقدیر کی ایسی غلط مگر دل آویز تعبیر سے حافظ کی شاعرانہ جادوگری نے ایک متشرع اور نیک نیت بادشاہ کو، جو آئین حقہ شرعیہ اسلامیہ کی حکومت قائم کرنے اور زنانیات کا خاتمہ کر کے اسلامی سوسائٹی کے دامن کو بدنما داغ سے پاک کرنے میں کوشاں تھا، قلبی اعتبار سے اس قدر ناتواں کر دیا کہ اسے قوانین اسلامیہ کی تعمیل کرانے کی ہمت نہ رہی۔

عورتوں کے معاملے میں اقبال مرحوم راسخ العقیدہ خیالات رکھتے تھے اور اس کے مقام و مرتبے سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ اقبال مرحوم کے عہد میں طوائفوں کو عروج حاصل تھا۔ اس ضمن میں اقبال مرحوم کا تبصرہ نہایت اہمیت رکھتا ہے۔ وہ حافظ کی شاعری اور انحطاط پذیر مسلم معاشرے پر لطیف طنز کرتے ہیں۔

بداخلاقی کو طاقت سے مٹا دیا جائے: اقبال

آج حافظ حبیب اللہ صاحب کی معیت میں علامہ سر محمد اقبال مرحوم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ باتوں باتوں میں جہاد پر گفتگو ہوگئی۔ میں نے پوچھا کہ جہاد دفاعی ہونا چاہیے یا جارحانہ۔ فرمانے لگے کہ عام طور پر دفاعی ہے لیکن بوقت ضرورت جارحانہ بھی ہو سکتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی قوم بداخلاقی میں اس قدر بڑھ جائے کہ جس سے دنیا میں نسل انسانی بالعموم تباہ ہو سکتی ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ بزور شمشیر اس قوم میں سے خرابی کو مٹانے کی کوشش کریں۔ چنانچہ سلطان ٹیپو مرحوم نے مالابار کے غیر مسلم وحشی باشندوں کو کہا تھا کہ تم بجائے برہنہ پھرنے کے کپڑے پہنا کرو ورنہ میں بزور شمشیر تمھیں مسلمان بنا کر تمھیں کپڑے پہننے پر مجبور کروں گا۔ نیز آپ [علامہ اقبال] نے آج یہ بھی فرمایا کہ قرآن میں جو امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا حکم مسلمانوں کو دیا گیا ہے تو اس سے صاف ظاہر ہے کہ اشاعت حق کے پیچھے شمشیر کی حمایت ہونی چاہیے ورنہ بغیر طاقت کے امر و نہی کیسے ممکن ہے۔ اگر امر و نہی کے فرائض مسلمان ادا کرنا چاہتے ہیں تو ان کے بازوؤں میں طاقت ہونا ضروری ہے۔ [روزنامچہ، ص ۲۹۳]

جذبات حسنہ کو مردہ کرنے والا آرٹ ممنوع ہے: اقبال

انسانی زندگی کو فائدہ پہنچنا چاہیے۔ ان کا ذاتی خیال یہ ہے کہ آرٹ زندگی کے ماتحت ہے۔ ہر چیز کو انسان کی زندگی کے لیے وقف ہونا چاہیے، اس لیے ہر وہ آرٹ جو زندگی کے لیے مفید ہو، جائز ہے اور جو زندگی کے خلاف ہو، جو انسان کی ہمتوں کو پست اور جذبات حسنہ کو مردہ کرنے والا ہو، قابل نفرت ہے اور اس کی ترویج حکومت کی طرف سے ممنوع قرار دی جانی چاہیے۔ [روزنامچہ، ص ۱۹۷]

عہد حاضر کی حکومت اخلاق کی حفاظت کو فرض نہیں سمجھتی: اقبال

ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ حکومت کا سب سے بڑا فرض افراد کے اخلاق کی حفاظت ہے لیکن اس سب سے بڑے فرض کو دنیائے جدید تسلیم ہی نہیں کرتی۔ حکومتیں محض سیاسی خیالات سے تعلق رکھتی ہیں۔ افراد کے اخلاق کو درست کرنا اپنے فرائض میں داخل ہی نہیں سمجھتیں۔ [روزنامچہ، ص ۱۹۸]

ہندوؤں کی تباہی میں موسیقی کا حصہ ہے: اقبال

پھر اسلام اور تہذیب حاضرہ کا ذکر ہوا۔ فرمانے لگے کہ اسلام تہذیب حاضرہ کی تمام ضروری اور اصولی چیزوں کا دشمن ہے، اس لیے مسلمانوں کو اسے تباہ کرنے کی کوشش کرنا چاہیے نہ یہ کہ ان چیزوں کو جزو اسلام بنا لیا جائے۔ آپ نے یہ بھی کہا کہ اب دنیا اسلام کی طرف آ رہی ہے، اس لیے اگر آج تہذیب مغربی تباہ ہو جائے تو اسلام کا بول بالا ہو جائے گا۔ اس لیے مسلمانوں کو اس آنے والے دور کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ جس وقت تہذیب جدید کا خاتمہ ہو، مسلمانوں کا اسلام کا علم بلند کر دینا چاہیے۔

آرٹ کے مضر اثرات کے متعلق آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لیے مردہ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندوؤں کی تباہی میں موسیقی کا بہت حصہ رہا ہے۔ [روزنامچہ، ص ۱۹۸]

اسلام کی فلاح برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے: اقبال

پرسوں رات علامہ سر محمد اقبال مرحوم نے بڑی پرجوش باتیں کیں۔ میں جب کبھی اُن سے ملتا ہوں یہ جی چاہتا ہے کہ اُن کی باتیں لکھتا چلا جاؤں لیکن ایسا نہیں ہو سکتا اور بعد میں اکثر باتیں بھول جاتا ہوں۔ اُس روز آپ نے فرمایا۔

Character is a Kind of energy. The more it is dissipated the weaker it becomes.

''جو جذبہ آج شاتم رسول کی سزا کے طور پر ہندو کے خلاف ظاہر ہو رہا ہے، وہ عنقریب انگریزوں کی طرف رخ پھیرنے والا ہے''۔

حضرت علامہ کے خیال میں دنیائے اسلام کی فلاح سلطنت برطانیہ کی تباہی پر منحصر ہے۔ [روزنامچہ، ۲۱۴]

فقر سے انسان بے پناہ فائدہ اٹھا سکتا ہے: اقبال

ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ ایک قوم یا فرد کو حالات کی نا مساعدت اور بخت کی نارسائی سے بھی فائدہ اٹھانا چاہیے۔ بے سروسامانی، افلاس اور فقر سے بھی انسان بے انتہا فوائد حاصل کر سکتا ہے۔ ایک مفلس آدمی جس کے پاس چھن جانے کے لیے کچھ نہیں یا جسے کسی مال و متاع کی محبت اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی، حق و صداقت کی حمایت میں دلیری اور جرأت دکھا سکتا ہے۔ [روزنامچہ، ص ۱۷۸]

تعلیم سے نہ دنیا ملی نہ دین: اقبالؔ

تعلیم کا ذکر آیا تو فرمایا کہ مسلمانوں نے دنیا کمانے کے لیے دنیوی تعلیم حاصل کرنا چاہی لیکن نہ تو دنیا حاصل کر سکے اور نہ دین ہی سنبھال سکے۔ یہی حال آج مسلم خواتین کا ہے جو دنیوی تعلیم حاصل کرنے کے شوق میں دین بھی کھو رہی ہیں۔ [روزنامچہ، ص ۱۷۸]

ابلیس خارجی چیز ہے شیطان داخلی: اقبالؔ

حضرت علامہ کے پاس جتنا عرصہ ہم لوگ ٹھہرے بہت دلچسپ گفتگو ہوئی۔ زیادہ تر قادیانیوں کا ذکر رہا۔ آپ نے فرمایا کہ مرزا صاحب وحی والہام اور مہدی و مسیح میں تمیز نہیں کر سکے۔ شیطان کا ذکر آگیا تو آپ نے توضیح فرمائی کہ ابلیس اور شیطان مختلف شخصیتیں ہیں۔ ابلیس بصیغۂ واحد کو رہے اور شیطان کی جمع شیاطین بھی استعمال ہوئی ہے۔ ابلیس خارجی چیز ہے، شیطان داخلی۔ ابلیس Will کا نام ہے، شیطان قوت گمراہی کا، وغیرہ وغیرہ۔ [روزنامچہ، ص ۲۳۰]

بزرگان سلف اور ہم نبوت محمدیؐ کی حقیقت نہ سمجھ سکے

کل رات کو علامہ سر اقبال مرحوم کی طرف گیا۔ وہاں پیر تاج دین صاحب بیرسٹر مع دو ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے اور بہت بیہودہ گفتگو میں مصروف تھے۔ مجھے اُن کے پاس بیٹھنا بہت ہی ناگوار معلوم ہوتا تھا۔

اُن کے جانے کے بعد حضرت علامہ سے باتیں شروع ہوئیں۔ اس اثنا میں راجہ حسن اختر صاحب مع ایک ساتھی کے اور پھر چوہدری محمد حسین صاحب بھی تشریف لے آئے۔ رات کی گفتگو بڑی ہی دقیق، علمی و فلسفیانہ تھی۔ نبوت پر عموماً اور نبوت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر خصوصاً بحث تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا پختہ خیال ہے کہ نبوت محمدیہ کی معنوی حیثیت کو انسان نہیں سمجھا۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ بزرگانِ سلف بھی اس کی حقیقت کو نہ سمجھ سکے۔

وہ خود مدعی ہیں کہ اُن کو اس کے DISCOVER کرنے کا موقع مل گیا ہے اور وہ تمہید القرآن (اُن کی مجوزہ کتاب) میں اس پر بحث کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔

سترہ روز بعد قادیان تباہ ہو جائے گا:

علامہ اقبال مرحوم نے حسرت صاحب کو مشورہ دیا فوراً "احسان" میں موٹے موٹے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ سترہ روز کے بعد قادیان تباہ ہو جائے گا اور ہر روز اس اعلان کو شائع کرتے رہیں۔ سترہ روز گزر جانے کے بعد جب اعتراض ہو تو کہہ دیا جائے کہ یوم قرآنی اصطلاح ہے نہ کہ چوبیس گھنٹے گزرنے کا وقفہ۔ [روزنامچہ، ص ۲۳۰]

یہی گفتگو خواجہ عبدالوحید صاحب نے نقوش اقبال مرحوم نمبر میں اس طرح درج کی ہے:

شیطان کا ذکر آ گیا تو آپ نے توضیح فرمائی کہ ابلیس اور شیطان شخصیتیں ہیں۔[قرآن میں] ابلیس بصیغۂ واحد مذکور ہے اور شیطان کی جمع شیاطین بھی استعمال ہوتی ہے۔ ابلیس خارجی چیز ہے، شیطان داخلی۔ ابلیس Will کا نام ہے شیطان قوتِ گمراہی کا۔

[حضرت علامہ نے ازرہِ ظرافت چراغ حسن] حسرت صاحب کو مشورہ دیا کہ فوراً [روزنامہ] احسان میں موٹے موٹے الفاظ میں اعلان کر دیں کہ سترہ روز کے بعد قادیان تباہ ہو جائے گا اور ہر روز اس اعلان کو شائع کرتے ہیں۔ سترہ روز گزر جانے پر اعتراض ہو تو کہہ دیا جائے کہ "یوم" قرآنی اصطلاح ہے نہ کہ چوبیس گھنٹے کا وقفہ۔ [اقبال مرحوم کے حضور،ص ۲۰۵]

علامہ اقبال مرحوم اور خواجہ عبدالوحید نے قادیانیت کے خلاف اس بڑے پیمانے پر علمی و قلمی جہاد کیا جس کے خاموش اثرات عالم اسلام کے تمام دیار و امصار میں پھیل گئے۔ اس کا اندازہ اب لگانا مشکل ہے، قادیانیوں کے خلاف عالمی تحریک دراصل علماء، علامہ اقبال مرحوم اور وحیدالدین کے قلمی و علمی جہاد کی اثر آفرینی کا اظہار ہے۔

روزنامچے میں علامہ اقبال کے ارشادات و ملفوظات کی عبارتوں کا نقوش اقبال نمبر میں خواجہ صاحب کے مضمون "اقبال کے حضور" میں درج شدہ عبارتوں سے معازانہ کیا گیا تو بعض مقامات پر متن میں فرق محسوس کیا گیا۔ مرتب نے بعض مقامات قلم زد کر دیے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مقامات مسودہ سے سٹ گئے ہوں۔

خواجہ عبدالوحید نے روزنامچے میں علامہ اقبال مرحوم کے ملفوظات کا جو خلاصہ پیش کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شہر لاہور میں صرف علامہ اقبال مرحوم مغربی فکر و فلسفے سے متعلق افکار اور اس کی ثقافت و سیاست و تہذیب سے پیدا ہونے والے مسائل پر مسلسل غور و فکر فرماتے تھے اور ان مشکلات کو حل کرنے کے لیے کوشاں رہتے تھے۔ خواجہ عبدالوحید صاحب علامہ اقبال مرحوم کے ہمسایہ تھے اور علامہ صاحب سے ان کے بچپن کے مراسم تھے، لیکن افسوس کہ علامہ اقبال مرحوم سے خواجہ صاحب کی اتنی قربت کے باوجود ہم تک روزنامچے کے ذریعے اقبال مرحوم کے جو ملفوظات پہنچے ہیں وہ بہت کم ہیں۔ اس کی وجہ خواجہ صاحب کی ذہنی و معاشی پریشانیاں ہیں جس کا اظہار روزنامچے میں جگہ جگہ کیا گیا ہے۔ ان پریشانیوں کے باعث خواجہ صاحب علامہ اقبال سے کم کم ملتے تھے اور ملنے کے باوجود ذہنی پریشانی کے باعث اقبال مرحوم کے ملفوظات کو تحریر نہ کر سکتے تھے۔ خواجہ صاحب علامہ اقبال مرحوم سے اس قدر بے تکلف تھے کہ گورنمنٹ کالج میں داخلے کے لیے اقبال مرحوم سے درخواست کو قبولیت بخشی۔ اس بے تکلفی کے باوجود خواجہ صاحب کے روزنامچے میں علامہ اقبال مرحوم سے جس پہلی ملاقات کا احوال درج ہے وہ ۱۹۳۲ء کی ہے جب کہ خواجہ صاحب بچپن سے علامہ اقبال مرحوم سے مستفید ہو رہے تھے۔ ۱۹۳۲ء کے بعد بھی خواجہ صاحب کی علامہ سے بے شمار ملاقاتیں ہوئیں لیکن پریشان خاطری کے باعث خواجہ صاحب ان علمی

ملفوظات تحریر نہ کر سکے۔ اس کے باوجود اقبال مرحوم کے جو ارشادات روزنامچے میں محفوظ کیے گئے ہیں اہمیت کے حامل ہیں۔

خطبات اقبال: سید سلیمان ندوی کی نظر میں:

علامہ اقبالؒ، خواجہ عبدالوحیدؒ کا ذکر ہو اور سید سلیمان ندویؒ کا ذکر نہ ہو یہ کیسے ممکن ہے؟ علامہ اقبالؒ شبلی نعمانیؒ کے انتقال کے بعد جانشین شبلیؒ کو استاذالکل قرار دیتے تھے اور انھیں اسلام کی جوئے شیر کا فرہاد لکھتے تھے۔ علوم اسلامی سے متعلق بیشتر استفسارات علامہ اقبال سلیمانؒ ندوی سے فرماتے تھے۔ سلیمانؒ ندوی کی آرزو تھی کہ اقبال خطبات شائع نہ کرتے لیکن یہ آرزو پوری نہ ہو سکی جس کا انھیں شدید قلق تھا۔ لیکن اس کے باوجود علامہ اقبال سے ان کے روابط میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سلیمانؒ ندوی کے خواجہ صاحب سے بھی دوستانہ روابط تھے۔ خواجہ صاحب کے نام سلیمان ندوی کے خطوط بھی جلد "تجدید" میں شائع کیے جا رہے ہیں۔ خطبات کے بارے میں سید سلیمان ندوی نے سکوت اختیار فرمایا، اس کی کیا حکمت تھی؟ کیا مصلحت تھی؟ یہ ایسا سوال تھا جس کا جواب راقم نے بے شمار لوگوں سے معلوم کرنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہا۔ علامہ سلیمان ندویؒ کے مسترشد جناب ڈاکٹر غلام محمدؒ جو راقم الحروف کے ہمسایہ تھے راقم نے ان سے اس بارے میں مسلسل اور مستقل استفسارات کیے۔ غلام محمد صاحب نے خطبات کے سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریا آبادی اور اپنے شیخ حضرت والا سید سلیمان ندویؒ سے خطبات کے بارے میں جو کچھ سنا تھا وہ راقم کو جستہ جستہ املا کرا دیا۔ لیکن املا پر انھیں نظر ثانی کی مہلت نہ ملی۔ یہ املا ذیل میں بعض جگہ تکرار محسوس ہوتی ہے۔ ایک بات دوسرے پیرائے میں دوسری جگہ دہرائی گئی ہے لیکن راقم نے اسے جوں کا توں رکھا۔ ان عبارتوں کی ادارت نہیں کی۔ املا کے یہ صفحات نامکمل ہیں۔ بقیہ صفحات کتابی صورت میں شائع کیے جائیں گے۔ ڈاکٹر غلام محمدؒ نے خطبات پر سید سلیمانؒ ندوی صاحب اور ماجدؒ صاحب کے اعتراضات کئی نشستوں میں بیان فرمائے۔ راقم تین سال تک پابندی سے استفادہ کرتا رہا۔ ڈاکٹر غلام محمدؒ والد محترم کے استاد تھے اور کئی سال سے ہمسایہ بھی لہٰذا خاص لطف و کرم فرماتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب سے استفادے کا یہ سلسلہ دسمبر ۹۲ء تک جاری رہا۔ راقم کی رہائش گاہ تبدیل ہوئی تو یہ استفادہ معطل ہو گیا۔ اس عہد کی یادداشتیں پیش خدمت ہیں۔ یادداشتوں کے بہت سے اوراق منتشر ہیں۔ انھیں ترتیب دے کر کتابی شکل میں شائع کیا جائے گا۔ ماجد دریا آبادی صاحب نے فلسفیانہ بنیادوں پر اعتراضات فرمائے تھے کیونکہ وہ خود فلسفی تھے۔

علامہ سید سلیمان ندویؒ اور خطبات اقبال

علامہ ندوی کے افادات اور نقد

اسلام کی تشکیل نو کے لیے اقبال مرحوم نے یورپ کے فکر و فلسفے کے غیر جانبدارانہ و غیر جذباتی جائزے کی بات کی ہے اور کہا ہے کہ یورپ جن نتائج تک پہنچا ہے وہ اسلام کے دینی فکر کی نظر ثانی اور تشکیل نو میں کہاں تک مدد دے سکتے ہیں۔ یہ نقطہ نظر بھی سراسر غلط ہے۔ اول تو دینی فکر پر نظر ثانی کا امکان ہی خارج از بحث ہے لیکن ہلاکت آفرینی یہ ہے کہ اسلام پر نظر ثانی اور اسلام کی تشکیل کے لیے معاونت ایک ملحد اور کافرانہ فکر و فلسفے سے درآمد کی جا رہی ہے۔ اقبال مرحوم کا آخری خطبہ Is religion possible بہت مختصر ہے لیکن اسے پڑھ لیا جائے تو ان کی تمام فکری لغزشیں مغرب سے مرعوبیت عیاں ہو جاتی ہے۔ نکلسن کا دیباچہ مثنوی اسرار خودی میں اقبال کے افکار اقبال مرحوم کے الفاظ میں پڑھ لیے جائیں تو اقبال مرحوم اور مغرب کے مابین گہری فکری فلسفیانہ ہم آہنگی واضح ہو جاتی ہے۔ اسرار خودی کا دیباچہ جسے بعد میں خارج کر دیا گیا۔ خطبات کے جستہ جستہ مقامات دیکھ لیے جائیں تو اقبال مرحوم کی تمام غلطیوں کا خاطر خواہ جائزہ لیا جا سکتا ہے۔

حضرت والا علامہ سید سلیمان ندویؒ نے جن مقامات کی نشاندہی کی تھی۔ ان کی تعداد دس سے زیادہ تھی۔ اقبال مرحوم کی تحریروں میں جن قابل اعتراض مقامات نکلسن کے دیباچے، خطبات اور اسرار خودی کے دیباچے سے منتخب کیے گئے تھے۔ [سلیمان ندویؒ نے ڈاکٹر غلام احمدؒ خطبات کے جن مقامات کے مطالعے کی ہدایت کی تھی اس کی تفصیل اور وہ تمام عبارتیں اس مضمون کی دوسری قسط میں پیش کی جائیں گی۔ فی الحال چند مقامات پیش کیے جا رہے ہیں۔ مرتب]

[1] The more genuine school of Sufism have, no doubt, done good work in shaping and directing the evolution of religious experience in Islam; but their latter day representatives, owing to their ignorance of the modern mind, have become absolutely incapable of receiving any fresh inspiration from modern thought and experience. They are perpetuating methods which were created for generations possessing a cultural outlook differing, in important respects, from our own.

[2] In these lectures I have tried to meet, even though partially, this urgent demand by attempting to reconstruct Muslim religious philosophy with due

regard to the philosophical tradition of Islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge.

[3] The task before the modem Muslim is, therefore, immense. He has to rethink the whole system of Islam without completely breaking with the past....... The only course open to us is to approach modern knowledge with a respectful but independent attitude and to appreciate the teachings of Islam in the light of that knowledge, even though we may be led to differ from those who have gone before us.

[4] The truth is that the religious and the scientific processes, though involving different methods, are identical in their final aim. Both aim at reaching the most real...... In the domain of science we try to understand its meanings in reference to the external behaviour of reality; in the domain of religion we take it as representative of some kind of reality and try to discover its meanings in reference mainly to the inner nature of that reality. The scientific and the religious processes are in a sense parallel to each other. Both are really descriptions of the same world with this difference only that in the scientific process the ego's stand point is necessarily exclusive, whereas in the religious process the ego integrates its competing tendencies and develops a single inclusive attitude resulting in a kind of synthetic transfiguration of his experiences.

[5] The great point in. christianity is the search for an independent content for spiritual life which, according to the insight of its founder, could be elevated, not by the forces of a world external to the soul of man, but by the revelation of a new world within his soul. Islam fully agrees with this insight and supplements it by the further insight that the illumination of the new world thus revealed is not something foreign to the world of matter but permeates it

through and through.

[6] The Absolute Ego, as we have seen, is the whole of Reality. He is not so situated as to take a perspective view of an alien universe; consequently, the phases of His life are wholly determined from within.

[7] It is the lot of man to share in the deeper aspirations of the universe around him and to shape his own destiny as well as that of the universe, now by adjusting himself to its forces, now by putting the whole of his energy to mould its forces to his own ends and .purposes. And in this process of progressive change God becomes a co-worker with him, provided man takes the initiative.

[8] The truth is that among the Muslim nations of. To-day, Turkey alone has shaken off its dogmatic slumber, and attained to self-consciousness. She alone has claimed her right of intellectual freedom; she alone has passed from the ideal to the real - a transition which entails keen intellectual and moral struggle. To her the growing complexities of a mobile and broadening life are sure to bring new situations suggesting new points of view, and necessitating fresh interpretations of principles which are only of an academic interest to a people who have never experienced the joy of spiritual expansion.

[9] Shari'at values (Ahkam) resulting from this application (e. g; rules relating to penalties for crimes) are in a sense specific to that people; and, since their observance is not an end in itself, they cannot be strictly enforced in the case of future generations.

[10] In the third period (of religious life) metaphysics is displaced by psychology and religious life develops the ambission to come into direct contact with the ultimate Reality.

[11] The interests of truth require that we must abandon our present attitude. I t does not matter in the least if the religious attitude is originally determined by

some kind of physiological disorder. George Fox may be a neurotic; but who can deny his purifying power in England's religious life of his day? Muhammad, we are told, was a psychopath. Well, if a psychopath has the power to give a fresh direction to the course of human history, it is a point of the highest psychological interest to search his original experience which has turned slaves into leaders of men, and has inspired the conduct and shaped the career of whole races of mankind. Judging from the various types of activity that emanated from the movement initiated by the Prophet of Islam, his spiritual tension and the kind of behaviour which issued from it, cannot be regarded as a response to a mere fantasy inside his brain. It is impossible to understand it except as a response to an objective situation generative of new enthusiasms, new organizations, new starting-points. If we look at the matter from the standpoint of anthropology it appears that a psychopath is an important factor in the economy of humanity's social organization. His way is not to classify facts and discover causes: he thinks in terms of life and movement with a view to create new patterns of behaviour for mankind. No doubt he has his pitfalls and illusions just as the scientist who relies on sense-experience has his pitfalls and illusions. A careful study of his method, however, shows that he is not less alert than the scientist in the matter of eliminating the alloy of illusion from his experience.

The question for us outsiders is to find out an effective method of inquiry into the nature and significance of this extraordinary experience.

[12] This is missing the whole point of higher religious life. Sexual self-restraint is only a preliminary stage in the ego's evolution. The ultimate purpose of religious life is to make this evolution move in a direction far more important to the destiny of the ego than the moral health of the social fabric

which forms his present environment. The basic perception from which religious life moves forward is the present slender unity of the ego, his liability to dissolution, his amenability to reformation and the capacity for an ampler freedom to create new situations in known and unknown environments. In view of this fundamental perception higher religious life fixes its gaze on experiences symbolic of those subtle movements of Reality which seriously affect the destiny of the ego as a possibly permanent element in the constitution of Reality.

[13] Whatever may be the psychological ground of the distinctions made in this passage it gives us at least some idea of a whole universe of inner experience as seen by a great reformer of Islamic Sufism.

[14] However, according to the teaching of the Qur'an the ego's re-emergence brings him a 'sharp sight' (50:22) whereby he clearly sees his self-built fate fastened round his neck.' Heaven and Hell are states, not localities. Their descriptions in the Qur'an are visual representations of an inner fact, i.e. character. Hell, in the words of the Qur'an, is 'God's kindled fire which mounts above the hearts-the painful realization of one's failure as a man. Heaven is the joy of triumph over the forces of disintegration. There is no such thing as eternal damnation in Islam. The word 'eternity' used in certain verses, relating to Hell, is explained by the Qur'an itself to mean only a period of time (78: 23). Time cannot be wholly irrelevant to the development of personality. Character tends to become permanent; its reshaping must require time. Hell, therefore, as conceived by the Qur'an, is not a pit of everlasting torture inflicted by a revengeful God; it is a corrective experience which may make a hardened ego once more sensitive to the living breeze of Divine Grace. Nor is Heaven a holiday. Life is one and continuous. Man marches always onward to receive

ever fresh illuminations from an Infinite Reality which 'every moment appears in a new glory'. And the recipient of Divine illumination is not merely a passive recipient. Every act of a free ego creates a new situation, and thus offers further opportunities of creative unfolding.

[15] The state of Barzakh, therefore, does not seem to be merely a passive state of expectation; it is a state in which the ego catches a glimpse of fresh aspects of Reality, and prepares himself for adjustment to these aspects. It must be a state of great psychic unhingement, especially in the case of full-grown egos who have naturally developed fixed modes of operation on a specific spatio-temporal order, and may mean dissolution to less fortunate ones. However, the ego must continue to struggle until he is able to gather himself up, and win his resurrection. The resurrection, therefore, is not an external event. It is the consummation of a life-process within the ego. Whether individual or universal it is nothing more than a kind of stock-taking of the ego's past achievements and his future possibilities. The Qur'an argues the phenomenon of reemergence of the ego on the analogy of his first emergence:

[16] Iqbal has drunk deep of European literature, his philosophy owes much to Nietzsche and Bergson, and his poetry often reminds us of Sheeley: yet he thinks and feels as a Moslem, and just for this reason his influence may be great. He is a religious enthusiast, inspired by the vision of a New Mecca, a world-wide, theocratic, Utopian state.

[17] The cry "Back to the Koran! Back to Mohammed! has been heard before, and the responses have hitherto been somewhat discouraging. But on this occasion it is allied with the revolutionary force of Western philosophy, which Iqbal hopes and believes will vitalise the movement and ensure its triumph. He sees that Hindu intellectualism and Islamic pantheism have

destroyed the capacity for action, based on scientific observation and interpretation of phenomena, which distinguishes the Western peoples "and especially the English." Now, this capacity depends ultimately on the conviction that khudf (selfhood, individuality, personality) is real and is not merely an illusion of the mind. Iqbal, therefore, throws himself with all his might against idealistic philosophers and pseudo-mystical poets, the authors, in his opinion, of the decay prevailing in Islam, and argues that only by self-affirmation, self-expression, and self-development can the Moslems once more become strong and free.

[18] Other questions of a more fundamental character have been solved for me by the author himself. At my request he drew up a statement of his philosophical views on the problems touched and suggested in the book. I will give it in his own words as nearly as possible.

[19] "The Philosophical, Basic of The Asrar-I Khudi. The test of reality, in his opinion, is all-inclusiveness; and since all finiteness is 'infected with relativity,' it follows that the latter is a mere illusion. To my mind, this inexplicable finite centre of experience is the fundamental fact of the universe. All life is individual; there is no such thing as universal life. God himself is an individual: He is the most unique individual. The universe, as Dr. McTaggart says, is an association of individuals; but we must add that the orderliness and adjustment which we find in this association is not eternally achieved and complete in itself.

[20] Thus the universe is not a completed act: it is still in the course of formation. There can be no complete truth about the universe, for the universe has not yet become 'whole.' The process of creation is still going on, and man too takes his share in it, inasmuch as he helps to bring order into at least a

portion of, the chaos. The Koran indicates the possibility of other creators than God.

"Obviously, this view of man and the, universe is opposed to that of the English Neo-Hegelians as well as to all forms of pantheistic Sufism which regard absorption in a universal life or soul as the final aim and salvation of man. The moral and religious ideal of man is not self-negation but self-affirmation, and he attains to this ideal by becoming more and more individual, more and more unique. The Prophet said, 'Takhallaqu bi-akhldq Alla' 'Create in yourselves the attributes of, God.' Thus man becomes unique by becoming more and more like the most unique Individual. What then is life 1 It is individual: its highest form, so far, is the Ego (I(hudl) in which the individual becomes a self-contained exclusive centre. Physically as well as spiritually man is a self-contained centre, but he is not yet a complete individual. The greater his distance from God, the less his individuality. He who comes nearest to God is the mpletest person. Not that he is finally absorbed in God. On the, contrary, he absorbs God into himself.

[21] Life is a forward assimilative movement. It removes all obstructions in its march by assimilating them. Its essence is the continual creation of desires and ideals, and for the purpose of its preservation and expansion it has invented or developed out of itself certain instruments, e.g. senses, Intellect, etc., which help it to assimilate obstructions. The greatest obstacle in the way of life is matter, Nature; yet Nature is not evil, since it enables the inner powers of life to unfold themselves.

"The Ego attains to freedom by the removal of all obstructions in its way. It is partly free, partly determined, and reaches fuller freedom by approaching the Individual who is most free God. In one word, life is an endavour for freedom.

[22] In man the centre of life becomes an Ego or Person. Personality is a state of tension and can continue only if that state is maintained. If the state of tension is not maintained, relaxation will ensue. Since personality, or the state of tension, is the most valuable achievement of man, he should see that he does not revert to a state of relaxation. That which tends to maintain the state of tension tends to make us immortal. Thus the idea of personality gives us a standard of value: it settles the problem of good and evil. That which fortifies personality is good, that which weakens it is bad. Art,1 religion, and ethics 2 must be judged from the standpoint of personality. My criticism of Plato 3 is directed against those philosophical systems which hold up death rather than life as their ideal systems which ignore the greatest obstruction to life, namely, matter, and teach us to run away from it instead of absorbing it.

[23] Transl. 1. 673 foil. In a note on our Prophet's criticism of contemporary Arabian poetry" (1'he lYtiC Era, 1916, p. 251) Iqbal writes: The ultimate end of all human activity is Life-glorious, powerful, exuberant. All human art must be subordinated to this final purpose, and the value of everything must be determined in reference to its life-yielding capacity. The highest art is that which awakens our dormant will-force and nerves us to face the trials of life manfully. All that brings drowsiness and makes us shut our eyes to Reality around, on the mastery of which alone Life depends, is a message decay and death here should be no opium-eating. In Art. The dogma of — for the sake of Art IS a clever invention of decadence to cheat us out of life and power."

[24] Buddhism, Persian Sufism, and allied forms of ethics will not serve our purpose. But they are not wholly useless, because after periods of great activity we need opiates, narcotics, for some time. These forms of thought and action are like nights in the days of life. Thus, if our activity is directed towards the

maintenance of a state of tension, the shock of death is not likely to affect it. After death there may be an interval of relaxation, as the Koran speaks of a barzakh, or intermediate state, which lasts until the Day of Resurrection. Only those Egos will survive this state of relaxation who have taken good care during the present life. Although life abhors repetition in its evolution, yet on Bergson's principles the resurrection of the body too, as Wildon Carr says, is quite possible. By breaking up time into moments we spatialise it and then find difficulty in getting over it. The true nature of time is reached when we look into our deeper self. 2 Real time is life itself, which can preserve itself by maintaining that particular state of tension (personality) which it has so far achieved. We are subject to time so long as we look upon time as something spatial. Specialised time is a fetter which life has forged for itself in order to assimilate the present environment. In reality we are timeless, and it is possible to realize our timelessness even in this life. This revelation, however, can be momentary only.

[25] THE EDUCATION OF THE EGO "The Ego is fortified by love (ishq). This word is used in a very wide sense and means the desire to assimilate, to absorb. Its highest form is the creation of values and ideals and the endeavour to realize them. Love individualizes the lover as well as the beloved. The effort to realize the most unique individuality individualises the seeker and implies the individuality of the sought, for nothing else would satisfy the nature of the seeker.

[26] "In another part of the poem 2 I have' hinted at the general principles of Moslem ethics and have tried to reveal their meaning in connexion with the idea of personality. The Ego in its movement towards uniqueness has to pass through three stages:

(a) Obedience to the Law.

(b) Self-control, which is the highest

form of self-consciousness or Ego-hood.1

(c) Divine vicegerency.2

"This (divine vicegerency, niyabat-i ildltt) is. the third and last stage of human development on earth. The nd'ib (vicegerent) is the vicegerent of God on earth. He is the completes. Ego, the goal of humanity, the acme of life both in mind and body; in him the discord of our mental life becomes a harmony. The highest power is united in him with the highest know ledge. In his life, thought and action, instinct and reason, become one. He is the last fruit of the tree of humanity, and all the trials of a painful evolution are justified because he is to come at the end. He is the real ruler of man kind; his kingdom is the kingdom of God on earth. Out of the richness of his nature he lavishes the wealth of life II on others, and brings them nearer and nearer to himself. The more we advance in evolution, the nearer we get to him. In approaching him we are raising our selves in the scale of life; The development of humanity both in mind and body is a condition precedent to his birth. For the present he is a mere ideal; but the evolution of humanity is tending towards the production of an ideal race of more or less unique individuals who will become his fitting parents. Thus the Kingdom of God on earth means the democracy of more or less unique individuals, presided over by the most unique individual possible, I on this earth. Nietzsche had a glimpse of this ideal race, but his atheism and aristocratic prejudices marred his whole conception.

مثنوی اسرارِ خودی کا دیباچہ جو حذف کر دیا گیا:

مسلمانوں اور ہندوؤں کی ذہنی تاریخ میں ایک عجیب و غریب مماثلت ہے اور وہ یہ کہ جس نکتۂ خیال سے سری کرشن نے "گیتا" کی تفسیر کی، اسی نکتۂ خیال سے شیخ محی الدین ابن عربی اندلسی نے قرآن شریف کی تفسیر

کی جس نے مسلمانوں کے دل و دماغ پر نہایت گہرا اثر ڈالا ہے۔ شیخ اکبر کے علم و فضل اور اُن کی زبردست شخصیت نے مسئلہ وحدت الوجود کو جس کے وہ آن تھک مفسر تھے، اسلامی تخیل کا ایک لاینفک عنصر بنا دیا۔ اوحدالدین کرمانی اور فخرالدین عراقی ان کی تعلیم سے نہایت متاثر ہوئے۔ اور رفتہ رفتہ چودھویں صدی کے تمام عجمی شعراء اس رنگ میں رنگین ہوگئے۔ ایرانیوں کی نازک مزاج اور لطیف الطبع قوم اس طویل دماغی مشقت کی کہاں متحمل ہوسکتی تھی جو جزو سے کل تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے۔ انھوں نے جزو و کل کا دشوار گزار درمیانی فاصلہ تخیل کی مدد سے طے کر کے "رگِ چراغ" میں "خونِ آفتاب" کا اور "شرارِ سنگ" میں "جلوۂ طور" کا بلاواسطہ مشاہدہ کیا۔

مختصر یہ کہ ہندو حکماء نے مسئلہ وحدت الوجود کے اثبات میں دماغ کو اپنا مخاطب کیا، مگر ایرانی شعراء نے اس مسئلے کی تفسیر میں زیادہ خطرناک طریق اختیار کیا یعنی انھوں نے دل کو اپنی آماج گاہ بنایا اور اُن کی حسین و جمیل نکتہ آفرینیوں کا آخر کار یہ نتیجہ ہوا کہ اس مسئلے نے عوام تک پہنچ کر قریباً تمام اسلامی اقوام کو ذوقِ عمل سے محروم کر دیا۔ علماءِ قوم میں سب سے پہلے غالباً ابن تیمیہ علیہ الرحمۃ اور حکماء میں واحد محمد نے اسلامی تخیل کے اس ہمہ گیر میلان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی۔

مغربی اقوام اپنی قوتِ عمل کی وجہ سے تمام اقوامِ عالم میں ممتاز ہیں اور اسی وجہ سے اسرارِ زندگی کو سمجھنے کے لیے اُن کے ادبیات و تخیلات اہلِ مشرق کے لیے بہترین رہنما ہیں۔ اگرچہ مغرب کے فلسفۂ جدید کی ابتدا ہالینڈ کے اسرائیلی فلسفی کے نظامِ وحدت الوجود سے ہوتی ہے، لیکن مغرب کی طبائع پر رنگِ عمل غالب تھا۔ مسئلہ وحدت الوجود کا یہ طلسم جس کو ریاضیات کے طریقِ استدلال سے پختہ کیا گیا تھا، دیر تک قائم نہ رہ سکتا تھا۔

سب سے پہلے جرمنی میں انسانی انا کی انفرادی حقیقت پر زور دیا گیا اور رفتہ رفتہ فلاسفۂ مغرب بالخصوص حکمائے انگلستان کے عملی ذوق کی بدولت اس خیالی طلسم کے اثر سے آزاد ہوگئے۔

نظامِ قدرت کے نہاں اسرار بطن سے واقعات پیدا ہوتے رہے ہیں اور ہوتے رہیں گے۔ مگر بیکن سے پہلے کون جانتا تھا کہ یہ واقعاتِ حاضرہ، جن کو نظریات کے دل دادہ فلسفی اپنے تخیل کی بلندی سے بنگاہِ حقارت دیکھتے ہیں، اپنے اندر حقائق و معارف کا ایک گنجِ گراں مایہ پوشیدہ رکھتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ انگریزی قوم کی عملی فطرت کا احسان تمام دنیا کی قوموں پر ہے کہ اس قوم میں جس "واقعات" اور اقوامِ عالم کی نسبت زیادہ تیز اور ترقی یافتہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی "دماغ یافتہ" فلسفیانہ نظام، جو واقعاتِ متعارفہ کی تیز روشنی کا متحمل نہ ہوسکتا ہو، انگلستان کی سرزمین میں آج تک مقبول نہیں ہوا۔ پس حکمائے انگلستان کی تحریریں ادبیاتِ عالم میں ایک خاص پایہ رکھتی ہیں اور اس قابل ہیں کہ مشرقی دل و دماغ ان سے مستفید ہو کر اپنی قدیم فلسفیانہ روایات پر نظرِ ثانی کریں۔

یہ دلچسپ بات ہے کہ تمام جدیدیت پسند کرامت علی سے مشرقی اور اقبال مرحوم تک سب اسلام کی

اصلاح کے در پے ہیں۔ایک بھی ایسا نہیں جو مغرب کی اصلاح چاہتا ہو، تمام عیب نقائص اسلام میں ملتے ہیں، مغرب ہر عیب سے خالی ہے۔یہ عجیب تضاد ہے۔کوئی مغرب کو بدلنا نہیں چاہتا سب اسلام کو بدلنا چاہتے ہیں اور بدلنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتے۔ان میں سے کچھ عربی نہیں جانتے، کچھ اسلام کو نہیں جانتے، کچھ مغرب کو نہیں جانتے، سب ایک آنکھ والے ہیں لیکن صرف اسلام کو تبدیل کرنا چاہتے ہیں۔اسلام اور مغرب دو مختلف ادیان ہیں، مارما ڈیوک پکتھال تو مغرب کو تہذیب ہی نہیں مانتے وہ تو کہتے تھے کہ یہ بہیمیت ہے یہ کتوں اور بلیوں کی تہذیب ہے اسے تہذیب نہیں کہا جا سکتا۔مسلمانوں کا اصل انحطاط اور ذلت کی آخری حد یہی ہے کہ انہیں اپنے عروج کے لیے اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لیے، سہارا کہاں سے ملے گا۔اللہ سے اس کے رسول سے اپنے نظریہ حیات سے نہیں بلکہ یورپ کے اصولوں سے تجربیت سے، سائنس سے، عقلیت سے، معتزلہ سے، نطشے، برگسان کے میرٹین اور وجدان سے یہ پستی کی انتہا ہے۔اسی لیے علماء نے خطبات اقبال مرحوم کی شدید مخالفت کی، کفر کے فتوے بھی دیے گئے لیکن ہم اقبال مرحوم کی اہمیت و افادیت کو سمجھتے تھے، علماء نے کہا کہ خطبات پر نقد معارف میں آنا چاہیے، اس ہیچ مداں نے صرف زبانی اتنا کہا کہ یہ لیکچر شائع نہ ہوتے تو اچھا ہوتا، اس سے زیادہ کہنے کی ضرورت نہ تھی۔اقبال مرحوم مرحوم کی شاعری نے اس ملت کو تازہ خون پہنچایا بلکہ اس ملت کے بکھرے اور بچھڑے ہوئے قافلے کو کمک پہنچائی، جب شاعری پڑھتے ہیں تو ایک آتش فشاں ابلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔یہ اقبال مرحوم کا دل دردمند ہے جو شعروں میں ملت کے زخموں کے لیے مرہم بن جاتا ہے۔اقبال مرحوم کی شاعری اور نثر میں بڑا فرق ہے۔ایک دل کا معاملہ ہے، دوسرا عقل کا۔اسلامی تاریخ و تہذیب میں عقل کا مقام دل ہے جب وہ دل کے مقام سے خطاب کرتے ہیں تو ان کے دل سے نکلی ہوئی آواز ملت اسلامیہ کے دل کی آواز بن جاتی ہے لیکن یہی آواز جب مغرب سے متاثر ہو کر عقل کے ذریعے نثر میں آتی ہے تو ملت اسے مسترد کر دیتی ہے۔علماء نے ان کی شاعری کے بڑے حصے کو قبول کر لیا کہ یہ ٹھیک تھا جو حصہ غلط تھا وہ غلط ہے لیکن نثر کو قدیم اور جدید طبقات نے مسترد کر دیا۔البتہ مجھے نظر آتا ہے کہ مستقبل میں مغرب گر اقبال مرحوم اور خطبات کو اسلامی معاشروں کو جدید بنانے کے لیے مضبوط آلے کے طور پر استعمال کرے گا۔نکلسن نے اپنے مقدمے میں بلاوجہ نہیں لکھا

They involve a radical change in the Moslem mind and their real importance is not to be measured by the fact that such a change is unlikely to occur within a calculable time.

اقبال مرحوم نے اُخی ولیس پادری رجب علی پادری میلکم کے تصور کے برعکس مولوی چراغ علی کے فلسفے سے DYNAMISM کی اصطلاح لے کر کائنات اور اشیاء میں ابدی سکون کی نفی کی اور یہ نفی اس حد تک

وسیع ہوئی کہ انھیں کائنات مسلسل تخلیق کا عمل نظر آتی حتیٰ کہ خدا بھی تخلیق ہونے لگا، کائنات مسلسل تخلیقی میلان و میلان سے بہرہ ور ہونے لگی۔ ارتقا عدم ارتقا کی منزلیں طے کرنے لگیں۔ یہ بات افسوس ناک ہے کہ خودی کی ہمالیٰ وورائی اور تخلیقیت کی شان نہ انبیاء کو معلوم تھی نہ صحابہؓ نہ آسمانی میں ان کا ذکر ہے نہ سلف کے علم میں تھی نہ خلف کو ان کا پتہ ہے۔ یہ اقبال مرحوم کے ذہن و دماغ کی خوبصورت اپج ہے مگر یہ اپج اسلامی علوم کی نفی کرتی ہے خدا خود تخلیق ہو رہا ہے اور کائنات بھی مسلسل تخلیق ہو رہی ہے۔ ایک ایسا تصور ہے جو مذاہب عالم کی پوری تاریخ میں کہیں نہیں ملتا، ان خود ساختہ تصورات کی بنیادیں جدید سائنس سے اقبال مرحوم کی والہانہ محبت میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ اب سائنس کے مفروضات کی بنیاد پر ذات خداوندی اور اس کی پیدا کردہ کائنات کے بارے میں اس آزادانہ تبصرے کی جرأت اسلامی تاریخ میں اقبال مرحوم کے حصے میں آئی۔

اقبال مرحوم کے پاس ان موضوعات کے سلسلے میں اہم ترین حوالہ وائٹ ہیڈ کا ہے، اس کے فکر کا اقبال مرحوم پر بہت اثر تھا لیکن کائنات کے ضمن میں اقبال مرحوم نے جن آیات کا استعمال کیا ہے وہ محل نظر ہیں، ان آیات کا انطباق ان مباحث پر ممکن ہی نہیں۔ خودی، دعا، آزادی سے ہمکنار ہونا، اپنے تجربات سے خودی کی تشکیل جیسے مباحث تمام کے تمام مغربی فلسفے سے اقبال مرحوم نے مستعار لیے اور انھیں اپنے الفاظ میں اسلام کا پیرہن عطا کرنے کی کوشش کی۔

اقبال مرحوم اجتہاد مطلق کے موید تھے یعنی اس درجے کا اجتہاد جو ائمہ اربعہ کی سطح کا ہو یعنی مجتہد مخصوص فقہ کی سطح سے بلند ہو کر براہ راست قرآن و سنت سے استنباط کرے یہ خواہش بہت عمدہ ہے لیکن کیا اس درجے کا اجتہاد کرنے کے لیے اس درجے کی شخصیت، وہی تقویٰ، وہی للہیت، وہی زہد ضروری نہیں ہے بلکہ میں تو یہ کہتا ہوں کہ اب اجتہاد مطلق کے لیے مجتہد مطلق کا مغربی فکر و فلسفہ جدید سائنس اور یونانی فکر و فلسفے کو بخوبی جاننا ضروری ہے اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ یونانی، جرمن، فرانسیسی، انگریزی زبانوں پر بھی عبور رکھتا ہو تا کہ کفر کی حقیقت اس کی اصل زبان میں پڑھ سکے مجتہد کی یہ اضافی صفات عہد حاضر کے لیے ضروری ہیں لیکن اجتہاد کی بنیادی صفات وہی رہیں گی جو امام نوویؒ، بیضاویؒ، غزالیؒ، ماوردیؒ، شاطبیؒ اور صاحب تفسیر احمدیہ تفصیل سے بیان کر چکے ہیں۔ اگر ایسا کوئی مجتہد پیدا ہو جائے تو وہ ضرور اجتہاد کرے لیکن ترکی کے کمال مصطفیٰ اتاترک اور ترکی کی پارلیمنٹ جیسے کافرانہ ملحدانہ اداروں سے اجتہاد کی توقع کرنا اقبال مرحوم کی فاش غلطی تھی اقبال مرحوم نے نثر اور شاعری کے اشارات میں ان مجتہدین عصر پر لطیف طنز کیا ہے جو علوم نقلیہ میں رسوخ اور رسوخ فی الدین کے بغیر اجتہاد کے علمبردار بن گئے ہیں۔ لیکن ان کی مذمت کرتے ہوئے اقبال مرحوم خود اپنے مقام کا جائزہ نہیں لیتے کیا وہ ان مباحث کو برپا کرنے کے اہل تھے عربی زبان سے واقفیت کے بغیر اور علوم اسلامی میں رسوخ کے بغیر ایک ایسے منصب پر فائز ہونے کی کوشش جہاں سے وہ ملت اسلامیہ کی تشکیل نو کا فریضہ بھی سنبھال لیتے ہیں اور اجتہاد کا

طریقہ کار بھی خود طے کر لیتے ہیں اقبال مرحوم کو اجتہاد کے اس فساد کا اندازہ تھا لہذا وہ اسرار خودی میں کہتے ہیں

نقش بہ دل معنی توحید کن چارہ کار خود از تقلید کن
اجتہاد اندر زمان انحطاط معنی تقلید ضبط ملت است

ان اشعار میں اقبال مرحوم نے عہد حاضر میں تقلید کو اجتہاد پر فوقیت دینے کا عندیہ دیا ہے جب اقبال مرحوم کا عہد اجتہاد کے قابل نہ تھا تو آج کے عہد میں تو اجتہاد سے گریز اور تقلید پر اصرار بدرجہ اولیٰ افضل ہے یہ درست ہے کہ اقبال مرحوم کی تائید تقلید ایک عارضی طریقہ اور احتیاطی راستہ ہے اور وہ اجتہاد کے زبردست مؤید تھے مگر کیا عصر حاضر اس احتیاط کا مکلف نہیں ہے یا اجتہاد کی ضرورت سے انکار نہیں لیکن شرائط اجتہاد پر اصرار ہے یا اجتہاد کرنے کے لیے کم از کم مطلوبہ قابلیت تو پیدا کیجیے اس کے بغیر صرف تمنا کا قدم اجتہاد کا راستہ آسان نہیں کر سکتا یا اجتہاد کی بحث میں اقبال مرحوم یہ نکتہ فراموش کرتے ہیں کہ اجتہاد تو نویں صدی ہجری تک کسی نہ کسی شکل میں ہو رہا تھا، لیکن اجتہاد کے دور میں ہی تاتاریوں نے مسلمانوں پر غلبہ کیسے حاصل کر لیا تو وہ کوئی نظریہ حیات رکھتے تھے نہ ان میں وہ حرکت تغیر ارتقاء Dynamism تھا جو کسی تہذیب و تمدن کے غلبے کے لیے بنیاد کا کام کرتا ہے پھر یہی غلبہ اچانک ختم ہو جاتا ہے اور مسلمان دوبارہ غالب آ جاتے ہیں یہ تبدیلی کس اجتہادی قوت کے ذریعے پیدا ہوئی یہاں تو تبدیلی کا عمل صرف دعوت کے ذریعے وقوع پذیر ہوا ہے اگر مسلمان تاتاری غلبے سے اجتہاد کے بغیر نکل سکتے ہیں تو مغربی تہذیب کے غلبے سے نکلنے کے لیے صرف اور صرف اجتہاد پر زور دینے کی کیا ضرورت ہے یا ابن تیمیہؒ کی تحریک اجتہاد کی اہمیت اپنی جگہ اس تحریک سے تاتاریوں کی شکست اور مسلمانوں کے غلبے کا کیا جواز مہیا کیا جا سکتا ہے یا ابن تیمیہؒ کے کس اجتہاد سے تاتاریوں کو شکست ہوئی اور کس اجتہاد نے مسلمانوں کو غلبہ دیا۔ قرآن کی آیتوں اور حدیثوں کو حرکت و ترقی کا مظہر قرار دینا بڑی عجیب بات ہے یہ فکر تاریخ اسلام کے لیے اجنبی فکر ہے اقبال مرحوم تقلید کے خلاف اٹھنے والی وہابی بابی تحریکوں کو اسلام کے دور جدید میں زندگی کے نئے سر چشموں سے تشبیہ دیتے ہیں لیکن ان سر چشموں نے عالم اسلام کی قسمت پر کیا اثر ڈالا۔ وہابی تحریک اجتہادی تحریک تھی؟ کیا یہ تحریک اجتہاد کے زور پر چلی؟ کیا اس تحریک کی مقبولیت اجتہادی روح کے باعث ہوئی یا اس تحریک نے جبر کے ذرائع پر انحصار نہیں کیا؟ تاریخ کا اس رخ سے جائزہ لیا جائے تو چونکا دینے والے حقائق منظر عام پر آئیں گے۔

اس دور کی تاریخ فراموش نہیں کی جا سکتی خلافت عثمانیہ کے خلاف انگریزی استعمار نے آل سعود کو کس طرح استعمال کیا یہ کیسی اجتہادی حرکت تھی جو طاقت اور جبر کی بنیاد پر اپنا دائرہ وسیع کر رہی تھی اس عہد کی تاریخ فراموش نہیں کی جا سکتی۔ اقبال مرحوم وہابی تحریک کے غلبہ کو اجتہاد کا غلبہ اور ان کے لیے نیک شگون تصور کرتے ہیں۔ یہ رویہ دراصل ان کی رومانیت کا نتیجہ ہے جو ملت اسلامیہ کا عروج چاہتی ہے خواہ یہ عروج جبر سے ہو جبکہ عروج جبر سے کیسے آ سکتا ہے۔ صرف اجتہاد کے جوش میں تحریکوں کی تعریف و توصیف یک طرفہ نظریہ ہے جو اقبال مرحوم

جیسے مفکر کے شایان نہیں ہے انتہا یہ ہے کہ وہ ترکی کی اصلاحات کو بھی اجتہاد کے احیاء کی نئی شکلیں قرار دیتے ہیں اور ان شکلوں کی بنیاد پر یہ استدلال کرتے ہیں کہ اسلامی ثقافت اپنی اصل میں حرکت پذیر ہے اور اس حرکت کے لیے قوت نمو اسے خارج سے نہیں داخل سے فراہم ہوتی ہے آج اقبال مرحوم زندہ ہوتے تو اپنے ان مفروضوں کی حقیقت اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے، ان کی نظر سے کمال اتاترک کے کمالات نہیں گزرے جب وہ آسمان کی طرف دیکھتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کو دکھاتا تھا اگر اسلام ایسے اجتہاد کے لیے آیا تھا تو پھر اسلام کی کیا ضرورت ہے؟ وہابی تحریک نے عصر حاضر کے تناظر میں کیا اجتہاد کیا ہے؟ ہم تو کم از کم اس سے لاعلم ہیں۔ عالمی اجتماع اسلامی کراچی میں منعقد ہوئی تھی، پوری دنیا سے تمام مکاتب فکر کے مسلم علماء فقہا تشریف لائے تھے، کئی روز تک ان سے تبادلہ خیال ہوتا رہا سب کا خیال یہی تھا کہ مغربی فکر و فلسفہ اور جدید سائنس کو سمجھے بغیر اجتہاد کا راستہ کشادہ کرے گا، ہر دردمند عالم خواہ کسی مکتب فکر سے ہو، اپنے ملک کی صورت حال سے مایوس تھا اور ہمارے شاعر مشرق بابی، (وہابی) ترک، اجتہاد میں امیدوں کا جہاں آباد کر رہے تھے۔

قدیم علماء نے اجتہاد کے لیے جو شرائط طے کیں وہ اقبال مرحوم کو عصر حاضر کے فرد میں نظر نہ آئیں تو انھوں نے اجتماعی اجتہاد اسمبلی کے ذریعے کرنے کا اجتہاد فرمایا، جب شرائط اجتہاد فرد میں نہیں پائی گئیں تو اسمبلی میں کیسے اکٹھے ہو سکتی ہیں، سو صفر اکٹھے ہو کر ایک کیسے بن سکتے ہیں، اسمبلیوں کے انتخابات کا تماشہ ہندوستان میں بہت دیکھا جا چکا یہ اسمبلیاں کیسے اجتہاد کر سکتی ہیں، اسمبلی کے انتخابات کی بنیاد مساوات کے نظریے پر ہے، تمام انسان برابر ہیں، ایک زمانہ تھا جب ہند میں صرف ٹیکس دینے والے ووٹ دے سکتے تھے وہ زمانہ بھی ختم ہو گیا، ہم پاکستان کی اسمبلی کو اجتہاد کے قابل نہیں سمجھتے اس کے اراکین کا دینی علوم سے کیا تعلق ایک آدھا استثنیٰ چھوڑ دیجیے۔ اب علامہ اقبال مرحوم اور ایک بقال کا ووٹ برابر ہے اور دونوں یکساں طور پر جمہوری عمل کے ذریعے اسمبلی کے ممبر بن سکتے ہیں، اب بقال، حمال، حجام اور موچی اجتہاد کریں گے، اقبال مرحوم کا یہ نقطہ نظر ان کی سطحیت کو واضح کرتا ہے، اس سطحیت کا احساس انھیں آہستہ آہستہ ہوتا گیا کیونکہ شروع میں خطبات پر علی گڑھ میں بہت داد ملی اور ہندوستان کے پڑھے لکھے جو مغرب سے مرعوب تھے انھیں اقبال مرحوم کے ذریعے اسلام کی فصیل میں نقب لگانے کا زبردست طریقہ مل گیا تھا لیکن جب گرد بیٹھ گئی تو حقیقت بھی کھل گئی۔ بعد میں اقبال مرحوم ہندوستان کے ان پڑھے لکھوں سے بہت متنفر ہوئے اور ان سے مکمل مایوس ہو گئے بلکہ کہتے تھے کہ اگر میں آمر ہوتا تو ان کو ہلاک کر دیتا۔

اقبال مرحوم مغرب کے Feminism سے شدید متاثر تھے ایک مضمون میں [انھوں نے لکھا تھا کہ تعدد ازدواج اس عہد کے سیاسی اقتصادی ضرورتوں سے مشروط تھا اور فی زمانہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے جو علماء

تعدد ازدواج کی اجازت دیتے ہیں وہ امرائے قوم کو زنا کا شرعی بہانہ مہیا کرتے ہیں" یہ جسارت مغربی فکر و فلسفے کا نتیجہ اور علوم اسلامی سے عدم واقفیت کے باعث تھی لیکن آخر زمانے میں اقبال مرحوم نے مغرب کی فحاشی عریانی بے حیائی دیکھی تو مجھے لکھا تھا کہ اسلام کے تعدد ازدواج کے اصول کی اصل حقیقت تو مجھ پر واضح ہوئی ہے اگر شارع علیہ السلام ہوتا تو جائز تعداد میں مزید اضافہ کر دیتا۔ مسئلہ یہ ہے کہ عقل اور اجتہاد جب اصول دین بن جائیں تو اسی قسم کی افراط و تفریط لازمی ہے پہلے دوسری کے بھی قائل نہ تھے اب پانچویں کے بھی قائل ہو گئے اسی لیے تقلید اجتہاد سے بہتر ہے اور اگر اجتہاد کرنا ہے تو ان تمام شرائط کا ہونا لازمی ہے جو علماء نے بیان کی ہیں۔ بعد میں اقبال مرحوم نے عورتوں کے حدود کار، حجاب، تقسیم کار پر وہی موقف اختیار کر لیا تھا جس پر اجماع امت ہے۔

فقہ اسلامی میں طلاق کے مسئلے کی تاریخی تحقیق سے بھی اقبال مرحوم گہری واقفیت نہ رکھتے تھے لہذا انھوں نے وکالت کے پیشے میں جب طلاق کے مقدمات کثرت سے دیکھے تو اس ضمن میں فقہی احکامات سے متنفر ہو گئے احکام کی علت اور روح سمجھے بغیر محض چند واقعات و حادثات سے مضطرب ہو جانا دین کا مزاج نہیں ہے عورت طلاق لیتی ہے مرد طلاق دیتا ہے یہ فقہ کا اصول نہیں قرآن کا حکم ہے اقبال مرحوم کو اعتراض تھا کہ نکاح کے معاہدے میں دونوں فریقوں کو برابر کے حقوق حاصل نہیں طلاق دینا حق نہیں ایک ضرورت ہے اور ایسی ضرورت جو انتہائی ناگزیر حالات میں زیر عمل آتی ہے اقبال مرحوم حق اور ضرورت میں فرق نہیں کر سکے کیوں کہ اس باریک فرق کو سمجھنے کے لیے فقیہانہ نظر ضروری ہے ایک بار انھوں نے مجھ سے شکوہ کیا تھا کہ ہندوستانی معاشرے میں مسلمان لڑکیوں کو اپنی پسند کی شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے خصوصاً حنفی فقہ ولی کی شرط عائد کرتی ہے یہ قرآن کے نصوص کے خلاف ہے میں نے سوال کیا کہ اس سوال پر تو ہم بعد میں بات کریں گے کہ ہمارے معاشرے میں لڑکیوں کو ولی کے بغیر نکاح کی اجازت ہونی چاہیے یا نہیں پہلا سوال یہ ہے کہ آیا ہمارے معاشرے میں لڑکوں کو اپنی پسند سے شادی کرنے کی اجازت ہے یا نہیں وہ چپ ہو گئے میرا دوسرا سوال یہ تھا کہ آپ کی شادیاں کیا آپ کی مرضی سے ہوئیں وہ غمگین ہو گئے میں نے عرض کیا جب اس عہد کا اتنا بڑا آدمی اپنی پسند سے شادی تو کیا طلاق بھی نہیں دے سکتا تو یہ کہنا کہ لڑکیوں کو پسند کی شادی کی اجازت نہ دینا ظلم ہے غلط بحث ہے مسئلہ لڑکی یا لڑکے کی پسند ناپسند کا نہیں شادی انفرادی معاملہ نہیں ہے یہ ایک اجتماعی عمل ہے اس کے نتیجے میں صرف ایک لڑکا لڑکی بندھن میں نہیں بندھتے بلکہ ایک خاندان دوسرے خاندان کا حصہ بنتا ہے۔ رشتوں تعلقات کی سیکڑوں نئی صورتیں پیدا ہوتی ہیں اگر لڑکی مرضی سے شادی کرے اور خاندان کی امان سے محروم ہو جائے تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ لڑکا اس سے ہمیشہ عہد وفا نبھا کرے گا پسند کی شادی کے جتنے بھی واقعات میرے علم میں ہیں ان میں اسی فیصد طلاق پر ختم ہوئے کیوں کہ لڑکی خاندان کی امان سے محروم ہوتی تو لڑکے کو اپنی مرضی چلانے کی آزادی مل گئی، اگر دونوں میں اختلاف ہو گیا تو لڑکی تنہا رہ گئی، ایسا بھی ہوا ہے کہ نہ لڑکی کے گھر والے راضی تھے نہ لڑکے کے گھر والے دونوں

خاندان کی امان سے محروم ہوئے۔ حوادث کا شکار ہوئے، معاشی بدحالی میں مبتلا ہوئے یا معاشرتی طور پر تنہا ہو گئے اس مصیبت میں بعض جگہ دہری مصیبت یہ آئی کہ دونوں میں اختلافات ہو گئے، بچے برباد ہوئے، ان کا کوئی والی تھا نہ ولی، دین کے احکامات باریک بینی سے اخذ کرتے ہیں عام آدمی ان کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا، اقبال مرحوم نے ایک فتوے پر اعتراض کیا کہ اگر لڑکی میکے رہتی ہے اور ماں باپ گھر کے اوپر رہتے ہیں، لڑکا بیوی کو ملاقات سے منع کر دے تو لڑکی پر تعمیل حکم واجب کیوں ہے؟ ایک قریبی عزیز کا واقعہ ہے کہ لڑکی کے والدین نہایت بدمزاج جھگڑالو قسم کے تھے لیکن پیار بھی، لہٰذا داماد نے انھیں ساتھ تو رکھا لیکن لڑکی کو ممانعت کر دی فتوے کی مصلحت فقیہہ سمجھ سکتا ہے عامی نہیں، اسلام میں رشتہ نکاح کو ہر حال میں برقرار رکھنا ضروری ہے۔ شوہر کی اطاعت کا حکم بلاوجہ نہیں دیا گیا ہے احکام اور فتاویٰ کی مصلحتیں باریک بین نگاہیں سمجھ سکتی ہیں۔ فقہی احکام بہت گہری مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ جنھیں مغربی ذہن اور مستشرقین کی تحقیق نہیں سمجھ سکی۔

جہاں تک پنجاب کے ان مقدمات کا تعلق ہے کہ خاوند ظالم ہے بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہمارا خاندانی نظام ختم ہو گیا ہے معاشرت تباہ ہو گئی ہے یورپ کی طرح ہر شخص آزاد ہے جو چاہے کرتا پھرے ہمیں اپنی معاشرت اور اپنے خاندان کی اصلاح کی ضرورت ہے نہ کہ شریعت اور فقہ کی اصلاح کی جائے اصل معاملے تک پہنچے بغیر ہم فروع پر رک جاتے ہیں فقہ اسلامی پر اقبال مرحوم کی نظر بہت سطحی تھی۔

اقبال مرحوم کو پنجاب میں ارتداد کے ذریعے تنسیخ نکاح کے مقدمات کی یلغار کا سامنا کرنا پڑا بجائے اس کے کہ وہ پنجاب کی مقامی معاشرت، عادات رسم و رواج پر غور کرتے تا کہ اتنے بڑے پیمانے پر تنسیخ نکاح کے مقدمات کی توجیہہ کر سکتے انھوں نے اسلامی فقہ اور حنفی فقہ میں خامیوں کی تلاش شروع کر دی وہ جزئیات کو لے کر کلیات اخذ کرنے کا ذہن رکھتے تھے اسے ہم جدید اصطلاح میں سائنٹفک ذہن کہہ سکتے ہیں اس سائنٹفک ذہن کا اطلاق سائنس پر کیا جا سکتا ہے فقہ میں اس کا اطلاق نہیں ہو سکتا عالم اسلام کی آبادی تقریباً پچاس کروڑ ہے شادی شدہ عورتوں کی تعداد بھی کم از کم دس کروڑ ہو گی اگر دس کروڑ عورتوں سے پنجاب میں دو سو عورتوں نے ارتداد کے ذریعے تنسیخ نکاح کا راستہ دیکھا تو اس سے فقہ اسلامی کی کمزوری نہیں بلکہ پنجابی معاشرے کی خامیاں سامنے آتی ہیں جو مسلمان تو ہو گئے لیکن عہد جاہلیت کے رسم و رواج کے دائرے سے نہیں نکل سکے، کیونکہ ہمارے یہاں نومسلموں کی تربیت کا کوئی نظام نہیں رہا لہٰذا ہماری معاشرت قدیم رسومات سے باہر نہیں نکل سکی، ہندوستان میں بھی کم و بیش یہی صورت حال ہے۔ پنجاب میں خاص طور پر اپنی ذاتوں، برادریوں پر فخر کیا جاتا ہے جزو سے کل تشکیل دینے کا یہ مزاج اقبال مرحوم کے ہاں غالب ہے جس سے بڑے مفاسد پیدا ہوتے ہیں اقبال مرحوم نے پنجاب کو عالم اسلام کے مساوی سمجھا اور پنجاب کے چند خاص علاقوں کی خاص برادریوں کے سماجی و معاشرتی رویوں کمزوریوں سے پیدا ہونے والے مسائل کا حل فقہ اسلامی میں موجود نہ پا کر فقہ اسلامی کے ذخیرے کو مسترد

کردیا۔ نئے مسائل کے لیے استنباط کیا جا سکتا ہے لیکن بنیادی شرط یہ ہے کہ اسلامی احکامات اسلامی معاشرے اسلامی تہذیب، اسلامی تمدن سے پیوستہ ہیں۔ آپ معاشرت، تہذیب، تمدن، غیر اسلامی رکھیں اور اس میں فقہ اسلامی پر عمل ناممکن سمجھ کر فقہ کو مسترد کر دیں۔ یہ غلط رویہ ہے، تشنیع فاحشہ کے احکامات میں سختی کیوں ہے؟ چار گواہوں کی شرط کیوں رکھی گئی ہے۔ مذاق اڑانے کے لیے کہہ دیجیے، اس طرح تو کبھی کسی زانی کو سزا نہیں ملے گی تو کیا اسلام صرف سزائیں دینے کے لیے آیا ہے جب بے حیائی اس حد پر پہنچ جائے اور گواہ بھی ہوں تو درگزر کر کے غلاظت کو مستور رہنے دیا جائے۔ اب اس بنیاد پر یہ الزام کہ اسلامی قانون ناقص ہے ہماری عقل کے ناقص ہونے کا مسئلہ ہے۔ جدیدیت پسندوں کا یہ طرز عمل صرف عقل پر انحصار کرنے کا نتیجہ ہے یہ عقل کو ذریعہ علم سمجھنے کے بجائے ماخذ علم سمجھتے ہیں اور عقل خود ان کی اپنی ہوتی ہے لہٰذا اصلاً دین کا ماخذ ان کا ذہن ہوتا ہے اسی سے وہ فیصلے کرتے ہیں کس قدر شرم کی بات ہے کہ جن شوہروں کے مظالم کے باعث یہ عورتیں عیسائی ہوئیں ان شوہروں کی اصلاح زجر و توبیخ معاشرتی مقاطعہ کے لیے پنجاب بھر میں کوئی تحریک نہیں چلائی گئی اور سارے الزامات فقہ حنفی پر ڈال دیے یہ بات بھی ان کے پیش نظر نہ رہی کہ مجبوری کے عالم میں کہا گیا کلمہ کفر ہوتا ہے اس کے کیا نتائج ہو سکتے ہیں اقبال مرحوم کا خیال تھا کہ ایک فقہی حکم سے عورتوں میں عیسائیت پھیل رہی ہے۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ پنجاب کا قدیم معاشرتی نظام عیسائیت کے فروغ کا سبب بن رہا تھا جس کی اصلاح کے لیے کوئی کوشش نہیں کی گئی یہ وہی صورت حال ہے جس کے بارے میں قرآن نے بدوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ تم اسلام لے آئے ہو لیکن یہ تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا اہل پنجاب کا فریضہ تھا کہ وہ مل بیٹھ کر ان ظالم شوہروں سے عورتوں کی گلو خلاصی کراتے۔ یہ اعتراض اسی قسم کا ہے کہ یتیم پوتے کو میراث میں شریعت کوئی حصہ نہیں دیتی اور دادا میراث کا مالک بن جاتا ہے۔ کیا قرآن نے دادا کو اپنی زندگی میں پوتے کو مال دینے کی ممانعت کی؟ کیا میراث میں بھی وصیت کی ممانعت ہے؟ دادا چاہے تو اپنی زندگی میں جس قدر مال پوتے کے لیے ہبہ کرنا چاہے کر سکتا ہے، آخر موت تک توقف کی کیا ضرورت ہے؟ دادا پر کوئی تنقید نہیں کر رہا۔ ساری تنقید اسلام کے قانون میراث پر ہو رہی ہے۔ دادا زندگی میں مال دینے سے کیوں گریزاں تھے، اب وصال کے بعد تو قانون میراث پر عمل ہوگا۔ یہ مسئلہ تو ہندوستان و پاکستان میں عام ہے کہ ماں یا باپ نے زندگی میں مکان ایک بیٹے کے نام پر کر دیا، وصیت کر دی یا اعلان کر دیا مختلف وجوہات کے تحت مثلاً بیٹا اچھا خادم ہے یا مکان کی تعمیر میں سب سے زیادہ روپیہ اس بیٹے نے لگایا یا غریب ہے وغیرہ وغیرہ لیکن کاغذات میں نام تبدیل نہیں ہوا خطرہ یہ ہے کہ اگر بیٹے نے خدمت نہ کی تو مکان سے بھی جائیں گے انتقال کے بعد ایسی جائیداد تمام ورثاء میں شریعت کے مطابق تقسیم ہو جاتی ہے کیونکہ جب تک ملکیت اور قبضہ منتقل نہ ہو جائیداد میں سب ورثاء کا حصہ رہتا ہے۔ اب شریعت پر اعتراض کیا جا رہا ہے کہ متوفی کی وصیت بھی کاغذ موجود ہے اور شریعت اس وصیت کے راستے میں رکاوٹ ہے۔ شریعت آپ کی خواہش نفس

کی تسکین کے لیے نہیں آئی اپنے نفس کو شریعت کے سامنے جھکا دیجیے یہی دین ہے ہر بات پر اعتراض ہر مسئلے میں عقلی دلیل سے شریعت سمجھ میں نہیں آسکتی اصل سوال یہ ہے کہ دادا نے موت تک توقف کیوں نہیں کیا؟ اگر پوتے سے محبت تھی تو زندگی میں مال سپرد کرتے اگر ہبہ پر اعتماد نہ تھا تو کسی کو سرپرست مقرر کرتے۔

مغرب سے مغلوبیت نے اقبال مرحوم کو یہ باطل خیال پیش کرنے پر مجبور کیا کہ اسلامی قانون کی روح جمہوری ہے جمہور اور اجماع کی اصطلاحات سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ نئے مسائل پیش آنے پر جمہوری طریقے سے لوگوں کی رائے لے کر [مثلاً قرعہ وغیرہ] قانون وضع کر لیا جائے گا اور غالباً انھیں ان کی نظر میں اجماع اور جمہور کا متبادل تھا فقہ اسلامی میں جمہور سے کیا عوام الناس مراد ہیں اقبال مرحوم اس اصول سے تو آگاہ ہوں گے لیکن اس کی تفہیم انھوں نے مغربی منہاج میں کی تو یہ گمراہی خود بخود پیدا ہوگئی اور اقبال مرحوم کے یہاں ایسی بے شمار گمراہیاں ملیں گی اقبال مرحوم نے یہ اجتہاد بھی فرمایا کہ "اسلام کے اصولوں کی بنیاد مطلق آزادی مساوات پر قائم ہے کسی کو دوسرے پر قانونی یا دینی برتری حاصل نہیں سیاست اسلامی کا بنیادی اصول انتخاب ہے جو خلافت کو جمہوریت کی شکل دیتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات میں اس اصول کی صراحت کی گئی ہے اقبال مرحوم کے یہ تمام اجتہادات مغربی فکر و فلسفے کی پیداوار ہیں۔ ان اجتہادات سے اسلامی تاریخ و تہذیب کا دامن خالی ہے جمہوریت ایک خالص مغربی اصطلاح ہے لہٰذا اسے اسلامی تاریخ و تہذیب اور فقہ میں ڈھونڈنا درست نہیں ہے جمہوری اداروں کو اسلامی تاریخ میں تلاش کرنا اسلام کی تاریخ سے ناواقفیت کا ثبوت ہے قرآن کریم میں ملوکیت کی مذمت اور جمہوریت کی مدحت کہاں ہے؟ انبیاء کی اولاد ان کے بعد ملوک بنی تو ملوکیت قرآن سے ثابت ہے اسے قابل نفرت قرار دینے کی شرعی توجیہ نہیں کی جا سکتی۔ جمہور کو جمہوریت اور جمہوری عمل قرار دینا اسلامی فقہ سے ناواقفیت ہے آزادی اور مساوات کو اسلام میں ڈھونڈنا اسلام سے ناواقفیت ہے یہ تو مغرب کے مسائل ہیں، ہماری کونیات Cosmology میں ماں باپ کے برابر نہیں ہو سکتی۔ بیٹا باپ کے برابر نہیں ہو سکتا۔ پیغمبر خدا کے برابر نہیں ہو سکتا تابعی صحابی کے برابر نہیں ہو سکتا عمرؓ ابوبکرؓ کے برابر نہیں ہو سکتے عشرہ مبشرہ اور سابقون الاولون کے برابر کوئی نہیں ہو سکتا فتح مکہ کے بعد ایمان لانے والے فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والوں کے برابر نہیں ہو سکتے۔ متقی، عابد، زاہد، فاسق فاجر کے برابر نہیں ہو سکتا لہٰذا مساوات کا اصول تو اسلام میں ممکن ہی نہیں یہ خالص کافرانہ اصطلاح ہے مساوات صرف ان معنوں میں ہے کہ سب اللہ کے عبد ہیں خواہ وہ عابد ہوں یا زناکار لیکن اسلامی معاشرے میں زناکار کی گواہی قبول نہیں ہوگی اور اسے کوئی اہم منصب نہیں دیا جائے گا اور کوڑے مارے جائیں گے رجم بھی کر دیا جائے گا اور جلاوطن بھی کیا جا سکتا ہے۔

اسلام اور آزادی دو متضاد نظریات ہیں اسلام تو اللہ کی غلامی کا نام ہے دنیا میں کوئی بھی آزاد نہیں

انسان یا تو اللہ کا غلام ہے یا شیطان کا لہٰذا آزادی کا فلسفہ تو خالص مغربی فلسفہ ہے۔

حنفی مکتب فکر پر اقبال مرحوم کا اعتراض کہ زندگی کی تخلیقی آزادی اور اس کے عدم تعین سے صرفِ نظر کر کے منطقی طور پر ایک کامل فقہی نظام کو احناف نے عقل محض کی بنیاد پر استوار کیا، فقہ اسلامی اور فقہ حنفی سے اقبال مرحوم کی لاعلمی کا ثبوت ہے۔ اقبال مرحوم حنفی فقہ اور فقہا کو عبداللہ ابن وہاب افغانی ہرزہ کی شاعر غالب پاشا جتنی اہمیت بھی نہیں دیتے، یہی وجہ ہے کہ ماجد صاحب نے انھیں درست مشورہ دیا تھا کہ یہ آپ کا دائرہ فکر نہیں ہے اس سے احتراز کیجیے۔

حجازی فقہا کی جانب سے نسلی امتیاز کی بنیاد پر عراقی فقہا کے خلاف شدید احتجاج کا ذکر خطبات میں آیا ہے۔ یہ خالص مستشرقین کے خیالات ہیں اور اقبال مرحوم نے میکس ہیورٹن کے حوالے کثرت سے دیے ہیں۔ اسلامی فقہ کے ذخیرہ پر نقد کرتے ہوئے انھیں اندرونی تنقید کے بجائے بیرونی عناصر یعنی مستشرقین کی تنقید بلکہ تضحیک اور توہین پر اعتماد کرنا پڑا جب کہ مستشرقین کون تھے؟ ان کے سیاسی مقاصد کیا تھے؟ یہ بات عیاں ہے، اقبال مرحوم کا فقہ اسلامی پر نقد مستشرقین کے زیر اثر بہت پیچیدہ اور گنجلک ہو جاتا ہے اور اکثر مقامات پر وہ اپنی بات اپنے نام سے کرتے ہیں، ان کا یہ کہنا کہ مالکی شافعی فقہا حقیقت پسند تھے جب کہ حنفی فقہ تخیلاتی اور کلامی مباحث کا مجموعہ ہے، نہایت غیر علمی اور نہایت سطحی بات ہے علاوہ فقہ اسلامی کے فقہی ذخیرے سے ناواقف تھے، اس پر ان کی گہری نظر نہیں تھی چند اہم مشہور کتابیں انھوں نے مترجم کے ذریعے پڑھ ڈالیں اور اس کمزور مطالعے کے بل پر لامحدود دعوے کر دیے، اس میں ان کا اخلاص موجود ہے لیکن اخلاص علم کا متبادل نہیں ہو سکتا۔ اقبال مرحوم اس بات سے بھی واقف نہ تھے کہ یونانی منطق حنفی اور مالکیوں سے پہلے شافعی فقہا کے یہاں اہم قرار پاتی ہے اور المستصفیٰ میں اسے اصول فقہ کا حصہ قرار دیا گیا ہے۔ ان بنیادی مباحث سے ناواقفیت کے باوجود وہ فقہ اسلامی کی تشکیل جدید جیسے موضوعات پر گفتگو کرنے کی جرأت کر رہے تھے۔ ان کے اخلاص پر بھی غیر علمی تبصروں کو اسی وقت قبول کیا جا سکتا ہے جب ہم اپنے تخیل کی حدود کو لامتناہی کر دیں۔

فقہ احناف پر اقبال مرحوم کے تبصرے اس قدر سطحی ہیں کہ انھیں پڑھ کر دکھ ہوتا ہے۔ اقبال مرحوم کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ وہ مختلف متحارب مکاتب فکر اور گروہوں کے لوگوں سے خط و کتابت کرتے تھے اور اس خط و کتابت سے حاصل شدہ معلومات کے تبادلے سے کچھ مفروضات قائم کر کے اپنی ذہانت سے بعض غیر معمولی نتائج اخذ کرتے ان میں وہ علمی اہمیت نہیں تھی کہ ان نکات کی تائید و تصدیق متعلقہ کتب سے براہ راست کر سکتے، وہ علم کے بجائے تخیل و وجدان کے سہارے دین پر نقد کرتے تھے۔ لہٰذا ہر محقق و مفکر نے اپنے حساب سے اخذ شدہ ادھوری، جانبدارانہ معلومات انھیں مہیا کر دیں۔ انہی معلومات پر انھوں نے اسلامی علوم پر نقد فرمایا ہے۔ احمد دین امرتسری

کے مکتب فکر سے بھی ان کے مراسم اور خط و کتابت تھی ۔ امت مسلمہ کے علامہ عرشی اور صوفی تبسم ان سے مستقل رابطے رہتے تھے اور کوشش کرتے تھے کہ اقبال مرحوم کی ملاقات ہو جائے ۔ لہٰذا ممکن ہے کہ حنفیوں کے خلاف یہ جارحیت وہاں سے ملی ہو کیونکہ احمد دین امرتسری صاحب اہل حدیث تھے تاریخی طور پر ذخیرہ فقہ میں مالکی اور حنفی مذاہب فقہ دوسرے مذاہب فقہ پر برتری رکھتے ہیں ۔ اقبال مرحوم نے ان مباحث میں امام داؤد ظاہری کا ذکر نہیں کیا، جو امام شافعی کے مقلد تھے اور آخر کار قیاس کا انکار کر بیٹھے جب کہ اقبال مرحوم قیاس کو زندگی کا منبع کہتے ہیں ۔ قیاس کا یہ انکار فقہا حجاز کے پیروکاروں کی طرف سے کیا گیا تھا احناف کی طرف سے نہیں ۔ اقبال مرحوم نے قیاس کو حد سے زیادہ اہمیت دے کر اجتہاد کو اسی پر منحصر کر دیا ہے جو غلط اصول ہے ۔ قیاس محض ایک طریقہ ہے، اجتہاد قرآن و سنت اور مقاصد شریعت میں محصور ہے، ان اصولوں، حکمتوں، مقاصد، تغیرات کی بازیافت، ان کا اطلاق، حالات و ناشی کی رعایت سب اجتہاد کے ہمہ گیر عمل کا حصہ ہیں ۔

اقبال مرحوم نے فقہ حنفی پر اعتراض کرتے ہوئے قیاس پر نقد کیا ہے اور اسے ظنی عقلی استدلال کہہ کر ارسطوی منطق سے جوڑ دیا ہے جبکہ حنفی فقہ کے تشکیلی زمانے میں یونانی منطق کا استعمال کبھی نہیں کیا گیا یونانی منطق سے استدلال بہت بعد کے زمانے میں ہوا لیکن اقبال مرحوم کو یہ بنیادی بات بھی معلوم نہ تھی کہ احناف کے فقہی قیاس اور یونانی منطق میں کوئی مطابقت نہیں اقبال مرحوم فقہ پر منطق یونانی کے اثرات کی تاریخ سے بھی لاعلم تھے ورنہ یہ اعتراض وارد نہ کرتے ۔

اقبال مرحوم کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ حدیث سے استدلال کا طریقہ استخراجی ہے یا استقرائی جب کہ وہ احناف پر طنز کرتے ہوئے بڑے اعتماد سے کہتے تھے کہ حجازی اور عراقی سامی اور آریائی سوچ رکھتے ہیں لہٰذا حجازی استقرائی طریقہ اختیار کرتے ہیں اور عراقی استخراجی طریقے کے قائل ہیں ممکن ہے کسی مستشرق نے حسب عادت کسی کتاب میں یہ جھوٹ گھڑا ہو اور اقبال مرحوم کو یہ جملہ پسند آ گیا ہو سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ حنفی مکتب فکر پر جمود تقلید گھہراؤ یونانی منطق سے مرعوبیت کے بے بنیاد الزامات عائد کرنے کے باوجود خطبات میں تسلیم کرتے ہیں کہ دوسرے مکاتب کے مقابلے میں حنفی مکتب تخلیقی اکتساب کی بہت زیادہ قوت رکھتا ہے اگر حنفی جامد مقلد اور یونانی منطقی تھے تو پھر تخلیق کا سوتا ان کے مکتب فکر سے کیسے پھوٹ گیا اقبال مرحوم کے یہاں اس طرح کے تضادات بے شمار ہیں کیوں کہ بیشتر آراء ان کے مطالعے کا حاصل نہیں ہیں بلکہ ادھر ادھر سے استفادہ کر کے اپنے نام سے دین کی تشکیل کا دعویٰ کر دیا گیا ہے جو تضادات سے پر ہے ۔ اسی لیے یہ دعویٰ کبھی قبولیت حاصل نہ کر سکا ۔

دینی علوم سے کامل بے خبری اور اسلامی فقہ کے عظیم الشان ذخیرے اور علم التفسیر اور علم الحدیث کے اصولوں سے عدم واقفیت کے باعث اقبال مرحوم کے یہاں گمراہیوں کا ایک طویل سلسلہ در آتا ہے معارف میں عموماً ان گمراہیوں پر سکوت کا ایک سبب یہ تھا کہ اقبال مرحوم کی ذات سے اور ان کے شاعرانہ کمالات سے ملت کو جو

فائدہ پہنچ رہا ہے اس میں کوئی رکاوٹ پیدا نہ ہو۔ مولانا ماجد تو اس معاملہ میں بہت غیرت مند تھے اور چاہتے تھے کہ اقبال مرحوم کے کفر کے خلاف جو کچھ لاوا ان کے دل میں ہے کتابی صورت میں تحریر کر دیں لیکن ان کو قائل کیا پڑا کہ صبر سے کام لیں۔ اقبال مرحوم ملت کا اثاثہ ہیں ان کی شاعری نے زخموں کی رفو گری کی لہٰذا ملت سے اس کا روحانی سہارا چھین نہ پائے بلکہ انھیں آمادہ کیا کہ وہ تحریریں بھی شائع نہ کریں جو اقبال مرحوم کے نام جارحانہ لب و لہجے میں لکھی گئی تھیں۔ ماجد صاحب نے ان کے الحاد و کفر کو دلائل سے ثابت کرتے ہوئے انھیں متنبہ کیا تھا کہ وہ اس دریا کو پایاب نہ کریں۔ ماجد صاحب اقبال مرحوم کے مداح تھے لہٰذا وہ قائل ہوئے، اقبال مرحوم کے انتقال کے بعد بھی ماجد صاحب نے احتیاط کا پلو تھامے رکھا البتہ اپنے شذرات میں کبھی کبھی خطبات اقبال مرحوم کی گمراہیوں کے بارے میں دلچسپ اشارے کرتے رہتے ہیں۔ اگر ان اشاروں کو مرتب کر لیا جائے تو خطبات پر ماجد صاحب کا نقد ملیقے سے مرتب ہو سکتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ کسی قاری نے ان سے استفسار کیا کہ کیا خطبات کا ترجمہ شائع ہو رہا ہے اب کیا ہوگا تو ماجد صاحب نے تیکھے انداز میں صدق میں جواب دیا تھا کہ اقبال مرحوم مرسید جب یورپ کے سامنے اسلام پیش کرتے ہیں تو ڈرتے رہتے ہیں کہ کوئی بات بھی زبان سے ایسی نہ نکل جائے جو یورپ کو ناگوار ہو۔ خطبات اگر ترجمہ ہو گئے تب بھی اس کے فروغ کا دائرہ بہت محدود رہے گا اور یہ فتنہ کبھی پھیل نہ سکے گا۔ مولانا دریا آبادی کا یہ اعتماد کتنا درست تھا؟ خطبات کو میں فتنہ اس لیے نہیں کہہ سکتا کہ اقبال مرحوم نے ان مباحث سے رجوع کر لیا تھا اور نظر ثانی کر رہے تھے انھیں اس کا موقع نہ ملا۔

جہل تو ویسے ہی عذاب ہے لیکن اگر جہل مقدس ہو تو اس کی تباہ کاری بڑھ جاتی ہے۔ مسلم جدیدیت پسند اپنے جہل کو مقدس بنا کر پیش کرتے ہیں۔ اس لیے یہ مسلم لبرل ازم سے زیادہ خطرناک ثابت ہو سکتے ہیں۔ جدیدیت اور اسلام کا کیا تال میل اس کے نتیجے میں جو مرکب وجود پذیر ہوتا ہے اسے دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ نمک اپنا ذائقہ کھو چکا ہے۔

اقبال مرحوم کے یہاں اتنے انحرافات، تضادات کے باوجود ایک کشش اور دلکشی ہے، ان کی دلنواز شخصیت ہر درد مند دل کو کھینچتی ہے، اس کی وجہ ان کا عشق رسالت اور علماء سے محبت ہے اس محبت کے باعث ان کی خاک مشک وغیرہ کے مساوی ہو گئی ہے۔

گلے خوشبوئے در حمام روزے ‏ ‏ رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم کہ مشکی یا عبیری ‏ ‏ کہ از بوئے دلاویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم ‏ ‏ ولیکن مدتے با گل نشستم
جمال ہمنشیں در من اثر کرد ‏ ‏ وگرنہ من ہماں خاکم کہ ہستم

چھیاسی LXXXVI

اقبال مرحوم کی شان میں علامہ عبداللہ العمادی نے یہ شعر کہے تھے:

تجھ پہ اے پنجاب نازل ہوں خدا کی رحمتیں	اے کہ تو اقبال کی دولت سے مالا مال ہے
ہم نے مانا تو نہیں مسحور تہذیب فرنگ	تجھ میں سب کچھ ہے اگر اسلام ہے اقبال ہے

تقلید، حدود و نفسیات اور اسلام:

حدود کے بارے میں اقبال مرحوم لکھتے ہیں کہ:

Rules relating to penalties for crimes are in a sense specific to that people and since their observance is not an end in it sell, they cannot be strictly enforced in the case of future generations.

یہ خیال بھی اقبال کا نہیں ہے استاد محترم مولانا شبلی کا ہے لیکن اقبال نے اسے اپنے نام سے پیش کیا ہے۔ اس خیال کی حقیقت کا منبع شاہ ولی اللہ کی اصل عبارت میں تحریف ہے۔

جاوید نامہ میں اقبال تقلید کی مخالفت کرتے ہیں۔

زندہ دل خلاق اعصار و دہور
جانش از تقلید گردد بے حضور
ای بہ تقلیدش اسیر، آزاد شو
دامن قرآں بگیر آزاد شو

لیکن اسی جاوید نامہ میں اقبال انتشار رفی سے بچنے کے لیے تقلید کی بھرپور تائید کرتے ہیں اور انحطاط کے دور میں اسلاف کی تقلید کو محفوظ راستہ تصور فرماتے ہیں۔

مضمحل گردد چو تقویم حیات	ملت از تقلید می گیرد ثبات
راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است	معنی تقلید ضبط ملت است
در خزاں ای بے نصیب از برگ و بار	از شجر مگسل با امید بہار
پیکرت دارد اگر جان بصیر	عبرت از احوال اسرائیل گیر

وغیرہ وغیرہ

آخری خطبے میں Is religion Possible میں اقبال نے مذہبی زندگی کو عقیدے کی شعوری پابندی سے لے کر نفسیات تک کل تین مراحل میں تقسیم کیا ہے۔ [1]Faith [۲]thought [3] Discovery ان کے خیال میں آخری مرحلے میں فرد absolute سے ہم آہنگ ہو کر اپنی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے۔ اور شریعت کو شعور کی گہرائیوں میں محسوس کرتا ہے۔ سترہویں صدی سے پہلے سائیکالوجی کا کوئی وجود نہ تھا اس کا مطلب یہ ہوا

کہ سترہویں صدی سے پہلے جو لوگ گزر گئے وہ مذہبی زندگی کے اس تیسرے مرحلے سے محروم رہے۔ ان کی شخصیت نامکمل رہی۔ بلکہ عہد رسالت کے صحابہ کرام بھی کیونکہ وہ سائیکالوجی سے واقف نہ تھے۔ LOGOS اور MYTH کی فلسفیانہ بحثیں قدیم ہیں ان بحثوں کو جانتے ہوئے بھی LOGOS سے نکلنے والی LOGY کے منہاج پر علوم اسلامی کو پرکھنا اور مذہبی زندگی کی بنیاد رکھنا مغربیت کے سوا اور کیا ہے؟ اقبال پیغمبر کو سائیکو پیتھ کہنے والے مغربی مفکرین پر نقد کیے بغیر ان کے تصور کو قبول کر لیتے ہیں یہ بڑی گمراہی کی بات ہے۔

علم سائیکالوجی کا روحانیت سے کوئی تعلق نہیں علم نفسیات کے مبادی میں روحانیات کا کوئی دخل نہیں، مغربی تہذیب و فلسفے نے نفس میں اور حیات انسانی میں جو خلل پیدا کیے ہیں اس نے فطرت انسانی کو مسخ کر دیا ہے اور انسان کا زندگی سے اعتبار اٹھا دیا ہے۔ نفسیات اس مسخ شخصیت کو مزید مسخ ہونے سے بچانے کا طریقہ ہے۔ وہ روح سے نہیں صرف وجود سے بحث کرتی ہے۔ اس کا روح سے یا روحانیت سے کوئی رابطہ نہیں۔ یہ مغربی تہذیب کی نفسیاتی خواہشات کے نتیجے میں پیدا ہونے والی نفسانی امراض کا مادی علاج ہے۔ اسے روحانیت سے وابستہ کرنا ایک غیر علمی طریقہ کار ہے۔ مستقبل قریب میں نفسیات کی وسعت اس تحقید کو اور واضح کر دے گی۔ نفسیات مغربی علوم سے نکلی ہے جس علم کی بنیاد دنیا، حرص دنیا اور صرف دنیا ہو اس کا روح سے کیا تعلق؟ افسوس یہ ہے کہ ہم علوم عقلیہ کو غیر جانبدار علوم تصور کرتے ہیں۔ یہ تصور خطرناک، باطل اور غلط تصور ہے۔ دنیا میں کوئی علم غیر جانبدار نہیں ہوتا، علوم عقلیہ کا ماخذ وہ مابعد الطبیعیات ہوتی ہے جس پر وہ قوم یا تہذیب یقین رکھتی ہے۔ اسلامی تہذیب میں تمام علوم عقلیہ کا ماخذ علوم نقلیہ ہیں۔ یہ دونوں توام ہیں، انھیں ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا تاریخ علوم سے ناواقفیت ہے۔ مغربی علوم نقلیہ مذہب کے انکار کے بعد سترہویں صدی سے شروع ہوتے ہیں۔ لہٰذا ان کی مابعد الطبیعیات انکار مذہب انکار آخرت اور طلب دنیا ہے۔ سائیکالوجی میں روح کہاں ہے روح تو تجربیت سے قابل ادراک نہیں لہٰذا نام روح کا ہے اصلاً نفس انسانی زیر بحث ہے۔ اقبال مرحوم نے بھی غلطی کی انھوں نے سائیکالوجی کو اسلام سے برآمد کر لیا بلکہ اسے مابعد الطبیعیات کا متبادل قرار دے دیا۔ ایک جزوی علم کلی علم کا متبادل کیسے ہو سکتا ہے۔ سائیکالوجی مغرب کے مذہب Humanism ،Capitalism اور اس کی اقدار Freedom ،Liberty ،Equality سے نکلی ہے تو یہ علم جزوی مغربی مابعد الطبیعیات کا متبادل کیسے ہو سکتا ہے۔ جہاں تک معاملہ اسلام کا ہے اسلام اور سائیکالوجی میں کوئی مماثلت نہیں، یہاں روح اور نفس دونوں موجود ہے۔ سائیکالوجی روح کے وجود کے انکار کا نام ہے۔

شعور، لاشعور، ضمیر کا اطمینان یہ سب مغربی فکر و فلسفے کے کھیلے ہیں۔ نیچر پرستی کے نتیجے میں ادراک الٰہی، تجلی، مشاہدہ حق کی گفتگو ہی اصل دین بن جاتی ہے۔ جس سے اعمال، عبادات، اطاعت، احسان، تقویٰ،

ایمان، اسلام کی صفات رخصت ہو جاتی ہیں اور صرف ادراک ہی اصل دین ٹھہرتا ہے جو تفکر و تدبر سے اور تفکر و شعور کی خاص حالت سے برآمد ہوتا ہے۔ اسی لیے منکرین حدیث تمام زور تدبر و تفکر پر دیتے ہیں وہ نماز کے ترک کر دیں گے یا جماعت نماز سے دانستہ گریز کریں گے اور اوقات نماز میں تدبر و تفکر قرآنی کو عین دین اور اصل عبادت سمجھیں گے۔ نماز کو محض رسم قرار دیں گے۔ اقبال کا ادراک حقیقت مطلقہ کا فلسفہ اسی مغربی منہاج علم، شک، تحقیق، تجسس، جستجو سے نکلتا ہے جس کا مقصد صرف دریافت حقیقت ہے اطاعت نہیں، اس لیے آج تک کسی مغربی سائنس دان نے حقیقت مطلقہ کو مظاہر و آثار کائنات کے ذریعے پہچان لینے کے باوجود عبودیت، سرافگندگی اطاعت کو اختیار نہیں کیا، کیونکہ اصل عبادت تو ادراک ہے وہ منزل آگئی تو عبادت کی کیا ضرورت ہے؟ تمام مغربیت پسند، اسی فلسفے کے مطابق اپنی زندگی بسر کرتے ہیں۔ قرآن و سنت اور آثار صحابہ سے جو چیز متفق علیہ ہے کہ مذہبی زندگی اطاعت کے منہاج پر منحصر ہے۔ اس زندگی کو اسلامی اصطلاحات یقین، علم، تقویٰ، احسان، محسن، متقی مومن، مسلم کی صفات میں تو بیان کیا جا سکتا ہے لیکن اسلامی زندگی کے لیے مغربی الحادی اصطلاحات کا استعمال مغرب سے مرعوبیت اور مغرب کو مذہب پر فائق سمجھنے کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال مذہب کے امکان کے مطالعے کو اعلیٰ ترین روحانی تجربے سے مشروط کرتے ہیں، عقیدے سے عمل اور پھر اعلیٰ ترین روحانی تجربے کے سہ رخی درجات کی تقسیم علوم اسلامی کی تاریخ کے لیے ایک اجنبی تصور ہے۔ عبادت کا مقصد کیا ہے اور کیا نہیں ہے اس بارے میں قرآن و سنت آثار صحابہ ہماری مکمل رہنمائی فرماتے ہیں۔ لیکن اقبال کے خیال میں یہ رہنمائی جدید انسان کے لیے کارآمد نہیں لہٰذا اس خطبے میں رہنمائی کا ایک ایسا تصور پیش کیا جاتا ہے جو علوم اسلامی میں قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ یہ تصورات لفظی اور معنوی طور پر بھی درست نہیں ہیں۔ یہ اصطلاحیں بھی قابل قبول نہیں۔ اقبال نے اس خطبے کے مباحث میں اپنی تقسیم کو مرکزی کردار عطا کیا ہے لیکن تقویٰ، یقین، احسان وغیرہ کی اسلامی اصطلاحات سے کامل بے اعتنائی برتی ہے۔ حیات روحانی کی معراج کیا ہے؟ ایک مومن ایمان کے درجہ کامل پر کب فائز ہوتا ہے۔ جب وہ احسان کے درجے میں ہوتا ہے یا جب وہ تفکر و شعور کی اس خاص حالت میں ہوتا ہے کہ اسے absolute reality کا فہم و ادراک حاصل ہو جائے اور ذہن کی گہرائیوں سے وہ قانون کی اصل تک رسائی حاصل کرے کیا روحانی زندگی کا حاصل Self یا Ego کی بازیافت ہے؟ کیا ادراک خدا و خودی کے مرحلے میں داخل ہوتے ہی نفس اپنے کمالات سے آگاہ ہو سکتا ہے اور اس کی حقیقت اس پر آشکار ہو سکتی ہے اور کیا وہ اس مرحلے میں خودی کی پرورش کا مکلف ہو جاتا ہے؟ اقبال نے یہ تمام مراحل بیان کیے ہیں جو محض مفروضات ہیں جن کی کوئی بنیاد نہ دین میں ہے نہ تفکر میں نہ فلسفے میں نہ سائنس میں نہ نفسیات میں یہ اقبال کے نفسیاتی وساوس ہیں۔ قلب ماہیت کا عمل ایمان، عقیدہ، تقویٰ سے احسان تک مرحلہ بہ مرحلہ طے ہوتا ہے یا یہ سفر نفسیات کے تفکر سے طے کیا جا سکتا ہے۔ اقبال نفسیات کی حدود سے واقف ہیں اس پر نقد بھی کرتے ہیں لیکن اس میں امکانات کی لامحدود وسعتیں بھی دیکھتے

ہیں یہاں تک کہ اقبال کے یہاں ایمان کامل کی آخری منزل نفسیات کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اس آخری منزل کے بارے میں وہ بتاتے ہیں:

Metaphysic is displaced by pcychology and religious life develops the ambission to come into direct contact with the ultimate reality.

کیا اقبال کے یہاں تصوف اور سائیکالوجی ایک ہے یا سائیکالوجی روحانیت کا اعلیٰ ترین علم ہے۔ مابعدالطبیعیات کو نفسیات سے بدل دینا ذہنی افلاس کی انتہا ہے مغرب نے یہی کیا ہے۔ مابعدالطبیعاتی مسائل فلسفے سے خارج ہو رہے ہیں۔

جدید سائنس، قدیم سائنس، یونانی فلسفہ، مغربی فلسفے کے ذریعے کیا ultimate reality کا ادراک ممکن ہے، سب کا جواب ایک ہے اور وہ نفی میں ہے جب تمام فلاسفہ اور سائنس دان اس پر متفق ہیں تو اقبال اس مرحلے کو سائنس کے ذریعے کیسے ممکن بنا سکتے ہیں؟ جدید فلسفہ کے بانی اور شارحین اور اس فلسفے سے نکلنے والی سائنس کے مفکرین فلسفہ اور سائنس کے ذریعے مذہب کا اور اعلیٰ ترین روحانی تجربے کا امکان دور دور تک نہیں دیکھتے تو اقبال کو یہ امکان کیوں نظر آتا ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے تصورات جو اقبال کے ذہن و قلب میں راسخ تھے انھیں مغرب کی نفسیات سے خلط ملط کر دیا گیا اور اس کے آمیزے سے مغرب اور مغرب سے متاثرین کے لیے یہ چیستان تخلیق کی گئی جس کی گتھیاں اقبال بھی نہ سلجھا سکے۔

اقبال نے فطرت کی تفہیم کے تمام مطالعات کو یکساں وجہ دیا ہے اور اسے اس عہد کے محسوسات کا حاصل ٹھہرایا ہے جو جوہری طور پر انھیں ہندی، یونانی، مسلم اور (Modern Atomism) میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ یہ دعویٰ اسلامی تاریخ میں بہت بڑا دعویٰ ہے یہ وحدت ادیان کے تصور کی فلسفیانہ وکالت ہے۔ اس نقطۂ نظر کے ذریعے اقبال تمام تہذیبوں، مذاہب اور تہذیب جدید میں جوہری طور پر کوئی فرق روا نہیں رکھتے انھیں ایک ہی سطح پر دیکھتے اور دکھاتے ہیں، اس نقطۂ نظر کا ثمر یہ ہے کہ اسلام اور ماڈرن ازم میں جوہری طور پر کوئی تضاد باقی نہیں رہتا اور یہ تہذیبیں مابعدالطبیعیاتی طور پر بھی ایک ہو جاتی ہیں اس تصور کے نتیجے میں ضلالت اور حق، باطل اور باطل، کتاب فلسفہ اور سائنس اور الکتاب میں کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہتا اقبال کا یہ کہنا کہ فطرت کی تفہیم کی کسی ایک مخصوص شکل پر اصرار درست نہیں ہے سیدھا سادے لفظوں میں وحدت ادیان کا مسئلہ کفر ہے۔ اسلام میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

کیا اسلام جمہوری مذہب ہے؟

اقبال مرحوم لکھتے ہیں کہ جمہوریت کا اصل ماخذ تو اسلام اور عہد خلافت راشدہ ہے۔ جمہوریت کی

بنیادیں اس زریں عہد میں تھی، امیہ اور عباسی اس میں رکاوٹ بن گئے، اب مغرب میں جمہوریت، پارلیمنٹ کا ظہور ہماری ہی روایت کا ظہور ہے لہٰذا جمہوریت کا خالق مغرب نہیں اسلام ہے یہ بھی بے بنیاد دعویٰ ہے۔

جمہوریت اور جمہوری عمل کا اسلام سے کیا تعلق اور خلافت اسلامی سے کیا تعلق؟ موجودہ جمہوریت تو سترہویں صدی کے بعد پیدا ہوئی ہے۔ یونان کی جمہوریت بھی موجودہ جمہوریت سے الگ تھی لہٰذا اسلامی جمہوریت ایک بے معنی اصطلاح ہے شورائیت کہہ سکتے ہیں قرآن بتاتا ہے کہ فرعون کی بھی شوریٰ تھی اور ملکہ سباء کی بھی شوریٰ تھی جب حضرت سلیمانؑ کا خط ملا تو سباء نے اپنی شوریٰ سے مشورہ کیا جب حضرت موسیٰ نے فرعون کو للکارا تو اس نے بھی شوریٰ سے مشورہ کیا اور اس کی شوریٰ کے ایک رکن نے حضرت موسیٰ کے حق میں بہت کلمات خیر کہے اور فرعون کو انتباہ کیا تو شورائیت، نظام استبداد اور آمریت میں بھی رہتی ہے ملوکیت میں بھی ہوتی ہے اور خلافت میں بھی ملتی ہے۔ مغرب کا یہ تصور کہ ملوکیت، خلافت، آمریت میں کوئی مشورہ نہیں کیا جاتا تھا۔ فرد واحد حکومت کرتا تھا، محض فریب نظر ہے، جمہوریت میں بھی اصل اقتدار کیا عوامی نمائندوں کے پاس ہوتا ہے۔ یہ بھی محض فریب نظر ہے، اصل اقتدار تو ان لوگوں کے پاس ہوتا ہے جو پارلیمنٹ میں موجود نہیں ہوتے، یہ اقتدار نوکر شاہی کے پاس۔ تمام قوانین وہی تیار کرتے ہیں، جمہوری نمائندے ان پر صرف دستخط کرتے ہیں اکثر کو یہ بھی نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کس مسودے پر دستخط کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ اسلام اور خلافت کا نظام خالصتاً جمہوری ہے تاریخ اسلام کے لیے اجنبی تصور ہے۔

اب دیکھیے حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کا اعلان پہلے کیا گیا بیعت بعد میں ہوئی۔ خلیفہ تو انھیں مقرر کر دیا گیا اس تقرری کا فیصلہ عوام نے نہیں ارباب حل و عقد نے کیا۔ یہ کون لوگ تھے؟ کیا یہ منتخب ہوئے تھے؟ کیا رسول اللہ نے انھیں خلافت کے فیصلے کا اختیار دیا تھا۔ عہد رسالت میں یہی لوگ رسالت مآب کے قریب تھے۔ لہٰذا یہی فطری قائدین تھے ان کو جمہور سے توثیق و تصدیق کی ضرورت نہ تھی ان کی حیثیت مسلمہ تھی جس طرح اہل عرب اپنی اولاد کو پہچانتے تھے، اسی طرح ان لوگوں کی اہمیت، حیثیت سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا کوئی مزاحمت نہ ہوئی۔ ہر کہہ و کو مہ خلافت کے فیصلے میں نہ شریک کیا جا سکتا تھا نہ شریک کرنے کی ضرورت تھی یا تنے اہم منصب کا فیصلہ ارباب حل و عقد کریں گے یا ہر ایک سے پوچھا جائے گا قرآن کریم اس معاملے میں واضح ہدایات دیتا ہے جس سے جمہوریت کے فلسفہ عوام کی نفی ہوتی ہے۔ قرآن حبل اللہ کے مقابلے پر حبل الناس کی اصلاح استعمال کرتا ہے اور یہودیوں کے ذکر میں اس اصطلاح کا خاص محل ہے کہ یہ ہمیشہ حبل الناس کے ذریعے سامان زندگی مہیا کریں گے اور قیامت تک سہارے کے بغیر دنیا میں کبھی قیام نہ کر سکیں گے۔ خلافت عام آدمی کا مسئلہ ہی نہیں تھا حضرت ابوبکرؓ نے اپنی زندگی میں حضرت عمرؓ کو خلیفہ نامزد کر دیا تھا اس کا جمہوریت سے کیا تعلق تھا۔ یہ تو نعوذ باللہ آمریت تھی۔ حضرت عمرؓ نے خلافت کے لیے ایک مجلس قائم کر دی تھی امت میں سے صرف چند لوگوں کے لیے خلافت کو

مخصوص کر دیا اور اس کے انتخاب کی بھی ذمہ داری محدود کر دی۔ یہ کیا جمہوریت تھی؟ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد حضرت علیؓ خلیفہ مقرر ہوئے تو جمہوریت کا اس میں کیا عمل دخل تھا؟ حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ میں خون عثمانؓ پر اختلافات ہوئے نوبت جنگ تک آ گئی تو مسئلہ جمہوریت سے حل نہیں ہوا بلکہ دونوں اصحاب کرام نے حکم مقرر فرمائے اور ان کو فیصلے کا اختیار دیا اتنے بڑے مسئلے کا حل صرف دو افراد کے سپرد کر دیا گیا کہ یہ دونوں جو کچھ طے کر دیں وہ فریقین کے لیے واجب التعمیل ہوگا اتنے اہم مسئلے میں عوام سے کوئی رائے لی گئی؟ خوارج اسی بنیاد پر تو الگ ہوئے کہ حکم کا تقرر ہی غیر قرآنی ہے پھر قرآن کے ان دعوے داروں نے جو کچھ کیا تاریخ کے اوراق خون سے تربتر ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے لشکر اسامہ روانہ کیا، سب کا اختلاف تھا آپ نے کسی اختلاف کو اہمیت نہ دی۔ فرمایا رسول اللہ کا حکم ہے موخر نہیں ہو سکتا اور خالد بن ولید کی موجودگی میں اسامہ کو سردار لشکر برقرار رکھنے میں کوئی تردد محسوس نہ کیا کہ حکم رسول یہی ہے۔ مرتدین اور مانعین زکوٰۃ کے مسئلے میں تمام صحابہ کی رائے مختلف تھی لیکن حضرت ابوبکرؓ اپنی رائے پر قائم رہے۔ یہ کونسی جمہوریت تھی؟ ہمیں تو اسلام میں کہیں مغربی جمہوریت نظر نہیں آتی، اور اسلامی جمہوریت تو کوئی چیز ہی نہیں ہے، معلوم نہیں اقبال مرحوم کو اسلام کی روح میں یہ جمہوریت کہاں نظر آ گئی۔ حضرت علیؓ کے وصال کے بعد حضرت حسنؓ کو خلیفہ مقرر کیا گیا۔ اس کا فیصلہ کس جمہوریت سے ہوا؟ حضرت حسنؓ حضرت معاویہؓ کے حق میں خلافت سے دستبردار ہو گئے اور فرمایا کہ اگر خلافت معاویہؓ کا حق تھا تو انھیں مل گیا اور اگر میرا حق تھا تو میں اس سے دستبردار ہو گیا، اس سال کو امت کی تاریخ میں عام الجمع کا سال کہا جاتا ہے۔ جب امت پھر مجتمع ہو گئی تو امت کو حضرت حسنؓ نے مجتمع کیا یا جمہوریت نے عوام ووٹ کے ذریعے یا اجماع ہوا؟ طالوت کا انتخاب جمہوریت سے تو نہیں ہوا، عوام تو طالوت کے مخالف تھے ان کا انتخاب تو علمی اور جسمانی صلاحیتوں کی بنیاد پر ہوا، ان کے انتقال کے بعد ان کے داماد حضرت داؤدؑ بادشاہ بنے، ان کے وصال کے بعد ان کے صاحبزادے سلیمانؑ ملک بنے، پھر ان کے صاحبزادے ہوئے۔ قرآن نے طالوت کو ملک کہا، ذوالقرنین کو ملک کہا کہیں ملوکیت کی مذمت نہ کی۔ بنی اسرائیل کے لیے سورہ مائدہ میں فرمایا کہ ہم نے تم میں ملوک بھی پیدا کیے اور انبیا بھی..... دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ کیا لہٰذا یہ کہنا کہ قرآن اسلام ملوکیت کے خلاف ہے اور جمہوریت کے حق میں ہے باطل خیال ہے۔ اگر اقبال مرحوم کے جمہوری فلسفے کو مان لیا جائے تو قرآن کریم اور خلافت اسلامیہ کے طرز انتخاب کا انکار کرنا پڑے گا اور اسے غیر جمہوری قرار دینا ہوگا پھر اس بات پر بھی شرمندگی ہوگی کہ دو خلفائے راشدین رسول اللہؐ کے داماد تھے اور دو خلفائے راشدین سسر تھے اور حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ تو سسر کے نواسے تھے کیا دنیا اس طریقہ کار کو جمہوری مان لے گی۔ مغرب کو خوش کرنے کے لیے جمہوریت کو اسلام سے برآمد کرنے کی کوشش معذرت خواہانہ جدیدیت ہے۔ اقبال مرحوم اسلامی اصطلاح جمہور اور جمہوریت میں فرق نہیں کر سکے۔ ان کا یہ موقف کہ اسلام میں تصور خلافت جمہوریت کی شکل ہے درست نہیں ہے۔ جمہوریت ایک خاص تہذیب و تاریخ کا ثمر ہے اسے

اسلامی تاریخ میں ڈھونڈنا معذرت خواہی ہے۔ اگر فی الحقیقت ایسا تھا تو قرآن میں ملوکیت کا تصور اور خلافت راشدہ کے نظائر اقبال مرحوم کے اس موقف کی مکمل تردید کرتے ہیں۔ اگر اسلام میں جمہوریت تھی تو پارلیمنٹ کیوں نہ تھی؟ اگر پارلیمنٹ عین اسلام ہے اجماع کا ادارہ ہے، اسلام کی فطری روح کے عین مطابق ہے تو عہد رسالت خلافت راشدہ اور قرآن کریم میں انبیاء کے معاشرے اس ادارے کے وجود سے ہمیں آگاہ کیوں نہیں کرتے، اتنے اہم اسلامی ادارے کا اسلامی تاریخ میں کوئی وجود نہیں ملتا۔ بلکہ دنیا کی تاریخ اس وجود سے خالی ہے۔ اب سترہویں صدی کی خاص تاریخ سے نکلنے والی پارلیمنٹ ہی درست ہے باقی سب غلط ہے، یہ طرز فکر دوسرے لفظوں میں اسلام کی تاریخ اور انبیاء کی تاریخ کا انکار ہے۔ یونان کی جمہوریت اپنی تاریخ اور تہذیب کی پیداوار ہے۔ یہی حال مغربی جمہوریت کا ہے، اسلام کو مغرب کے سیاسی نظام میں سمونے [یا یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اسلام مغرب سے افضل ہے] کے لیے اقبال مرحوم کا نقطہ نظر اسلامی علوم سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ اقبال مرحوم نے اصطلاح اجماع سے جمہوریت کا استنباط کیا ہے۔ اجماع کے لیے پارلیمنٹ کو موزوں ترین اور معتبر ترین ادارہ قرار دیا ہے۔ اگر عالم اسلام کی ایک ہی پارلیمنٹ ممکن ہوتی تو شاید اقبال مرحوم کے اس مفروضے کی کوئی عقلی دلیل مل سکتی۔ لیکن قومی ریاستوں کی قومی پارلیمنٹوں کے ذریعے قومی اجماع، اجماع جمہور کا متبادل کیسے ہو سکتا تھا۔ اب چندرہ سو سال کے بعد جمہور کی اصطلاح بھی بدل دی جائے تو شاید ممکن ہو۔ اقبال مرحوم صاف لفظوں میں کہتے تھے کہ صرف چار مکاتب فکر کے اجماع کے تصور کو ختم کرکے اس تصور کو وسیع کر دیا جائے۔ صرف اقبال کے کہنے سے مکاتب فکر ختم نہیں ہو سکتے۔ اس امت میں بے شمار مکاتب فکر تھے، سب ختم ہو گئے، صرف چار زندہ رہ گئے۔ غیر فطری طریقے سے جو مکاتب ابھرے وہ فطری طریقے سے ختم ہو گئے، خطبات لکھنے اور تقریر کرنے سے نہ کوئی مکتب فکر وجود میں آتا ہے نہ ختم ہوتا ہے۔ اس طرح کے دعوے علامہ نے اپنی کتاب میں کیے ہیں اس پر اس عہد کے علماء نے معارف میں دو قسطوں میں تبصرہ لکھا تھا۔ یہ اقبال کی زبان نہیں یہ تو بحث کی زبان ہے۔ یہ عجیب وسعت ہے جو عالمگیر سطح پر متشکل ہونے کے بجائے قومی سطحوں پر قومی اجماع کی صورت میں ظہور پذیر ہوگی۔ اس طرح عالم اسلام میں کبھی اجماع ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔ اقبال کے ذہن میں یورپ میں قومی کلیساؤں کے ظہور کی تاریخ واضح نہیں تھی۔ اقبال مرحوم کی اس تجویز سے اسلام کا انجام اس سے برا ہوتا جو عیسائیت کا ہوا قومی کلیساؤں نے عیسائیت کا شیرازہ بکھیر کر رکھ دیا تھا۔ اجماع جمہور کو جمہوریت اور پارلیمنٹ کی اصطلاحات کے مساوی قرار دینا علوم اسلامی کی تاریخ سے کامل ناواقفیت کا اظہار ہے۔ یہ بھی غلط بحث ہے، اسلام میں اجماع جہلاء کا نہیں ہے اجماع علماء کا معتبر ہے عوام کا نہیں یہ علماء کون ہوں گے اس کے بھی اصول طے ہیں اجماع کی اصطلاح ان تمام اصولوں کا کامل احاطہ کرتی ہے۔ لہٰذا جمہوریت اور جمہوری عمل کے تحت مطلق آزادی مطلق مساوات اور ایک انسان ایک ووٹ کا فلسفہ اجماع کی اصطلاح سے دور کا تعلق بھی نہیں رکھتا۔ جمہوریت خواہش نفس کا نام ہے کہ آپ

کسے ووٹ دینا چاہتے ہیں، اس کے لیے کوئی شرط نہیں ہر شخص ووٹ دینے کا اہل ہے کہ تمام انسان برابر ہیں۔ قرآن وسنت اس کافرانہ تصور کی سرے سے نفی کرتے ہیں۔ جاہل اور عالم، متقی اور فاسق، مشرکین منافقین، منحرفین مختلف طبقات ہیں۔ یہ تقسیم صرف عالم آخرت کے لیے نہیں اس دنیا کے لیے بھی ہے۔ اسلامی ریاست کا سربراہ جاہل شخص نہیں بن سکتا نہ فاسق و فاجر کو امارت مل سکتی ہے کیونکہ فسق و فجور کا خاتمہ ریاست کا بنیادی وظیفہ ہے جب کہ جمہوریت میں کوئی تحدید نہیں ہے۔ اقبال مرحوم نے خلافت کے خاتمے اور ترکی میں لادینی جمہوری حکومت کے آغاز کو اسلام کی نشاۃ ثانیہ سے تعبیر کیا اور اپنے مقالے اجتہاد میں اسے مسلمانوں کی اجتہادی قوت کے نمونے کے طور پر پیش کیا، لیکن یہ اجتہاد جو آغاز میں بھی محض الحاد تھا، آخر کار الحاد کے سوا کیا نکلا۔ اسلام میں ایسے کسی اجتہاد کی گنجائش نہیں جو بنیادی اصولوں کے بجائے محض تیغ خواہشات کے لیے کیا جائے۔ حکومت کی جمہوری شکل کو عین اسلامی قرار دینے کی بات بھی اقبال مرحوم کے مغرب سے متاثر ہونے کی صراحت کرتی ہے۔ اجماع کو لادینی سیاسی نظام کے جمہوری ادارے پارلیمنٹ کا متبادل سمجھنا اقبال مرحوم کی بہت بڑی غلطی تھی۔ آج وہ زندہ ہوتے تو اس خیال سے رجوع کرتے۔ اقبال مرحوم اپنی فکر کا رشتہ شاہ صاحب کے ساتھ ساتھ سرسید سے بھی قائم کرتے ہیں جب کہ سرسید قرآن کو کلام اللہ تسلیم کرنے سے انکار کرتے تھے۔ سرسید اور مولوی چراغ علی کی خط و کتابت سے یہ بات ثابت ہوتی ہے جو شخص قرآن کو کلام اللہ ہی تسلیم نہیں کرتا اس سے اقبال مرحوم کا متاثر ہونا عجیب بات ہے۔ غالباً اقبال مرحوم نے سرسید کے افکار کا غائر اور تنقیدی مطالعہ نہیں کیا ورنہ اقبال مرحوم جیسے مومن سے اس غلطی کا صدور محال تھا۔

اقبال مرحوم کا انائے مطلق کیا ہے؟
اقبال مرحوم کا تصور امکان مذہب؟

اقبال مرحوم کا absolute ego انائے محدود، انائے مطلق، مطلق وجود اور وجود کیا ہے؟ کیا ان کے مراتب ہو سکتے ہیں؟ تعمد وجود کا آخری وصف کیا ہے؟ مرتبہ وجود اور شرک کا آپس میں کیا تعلق ہے؟ کیا خدا کائنات سے ماورا ہے یا کائنات کی عین بن کر کائنات میں تجلی ہے؟ کیا اشیائے کائنات [egoes] اناؤں کے مجموعہ کا نام ہے؟ نفس انسانی میں پوشیدہ حقیقت اور نفس کائنات کی حقیقت کیا ہے؟ کیا اقبال مرحوم وجودی تھے اور ابن عربی سے متاثر تھے؟ عموماً لوگ اقبال مرحوم پر الزام لگاتے ہیں کہ وہ حضرت شیخ اکبرؒ سے بہت متاثر تھے اور خطبات میں اسی تاثر کی علمی وضاحت مغربی فلسفے کے تناظر میں کی گئی ہے۔ اقبال مرحوم شیخ اکبری تعلیمات سے براہ راست واقف نہ تھے۔ شیخ اکبر کو عربی زبان پر عبور کے بغیر پڑھنا اور سمجھنا بہت مشکل ہے۔ اقبال مرحوم کو ان سے دلچسپی تھی کیونکہ اس زمانے میں یورپ ابن عربیؒ سے بے حد متاثر تھا۔ انگریزی تراجم کے ذریعے وہ شیخ کی تعلیمات پڑھ رہے تھے۔ مجھ سے بھی خواہش ظاہر کی تھی کہ تعلیمات شیخ اکبری تخلیص پیش کروں تاکہ وہ ان

مطالعہ و دیش نظر رہے۔ انھیں مسئلہ زماں و مکاں سے خاص دلچسپی تھی اور مغرب زدہ طبقات اور ماڈل مغرب کو بتانا چاہتے تھے کہ ہمارے یہاں بھی بہت پہلے ان مباحث پر کام ہو چکا ہے لہٰذا مجھ سے اور مختلف علماء سے شیخ اکبر کی تعلیمات افکار کتابوں کے بارے میں استفسار کرتے رہتے تھے کہ شیخ کے یہاں حقیقت زماں کیا ہے کس کس کتاب میں تفصیل ہے۔ متکلمین اور شیخ کے حقیقت زماں کا فرق کیا ہے۔ ابن عربی کی کتابوں پر اقبال مرحوم کی گرفت کمزور تھی لہٰذا اقبال مرحوم کو ابن عربی کا خوشہ چیں کہنا درست نہیں ایران کی مابعد الطبعیات کے مطالعے کے دوران وہ تصوف سے جڑ گئے اسے مسلمانوں کی تباہی کا سبب خیال کرتے تھے اس کے برعکس Individualism کی حمایت کرتے تھے جبکہ تصوف کی خاص بات فردیت ہے اسرار خودی کا دیباچہ تصوف پر سخت تنقید تھی حسن نظامی ناراض ہو گئے لہٰذا اسے خارج کر دیا گیا لیکن یہی خیالات اقبال مرحوم نے نکلسن سے انگریزی دیباچے میں لکھوائے جس میں Islamic Pantheism اور All forms of pantheistic sufism کی شدید مذمت کی ہے حیرت ہے کہ اقبال مرحوم مغرب کی دو گمراہیوں فریڈم اور indvidualism کو قبول کرتے ہیں لیکن مشرق کے تصوف کو عجمی قرار دے کر رد کر دیتے ہیں۔ Absolute Ego سے ملنے اور حیات ابدی حاصل کرنے، فنا ہونے لیکن بقا پانے اور اپنے وجودی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے Absolute Ego سے ملنے کا تصور لیکن الگ رہنا اور اپنا تفرد بھی برقرار رکھنے کا فلسفہ اقبال مرحوم کا ناقابل فہم نقطۂ نظر ہے۔ وہ خدا کی تلاش کو انسان کی تلاش کے معنی میں لیتے ہیں کہ یہی باطن کی تلاش ہے لیکن یہ تلاش خود کیا ہے اس کی تشریح نہیں کر سکتے ہیں۔

کیا ذات باری کا ادراک [Rational Intution, Spritual Intituion, Inner Intution] سے باطنی وجدان، روحانی وجدان، تعقلی وجدان کے ذریعے ممکن ہے؟ اگر ایسا ہو سکتا ہے تو دنیا کی تاریخ میں کتنے لوگوں کو اس کا تجربہ ہوا کیا اسلام میں اس تجربے کی کوئی شرعی صورت موجود ہے؟ مغرب میں کتنے لوگ طبیعات میں مظاہر و شواہد دیکھنے کے بعد اس روحانی وجدان کے ذریعے حقیقت مطلق تک پہنچے؟ اگر حقیقت مطلق یا انائے مطلق تک نظریہ اضافیت کے ذریعے پہنچنا ممکن تھا تو مغرب میں کتنے لوگ حقیقت مطلق تک پہنچ گئے۔ سائنس دانوں کی تاریخ پڑھ لیجیے کتنے سائنس دان آثار کائنات سے طبیعات کے ذریعے، محسوسات و تجربات کے ذریعے، مابعد الطبعیات تک پہنچے؟ اگر صرف مظاہر کائنات اور طبیعیات سے خالق کائنات مل سکتا تو مغرب کے ہر جدید انسان اور ہر سائنس دان کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی اور مغرب کا ہر سائنس دان یا وسیع المطالعہ شخص صوفی اور درویش ہوتا، کتنے درویش پیدا کیے مغرب نے، کتنے سائنس دان اللہ کے سامنے سربسجدہ ہوئے، سائنس تو اپنے آپ کی پرستش کرتی ہے، اپنے آپ کو سجدہ کرتی ہے، اس مادی سائنس سے روحانیت کشید کرنے کی کوشش تین سو برس کے تجربات نے غلط ثابت کر دی ہے۔ جدید سائنس جو مادیت کی اساس سے نکلی ہے

کبھی روحانیت کی سمت رہنمائی نہیں کر سکتی اور مغرب کی پوری تاریخ اس تصور کی تصدیق کرتی ہے۔ اقبال مرحوم نے نظریہ اضافیت کی بنیاد پر دین اسلام کے تمام پیمانوں کو ازکار رفتہ قرار دے کر نئی تعبیر و تشریح کا راستہ نکال دیا۔ کیا نظریہ اضافیت حکم خداوندی یا وحی الٰہی کا نعم البدل ہے کہ اس کی روشنی میں ہم دین کا جائزہ لیں۔ یہ اقبال مرحوم کی سب سے بڑی غلطی ہے اور ناقابل معافی غلطی کہ مغرب کی سائنس اور فلسفے کو منہاج حقیقی بنا کر دین کی تعلیمات کو اس پیمانے پر جانچا جائے نہ کہ دین کو اصل حقیقی اور درست منہاج سمجھ کر مغرب کے فکر و سائنس کو اس پیمانے سے جانچا جائے۔ مغرب کی عقلیت Rationalism کو اسلام میں ممکن بنانے بلکہ اسلام سے ثابت کرنے کے لیے اقبال مرحوم نے غزالی کے برعکس عقل اور وجدان کو توام بتایا۔ غزالی کی تردید کے بعد وہ اسلام کی فطرت میں عقلیت کو تلاش کر لیتے ہیں۔ وہ غزالی کو رد کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ عقل اور فکر لامحدود ہے بلکہ کانٹ کا بھی رد کرتے ہیں جس نے Critic on pure reason میں عقل کی تحدیدات کا اعتراف کر لیا تھا اس معنوں میں اقبال مرحوم تمام جدید فلاسفہ سے بھی آگے چلے جاتے ہیں۔ خطبات میں اقبال مرحوم نے جہاں جہاں مغربی فکر و فلسفے کو قرآنی آیات سے ثابت کیا ہے۔ یہ تمام استدلال سرے سے غلط ہے۔ اقبال مرحوم علم تفسیر سے ناواقف تھے اور انھوں نے قرآن کے انگریزی تراجم کے ذریعے قرآن کو سمجھا اور قرآن کی تشریح خالص عقل کی روشنی میں کی لہٰذا جہاں جہاں بھی قرآنی آیات کو وہ اپنے موقف کے حق میں پیش کرتے ہیں وہاں وہاں وہ ٹھوکریں کھاتے ہیں اور یہ ٹھوکریں تحریفات سے بھی بڑھ کر ہیں۔ مغربی فکر و فلسفے کی تائید و توثیق کے لیے انھوں نے قرآن سے جتنے بھی حوالے دیے ہیں وہ محرف، غلط، بے بنیاد سیاق و سباق سے کٹے ہوئے اور اصل بحث سے لاتعلق ہیں۔ قرآنی آیت میں موضوع کچھ اور ہے۔ اقبال مرحوم اس سے اپنے مطالب اخذ کر رہے ہیں اور اس اخذ و استفادے میں کوئی اصول زیر بحث نہیں سلف سے خلف تک کسی ایک عالم نے اس طریقے سے قرآن کی تشریح نہیں کی۔

اقبال مرحوم نے آیات کو سباق و سیاق سے کاٹ کر مطالب اخذ کیے ہیں۔ ان مطالب سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اقبال مرحوم کا فہم قرآن نہایت ناقص تھا وہ قرآن کی تشریح و تفہیم پر قادر نہ تھے اور قرآنی الفاظ کا درست مفہوم نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کیونکہ ان کی عربی استعداد برائے نام تھی۔ اگر کوئی مفسر یا محقق خطبات کی تمام آیات کو سامنے رکھ کر ان کا تنقیدی جائزہ لے تو ضخیم کتاب مرتب ہو سکتی ہے۔ اسلام کی تشکیل جدید کا دعویٰ کرنے والے اگر قرآن سے ہی واقف نہیں ہیں تو انھیں تشکیل کا کیا حق پہنچتا ہے۔ اپنے نظریہ زمان و مکان کے لیے اقبال مرحوم نے قرآنی آیات سے غلط استدلال کیا ہے۔ اقبال مرحوم باطنی تجربے، روحانی وجدان، فواد کے ذریعے خدا کے براہ راست مشاہدے و تجربے کو یقینی قرار دیتے ہیں جب کہ یہ نقطۂ نظر گمراہی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ انسان کے لیے روح کا ادراک ممکن نہیں تو وہ absolute ego کا دیدار کسی بھی ذریعے سے کیسے کر سکتا ہے؟ ایسا ممکن ہوتا تو کیا حضرت موسیٰ دیدار خداوندی سے محروم رہتے؟ افسوس یہ کہ دیدار الٰہی کی پیغمبرانہ خواہش تو ممکن نہ تھی مگر اقبال

مرحوم اپنے فلسفے سے اس کو ممکن بنا دیتے ہیں، انسان کو اللہ کی صفات کا علم حاصل ہوسکتا ہے یا اس کی ذات کا .... اسلامی تاریخ میں یہ متنازعہ مسئلہ نہیں ہے لیکن اقبال مرحوم فرماتے ہیں کہ ذات خداوندی کا براہ راست مشاہدہ ہوسکتا ہے اور ایسے بڑے دعوے کی کوئی دلیل نہیں۔ ولیم جیمز کی روحانیت میں تو شاید ممکن ہو اسلام میں ایسا دعویٰ ممکن نہیں، حواس و عقل سے ذات خداوندی کا ادراک ممکن ہی نہیں ورنہ حضرت موسیٰ دیدار الٰہی کی نعمت سے محروم نہ رہتے اور جدال رہانی کا دیدار فرماتے۔ اس فلسفے کی بنیاد پر اقبال مرحوم نے نبی اور ولی کو یکساں مقام پر کھڑا کر کے دونوں کے روحانی تجربات کو یکساں قرار دیا۔ اقبال مرحوم روحانی تجربے کو عقل کے ذریعے ممکن سمجھتے ہیں۔ یعنی وجود خدا، خدا سے ملنے والا علم وحی، پیغمبرانہ دعوے کی تفہیم ان سب کی عقلی معیار پر تصدیق ممکن ہے۔ اقبال مرحوم انکار کرتے ہیں کہ خدا کائنات سے باہر نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب کائنات ہماری دسترس میں ہے اور روز بروز تسخیر ہوتی جارہی ہے تو ذات خداوندی بھی دسترس سے باہر نہ رہ سکے گی اور باطنی وجدان، عقلی وجدان، روحانی وجدان کے ساتھ ساتھ آخر کار طبعیات کے ذریعے انسانی ادراک میں آجائے گی۔ یہ نقطہ نظر بہت بڑی جسارت ہے۔ اس طرح کی جسارتیں ان کے یہاں عام ہیں اور مغربی فلسفے نے انھیں یہ اعتماد بخشا کہ وہ اس قسم کے دعوے کر سکیں جو اسلامی تاریخ میں کسی بڑے سے بڑے عالم نے نہیں کیے۔ مثلاً تقدیر کے مفہوم کو نہ مسلم سمجھ سکے نہ غیر مسلم، نبوت محمدی کی اصل حقیقت عالم اسلام کے کسی شخص کی سمجھ میں نہیں آئی۔ کسی چیز کی تقدیر خارج میں نہیں بلکہ باطن میں پیوست ہوتی ہے۔ تقدیر کسی بیرونی جبر کے بغیر ظہور پذیر ہوتی رہتی ہے۔ تقدیر کے تمام ممکنات باطن میں موجود ہوتے ہیں۔ انسان اپنی تقدیر خود بنا سکتا ہے اور تقدیر کو جو معنی جو رنگ دینا چاہے اپنی خودی کے زور پر ہر انسان ہر رنگ اور ہر معنی دے سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان ایک ایسی ہستی ہے جو خود کاتب تقدیر ہے اور لوح تقدیر پر جو چاہے اپنی سعی و جہد سے تحریر کرسکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں انسان مخلوق نہیں خالق ہے۔ وہ خودی کے ذریعے خدا بن سکتا ہے۔ یہ تصور مغرب کے Humanism کا ہے اور انسان کے خالق ہونے کا اعلان ہے۔ نطشے کا ہم ماش ہو ہو یہی ہے۔ اقبال مرحوم کا یہ تصور تقدیر مغرب کے منہاج علم کے عین مطابق ہے لیکن اسلام میں اس تصور کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ اقبال مرحوم کے یہاں تضادات کا یہ تنوع غالباً اس وجہ سے بھی ہے کہ اقبال مرحوم نے ۱۹۱۲ کے بعد سے مطالعہ کتب ترک کردیا تھا وہ صرف قرآن پڑھتے تھے یا مثنوی کبھی کبھار کوئی کتاب دیکھ لیتے لہٰذا صرف قوت حافظہ، سابق مطالعہ، اور زبردست قوت مشاہدہ...... کے زور پر وہ علمی و تحقیقی کام کرتے تھے۔

اقبال مرحوم کے فلسفے میں تخلیقیت، نوع بنوع تسخیر سے ہر خلاقی، تازہ آفرینی، لمحہ بہ لحمہ تغیر، خودی کے بل پر خدا کو مخاطب پر مجبور کرنے کی حیرت انگیز صلاحیت کے نتیجے میں انسان ایک مطلق آزاد وجود بن جاتا ہے جو تقدیر الٰہی کا پابند نہیں اور تکوینی انتظام سے بھی ماورا ہے کیونکہ تقدیر تکوینی انسان کو مجبور ٹھہراتی ہے مثلاً وہ کب پیدا

ہو کب مرے اور کہاں پیدا ہو یہ انسان کے دائرہ اختیار سے باہر ہو جاتا ہے۔ اقبال مرحوم کو انسان کی یہ بے چارگی پسند نہیں، تکوین کے جبر سے کوئی مخلوق آزاد نہیں، مگر شعور اور جدو جہد سے راستے متعین کرنے کی آزادی ایک الگ چیز ہے۔ حضرت عیسیٰ کی پیدائش تو معجزے کے ذریعے ممکن ہے۔ یہ معجزہ ذات مطلق سے مخصوص ہے لیکن عام لوگوں کے لیے نکاح اور وظیفہ زوجیت کے بغیر اولاد کا امکان محال ہے۔ اولاد کا امکان باطن میں رکھ دیا گیا ہے لیکن اس ممکن کو وجود میں لانے کے لیے اور لوح تقدیر کو پڑھنے کے لیے کوششیں اور جدو جہد انسان ہی کرے گا۔ اگر تقدیر میں اولاد نہیں لکھی گئی ہے تو پھر کتنی ہی کوشش کرے کتنے امکانات ہوئے کار لائے اولاد سے محروم رہے گا۔ قرآن بتاتا ہے کہ آئندہ کا نقشہ اللہ کے علم میں ہے مکمل طور پر مثلاً ایران پر رومیوں کی فتح کی خوش خبری، مشرکین عرب پر مسلمانوں کے غلبہ کی خبر، حضرت یوسف کو ستاروں کا سجدہ اور اس کی عملی تعبیر، قوم لوط کو پیغام عذاب، فرعون کی غرقابی، ابراہیم کو اولاد کی خوش خبری، زکریا کو اولاد کی خوش خبری، یہ سب واقعات مستقبل تو تھے مگر اقبال مرحوم کو ان آیات کے مقابلے میں خدا کی خلاقی زیادہ پسند ہے، اس طرح کائنات خدا کی تقدیر کا جبر بن جاتی ہے اور وہ جبر کو قبول نہیں کرتے۔ تقدیر کو صرف دعا بدل سکتی ہے اگر قبول ہو جائے۔ لیکن اقبال مرحوم کے یہاں یہ تصور کالعدم ہے۔ وہ اس تصور تقدیر کو جبر قرار دیتے ہیں اور خدا کی آزادی کے منافی۔ ان کے خیال میں یہ تصور انسان کی خودی کو ختم کر دیتا ہے اور اس کی حیثیت کا انکار کر دیتا ہے۔ وہ کائنات میں صاحب حیثیت نہیں رہتا۔ اقبال مرحوم خدا کو شعوری تخلیقی زندگی یا ارادہ سمجھتے ہیں۔ یہی انا یا نفس ہے۔ سورہ اخلاص خدا کی ذات کا ادراک واضح کرتی ہے۔ اقبال مرحوم کا یہ تصور اسلام کے تصور الٰہ کے برعکس ہے۔ وہ کائنات کو خدا کا تخلیقی عمل سمجھتے ہیں جو ہنوز نا تمام ہے گویا خدا تخلیق میں مصروف عمل ہے۔ اس تصور کے ذریعے وہ سائنس کے اس مفروضے کو ثابت کرنا چاہتے کہ کائنات مسلسل پھیل رہی ہے ارتقاء پذیر ہو رہی ہے، نئی نئی کہکشائیں بن رہی ہیں، مردہ انجم ڈھل رہے ہیں، ستارے وجود میں آ رہے ہیں، خدا مصروف عمل ہے بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ انسان کا درجہ اس قدر بڑھاتے ہیں اور خدا کا درجہ اس قدر گھٹا دیتے ہیں کہ تصور اس کے ادراک سے کانپتا ہے۔

And in this process of progressive change God becomes a co-worker with him provided man takes the initiative.

یہ کائنات محض ذات خداوندی کی ایک صفت کا مادی مظہر ہے۔ اقبال مرحوم نے قدریہ و جبریہ فرقوں کی تاریخ پر گہری نظر نہیں ڈالی۔ اس عہد کے علمی مناقشے، فرقہ وارانہ اور ان ہنگاموں میں امام ابو حنیفہ کا متوازن مسلک جس نے ان مسائل کی جڑ کاٹ دی۔ اقبال مرحوم انہی مباحث کو جو عقلی زور پر ہر عہد میں برپا ہو جاتے ہیں۔ اہم علمی مشق سمجھتے رہے۔ اگر وہ پہلی صدی ہجری میں تشیع سے خوارج اور معتزلہ تک کی تاریخ کا غائر مطالعہ کر لیتے تو ان ازکار رفتہ مباحث کو خطبات میں تجدید نہ دیتے۔ اب پڑھنے والا سمجھتا ہے کہ کوئی نئی بات لکھی گئی ہے کیونکہ قدیم

مباحث سے لوگ واقف نہیں مغربی فلسفے نے اقبال مرحوم کو یہاں تک پہنچا دیا ہے کہ انھوں نے خطبات میں کہیں لکھا ہے کہ اللہ نے اپنی آزادی طاقت حیات قدرت میں انسان کو شریک کر لیا ہے۔

He has chosen finite egoes to take part in his life power and freedom.

قرآن کے مطابق اللہ نے اپنے اختیارات میں کسی کو شریک نہیں رکھا حتیٰ کہ پیغمبروں کو بھی نہیں البتہ اس نے کچھ اختیارات دنیا میں انسان کو دیے ہیں اور بتا دیا ہے کہ آخرت میں تمام اختیارات صرف اسی کے پاس ہوں گے کیونکہ وہ مالک یوم الدین ہوگا۔

اقبال مرحوم فطرت کے سائنسی مطالعے کو عبادت قرار دیتے ہیں لیکن افسوس کہ یہ عبادت آج تک کسی نیچری کسی سائنس دان کو عابد نہ بنا سکی۔ تین سو سال میں ایک بھی عبقری فطرت کی عبادت کر کے فطرت کے مطابق زندگی بسر کرنے پر آمادہ نہیں ہوا فطرت کے مناظر کا مشاہدہ تجربہ مطالعہ ذات خداوندی کا ادراک مہیا کرتا ہے۔ جب کہ ذات خدا نا قابل ادراک ہے۔ ذات کے بارے میں پیغمبروں کو جو علم اللہ تعالیٰ عطا فرماتے ہیں وہ ان کی مرضی ہے اور وہ اس علم سے اس حد تک واقف ہو سکتے ہیں جیسا کہ قصہ موسیٰ سے اشارات ملتے ہیں جب ذات خداوندی کی حقیقت اور ادراک کے فہم میں پیغمبروں کا یہ مقام ہے تو اس ارذل و اسفل انسان کو اقبال مرحوم کہاں پہنچانا چاہتے ہیں۔ انسان ماہیت روح کا ادراک نہیں کر سکتا تو ذات الٰہی کا ادراک کیسے کرے گا۔ اللہ کا دیدار نہ چشم ظاہر سے ممکن ہے نہ چشم تخیل سے۔ اسی نظریے کو لے کر منکرین حدیث نے دعویٰ کیا کہ اصل علما تو سائنس داں ہیں یہ عجیب علماء ہیں جنھیں خشیت الٰہی نصیب ہوتی ہے نہ قرب الٰہی نہ دیدار الٰہی صرف دعوے کی وجہ سے ہیں۔ وہ عبادت کو ایک فرض روح کی پکار کے بجائے سماجی حرکت Social Activity بنا دیتے ہیں۔ ان کے پاس عبادت کی شکلوں کی بھی اہمیت نہیں قبلہ رو ہونے کا مقصد وحدت حرکات ہے۔ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا، اقبال مرحوم آگے بڑھ کر جنت و دوزخ کو حقیقت کے بجائے محض تصورات سمجھتے ہیں۔ نہ صرف اقبال مرحوم جنت دوزخ کے حقیقی وجود کا انکار کرتے ہیں بلکہ حیات بعد الموت کو بھی حقیقی واقعہ سمجھنے کے بجائے نفس انسانی کے عروج و جدل و علو کا ایک راستہ قرار دیتے ہیں۔ مرنے کے بعد فیصلہ ہوگا کہ خودی کیسے ترقی کرے گی اور کتنی؟ اگر آخرت محض ادعا ارتقاء خودی کے لیے برپا کی جا رہی تھی تو کیا ضرورت تھی۔ افسوس کہ اس ضرورت کا علم چودہ سو برس میں کسی کو نہیں ہوا۔ اقبال مرحوم کے تصور جنت و دوزخ سے معلوم ہوتا ہے کہ دوزخ تزکیہ نفس کا ادارہ ہے جہاں سے نفوس کے تزکیے کے بعد نفس انسانی کی لامحدود تخلیقی قوتیں آخری امکانات کی جستجو میں مصروف عمل ہو جائیں گی یعنی نطشے کا ابد ماش مرنے کے بعد بلکہ خود کو مارنے کے بعد ہی اٹھے گا تو پھر وہی تخلیقیت کا سفر شروع کر دے گا کیونکہ جنت و دوزخ کی زندگی تو تخلیق کے لیے پیغام مرگ ہے ایک خاص علاقے میں محدود زندگی جبر ہے اور ارتقاء و تخلیق

لامحدود تخلیقی قوتیں آخری امکانات کے تصور سے خالی ہے۔ یہ تصور حرکی نہیں ہے اور حرکات Dynamic اسلام کا اصل الاصول ع روح امم کی حیات کشمکش انقلاب، موت کے بعد کی دوزخی برزخی بہشتی زندگی اس کشمکش حیات سے خالی ہوگی۔ لہٰذا یہ زندگی خدا کی ہر لحہ تخلیق ہونے والی ہستی کی خود تخلیقیت کے تصور خلاقی کا انکار ہے لہٰذا خدا ایسا نہیں کرسکتا۔

اقبال مرحوم نہ صرف خدا کو بلکہ پیغمبر کو بھی صرف اور صرف تخلیقیت کے ذریعے پہچانتے ہیں اور دونوں ہستیوں کی اصلیت یہی ہے کہ دونوں تخلیقیت اور خلاقیت سے پُر ہستیاں ہیں۔ اس خالص مادی تصور سے خدا اور اس کے پیغمبروں کو صرف مادی مظاہر میں محصور کرنا اور ان کو محض مادیات کے دائرے سے سوچنا، دیکھنا اور پہچاننا اور اس سے اوپر نہ اٹھنا ہی ماڈرن ازم ہے۔ اس میں کیا شبہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ کہا تھا کہ ری کنسٹرکشن آف اسلامک تھاٹ اسلامی معاشروں میں ماڈرن ازم کی انجیل ہے۔ غلط تو نہیں کہا تھا۔ افسوس یہ ہے کہ اس کتاب پر آج تک بھرپور نقد نہیں کیا گیا۔ اب وقت ہے کہ اس کتاب میں مستور کفر الحاد لادینیت کو بیان کر دیا جائے۔ کیونکہ اقبال مرحوم کی شاعری مسلم ہو چکی ہے اور ان کی نثر طاق نسیاں میں رکھ دی گئی ہے۔ اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ اقبال مرحوم اب اس نثری حوالے سے بہت بلند ہو چکے ہیں۔ آخر عمر میں اقبال مرحوم نے بھی ان نظریات سے رجوع کر لیا تھا۔ ہمارے دوست خواجہ عبدالوحید نے مجھے لاہور کی ایک تقریب کا حال لکھا تھا جہاں اقبال مرحوم نے یہ اعتراف کیا تھا کہ مغربی فکر و فلسفے کو منہاج سمجھ کر اسلام کی توجیہ و تشریح کا طریقہ ٹھیک نہیں تھا۔ مجھے اس کے برعکس نیا اختیار کرنا چاہیے تھا۔ یعنی آخری عمر میں اقبال مرحوم امام غزالیؒ کے منہاج کے قائل ہو گئے تھے کہ حق تو صرف اور صرف کتاب و سنت میں محصور ہے۔ اس کو منہاج بنا کر مغربی فلسفے کا جائزہ لیا جائے۔ خطبات کی خطرناک ترین غلطی مغربی فلاسفر/مفکرین کے رسالت مآب پر اعتراضات ہیں جس میں کیفیات وحی کو نفسیاتی بیماری کی علامتیں قرار دیا گیا تھا۔ اقبال مرحوم نے ان الزامات کی تردید کے بجائے اس الزام کو تسلیم کر لیا کہ نبی نفسیاتی بیماریوں میں مبتلا ہو سکتے ہیں اور تاریخ کا رخ موڑنے والی شخصیات عموماً غیر معتدل ہوتی ہیں اس میں کوئی حرج نہیں، عہد حاضر میں اقبال مرحوم مذہب کی غایت اصلی Spritual Intution بتاتے ہیں جو باطل تصور ہے۔ اقبال مرحوم کے خطبات کے مباحث کے نتیجے میں مذہب کا امکان محض فلسفیانہ واہمہ بن جاتا ہے۔ فی الاصل مذہب کی ضرورت ہی نہیں رہتی اور وجدان کی روح کے کناروں کو چھیڑنے کے لیے کافی ہوتا ہے لہٰذا اقبال مرحوم کا تصور امکان مذہب محض انسانی انا self کی فلسفیانہ توجیہ بن جاتا ہے جس کے نتیجے میں مذہب کالعدم ہو جاتا ہے جیسا کہ مغرب میں ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ خطبات کو جب بھی اسلامی معاشروں میں علمی مقام ملا مذہب اسلامی معاشروں سے رخصت ہو جائے گا۔

ذات خداوندی ترقی: تخلیقیت

خدا کی ذات فہم انسانی سے بالاتر ہے، اس کی اصلیت و حقیقت ہمارے قلب پر عیاں نہیں ہوسکتی، لہٰذا ہم ذات باری تعالیٰ کا تصور تو کر سکتے ہیں ادراک نہیں کر سکتے، لیکن اقبال مرحوم کو یقین تھا کہ ماڈرن سائنس کے ذریعے اللہ کی حقیقت کو پہچانا جاسکتا ہے۔ ان کے خیال میں سائنس کے ذریعے ذات باری تعالیٰ کی حقیقت کا ادراک ہوسکتا ہے وہ اللہ کو صفت قرار دیتے ہیں جو مسلسل تخلیقیت میں اپنا اظہار کر رہا ہے۔ جبکہ اللہ کی ذات ایک ہے اور ننانوے اس کی صفات ہیں اس کا اسم خاص اللہ ہے۔ اقبال مرحوم حرکت وارتقاء کے مغربی تصور سے اس قدر متاثر ہیں کہ وہ خدا کو محض تخلیقی قوت کے طور پر دیکھتے ہیں، اس تخلیقی عمل میں انسان خدا کا رشتہ دار بن جاتا ہے، ان کے خیال میں کیونکہ تخلیقی ذہن سائنٹفک معتقد رکھتا ہے اس لیے ماڈرن فزکس سے اللہ کا ادراک کیا جاسکتا ہے۔ خدا کا نقطہ نظر تخلیقیت ہے یا نہیں یہ اقبال مرحوم کو کیسے معلوم ہوا وہ خدا کے اس نقطہ نظر تک کیسے پہنچے؟ یہ تو نبوت کا دعویٰ ہے۔ اللہ پیغمبر کو خود بتاتا ہے کہ اس کی رضا اور منشاء کیا ہے۔ سائنس کے ذریعے خدا کی منشاء اور اس کی قوت تخلیقیت کا ادراک محض فلسفیانہ موشگافیاں ہیں اقبال مرحوم مادی کائنات کو روحانی شے اور روحانی حقیقت سمجھتے ہیں، ان کے خیال میں فزیکل لاز اور میٹافزیکل لاز دونوں کا علم [نالج] ایک دوسرے کا مددگار ہے۔ خالق اور تخلیق میں کوئی فرق نہیں، وجود ایک ہی ہے اس وجود کا اظہار مادہ ہے لیکن اس کی فطرت [نیچر] تبدیل ہو رہی ہے خود مادہ کیا ہے؟ سائنس آج تک یہ نہیں بتا سکی کہ مادہ کیا شے ہے؟

حقیقت ماورائے ذات نہیں ہے:

ترقی اور ارتقاء کے مغربی نظریات میں اصل بات لمحہ بہ لمحہ مادی ترقی ہے جو نگاہوں کو چکا چوند کر دے۔ انسان آزاد ہے اور ارتقاء پذیر ہے تو اس کے ہونے کے امکانات لامحدود ہیں لہٰذا مقصد کا کیا سوال بس ترقی کرنا، تخلیق کرنا، حرکت کرنا، ایجاد کرنا، مادی مظاہر میں وسعت اختیار کرنا نوبہ نو ایجادات بازار میں پیش کرنا، لذات دنیا سے زیادہ سے زیادہ متمتع ہونا، ایجادات کا اور کیا مقصد ہے، یہی تو مقصد زندگی ہے۔ برگساں اور اقبال مرحوم کے یہاں انسان کی لامحدود صلاحیتوں کی وسعت کے امکانات خودی کے جذبے کے ذریعے دریافت ہوتے رہتے ہیں۔ فلسفہ خودی...... میں اور میری ذات کے اسرار حقیقت مجھ میں مضمر ہیں لہٰذا حقیقت ماورائے ذات نہیں رہتی۔ انسان بے پناہ امکانات کا امین بن جاتا ہے، وہ ترقی کرتا چلا جائے، آگے بڑھتا جائے، اس کا کام ترقی پانے کے سوا کچھ نہیں ہے، یہی حاصل زندگی ہے۔

انسان کی دسترس سے لوح محفوظ بھی محفوظ نہیں:

خودی کے ذریعے حرکت اور تخلیقیت ہی حق بن جاتے ہیں، انسان ہی وراء الوراء ہو جاتا ہے اور رضا

بھی بندے سے اس کی رضا پوچھنے کے لیے عرش سے فرش پر اتر آتا ہے۔ یہ خودی بحرِ بے کنار ہے، اس کے بغیر انسان کائنات انقلاب ارتقاء، سائنسی ترقی کا وجود بے معنی ہے۔ تقلید کے جمود سے نکلنے کے لیے اقبال مرحوم نے حرکت کا ایک ایسا تصور اختیار کر لیا جو صحف سماوی کی تاریخ میں اور مذہبی تہذیبوں کی تاریخ میں غالباً عجمی تصور ہے، اس تصور کے ذریعے یہ تصور بھی نکلتا ہے کہ تقدیر کا کوئی اور کاتب نہیں ہے۔ انسان خود کاتب تقدیر ہے، جس کی دسترس سے لوحِ محفوظ بھی محفوظ نہیں۔ دنیا بڑھ رہی ہے، خدا اپنے آپ کو تخلیق کر رہا ہے، نئی دنیائیں طلوع ہو رہی ہیں، تعمیر خودی کا طریقہ قومی بالادستی ہے، انسان مر جائے گا، قوم زندہ رہے گی، ابدیت قوم کو حاصل ہے، مسلم قوم پرستی اسی تصور سے جڑ پکڑتی ہے، قرآن و سنت مسلم قوم پرستی کے تصور سے خالی ہیں۔

مغرب اور نطشے کی ہم آہنگی:

اقبال مرحوم یہ بھی کہتے ہیں کہ وجدان عقلیت کی اعلیٰ ترین منزل ہے اور سائنٹفک طریقہ کے ذریعے حقیقت Truth کو معلوم کیا جا سکتا ہے۔ مغرب وجدان [Highler Facutuly] کو اعلیٰ ذریعہ علم نہیں سمجھتا، وجدانیت کی سائنٹفک طریقہ میں کوئی جگہ نہیں۔ اقبال مرحوم ایک تہذیب کی تاریخ کو دوسری تہذیب کی تاریخ میں ضم کرنا چاہتے ہیں جو ممکن نہیں۔ مغرب وجدان اور جبلت میں فرق کرتا ہے اور مغربی فلسفہ جبلتوں کی سطح سے اوپر نہیں اٹھ سکا۔ نطشے کو پاگل قرار دے کر قید کیا گیا، اب پورا مغرب پاگل ہو گیا ہے کیونکہ جدید مغرب نے نطشے کے فلسفے کو اختیار کر لیا ہے، جمالیات اور جبلتیں ہی حقیقت مطلقہ کا متبادل ہیں۔ پاگل پن کی انتہا یہ ہے کہ مغرب کی نظر میں ہر وہ شخص جاہل، غیر عقلی، وحشی اور دائرہ انسانیت سے خارج ہے جو مسائل کا حل مذہب، الہامی متن، کسی روایت یا کسی خارجی ذریعے میں ڈھونڈتا ہے، لہٰذا ایسا انسان مغربی انسان کی تعریف کے پیمانے پر پورا نہیں اترتا اور واجب القتل ہے، اسی فلسفہ کے تحت یورپ اور امریکہ نے کروڑوں انسانوں اور سرخ ہندیوں کا قتل عام کیا، برِ اعظم ایشیا، افریقہ، عرب، آسٹریلیا لوٹ لیے۔

اقبال مرحوم اور کانٹ: ورائی امور ہنگامی امور

ماڈرن ازم کے آغاز میں مغرب کا دعویٰ تھا کہ حقیقت پہچاننے کے لیے انسان خود کفیل ہے۔ اسے وہ صلاحیتیں حاصل ہیں جس سے وہ حقیقت مطلقہ [absolute reality] تک رسائی حاصل کر سکتا ہے۔ اقبال مرحوم اس دعوے کی تصدیق کرتے ہیں۔ جب کہ کانٹ اس دعوے کی تردید کرتا ہے جو مغرب کا سب سے بڑا فلسفی اور ماڈرن ازم کا بنیادی فلسفی ہے۔ کیا اقبال مرحوم کانٹ سے بڑے فلسفی تھے اور مغرب کو مغرب سے زیادہ بہتر جانتے تھے یا مغربی فلسفے پر کانٹ سے زیادہ عبور رکھتے تھے؟ جس دعوے کا انکار کانٹ نے اس کے بعد تمام مغرب نے کیا۔ اقبال مرحوم اس کو تسلیم نہیں کرتے۔ یہ بھی عجیب بات ہے کانٹ نے ثابت کر دیا کہ ورائی امور کا علم عقلی

حقیقت مطلقہ تک رسائی ممکن نہیں۔ انسان صرف ہنگامی امور کا علم حاصل کر سکتا ہے یعنی انسان علوم نقلیہ کا اثبات یا تردید سائنس سے حواس سے تجربات سے نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ انسان کے دائرہ حواس و تجربات سے ماورا ہیں۔ صرف علوم عقلیہ کی تائید یا تردید کی جا سکتی ہے اور یہی اصل علم ہے بعض مغربی فلسفیوں اور سائنس دانوں کی زبان میں جس علم کو ریاضی کی زبان میں یعنی دو اور دو چار کی طرح بیان نہ کیا جا سکے وہ علم ہی نہیں ہے جب کہ سائنس کے بے شمار نظریات مفروضات پر قائم ہیں سائنس بھی دو اور دو چار کی طرح بیان نہیں کیا جا سکتا۔ سائنس آج تک مادہ کی تعریف بیان نہیں کر سکی کہ یہ ہے کیا۔ اگر عقل، فلسفہ اور سائنس کے ذریعے حقیقت مطلقہ تک رسائی حاصل ہو سکتی تو فلسفہ کی ڈھائی ہزار سالہ تاریخ میں آج تک کسی ایک فلسفی سائنس دان کو حتیٰ کہ ارسطو کو حقیقت مطلقہ تک رسائی کیوں حاصل نہ ہو سکی؟ اگر بالفرض کسی کو آج رسائی حاصل بھی ہو جائے تو اصلاً یہ عقل کا کمال ہوگا اور یہ عقل اس فرد واحد کی ہوگی اور حقیقت مطلقہ کی تائید و توثیق ایک شخص کی عقل کرے گی یعنی حقیقت مطلقہ محتاج ہے، اپنی مخلوق کی تصدیق کی، یعنی اصل حقیقت مطلقہ تو عقل انسانی ہوئی۔ اقبال مرحوم کے خطبات میں حقیقت مطلقہ خود انسان، انسان کی عقل اور سائنس بن جاتی ہے یعنی حقیقت پیدا کی جا رہی ہے، تخیل اور تصور اور تجربے کے ذریعے یا ان ذرائع سے اس کی تصدیق کی جا رہی ہے جب کہ حقیقت قائم بالذات ہوتی ہے نہ یہ تخلیق ہوتی ہے نہ فنا ہوتی ہے، کوئی اسے مانے یا نہ مانے وہ حقیقت ہوتی ہے۔

مسلم ماڈرن ازم: مسلم لبرل ازم

ان تمام حقائق کے باوجود ہمیں مسلم ماڈرن ازم اور مسلم لبرل ازم میں فرق کرنا چاہیے۔ مسلم ماڈرنسٹ نہایت مخلص، دین کے خادم، خیر خواہ امت کے لیے پریشان لوگوں کا گروہ ہے۔ اس کے سرخیل اقبال مرحوم ہیں یہ معجزات کو بھی مانتے ہیں، اسلام کے ماخذات پر بھی یقین رکھتے ہیں۔ یہ مسلم جدیدیت پسند مغرب میں ایک روحانی خلاء محسوس کرتے ہیں، اس کی مادیت کو سراسر اسلام کا حاصل اور ثمر سمجھتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ مغرب ناکافی ہے کیونکہ اس نے اسلام سے علوم عقلیہ، سائنس، تجربیت اور دنیا لے کر ترقی کر لی۔ مگر اسلام کی مکمل تعلیم یعنی روحانیت سے استفادہ نہ کیا، مغرب کے مقاصد درست ہیں لیکن اس کی تکمیل اسلام کے نظام عبادات و روحانیات کے بغیر نہیں ہو سکتی، یہ بہت بڑی غلطی ہے۔ مغرب کے فلسفے سے اتنے متاثر ہیں کہ اسے بھی اسلام میں یا اسلام کو مغرب میں سمونا چاہتے ہیں۔ مسلم لبرل ازم دوسری شے ہے، جس کی ابتداء کرامت حسین جونپوری، چراغ علی، سرسید نے کی اور مشرقی، نیاز فتح پوری، عبدہ، جیراج پوری، غلام احمد پرویز اس کی علامتیں ہیں۔ یہ نہایت جدیدیت اور امت کے مخالف لوگ ہیں، یہ لوگ فکری اور علمی سطح پر نہایت کمزور ہیں۔ سرسید عبدہ تو انگریزی بھی نہیں جانتے تھے۔

سرسید چراغ علی: قرآن کلام اللہ نہیں

سرسید اور مولوی چراغ علی تو قرآن کو اللہ کا کلام ہی نہیں مانتے۔ جب یہ قرآن کو کلام الٰہی نہیں مانتے

تو ان کا دین کیا رہ گیا، ان کے بارے میں حسن ظن سے کتنا کام لیا جائے یہ تو سراسر الحاد ہے اور کیا ہے؟ حضرت رحمۃ اللہ تعالیٰ [مولانا اشرف علی تھانویؒ] اور حضرت نانوتویؒ نے [تصفیۃ العقائد میں] سرسید کے بارے میں لقد کے ساتھ کچھ کلمات خیر کہے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے سامنے سرسید کی تمام چیزیں نہیں تھیں جو قرآن کو کلام اللہ نہ مانے اس کے بارے میں کیا حسن ظن رکھا جائے جس کی زندگی انگریزوں اور ماڈرن ازم کی تبلیغ میں بسر ہوئی، اس کا امت پر کیا احسان ہے صرف نوکریاں، غلامی کے طریق۔ لہٰذا مسلم معاشروں کو مسلم لبرل ازم سے کوئی خطرہ نہیں، اصل خطرہ مسلم ماڈرن ازم سے ہے، یہ کبھی بھی طاقتور تحریک بن سکتا ہے اس میں کئی صلاحیتیں موجود ہیں۔

خطبات اقبالؒ اور مولانا مودودیؒ

مولانا مودودیؒ نے مسئلہ قومیت اور اسلامی تہذیب کے اصول و مبادی لکھ کر دراصل مسلم ماڈرن ازم کے کلیدی دعووں پر ضرب لگائی تھی، بلکہ میرا خیال ہے کہ اسلامی تہذیب و مبادی اقبال مرحوم کے خطبات کا ایک طرح پر جواب بھی ہے۔ خطبات اقبال دراصل مسلم جدیدیت کی بائبل ہے، لیکن اتنی ادق اور عسیر الفہم ہے کہ منکرین حدیث اس سے جزوی استفادہ بھی نہ کرسکے کیونکہ وہ فلسفیانہ مباحث سے استفادہ کی اہلیت نہیں رکھتے، ورنہ اگر منکرین حدیث اپنے خاص موثر اسلوب میں زندگی بھر صرف خطبات اقبال مرحوم کی تشریح لکھ دیتے تو لاکھوں مسلمانوں کا ایمان متزلزل کردیتے فلسفہ کو پڑھنے اور سمجھنے کی روایت ہند میں بہت کمزور ہے۔ خیر آبادی مکتب فکر نے بھی کبھی مغربی فلسفہ کو نہیں پڑھا، جدید تعلیمی اداروں میں فلسفے کی روایت بھی کمزور ہے علی گڑھ وغیرہ سے مغربی فلسفے پر کیا کام ہوا صفر بلکہ مغرب کی تائید و توثیق ہوئی ہے۔ مغرب پر کوئی نقد نہیں، پورا عالم اسلام اس معاملے میں بانجھ ہے۔ ندوہ اور دار المصنفین بھی، ازہر بھی، دیوبند بھی، جماعت اسلامی بھی، یہی حال جدید تعلیم یافتہ طبقات کا ہے۔ اگر جدیدیت پسند طبقات میں سے ایک بھی خطبات کو اوڑھنا بچھونا بنالیتا تو اس تحریک کو روکنا مشکل تھا۔ مجھے اندیشہ ہے کہ مستقبل میں برعظیم کے مذہبی معاشروں کو تہس نہس کرنے کے لیے خطبات اقبال کو ایک طاقت ور قوت کے طور پر کام میں لایا جائے گا۔ اور اقبال مرحوم کی محبوب دلنواز ہستی کے اس گمشدہ فراموش کردہ فکری گوشے کے ذریعے اسلام کے حصار میں خلل پیدا کردیا جائے گا۔ مولانا مودودیؒ کا یہ کارنامہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے اقبال مرحوم کے پیدا کردہ مسلم ماڈرن ازم کے مکتب فکر کی یلغار کو روکا اور اپنی تنظیمی صلاحیتوں اور تحریکی دعوت کے ذریعے انگریزی خواں طبقات میں مسلم جدیدیت پسندی کی تحریک کا قلع قمع کردیا، ان کی خامیاں اور کمزوریاں اپنی جگہ ہیں انبیاء کے سوا کون خامیوں سے مبرا ہے میں نے معارف میں ان کے فکر کا سخت محاکمہ کیا ہے اور ان کی غلطیوں پر بار بار گرفت کی ہے، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اقبال مرحوم کی فکر کے منفی اثرات کو جدید تعلیم گاہوں میں مولانا مودودی کی کتابوں نے زائل کردیا بلکہ سنا ہے کہ جماعت کے یہاں اہل علم خطبات کا تنقیدی مطالعہ کرتے ہیں۔

جو کام علماء نہ کر سکے وہ کام اقبال مرحوم نے انجام دیا:

اقبال مرحوم پر تمام تر نقد کے باوجود ان کے کارناموں کو ہم کیسے بھول سکتے ہیں۔ ہم نے کیا پوری امت نے اقبال مرحوم کی لغزشوں اور خطاؤں کے عظیم مجموعے خطبات کو بھلا دیا اور ان کے غیر مسلسل کلام اقبال مرحوم کو روح میں بسا لیا۔ اقبال مرحوم کا یہ کم کارنامہ ہے کہ انھوں نے اردو کو فاسقوں و فاجروں سے چھین کر اسے ایسی مذہبی شناخت عطا کر دی جس کی مثال پوری تاریخ میں نہیں ملتی، دنیا کی کسی زبان میں اتنا بڑا شاعر پیدا نہیں ہوا جس نے لوگوں کی سمت سفر موڑ دی اور زبان کو تہذیبی و تمدنی تنوع کا اعلیٰ ترین ترجمان بنا دیا ہو غلطیاں اپنی جگہ اس سے ان کے مرتبے میں کوئی کمی نہیں ہوتی۔ آخرت میں فیصلہ میزان کے ذریعے ہوگا۔ یہاں نیکیوں کا پلڑا بھاری ہوگا یا برائیوں کا۔ مجھے یقین ہے کہ اقبال مرحوم کا نیکیوں کا پلڑا سب سے بھاری ہوگا۔ اقبال مرحوم نے ایسے ایسے مسلمانوں کے دل میں دین کی محبت جگا دی اور انھیں سچا مسلمان بنا دیا جنھیں علماء بھی تبدیل نہیں کر سکے۔ لیکن کلام اقبال مرحوم نے ان کی زندگی بدل دی جس نے ایک ملحد کو مسلمان بنا دیا وہ کتنا بڑا شخص ہوگا جس نے لاکھوں کو اسلام کی محبت میں مبتلا کر دیا اس کے درجات کا کیا کہنا۔

اقبال پر بلنٹ، افغانی، چراغ علی، سعید پاشا، گوکلپ، قادر مغربی، مفتی ولیس، پادری رجب علی، پادری میکال کے اثرات:

بلنٹ نے اپنی کتاب Future of Islam ۱۸۸۲ء میں لکھا تھا کہ اسلام حرکت و ترقی کا مذہب ہے یہی نظریہ اقبال مرحوم نے بلنٹ سے اخذ کر کے وسیع کر دیا۔ بلنٹ افغانی اقبال مرحوم اصلاح کلیسائے یورپ کی تحریک سے شدید متاثر تھے اور اسلام میں اصلاح کے لیے کسی لوتھر کا راستہ دیکھ رہے تھے۔ اقبال مرحوم کو لوتھر کے منفی اثرات کا بخوبی اندازہ تھا جس کا ذکر ایک خطبے میں تفصیل سے کیا گیا ہے۔ بلنٹ کی کتاب میں اصلاح خلافت کی تجاویز کے خلاف میں نے معارف کی جلد ۸، ۲۰۰۹ء میں کئی مضامین شائع کیے۔ بلنٹ نے اجتہاد پر بہت زور دیا اقبال مرحوم اس سے شدید متاثر تھے یہ وہی بلنٹ ہے جس سے افغانی کے خصوصی تعلقات تھے اور سلطنت برطانیہ کے درمیان یہ رابطہ کا کام کرتے تھے۔ صرف بلنٹ سے نہیں بلکہ ان کی اہلیہ سے بھی افغانی کے تعلقات گھر والوں کی طرح تھے۔ افغانی دنیا میں جہاں کہیں ہوتے بلنٹ سے ان کا رابطہ متواتر رہتا۔ بلنٹ اور ان کی اہلیہ کے اصرار سے افغانی انکار نہ کر سکتے تھے۔ برطانوی حکومت اور امیر ترکی کے مابین روابط بھی بلنٹ کے ذریعے طے پائے، مشکل وقت میں بلنٹ نے افغانی کی مالی اور سفارتی مدد بھی کی ترکی میں اثر و رسوخ کا سبب بھی یہی مراسم تھے۔ افغانی اسلام کو ترقی، فلاح، علم، سائنس، اور انسانیت کا محرک سمجھتے تھے۔ اس تحریک کی علامتیں اسلامی تاریخ کے بجائے وہ مغربی تاریخ سے ڈھونڈتے تھے اور مغرب کی تاریخ کو اسلامی تاریخ کی ہی توسیع شدہ بہترین شکل

خیال کرتے تھے، کم و بیش یہی افکار اقبال مرحوم کے تھے کیونکہ وہ افغانی سے بھی متاثر تھے۔ علی عبدالرازق کی کتاب اسلام و اصول الحکم کا اقبال مرحوم پر خاص اثر تھا۔ اس کے بڑے مداح تھے۔ رازق نے مغرب کو معیار بنا کر فقہ اسلامی پر بحث کی تھی۔ اقبال مرحوم اسی اصول کو اہم سمجھتے تھے اور غالباً انہیں انھوں نے لکھا ہے کہ جو اس اصول کے تحت فقہ مرتب کر دے وہ مجدد حاضر ہوگا۔ اقبال مرحوم پر مولوی چراغ علی کی کتاب ریفارمز انڈر مسلم رول کا بھی بہت اثر تھا۔ وہ بھی اجتہادات کے داعی تھے۔ تقلید، جمود، اجتہاد، ارتقاء، اصول حرکت اور مذہب کی اصلاح جیسے خوبصورت نظریے افغانی، عبدہ اور اقبال مرحوم کے یہاں یکساں طور پر در آئے اور اس فکر کی عملی علامت لوتھر کی ذات تھی جس نے عیسائیت کو تباہ کر دیا۔ اجتماعی اجتہاد اسمبلیوں کے ذریعے ممکن بنانے کا نظریہ شیخ عبدالقادر مغربی نے پیش کیا تھا۔ اقبال مرحوم ان سے شدید متاثر تھے اور اس سلسلے میں مجھ سے گفتگو کر چکے تھے۔ سرسید اجتہاد کو اصلاح مذہب کا متبادل و مترادف گردانتے تھے۔ اجتہاد سے ان کی مراد دینی اصطلاح نہیں بلکہ ارادہ تھا، یعنی مغرب کے راستے میں دین کا جو حکم رکاوٹ ہے اس کی تاویل کر کے بدل دیا جائے۔ اسے دین سے خارج کر دو۔ بے چارے انگریزی جانتے تھے نہ علوم اسلام پر عبور رکھتے تھے۔ قرآن کو کلام رسول اللہ مانتے تھے، حالانکہ کفار نے بھی اسے کلام خداوندی مانا ہے۔ یہ کفر کی حمایت میں کفر سے بھی بڑھ گئے تھے اور پیروی مغرب کو عام کرنے میں تقلید کو سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔

سعید حلیم پاشا نے فقہی قانون کو میکانکی قرار دیا۔ اقبال مرحوم اس میکانکی تصور قانون سے بھی متاثر تھے۔ ضیا گوکلپ کے افکار و شاعری کا بھی اقبال مرحوم پر شدید اثر رہا۔ ترکی میں شریعت کے جمود اور غیر حرکت پذیری کا تصور شدت سے ابھرا تو یونانی الاصل ترکی، اغنی دیس نے [N.P Aghnides] نے ثابت کیا کہ اسلامی قانون بے لچک ہے اور جمود کی طرف لے جاتا ہے۔ لہٰذا اسے حرکی قانون تصور کرنا غلط ہے۔ اغنی دیس سے پہلے بالکل یہی نقطہ نظر پادری رجب علی نے ۱۸۸۰ء میں پیش کیا تھا کہ اسلام ایک جامد مذہب ہے۔ یہ آسمانی سلطنت ہے لہٰذا تمام احکام آسمانی میں تبدیلی ممکن نہیں لہٰذا اس جامد مذہب کے ساتھ مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ اگر ترقی چاہتے ہیں تو مذہب چھوڑ دیں۔ یہی بات پادری میکال نے اپنے مضمون میں اسی زمانے میں لکھی کہ مسلمان اسلام کو چھوڑے بغیر ترقی نہیں کر سکتے۔ اسلام میں لچک نہیں تمام قوانین الٰہی ہیں، ان کے ماخذات قرآن و سنت ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہو سکتی لہٰذا یہ مذہب زمانے کے ساتھ چل نہیں سکتا۔ اس کے جواب میں ہمارے پادری مولوی چراغ علی نے اپنی کتاب ریفارمز انڈر مسلم رول کے نام لکھی جس کا ترجمہ مولوی عبدالحق نے اعظم الکلام کے نام سے کیا ہے۔ یہ کتاب ملکہ برطانیہ کا قصیدہ بھی ہے اور اس میں الحادی اجتہادات کا انبار ہے تاکہ دین اسلام کو نہایت لچکدار زمانے کے عین مطابق ثابت کیا جائے۔ سب سے بڑا اجتہاد یہ کیا کہ قرآن کو کلام رسول اللہ ثابت کر دیا۔ اقبال مرحوم اس کتاب سے بہت متاثر تھے۔ خطبہ اجتہاد پر اس کتاب کے بہت اثرات ہیں۔ اقبال مرحوم نے

چراغ علی کا حوالہ اس لیے نہیں دیا کہ ہندوستان میں چراغ علی کے بارے میں کسی کی رائے اچھی نہیں تھی اور اعظم الکلام کی اشاعت کے بعد تمام علماء چراغ علی کے خیالات سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔ خطبہ اجتہاد اور اس کتاب کی روح بنیادی طور پر یکساں ہے، خود نہ بدلو دین کو بدل دو، جو چیز عقل میں نہ آئے وہ اسلام نہیں اسلام عقل ہے اور عقل اسلام ہے، سائنس اسلام ہے اسلام سائنس خطبات میں اس کے سوا کیا ہے؟ اگنی ولیس نے اسلام کو جامد مذہب ثابت کرنے کا فلسفہ اپنے مقالے "محمڈن تھیوریز آف فنانس" میں پیش کیا۔ اس کا جواب خطبہ اجتہاد میں حرکت کے نظریے کے ذریعے دینے کی کوشش کی گئی۔ لہٰذا انھوں نے اگنی ولیس کے نقد کا ارادہ کیا۔ اقبال مرحوم چاہتے تھے کہ مجتہد فی الشرع، مجتہد مستقل اور مجتہد مطلق کا وجود اسلامی معاشرے میں ضروری ہے تا کہ اجتہاد ہو لیکن اس اجتہاد کے لیے جس ٹھوس علمی پس منظر، تقویٰ، عصر سے واقفیت وغیرہ ضروری تھی اس سے وہ دل برداشتہ ہو گئے تھے۔ دنیائے اسلام میں تقلید کے اثر سے رہائی کی تحریکیں امام ابن تیمیہؒ، محمد بن عبدالوہابؒ، عثمان، دان فودیو، شاہ ولی اللہؒ اور شاہ اسماعیلؒ کے ذریعے اٹھیں۔ لیکن اس سے فروغ اجتہاد نہ ہوا بلکہ کچھ نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ اقبال مرحوم کی ان مسائل پر نظر نہ تھی وہ اخلاص کے ساتھ ان تحریکوں کو ایک نئی ساخت دینا چاہتے تھے، لیکن اس دینی بصیرت سے محروم تھے، جو اسلامی علوم میں ضروری تھی۔ مغربی علوم میں ان کی اچھی نظر تھی۔ لہٰذا وہ ان علوم سے شدید متاثر ہو گئے۔ وہ تشکیل دین کے ذریعے اجتہاد کے حامی تھے، مگر اس راستے کی دشواریوں سے آگاہ نہ تھے اور نہ اسلامی تاریخ و فقہ پر ان کی ویسی نظر تھی کہ تشکیل کے مراحل طے کر سکتے۔ یا انھیں بخوبی سمجھ سکتے۔ اجتہاد ۹ویں صدی ہجری تک ہوتا رہا ہے۔ بلکہ اس کے بعد بھی ہو رہا ہے یہ کہنا کہ اجتہاد ختم ہو گیا ہے یہ بھی علوم اسلامی کی تاریخ سے ناواقفیت ہے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ وہ علماء جنھوں نے کہا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے یہ بات علماء کی جانب سے انھی معنوں میں کہی گئی جن معنوں میں اقبال مرحوم نے اجتہاد کی مخالفت کرتے ہوئے جاوید نامہ میں تقلید پر زور دیا۔ اقبال مرحوم یہ بات نہ سمجھ سکے کہ ابن تیمیہؒ و دیگر نے اگر تقلید کی مخالفت کی تو اس کا مقصد ماضی کا انکار، ماخذات دین کی نئی تعبیر و تشریح، فکر اسلامی کی تشکیل نو، ماخذات دین کا انکار نہیں تھا بلکہ ماضی کی طرف بالکل صحیح طریقے سے لوٹنا اور دین کو خالص کر کے عہد رسالت کی بازیافت کرنا تھا۔ اس میں دنیا کی لذتیں، حرص و طمع ترقی، سائنس، ٹیکنالوجی اور خواہش دنیا تو کم از کم شامل نہ تھی لیکن افغانی سر سید عبدہٗ کے نزدیک تقلید کی مخالفت اس لیے ضروری تھی کہ یہ مغربی اقوام سے حاصل ہونے والے منافع میں رکاوٹ پیدا کر رہی تھی تقلید جدید طرز زندگی اس کے سائنسی مظاہر سے بلا روک ٹوک استفادے میں سنگ گراں تھی۔ یہ تقلید اسلام اور مغرب میں واضح فرق محسوس کرتی تھی۔ یہ دارالحرب دارالاسلام کی اصطلاحات میں گفتگو کرتی تھی۔ یہ مغرب سے آنے والی ہر چیز کو مباح نہیں سمجھتی تھی اور اس کا نہایت باریک بینی، نکتہ چینی کے ساتھ جائزہ لیتی تھی۔ اقبال مرحوم کا خطبہ اجتہاد اور ان کے خطبات کیا قرون اولیٰ کے عہد کو تازہ کرنا چاہتے ہیں یا ان کی نظر اسلامی تہذیب و تمدن، ہیت

الحمراء کے محلات، باغات اور اندلس کے کتب خانوں میں ڈھونڈتی ہے اور مغرب کی معمل گاہوں میں وہ روحانیت تلاش کرتے ہیں یعنی سامانزوں تو مادیت پر ہے وہ جن لوگوں کے اجتہاد سے اپنے اجتہاد کا استدلال فرما رہے ہیں مثلاً ابن تیمیہؒ، شاہ ولی اللہ، شاہ اسماعیل شہید ان میں سے کسی ایک کی بھی نگاہ اس دنیا، اور مادہ پرستی پر نہیں تھی۔ یہ مادیت تو ان کے اجتہادات سے خارج رہی۔ ان کی نظر میں تو قرن اول ہی مقصود اور محبوب تھا۔ اقبال مرحوم کے اجتہاد اور ان اکابرین کے اجتہاد میں یہ بنیادی فرق ہے۔ ان کا مرجع سابقون الاولون تھے اور سرسید، مصطفیٰ کمال، عبدہ، افغانی کا مرجع مغرب، سائنس، مادہ پرستی، دنیا، آرام و آسائش، ترقی تھے لہٰذا دونوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اقبال مرحوم یہ فرق بھی نہیں سمجھ سکے تقلید تاتاری یلغار کے بعد امت کو علمی و فکری یلغار سے بچانے کے لیے حصار مہیا کرتی تھی۔ استاذ مرحوم مولانا شبلیؒ کو لوگ معتزلی کہتے ہیں وہ پکے حنفی تھے کئی بار میں نے کریدنے کے لیے تقلید پر اعتراض کیے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ نے جو جوابات دیے وہ حیران کن تھے۔ انھوں نے کہا کہ معتزلہ کی طرف عقلی میلان کے باوجود میرا قلبی اور روحانی میلان احناف کی تقلید کو تسلیم کرتا ہے۔ کیونکہ یہ بند ایک بار ٹوٹ گیا تو کچھ نہیں بچے گا اور اجتہاد کے نام پر الحاد کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے، اس لیے اجتہاد وہی معتبر ہے جو تقلید کے حصار میں رہ کر کیا جائے۔ یہ جو آج کل تقلید کو جمود عقل دشمنی، رجعت پسندی، جہالت کہا جاتا ہے۔ اس میں قصور دونوں کا ہے، یعنی ہمارا طبقہ مولوی جناب علم سے کم بہرہ رکھتا ہے اور دوسری جانب مغرب کو جاننے والے جو صرف مغرب کو جانتے ہیں بلکہ یہ بھی مغرب کو کامل طور پر نہیں جانتے اور انھیں اسلام حقیر نظر آتا ہے۔ اس کے برعکس جلیل القدر علماء آج تعداد میں کم ہیں لیکن وہ اسلام کو مکمل جانتے ہیں۔ سرسید کو دیکھیے کیسی کیسی باتیں لکھتے ہیں۔ لندن کی خادمہ انھیں ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی بیٹی سے بہتر نظر آتی ہے۔ ایسے لوگ اجتہاد کریں گے تو کیا کریں گے۔ مولوی نذیر احمد نے اسی لیے سرسید کی تفسیر پر جو تبصرہ کیا ہے وہ تو کیا ہے ابن الوقت میں سرسید کے بارے میں کیا کچھ نہیں لکھا گیا ہے۔

اقبال پر نطشے، اگسٹس وائٹ ہیڈ، میکنزی، برگساں،
ولیم جیمز، وارڈ، سورلے میکٹیگرٹ کے اثرات:

اقبال مرحوم کے یہاں روحانی وجدان اور سائنس کے ذریعے روحانیت کی منزل حاصل کرنے کا تصور ان تین مغربی فلسفیوں کا فیضان ہے جو کیمبرج میں پڑھاتے تھے۔ وارڈ، سورلے اور میکٹیگرٹ یہ فلسفے کے شعبے سے وابستہ تھے۔ یہ تینوں کائنات کا روحانی زاویہ واضح کرتے تھے ولیم جیمز کی کتاب کے اثرات تو خطبات اقبال مرحوم میں جگہ جگہ محسوس ہوتے ہیں اقبال اس فلسفے کے اثر سے موت بعد از حشر نشر کو حیاتیاتی [Biological] اصطلاحات سمجھتے تھے۔ اقبال نطشے، برگساں انگریز فلسفی، وائٹ ہیڈ اور پروفیسر میکنزی

سے بھی شدید متاثر تھے۔ وائٹ ہیڈ ر کے خطبات گفتگو اور میکنزی کی انٹروڈکشن ٹو سوشل فلاسفی سے متاثر ہو کر اقبال مرحوم نے انسان کامل اور خاص قسم کے پیغمبر کی ضرورت کا فلسفہ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے خیال میں زندگی حاضر کو اتنی ترقی دی جائے کہ یہ دنیا ہمارے بلند ترین عزائم کو پورا کرنے کی جلوہ گاہ بن جائے۔ اقبال کا انسان کامل نطشے، وائٹ ہیڈ، میکنزی کے افکار کا آمیزہ ہے۔ مغرب کے فلاسفہ سے بے حد متاثر تھے۔ اس کی تصدیق کے لیے اسرار خودی انگریزی کا دیباچہ دیکھا جائے جو نکلسن نے لکھا ہے۔ اس کا ایک حصہ اقبال مرحوم کے خیالات پر مشتمل ہے جو اقبال مرحوم نے خود بیان کیے۔ اقبال مرحوم سمجھتے تھے کہ دنیا کی مختلف قوموں کے فلسفے کے خیالات میں بے حد مشابہت ہے۔ مغربی فلسفہ اور اسلام میں بھی اس مشابہت کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ کیوں کہ حق تو ہر جگہ ہے اور دنیا کے ہر فلسفے میں اس کا یکساں طور پر ظہور ہوا ہے۔ وہ اس سلسلے میں ایک کتاب لکھنے کا بھی منصوبہ ذہن میں رکھتے تھے۔ کتابیں تو بہت ان کے ذہن میں تھی جیسے تمہید القرآن Islam as I understand وغیرہ حیرت کی بات یہ تھی وہ خود فلسفے اور لٹریچر کے دلدادہ تھے لیکن مسلمانوں کے لیے دونوں کی تعلیم کو بالکل بے کار سمجھتے تھے اور اس کی مذمت کرتے تھے۔ نکلسن کا دیباچہ مغربی فلسفے سے اقبال کی مرعوبیت کا شہ پارہ ہے۔ صرف ایک جملہ میں وہ بتاتے ہیں Life is an endeavour of freedom۔ یہ خالص مغربی تصور ہے۔ آزادی کے اس کافرانہ تصور کی بنیاد پر ستر ہویں صدی کی تحریک نشاۃ ثانیہ سے برآمد ہوئیں۔ اس سے پہلے کی تاریخ آزادی کے اس ملحدانہ تصور سے یکسر خالی ہے۔ مغرب آزادی کا قائل ہے۔ اسلام اس کی نفی کر کے عبدیت کا اعلان کرتا ہے۔ عبدیت اور آزادی توام نہیں ہو سکتے۔ عبد اور آزاد ہو جائے ممکن نہیں۔ مغرب نے روحانیت سے مادیت کا سفر تیزی سے طے کیا جب اس سے روحانی تشفی نہ ہوئی تو مادی روحانیت کا ذریعہ ایجاد کیا گیا ایک زمانے میں یورپ روحانی انجمنوں سے بھر گیا تھا جگہ جگہ ایسے ادارے انجمنیں تنظیمیں بن گئیں جو روحانیت کا دعویٰ کرتے۔ فرانس اس معاملے میں سب سے آگے تھے۔ یہودیوں نے قبالہ کے نام پر اور عیسائیوں نے روحوں سے کلام کے لیے بے شمار روحانی انجمنیں قائم کی تھیں۔ یہ سب مادی روحانیت کے مظاہر تھے اقبال مرحوم نے ان سے استفادہ کیا اور خطبات کی سطور میں اس روحانیت کو سمو دیا لیکن اسلامی منہاج میں اس کی کیا گنجائش ہو سکتی ہے اقبال مرحوم کو اس کا بخوبی اندازہ تھا اور آخر زمانے میں تو بہت شدت سے ہو رہا تھا جس کا اظہار وقتاً فوقتاً کرتے رہتے تھے خودی اور انائے مطلق، اور برگساں کے فلسفے لفظ بلفظ مغربی فکر و فلسفے کا چربہ تھے نطشے کا ابر ماش جو اقبال مرحوم کا پسندیدہ کردار تھا جس کی جھلک وہ جگہ جگہ دکھاتے رہے مگر اصلاح یہ کیا ہے یہ تو خود ایک خدا ہے جو خود تخلیق کرتا ہے مذہب اور سائنس دونوں کے اہداف کو اقبال مرحوم نے یکساں قرار دیا ہے یعنی حقیقت [Ultimate reality] تک پہنچنا لیکن یہ بات ناقابل یقین ہے سائنس اور مذہب کی تاریخ سے واقف کوئی بھی فرد آزادانہ تنقید کے ذریعے اس موقف کی فاش غلطی کو سمجھ سکتا ہے لیکن اقبال

مرحوم جیسے عبقری نے اس عام سے فلسفے میں سخت ٹھوکر کھائی اور بہت سے لوگوں نے مذہب کی طرح سائنس کو بھی ایمانیات کے طور پر قبول کیا اقبال مرحوم نے خود اعتراف کیا کہ وہ Varieties of Experience اور Moral Values and the Idea of God جیسی کتابوں سے متاثر تھے اور ان سے بہت کچھ اخذ کیا ہے اخذ و استفادے کی یہ روِ مغرب سے مخصوص رہی کاش اقبال مرحوم عربی پر عبور رکھتے اور ہماری امہات کتب سے براہ راست استفادہ کرتے تو مغرب کی یہ کتابیں ان کو ہیچ نظر آتیں۔

خطبۂ اجتہاد اور ماجد صاحب

میرے مشورے سے اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کو خطبۂ اجتہاد اور دیگر خطبات ارسال کیے تھے ماجد صاحب نے نہایت سخت رائے دی انھوں نے اقبال مرحوم کو یہ بھی لکھا کہ علوم اسلامی پر عبور کے بغیر اسلام پر نقد بہت بڑی جسارت ہے آپ عربی زبان سے بھی کماحقہ، واقف نہیں اور صرف ترجموں سے مدد لے کر یا اہل علم کی معاونت سے اسلام کے مسلمات، قرآن و سنت اور تعامل امت سے ثابت شدہ امور حتیٰ کہ عقائد جنت دوزخ کے بارے میں بھی آپ آزادانہ رائے قائم کرتے ہیں قرآن و سنت کو منہاج نہیں بناتے، یہاں تک تو معاملہ ٹھیک ہے کہ آپ تلاش حقیقت میں سرگرداں ہیں لیکن اس تلاش کے دوران تشکک اور ریب کی اس کیفیت میں آپ کی جانب سے ان مہمات مسائل میں اس رائے کا تحریری اظہار سیدھے سادے لفظوں میں کفر ہے۔ یہ ماجد صاحب کا انداز تھا، دین کے معاملے میں وہ مداہنت برداشت نہ کرتے تھے۔ ان کے خط سے اقبال کو شدید ذہنی دھچکہ پہنچا۔ انھوں نے مشورہ دیا تھا کہ آپ کی علمی الجھنیں بجا ہیں لیکن آپ الجھن سوال کی صورت میں جید علماء کے سامنے پیش کیجیے پھر بھی سمجھ میں نہ آئے تو توقف کیجیے اعتراض کا مطلب یہ ہے کہ آپ دین میں تضاد تلاش کر رہے ہیں۔ یہ اسلام کی خدمت نہیں آپ کو اللہ نے دوسری صلاحیتیں دی ہیں اس سے کام لیجیے، فقہ اور اجتہاد آپ کے دائرہ علم سے باہر کی چیزیں ہیں ان امور پر صرف وہ شخص کلام کرے جس نے اپنی عمران معاملات کی تہہ تک پہنچنے میں بسر کردی ہو اور صدر اول سے لے کر آج تک کے تمام فقہی ذخیرے اختلافات ائمہ، اختلافات مجتہدین، پوری اسلامی تاریخ اس کے مختلف ادوار وغیرہ پر اس کی فقیہانہ نظر ہو.......... جس طرح آپ نے مغرب میں جا کر مغربی فکر و فلسفے کی تعلیم حاصل کی بالکل اسی طرح آپ کی یہ اولین ذمہ داری ہے بلکہ ذمہ داری نہیں آپ پر فرض عائد ہوتا ہے کہ آپ علوم اسلامی کی تحصیل بالکل اس طرح اس کے مراکز میں جا کر کریں جب مغربی فلسفے کے لیے مغرب اور جرمنی جاسکتے ہیں تو اسلامی علوم کے لیے اس کے مراکز و مصادر سے رجوع کیوں نہیں کرتے؟ انھوں نے اقبال کو یہ بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ علامہ انور شاہ کشمیری سے علوم اسلامی کی تحصیل کریں پھر خطبات پر نظر ثانی کر کے شائع کریں۔ ماجد صاحب کا خیال تھا کہ اقبال مرحوم کے خطبات میں قرآن کی آیات کی تفسیر تمام اصولوں

سے انحراف پر مبنی ہے، سیاق و سباق کو پیش نظر رکھا نہیں گیا ہے اور مطلوبہ مفاہیم کے لیے دل پسند تشریحات کی ہیں، ان آیات سے غلط مفہومات اخذ کیے ہیں اس کی وجہ علم تفسیر سے آپ کی عدم واقفیت ہے علم تفسیر اور عربی پر عبور کے بغیر قرآن کی دل پسند تشریح آپ کے ایمان کے لیے بھی خطرہ ہے۔ کیوں کہ یہ بند ایک بار ٹوٹ گیا تو کچھ نہیں بچے گا اور اجتہاد کے نام پر الحاد کے دروازے چوپٹ کھل جائیں گے اس لیے تقلید کے حصار میں رہ کر ہی اجتہاد کیا جاسکتا ہے یہ جو آج کل تقلید کو جمود عقل دشمنی رجعت پسندی جہالت کہا جارہا ہے اس میں قصور دونوں کا ہے یعنی ہمارا طبقہ مولوی جو اب علم سے کم بہرہ رکھتا ہے اور دوسری جانب مغرب کو جاننے والے جو صرف مغرب کو جانتے ہیں اور انھیں اسلام حقیر نظر آتا ہے سرسید کو دیکھو کیسی کیسی باتیں لکھتے ہیں لندن کی خادمہ انھیں ہندوستان کے اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی بیٹی سے بہتر نظر آتی ہے ایسے لوگ اجتہاد کریں گے تو کیا کریں گے مولوی نذیر احمد نے اسی لیے سرسید کی تفسیر پر جو تبصرہ کیا ہے ٹھیک تو کیا ہے تبصرہ بہت بے ہودہ ہے، ثقاہت کے خلاف لیکن مولوی صاحب دہلوی تھے اور محاورے، روزمرہ پر عقائد، اکرام، تعظیم سب قربان کردیتے تھے۔ اس کا ثبوت امہات الامہ ہے قرآن کے ترجمے میں زبان کس قدر زکر دری ہے کھڑی بولی اور پڑی بولی سب پر عبور رکھتے تھے، بنیا مزاج سود کو حلال ٹھہراتا ہے قرض سود پر دیتے تھے پیسے گن گن کر رکھتے تھے۔ مولوی بھی کہلاتے تھے ان کی وجہ سے بے چارے مولوی بہت بدنام ہوئے، پہلے صرف بنیے یا پٹھان سود خوری کے لیے مشہور تھے، ڈپٹی صاحب نے مولوی پر بھی سود خوری کا الزام ثابت کردیا، لیکن ابن الوقت میں جو کچھ لکھا ہے بلفظ بلفظ سچ لکھا ہے۔

اقبال مرحوم جدید علم کلام اور کسی مجتہد کی ضرورت کے قائل تھے لیکن خود ان صفات سے متصف نہ تھے انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ کام ان کے تو کیا اور کسی کے بس کا بھی نہیں ہے لہٰذا وہ اجتماعی اجتہاد کی ضرورت کے بھی قائل ہوگئے تھے لیکن افسوس کہ اسمبلی اور پارلیمنٹ انھیں اس کی علامتیں نظر آئیں ترکی کی اسمبلی کی روداد کو دیکھ کر کے اقبال مرحوم کا اسے اجتہاد قرار دینا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ مغرب کے فلسفے کا ان پر بے حد اثر تھا اور وہ اسلامی علوم و فنون پر اس درجہ انحصار نہیں کرتے تھے جس طرح مغرب کے فلسفہ و علم پر وہ ترکوں کے الحاد کو اجتہاد کا ہم معنی سمجھتے تھے اور اسے بڑا کارنامہ قرار دیتے تھے اس موضوع پر ان سے بہت تندو تلخ تبادلہ خیالات بھی ہوا اور آخر میں وہ اس سے رجوع کرچکے تھے لیکن اس رجوع کا اظہار تحریری طور پر کرنے کی مہلت نہ ملی۔ اگرچہ دلیس کی تردید اور ترکی کے مسلم جدیدیت پسندوں کے انکار کی حمایت میں وہ لکھنا چاہتے تھے یا لکھ چکے تھے کیوں کہ اقبال مرحوم کے ذہن میں بہت طویل مدت سے یہ معاملات موجود تھے اور ممکن ہے انھوں نے بہت کچھ لکھ رکھا ہو بہر حال اقبال مرحوم ان مباحث پر مجھ ہیچ مداں کی رائے کے طالب ہوئے، ان مباحث پر خط و کتابت و تبادلہ افکار کا سلسلہ شروع ہوگیا جو ان کے انتقال تک جاری رہا مغربی فکر و فلسفے سے مجھے زیادہ شغف نہ تھا۔ یہ الگ میدان

ہے۔ لہٰذا یہ طے پایا کہ اس بارے میں ماجد صاحب سے بھی رجوع کریں۔ ماجد صاحب مغربی فلسفے پر اچھی نظر رکھتے تھے اقبال مرحوم اجتہاد والے مقالے کو جو انہیں ۱۹۲۵ء میں کہیں پڑھنا چاہتے تھے میرا خیال تھا کہ انھیں توقف کرنا چاہیے تاکہ اس کے مزید پہلوؤں پر سوچ بچار ہو سکے۔ مسلم الہیات اور جدید فکر کے مابین اقبال مرحوم کو جو تفاوت نظر آتا تھا اس پر وہ رنجیدہ تھے ان کی کوشش تھی کہ وہ اس خلیج کو پاٹ دیں وہ مغرب کو اسلامی فکر کی توسیع سمجھتے تھے اور مغرب کی جدید سائنس سے بہت متاثر تھے اس میں مسلمانوں کے عروج و طاقت کے امکانات محسوس کرتے تھے۔ امام غزالیؒ سے سخت نالاں تھے اور سمجھتے تھے کہ غزالی اور قدیم متکلمین اور فقہا نے فلسفے کی مذمت کر کے مسلمانوں پر ترقی ارتقاء اور سائنسی انقلاب کے دروازے بند کر دیے ہیں۔ اگر یہ فقہاء اور خصوصاً امام غزالیؒ پیدا نہ ہوتے اور عالم اسلام میں فلسفے کی موت واقع نہ ہوتی تو مسلمانوں پر زوال نہ آتا لیکن ان کے پاس اس سوال کا جواب نہ تھا کہ رسول اللہؐ اور صحابہ کرام کے پاس تو کوئی فلسفہ نہ تھا لیکن قیصر و کسریٰ کیسے فتح ہو گئے تھے لیکن اقبال مرحوم کا خیال تھا کہ فلسفے کے بغیر سائنس میں آگے بڑھنا مشکل ہے اور سائنس کے بغیر مغرب پر فتح پانا ممکن نہیں ہے۔ مادی اسباب ان کے یہاں اہم تھے۔ وہ مغرب کی تمام تر ترقی کو اسلام کا ہی اثاثہ سمجھتے تھے جو بہت بڑی غلط فہمی تھی اور رفتہ رفتہ یہ غلط فہمی دور ہو گئی تھی ان سے بار بار یہ پوچھتا تھا کہ اگر قرآن نے تفکر و تدبر و تعقل کی دعوت دے کر تجربیت، حواس کے استعمال کے ذریعے مغرب کی اس ترقی کو ممکن بنایا اور رسول اللہ کی آمد سے ہی مغرب مغرب ہو گیا اور اسلام نے ہی تجربیت Impresicim، عقلیت Rationality ترقی [Development]، ارتقا [Progress] کا درس دیا اور قرآن سنت و خلافت راشدہ کا عہد ہی لیے زریں دور تھا۔ خود عہد اسلامی میں سائنس کا وہ ارتقاء کیوں نہ ہوا جو مغرب میں ممکن ہوا۔ کیا کسی پیغمبر نے ایجادات سے انقلاب برپا کیا یا دعوت سے اور دعوت بھی ازل سے ابد تک ایک ہی رہی تھی تو حیرت کی بات ہے۔ اگر سائنس ترقی کی اصل اساس ہے تو انبیاء کم از کم سائنس داں تو ہوتے اور انسانیت کے لیے کچھ ایجادات تو کرتے لیکن تاریخ اس تصور سے خالی ہے۔ سب سے مشکل کام انسان کو بدلنا اسے تیار کرنا ہے۔ انبیاء مشکل ترین کام کے لیے مبعوث کیے جاتے ہیں۔ اقبال مرحوم اتفاق کرتے تھے، ان سے کسی نے یہ بھی استفسار کیا کہ کیا مغربی سائنسی ترقی کو بیرونی علاقوں کی لوٹ مار، کالونیل ازم، افریقی غلاموں سے بیگار کے بغیر ممکن بنایا جا سکتا تھا؟ اقبال مرحوم نے اس پہلو سے مغرب کا مطالعہ بھی نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ لوٹ کے مال، افریقی غلاموں سے بیگار کے بغیر سائنسی انقلاب برپا ہونا ممکن نہ تھا۔ کیا خلافت اسلامیہ یہ کام کر سکتی تھی؟ اندلس کی ریاست نے یورپ میں لوٹ مار کے ذریعے سائنس اور عیش و عشرت کی ثقافت تعمیر کی، مناظر گیلانی صاحب نے اس موضوع پر معارف میں مضامین لکھے ہیں جس میں بتایا ہے کہ کس طرح لوٹ مار کی جاتی تھی۔ لوٹ کے مال سے اسپین کی سائنسی ترقی ہوئی، انجام کیا ہوا؟ آج وہاں کوئی مسلمان باقی نہیں رہا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ جب مسلمانوں کے سامنے عادشمود اہرام

مصر موجود تھے تو مسلمان قرآنی تجربیت کے ذریعے ان جیسی عمارتیں چودہ صدیوں میں کیوں نہ بنا سکے۔ یعنی ان میں نقل کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی۔ اس طرح پوری امت ایک ناکام امت ٹھہرتی ہے۔ سائنسی ترقی کے اس فلسفے کے نتیجے میں رسول اللہ پر زد پڑتی ہے کہ نعوذباللہ اس پیغمبر کے زمانے میں تو کچھ نہ تھا۔ رسول اللہ کا گھر، مسجد نبوی، مدینۃ النبی کے گھر عاد و ثمود و اہرام مصر کا عشر عشیر بھی نہ تھے۔ لہٰذا عہد رسالت سائنسی نقطۂ نظر سے دنیا کا ناکام ترین معاشرہ تھا۔ جو ماضی کے علوم و فنون کا احیاء کرنے سے قاصر رہا اور چٹائی، چھپر، ٹاٹ، جھونپڑی کی ثقافت سے اوپر نہ اٹھ سکا۔ کیا کسی معاشرے کی کامیابی اور ناکامی کا پیمانہ صرف مادی پیمانے سائنسی ترقی اور عروج ہے۔ اقبال مرحوم سے میں نے یہ بھی پوچھا کہ اگر مغرب کی ترقی اسلام اور قرآن سے ممکن ہوئی تو روم، ایران، مصر، چین، یونان، موئن جو دڑو اور ہزاروں مدفون تہذیبوں کی ترقیوں کو آپ کس پیغمبر اور کس کتاب سے منسوب کریں گے اقبال مرحوم کے پاس ان سوالوں کے جواب میں گہری خاموشی تھی کہتے تھے کہ بات اہم ہے غور کی ضرورت ہے اندلس ان کے یہاں اسلام کا استعارہ تھا بار بار پوچھا کہ اندلس جس پر آپ کو بہت ناز ہے اور جس کا نوحہ آپ نے درد سے لکھا ہے کیوں مٹ گیا اس کی وجہ سائنس اور دنیا میں حد سے زیادہ استغراق تو نہیں تھا اور وہ جدیدیت تو نہیں کہ وہاں نماز بھی مقامی زبان میں پڑھائی جانے لگی تھی۔ نہ اندلس رہا نہ نمازی رہے، نہ مساجد رہیں اسلامی عبادات میں مقامیت ہونے کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اس معاشرے کی روحانیت کیا تھی کہ مسلمان اقلیت میں رہے تو ابن حزم کے حوالے سے کہتے تھے کہ وہاں مسلمانوں کی آبادی کی قلت مسئلہ بن گئی تھی۔

مدینہ کی جگہ اندلس نے لے لی:

انھیں اس بات کا قلق تھا کہ جدید مسلمان مدینہ کا ذکر اس والہانہ طریقے سے نہیں کرتے جس طریقے سے اندلس کا ذکر کرتے ہیں اور اندلس ایک آئیڈیل کے طور پر دیکھا جا رہا ہے جو ہماری روحانی پستی اور فکری زوال کا سبب ہے ان کے خیال میں مسلمان کا والہانہ لگاؤ اندلس سے نہیں مدینۃ النبی سے ہونا چاہیے اندلس کا تنا فخر بہت سے سوالات پیدا کرتا ہے کہ کیا سائنس اور ترقی مذہب و دیانت کا تحفظ کر سکتے ہیں۔ کیا صرف سائنسی و معاشی برتری بقاء و غلبے کے لیے کافی ہے۔ کیا غلبہ صرف مادی ارتقاء مادی شان و شوکت کا نام ہے؟ اندلس میں تو ابن عربیؒ جیسے صوفی بھی موجود تھے لیکن اندلس بچ نہیں سکا المقری نے اندلس والوں کے شاہانہ ٹھاٹ باٹ کا ذکر کیا ہے قصر زہرہ پر کتنا خرچ ہوتا تھا، یہ لوٹ مار کا پیسہ کہاں سے آتا تھا؟ کیا اس کا نام ترقی ہے؟ اسلام تو اس کے لیے نہیں آیا۔ کیا اسی لیے اندلس مٹا دیا گیا؟ اگر سائنس اور معاشی ترقی تحفظ کے ضامن ہیں تو اندلس، یونان، مصر کے فرعون، چینی تمدن، عاد و ثمود و سبا کیوں تباہ ہوئے تباہ کرنے والے تو سائنس و ٹیکنالوجی میں شان سے آگے تھے نہ ان کے ہم پلہ تھے اقبال مرحوم نے مجھ سے ایک مرتبہ خود کہا کہ کبھی کبھی اپنی شاعری کا جائزہ لیتا ہوں تو یہ سوال

پریشان کرویتا ہے کہ مسلمانوں نے جب قیصروکسریٰ کو فتح کیا تو ان کے پاس ایک کتاب بھی نہیں تھی ڈھنگ کی کوئی عمارت بھی نہیں تھی ان سے اچھے گھروں میں تو ہم رہتے ہیں۔ اس لیے نظریے کی اہمیت بہت زیادہ ہے ایک طاقت ور نظریہ سائنس اور اسباب دنیا سے زیادہ قوت رکھتا ہے خصوصاً وہ نظریہ جو اسباب کے بجائے مسبب الاسباب پر یقین رکھتا ہو اس یقین نے ہر دور میں دنیا بدل ڈالی ہے۔ مسلمانوں کا زوال اس یقین سے محرومی کے باعث ہوا۔ یقین طاقت ور ہو تو تاتاریوں سے شکست کا انتقام انھیں مسلمان کر کے لیا جاسکتا ہے۔ عروج کا واحد طریقہ صرف جنگ، جدال، سائنسی ترقی نہیں ہے۔ خصوصاً اس وقت جب ترقی کے لیے مطلوب شے کسی اور کی ملکیت ہو اور اس غیر کی مرضی کے بغیر ہمیں مل نہ سکتی ہو۔ مسلمانوں نے تاتاریوں کو عسکری شکست تو نہیں دی ان کو یقین دعوت اور تہذیب سے شکست دی۔ کیا وجہ ہے کہ ہم مغرب کو ان ہتھیاروں سے شکست دینا ممکن سمجھتے ہیں جو لیکن مغرب کے ہتھیار ان سے خرید کر یا اس کا علم ان سے سیکھ کر ان ہتھیاروں سے ہی مغرب کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ نظریہ کتنا کمزور ہے۔ کیا مغرب آپ کو اپنے سائنسی علوم غلبے کے لیے دے دے گا؟ ظاہر ہے ایسا ممکن نہیں۔ لہٰذا آپ کا عروج ارتقاء مشروط ہو گیا۔ مغربی علوم سے جب تک مغرب وہ علوم نہ دے آپ پسماندہ رہیں گے اسلام خارج کا محتاج ہو گیا۔ لہٰذا اقبال مرحوم کے اس فکر کے نتیجے میں عالم اسلام کا مقصد مطمح نظر ہدف صرف اور صرف مادیت رہ گیا۔ انقلاب اسلامی ایک روحانی انقلاب ہے لیکن یہ مادی ذرائع کے بغیر برپا نہیں ہو سکتا۔ کتنی عجیب بات ہے۔

اقبال مرحوم اور عربی زبان:

اقبال مرحوم نے بتایا تھا کہ وہ بعض مقامی علماء سے عربی کتب کا متن پڑھا کرتے ہیں پھر وہ علماء ان عبارتوں کا ترجمہ و تشریح کر دیتے ہیں، پھر اقبال مرحوم ان کی سماعت کے بعد سوالات در سوالات کے ذریعے ان مباحث و مسائل کو سمجھنے کی سعی فرماتے ہیں، لیکن ان علماء کا مغربی فلسفے سے کوئی تعلق نہیں تھا اور وہ اقبال مرحوم کے فلسفیانہ سوالات کے تسلی بخش جوابات دینے کی اہلیت بھی نہ رکھتے تھے۔ کیونکہ وہ فلسفیانہ مباحث سے واقف نہ تھے۔ لاہور کے ایک عالم مولانا غلام مرشد سے بھی ان کے استفادے کی اطلاع ملی تھی۔ مگر مرشد صاحب خود مغرب سے شدید طور پر متاثر ہیں۔ ان کے بعض بیانات اور درس کی تفصیلات بہت افسوس ناک ہیں۔ لاہور کے علمی حلقوں میں ان کی شہرت بھی بہت اچھی نہیں تھی۔ ماجد صاحب کی تنقید کے بعد اقبال مرحوم نے خطبات کا ارادہ ترک کر دیا تھا انھیں احساس ہو گیا کہ یہ مباحث اس قدر سادہ نہیں کہ انھیں امہات کتب کے تراجم کی سماعت کے ذریعے طے کر دیا جائے۔ غالباً کسی بیان میں اقبال مرحوم نے یہ کہا ہے کہ میں **Islam as I understant it** کے نام سے کتاب لکھ رہا ہوں وہ تمہید القرآن کے نام سے تعارف قرآن لکھنے کا ارادہ بھی رکھتے تھے لیکن اس کا

سراغ نہیں ملا۔ میرے خیال میں خطبات اقبال مرحوم کا نام اگر تبدیل کر دیا جائے بلکہ خطبات اقبال مرحوم کا بہترین نام میری نظر میں Islam as I understand it ہونا چاہیے کیونکہ خطبات میں صرف وہی کچھ پیش کیا گیا ہے جو اقبال مرحوم سمجھتے تھے، خود اسلام کو علوم اسلامی علماء اسلام اور تعامل امت کے ذریعے سمجھنے کی روایت اقبال مرحوم نے ترک کر دی لہٰذا قدم قدم پر ٹھوکر کھائی، اسلام کو ذات رسالت مآب اور صحابہ کرام کی سیرت اور اجماع امت کے بغیر محض اپنی خودی اور عقل کے بل پر سمجھنا ممکن ہی نہیں ہے۔ ماجد صاحب کے خط نے اقبال مرحوم کی ہمت شکستہ کر دی تھی، انھوں نے اس تنقید کی روشنی میں خطبہ میں بہت سی ترامیم کیں تغیرات کیے نظر ثانی کا یہ سلسلہ کئی مہینوں تک چلا، لیکن ماجد صاحب کی خواہش کے باوجود اقبال مرحوم نے انھیں نظر ثانی شدہ مسودہ ارسال نہیں کیا، انھیں خدشہ تھا کہ ماجد صاحب اس سے بھی مطمئن نہ ہوں گے۔ مجھے یہ مسودہ ارسال کیا گیا تھا۔ اس پر میرے کچھ تحفظات تھے اور تنقید بھی، اقبال مرحوم کو قلق تھا کہ علماء نے ان کے خطبات کا خیر مقدم نہیں کیا۔ وہ علماء کی طاقت سے بخوبی واقف تھے اور تنہا ان سے مقابلہ کی سکت نہ پاتے تھے، انھیں ملال تھا کہ سرسید نے علماء کا جو اثر کم کر دیا تھا وہ خلافت کمیٹی کی سیاست کے باعث دوبارہ بحال ہو گیا ہے اور اسی اثر سے وہ خائف تھے، ماجد صاحب کی تنقید نے اقبال مرحوم کو بہت محتاط بنا دیا تھا۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص احسان ہے ورنہ اقبال مرحوم جیسے قیمتی شخص کے قلم سے دشمنان اسلام کو بہت مہمیز مل سکتی تھی۔

علامہ کے مقالے اجتہاد پر ماجد صاحب اور بے شمار لوگوں نے اپنے اپنے طریقے سے نقد کیا، اگر اقبال مرحوم اس نقد کو قبول کر لیتے تو ان کا پورا خطبہ یکسر بدل جاتا، جن اکابر علماء نے اس خطبے پر نقد کیا ان کے خطوط کبھی شائع نہیں کیے گئے، شاید ابھی تک ماجد صاحب کا خط بھی شائع نہیں ہوا۔ اقبال مرحوم کے انتقال کے بعد ان کے ورثاء نے بھی اس کی اشاعت کا اہتمام نہیں کیا ورنہ بہت عمدہ مباحث سامنے آتے، اجتہاد پر اقبال مرحوم کا خطبہ جو شائع ہو چکا ہے۔ پہلے متن سے بہت مختلف ہے اس میں بھی انحرافات کے بہت پہلو ہیں لیکن پہلا متن تو بے حد غلط سلط تھا۔ علماء کی تنقید سے اقبال مرحوم نے یہ بات سمجھی۔ دینی مسائل میں ان کی دخل اندازی ان کے بس کی بات نہیں، لہٰذا وہ شاعری کریں اور ان امور تک محدود رہیں جن پر انھیں عبور حاصل ہو ورنہ دین چیستاں بن جائے گا۔ صرف دین کی خدمت کا ارادہ کافی نہیں ہے، اس کے لیے مطلوبہ اہلیت بھی ضروری ہے۔ اخلاص اور علم دو الگ راستے ہیں دونوں مل جائیں تو بڑی برکت ہو سکتی ہے لیکن صرف اخلاص سے علم کی کمی پوری نہیں ہو سکتی۔

عہد حاضر میں اجتہاد کی شرائط:

عہد حاضر میں اجتہاد پہلے کی نسبت زیادہ مشکل ہے کیونکہ اب ہمارا سامنا ایک ایسے فلسفے سے ہے جو

یونانی فلسفے کی طرح مغلوب نہیں بلکہ دنیا میں غالب ہے۔ اس فلسفے نے علوم نقلیہ کا انکار کر دیا ہے اور عقل کو واحد ماخذ علم تسلیم کیا ہے۔ یہ فلسفہ مابعد الطبیعیات سے واقفیت کے لیے طبیعیات کو بے اثر پاتا ہے اور حقیقت تک عقل کے ذریعے پہنچنا چاہتا ہے۔ جب کہ یونانی عقل کے ذریعے یہ ہفت خواں سر نہ کر سکے لہٰذا اب جو مجتہد ہو وہ صرف علوم اسلامی سے ہی واقف نہ ہو بلکہ اسے مغربی فلسفے اور جدید سائنس کے مباحث سے بھی کما حقہ واقفیت ہو اس کے بغیر اجتہاد کرنا محال ہوگا، کیونکہ جدید مغرب نے جو سوالات پیدا کیے ہیں ان کا محرک ایجادات ہیں ایجادات کا محرک سرمایہ، خواہش نفس، برتری، غلبہ اور انسان کے خدا ہونے کا دعویٰ ہے لہٰذا جدید مسائل کا فقہی جواب اس وقت تک نہیں دیا جا سکتا جب تک کہ علوم نقلیہ کے ساتھ ساتھ علوم عقلیہ و عاضرہ پر ہماری نظر نہ ہو۔ مثلاً آج کل نیا رجحان جائیداد کی خرید و فروخت ہے، لوگ دو کانیں خرید کر رکھ لیتے ہیں، منڈی میں جب طلب بڑھتی ہے تو قیمتیں بڑھا کر بیچ دیتے ہیں اس کے نتیجے میں مکان جو بنیادی ضرورت ہے، اس قدر گراں ہو گیا ہے کہ عام آدمی مکان خریدنے کا تصور نہیں کر سکتا یہ بھی احتکار کی شکل ہے جس طرح گندم وغیرہ روک لینا اور پھر مہنگا بیچ دینا جرم ہے تو اس سے زیادہ سنگین جرم میری نظر میں یہ کام ہے یورپ وغیرہ میں تو اب مکان خریدنا لوگوں کے لیے ممکن نہیں، کچھ عرصے بعد یہی صورت حال پاکستان میں ہوگی۔ یہ کیپٹل ازم کا نتیجہ ہے اب اگر ہمارے مولوی صاحبان سے کوئی فتویٰ لے تو نہایت سادگی سے فتویٰ دے دیں گے کہ جائز ہے۔ یہ سوچے سمجھے بغیر کہ لوگوں کو بنیادی ضرورت سے محروم کرنے والا کاروبار کیسے حلال ہو سکتا ہے۔ حسب ضرورت جائیداد رکھنا تو ٹھیک ہے لیکن اسے کاروبار بنا لینا اور ایسا کاروبار کہ عام آدمی کے لیے مکان خریدنا محال ہو جائے شریعت میں جائز نہیں۔ یہ مسئلہ عصر حاضر کا ہے لہٰذا کیپٹل ازم سے ناواقف علماء یقیناً اس کے جواز کا فتویٰ دیں گے اس لیے یہ ہیچ مداں کہتا ہے کہ علوم عقلیہ حاضرہ پر بھی مجتہد کی گہری نظر ہو۔ وہ اس عہد کی باریکیوں سے بخوبی واقف ہو۔ اقبال مرحوم کا المیہ یہ تھا کہ وہ علوم حاضرہ سے واقف تھے لیکن علوم قدیم اور علوم نقلیہ سے سراسر ناواقف اس کا ثبوت خطبات میں قرآنی آیات سے غلط استنباط ہے۔ خطبات میں نوے فی صد آیات کھینچ تان کر سیاق و سباق سے کاٹ کر مطالب اخذ کیے گئے ہیں۔ علمائے کرام کا المیہ ہے کہ وہ دینی علوم سے بخوبی واقف اور فلسفہ مغرب و سائنس سے قطعاً ناواقف ہیں۔ ندوہ بتایا گیا تھا کہ فلسفہ سائنس پڑھایا جائے گا، شاہ سلیمان پھلواری کا خطبہ وضاحت کرتا ہے جو ندوہ کی تاسیس میں پڑھا گیا تھا لیکن عملاً کچھ نہیں ہوا لہٰذا علماء اور جدیدیت پسند مفکرین کی حالت یکساں ہے جو صرف ایک دنیا سے واقف ہیں دوسری سے ناواقف جس طرح علما جدید دنیا کے معاملے میں جہل کا شکار تھے اقبال مرحوم دینی علوم کے معاملے میں جہل سے قریب تھے۔ دونوں دنیا کو ایک آنکھ سے دیکھ رہے تھے۔ ندوۃ العلماء میں مغربی فلسفہ و سائنس نہیں پڑھایا جا سکا تو باقی دینی مدارس سے کیا شکایت عالم عرب میں بھی یہی حال ہے۔ فلسفہ و سائنس الہامی مذہب کا اصل مد مقابل ہے، اسے ہم عقلی مذہب کہہ سکتے ہیں لہٰذا اس مد مقابل مذہب سے واقفیت کے بغیر جدید مسائل کے حل میں

اجتہاد اگر کیا گیا تو وہ الحاد کے دائرے میں اضافے کا سبب بنے گا اس سے مسلمانوں کا اور اسلام کو فائدہ پہنچنا مشکل ہے لہٰذا ان حالات میں قدیم فقہا کا عاقلانہ نقطۂ نظر صادق آیا کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ معاشرہ اور علماء جب وہ صلاحیتیں پیدا کرنے کے لیے تیار نہیں جو اجتہاد کی لازمی شرائط ہیں تو ان کا خاموش رہنا بہتر ہے کیونکہ لوگ اگر کسی چیز کا اختیار کریں گے تو دل میں شک اور وسوسہ بہرحال رہے گا کیونکہ اس عمل کی دینی توثیق و تائید تو نہیں کی یہ کھٹک اور چبھن ایمان کی سلامتی کے لیے ضروری ہے کیونکہ دل کا مفتی مطمئن ہو جائے گا تو یہ چبھن خود ہی ختم ہو جاتی ہے اگر علماء نے مغرب کو جانے بغیر محض چند باتوں کے ذریعے جزئیات پر فتویٰ دیا اور کلیات سے تعرض نہ کیا تو الحاد کو اجتہاد کے دائرے میں پناہ ملے گی جس سے حلت و حرمت کے پیمانے بدل جائیں گے اور الحاد کو اسلامی حصار میسر آ جائے گا۔ یہ خطرناک ترین صورت ہوگی فی الحال تو مجھے ایسا عالم نظر نہیں آتا جو اجتہاد کا اہل ہو کیونکہ مغرب سے واقف علماء آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں، چند علماء نے انگریزی سیکھ لی ہے لیکن انگریزی سیکھنا اور فلسفہ جاننا دو مختلف دنیاؤں کا سفر ہے۔ ہمارے علماء کو جرمن اور فرانسیسی زبان سیکھنی چاہیے، فلسفے کے تمام امام ان زبانوں میں ملیں گے، انگریزی ترجموں کے ذریعے بھی فلسفہ پڑھا جا سکتا ہے لیکن مجھے اس میں شک رہے گا کہ اصل متن کیا تھا؟ مسلم فلاسفہ پر اس سلسلے میں مغرب نے نقد کیا ہے کہ وہ جن افکار کو افلاطون سے منسوب کر رہے تھے وہ فلاطینوس کے تھے، ان کا اعتراض ہے کہ عرب افلاطون کے افکار ارسطو کے نام سے بیان کر رہے تھے۔ کیونکہ فلسفہ یونان ترجمے کے ذریعے سیکھا گیا لہٰذا یہ غلطی ہوئی ہوگی لہٰذا فلسفہ کو اس کی اصل زبان میں پڑھنا ضروری ہے استاد مرحوم مولانا شبلی آخر عمر میں فرماتے تھے کہ صرف انگریزی سے کام نہیں چلے گا۔ علماء کو کم از کم دو یورپی زبانیں سیکھنا ہوں گی تاکہ فلسفہ کے ماخذات کا براہ راست مطالعہ کر سکیں۔ ندوہ میں انگریزی پڑھائی گئی لیکن یورپی زبانوں کی تدریس کا خیال کسی کو نہیں آیا۔

اقبال مرحوم نے خطبات کا نام Re-Construction رکھا، مجھے اس پر بھی اعتراض تھا، تعمیر نو یا تشکیل نو کا کیا مطلب؟ کیا عمارت منہدم ہو گئی۔ تشکیل نو کا مطلب دین کی از سر نو تعمیر کے سوا کیا ہے یعنی اسلام کی اصل شکل مسخ ہو گئی اب اسے از سر نو تعمیر کیا جائے۔ یہ دعویٰ پوری اسلامی تاریخ کو مسترد کرنے کے سوا کیا ہے؟ ان امور میں اقبال مرحوم مغرب سے اس قدر متاثر ہیں کہ اسلامی دنیا کو تیزی سے روحانی طور پر مغرب کی طرف بڑھتا ہوا دیکھتے ہیں۔ اس پیش رفت کی تحسین فرماتے ہیں، اس کی دلیل یہ دیتے ہیں کہ فکری سطح پر یورپ کی تہذیب اسلامی ثقافت کی توسیع شدہ ترقی یافتہ شکل ہے، وسعت کے امکانات اسلام کے بیج میں تھے، لیکن درخت مغرب میں نکل آیا یہ عجیب تضاد ہے، افغانی سے اقبال مرحوم تک اسلام میں لوتھری ضرورت کا اثبات یہ ثابت کرتا ہے کہ سر سید افغانی، ابوالکلام، اقبال مرحوم وغیرہ اسلام کو Protestanzie کرنے کے حامی تھے۔ ورنہ اسلام کی تعمیر نو

کی بات عجیب بات ہے۔ اسی بات کو کبھی عقلیت پسندی، کبھی تجدید مذہب کا نام بھی دیا گیا ہے اور کبھی اس کی مذمت بھی کی گئی ہے۔ وہ لوتھر کی تحریک اصلاح کے منفی مضمرات کے قائل تھے حالانکہ پروٹسٹنٹ ازم نے جس قسم کی اباحیت کو جنم دیا، علماء اور فقہاء کی حیثیت کا جس طرح خاتمہ کیا، سرمایہ دارانہ نظم و تنظیم کے نظام کا جو فرض ادا کیا چرچ آف انگلینڈ کی صورت میں غیر اخلاقی طرز زندگی کو مذہبی جواز مہیا کرنے کا جو کام کیا اقبال مرحوم اس سے صرف نظر کرتے ہیں یعنی وہ مغرب کی صنعتی ترقی، مذہبی انحطاط وغیرہ کی تاریخ پر بھی بہت گہری نظر نہیں رکھتے تھے۔ استعماریت کی تاریخ، کالونیل ازم کی تاریخ، بر اعظموں میں یورپی لوٹ مار، ہندوستان چین کی دولت لوٹنے کی تاریخ بر اعظم امریکہ پر قبضہ افریقہ میں سونے کی کانوں پر قبضہ افریقی غلاموں سے صنعت میں بیگار ان مباحث کے بغیر مغرب کو سمجھنا مشکل ہے۔ اقبال مرحوم مغرب کی ترقی کو ان تمام مباحث سے کاٹ کر غیر اقداری [Valu Nutral] سمجھ کر اس کو اسلامی منہاج میں داخل کرنا چاہتے ہیں تاکہ مسلمان استخلاف فی الارض کے حقدار بن جائیں۔ لیکن کیا استخلاف فی الارض صرف سائنس و ٹیکنالوجی اور ترقی سے ملتا ہے کم از کم قدیم صحف سماوی اور قرآن حکیم اور انبیاء کے باب ہمیں ایسی رہنمائی نہیں دیتے۔ اقبال مرحوم نے خود اس نکتے پر غور کیا تھا اور مجھ سے استفسار کیا تھا کہ قرآن حکیم اور تاریخ انسانی کی روشنی میں یہ بات واضح ہو رہی ہے کہ جدید لوگوں کے یہ دعاوی کہ طاقت کا جواب طاقت، علم کا جواب علم، سائنس کا جواب سائنس اور ٹیکنالوجی کا جواب ٹیکنالوجی سے ہی دیا جا سکتا ہے۔ ایک باطل دعویٰ ہے اور سراسر مادیت پرستی کے مظاہر کی پرستش کا نام ہے۔ اگر یہ دعویٰ اور فلسفہ حق ہوتا تو قوم لوط عاد و ثمود اصحاب الرس، قوم سباء کو مٹانے والوں کے پاس اسی درجے کی سائنس و ٹیکنالوجی صنعت و حرفت ہوتی۔ حضرت موسیٰ کے پاس تو فرعون کے زمانے کی سائنس و ٹیکنالوجی نہ تھی، مگر مصر تسخیر ہو گیا، قیصر و کسریٰ جب فتح ہوئے تو مسلمانوں کے پاس مسجد نبوی بھی کھجور کے تنوں اور چٹائیوں پر کھڑی تھی لہٰذا طاقت کا اصل سرچشمہ علم، سائنس و ٹیکنالوجی نہیں وہ صحیح عقیدہ ہے جو روح کے اندر سما جائے اور خالق ارض و سماء کی قوت پا سے وہ یقین حاصل ہو جو ایمان فتح کرنے والوں کو تھا جب حضرت عمرؓ نے فرمایا تھا کہ تم مغلوب صرف گناہ کی وجہ سے ہو سکتے ہو، گناہ گار کبھی غالب نہیں آ سکتا، یہ یقین اس درجے کا ہو جو حضرت ابوبکر کو حاصل تھا جب فتنہ ارتداد کے مقابلے کا اعلان کیا، فرمایا جو اونٹ کی رسی دینے سے بھی انکار کرے گا اس سے بھی جنگ کروں گا، ان کا یقین یہ تھا کہ کوئی باقی رہے یا نہ رہے حق کو باقی رہنا چاہیے، اس یقین کا نتیجہ دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ورنہ عقلی و استدلالی طور پر صحابہؓ کا آپ کو مرتدین سے جدال پر توقف کا موقف بظاہر غلط نہ تھا لیکن اللہ والے دل کی آنکھ سے حقیقت کو دیکھتے ہیں انھیں حقیقت دکھا دی جاتی ہے۔

امام غزالیؒ نے اجتہاد کو علم قرار دیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اس کا مقصود کسی قانونی مسئلے پر آزادانہ رائے

قائم کر سکا قرار دیا ہے۔ المستصفیٰ میں اجتہاد کی جامع تعریف بیان کی گئی ہے۔ اجتہاد کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تقلید ترک کر دی جائے۔ فقہی مذہب چھوڑ دیا جائے۔ تحقیق کے نام پر انتحاد امت کی بات کی جائے۔ اجتہاد کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہر عہد میں تقلید کو ممکن بنا سکے اور کتاب و سنت کو اس ضمن میں مرکزی مقام حاصل ہو کیونکہ تقلید بھی دین کے ماخذات سے اصول اخذ کرتی ہے اور عدم تقلید بھی ماخذات دین کا انکار نہیں کرتی۔ جمہور کے اصول تو یکساں ہیں فروعات میں اختلافات ہیں۔ تلفیق کے بغیر بھی آخر یہ امت اجماع پر قائم ہوئی یا نہیں۔ اہل حدیث آج بھی حنبلیوں کے ساتھ موانست رکھتے ہیں۔ کیا حنبلی مقلد نہیں ہیں اور اہل حدیث غیر مقلد لیکن رشتہ محبت تو قائم ہے، تقلید اور عدم تقلید میں۔ اس امت میں اجتہاد ہوتا رہا ہے، اس کا دروازہ حکمت کے تحت بند کر دینے کے بعد بھی کبھی بند نہیں ہوا۔ آخر ہمارے زمانے میں مفقود الخبر شوہر اور عورت کے مرتد ہو جانے پر نکاح ٹوٹنے کا مسئلہ ان پر اجتہادات ہوئے یا نہیں؟ شاتم رسول کے مسئلے پر بھی تو امت نے اجتہاد کیا۔ فقہ حنفی میں غیر مسلم شاتم رسول تو قتل کی سزا سے بری ہے، سزا صرف مسلم کو دی جا سکتی ہے کیونکہ غیر مسلم جب رسالت محمدی پر ایمان ہی نہیں رکھتا تو وہ سزا کا مستوجب کیوں ہوگا۔ لیکن اب احناف بھی شتم رسول کو واجب القتل جرم قرار دیتے ہیں جب کہ ان کی امہات کتب میں اس مسئلے کا جواب مختلف ہے، فقہ مالکی شاتم میں مذہبی تفریق نہیں کرتی۔ اندلس میں عیسائیوں نے توہین رسالت کی ایک مہم شروع کی، ہزاروں سرفروش کفن باندھ کر توہین رسالت کے لیے نکل آئے پہلے تو شاتم کو قتل کی سزا دی گئی لیکن جوش و خروش بڑھ گیا اور معاملہ سنگین ہو گیا تو پھر عیسائی پادریوں کے ذریعے اس مسئلے کا حل تلاش کیا گیا۔ عصر حاضر میں اجتہاد الحاد کا مترادف ہو گیا ہے اور اس کا مقصد محض آزادانہ بے باکانہ نعرے ہے، لوگ صرف اپنی اپنی آوازیں سننے کو تحقیق اور اجتہاد سمجھ رہے ہیں۔ اپنی تاریخ، اپنے علوم، اپنے احوال و ظروف کو مسترد کر کے اجتہاد و آزادی فکر کا نام ہو گیا ہے جو خالصتاً مغربی نقطۂ نظر ہے جو کسی خارجی ذریعہ علم کا انکار کرتا ہے اور عقل پر تمام علم کا انحصار رکھتا ہے۔ اجتہاد میں معیار اور مرجع بہر صورت سلف رہیں گے لیکن جدید اجتہاد میں مرجع ترقی دنیا اور لذات دنیا کے حصول میں شرعی حیلوں کو تراشنے کا نام اجتہاد رکھ دیا گیا ہے۔ اقبال مرحوم نے اجتہاد کو اصول حرکت قرار دیا ہے، ان کے پیش نظر مغربی فکر و فلسفے میں حرکت کی اصطلاح تھی وہ حرکت میں زندگی دیکھتے تھے جس نے مغرب کے زمین و آسمان بدل ڈالے تھے۔ جب وہ عالم اسلام پر نظر ڈالتے تھے تو انھیں جمود نظر آتا تھا۔ یہ جمود جن تاریخی اسباب سے پیدا ہوا تھا ان اسباب کا غائر مطالعہ کرنے کے بجائے اقبال مرحوم نے سیدھے سادھے لفظوں میں مستشرقین کے مغالطوں کو ترجمہ کر کے "تقلید" اور تصوف، عجمی اثرات، ایرانی تصوف، کو اس جمود کا ذمہ دار قرار دیا۔ مغرب میں حرکت کسی خارجی ذریعے کی محتاج نہیں ہوتی لہٰذا حرکت کی خالص مغربی اصطلاح کو اسلامی منہاج میں برتتے ہوئے اقبال مرحوم نے اس کی نزاکت کا اندازہ نہیں کیا۔ بہ ظاہر یہ اصطلاح بہت دل کش لگتی ہے لیکن اس کے اثرات بہت روح فرسا نکلتے ہیں۔ ترقی میں حرکت کا انجام سامنے ہے۔ اقبال مرحوم کو اس کا

اندازہ ہی نہیں تھا کس طرح عربی زبان کو مٹایا گیا، کیسے اذان پر پابندی لگی؟ کس طرح دینی مدارس بند کیے گئے؟ عمامہ پہننا حرام ٹھہرا، عربی زبان کی کتابیں تلف کر دی گئیں، ایک دور یہ بھی آیا کہ تجہیز و تکفین کے لیے کوئی مولوی دستیاب نہ تھا۔ یہ حرکت کی برکت تھی، آخر حکومت ترکی کو خود دینی تعلیم اور دینی مدارس کا انتظام کرنا پڑا۔ یہ سارا بھلا انتظام ایک نئے نظام میں ڈھل رہا ہے۔ اُغنی ولیس نے اسلامی قانون کو نیوٹن کے قوانین کی طرح متعین سمجھا [Determine] اور اقبال مرحوم نے اس کے برعکس جہانگ علی کی طرح ان میں زبردست حرکت کا مشاہدہ کیا جس طرح نیوٹن کے قوانین جامد تھے ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی، جس طرح کائنات ایک مشین کے کل پرزوں کی طرح متعین طریقے کے مطابق حرکت کرتی ہے یعنی کائنات انہی متعین قوانین کے تحت چل رہی تھی، اسی طرح اس نے اسلام کے قانون فقہ کو جامد ٹھہرے ہوئے پتھر کی لکیر قوانین قرار دیا ....نہ وہ اسلامی قانون کی اصلیت سے واقف تھا نہ اقبال، لہٰذا اعتراض بھی غلط تھا اور اس کا جو جواب اقبال مرحوم نے دیا وہ بھی غلط تھا۔ اعتراض کرنے والے نے مغربی اصطلاح میں فقہ اسلامی کا المیہ بیان کیا، ازالہ کرنے والے نے مغربی اصطلاح کے ذریعے ہی اس کا جواب دیا۔

قرآن کریم کا مقصد انسانی فلاح کے عمومی اصول مہیا کرنا تھا اس کی تعلیم زندگی کو ترقی پسندانہ تخلیق کا عمل ٹھہراتی ہے وغیرہ وغیرہ اس طرح کے دعوے خطبات اقبال مرحوم میں بہت ملتے ہیں۔ یہ تمام دعوے اقبال مرحوم پر مغربی فکر و فلسفے کے حد سے زیادہ غلبے کا اثر ہیں سترہویں صدی سے پوری اسلامی تاریخ بلکہ ادیان سابقہ کے صحائف، دنیا کے تمام معاشرے تہذیبیں، ترقی، فلاح، صلاح، تخلیق، حرکت، ارتقاء کے ان کافرانہ تصورات سے عاری رہے جو فکر مغرب کے غلبے سے عام ہوئے حیرت یہ ہے کہ اقبال مرحوم مغربی اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے اس کا تاریخی پس منظر نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ اصطلاحات ایک خاص تاریخ تہذیب و ثقافت سے نکلتی ہیں وہ زمان و مکاں میں مخصوص ہوتی ہیں صرف انبیاء کی دعوت زمان و مکاں سے ماوراء ہوتی ہے آفاقی ہوتی ہے لیکن اقبال مرحوم مغرب کے فلسفے اور اس کی اصطلاحات کو بھی آفاقی، غیر اقداری Value Nutral سمجھ کر نہایت سبک روی سے انھیں اسلامی تاریخ تہذیب فقہ میں داخل کرنے کی جسارت کرتے ہیں اس جسارت پر علماء کا احتجاج بے سبب نہیں تھا لیکن احتجاج کرنے والوں کو بات کہنے کا سلیقہ نہیں آتا تھا وہ فتویٰ دے کر چپ ہو گئے اقبال مرحوم اپنے عہد کے اسالیب میں گفتگو کر سکتے تھے انھوں نے اپنی غلط سلط بات بھی نہایت سلیقے اور تہذیب سے کہی بلکہ خطبات میں اسلام کے نصوص پر بھی نقد اس قدر دھیما نکھرا کر کیا ہے کہ دس پندرہ مرتبہ پڑھنے کے بعد سمجھ میں آتا ہے کہ اس اسلام کے عقب میں تو صرف مغرب کا فلسفہ ہے، ان کی تحریر نہایت گنجلک ہے اور میرے خیال میں اقبال مرحوم نے ماجد صاحب کی شدید تنقید کے بعد احتیاط کے طور پر اپنے آپ کو محفوظ رکھنے کے لیے یہ طرز

ایجاد کیا تھا تا کہ بات کہہ دی جائے اور گرفت بھی نہ ہو۔ اقبال مرحوم اسلام پر نقد کرتے ہوئے علماء و فقہاء اسلام سے حوالے لانے کے بجائے کفار محققین و مستشرقین کے حوالے اپنے موقف کی تائید میں پیش کرتے ہیں جو نہایت غیر ذمہ دارانہ عمل تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ علوم اسلامی سے بالکل واقف نہ تھے مثلاً حدیث کی حجت اور سنت کے مقام کے موضوع پر وہ حدیث کی تنقید میں Schacht اور گولڈ زیہر وغیرہ کے حوالے دیتے ہیں اور ان پر تنقید بھی نہیں کرتے یعنی دین کے دوسرے ماخذ سنت کی حیثیت مستشرقین کے ذریعے متعین ہوگی علماء نے اسی لیے اسے کفر سے تعبیر کیا تھا علامہ حضرت انور شاہؒ نے اقبال مرحوم سے ملاقات میں انہیں مشورہ دیا تھا کہ آپ دینی علوم کی تحصیل کریں جس طرح آپ نے مغربی علوم کی تحصیل کی ماخذات کے متن خود علماء کی رہنمائی میں ان علوم کے اصولوں کے تحت مطالعہ کریں اور علماء سے مذاکرہ کے بعد اپنی آراء کا اظہار کریں جب آپ سات سمندر پار سفر کرکے کفر کے علوم حاصل کرسکتے ہیں تو اسلامی علوم کے حصول میں وہی مشقت اٹھائیے اس کے بغیر سکوت اختیار کرنا بہتر ہے۔

انجی ویلس کی کتاب تھیوریز آف فنانس [Theories of Finance] میں اجماع کے ذریعے نص قرآن کی منسوخی کا نظریہ بعض علماء احناف اور معتزلہ کے حوالے سے پیش کیا گیا تھا لہٰذا اقبال مرحوم نے مجھ سے اس نظریے کے حوالے طلب فرمائے۔

یونانی الاصل عیسائی ترکی مفکر انجی ویلس کے اس ادعا کو اقبال مرحوم نے نہایت تحیر کے ساتھ محسوس کیا اس تحیر سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ احناف اور معتزلہ کے فقہی ذخیرے سے واقف نہ تھے فقہی بصیرت رکھنے والا اور علم فقہ پر عبور رکھنے والے شخص کے لیے اس طرح کے مسائل حیرت انگیز نہیں ہوتے اقبال مرحوم جب ان سوالات کی تصدیق و تائید کے لیے علماء سے رجوع کرتے تھے تو ان دلائل کی بنیاد پر کوئی دعویٰ کرنے اجتہاد انحراف کرنے یا نقطہ نظر پیش کرنے کا حق بھی صرف علماء کو حاصل تھا یہ اقبال مرحوم کا مقام نہیں تھا انجی ویلس کے استدلال کی بنیاد علامہ آمدی، قاضی شوکانی اور عبدالعزیز بخاری کے دلائل پر رکھی گئی تھی اور اقبال مرحوم ان تینوں کی کتابوں سے واقف نہ تھے لیکن اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہانت دی تھی وہ صرف تخیل کے ذریعے ایسا ایسے سوالات پیدا کرتے تھے جو سالہا سال مطالعہ کرنے والوں کے ذہن میں بھی نہیں آتے یہ دانائی ان کو دل درد مند کے ذریعے ملی تھی جو امت کے لیے دھڑکتا رہتا تھا اجماع کی نص قرآنی سے منسوخی کے سوال پر میں نے مختصر جواب تحریر کردیا تھا کہ شاید وہ فکر کی دنائی کے ساتھ فقہ اسلامی کے لٹریچر کی غواصی بھی فرمائیں گے لیکن ایسا نہ ہوسکا ان کا طریقہ کار یہی تھا کہ وہ مستشرقین، منکرین حدیث، ملحدین، مغربی فلاسفہ کی کتابوں میں پڑھ کر اسلام پر وارد اعتراضات جمع کرتے ان کی علمی تنقیح کے بجائے مختلف علماء کے سامنے اشکالات پیش کرکے ان علماء کے جوابات سے اطمینان قلب حاصل کرتے یعنی اقبال مرحوم اپنے اشکالات کے ضمن میں صرف اور صرف تقلید علماء پر بھروسہ کرتے تھے

یہاں ان کی اجتہادی قوت کام نہیں کرتی تھی اپنے لیے تقلید ضروری سمجھتے تھے اور عالم اسلام کے لیے اجتہاد لازمی سمجھتے تھے۔ پارلیمنٹ کے حامل ارکان کو بھی اجتہادی اجازت دیتے تھے لیکن خود پابند تقلید اجتہاد فرماتے یعنی علماء سے استفادہ کرکے اپنی رائے پیش کردیتے۔ اس تقلید کا یہ نتیجہ نکلا کہ انھوں نے میرے مختصر جواب کی بنیاد پر نہایت اعتماد سے انغی دلیں کے اس موقف کو کہ بعض حنفی اور معتزلی مصنفین کے نزدیک اجماع قرآن کو منسوخ کرسکتا ہے مسترد کردیا۔ یہ مثال بتاتی ہے کہ اقبال مرحوم اپنے علمی دعووں کی دلیلیں دوسروں سے حاصل کرکے اپنے نام سے پیش کرتے تھے۔ خطبات میں ایک اور مقام پر بھی اقبال مرحوم نے اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔ انھوں نے استاد مرحوم مولانا شبلیؒ کی کتاب ''الکلام'' سے حضرت شاہ ولی اللہ کی کتاب کا حوالہ اصل سے تقابل کے بغیر لفظ بلفظ ترجمہ کرلیا۔ یہ حوالہ درست نہیں تھا اور اس غلط حوالے سے جو استاد مرحوم مولانا شبلیؒ نے اخذ کیا تھا وہ بھی درست نہیں تھا۔ امت کا اجماع ہے کہ حدود زماں و مکاں سے ماورا ہیں اور قیامت تک نافذ العمل۔ شاہ صاحب کا بھی یہی نقطہ نظر ہے لیکن اقبال مرحوم انغی دلیں کی تردید میں اتنے آگے چلے گئے کہ انھیں اسلامی سزائیں بھی قابل تغیر، ترمیم، تنسیخ نظر آئیں اس سے وہ اصول حرکت و ارتقا ثابت کرنا چاہتے تھے۔ استاد مرحوم مولانا شبلیؒ کے یہاں انھیں اپنے مفروضے کے حق میں حضرت شاہ ولی اللہؒ جیسے عالم کی تحریف شدہ عبارت مل گئی یعنی نتیجہ پہلے اخذ کرلیا تھا اور دلیل بعد میں تلاش کی گئی۔ مقصد صرف انغی دلیں کی تردید تھا خواہ اس سے اسلام کی تردید ہوجائے۔ امت کی تاریخ میں منکرین حدیث کی بھی کبھی جرأت نہ ہوئی کہ وہ حدود کو صرف جزیرۃ العرب کے معاشرے تک محدود سمجھتے ہوں، لیکن اقبال مرحوم نے اسلام میں اصول حرکت و اجتہاد کو ثابت کرنے کے لیے نہایت شیفتگی کے ساتھ حدود میں ترمیم، تبدیلی کا اصول بھی شاہ ولی اللہ جیسے جید عالم سے منسوب کردیا۔ اقبال مرحوم کے لیے یہ بات حیران کن تھی کہ استاد مرحوم کے اقتباس میں تحریف کیسے ہوسکتی ہے۔ اگر وہ خطبات میں الکلام کے ثانوی ماخذ کا حوالہ دے دیتے تو انھیں شرمندگی نہ ہوتی، شاہ ولی اللہ کے نام سے غلط حوالہ پیش کیا ایک ایسے خطبے میں جسے علما کی نظر سے گزرنا تھا بڑی جرأت کی بات تھی ماجد صاحب نے اس غلطی کو بھی واضح کیا تھا لیکن اقبال مرحوم پر یہ غلطی اس وقت واضح نہ ہوسکی۔ جب اقبال مرحوم پر یہ بات واضح ہوگئی کہ ان سے بہت بڑی غلطی ہوئی ہے اور امت کے اجماع کے برعکس رائے دی گئی ہے اور دلیل بھی محرف ہے تو وہ دل گرفتہ ہوئے مجھ سے خط و کتابت کے ذریعے استفسار کیا۔ دوسرے علماء سے بھی رجوع کیا۔ خطبات پر نظر ثانی کا وعدہ کرلیا تھا لیکن مہلت نہ ملی۔ اقبال مرحوم کے مسودات میں نظر ثانی شدہ عبارتیں مل سکتی ہیں۔ اقبال مرحوم کہتے تھے کہ تمام عمر مغربی فلسفے میں بسر کی ہے لہٰذا اسلام کی تعلیمات اور فقہ کا مطالعہ بھی دانستہ یا نادانستہ مغربی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں۔ اقبال مرحوم مرحوم کا نقطۂ نگاہ شک سے شروع ہوتا ہے اور زیادہ وہ بڑے شک پر ختم ہوتا ہے کیونکہ فلسفہ یقین کا نام نہیں وہ تو شک کا نام ہے شک کی وہ منزل کہ جب فلسفی خود اپنے آپ پر شک کرتا ہے اس کا تمام تر یقین شک پر ہوتا ہے۔ فلسفی کی زندگی تجربات سے

خالی نہیں ہے۔ خطبات کے سلسلے میں اقبال مرحوم پر جو حملے ہوئے اس نے انھیں اس غور پر مجبور کر دیا تھا۔ آخری زمانے میں انھوں نے بار ہا مختلف مجالس میں اعتراف کیا کہ میں نے مغرب کو منہاج بنا کر اسلام کو اس کسوٹی پر پرکھنے کی کوشش کی۔ یہ طریقہ کار درست نہیں تھا۔ اسلام کو کسوٹی بنا کر مغرب کو اس معیار پر پرکھنا چاہیے تھا تا کہ اسلام اور مغرب کے مابین مغائرت دور کی جا سکے۔

اقبال پر مصری مفکر عبدالرازق کے اثرات:

خطبات کے سلسلے میں لاہور، لکھنؤ، دہلی اور دیگر شہروں کے علماء سے ان کا رابطہ تھا۔ مولانا ابوالکلامؒ سے بھی وہ استفادہ کرتے تھے لیکن اس استفادے کا مسئلہ یہ تھا کہ جن علماء سے وہ استفادہ کر رہے تھے ان میں سے کوئی بھی مغرب کے فکر و فلسفے سے اس سطح پر واقف نہ تھا جس سطح پر اقبال مرحوم واقف تھے لہٰذا یہ علماء اقبال مرحوم کو بہت اچھا مشورہ دینے کے اہل نہ تھے اقبال مرحوم پر مغربی فلسفے اور وہاں کے اساتذہ کا جادو تھا وہ حیران کن تھا لہٰذا میری رائے یہ تھی کہ وہ ماجد دریا آبادی صاحب سے اس بارے میں بہتر رائے حاصل کر سکتے ہیں۔ مولوی احمد دین امرتسری سے صوفی تبسم اور علامہ عرشی نے رابطہ کرانے کی بہت کوشش کی لیکن اقبال مرحوم نے اس میں دلچسپی نہ لی انھیں اندازہ تھا کہ احمد دین امرتسری نہ صرف مغربی فلسفے سے ناواقف ہیں بلکہ علوم اسلامی میں ان کا خاص نقطہ نظر ہے اور اگر ان کے افکار اقبال مرحوم نے پیش کیے تو مرحوم ہندوستان میں ان کی شخصیت بے اثر ہو جائے گی لہٰذا وہ بہت احتیاط برتتے تھے حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ اقبال مرحوم جو قیام خلافت کے زبردست طرف دار ہیں وہ علی عبدالرازق کی کتاب سے کیسے متاثر تھے جو ریاست کو اسلام کے دائرے سے خارج کر دیتی ہے۔ اقبال مرحوم کی پوری شاعری استخلاف فی الارض کی پکار ہے لیکن عبدالرازق تو خلافت اور ریاست کے وجود سے انکار کر دیتے ہیں اور اقبال مرحوم کے لیے پھر بھی ان کی کتاب اہم ہو جاتی ہے یہ گتھی کبھی میں سلجھا نہ سکا اقبال مرحوم کے یہاں مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ اور عروج کے بارے میں اس قدر ولولہ پایا جاتا ہے جس کا احاطہ ممکن نہیں یہ ولولہ خلافت کے بغیر مادی پیکر اختیار نہیں کر سکتا رازق اس مادی پیکر کا انکار کر دیتے ہیں اور اقبال مرحوم پھر بھی انھیں دل سے قبول کر لیتے ہیں اس کی ..... توجیہ کرنے کی بہت کوشش کی ناکام رہا۔

اقبال مرحوم پر افغانی کا اثر:

جمال الدین افغانی کے خیال میں حقیقت کی تلاش اور اس کے اظہار میں نبوت اور فلسفہ ایک ہی طرح کام کرتا ہے۔ اقبال مرحوم نے افغانی کی فکر میں ترمیم کر کے یہاں فلسفے کو سائنس سے بدل دیا فلسفہ کم از کم مابعدالطبیعیاتی سوالات سے بحث تو کرتا ہے حقیقت کی تلاش اس کا موضوع تو ہے گو کہ اس تلاش کا ذریعہ صرف

عقل ہے دوسرے لفظوں میں حق فرد میں محصور ہے۔ فرد بتا سکتا ہے کہ کیا حق ہے کیا باطل ہے یعنی عقل کو فوقیت دے دی گئی تمام ذرائع علم پر لیکن سائنس تو حقیقت کے سوال سے بحث ہی نہیں کرتی اس کا مابعد الطبیعیاتی سوالات سے کوئی تعلق ہی نہیں ہے اس نے حقیقت کو پانے کا کبھی دعویٰ ہی نہیں کیا۔ سائنس کی تاریخ تجربات سے تو عبارت ہے لیکن حقیقت مطلق تک رسائی کبھی اس کا موضوع نہیں رہا قدیم سائنس کو کسی حد تک مستثنیٰ کیا جا سکتا ہے کیوں کہ وہ فلسفے سے راست منسلک تھی لیکن جدید سائنس تو اپنی نہاد میں الحاد ہے اس سے مذہب کی تائید و تصدیق کی خواہش بڑی عجیب بات ہے اقبال مرحوم جیسے شخص سے اس خواہش کا صدور بہر حال ہوا ہے۔

مذہب سائنس کا محتاج ہے:

روحانیت کے سلسلے میں اسلام نے جو کچھ پیش کیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی مذہب میں نہیں ملتی اس معاملے میں ہم بہت مالا مال ہیں اس میں کچھ رطب و یابس بھی ہے لیکن اس سے قطع نظر بہت کچھ قیمتی سامان بھی مل جاتا ہے جس پر فخر کیا جا سکتا ہے ماجد صاحب کا خیال تو یہ تھا کہ اقبال مرحوم خطبات لکھنے کے زمانے میں مغربی فلسفے کے جدید انداز سے واقف نہ تھے سیاسی مصروفیات اور وکالت اور شاعری کے بعد وقت کہاں ملتا ہوگا لہذا مغربی فلسفے کے بدلتے ہوئے جدید رجحانات تک ان کی رسائی نہ تھی۔ جو کچھ وہ پہلے پڑھ چکے تھے اس پر ان کے علم کا مدار تھا ورنہ ممکن تھا کہ وہ خطبات میں بہت سے خیالات سے رجوع کر لیتے مذہب کی تائید و توثیق کے لیے سائنسی افکار سے استدلال ایک مغالطہ پیدا کرتا ہے کہ ایک دوامی چیز کی تائید غیر دوامی یا ہنگامی شے سے کیسے کی جا سکتی ہے دوسرے لفظوں میں سائنس کی بنیاد عقل اور محسوسات و تجربات ہیں یعنی مذہب کو پرکھنے جانچنے کی بنیاد ہماری عقل اور ہمارے محسوسات ہو گئے یعنی حق مذہب نہیں بذات خود ہم ہیں حق کسی تائید اور خارجی توثیق کا محتاج نہیں وہ اول و آخر حق ہے چاہے اسے کوئی تسلیم کرے یا نہیں اللہ تعالیٰ کسی کی تصدیق کا محتاج نہیں ہے لیکن خطبات میں نظر آتا ہے کہ سائنس کی تصدیق کے بغیر مذہب پر لوگ ایمان نہیں لائیں گے۔

حوالہ جات

[۱] اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ انور، لکھنؤ ۱۹۸۲ء

[۲] ایک ادبی روزنامچہ، نورالحسن ہاشمی، ص ۱۸، ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ ۱۹۵۴ء

[۳] [خواجہ حسن نظامی آپ بیتی، ص ۱۳۳، مطبوعہ دہلی، ۱۹۱۹ء]

[۴] [اردو میں خودنوشت سوانح، ایضاً، ص ۱۳۰]

[۵] [ایضاً]

[۶] [ایضاً]

[۷] Exete،English Diaries & Jounrals،Vincent Watte 1952

A Wheaton and company Ltd.

[۸] [اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ڈاکٹر صبیحہ ایضاً، ص ۱۳۳]

[۹] مقدمہ فرمان سلیمانی، مشفق خواجہ، غیر مطبوعہ]

[۱۰] [روایت ڈاکٹر معین الدین عقیل، سابق صدر شعبہ اردو و سابق ناظم شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ]

[۱۱] [اردو میں خودنوشت سوانح حیات، ایضاً، ص ۱۳۱۔۱۳۳

[۱۲] خواجہ عبدالوحید، یادِ ایام [روزنامچہ]، ص ۳۳۵، شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ جامعہ کراچی

[۱۳] ایضاً، ص ۳۳۵

[۱۴] ایضاً، روزنامچہ ایضاً، ص ۳۳۶

[۱۵] ڈاکٹر سید عبداللہ، مضمون عجب آزاد مرد تھا، مشمولہ سب رس یادرفتگاں نمبر، ص ۲۸۸، کراچی

[۱۶] "یادِ ایام" ص ۶۱

[۱۷] ایضاً، ص ۲۲۵

[۱۸] ایضاً، ص ۸۹

[۱۹] ایضاً، ص ۳۱۴

[۲۰] خواجہ عبدالوحید: اقبال کے حضور مشمولہ نقوش اقبال نمبر، ص ۳۱۹

[۲۱] ''یاد ایام''، ایضاً، ص ۲۸۵

[۲۲] ایضاً، ص ۲۷۸

[۲۳] ایضاً، ص ۲۸۶

[۲۴] ایضاً، ص ۲۸۶

[۲۵] ایضاً، ص ۲۰۴

[۲۶] ایضاً، ص ۲۱۲

[۲۷] ایضاً، ص ۲۱۳

[۲۸] ایضاً، ص ۲۷۲

[۲۹] ایضاً، ص ۲۷۳

[۳۰] ایضاً، ص ۲۸۷

[۳۱] ایضاً

[۳۲] اقبال کے حضور، ایضاً، ص ۳۱۸

[۳۳] اقبال کے حضور، ص ۳۲۰

[۳۴] اقبال کے حضور، ص ۳۱۹

[۳۵] محمود احمد کاوش کے غیر مطبوعہ مقالے ''مشفق خواجہ'' سے ماخوذ معلومات: محمود احمد کاوش مشفق خواجہ پر پی ایچ ڈی کا مقالہ تحریر کر رہے ہیں۔ خواجہ صاحب کے خاندان اور آبا و اجداد پر ان کا مقالہ جریدہ کے آئندہ شمارے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

[۳۶] خون بہا: حکیم احمد شجاع، بھولی بسری شخصیت ابوسلمان شاہجہانپوری۔

[۳۷] رحیم بخش پنجاب یونیورسٹی کے پہلے مسلم گریجویٹ تھے۔ آپ رفتہ رفتہ [ڈپٹی کمشنر کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے کم عمری میں انتقال کیا۔ خواجہ رحیم بخش کے بیٹے خواجہ فیروز الدین احمد بار ایٹ لا میونسپل کمشنر رہے۔ ان کے بیٹے خواجہ خورشید انور نے سول سروس کے امتحان میں نمایاں کامیابی حاصل کی مگر انھوں نے ملازمت پر موسیقی کو ترجیح دی۔ مشرقی موسیقی کی بازیافت اور اختراع و تنوع میں خواجہ خورشید انور نے سرگرمی سے حصہ لیا۔

[۳۸] خواجہ امیر بخش محکمہ جنگلات میں معزز عہدے پر تھے عین عالم جوانی میں انتقال کر گئے۔

[۳۹] خواجہ کریم بخش کا شمار پنجاب کے مشہور اکاؤنٹنٹوں میں ہوتا تھا۔ خواجہ کریم بخش کے تین فرزند تھے۔ خواجہ عبدالمجید پیشے کے لحاظ سے سپرنٹنڈنٹ پولیس تھے مگر ان کے علمی انہماک اور ذوق وجستجو کا اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ انھوں نے چار جلدوں پر مشتمل ''جامع اللغات'' مرتب کی۔ انھوں نے فارسی لغت پر بھی کام شروع کیا لیکن ان کی اچانک موت نے انھیں یہ کام ادھورا چھوڑنے پر مجبور کیا۔ دوسرے بیٹے خواجہ عبدالحمید انگلستان سے فارغ التحصیل تھے۔ وہ الیکٹریکل انجینئر تھے۔ خواجہ عبدالحمید کے بیٹے کرنل خواجہ عبدالرشید کا علمی مرتبہ بہت بلند تھا۔ انھیں علمی و تحقیقی کاموں کی بدولت شہرت ملی۔ وہ ''معارف الآثار'' اور کئی دیگر اردو، فارسی اور انگریزی کتابوں کے مصنف تھے۔ خواجہ کریم بخش کے تیسرے بیٹے خواجہ عبدالوحید تھے جو ''یاد ایام'' کے مولف ہیں۔

خواجہ عبدالوحید کے دادا کے عم زاد مولوی احمد دین وکیل بھی باذوق شخص تھے۔ انھوں نے ''سرگزشت الفاظ'' لکھ کر شہرت پائی۔ اس کے علاوہ انھیں علامہ محمد اقبال پر اولین کتاب ''اقبال'' لکھنے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ ۱۹۲۳ء میں شائع ہونے والی اس کتاب کو بوجوہ نذر آتش کردیا گیا تھا۔

[۴۰] خون بہا، حکیم احمد شجاع، طبع دوم لاہور ۱۹۶۵ء، ص ۸۳۔۱۸۲

[۴۱] اقبال کے حضور، ایضاً، ص ۳۸۳

[۴۲] ڈاکٹر سید عبداللہ، عجب آزاد مرد تھا، مشمولہ سب رس شخصیات نمبر، ایضاً

[۴۳] اقبال کے حضور، ص ۳۸۲

[۴۴] یاد ایام، متفرق اوراق

[۴۵] روایت، ڈاکٹر وحید قریشی، مشمولہ غیر مطبوعہ مقالہ ''مشفق خواجہ حیات وخدمات'' محمود احمد کاوش بارووال

[۴۶] ابوسلمان شاہجہاں پوری، خواجہ عبدالوحید لاہوری ایک بھولی بسری شخصیت، مشمولہ ہفت روزہ چٹان، لاہور ۱۷، دسمبر ۱۹۷۱

[۴۷] ڈاکٹر سید عبداللہ، ابوسلمان شاہجہاں پوری محمد احمد کاوش کے مضامین سے ماخذ کردہ معلومات

[۴۸] ''یاد ایام''، ص ۱۴

[۴۹] ''یاد ایام''، ص ۳۰۰

[۵۰] ''یاد ایام''، ص ۳۸۲

[۵۱] ''یادِ ایام''،ص۳۹۱

[۵۲] ''یادِ ایام''،ص۳۹۳

[۵۳] ''یادِ ایام''،ص۴۰۱

[۵۴] ''یادِ ایام''،ص۴۰۲

[۵۵] ''یادِ ایام''،ص۴۰۹

[۵۶] ''یادِ ایام''،ص۴۲۳

[۵۷] ''یادِ ایام''،ص۴۳۲

[۵۸] اقبال کے حضور ایضاً ،ص۱۳۵

[۵۹] ایضاً ،ص۳۹۲

[۶۰] ''یادِ ایام'' ایضاً ،ص۳۵۳

[۶۱] ''یادِ ایام''، ایضاً ،ص۳۵۴

[۶۲] ''یادِ ایام'' ایضاً ،ص۳۵۰

[۶۳] ''یادِ ایام'' ایضاً ،ص۳۷۰

[۶۴] ڈاکٹر ابو سلمان شاہجہان پوری، ''لاہور کی بھولی بسری شخصیت خواجہ عبدالوحید''

[۶۵] یہ معلومات یادِ ایام، خواجہ طارق کی روایات، محمود احمد کاوش نا رووال اور ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کے مضامین سے اخذ کی گئی ہیں۔

[۶۶] ایضاً

[۶۷] کے کے عزیز Public Life in Muslim Inda 1850-1947 ،ص۴۵۸

[۶۸] روایت خواجہ طارق/ مشفق خواجہ/ابو سلمان شاہجہانپوری

[۶۹] روایت خواجہ طارق

[۷۰] خواجہ عبدالوحید کے خانوادے کی تفصیلات محمود احمد کاوش نا رووال کے مقالے سے اخذ کی گئی ہیں۔

۱۔ خواجہ عبدالقدیر پیدائش: ۲۳ ر ستمبر ۱۹۳۱ء

محمود نج شعبہ مارکیٹنگ کے اعلیٰ عہدے سے ریٹائرڈ

۲۔ ارجمند بانو [بی بی باجی] پیدائش: ۱۲ ر دسمبر ۱۹۳۲ء

بہ مطابق ۱۵ ر شعبان ۱۳۵۱ ہجری بروز شنبہ

۳۔ رفعت جہاں بانو پیدائش: ۲۲/جون ۱۹۳۴ء

بہ مطابق ۹/ربیع الاول ۱۳۵۳ ہجری بروز جمعۃ المبارک، وفات: ۹/اگست ۱۹۳۴ء

۴۔ خواجہ عبدالقیوم: پیدائش: ۲۲/جون ۱۹۳۴ء

بہ مطابق ۹/ربیع الاول ۱۳۵۳ ہجری بروز جمعۃ المبارک

فیلو رائل اسکول آف فوٹو گرافی۔ ناول "بے وفا" اور "ایوب خان۔۔۔ ساتا کار و تصاویر"

پنجابی سفرنامہ زیر اشاعت

۵۔ خواجہ عبدالحئی [مشفق خواجہ] پیدائش: ۱۹/دسمبر ۱۹۳۵ء

بہ مطابق ۲۲/رمضان المبارک ۱۳۵۴ ہجری پونے بارہ بجے شب یوم پنج شنبہ

۶۔ رفعت جہاں بانو [ڈاکٹر] پیدائش: ۱۲/اپریل ۱۹۳۷ء

بہ مطابق ۲۹ محرم الحرام ۱۳۵۵ ہجری

شادی خواجہ عبدالمجید کے نواسے کرنل محمد اظہر راٹھور سے ہوئی۔

۷۔ خواجہ عبدالرحمٰن طارق پیدائش: ۱۳/دسمبر ۱۹۳۸ء

بہ مطابق ۲۰/شوال ۱۳۵۷ ہجری سوا تین بجے شب

حبیب بینک لمیٹڈ سے سینئر وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائرڈ

۸۔ خواجہ عبدالسلام عارف پیدائش: ۲۳/جولائی ۱۹۴۰ء

بہ مطابق ۱۵/جمادی الثانی ۱۳۵۹ ہجری چھ بجے

نیشنل بینک آف پاکستان سے اسسٹنٹ وائس پریذیڈنٹ کی حیثیت سے ریٹائرڈ

۹۔ صولت النساء [صولت نسیم درانی] پیدائش: ۱۷، ۱۸/اکتوبر ۱۹۴۲ء

بہ مطابق ۶، ۷/شوال ۱۳۶۱ ہجری دو بجے شب مابین شنبہ و یک شنبہ

۱۰۔ ہمایوں وحید پیدائش: ۸/جون ۱۹۴۶ء

بہ مطابق ۷/رجب المرجب ۱۳۶۵ ہجری سوا سات بجے شام بروز شنبہ

۱۱۔ جڑواں بچے پیدائش: ۱۹۴۹ء انتقال کر گئے۔

۱۲۔ راشد وحید پیدائش: ۳/جولائی ۱۹۵۳ء

بہ مطابق ۲۲/شوال المکرم ۱۳۷۲ ہجری ساڑھے آٹھ بجے شب

ٹیلی ویژن اور فلم سے وابستگی

[۱۷] "یادایام"، ایضاً، ص ۲۳۷

[۷۲] ایضاً، ص۔ ۱۷۲

[۷۳] ایضاً، ص۔ ۱۸۷

[۷۴] ایضاً، ص۔ ۱۸۸

[۷۵] ایضاً، ص۔ ۳۶

[۷۶] "یادایام" ص۔ ۲۶۸

[۷۷] ایضاً، ص۔ ۲۸۷

[۷۸] ایضاً، ص۔ ۲۸۸

[۷۹] ایضاً، ص۔ ۳۱۴

[۸۰] ایضاً، ص۔ ۳۲۵

[۸۱] ایضاً، ص۔ ۳۳۴

[۸۲] ایضاً، ص۔ ۳۲۴

[۸۳] ایضاً، ص۔ ۳۳۰

[۸۴] ایضاً، ص۔ ۷

[۸۵] ایضاً، ص۔ ۷۴

[۸۶] ایضاً، ص۔ ۳۷

[۸۷] ایضاً، ص۔ ۷۵

[۸۸] ایضاً، ص۔ ۱۳۰

[۸۹] ایضاً، ص۔ ۳۴

[۹۰] ایضاً، ص۔ ۱۳۱

[۹۱] "یادایام" ایضاً، ص۔ ۱۳۲

[۹۲] ایضاً، ص۔ ۱۳۳

[۹۳] ایضاً، ص۔ ۱۳۵

[۹۴] ایضاً، ص۔ ۱۵۱

[۹۵] ایضاً، ص۔ ۷۰

[۹۶] ایضاً، ص۔ ۳۳۴

دہشت گردی: تاریخ و تحقیق کی روشنی میں

مہذب قوموں کے ہاتھوں پونے دو ارب لوگوں کا قتل

سید خالد جامعی

زبانیں اور استعماری طاقتیں:

گزشتہ تین سو سال کی استعماری تاریخ بتاتی ہے کہ ولندیزی (Dutch)، برطانوی (Birtish)، ہسپانوی (Spanish)، اطالوی (Italian)، بلجیمین (Beligian)، تاتاری (Tatarian)، پرتگیزی (Portuguese)، روسی (Russian)، امریکی (American)، فرانسیسی (French)، المانوی [German]، اور آسٹرین [Austrian] استعمار نے دنیا میں جہاں بھی قبضے کیے وہاں نوآبادیات قائم کیں اور لوگوں کو غلام بنایا۔ یہ تمام طاقتیں Empire کہلاتی تھیں اور امپیریل ازم انہی کا تحفہ تھا جس کا تلخ ذائقہ دنیا آج بھی محسوس کرتی ہے۔ گزشتہ تین سو برس کے عرصے میں پونے دو ارب انسانوں کا قتل عام انہی استعماری طاقتوں نے کیا۔ قتل عام کرنے والی مہذب نسلیں یورپی تھیں۔ اس سے پہلے کی تاریخ میں یونانی [Greeck]، ہندی [Hindai]، ایرانی [Persian]، چینی [Chinese]، اور دیگر استعماری طاقتوں نے دنیا میں قتل و غارت گری کی وحشیانہ رسمیں عام کیں۔ [Emperialism] استعماری طاقتوں کی لوٹ مار، غنڈہ گردی، دہشت گردی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ۱۹۱۴ء میں برطانوی استعمار [Birtish Emperialism] کی کل آبادی ۴۶ء۸ ملین تھی لیکن اس کی نوآبادیات کی آبادی ۳۹۰ ملین تھی اور ۲۷ ملین کلومیٹر رقبہ اس کے قبضے میں تھا۔ فرانس کی آبادی ۱۹۱۴ء میں ۳۹ء۶ ملین تھی لیکن اس کی نوآبادیات میں ۶۳ ملین لوگ محصور تھے اور رقبہ ۱۱ ملین کلومیٹر تھا۔ جرمنی کی آبادی ۶۳ ملین تھی اور نوآبادیات میں غلام شخصوں کی تعداد ۱۵ ملین تھی اور رقبہ ۲ء۵ ملین کلومیٹر تھا۔ اطالوی استعمار کی آبادی ۳۵ ملین تھی اور اس کی نوآبادیات کے لوگوں کی تعداد ۲ ملین تھی اور رقبہ ۲ ملین کلومیٹر تھا۔

Neo-Colonialism کے بانی روس، امریکہ اور برطانیہ کی نوآبادیات اور آزاد کردہ نوآبادیاتی

علاقوں پر ذہنی، فکری اور ثقافتی یلغار کے ذریعے دوبارہ قبضے کی تاریخ کسی اور موقع پر بیان کی جائے گی۔ عموماً لوگ فرانسیسی استعمار [Frech Emperialism] کو ایک شریف استعماری طاقت سمجھتے ہیں لیکن Alistair Home کی کتاب A Savage war of Peace: Algeria 1954-1962۔ اس شرافت کی حقیقت، خصلت، حیثیت اور ماہیت سے بخوبی آگاہ کرتی ہے۔ صرف قتل عام کوئی بات نہیں۔ استعمار نے جس وحشیانہ طریقے سے عورتوں، بوڑھوں بچوں کو قتل کیا جس طرح دہشت گردی کا ارتکاب کیا گیا۔ سترھویں صدی سے پہلے ایسی سفاکی کی مثالیں چنگیز اور تاتاری علاقوں کے سوا بہت کم ملیں گی۔ امریکا اور آسٹریلیا کے اصل باشندوں کو وحشی قرار دے کر قتل کر دیا گیا اور ان کی زبانیں مٹا دی گئیں۔ جہاں زبانیں نہیں مٹائی جا سکیں وہاں ثقافتی استعمار نے کے ذریعے زبانوں کے رسم الخط کو تبدیل کیا گیا تاکہ ان نوآبادیات کو ان کے عظیم الشان تاریخی ورثے سے محروم کر دیا جائے۔ اس کے نتیجے میں جب یہ نوآبادیات اپنے تاریخی ورثے کو پڑھنے کے قابل نہ رہیں تو ان کے تاریخی آثار عجائبات وہاں سے منتقل کر کے ماضی کے اس ورثے سے قائم ایک جذباتی تعلق کو بھی ہمیشہ کے لیے ختم کر کے ان نو آبادیات کے لوگوں کے لیے ان کی تاریخ کا معمہ بنا دیا گیا۔ استعماری طاقتوں کے ہاتھوں زبانوں کے قتل عام کی داستان ابھی تک کئی پردوں میں مستور ہے۔ ذیل میں ہم چند پردے ہٹا کر حقائق پیش کر رہے ہیں۔ پہلی مثال براعظم آسٹریلیا پر برطانوی قبضے کے بعد، مقامی لوگوں کا اور ان کی زبانوں کا قتل عام ہے۔

براعظم آسٹریلیا: زبانوں کا قتل عام:

ایشیا سے ملحقہ جنوب میں دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ آسٹریلیا واقع ہے جو ایک براعظم بھی ہے۔ زبانوں کے قتل عام پر بھی علمی و تحقیقی مطالعات سے پتہ چلتا ہے کہ برطانوی استعمار نے نہ صرف اس براعظم کو لوٹا اور اس کے مکینوں کا قتل عام کیا بلکہ ان کی زبانوں کا بھی قتل عام کیا گیا یہ سلسلہ اس علاقے پر برطانیہ کے تسلط سے شروع ہوا اور ہزاروں زبانوں کی تباہی، بربادی اور معدومی پر منتج ہوا۔

ماہرین ارضیات کے مطابق براعظم آسٹریلیا کی سرزمین دنیا کی قدیم ترین ساخت کی حامل ہے جو آج سے تقریباً ۱۴ ارب ۶۰ کروڑ سال سے ۷۵ کروڑ سال پہلے معرض وجود میں آئی۔

انگریزوں کی آمد سے سینکڑوں سال پہلے یہاں کے شمالی ساحلوں پر چینی اور ملائو نیشیائی اقوام کا آنا جانا رہتا تھا۔ انگریزوں کی آمد یہاں ایبل تسمان سے شروع ہوتی ہے۔ ایبل تسمان نے ۱۶۴۲ اور ۱۶۴۳ میں اور جیمز کک نے ۱۷۷۰ میں اس براعظم کو تسخیر کیا لیکن کیپٹن آرتھر فلیپ نے ۱۷۸۸ میں یہاں نوآبادیات قائم کرنے کا سلسلہ حقیقی معنوں میں شروع کیا۔

جزیرہ تسمانیہ کے لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا:

براعظم آسٹریلیا کی زبانوں کے ساتھ ساتھ یہاں کے باشندوں کے خاتمے کا پہلا قدم جزیرہ تسمانیہ

میں اٹھایا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے درمیان ہی جزیرہ تسمانیہ کے تمام مقامی لوگوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا۔ آسٹریلیا کے اصل باشندوں کے خلاف امتیازی قوانین تیار کیے گئے جو ۱۹۶۰ تک رو بہ عمل رہے لیکن ان قوانین کو وہاں کی انسانی حقوق کی تنظیموں کے احتجاج کے بعد ۱۹۶۰ کے عشرے میں منسوخ کرنا پڑا لیکن اس تنسیخ سے کوئنز لینڈ کو مستثنیٰ رکھا گیا۔ آسٹریلیا کی ۸ ریاستیں ہیں۔ مقامی لوگوں کی آبادی آسٹریلیا کے شمال اور شمال مشرقی حصے میں کثرت سے آباد ہے۔

آسٹریلیا کی ۲۳۵ زبانیں موت کی دہلیز پر:

آسٹریلیا کی تقریباً ۲۶۸ زبانوں میں سے ۲۳۵ زندہ ہیں اور ۳۱ مر چکی ہیں لیکن بقیہ ۲۳۵ زبانیں بھی موت کی دہلیز پر آخری سانسیں گن رہی ہیں۔ ان زبانوں میں صرف چند ہی ایسی ہوں گی جن کے بولنے والے ہزار یا ڈیڑھ ہزار کے قریب ہوں گے لیکن باقی تمام زبانوں کے بولنے والوں کی تعداد تین چار سو یا بیس سے زیادہ نہیں۔

شمالی صوبہ کوئنز لینڈ:

سرکاری سرپرستی میں آسٹریلیا کے اصل گرشتہ باشندوں کا قتل عام اور استحصال ۱۹۶۰ تک آسٹریلیا میں ہوتا رہا۔ عوامی دباؤ کے باعث حکومت نے مدارس میں داخلے اور دفاتر میں نوکری وغیرہ کے حقوق مجبوراً بحال کیے لیکن شمالی صوبہ کوئنز لینڈ کو اس عمل سے مستثنیٰ رکھا گیا۔ یہ صوبہ شمال میں ہے جہاں پر آج بھی آسٹریلیا کی معدوم ہونے والی زیادہ تر زبانیں ہیں۔ ریاست وکٹوریہ میں جو جنوب مغرب میں ہے آج بھی ان مقامی لوگوں کو حق ملکیت حاصل نہیں۔ یہاں جن علاقوں میں یہ لوگ محصور ہیں یا محدود ہیں، ان علاقوں میں اصل باشندے زمین کی ملکیت نہیں رکھ سکتے نہ انھیں خریدنے کی اجازت ہے۔ یہ ریاست یہاں کی امیر ریاست ہے اور سفید فام نسل کے لوگ یہاں زیادہ بستے ہیں۔

قدیم باشندوں کے حقوق ۲۰۰۲ء میں معطل:

دسمبر ۲۰۰۲ء میں رائٹر (Reuters) خبر رساں ایجنسی نے یہ خبر دی کہ آسٹریلیا کے وزیر اعظم ہاورڈ نے مقامی لوگوں کو تحفظ دینے اور ان کی زبانوں کو بچانے کے لیے ان کے علاقوں میں رات کا کرفیو نافذ کر دیا ہے اور شراب کی فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے۔

زبانوں کو مٹانے کے بعد تحفظ کی تحریک:

۱۹۶۰ء میں قائم آسٹریلیائی ادارہ برائے مطالعات باشندگان اصل (Australian Institute of Aboriginal Studies) نے ان مقامی زبانوں پر تحقیق کے کام کا آغاز کیا۔ یہ ادارہ دارالحکومت کینبرا میں ہے۔ یہ ادارہ وقتاً فوقتاً زبانوں کے بچاؤ کے لیے کام کرتا ہے جس میں مختلف زبانوں کو محفوظ کرنا، ان کے نغموں اور لوریوں کو صوتی انداز میں ریکارڈ کرنا وغیرہ شامل ہے۔ دو صدیوں تک زبانوں کا قتل عام کرنے کے بعد ان کی

حفاظت کا انوکھا اور اچھا خیال جدیدیت اور انسانیت کی عجیب و غریب شکل ہے۔ پہلے باشندوں کو قتل کیا گیا جو بچ گئے ان کی زبانوں کو مٹایا گیا اور اب عالمی انسانی و تہذیبی ورثے کے تحفظ کے نام پر زبانوں کی حفاظت کے منصوبوں کے ذریعے اپنی انسانیت کے گن گائے جا رہے ہیں۔

آسٹریلیا کی تمام زبانیں ذخیرۂ الفاظ کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کافی حد تک مشابہ ہیں۔ ماہرین لسانیات کا خیال ہے کہ آج سے ۵ ہزار سال پہلے یہ تمام زبانیں ایک بڑی زبان تھی۔ ان تمام زبانوں کے لسانی و ثقافتی روابط انڈونیشیائی اور پاپوا نیو گنی (Papua New Guinea) کی زبانوں سے بھی ملتے ہیں۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان دونوں ممالک میں تو یہ زبانیں خوب پھل پھول رہی ہیں لیکن آسٹریلیا میں انھیں تہس نہس کر دیا گیا ہے۔

مٹنے والی زبانوں کی فہرست:

ذیل میں آسٹریلیا کی ایسی زبانوں کے نام دیے جا رہے ہیں جن کے بولنے والوں کی تعداد صرف چند نفوس ہے اور اس مضمون کی اشاعت تک ان میں سے کتنی ہی زبانیں معدوم ہو چکی ہوں گی:

۱۔ ادینیاماتھن ہا (Adynyamathanha): یہ زبان آسٹریلیا کے جنوب میں بولی جاتی تھی اب وہاں اس کے بولنے والے صرف ۲۰ ہیں۔

۲۔ امی (Ami): اس کے بولنے والے ۳۰ ہیں اور یہ شمال میں ڈارون میں بستے ہیں۔

۳۔ الاوا (Alawa): شمالی علاقے میں بولی جاتی ہے اور بولنے والوں کی تعداد ۱۷ سے ۲۰ تک ہے۔

۴۔ ارابانا (Arabana): سن ۱۹۸۱ میں اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۸ تھی اور یہ لوگ جنوب میں بڑی جھیل آئری (Lake Eyre) کے مغربی حصے میں بستے ہیں۔

۵۔ النگتھ (Alngith): آسٹریلیا کے شمال مشرقی علاقے جزیرہ نما کیپ یارک میں اس کے بولنے والے اب صرف ۳ کی تعداد میں ہیں۔

۶۔ انڈے گیرے بن ہا (Andegerebinha): بولنے والوں کی تعداد ۱۰ یا اس سے کم ہے۔ شمالی علاقے میں بولی جاتی ہے۔

۷۔ انتاکارن یا (Antakarinya): جنوبی آسٹریلیا کے شمال مشرق میں یہ لوگ بستے ہیں اور ان کی تعداد ۵۰ کے قریب ہے۔

۸۔ امارگ (Amarag): شمالی علاقہ میں صرف چند بولنے والے ہیں یہ زبان فوری معدوم ہونے والی ہے۔

۹۔ اریبا (Areba): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۱ ہے جو شمال مشرق میں کوئنز لینڈ کے جزیرہ نما کیپ یارک میں بستے ہیں۔

۱۰۔ اتمپایا (Atampaya): ۴، ایلیٹ کریک (Eliot Creek) کوینز لینڈ۔

۱۱۔ ایابادھو (Ayabadhu): بولنے والوں کی تعداد ۱۰ ہے اور یہ لوگ بھی شمالی آسٹریلیا میں جزیرہ نما کیپ یارک کی دریائے کول مَین (Coleman) کے شمال میں بستے ہیں۔

۱۲۔ باڈی (Baadi): ۲۰، اس زبان کو تحفظ دینے کی غرض سے محصور کیا گیا ہے اور ان کا علاقہ مغربی کمبرلی ریجن Western Kimberley Region مغربی آسٹریلیا میں ہے۔

۱۳۔ بڈی مایا (Badimaya): تقریباً معدوم ہو رہی ہے بولنے والوں کی تعداد ۲ ہے اور یہ مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۱۴۔ بنجالنگ (Bandjalang): زبان بولنے والے صرف دس ہیں اور علاقہ وڈن بونگ (Woodenbong) نیو ساؤتھ ویلز میں رہتے ہیں۔

۱۵۔ بنجی گلی (Bandjigali): ۱، شمالی وہائٹ کلف (White Cliffs) نیو ساؤتھ ویلز۔

۱۶۔ بیرو پوائنٹ (Barrow Point) صرف ایک بولنے والا، کیپ یارک کوینز لینڈ شمالی آسٹریلیا۔

۱۷۔ بایونگو (Bayungu): ۲، ویسٹ ہاما کی لینڈن اور منیلیا دریاؤں کے درمیان مغربی آسٹریلیا میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۱۸۔ بیدیارا (Bidyara): ۲۰، کوینز لینڈ کے کناموورا اور گائیلا کے علاقوں میں یہ زبان بولنے والے لوگ بستے ہیں۔

۱۹۔ بیری (Biri): ۵، جنوب مشرق چارٹر ٹاورز (Charter Towers) کوینز لینڈ۔

۲۰۔ بروم پرلنگ (Broome Pearling): ۳۰ کے قریب لوگ خلیج بیگل (Beagle Bay) مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۲۱۔ بُنابا (Bunaba): سو کے قریب لوگ یہ زبان بولتے ہیں جو فٹزروئے کراسنگ ایریا (Fitzroy Crossing Area) مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۲۲۔ بُردُنا (Burduna): ۳، مغربی آسٹریلیا کی ہنری اور مایلینڈن دریاؤں کے کنارے یہ لوگ بستے ہیں۔

۲۳۔ جامنجنگ (Djamindjung): ۱۳۰، کوینز لینڈ، منگاما کے مغرب میں۔

۲۴۔ جنگون (Djangun): منگاما، کوینز لینڈ، صرف ایک زبان بولنے والا باقی ہے۔

۲۵۔ دھرگری (Dhargari): ۱، مغربی آسٹریلیا، منیلیا اور دریائے لیون کے زیریں حصے میں بستے ہیں۔

۲۶۔ جاوی (Djawi): ۱، مغربی آسٹریلیا، خلیج برنس وِیک (Brunswick Bay) کے کنارے۔

۲۷۔ جنبا (Djinba): ۹۰، بولنے والے ارنہم لینڈ Arnhem Land اور دن [illegible] اس زبان کا ایک اور لہجہ دابی (Dabi) ۱۹۹۱ تک میں معدوم ہو چکا ہے۔

۲۸۔ جنگلی (Djingili): ۱۰، ایلیٹ، ناردرن ٹیریٹری۔

۲۹۔ جواری (Djiwarli): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک بوڑھا ہے، کوواگنسٹ، مغربی آسٹریلیا۔

۳۰۔ دیراری (Dirari): ۱، جنوبی آسٹریلیا، جھیل آئری کے شمال میں۔

۳۱۔ دھلانجی (Dhalandji): ۲۰، مغربی آسٹریلیا میں ویسٹ پلبارا میں خلیج ایکس ماؤتھ کے کنارے بستے ہیں۔

۳۲۔ دیابوگے (Dyaabugay): ۳۰، کوئنزلینڈ، پورٹ ڈگلس کے شمال مرتفع پر۔

۳۳۔ ڈارلنگ/ بگونجی (Darling/ Bagundji): ۵، دریائے ڈارلنگ کے کنارے نیو ساؤتھ ویلز۔

۳۴۔ دیابردیابر (Dyaberdyaber): ۳، خلیج کنگ، مغربی آسٹریلیا۔

۳۵۔ دیانگاڈی (Dyangadi): ۵، دریائے میک لیے، آرمی ڈیل نیو ساؤتھ ویلز۔

۳۶۔ دِربال (Dyirbal): ۴۰، دریائے ہربرٹ، کوئنزلینڈ

۳۷۔ دیوگن (Dyugun): ۲، بروم (Broome) مغربی آسٹریلیا۔

۳۸۔ ایرے (Erre): ۱، کوہ ہاؤشپ (Mt. Howship) ناردرن ٹیریٹری۔

۳۹۔ فلنڈرز آئی لینڈ (Flinders Island): ۳، جزیرہ وفا کیپ پارک خلیج پرنس شارلٹ، کوئنزلینڈ۔

۴۰۔ گاجیراونگ (Gadjerawang): ۳، یہ لوگ دریائے وکونیا کے سرے پر مغربی آسٹریلیا میں بستے ہیں۔

۴۱۔ گاگاڈو (Gagadu): ۱، اوین پلی، ناردرن ٹیریٹری۔

۴۲۔ گمبیرا (Gambera): ۱، شمالی کمبرلیز، مغربی آسٹریلیا۔

۴۳۔ گنگ گالیڈا (Ganggalida): ۵، بورک ٹاؤن (Bourke Town) کوئنزلینڈ

۴۴۔ گیاردلت (Gayardilt): ۵۰، خلیج کارپینٹیریا، کوئنزلینڈ۔

۴۵۔ گی یگ (Giyug): ۲، ڈارون کے جنوب مغرب میں ناردرن ٹیریٹری۔

۴۶۔ گونی یانڈی (Gooniyandi): ۱۰۰، دریائے مارگریٹ مغربی آسٹریلیا۔

۴۷۔ گوگاج (Gugadj): ۱، دریائے نورمن، کوئنزلینڈ۔

۴۸۔ گوگو بدھون (Gugu Badhun): ۲، آئناسلے (Einasleigh) کوئنزلینڈ۔

۴۹۔ گوگوبیرا (Gugubera): ۱۵، ایلس اور مچل دریاؤں کے سرے پر کوئنزلینڈ میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۵۰۔ گوگو یمجر (Guguyimidjir): ۳۰ لوگ یہ زبان بولتے ہیں لیکن ۲۵۰ سے ۳۰۰ کے قریب یہ زبان بولنے والے لوگ اب انگریزی بولنے کو ترجیح دیتے ہیں۔ ہوپ ویل (Hopevale) کوئنزلینڈ

۵۱۔ گنگابولا (Gungabula): ۱۲، انجون (Injune) کوئنزلینڈ۔

۵۲۔ گنیا (Gunya): ۳، وایانڈرا (Wyandra) کوئنزلینڈ۔

۵۳۔ گوراگون (Guragone): ۲۰ ۰ء ارنہم لینڈ، ناردرن ٹیریٹری۔

۵۴۔ گرجر (Gurdjar): ۲۰۰۳ء دریائے نورمن کے شمال مشرقی کنارے کوئنزلینڈ۔

۵۵۔ گوامو (Guwamu): ۱۱ء، مارانوا دریا، کوئنزلینڈ

آسٹریلیا کی مردہ زبانیں:

مندرجہ بالا زبانیں آسٹریلیا کی وہ زبانیں ہیں جو موت کے قریب ہیں اور اپنی زندگی کی آخری سانسیں گن رہی ہیں مگر ذیل میں اس براعظم کی وہ زبانیں درج جا رہی ہیں جو اب مر چکی ہیں۔

اگوامن (Agwamin) — اغو تھرنگ گالو (AghuThamggalu)

اوابا کال (Awabakal) — بنگرلا (Banggaria)

بیالی (Bayali) — پرلاتپا (Pirlatapa)

تجورورو (Tjurruru) — تھراول (Thurawal)

ڈھرگا (Dhurga) — ڈیری (Dieri)

کری یارا (Kariyarra) — کلارکو (Kalarko)

کلکوٹنگ (Kalkutung) — کنگاراکانی (Kungarakany)

گنگولو (Gangulu) — گورینگ گورینگ (Gureng Gureng)

گوگو ورا (Gugu Warra) — لینن گی تج (Leningitij)

ملگانا (Malgana) — مے کولان (Maykulan)

نگان یائے وانا (Nganyaywana) — نگانڈی (Ngandi)

نے رن یے ری (Narrinyeri) — وری ینگا (Wariyangga)

وڈارنگ (Wandarang) —ووریمی (Worimi)

وولی وولی (Wuliwuli) — یالارنگا (Yalarnnga)

یوگمبل (Yugambal)[۳۱،۳۷،۳۸،۳۹،۴۰،۴۱،۴۲]

کیتھولک استعماریت: رونگو زبان کا خاتمہ:

بحرالکاہل کا جزیرہ ایسٹر (Easter Islands) جسے ولندیزی سیاح نے ۱۷۲۲ء میں دریافت کیا تھا۔ اس جزیرے میں آج کل رومن رسم الخط رائج ہے لیکن ۱۸۶۴ء سے پہلے اس جزیرے کا اپنا رسم الخط تھا جسے "رونگو رونگو" کہا جاتا تھا۔ اس خط کو شارک مچھلی کے دانت سے لکھا جاتا تھا۔ اس خط کو پڑھنے کا طریقہ یہ تھا کہ جب ایک صفحہ یا ایک سطر پڑھ لی جاتی تو اس صفحے کا سرا گھما کر نیچے کر دیا جاتا اور اس طرح دوسری سطریں سامنے آ جاتی تھی

اس کو پڑھنے کے لیے سینگے کو گھمایا جاتا تھا۔ ۱۸۶۴ء میں جب کیتھولک ہسپانوی مبلغین یہاں آئے تو انھوں نے ان لکڑی کی تختیوں کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہ لکڑی کی تختیاں مختلف حجم کی تھیں ان میں سے آج صرف ۲۵ تختیاں دستیاب ہیں ان میں سب سے بڑی تختی کا حجم ۶ فٹ ہے۔ یہ رسم الخط قدیم سندھی رسم الخط سے مشابہ ہے۔ ان واقعات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ استعماری طاقتوں کے ساتھ ساتھ مذہبی استعماریت نے بھی مختلف زبانوں کو کس طرح ختم کیا۔

ہندی استعماریت اور پالی و مقامی زبانیں:

بودھ مت کا آغاز ۶۰۰ ق م میں ہوا جو دراصل آریہ غلبہ یا (ہندو مت) کے خلاف اعلان جنگ تھا۔ یہ اعلان جنگ لسانی طور پر بھی سنسکرت کا مد مقابل تھا بودھ مت نے سنسکرت کو کسی حد تک اپنایا اور اس کی عوامی زبان ماگدھی تھی اور پالی زبان ادبی حیثیت رکھتی تھی۔ چناں چہ راجا اشوک کے کتبے آج تک اس امر کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ پالی دراصل متن یا سطر کو کہتے ہیں اور یہ لفظ قطار اور حاشیے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ پالی بھی سنسکرت کی طرح مختلف رسم الخطوں میں لکھی جاتی تھی۔ سب سے پہلے یہ زبان سنہالا رسم الخط میں حضرت مسیح سے سو سال قبل ضبط تحریر میں لائی گئی۔

ہندو مت کا احیاء ہوا تو بدھ مذہب اور پالی زبان خاک و خون کے المناک مناظر سے دوچار ہوئے۔ بدھ دھرم اور اس کی زبان کی درگت بنائی گئی۔ بودھ مت کے علما کو قتل کر کے ان کے سروں کو اوکھلی میں کوٹا کر ہڈیوں کے سفوف کو ہوا میں اڑا دیا گیا۔ مذہب کے ساتھ زبان بھی مورد عتاب ٹھہری۔ پورے شمالی ہند کی زبانیں بھی زبردست شکست و ریخت سے دوچار ہوئیں۔ طاقت کے بل پر پالی اور دیگر زبانوں کو مٹانے اور سنسکرت کو زندہ کرنے کی بھرپور کوشش ہوئی لیکن سنسکرت عوامی زبان نہ بن سکی۔ اسلام کی پوری تاریخ اس قسم کی عصبیت تشدد سفاکی اور بہیمیت سے پاک ہے۔ ارشاد رسالت مآب ہے کہ ”اگر دشمن کے شر سے بچنا چاہتے ہو تو اس کی زبان سیکھ لو“ یہ حکیمانہ قول مسلمانوں میں زبانوں کو سیکھنے کا سبب بنا اور انھوں نے اس حکمت کے ذریعے دشمنوں کو اسلام کے دائرے میں داخل کر لیا اور ان کی زبانوں کو بھی اپنا بنا لیا۔ اس قید میں آنے کے بعد کوئی رہائی پر آمادہ نہ ہوا۔

نو کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل عام:

براعظم شمالی امریکا کو یورپی مہم جوؤں نے سولہویں صدی کے اوائل میں دریافت کیا۔ کولمبس کی آمد کے وقت امریکا میں جو لوگ آباد تھے ان کے بارے میں عام خیال یہ ہے کہ وہ تیس تا چھتیس ہزار سال قبل ایشیاء سے امریکا آئے تھے۔ عام طور پر ان لوگوں کو سرخ ہندی کہا جاتا ہے۔

کولمبس کی آمد کے وقت موجودہ براعظم شمالی امریکا میں ایک اندازے کے مطابق تقریباً دس کروڑ

سرخ ہندی النسل آباد تھے۔ براعظم متحدہ امریکا کی تاریخ کا سیاہ باب یورپی حملہ آوروں اور آبادکاروں کے ہاتھوں اس پوری آبادی کی نسل کشی اور ان کی جائیداد اور زمینوں پر زبردستی قبضہ کرنا اور ان کو چھینا تھا۔ مائیکل مین کی کتاب The Dark Side of Democracy جو ہارورڈ یونیورسٹی سے شائع ہوئی ہے اس کے مطابق یورپی آبادکاروں نے اٹھارویں اور انیسویں صدی کے دوران شمالی امریکا میں تقریباً نو کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل کیا یہ قتل عام پچیس سالوں پر محیط ہے۔ اس قتل عام کے لیے ہر ممکن وسائل استعمال کیے گئے اور ہر طریقہ اپنایا گیا۔ قتل و غارت گری، آبادیوں میں بیماریوں کا پھیلانا، عورتوں کو زیادتی کا شکار بنانا وغیرہ عام بات تھی۔ دو صدیوں کی قلیل مدت ایک پورے براعظم کی آبادی کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا گیا اور ان کا براعظم ان سے لوٹ لیا گیا۔

کانٹ، مارکس، لاک، ہیوم سرخ ہندیوں کے دشمن:

شمالی اور جنوبی امریکا میں قتل عام کے اس سلسلہ کا آغاز ہسپانیوں نے کیا تھا۔ ہسپانوی مصنف "Tzvetan Todorov" اسے "انسانی تاریخ کا عظیم ترین قتل عام" (The greatest genocide in human history) قرار دیتا ہے۔ سولھویں صدی کے ہسپانوی پروفیسر اور ماہر الٰہیات Francisco de Vitoria نے اس قتل عام کا جواز ان الفاظ میں بیان کیا تھا۔

"سرخ ہندی اس قابل نہیں ہیں کہ وہ نظم و نسق قائم کر سکیں اور حکومت کو اپنے بل بوتے پر چلا سکیں وہ پاگلوں اور وحشی درندوں سے بدتر ہیں اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی غذا وحشی درندوں کی غذا سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہے بلکہ ان کی بے عقلی اور بے وقوفی دوسری قوموں کے بچوں اور پاگلوں سے زیادہ بڑھی ہوئی ہے" مصنف Tzvetan Todorov کے مطابق پروفیسر فرانسس کا سولھویں صدی کی ہسپانوی تحریک انسانیت (پرستی) کے اساطین میں شمار ہوتا تھا۔ (One of the Pinnacles of Spanish Humanism In The Sixteenth Century) غرض پروفیسر فرانسس کے افکار کے مطابق سرخ ہندی اس قابل نہیں تھے کہ انسان کہلا سکیں اس لیے ان کا قتل عام جائز تھا۔

مسئلہ صرف پروفیسر فرانسس کا نہیں تھا، جارج واشنگٹن سرخ ہندیوں کو انسانی لباس میں بھیڑیے کہتا ہے کیوں کہ یہ لوگ انسان کہلانے کے مستحق نہیں تھے۔ مارکس کے فلسفے کے مطابق یہ لوگ People without Hisotry تھے۔ [اس لیے ان کا قتل عام جائز تھا۔]

لاک کے خیال میں:

There is no difference between a buffalo and a native American.

کانٹ کے خیال میں:

Blacks are not human they live in woods.

ہیوم نے ایک کالے کو کسی گورے سے نہایت عالمانہ گفتگو کرتے ہوئے دیکھا تو اس نے حیرت کا اظہار کیا کہ کالے اتنے عقل مند بھی ہو سکتے ہیں۔

انگریز آبادکاروں کے ہاتھ قتل عام:

جب انگریزوں نے ہسپانیوں کے اس مشن کی وراثت پائی تو انھوں نے اس مشن کو ان بلندیوں تک پہنچایا کہ ہسپانیوں کا قتل عام اس کے مقابلے میں ایک معمولی چیز نظر آتا ہے۔ گو کہ اس قتل عام کو جواز دینے کے لیے جوہات کبھی گئی وہ وہی تھی جو پروفیسر فرانسس کے مذکورہ بالا اقتباس سے واضح ہوتی ہے۔ جارج واشنگٹن کے مطابق سرخ ہندی انسانی لباس میں بھیڑیے ہیں۔ تہذیب کے قیام میں سدِ راہ ہیں اور انسانی تہذیب کی بقا اور قیام کی خاطر ان کا قلع قمع کرنا ضروری ہے۔ گو کہ جواز ایک ہی تھا لیکن امریکا کے یورپی آبادکاروں نے جس درندگی اور جس مہارت کے ساتھ دو سو سال کے اندر پوری نسل کا خاتمہ کیا وہ انھیں کا حصہ ہے۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ ایک کا تعلق درندگی سے ہے دوسری کا مہارت سے ہے۔

قصاب اسکاٹ لینڈ: لارڈ کمبرلینڈ:

جہاں تک مہارت کا تعلق ہے اس میں بھی امریکا میں آباد ہونے والے انگریز ہسپانوی آبادکاروں سے کئی ہاتھ آگے تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امریکا میں آباد ہونے والے انگریز آبادکاروں کو اس قسم کے قتل عام کا وسیع تجربہ تھا۔ شمالی امریکہ میں وحشی سرخ ہندیوں کے قتل عام سے پہلے انگریز اسکاٹ لینڈ میں "وحشی" کیلٹک (Celtic) باشندوں کا قتل عام کر چکے تھے اور کیلٹک قتل عام کے تجربے سے شمالی امریکا میں بھرپور فائدہ اٹھایا گیا۔ مثال کے طور پر لارڈ کمبرلینڈ (Lord Cumberland) جسے قصاب اسکاٹ لینڈ کہا جاتا تھا اور جسے اسکاٹ لینڈ میں قتل عام کا وسیع تجربہ تھا۔ بعد ازاں امریکا گیا اور اس نے اپنے تجربے کو ان نئے "وحشیوں" کو ختم کرنے کے لیے استعمال کیا۔ درندگی اور مہارت کے اس امتزاج نے دو سو سالوں میں ایک پوری نسل کا خاتمہ اور ان کے براعظم پر مکمل قبضہ کی شکل اختیار کی جس کی نظیر ساری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی۔ امریکی تحقیق کے تازہ اعداد و شمار کے مطابق یورپی قبضہ سے پہلے شمالی امریکا میں دس کروڑ سرخ ہندی آباد تھے۔ لیکن دو سو سال کے قتل عام کے نتیجہ میں ان کی تعداد محض چند لاکھ رہ گئی تھی۔

کیلی فورنیا یا زبانوں کا قبرستان

مؤرخین کے مطابق صرف براعظم امریکا میں نو کروڑ ریڈ انڈین باشندوں کو وحشی قرار دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ان کی زبانوں نوہاٹل (Nauhatl)، یوما (Yuma)، چپوا (Chipewa)، توماہاک (Tomahawk)، موہاک (Mowhawk)، موہاوے (Mojave)، نواجو (Navajo)، چوکٹا (Choctow)، پیما (Pima) اور ہوپی (Hopi) وغیرہ کو فنا کر دیا گیا۔ جب نسل ہی باقی نہ رہی تو زبان کے بچنے

کا کیا سوال پیدا ہوتا۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا جہاں زبانوں کے کئی درجن گروہ پائے جاتے تھے وہاں سفاکی اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا کہ تاریخ نے اس ریاست کا نام جس کا مطلب ہسپانوی زبان میں ''خوابناک سونے کی سرزمین'' تھا، زبانوں کا قبرستان (Cemetery of Languages) رکھ دیا۔ جہاں ستر درجن سے لسانی گروہوں کی دو سو کے قریب زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں وہاں آج صرف دو زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ یہ تاریخ ساز کارنامے ان قوموں نے انجام دیے جنھیں اس بات پر فخر ہے کہ وہ دنیا میں انسانی حقوق کے سب سے بڑے علمبردار ہیں اور انسانیت کی جتنی خدمت انھوں نے انجام دی وہ خدمت کوئی اور انجام نہ دے سکا۔

سرخ ہندیوں کے قتل و غارت گری کی تحقیق داستانیں:

براعظم امریکہ میں یورپی آبادکاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں سرخ ہندیوں کا قتل عام شروع کیا تو کسی قاعدے، قانون، اخلاق، اصول، روایت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک قاعدہ تھا جس کی پیروی کی جاتی تھی کہ سرخ ہندیوں کو Exterminate or Banish کر دیا جائے۔ خون کے دریا بہا کر سونے کے دریا پیدا کیے گئے اس عہد کی المناک داستانوں کو تاریخ نگاروں نے محفوظ نہ رکھا کیوں کہ اس عہد کے تاریخ نگار روشن خیال، مہذب و متمدن انسان سب اس بربریت اور لوٹ مار کو جائز سمجھتے تھے اور اس پر انھیں کوئی تاسف نہ تھا۔ ان مظالم پر نہ آسمان رویا نہ زمین کی آنکھ نم ہوئی نہ کسی کا سینہ شق ہوا، نہ کسی کا رنگ فق نہ کوئی چہرہ زرد ہوا۔ تاریخ کا یہ المناک خونی باب اب رفتہ رفتہ روشنی میں آ رہا ہے۔ قتال و جدال کی یہ کیفیت غیظ و غضب کی آخری حدود کو چھو چکی تھی، سرخ ہندی عورتوں بچوں کے لیے بھی ان مہذب متمدن تعلیم یافتہ دنیا کی اعلیٰ ترین گوری نسل کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا ایک شمہ بھی نہ تھا۔ سرخ ہندیوں کے وحشیانہ قتل عام کی عبرتناک داستانیں جو تین سو سال تک پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ اب رفتہ رفتہ منظر عام پر لائی جا رہی ہیں لیکن کئی پہلوؤں سے چھان کر اس کی تفصیلات Paddison, Nichols, Nash, Stannard, Sheehan, Wallace, Hoxie, La Perousse, Phillips, Hurtado, Heizer, Brown, Churchill, Cocker, Prucha, Madsen, Rommail, Micheal Man, Glain D. Page نے نہایت تفصیل سے اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں اس موضوع پر درج ذیل کتابوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

1. Nash, G. 1992. Red, White and Black: The Peoples of Early North America, 3rd ed. Englewood Cliffs, N.J.: Prentice Hall.

2. Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.

3. Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and

the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.

4. Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.

5. Hoxie, F. 1984. A Final Promise: The Campaign to Assimilate the Indians, 1880-1920. Lincoln: University of Nebraska Press.

6. La Perousse, J.-F. 1989. Monterey in 1786: Life in a California Mission: The Journals of Jean Francois de la Perousse, ed. M. Margolin. Berkeley: Heyday Books.

7. Paddison, J. 1999. A World Transformed: Firsthand Accounts of California Before the Gold Rush. Berkeley, Calif.: Heyday Books.

8. Nichols, D. 1978. Lincoln and the Indians: Civil War Policy and Politics. Columbia: University of Missouri Press.

9. Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.

10. Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.

11. Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.

12. Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.

13. Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.

14. Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.

15. Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.

16. Madsen, B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.

17. J. M. Gran The origions of war 2 vols Groningen: Origin Press 1995.

18. Glen D Paige Nonkilling Global Political Science Philadelphia: X Libris Corporation 2002.

19. Allen D. Grimshaw "Encyclopedia of violence, peace conflict 3 volumes N. Y. Academic Press 1999.

20 Chles W. Kegley and Wiltt Kopfe World politics: Trend & Transformation 6th London Macmillan Press LTD 2000.

21. JACK Porter Genocide and Human rights: A Global Anthology Lanham, Maryland, University Press of America 1982.

22. Chalk F. & K. J. The History and Sociology of Genocide, New Haven 1990.

23. Chany I. W. [Ede] Encyclopedia of Genocide Vol. 1 - 2 Santa Barbara California 1999.

24. Horowitz, I.L Taking lives: Genocide and State Power New Brunswick, New Jersey 1997.

25. Kupuer, L. Genocide, Its political use in the Twentieth Century New Haven 1981

براعظم امریکا کی آبادی افریقہ اور یورپ سے زیادہ تھی:

Non Killing Global Political Science کے مقدمہ نگار ڈاکٹر سکندر مہدی کے مطابق: قبل از قتل عظیم [Mega Murder] براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی

مجموعی آبادی کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی۔ امریکہ کے قدیم باشندوں میں سے ۸۰ لاکھ افراد براہ راست جنگ میں موت کا شکار ہوئے یا پھر جنگ اور تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور شکست کے باعث موت سے ہم کنار ہوئے۔

اسی لاکھ سرخ ہندی اکیس سال میں ہلاک کیے گئے:

سکندر مہدی کی تحقیقات کے مطابق یہ ۸۰ لاکھ سرخ ہندی کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے صرف اکیس سال کے اندر ہلاک ہوئے، صرف دو عشروں میں اتنے بڑے پیمانے پر امریکہ کے اصل باشندوں کا قتل عام اس جمعیت کا منظر نامہ پیش کرتا ہے جو عیسائیت سے انحراف اور مغربی فکر و فلسفے کے فروغ کا لازمی نتیجہ تھا۔

اسٹیرڈ کے مطابق پندرہویں صدی کے اختتام پر کرۂ ارض پر دس کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد تقریباً ۵۰ لاکھ رہ گئی لیکن اس نے یہ نہیں بتایا کہ ساڑھے نو کروڑ لوگ کہاں چلے گئے۔ مائیکل مین کی کتاب Dark Side of Democracy اس موضوع پر ہلکی سی روشنی ڈالتی ہے لیکن یہ روشنی بھی بہت دھندلی ہے اس کے مطابق براعظم امریکہ میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کر دیا گیا تھا۔ جب کہ سکندر مہدی، ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری اور علی محمد رضوی مقتول سرخ ہندیوں کی تعداد صرف اسی لاکھ یا ایک کروڑ بیان کرتے ہیں لیکن مائیکل مین کی تحقیقات نے تاریخی گرد و غبار کو صاف کر کے سرخ ہندیوں کے قتل عام کو ایک نئی جہت عطا کی ہے۔

Encyclopaedia of Violence Peace and Conflict Vol.II میں Genocide and Democide کے موضوع پر تحقیقات میں ثابت کیا گیا ہے کہ بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے جن میں ۲۲۱ قبل مسیح اور ۱۹ ویں صدی کے اختتام کے مابین تین کروڑ چالیس ہزار افراد ہلاک کیے گئے۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد قتل ہوئے۔

یورپی باشندوں کی آمد سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ افراد قتل کیے گئے۔ اس طرح یہ چار قتل عام تقریباً دس کروڑ افراد کا احاطہ کرتے ہیں۔ [انسائیکلوپیڈیا آف وائلنس، پیس، کنفلکٹ تین حصے اکیڈمک پریس بص ۱۰، ۱۹۹۹ء]

تقابل: ہٹلر کے مقتولین اور براعظم امریکہ کے مقتولین:

یہ بات حیرت انگیز ہے کہ ایک ہزار سال کی تاریخ میں جتنے لوگ ہلاک اور قتل کیے گئے اس سے زیادہ تعداد امریکہ کے یورپی آباد کاروں کے ہاتھوں صرف ایک صدی میں قتل کر دی گئی۔ ایک ہزار سال میں ۶ کروڑ لوگوں کا قتل عام لیکن صرف ایک صدی میں دنیا کے مہذب ترین انسانوں کے ہاتھوں جو کہ روشنی، نشاۃ ثانیہ تحریک

تنویری، رومانی تحریک، عقلیت، علم بنیادی حقوق، لبرل ازم، انسانیت، آزادی اور انسان کی خدائی کے دعوے لے کر اٹھے تھے ان کے ہاتھوں صرف ایک صدی میں نو کروڑ سرخ ہندیوں کے جسموں پر بجلیوں کا کوندا ان گر گیا اور دنیا خاموش رہی۔ اعداد و شمار کی جادوگری بھی عجیب ہے۔ براعظم امریکہ میں سرخ ہندیوں کے قتل عام کی تاریخ معلوم کرنے اور اس سلسلے میں اعداد و شمار جمع کرنے کے لیے انٹرنیٹ پر ۲۰ ہزار ویب سائٹس کا مطالعہ کیا گیا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ چند ویب سائٹس کے سوا بیشتر سائٹس اس قتل عام کے بارے میں خاموش ہیں اور جن سائٹس پر معلومات مہیا کی گئی ہیں وہ ادھوری، ناقص، نامکمل، محرف، اور نہایت مختصر ہیں اس کے برعکس ہر ویب سائٹ ہٹلر اور نازیوں کے مظالم کی عجیب و غریب کہانیاں شائع ہے جب کہ ہٹلر اور نازیوں نے مجموعی طور پر اتنے لوگوں کا قتل عام نہیں کیا جس قدر قتل عام امریکہ کے اصل باشندوں کا تہذیب جدید کے معماروں نے کیا۔

براعظم امریکہ کے اصل باشندوں کو لوٹنے، برباد کرنے کے لیے جو طریقے اختیار کیے گئے اس کی ہلکی سی جھلک مائیکل مَن کے درج ذیل بیان میں دیکھی جا سکتی ہے۔

They needed labor, but their early attempts to capture and tie Indians to dependent labor failed. These hunter-gatherers wasted the land; they did not improve it, they were idle. From John Locke to contemporary Israelis dispossessing Palestinians, Europeans have argued that those who work and improve the land are entitled to it. The New World was thus vacuum domicilium or terra nullius, an "empty" home or land, the bounty of God to civilized peoples. They made lesser attempts to employ the natives, convert them to Christianity, intermarry with them, or culturally assimilate them.

Like the frying of Indian men, women, and children in villages they had torched - as "God laughing at his enemies" [page No.84]

یورپی آبادکاروں نے ان معصوم سرخ ہندیوں کو کس طرح تباہ و برباد کیا اس کی ایک جھلک مائیکل مَن کے مطابق:

The Indians' environment became degraded and they died, even without wars. The settlers had the political and military power to achieve these dire ends without much risk to themselves. There were forcible mass deportations of sick and hungry natives, whose chances of survival outside their traditional lands

were poor. The Indians were crowded on to smaller and smaller hunting lands and reservations. Many Europeans recognized the relentless ethnocide this involved but did nothing. [page No.85]

سرخ ہندیوں کے لیے گالی نما القابات:

یورپی آباد کار مقامی باشندوں کو جاہل، بت پرست، ملحد، چیتھڑا، ناپاک، کیڑے مکوڑے، گنوار، کتے، بھیڑیے، سانپ، سور اور بے عقل گوریلے کے نام سے پکارتے تھے۔ بھوک اور بیماری کے باعث ان باشندوں کی قوت مزاحمت ختم کر دی گئی تو ان پر بے شمار بیماریاں حملہ آور ہو گئیں جس سے یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح مرنے لگے ان کی موت کا مہذب متمدن یورپی آباد کاروں کو کوئی دکھ تھا نہ افسوس نہ صدمہ اور نہ غم کیونکہ یہ انسان ہی نہیں تھے لہٰذا انسانیت کے زمرے سے خارج لوگوں سے ہمدردی بھی خارج از امکان تھی۔ بیماریوں کے باعث مرنے والوں کی ہلاکت پر یورپی آباد کار خوشی کا اظہار کرتے اور اسے خدا کی عظیم مہربانی اور رحمت کے نام سے یاد کرتے۔ سفاکی، درندگی، بہیمیت کی یہ کہانی مغربی مؤرخین و محققین کے الفاظ میں درج ذیل ہے:

Europeans perceived an enormous difference in civilizational level between themselves and natives. The natives were illiterate, "idolatrous," "heathen," "naked," and "dirty." Before their own arrival, this had been a land "full of wild beasts and wild men," "a hideous and desolate wilderness." The settlers could distinguish between the proud bearing and military skills of the Plains Indians and the lightly clad hunter-gatherers of California, described as "beasts," "swine," "dogs," "wolves," "snakes," "pigs," "baboons," and "gorillas." But ultimately, Indians were "savages." Divine Providence was there for all to see in the form of disease. John Winthrop described the smallpox epidemic of I6I7 as God's way of "thinning out" the native population "to make room for the Puritans." William Bradford wrote, "It pleased God to visit these Indians with a great sickness and such a mortality that of a thousand, above nine and a half hundred of them died. Followers of the Lord, he said, could only give thanks to "the marvelous goodness and providence of God" (quotes from Nash, 1992: 136; Stannard, 1992: 238). Whatever they did to the natives could be justified ideologically. [Page No.85]

خدا، سائنس، سرخ ہندی اور کلیسا:

کیا یہ ممکن نہیں تھا کہ یورپی آبادکاروں اور سرخ ہندیوں کے درمیان افہام و تفہیم پیدا ہو جاتی، مائیکل مَن اس کا جواب نفی میں دیتا ہے اور اس کا ذمہ دار خدا اور سائنس کو ٹھہراتا ہے۔

Civilization might be learned, but race was fixed. God plus science reinforced economic, military, and political power to make it difficult for Europeans and Indians to live among each other. [Page No.86]

افسوسناک بات یہ تھی کہ کلیسا جو انسانیت کا دعوے دار تھا نسل کشی کے اس عمل میں سفید فام باشندوں کا ہم خیال تھا امریکا اور آسٹریلیا میں اس کا کیا کردار رہا؟ اس کی ایک جھلک درج ذیل تحریر میں ملاحظہ کیجیے:

The various churches were much closer to the white settler communities they served. Though local priests and ministers might be more moderate than their congregations, they had little power over them. As in Australia, they played second humanitarian fiddle to missionary movements, which provided the main early pressure group for assimilating rather than eliminating natives. [Page No.87]

سرخ ہندی اجنبی ہی رہے:

سرخ ہندیوں کو اپنی تہذیب، تاریخ اور مذہب میں سمونے کی کوشش کی گئی لیکن سرخ ہندی اپنی تاریخ، روایات اور مذہب سے اتنے پیوستہ تھے کہ یہ تمام کوششیں ناکام ہو گئیں، روشن خیال امریکی صدور سرخ ہندیوں کو عیسائی بنانا چاہتے تھے لیکن یورپی آبادکار اپنے معاشروں میں سرخ ہندیوں کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

Presidents Washington and Jefferson, several secretaries of war, and federal Indian agencies all worked closely with missionaries and schools in this assimilation project. They warned that any resistance would meet with certain defeat, but they did not conceive of assimilation as coercive. This was not popular with most settlers, who opposed all assimilation. [Page No.88]

سرخ ہندی یا بھیڑیے:

جن سرخ ہندیوں نے یورپی آبادکاروں کی تہذیب، تمدن، مذہب کو اختیار کر لیا وہ بھی اجنبی رہے اور

سفید فام معاشرے نے انھیں قبول کرنے سے انکار کر دیا، کیوں کہ سرخ ہندی یورپی آبادکاروں کے خیال میں بنیادی طور پر انسان کے روپ میں بھیڑیے تھے، جانوروں کی کھالوں، ہڈیوں میں ملبوس درندے تھے، جنھیں خدا نت نئی بیماریوں کے ذریعے ہلاک کر رہا تھا تاکہ سفید فام نسلوں کے ہاتھ ان کے خون سے رنگین نہ ہوں اور نسل کشی کا کام زمین کے بجائے آسمان سے قدرتی آفات کے ذریعہ ہوتا رہے۔ سفید فاموں کے اندر شمولیت کی خواہش رکھنے اور کوشش کرنے والوں کا انجام کیا ہوا؟ انھیں نہ سرخ ہندیوں کے معاشرے میں جگہ ملی نہ انھیں سفید فام اقلیت نے قبول کیا۔ یہ طبقہ بے یار و مددگار ہو کر تہس نہس ہو گیا۔

Neither community was much interested in intermarriage. Prominent colonials and traders fathered children by Indian women, but they rarely legitimized them. Permanent interracial unions were commoner among frontier traders and laborers in southern colonies with a surplus of males. Mixed blood was accepted in Indian communities, but most of the few Indians or half-breeds who tried to join white society were rejected (Nash, 1992: 280-5). Cherokees who had become private propertied planters were rejected in the 1820s, and when Cherokees acquired permanent political institutions, the State of Georgia would not accept them. It lobbied hard for the deportation of the Cherokee and achieved this in 1834 (Champagne, 1992: 133, 143-6).

سرخ ہندیوں کی جلاوطنی کا عمل:

سرخ ہندیوں کو اپنی تہذیب و ثقافت میں جذب کرنے، تحلیل کرنے، خلط ملط کرنے [Assimilation] کا عمل جب بری طرح ناکام ہو گیا تو سرخ ہندیوں کے تحفظ کی وکالت کرنے والے اپنے موقف سے دستبردار ہو گئے اور طے کیا گیا کہ سرخ ہندیوں کو مسس سپی کے مغرب میں نئے قبائلی علاقوں کی طرف جلاوطن کر دیا جائے ۱۸۳۰ء میں جب جلاوطنی کا یہ عمل شروع ہوا تو ہزاروں سرخ ہندی راستے میں ہلاک ہو گئے۔ ہلاکت کی وجہ صرف یہ تھی کہ ان باشندوں کو دشوار گزار، خطرناک، نامعلوم، غیر آباد راستوں کے ذریعے پیدل ہانک دیا گیا تھا، خطرناک جنگلات، ہولناک راستوں سے گزرتے پڑتے، ہزاروں معصوم لوگ عورتیں، بچے، بوڑھے بھوک پیاس کے ہاتھوں راستے میں مر کھپ گئے، میلوں تک یہ لوگ پیدل منظم طور پر جبری اجتماعی نقل مکانی کے لیے چلتے رہے، منزل دشوار، راستہ کٹھن، نہ انتہا کی خبر، نہ ابتدا معلوم، بھوک، پیاس اور افلاس نے ہزاروں کو راستے ہی میں موت کی وادی میں پہنچا دیا۔ یورپی آبادکار انھیں ہمسائے کے طور پر کسی صورت قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔

تہذیب انسانیت کے علمبردار اپنے سوا کسی کو انسان ماننے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ ہمسایہ تو وہی بن سکتا ہے جو ہم جنس ہو، صحبت ناجنس یورپی آبادکاروں کو گوارا نہ تھی، Hoxie کے مطابق یہ حکمت عملی طے کر لی گئی تھی کہ KILL THE INDIAN SPARE THE MAN اس حکمت عملی کی تفصیل پڑھیے

The late 19th century eventually saw some moderation into a combination of cultural suppression and segregated assimilation, a policy sometimes known as "kill the Indian, spare the man." Indians were now assimilated as a marginalized underclass on peripheral reservations. [Page No.90]

قبولیت عیسائیت اور سرخ ہندی:

اس دور میں بعض رحم دل لوگ بھی زندہ تھے جو سرخ ہندی وحشیوں کو انسان بنانا چاہتے تھے لیکن اسے نہایت مشکل کام سمجھتے تھے، ان کے خیال میں سرخ ہندی غیر تعلیم یافتہ، غیر متمدن، مرکزی قیادت سے عاری وحشی نسل تھے جو اپنی بھوک مٹانے کے لیے کوئی بھی طریقہ آزما سکتے تھے۔ یہ کام بہت مشکل تھا کہ اس وحشیانہ نسل Savage Race کو ایک ایسے معاشرے میں تبدیل کر دیا جائے جو انسانیت پسند، عیسائی، تمدنی اور صنعتی اثرات کا حامل ہو۔ رحم دل لوگوں کی نظر میں سرخ ہندی کیا تھا اس کا اندازہ سرخ ہندیوں کے بارے میں ان کے رحم دلانہ خیالات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ یہ رحم دل لوگ جن میں Father Fremin Lasuen جیسے لوگ نمایاں تھے، سرخ ہندیوں کو زندگی کی ضمانت اس بنیاد پر دینا چاہتے تھے کہ انہیں عیسائی بنا لیا جائے اور انہیں اپنی تہذیب و ثقافت میں ضم کر لیا جائے اس کے سوا سرخ ہندیوں کی بقاء زندگی اور حفاظت کا کوئی طریقہ نہیں تھا۔ مائیکل من کے مطابق:

He wanted to save the Indians through conversion and assimilation. He knew this was difficult. Indians were "without education, without government, religion, or respect for authority, and they shamelessly pursue without restraint whatever their brutal appetites suggest to them." How could he transform "a savage race... into a society that is human, Christian, civil and industrious"? "This can be accomplished only by denaturalizing them. It is easy to see what an arduous task this is, for it requires them to act against nature. But it is being done successfully by means of patience and by unrelenting effort." Indians were in a "state of

nature," different from the Spanish gente de razon, people of reason. While in their state of nature, created by God, they were to be treated benignly as free men. Though savages, they could not be exploited, still less driven away or killed. [Page No.87]

عیسائیت کے مظالم سرخ ہندیوں پر:

البتہ ایک بات یہ تھی کہ عیسائیت قبول کرنے کے بعد بھی ان کی زندگی غم والم سے نشاط وطرب کی طرف لوٹنے سے قاصر تھی، جلاوطنی کا دکھ سہنے کے بعد طوعاً یا کرہاً یا برضا و رغبت عیسائیت قبول کرنے کے باوجود ان کی زندگی کے شب و روز انسانوں کے شب و روز سے مختلف تھے، عیسائیت قبول کرتے ہی وہ دائمی قیدی بن جاتے تھے انھیں جبری مشقت کے کاموں میں شریک ہونا پڑتا جس میں یہ جبر بھی شامل تھا کہ وہ لاطینی زبان میں طویل مناجات پڑھیں، جس کا ایک لفظ بھی وہ سمجھنے سے قاصر تھے، اگر وہ ان امور سے چھٹکارا پانے کا سوچتے اور وہ کام یا دعا سے فرار اختیار کرتے تو انھیں کوڑے مارے جاتے اور مجبور کیا جاتا کہ وہ لاطینی زبان میں مزید مناجات کا ورد کریں، صرف یہی نہیں ان جرائم کی سزا اور بھیانک تھی، کبھی زنجیروں میں جکڑے جاتے، کبھی ان کے ہونٹ گرم لوہے سے داغے جاتے، ان کے لیے فرار کے تمام راستے بند تھے کیونکہ فرار ہو کر کہاں جاتے، کوئی ان مفلوک، بے بس، درماندہ انسانوں کو پناہ دینے کے لیے آمادہ نہ ہوتا۔ نہایت خراب خوراک اور شدید محنت کے باعث ان کی صحت گرتی ہوئی دیوار تھی، ان کے جسم کے کھنڈرات بتاتے تھے کہ یہ عمارتیں کبھی عظیم الشان بھی رہی ہوں گی، صحت کے ان کھنڈرات پر وباؤں، بیماریوں کا زبردست حملہ جاری رہتا اور ان حملوں میں بچ جانے کا امکان برائے نام ہوتا، لاکھوں سرخ ہندی اسی طرح مرنے پر مجبور کیے گئے۔ یہ موت رحم دلوں کی طرف سے عطا کردہ رحم دلانہ موت تھی، جو قاتلوں کے خیال میں شاید اس موت سے بہتر تھی جو سنگ دلانہ طریقے پر پہلے عطا ہوئی تھی۔

But once Indians were baptized, everything changed. They were now under the authority of the order, and the order became a prison. Long hours of forced work in the fields were followed by hours of forced prayers in Latin, of which they understood not a word. Indians girls were locked up at night. If Indians showed any independence, or refused to work or pray, they were shackled and whipped and forced to recite more Latin. If they ran away, the soldiers forcibly brought them back, shackled them, and whipped them more. Sometimes they would crop off an ear or brand a lip. The Indians had difficulty escaping, since

independent Indian villages would not take them in. [Page No.88]

رحم دلی کے آغاز، ارتقاء اور اختتام کی کہانی مائیکل مین نے تین سطروں میں کفنا دی ہے۔ جبر ظلم کی یہ تاریخ اس بات کی شہادت ہے کہ عیسائیت کا زوال اس وجہ سے بھی ہوا کہ وہ نسلی امتیاز کے راستے پر رواں دواں ہو گئی، آج تک کلیسا کا اسقف اعظم افریقہ کا حبشی پادری منتخب نہیں ہو سکا، پوپ پال کی نجی سپاہ جو دنیا کی مختصر ترین فوج ہے اس کے سپاہی ہمیشہ سوئٹزرلینڈ کی گوری نسل سے لیے جاتے رہے، دو سال قبل پہلی مرتبہ سپاہ مختصر میں دو کالے سپاہیوں کو بھرتی کا پروانہ عطا کیا گیا۔

The Franciscans committed local ethnocide, unintentional but devastating. Half of California's Indians died during the mission period, almost all from diseases introduced there amid a population weakened by too much coerced work and too little food. [Page No.88]

سرخ ہندیوں کی عبرت ناک اموات:

۱۸۴۸ء میں کیلی فورنیا کو ملک میکسیکو سے کاٹ کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست بنا دیا گیا جس کے نتیجے میں سرخ ہندیوں کے بالارادہ قتل میں حیرت انگیز اضافہ ہوا، اس قتل عام کی سب سے بڑی وجہ جبری امراض اور بھوک سے زوال پذیر قوت مزاحمت کے باعث بیماریاں تھیں، صرف دس فی صد سرخ ہندی براہ راست قتل کیے گئے جب کہ ساٹھ سے ستر فی صد مقامی آبادی کو بھوک، قحط، نسل کشی، عورتوں مردوں کی شادیوں پر قدغن، کم شرح افزائش اور خطرناک بیماریوں کے ذریعے جو محض اتفاقی اور حادثاتی نہیں تھیں، قسطوں میں ہلاک کر دیا گیا۔ جبری غذائی قلت کا شکار یہ سرخ ہندی جو سالوں سے قوت مزاحمت سے محروم ہو رہے تھے، ان بیماریوں کا خاص نشانہ تھے، اگر ان کے جسم تومند ہوتے، انھیں پیٹ بھر کر مناسب خوراک وقت پر ملتی ان کی صحت قابل رشک ہوتی تو یقیناً یہ بیماریوں کا مقابلہ کر سکتے تھے، لیکن ان کو لاغر، کمزور، ناتواں شاید اسی لیے رکھا گیا تھا تا کہ یہ بیماریوں کے پھیلائے جال میں آسانی سے لقمہ اجل بن سکیں اور ان کی موت کا ذمہ دار گردش سماں کو ٹھہرایا جائے اور قاتل ہر الزام سے بری ہو جائیں۔ بیماریوں، وبائی امراض سے بچاؤ کے لیے حکمران طبقات اور یورپی آباد کاروں نے کوئی اقدام نہیں کیا، سرخ ہندیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا، یہ مہذبانہ قتل عام تھا، پہلے عیسائی بنایا گیا پھر بھوکا مارا گیا، پھر بیماریوں کے علاج کے لیے سہولت مہیا نہیں کی گئی اس کے برعکس حبشی غلاموں کو بیماریوں سے تحفظ کے لیے سفید فام یورپی آباد کاروں نے بھرپور حفاظت کی، انھیں چیچک سے بچایا گیا کیونکہ وہ قیمتی اور کارآمد تھے، اس کے برعکس سرخ ہندیوں کو مرنے دیا گیا بلکہ حبشیوں کے اتارے ہوئے کمبل سرخ ہندیوں کو دیے گئے تا کہ وہ چیچک سے مر جائیں۔ مائیکل مین کے الفاظ میں اس المناک باب کو پڑھیے:

In California the interlinked categories of disease, malnutrition, and starvation killed somewhere around 60-80 percent of natives, direct killing about 10 percent, with most of the remainder attributable to reproductive failure. Deliberate killings were usually in cold blood or in situations of such an imbalance of force that the appellation murder is applicable. But none of these categories are entirely separable from each other. Malnutrition, starvation, and low fertility often resulted predictably from settler policy, while diseases were not entirely accidental. Diseases spread most rapidly where malnourished natives were herded closely together, as in California missions and the many U.S. Indian reservations located on marginal lands. The settlers were not ignorant of the disease mechanisms involved, yet they rarely took steps against epidemics to which they themselves were immune. Nor were they unhappy with the results. Nash (1992: 300-1) compares the white responses to the spread of disease among Indians and black slaves. Since slaves were valuable, the white community tried to combat epidemics among them. Slaves were inoculated against smallpox. Indians were not. Indeed, some settlers fomented disease. Reports of donations of disease-ridden blankets to Indians have become notorious, though rare. [Page No.89]

کیلی فورنیا: سرخ ہندیوں کا قبرستان

کیلی فورنیا میں سرخ ہندیوں پر گزرنے والی شب ستم، آنسوؤں اور لہو سے تحریر کرنے کے قابل ہے۔ ان انسانوں کو براہ راست قتل کرنے کے بجائے قسطوں میں موت کشید کرنے کے لیے کیسے کیسے طریقے اور تجربے کیے گئے اس کا تصور کرنے سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ سرخ ہندیوں کی عورتوں کو مردوں سے الگ کردیا گیا تاکہ نسل میں اضافہ نہ ہو اور سرخ ہندی مرد لواطت کے ذریعے جسمانی عوارض میں مبتلا ہوجائیں۔ عورتوں کو طوائف بننے پر مجبور کیا گیا اور پھر جن طوائفوں کو خطرناک جنسی بیماریاں منتقل ہوئیں انھیں جنسی خدمات انجام دینے کے لیے سرخ ہندی مردوں کے سپرد کردیا گیا تاکہ یہ بیماریاں ان میں منتقل ہوجائیں اور وہ تڑپ تڑپ کر جان دے دیں۔ سرخ ہندیوں کو شراب کا رسیا بنایا گیا تاکہ ان کی اخلاقی اقدار زوال پذیر ہوجائیں اور ان کی ہلاکتیں

میں مزید اضافہ ہوا۔ یہ شراب مشنریوں اور حقوقی پابندیوں کے باوجود محنت کے عوض مہیا کی جاتی تھی۔ جنسی بیماریاں، کمزور صحت اور تولیدی صلاحیتوں کے خاتمے کا باعث بن گئیں۔ ۱۸۴۸ء سے ۱۸۶۰ء تک کیلی فورنیا کی سرخ ہندی آبادی پندرہ لاکھ سے کم ہو کر صرف اکتیس ہزار رہ گئی جب کہ سفید فاموں کی آبادی ۲۵ ہزار سے بڑھ کر ساڑھے تین لاکھ ہو گئی۔ ۱۸۶۰ء میں سرخ ہندیوں کی مردم شماری کے مطابق ان کی تعداد میں کمی کا اہم عامل مردوں اور عورتوں کی بالجبر علیحدگی تھی۔ سرخ ہندی عورتیں اپنے دشمنوں کے بچوں کو جنم دیتی تھیں لیکن انھیں اس بات کی اجازت نہ تھی کہ وہ اپنے بچوں کو جنم دے سکیں اور اپنی نسل کو زمین و آسمان دیکھنے کے لیے دنیا میں آنے دیں تا کہ وہ مردوں کے لیے راحت کا سامان بن سکیں۔ سرخ ہندی جنسی راحت کے لفظ سے نا آشنا ہو گئے تھے۔ ان کی زندگی بدترین زندگی تھی، انھیں محض اپنی زندگی کی بقاء کے لیے محنت کی اجازت تھی تا کہ وہ زندگی اور موت کے مابین معلق رہیں اور آقاؤں کی غلامی کا شرف حاصل کریں۔

جمہوریت اور بہیمیت کا فطری تعلق:

سرحدی علاقوں سے منتخب ہونے والے ریاستی سطح کے افسران انتہاپسندی میں سب سے آگے تھے۔ وہ زمینوں پر ناجائز قبضے اور اس پر مزاحمت کے عمل سے نپٹنے کے لیے زیادہ سخت حکمت عملی اختیار کرتے تھے۔ ۱۸۲۰ء اور بالخصوص ۱۸۳۰ء کے عرصے میں شمالی قانون ساز ادارے نے کامیابی سے بے دخلی کا عمل شروع کر دیا اس بات کی پرواہ کیے بغیر کہ اس سفر کے اختتام پر سرخ ہندیوں پر کیا گزرے گی۔ سرخ ہندیوں کو بے دخل کیے جانے کے بعد ان سے خالی ہو جانے والی زمینوں کی امداد اور محصولات سے حاصل ہونے والی رقوم پر کئی مقامی سیاستدانوں نے خوشی کا اظہار کیا۔ یہ جمہوری رویہ تھا، جمہوریت اور بہیمیت وحشت و درندگی لازم و ملزوم ہیں انھیں اس بات پر یقین تھا کہ سرخ ہندیوں کی بے دخلی کے بعد ان علاقوں سے وہ دوبارہ منتخب ہو جائیں گے کیوں کہ سرخ ہندیوں کے حق میں بیانات دینے والے انتخابی عمل میں کامیابی کا کوئی امکان نہیں پاتے تھے لہٰذا جمہوری عمل کا تقاضہ یہی تھا کہ اپنے حلقہ انتخاب کی خواہش، تمنا اور آرزوؤں کی صورت گری کی جائے یہی جمہوریت کا سیاہ چہرہ ہے جو لوگوں کو مفاد کا اسیر اور حرص و حسد کا غلام بنا دیتی ہے۔

سرخ ہندیوں کو مارنے کی آزادی:

کیلی فورنیا میں صورت حال واضح تھی۔ ۱۸۵۰ء میں جب جمہوریت اپنی انتہائی جدید شکل میں موجود تھی کیلی فورنیا کے آئین میں سفید فام مردوں کے حق رائے دہی کو یقینی بنایا گیا انھیں اس بات کا بھی اختیار دیا گیا کہ سرخ ہندی اپنے مخصوص علاقوں سے نکل کر کہیں پھرتے ہوئے نظر آئیں تو انھیں طاقت سے بھگا دیا جائے یا مزدور بنا لیا جائے، اس میں بچوں کی بھی تخصیص نہیں تھی۔ قانون سازی کے ذریعے آبادکاروں کی ملیشیا کو پکڑ دھکڑ کی مکمل خود مختاری دے دی گئی اور اس کے لیے ۱۸۵۰ء اور ۱۸۵۱ء میں گیارہ لاکھ ڈالر ادا کیے گئے۔ سرخ ہندیوں

کے لیے مخصوص کیے گئے علاقے انتہائی چھوٹے اور بالکل بے آباد زمینوں پر تھے ان میں اتنی گنجائش نہیں تھی کہ مزید بے دخل کیے جانے والے سرخ ہندی سما سکیں۔ بے دخل کیے جانے کا مطلب ان کی موت تھا اس پر قانون سازوں نے کبھی بھی تنقید نہیں کی۔

سرخ ہندیوں کے خلاف، ان کے خاتمے تک جنگ کا اعلان:

گورنر برنٹ Burnett کو اس وقت مشکل صورتحال کا سامنا کرنا پڑا جب اس نے بعض تحفظات کی وجہ سے سرخ ہندیوں کے ساتھ مصالحت سے انکار کر دیا اس کے بعد سرخ ہندیوں کے لیے خطرات بڑھنے لگے اور یہ تنازع نسل کشی تک پہنچ گیا۔ سرخ ہندی زمینوں پر سفید فاموں کا قبضہ اور اس کے جواب میں سرخ ہندیوں کی مزاحمت کی وجہ سے وہ سرخ ہندی جو اب تک منتشر تھے جنگی سربراہوں کے زیر اثر منظم ہونے لگے تھے۔

[Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian (Phillip 1975- Chp3-5) Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.]

Not to conciliate but to escalate to نے قتل عام کا اعلان کیا اور کہا Burnett

genocide برنٹ نے اعلان کر دیا کہ:

A war of extermination will continue to be waged between the two races until the indian becomes extinct.

"دو مختلف نسلوں کے درمیان جنگ سرخ ہندیوں کے مکمل خاتمے تک جاری رہے گی اس کے پیش نظر

(Hurtado 1988:134-6) The ہے۔ Mc Dougall نے اعلان کیا کہ کئی قبائل کا خاتمہ لازمی ضرورت ہے war must of necessity be one of extermination to many of the tribes. [Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.]

ہٹلر اور کیلی فورنیا کے گورنروں کا تقابل:

تاریخ بتاتی ہے کہ ہٹلر نے بھی کبھی ان انتہاپسند گورنروں کی طرح ایسے بے باک بیانات نہیں دیے وہ جانتا تھا کہ جرمن اس کو مسترد کر دیں گے جبکہ ان گورنروں کو یقین تھا کہ سفید فام آبادی ان وحشیانہ بیانات کو بخوشی قبول کرے گی۔ لہٰذا وہ سرخ ہندیوں کے خلاف زہر افشانی کرتے رہے جبکہ ہٹلر نے ایسا نہیں کیا۔ ان کے بعد آنے والا گورنر Birglar ان سے مختلف نہیں تھا فوج کے نام ایک خط میں اس نے سرخ ہندیوں کے بارے میں لکھا:

the acts of these Savages are sometimes signalized by a ferocity worthy of. . . cannibals . . . They seem to cherish an instinctive hatred toward the white race, and this is a principle of their nature, which neither time nor vicissitude can impair. This principle of hatred is hereditary . . . The character and conduct of these Indians . . . [means] . . .that Whites and Indians cannot live in close proximity in peace.

''ان وحشیوں کے افعال آدم خوروں کی طرح خونخوار ہوتے ہیں وہ سفید فاموں سے اندرونی نفرت پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی فطرت کا مظہر ہے جسے نہ تو وقت نہ کوئی اور شے تبدیل کرسکتی ہے۔ نفرت کا یہ اصول وراثتی ہے۔ سرخ ہندیوں کا یہ رویہ اور کردار اس بات مظہر ہے کہ سفید فام اور سرخ ہندی امن کے ساتھ ایک جگہ نہیں رہ سکتے''۔

سرخ ہندیوں کے خلاف نفرت کی تاریخ:

Birglar نے اپنے خط کا اختتام فوج سے اس مطالبے پر کیا کہ وہ چوڑے علاقوں [countries] سے تمام سرخ ہندیوں کو نکال باہر کرے۔ کہاں؟ اس بات کا جواب اس نے نہیں دیا اس کام کے لیے اس نے کیلی فورنیا کی ملیشیا کی خدمات پیش کیں۔ (Heizer; 1993:189-91) [Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska]

تمام سرحدی ریاستوں کے سیاست دان، آباد کار اور اخبارات اسی قسم کے تشدد آمیز جذبات رکھتے تھے اور اسی طرز عمل کے زبردست حامی تھے۔ اسی قسم کے جذبات کا اظہار Minnesota کے گورنر Ramsey نے کیا اس نے اعلان کیا:

سرخ ہندی: ''شہر بدر کردو یا ختم کردو'':

''سی او Sioux سرخ ہندیوں کو لازمی طور پر ختم کردینا چاہیے یا ان کو ہمیشہ کے لیے ریاست کی سرحد سے نکال باہر کیا جائے۔'' اس زمانے کا مقبول نعرہ تھا "Exterminate or Banish" ''ختم کردو یا شہر بدر کردو'' تھا۔ جنرل سلی جو کیلی فورنیا میں ویز کھالوں کا تاجر تھا سرخ ہندیوں اور وفاقی حکومت دونوں کو فریب دینے کے لیے مشہور تھا اس نے سانتی سیاؤں قبیلے کو ختم کرنے کے لیے جنگ شروع کی اور اس میں کامیاب ہوا اس نے 770 جلاوطن کیے جانے والے سانتی قبیلے کے افراد کو سینٹ پال کی دخانی کشتی کے ذریعے بے دخل کیا سفید فام دریا کے کنارے کھڑے ان پر پتھر برساتے اور ان کے ساتھ بدسلوکی کرتے۔ (Brown 1970;50-65)

[Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

اخبارات کی جانب سے قتل عام کی حمایت:

ریاست کولوراڈو کا گورنر بھی اسی قسم کے نفرت انگیز، متشددانہ، غیر انسانی جذبات کا حامل تھا اس کی ریاست کے تمام اخبارات جو آزادیٔ صحافت کے علمبردار تھے اس کے نسلی اور متشدد جذبات کے طرف دار تھے اور اس کی مدح میں رطب اللسان رہتے تھے۔ Denver کے اخبارات نے اس کی تعریف کی۔ ان اخبارات نے ۱۸۶۳ء میں ظلم و جبر کی ستائیس کہانیوں میں سے ۱۰ واقعات جو سرخ ہندیوں کے قتل سے متعلق تھے، ان کی کھلم کھلا حمایت کی۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ اس زمانے کے اخبارات، سیاست دان، عدالتیں، حکومتیں، فوج، مسیحی ادارے کلیسا اور رہنما عظیم کی اخلاقی، ذہنی اور نفسی صورت حال کس قدر بدترین تھی۔ (Churchill 1997; 172)

[Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.]

چار سفید فاموں کے قتل کا بدلہ: ۱۴۴ لوگوں سے!

۱۸۷۱ء میں مویشی اور سفید گھوڑے چوری کرنے کی دو سرخ ہندی چھاپہ مار کارروائیوں کے جواب میں جس میں چار سفید فام باشندے ہلاک ہوئے Tuscon کے شہریوں کی سربراہی میں ایک ٹیم نے سرخ ہندیوں کے ایک قبیلے اپاچی کے گاؤں پر حملہ کر دیا جس کا اس چھاپہ مار کارروائی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ۱۴۴ لوگوں کو ہلاک کیا گیا جن میں مرد صرف آٹھ تھے باقی ۱۳۶ عورتیں تھیں، اکثر عورتوں کی پہلے عصمت دری کی گئی۔ مقامی اخبار Denver News نے قاتلوں کو مبارکباد دی اور اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ مرنے والوں کی تعداد دوگنی ہو سکتی تھی۔

عدالتوں میں بے انصافی کی کہانی:

مشرقی علاقے میں غضب کی اس صورت حال کو ''غالصتاً قتل'' قرار دیا گیا اور باغیوں کے سربراہ کو عدالت میں پیش کرنے پر دباؤ ڈالا گیا۔ عدالت میں اس کے خلاف کافی شہادتیں پیش کر دی گئیں لیکن عدالت نے ان افراد کو بری کرنے میں صرف انیس منٹ کا وقت لگایا۔ یہ اس زمانے کا انصاف تھا (Brown 1970: ۔I)

[Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: 202-5;cocker, 1998:220 An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

[Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.]

عدالتیں: سرخ ہندی کی شہادت قبول نہیں

بہت ہی کم سفید فام شہری قاتلوں کے طور پر عدالت میں مجرم پائے گئے جبکہ عدالت اس مقابلے میں

مستقل مزاجی سے اس روش پر قائم رہی کہ وہ سفید فاموں کے خلاف کسی سرخ ہندی کی شہادت قبول کرنے پر تیار نہ تھی، یا اس زمانے کی مہذب عدالتیں تھیں۔(for california, see Heizer, 1993:II-14)

[Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.]

سرخ ہندیوں کے خلاف جیفرسن اور واشنگٹن کے احکامات:

اگر وفاقی حکومت اور فوج سرخ ہندیوں کی حفاظت کا فریضہ انجام دیتی تو مشنری، آبادکار اور اخبارات اس پر خوب شور مچاتے تھے۔ سفید فاموں کے درمیان تمام اختلافات اس وقت ختم ہو جاتے جب کوئی سرخ ہندی مزاحمت کرتا یا کسی سفید فام مرد یا عورت کو قتل کر دیتا۔ Modoc قبیلے کے سرخ ہندیوں نے اوریگان اور کیلی فورنیا کی سرحد پر جنرل کینبی کو پکڑ کر قتل کر دیا یہ بات یورپی آبادکاروں کے قومی غم و غصے کا سبب بن گئی اور پوری آبادی میں انتقام کی آگ پھیل گئی۔ جنرل شرمان نے نہ صرف قاتلوں کے گروہ کے قتل کا مطالبہ کیا بلکہ بکھرے ہوئے تمام قبیلوں کے خاتمے کا مطالبہ کیا۔ امریکی فوجیوں اور سوانی لاکوتا قبیلے کے درمیان ایک جھڑپ میں ۸۰ امریکی فوجیوں کی ہلاکت پر جنرل شرمان کو اپنے اس دعوے پر عمل کا موقع مل گیا۔ اس کا کہنا تھا کہ سوانی قبیلے کے مردوں، عورتوں اور بچوں کے خاتمے تک ہمیں نہایت سنجیدگی اور مستقل مزاجی سے ان کے خلاف لڑنا ہوگا۔ ایک اور شخص جارج آرمسٹرانگ کی موت پر اس قسم کے قومی غم و غصے کا اظہار کیا گیا۔ اس کے نتیجے میں نہ ختم ہونے والی جنگ شروع ہو گئی جو ۱۸۸۱ء میں تمام سوانی زمینوں پر قبضے اور ان کے مکمل ہتھیار ڈالنے پر ختم ہوئی سرخ ہندیوں کی مزاحمت کو روشن خیال صدور کے دور میں سختی سے کچلنے کے اسباب مہیا کیے گئے اور بے دخلی سے انکار پر نسل کشی کی دھمکی دی گئی۔ بیسویں صدی کے مشہور ترین صدور "تامس جیفرسن" سے "جارج واشنگٹن" تک اس معاملے میں روشن خیالی کو بالکل بھول گئے۔

جارج واشنگٹن: سرخ ہندی بھیڑیے ہیں:

جارج واشنگٹن نے اپنے جنرل کو ہدایت کی تھی کہ وہ اڑوکوا قبائل Iroquois پر حملہ کر دے اور 'Lay waist all settlement-that the country may not be over run but destroyed and not to listen any over tune of peace before the total ruin of their settlement is "effected" "ان کی آبادیوں کو تباہ و برباد کر دیں ان کی تمام باقیات کے خاتمے تک امن کا کوئی نغمہ سننے کی ضرورت نہیں ہے"۔ اس نے سرخ ہندیوں کو بھیڑیوں سے تشبیہ دی کہ دونوں وحشی شکاری ہیں صرف شکلوں کا فرق ہے۔ Indians are wolves both being beasts of prey though they different in shape. اس نے اعلان کیا کہ تمام سرخ ہندیوں کو مسی سی پی کے مغرب کی طرف دھکیل دیا جائے اور مزاحمت کرنے والوں کو

طاقت سے کچل دیا جائے۔ جیفرسن نے بھی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں اپنا لہجہ تبدیل کر لیا۔

جیفرسن: سرخ ہندیوں کی جڑیں کاٹ دو

the root-and-branch destruction of hostile tribes or driving them beyond the Mississippi: "nothing is more desirable than total suppression of their savage insolence and cruelties"; "This then is the season for driving them off"; their "ferocious barbarities justified extermination"; "if ever we are constrained to lift the hatchet against any tribe, we shall never lay it down till that tribe is exterminated, or driven beyond the Mississippi . . .. In war, they will kill some of us; we shall destroy all of them."

جیفرسن مسلسل حکم دیتا کہ دشمن قبیلوں کی جڑیں کاٹ دو یا پھر انھیں مسسی سپی کے پار دھکیل دو۔ اس کا کہنا تھا کہ ان وحشی قبیلوں کے مکمل خاتمے کے سوا کوئی بات اہم نہیں ہے۔ یہی ان کے نکال باہر کیے جانے کا وقت ہے۔ ان کی وحشی حرکتیں قتل عام کا جواز ہیں۔ اگر ہم ان پر ہتھیار اٹھانے پر مجبور ہوئے تو ہم اسے ان کے مکمل خاتمے تک نیچے نہیں رکھ سکیں گے۔ جنگ کی صورت میں وہ ہمارے چند افراد کو قتل کریں گے ہم ان کے تمام افراد کو قتل کر دیں گے۔ ۱۸۱۳ء میں اس کا خیال تھا کہ کریک قبیلہ شکست کے بعد معافی کی یہ شرط قبول کرے گا کہ وہ اپنی تمام آبادی کو مسسی سپی سے باہر لے جائیں ورنہ ہم انھیں مجبور کر دیں گے۔ یوں جیفرسن اور دیگر واشنگٹن نے برطانیہ جیسے تہذیب یافتہ دشمن کے خلاف یہ زبان استعمال کی۔ جیفرسن نے سفید فاموں کے زمینوں پر قبضے کی مکمل پشت پناہی کی اس کے دورِ صدارت میں دو لاکھ مربع میل سرخ ہندی زمینوں پر اس کے کاشتکاروں نے قبضہ کیا۔

جیفرسن کے خوں خوار احکامات: تحلیل، بے دخلی یا قتل

اس قبضے کے لیے جیفرسن کا فرمودہ تھا کہ وہ سرخ ہندیوں کو قرضے میں جکڑتے اور پھر اس کے بدلے وہ انھیں اپنی زیرِ ملکیت زمین بیچنے پر راضی کر لیتے۔ اس طرح سرخ ہندی اپنی آبائی شکاری زمین سے محروم ہوتے گئے۔ جیفرسن نے اپنے حکام کو حکم دے رکھا تھا:

trick the Indians into debt, forcing them to sell their lands. With inadequate land left for hunting, they would have to learn agriculture and then assimilate. If they resisted this, they must be crushed; if they merely languished and starved, that proved the inevitability of their end.

اگر وہ اس پر مزاحمت کرتے تو ان کو کچل دیا جاتا اور اگر وہ فاقہ کشی کرتے تو ان کا خاتمہ لازمی تھا۔

جیفرسن کی ترجیح Assimiation تھا اس کے بعد وہ بے دخلی Deportation کا قائل تھا اگر یہ بھی ناکام ہو جائے اور مزاحمت ہو تو وہ قتل عام کا فیصلہ کرتا جیفرسن کا کہنا تھا کہ وہ ہندی نسل کی سفید فام نسل کے ساتھ برابری کا قائل ہے مگر اعلیٰ تہذیب ہمیشہ کمتر تہذیب پر غالب آتی ہے۔

he believed in the inherent racial equality of Indians (unlike blacks) with whites (Wallace, 1999: 78), but higher must triumph over lower civilizations.

اگرچہ امریکیوں کی اکثریت اس بات سے واقف ہے کہ یہ دونوں صدور واشنگٹن اور جیفرسن غلام رکھتے تھے مگر ہندیوں کے لیے ان کے غیض و غضب کی تاریخ سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

سرخ ہندیوں کے خلاف جیکسن کا اعلان جنگ:

صدر امریکہ اینڈریو جیکسن کے دور صدارت میں صرف تمام سفید فام مردوں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ اگرچہ وہ ہندیوں کا حامی مشہور تھا اصلاً جیکسن محض ایک عقلمند سیاست دان تھا جو کہ شمالی ریاستوں کے دباؤ پر بے دخلی کی قانون سازی پر راضی ہو گیا اور سفید فام اور ناجائز قابضین کے خلاف ہندیوں کے دفاع کے حق میں تھا مگر اس کا خیال تھا کہ بے دخلی سرخ ہندیوں کی حفاظت کا واحد حل ہے۔ (Prucha 1994) [Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.] یہ در اصل ایک نقاب تھا، سرخ ہندیوں نے بے دخلی پر احتجاج کیا تو وہ غضب میں آ گیا۔ صرف ایک سفید فام عورت کو کریک قبیلے کے افراد نے یرغمال بنا لیا تو اس نے انتہائی اشتعال اور غیض و غضب کی حالت میں اعلان کیا کہ ”میں ان کے قصبوں میں گھس کر یرغمال اور اغوا کرنے والے دونوں کو برآمد کروں گا اور مجھے اس بات میں کوئی جھجک نہیں ہے کہ میں ان کے دیہاتوں کو برباد کر دوں ان کے گھروں کو آگ لگا دوں ان کے جنگجوؤں کو ختم کر دوں، ان کی بیویوں اور بچوں پر قبضہ کر لوں، جب تک کہ یہ ہتھیار نہ ڈال دیں“۔

"I shall penetrate the Creek Towns, until the Captive, with her Captors are delivered up, and think myself justifiable in laying waste their villages, burning their houses, killing their warriors and leading into captivity their wives and children, untill I do obtain a surrender of the Captive, and the Captors." Prucha (p. 212)

جیکسن کے زہریلے ارشادات: سرخ ہندی بھیڑیے

ایک اور موقع پر جیکسن نے سرخ ہندیوں کو ”دھوکے باز“ اور ”نافرمت پسند“ کا طعنہ دیا اس نے اعلان کیا

کہ "ہمارے مقتولین کا مرحفاظت سے رکھا ہے۔ وہ یہ کہتا تھا کہ ہندیوں سے ڈرنا ان سے محبت کرنے سے بہتر ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ سرخ ہندی بچوں اور عورتوں کو بھی قتل کردیں۔ ایسا نہ کرنا بھیڑیے کو جھولے میں کھلانے کے مترادف ہوگا یہ جانے بغیر کہ وہ کب بھیڑیا بن کر کچھار میں جا پہنچے۔

"the blood of our murdered countrymen must be revenged. The banditt ought to be swept from the face of the earth." He boasted, "I have on all occasions preserved the scalps of my killed." In principle he believed that "fear is better than love with an Indian." He urged his soldiers to kill women and children. Not to do so would be like pursuing "a wolf in the hammocks without knowing first where her den and whelps were."

اس کے ان بیانات نے اس کے لیے صدارت کی راہ ہموار کی۔ اس نے اپنے دورِ صدارت میں ہندیوں سے معاہدے کو توڑ ڈالا اور سرخ ہندیوں کی جبری بے دخلی کا عمل شروع کردیا۔ اس کا دعویٰ تھا کہ اس کا ۱۸۳۰ کا Removal Act رحم دلانہ تھا۔ جبکہ اس کے نتیجے میں مشہور ٹرائل آف ٹیرز (Trial of Tears) میں کریک قبیلے کے دس ہزار چیروکی قبیلے کے چار ہزار اور چاکٹا قبیلے کے چار ہزار باشندے ہلاک کیے گئے۔

سرخ ہندیوں کے خلاف لنکن کی مہم جوئی:

سرخ ہندیوں کے معاملے میں لنکن کی بہت زیادہ شمولیت نہیں رہی۔ نوجوان سیاستدان کی حیثیت سے اس نے ہندیوں کے مخالف جنگجو تاثر قائم کرنے کے لیے Black Hawk جنگ میں اپنا عسکری تجربہ استعمال کیا اس نے zenchery Taylor کی وحشیوں کے عسکری استحصال اور winfield scot کے چیروکی قبیلے کی بے دخلی کے اقدامات کی تعریف کی۔ اس کے دور میں ہندی ایک جزوی مسئلہ تھے صرف ایک دفعہ سرخ ہندیوں کے خلاف ہولناک بڑا فیصلہ کرنے کی ضرورت پیش آئی جب اس نے Minnesota میں عسکری حملے اور ہندی زمینوں پر قبضے کا حکم جاری کیا اس فیصلے کی وجہ سے ۱۸۶۲ء میں مقامی قبیلہ بغاوت پر مجبور ہوا جس کو فوج نے کچل دیا اور ۳۰۹ مقامی افراد کو گرفتار کرلیا۔ لنکن کو ان افراد کی پھانسی کا فیصلہ کرنا تھا۔ انسانیت پسندوں اور قتل عام کے حمایتوں کی طرف سے دلائل جاری تھے۔ مقامی افراد اور گورنر Ramsey تمام افراد کے قتل کے حامی تھے تاہم اس نے ۳۹ افراد کی پھانسی کا فیصلہ کیا جو کہ امریکی عدالت کی تاریخ کا پہلا واقعہ ہے جب بیک وقت کثیر تعداد میں افراد کی پھانسی کا اعلان کیا گیا۔ جبکہ سزا پانے والوں کے خلاف کافی وشافی ثبوت موجود نہیں تھے۔ لنکن کے اس فیصلے سے کوئی بھی مطمئن نہ تھا مگر وہ خوش تھا کہ وہ ایک پیچیدہ صورتحال سے نکل آیا ہے۔ گرفتار شدگان کی اکثریت جیل کی اذیتوں کی وجہ سے ہلاک ہوگئی۔ لنکن کو یقین تھا کہ سرخ ہندی اعلیٰ نسل کے مقابلے میں جلد ہی ختم ہو جائیں گے۔ وہ

سرخ ہندیوں سے نفرت کرتا تھا اس نفرت کا اظہار لنکن نے ۱۸۶۳ء میں وائٹ ہاؤس میں ایک قبائلی وفد سے گفتگو کرتے ہوئے کیا۔

''پیلے چہرے والے لوگ لاتعداد اور خوشحال ہیں وہ زمین پر کاشت کاری کرتے ہیں۔ اور اپنی روٹی پیدا کر کے کھاتے ہیں اور وہ شکار کے کھیل کے بجائے زمین کی پیداوار پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ سرخ ہندی نسل کے برخلاف ایک ایسی نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو ایک دوسرے کو قتل کرنا اور ایک دوسرے سے لڑنا پسند نہیں کرتی''۔

the pale-faced people are numerous and prosperous because they cultivate the earth, produce bread and depend upon the products of the earth rather than wild game for a subsistence. This is the chief reason of the difference; but there is another . . . we are not, as a race, so much disposed to fight and kill one another as our red brethren. (Nichols, 1978: 187)

لنکن کے متعصبانہ خیالات کے چند ہی برس بعد ہی سفید فام مہذب انسانوں کے درمیان خانہ جنگی شروع ہوگئی لنکن کے الفاظ تاریخ نے مسترد کر دیے تھے۔ مہذب سفید فام سرخ ہندیوں کے ساتھ ساتھ اب ایک دوسرے کو بھی قتل کر رہے تھے۔ وحشی کون تھے تاریخ اس حقیقت سے نقاب الٹ رہی تھی۔ وحشت کا سفر کبھی ختم نہیں ہوا یہ سفر جاری تھا جاری ہے اور آئندہ بھی جاری رہے گا۔ جب تک کہ تمام دنیا پر اس کا تسلط قائم نہ ہو جائے۔ روز ویلٹ کے خیال میں مردہ ہندی بہترین آدمی ہے:

انیسویں صدی کے اختتام پر نسل کشی کا عمل ختم ہو رہا تھا امریکہ کے پانچویں عظیم جمہوریت پسند صدر تھیوڈور روز ویلٹ کو اس میں حصہ ڈالنے کی قطعاً ضرورت نہیں تھی اس نے قتل عام کے بارے میں کہا کہ اس کے سوا چارہ کار نہ تھا۔ ''It was ultimately beneficial as it was inevitable'' اس نے مزید کہا ''تمام جنگوں میں سب سے عظیم جنگ وہ ہے جو وحشیوں کے خلاف ہے میرے خیال میں بہترین سرخ ہندی وہ ہیں جو مر چکے ہیں اور میرا خیال ہے کہ دس میں سے نو ہلاک ہو چکے ہیں۔ اور دسویں کے بارے میں مجھے کوئی جستجو نہیں ہے۔

that the noblest of all wars was one of extermination against savages. "I don't go so far as to think that the only good Indians are dead Indians, but I believe nine out of ten are, and I shouldn't like to inquire too closely into the case of the tenth."

[Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.] [Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.] [Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.] [Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan Cape.]

Sheehan 1973: 206, 29, 244, Stannard (1992, 19-22, 245-6), Wallace (1997:65,235-8 and Cockor (1998: 206)

امریکی صدور کے اعلانات کا جمہوری پس منظر:

وہ جمہوریت پسند صدور جو اپنے حلقہ انتخاب کی ضروریات سے آشنا تھے ان کے اندر شاہی نسل پسندی زیادہ نظر آتی ہے۔ تاکہ اپنے حلقۂ انتخاب کی زیادہ سے زیادہ توجہ حاصل کرسکیں، اپنے حلقہ انتخاب میں مقبولیت کا جمہوریت میں صرف ایک ہی طریقہ اور ایک ہی راستہ ہے کہ رائے دہندگان کو ہرگز ناراض نہ کرو، ان کی خواہشات اور مطالبات کو پورا کرنے کے لیے اپنی جان لڑا دو یہ جمہوری عمل کا بنیادی نقص ہے اس نقص کی تلافی صرف انسانیت کے دعووں کے ذریعے ہی ممکن ہے عملاً کچھ نہیں ہوسکتا، لہٰذا جمہوری عمل میں شریک ان صدور نے جمہوریت کے تحفظ کے لیے جمہوری طریقوں کے عین مطابق ایسی حکمت عملیاں مرتب کیں جو ان ہجرت ماکس تیر سے بھی آگے بڑھ گئیں جو نسل کشی کے لیے اختیار کی گئی تھیں۔ زمینوں پر قبضہ کرنے کا عمل اور سرخ ہندی مزاحمت، ان آبادکاروں کے جیسے جذبات کا حامی تھا۔

مغربی فکر و فلسفے، سرمایہ دارانہ نظام، سرمایہ دارانہ شخصیت، مذہب دشمن اقدار، تصور نفس کے خود ساختہ نظریات، الوہیت انسانی کے دعووں اور آخرت کے انکار کے باعث جس خلق جدید کی تعمیر سترہویں صدی کے بعد ہوئی جس کے بارے میں فوکو نے کہا تھا کہ انسان تو اٹھارہویں صدی میں پیدا ہوا ہے اس انسان کے کردار، اخلاق، تہذیب، شرافت، اصول، روایت اور رواداری کی پوری تاریخ پانچ امریکی صدور واشنگٹن، لنکن، جیفرسن، روز ویلٹ اور جیکسن کے بیانات میں دیکھی جا سکتی ہے۔

مائیکل مین نے ان پانچ امریکی صدور کے بارے میں عجیب بات لکھی ہے:

How many of these presidents would be prosecuted today for genocide by an international war crime tribunal? Four I think excluding Roosevelt. [Page No.91]

نو کرو ڑ قتل: پچاس برس!

امریکہ میں ریاستی سطح پر امریکہ کے اصل باشندوں کے خلاف ظلم و جبر کے یہ ابواب تحریر کیے جا رہے تھے تو آبادکاروں کی سطح پر سرخ ہندیوں کے خلاف غم و غصہ، اشتعال، نفرت کے جذبات بہیمیت کی انتہا پر تھے۔

براعظم امریکہ کے اصل سرخ باشندوں کو صفحۂ ہستی سے مٹانے، ان کی آبائی زمینوں سے ہٹانے، ان کی نسلوں کو تباہ کرنے، انھیں برباد، تہس نہس کرنے کا یہ عمل پچاس برس میں تکمیل پذیر ہو گیا تھا۔ سرخ ہندیوں کا قتل عام کرنے کے لیے خوبصورت اصطلاحیں، دل فریب نعرے، دفاع کی حکمت عملی، اپنی مظلومیت کا ڈھنڈورہ اور سرخ ہندیوں کی وحشت و بربریت کی جھوٹی کہانیاں گھڑی جاتی تھیں۔ اس تمام عمل میں حکومت، ریاست، عدالت، اخبارات، کلیسا سب ہم آواز تھے کسی سرخ ہندی کی بیوی سے جبری زیادتی کی جاتی یا بھوکے سرخ ہندی بھوک سے مجبور ہو کر یورپی آبادکاروں کے جانور چوری کر کے ذبح کر لیتے یا کھا پی لیتے تو قیامت گزر جاتی۔

عدالت میں کیلی فورنیا کے ایک باشندے کو لایا گیا تو اس نے بیان دیا:

I believe for every beef that has been killed by then ten or fifteen Indians have been killed.

سفید فام مہذب آبادکاروں کے ہاتھوں سرخ ہندیوں کی زندگی کتنی اذیت ناک تھی اس کی تصویر درج ذیل ہے:

It editorialized about a man called McElroy who had a deer stolen from him. He retaliated by killing an Indian man and his squaw and wounding a third. Then McElroy was murdered as Indians also retaliated. But the death of a white man brought in the California militia. They found an Indian camp, killed 9 Indian men (the rest fleeing), and then butchered its 40 defenseless women and children. This newspaper reported on another occasion that a 36-strong militia unit looking for the killers of a white man found an Indian village and killed all but 2 or 3 of its 150 inhabitants - men, women, and children. The captain of another army unit wrote proudly, "The number killed I confidently report at not less than 75 and have little doubt it extended to nearly double that number." A captain of different sensibilities criticized a Californian rancher who killed two or three Indians, believing that an Indian had stolen some of his cattle. The next

day, the cattle were found. Indians then avenged their dead relatives by killing the rancher. The captain was now trying to prevent further escalation (Heizer, 1993: 42-3,63-79, 84-90, 95-7, 156-7, 245, 249-50).

گھوڑے چوری کرنے پر تمام سرخ ہندی واجب القتل ہو گئے:

ریاست مزوری Missouri کے تین سفید فاموں کا کہنا تھا کہ وہ ہر اس سرخ ہندی کو قتل کر دیں گے جو ان کے سامنے آئے۔ کیوں کہ سرخ ہندیوں نے ان کے گھوڑے چوری کر لیے تھے۔ ایک کے جرم پر پوری نسل کو معتوب قرار دینا کسی بھی جھگڑے کا نصف سبب بنتا تھا"۔ Madsen, B. (Madsen, 1994:316) 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.]

سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری یلغار:

سفید فاموں کا مقصد ہندیوں کا مکمل خاتمہ تھا اور سفید فاموں میں تفاوت کی وجہ محض ہتھیاروں یا ان کے نظم و ضبط کی برتری نہیں تھی بلکہ یہ اس غم و غصے کا بھی نتیجہ تھا کہ ایک کمتر، جنگلی اور بدتہذیب قوم ایک برتر قوم کے خلاف کس طرح شدید مزاحم تھی ان کی دنیا خوف، فساد اور ظلم کی وجہ سے گراوٹ کا شکار تھی جیسا کہ مختلف صدور کے بیانات سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سفید فاموں کی اکثریت ہندیوں کے مکمل خاتمے کی حامی تھی۔ اس سلسلے میں مزاحمت کی سب سے بڑی تحریک ۱۸۸۰ء کی سیاہ فاموں کو غلام بنانے کے خلاف ردعمل کی تحریک تھی، اگرچہ یہ بہت تاخیر سے شروع ہوئی مگر اس نے بہت سی جانیں بچائیں۔

قتل عام کرنے والی عسکری طاقت میں فوج اور آبادکاروں کی ملیشیا شامل تھی۔ فوج اپنے اسلحہ اور ابلاغی طاقت کے زور پر زیادہ ہندیوں کو قتل کر سکتی تھی۔ فوج کو امن قائم کرنے، سرخ ہندی چھاپہ مار کارروائیوں کو روکنے، سرخ ہندی تحاریک کو کچلنے، اور سرخ ہندیوں کو ان کے مخصوص علاقوں سے بے دخل کرنے کے کام تفویض کیے گئے تھے۔ ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے مختلف طریقے استعمال کیے جاتے تھے۔ فوج کے منصوبے کے مطابق سرخ ہندیوں سے مذاکرات کیے جاتے تھے کہ وہ یہ جگہ چھوڑ کر اپنے لیے مخصوص کیے گئے بے آباد خطوں میں چلے جائیں، جو سرخ ہندی مذاکرات پر راضی نہیں ہوتے ان پر سخت تشدد کیا جاتا۔

سرخ ہندیوں کے خلاف بہیمانہ جذبات: قتل کر دو یا نکال دو

خانہ جنگی کے بعد فوج نے دوران جنگ سیکھی ہوئی حیوانہ حکمت عملی پر عمل کرنا شروع کیا اور میدانی علاقوں کے قیدیوں پر مقامی نسل کشی کا ارتکاب کرنا شروع کیا اور اپاچی اور دوسرے قبائل کا قتل عام کیا۔ شرمان عسکری چیف آف اسٹاف تھا اس نے ۱۸۶۶ء کی جنگ میں اپنی چالوں کو اس طرح بیان کیا "میرے خیال میں اگر

ہم پچاس سرخ ہندیوں کو آرکنساس اور پلیٹ کے درمیان چھوڑ دیں تو ہمیں ہر اسٹیشن، ہر سڑک، ہر ریل گاڑی کی حفاظت کرنی پڑے گی۔ پچاس شرپسند سرخ ہندیوں کے لیے تین ہزار فوجی تعینات کرنے پڑیں گے اس سے بہتر ہے کہ جتنا جلد ممکن ہو ان سے نجات حاصل کرلی جائے۔ یہ زیادہ بہتر ہوگا کہ ان کو بہلا پھسلا کر بے دخل کر دیا جائے یا پھر قتل کر دیا جائے" اس کے الفاظ یہ ہیں:

My opinion is, if fifty Indians are allowed to remain between the Arkansas and the Platte we will have to guard every stage station, every train, and all railroad working parties . . . fifty hostile Indians will checkmate three thousand soldiers. Rather get them out as soon as possible, and it makes little difference whether they be coaxed out by Indian commissioners or killed.

سرخ ہندیوں کا وحشیانہ قتل عام:

اس کا مقصد ان سرخ ہندیوں سے مقابلہ کرنا تھا جو متحرک اور چھوٹے گروہوں کی صورت میں جنگ کرنے کے ماہر تھے۔ لہٰذا ان سے اس وقت جنگ شروع کی جاتی جب وہ سردیوں کے لیے بنے ہوئے رہائشی دیہاتوں میں چلے جاتے، ان کی نقل و حرکت محدود ہو جاتی اور وہ خاص علاقوں میں محصور ہو جاتے اس وقت ان جنگجوؤں کو اپنی عورتوں، بچوں اور املاک کی حفاظت کی خاطر ایک جگہ کھڑے ہو کر مقابلہ کرنا پڑتا۔ آبادکاروں کی فوج کو یقین تھا کہ منجمد جنگ کی صورت میں قتل عام کی صلاحیت بہتر ہوتی ہے اور دشمن کو زبردست نقصان پہنچا کر اس کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔ (Uttely:1994) تاہم ان کی جنگی صلاحیت ان مردوں، عورتوں اور بچوں کے خلاف براہ راست استعمال ہوتی تھی جو اپنے دیہاتوں سے بھاگنے کی کوشش کرتے اگر وہ فرار ہونے میں کامیاب ہو جاتے تو انھیں اپنی املاک سے ہاتھ دھونا پڑتا اور ایسی جگہوں کو زندگی بسر کرنے کے لیے منتخب کرنا ہوتا جہاں زندہ رہ جانے کی امیدیں بہت کم ہوتیں اور اگر وہ فرار میں ناکام ہوتے تو انھیں ایک ساتھ ہی قتل کر دیا جاتا۔

وحشیانہ قتل عام پر ایک جنرل کا شدید احتجاج:

شرمان کے ماتحت افسر جنرل Sanborn نسل کشی کی اس حکمت عملی پر سخت برہم تھا۔ سیکریٹری داخلہ کو ایک خط میں اس نے لکھا

"ہماری جیسی طاقتور قوم کے لیے، چند خانہ بدوشوں سے ایسے حالات میں گھرے ہوئے لوگوں سے جنگ جاری رکھنا قابل شرم ہے یہ ایک ایسا عمل ہے جس نے ہمیں ہماری آئندہ نسلوں اور پوری انسانیت کی نظروں میں ہمیشہ کے لیے گرا دیا ہے"۔

For a mighty nation like us to be carrying on a war with a few straggling

nomads, under such circumstances, is a spectacle most humiliating, an injustice unparalleled, a national crime most revolting, that must, sooner or later, bring down on us or our posterity the judgement of Heaven.

مظالم پر تنقید کرنے والوں کو مسترد کر دیا گیا:

جنرل سن بورن جیسے غیرت مند جنرل بہت کم تھے تاریخ نے انھیں بھلا دیا۔ ایک جنرل کی جانب سے نہتے مظلوموں کے خلاف وحشیانہ جنگی کارروائیوں پر احتجاج کے باوجود آج تک ان جرائم پر سرخ ہندی باشندوں سے کبھی معذرت نہیں کی گئی شاید یہ تہذیب کا تقاضہ ہے۔

مگر جنرل شرمن دان نے خود پر تنقید کرنے والوں کی تنقید کو مسترد کرتے ہوئے انھیں ایسے متقی کلیسائی قرار دیا، جو ان وحشیوں کے مددگار اور ہمدرد ہیں جنھوں نے مردوں، عورتوں اور بچوں کو قتل کیا ہے۔ اس کی وضاحت ایک ردعمل کے سوا کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ شرمن دان کی شخصیت، ہتھیار ڈالنے والے سرخ ہندیوں کے ساتھ ایک مکالمے میں ظاہر ہوتی ہے جس میں ان کے سربراہ نے خود کو ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں متعارف کراتے ہوئے کہا Tosawi, good Indian کہا تھا، جنرل شرمن دان نے جواب دیا "مرا ہوا سرخ ہندی ہی میری نظر میں اچھا سرخ ہندی ہے" بعد ازاں اس کے یہ الفاظ زبانِ زد عام شہور ہو گئے کہ:

> The only good Indian I ever saw is dead Indian"
>
> (Broown, 1970: 157-8, 170-I)
>
> [Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.]

سرخ ہندیوں کے خلاف عسکری کارروائیاں:

شرمن دان اور شرمان سرخ ہندیوں کے خلاف جنگ میں کمان کے سربراہ رہے اور ان کی ظالمانہ تدبیریں آباد کاروں اور سیاستدانوں میں پسندیدہ رہیں اور انھوں نے انتہائی اطمینان سے اپنے مقاصد حاصل کیے عسکری حکمت عملی کی اخلاقیات کا انحطاط تا حال نسل کشی کا حصہ رہا۔

دشمن سے نفرت اس قسم کی عسکری حکمت عملی کا لازمی حصہ ہوتی ہے۔ اس میں دشمن کی ضروریات کی فراہمی کے ذرائع کو منقطع کر دیا جاتا ہے جو کہ لڑائی نہ کرنے والے لوگ بھی انھیں فراہم کرتے ہیں یہ چالیں انیسویں صدی میں میدانی سرخ ہندیوں کے ساتھ جنگ میں استعمال کی گئیں۔ بہادر جنگجو کوئی مخصوص یونیفارم نہیں پہنتے تھے لہٰذا ہر سرخ ہندی مرد دشمن ہو سکتا تھا۔ محفوظ طریقہ یہ ہے کہ تمام سرخ ہندی مردوں کو قتل کر دیا جائے۔ اس کے

علاوہ جنگی حکمت عملی کے طور پر دشمن کو ایسے مقام پر دفاع پر مجبور کر دیا جاتا جہاں مرد عورتیں اور بچے اکٹھا ہوں۔ اس قسم کی عسکری چالیں شدید ظالمانہ تھیں۔

آباد کاروں کی ملیشیا کو ریاست اور مقامی حکومتوں کی طرف سے امداد دی جاتی تھی۔ جس کی وجہ سے ان کے اندر نسل کشی کا جذبہ اور بھی تازہ رہتا تھا۔ یہ جنگجو جزوقتی ملازم ہوتے، اور انھیں سرخ ہندیوں کے سر کے بدلے اجرت دی جاتی تھی۔

ہر سرخ ہندی کو قتل کر دو:

کرنل شوئنگٹن جو کولوراڈو کی تیسری ملیشیا کا کمانڈر اور سابق ضابطہ پرست وزیر تھا اس کا کہنا تھا کہ "میرا مقصد ہر اس سرخ ہندی کو قتل کرنا ہے جو میرے سامنے آئے، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا۔ چھوٹے سے اس کی مراد بچے تھے جیسا کہ وہ کہتا تھا' انڈے ہی جوں بنتے ہیں۔

"kill and scalp all, little and big." "Little" meant children, for as he said, "Nits make lice."

ایک عسکری افسر سرخ ہندیوں کے ساتھ مذاکرات کا خواہش مند تھا جب اس نے شوئنگٹن کی ملیشیا کے بارے میں استفسار کیا تو اس کے گورنر نے جواب دیا:

"انھیں سرخ ہندیوں کو ختم کرنے کے لیے تیار کیا تھا اور وہ انھیں قتل کر کے ہی چھوڑیں گے"۔

سپاہی عورتوں کے اعضاء کے تحفے اٹھائے پھرتے تھے

۱۸۶۴ء میں Sand Creek میں کرنل شوئنگٹن نے ایسا ہی کیا اس کی فوج نے ۱۰۵ سرخ ہندی عورتوں اور بچوں اور ۲۸ مردوں کو قتل کیا اور ان کے اعضاء کاٹ ڈالے۔ اس کی فوج کے سپاہی جو تحفے اٹھائے پھر رہے تھے وہ عورتوں کی فرج [vagina] سے بنائے گئے تھے۔ یہ مہذب متمدن یورپی آباد کاروں کا حال تھا جو آج دنیا کو انسانیت اور اخلاقیات کا درس دے رہے ہیں۔ (Brown 1970:86-93 Stannard 1992-171-4)

[Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.] [Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.]

قاتل اخبارات میں ہیرو کے طور پر پیش کیے جاتے:

بعض لوگوں کی کوشش تھی کہ وہ شوئنگٹن کو عدالت میں لائیں مگر وہ ایسا کرنے میں ناکام رہے۔ شوئنگٹن ہمیشہ Denver کے اخبارات و رسائل و جرائد کا ہیرو رہا (1999-218) Wallace کا خیال ہے کہ آباد کار خود

ایک فوج بن چکے تھے جس کا غصہ بہرا س سیاستدان پر اُبل پڑتا جو ان کی رائے کے خلاف جانے کی کوشش کرتا۔

[Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. 1998-187-8 London: Jonathan Cape.]

مصنف کوکر (Cocker) نے Sugarfoot Jack کی سوانح بیان کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ یہ بین الاقوامی تجارت کا قاتل تھا اور اسے برطانیہ سے تسمانیہ کی اصل آبادی کو قتل کرنے کے لیے لے جایا گیا اس کے بعد وہ کیلی فورنیا کی ملیشیا کا رکن بنا اور آخر میں اپاچی قبیلے کے نومولود بچوں کا اذیت پسند قاتل بنا۔

اس سے پہلے کہ ہم امریکی ریاست کے سرخ ہندیوں پر مظالم کی داستان کے بعض اوراق پلٹیں ضروری ہے کہ ۱۷ ویں صدی سے پہلے اور کے بعد کے معاشروں کی جستجو یا تصویر کی اصل حقیقت بھی آپ کے سامنے پیش کر دیں۔ یہ حقیقت اعداد و شمار کی صورت میں پیش کی جا رہی ہے جو کسی تفسیر تشریح کی محتاج نہیں ہے۔

بر اعظم امریکہ: سرخ ہندیوں کی زبانوں کا قتل عام

سرخ ہندیوں پر مظالم اور قتل عام کی داستان ۱۵ ویں صدی کے اختتام سے شروع ہو کر ۱۹ ویں صدی تک جاتی ہے اس کی تفصیلات شروع میں پیش کر دی گئی ہیں ظلم کی یہ سیاہ رات انیسویں صدی کے آخر میں کچھ کم ہوئی جب امریکی حکومت نے بچے کچھے اصلی امریکی باشندوں کی تعلیم و صحت کے لیے اپنے وہ دروازے کھولے جو اس سے پہلے صرف اینگلو سیکسن (Anglo-Saxon) عوام یا گوری چمڑی والوں کے لیے مخصوص تھے۔ مولانا ظفر علی خان بابائے صحافت نے غالباً یورپی آبادکاروں اور سفید فاموں کے انہی مظالم کی بنیاد پر زمیندار میں اپنے اداریوں اور تقریروں میں انہیں "گوری چمڑی والے مہذب کالو" کہتے اور لکھتے تھے۔

سرخ ہندیوں کی زبانوں کا خاتمہ:

جب یورپی اقوام نے ۱۴۹۲ء میں امریکی سرزمین پر قدم رکھا تو وہاں کی مقامی آبادی کو وحشی جنگلی اور حقیر قرار دیا گیا چونکہ ان کی زبان لکھی نہیں جاتی تھی جس کی وجہ سے ان زبانوں کو ختم کرنے میں امریکی استعمار کو زیادہ مشکلات کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ تحریر سے محرومی کے باوجود یہ زبانیں صدیوں سے لوک کہانیوں، قصوں، نغموں اور لوریوں کے ذریعے سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتی رہی تھیں اس طرح تصوراتی قصوں کے ذریعے ان تمام زبانوں کی انفرادیت اور خوبصورتی قائم تھی۔ اگر کسی زبان کا قصہ گو اپنے علاقے اور اپنی زبان میں مشہور ہوتا تو اسے اس خوبصورت انداز بیان کی وجہ سے دوسرے قبائل میں بھیجا جاتا تاکہ وہ اس خاص زبان کی دلکشی سے دوسری زبان والوں کو متاثر کرے۔ لیکن ۱۴۹۲ء سے شروع ہونے والی اس بقا کی جنگ نے جس کا اختتام آج بھی نہیں ہوا ہے سرخ ہندیوں کی تمام زبانوں اور ان کی پوری تہذیب کو جڑ کر خاکستر کر دیا گیا۔

سرخ ہندی قصہ گو اوران کی کہانیاں:

قصہ گو کہانی دلچسپ انداز سے شروع کرتے جس طرح اردو میں ہر کہانی کے آغاز سے پہلے عموماً یہ جملہ کہا جاتا ہے "ایک دفعہ کا ذکر ہے" اسی طرح یہ مقامی لوگ جب اپنی کہانی شروع کرتے تو ان جملوں سے عموماً کہانی کا افتتاح ہوتا۔ "لوگوں کے آنے سے پہلے ......" یا "جب کویوتے جوان تھا......"۔

سرخ ہندی: ریچھوں کو نہیں مارتے تھے:

ان کی کہانیاں سادگی کا نمونہ ہوتیں اور ان میں عموماً جرأت اور بہادری کا پہلو نمایاں رہتا تھا یہ کہانیاں سبق آموز ہوتیں تھیں اور سرخ ہندیوں کی تہذیبی وتمدنی خصوصیات، الہامی روایات، مذہبی کرداروں کے احکامات بیان کرتی تھیں۔

ان کی کچھ کہانیاں مافوق الفطرت بھی ہوتی تھیں جیسا کہ ایک کہانی میں دو لڑکیاں ہر رات ستاروں کو دیکھ کر یہ خواہش کرتی تھیں کہ ان کی شادی ان ستاروں سے ہو جائے۔ ان کی یہ خواہش کسی طرح پوری ہو جاتی ہے اور اس دوران ان کے ساتھ آسمان اور وہاں زندگانی میں نئے نئے سبق آموز اور حیران کن واقعات جنم لیتے ہیں اور مزید کہانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ جن والدین کی اولاد پیدا ہوتے وقت یا بعد میں مرجاتی تو ان کی دل جوئی کے لیے بھی کہانیاں کہی جاتی تھیں جن میں ایسے والدین کے لیے نئے بچوں کی ولادت کی خوش خبری ہوتی جو ایسی طاقتوں کے حامل ہوتے جن سے مرنے والے بچے محروم تھے جنھیں بھوت پریت یا بلاؤں نے کھالیا تھا۔

مقامی لوگ ریچھ کو کبھی نہیں مارتے تھے بلکہ انھیں جب ریچھ نظر آتا تھا وہ دعائیہ کلمات ادا کرتے تھے۔ کیوں کہ سرخ ہندی نہایت مہذب متمدن اور محبت کرنے والے لوگ تھے وہ انسان تو کیا جانوروں کو بھی مارنا پسند نہیں کرتے تھے۔

کیلی فورنیا زبانوں کا قبرستان:

مؤرخین کے مطابق صرف امریکا میں تقریباً نو کروڑ سرخ ہندی باشندوں کو وحشی قرار دے کر ہلاک کر دیا گیا اور ان کی زبانیں نوہاتلا (Nauhuatl)، یوما (Yuma)، چپوا (Chipewa)، توماہاک (Tomahawk)، موہاک (Mowhawk)، موجاوے (Mojave)، چوکٹا (Choctow)، پیما (Pima) اور ہوپی (Hopi) وغیرہ کو فنا کر دیا گیا۔ جب نسل ہی باقی نہ رہی تو زبان کے بچنے کا کیا سوال پیدا ہوتا۔ امریکی ریاست کیلی فورنیا جہاں زبانوں کے کئی بڑے گروہ پائے جاتے تھے وہاں سفاکی اور درندگی کا ایسا مظاہرہ کیا گیا کہ تاریخ نے اس ریاست کا نام جس کا مفہوم ہسپانوی زبان میں "خوفناک سونے کی سرزمین" تھا، زبانوں کا قبرستان (Cemetery of Languages) رکھ دیا۔ جہاں سترہ بڑے لسانی گروہوں کی دو سو کے قریب

زبانیں اور بولیاں بولی جاتی تھیں وہاں آج صرف دو زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ کیلی فورنیا میں ۱۷۶۹ء تک تین لاکھ ریڈ انڈین تھے ایک سو سال کے بعد ان کی یہ تعداد تیس ہزار تک رہ گئی۔ یہاں پر ۱۸۴۹ء میں سونا دریافت ہوا جس کے بعد مقامی لوگوں کے قتل عام میں اور تیزی آ گئی تاکہ سونے کے حصہ داروں کی فہرست میں مقامی باشندوں کے نام شامل نہ کیے جاسکیں۔ یہ تاریخ ساز کارنامہ اس قوم نے انجام دیا جسے اس بات پر فخر ہے کہ وہ دنیا میں انسانی حقوق کے سب سے بڑی علمبردار ہے اور انسانیت کی جتنی خدمت اس نے انجام دی وہ خدمت کوئی اور انجام نہ دے سکا۔

سرخ ہندیوں کی دو سو تیس زبانیں: مختصر جائزہ:

ریاست ہائے متحدہ امریکا میں لسانیات کے ماہرین نے سن دو ہزار میں ۲۳۰ زبانوں کی فہرست تیار کی ہے جس میں سے ۱۶۶ مقامی زبانیں سرخ ہندی بولتے ہیں جو آج بھی بولی جاری ہیں۔ سرخ ہندی لوگوں کی اکاون زبانیں جو ۱۹۷۷ء تک مرچکی تھیں ان معدوم زبانوں کو شامل کر کے مقامی لوگوں کی زبانوں کی تعداد ۲۱۷ بن جاتی ہے۔ ۱۴۴ زبانوں میں سے اس مضمون میں ایسی زبانوں کا ذکر کیا گیا ہے جن کے بولنے والوں کی تعداد تقریباً ہزار ہے اور ایسی زبانوں کی تعداد ۱۳۳ ہے۔ نیا خواو نیچیرو کی ایسی زبانیں ہیں جن کے بولنے والے ۲۲ ہزار سے زیادہ ہیں اور غالباً اب امریکا میں سرخ ہندیوں کی یہی دو بڑی زبانیں باقی رہ گئی ہیں۔ ان مقامی زبانوں کے علاوہ بقیہ ۱۳ زبانوں میں انگریزی اور ہسپانوی زبان جنہیں سرکاری اور غیر سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہے شامل ہیں ان زبانوں کے علاوہ جرمن، فرانسیسی بھی اس فہرست میں شامل ہیں۔

صرف ایک ہزار سرخ ہندی قبائل باقی ہیں:

سرخ ہندیوں کے زبردست قتل عام کے باوجود آج بھی امریکہ میں ایک ہزار کے قریب قبائل باقی رہ گئے ہیں جن میں سے صرف ۵۶۲ قبائل کو حکومت کی جانب سے آبرومندانہ زندگی گزارنے کی اجازت ملی ہے لیکن ان مقامی لوگوں نے گوری اور سیاہ فام اقوام میں شادی بیاہ اور دیگر روابط استوار کر لیے ہیں اب ان کا تشخص خود بخود ختم ہوتا جا رہا ہے اور حکومت ایسے لوگوں کو خاص قبیلے کا فرد یا رکن ماننے سے گریز کر رہی ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ میں جینیاتی کشمکش نے ایک نیا روپ دھار لیا ہے وہاں کے لوگ اب اپنا جینیاتی تجزیہ کرا رہے ہیں تاکہ ان کا قدیم قبیلے سے تعلق ثابت ہو جائے اس سلسلے میں کئی ادارے وجود میں آچکے ہیں جو جینیاتی تعلق کو جانچنے کا فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

سرخ ہندی پچیس ہزار قبل مسیح سے امریکہ میں آباد تھے:

محققین اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ امریکا میں مقامی لوگوں کی آبادکاری کا سراغ ۱۰ ہزار سال قبل مسیح سے ملتا ہے لیکن کچھ سرخ ہندیوں کے بعض علاقوں میں ۲۵ ہزار سال قبل مسیح کی انسانی آبادی کے آثار بھی کثرت سے

سطلب اس کا مطلب یہ ہے کہ امریکہ کے اصل باشندے سرخ ہندی دس ہزار قبل مسیح سے اس سرزمین پر آباد تھے جنھیں قتل و غارت گری کے ذریعے تہس نہس کر دیا گیا۔

براعظم امریکہ کے بڑے لسانی گروہ:

براعظم امریکہ میں یورپی فاتحین کی آمد کے وقت کئی بڑے لسانی گروہ موجود تھے لیکن یورپی فاتحین کی تاخت و تاراج کے بعد شمالی امریکا کے مشہور لسانی و ثقافتی گروہ مسکوجی ین (Muskogean)، الگون کیان (Algonkian)، کاڈوئی (Caddoan)، ایروکوائی (Iroquoian)، سی او (Sioux)، ہوکان (Hokan)، پینوٹی ان (Penutian)، اتھا پاسکان (Athapascan) اور ازٹیکا (Azteca) اقلیت کا درجہ اختیار کر گئے یہ گروہ سخت جانفشانی کے ساتھ ظلم و تشدد کا مقابلہ کرتے رہے اور آج بھی اپنے وجود کے ذریعے اپنی عظیم روایات کی نمائندگی کر رہے ہیں انھیں گروہوں کی زبانیں باقی ہیں یہ وہ بڑے لسانی خاندان ہیں جو آج شمالی امریکا میں اپنی کچھ زبانوں کے ساتھ بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔

قتل عام کے بعد تحفظاتی علاقوں کا قیام:

امریکی حکومت نے بیسویں صدی کے اوائل میں "انسانیت کے بے پناہ جذبے" کے تحت یہ محسوس کر لیا کہ اگر ان مقامی لوگوں کے ساتھ ظالمانہ جابرانہ برتاؤ مسلسل جاری رکھا گیا تو ان کی ثقافت، زبان اور قبیلے ختم ہو جائیں گے "انسانیت کا تقاضہ تھا" کہ ان بچے کھچے لوگوں کو بچایا جائے اور دنیا کو بتایا جائے کہ ہم زبانوں اور ثقافتوں کے تنوع پر یقین رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں کوشاں بھی ہیں۔ لہٰذا ان لوگوں کو تحفظ دینے کے لیے تحفظاتی علاقوں Reserved Areas یا Reservation کی اصطلاحات شروع کی گئیں۔ یہ ایسے علاقے ہوتے ہیں جہاں ایک خاص قبیلے کے لوگوں کو ان کے قدیم رسم و رواج کے ساتھ رکھا جاتا ہے، انھیں عطیات حکومت فراہم کرتی ہے۔ یہ لوگ باہر کے علاقوں میں آمد و رفت کے ساتھ اپنی تعلیم جاری رکھ سکتے ہیں۔ ان کے علاقوں میں شراب نوشی کی ممانعت ہے۔ اس طرح کے علاقوں کے قیام کا مقصد ایک طرف تو ان سرخ ہندی لوگوں کو سفید فاموں سے ثقافتی تحفظ مہیا کرنا تھا تاکہ ماضی کے مظالم کی تاریخ کو دھندلا دیا جائے۔

سرخ ہندیوں کا اصل مرکز: اوکلاہوما:

ان علاقوں میں حکومت ان مقامی لوگوں کو روزگار کے حصول کے لیے اور زندگی کے نئے طرز اپنانے کے لیے آمادہ کرتی ہے ۱۹۳۰ء تک جو اعداد و شمار ملتے ہیں، اس کے مطابق امریکا کے ہر صوبے میں ان لوگوں کی آبادی تین ہزار سے شروع ہوتی تھی اور بعض خاص صوبوں کی تعداد لاکھ سے اوپر چلی جاتی ہے، خاص کر اوکلاہوما میں جب کہ دیگر صوبوں میں ان کی تعداد ۲۰ ہزار سے ۶۰ ہزار کے درمیان ہے۔

۱۹۷۵ء تک سرخ ہندیوں کی تعلیم، معیار زندگی، حالات، زبانوں، طرز زندگی کے بارے

میں امریکی حکومت کی جانب سے اعداد و شمار دستیاب نہ تھے پہلی مرتبہ ان کے حالات پر مبنی اعداد و شمار U.S. Bureau of the Census نے ۱۹۸۰ء میں شائع کیے اور تمام مقامی افراد کو Hispanic کے زمرے میں رکھا جب کہ اس زمرے میں وہ لوگ بھی شامل ہو جاتے ہیں جو ہسپانوی زبان بولتے ہیں اور یہ لوگ یا تو مقامی ہوتے ہیں، یا میکسیکو کے یا پھر کیوبائی (Cuban) لوگ ہوتے ہیں۔ اس طرح امریکی سرخ ہندی مقامی باشندوں سے متعلق اعداد و شمار سے واضح معلومات نہیں مل سکتیں۔

آنسوؤں کا سفر: کبھی ختم نہ ہو سکا:

انیسویں صدی کے آخر تک امریکی استعماری ریاست نے زیادہ تر قبائل اور زبانوں کو بزورِ شمشیر موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ چیروکی (Cherokee) زبان بولنے والے اس ظلم کے دور کو (Trail of Tears) کہتے ہیں، جس میں ان لوگوں کو ان کے اپنے آبائی علاقوں سے جبراً انتقال دیا گیا۔ آنسوؤں کا یہ سفر کبھی ختم نہ ہوگا خون کے گھونٹ جو پی لیے گئے جبر کی اس تاریخ کو ہچکیوں اور سسکیوں کے ذریعے یاد رکھیں گے کیوں کہ سرخ ہندیوں کی تاریخ لکھنے کی جرات کسی کو نہیں ہے مائیکل مین جیسے جری شخص نے اس خونی تاریخ کو ڈرتے ڈرتے صرف گیارہ صفحات میں تحریر کیا ہے لیکن جرمنوں کے ہاتھوں ۱۸ لاکھ آرمینیائی باشندوں کے قتل پر دو ابواب تحریر کیے ہیں۔

سرخ ہندی: آہنی شخصیت کے مالک:

کالوسا (Calusa) قوم مسکوجی زبان بولتے تھے۔ ۱۵۰۰ کے ابتدائی سالوں میں ان کا بڑا ہی خون ریز مقابلہ ہسپانویوں سے رہا جس کے نتیجے میں انھوں نے ۱۵۲۱ء کے مشہور کون کیس تادور (Conquestador) پونس ڈی لیون (Ponce de Leon) کو قتل کر دیا۔ سیمی نولے (Seminole) زبان بولنے والوں کی امریکی استعماری طاقت سے بڑی مشہور جنگیں رہی ہیں۔ پہلی سیمی نولے جنگ ۱۸۱۷ء سے ۱۸۱۸ء تک، دوسری سیمی نولے جنگ ۱۸۳۲ء سے ۱۸۴۲ء تک۔ سیمی نولے غالباً ہسپانوی زبان کے لفظ Cimarron کی بگڑی ہوئی شکل ہے جس کا مطلب ''آہنی شخصیت'' ہے۔

امریکہ کی واحد بڑی سرخ ہندی زبان: اپاچی:

ناخو (ناجو) (Navajo) ریڈ انڈین لوگوں کی کہانیاں نغمہ ہوا کرتی تھیں اور ان کا تعلق ایک اور قبیلے اپاچی (Apache) سے بہت گہرا تھا۔ یہ دونوں قبائل اتاباسکان لسانی خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ اپاچی زبان اور قبیلہ مزید ذیلی گروہوں میں منقسم ہے۔ ناخو قبیلہ آج بھی امریکا میں ایک مضبوط قبیلہ ہے جنھوں نے اپنی کوششوں سے اپنی زبانوں کو تحفظ دیا ہے اور آج ان کی زبان امریکا میں واحد بڑی سرخ ہندی زبان کے طور پر بولی جا رہی ہے۔

اپاچی طرز بیان ختم ہو گیا:

اپاچی قبیلے کا ایک گروہ ایسا بھی تھا جو کہانیاں صرف علی الصبح اور مغرب کے وقت سناتا تھا یا پھر شدید سردیوں کے موسم میں بیان کی روایت تھی۔ جی کاریہ (Jicarilla) اپاچی کی کہانیوں میں تجسمات اہم کردار ادا کرتا تھا۔ لیکن ان قبائل کو ہسپانوی استعمار نے جب عیسائیت کا لبادہ پہنایا تو ان کی زبان نے اپنی لوک کہانیاں اور طرز بیان کو ترک کر کے ہسپانوی اور انگریزی کی زبان اور تہذیب کا تتبع کر لیا اس طرح پوری کی پوری تہذیب و ثقافت برباد ہوئی اور ایسی کہانیوں کو جان بوجھ کر فراموش کر دیا گیا جن میں قدیم مقامی مذاہب کی جھلک یا ان کے کرداروں کا مظہر سامنے ہوتا تھا۔

پینوٹی آئی (Penutian) زبان بولنے والے انیسویں صدی تک ۱۴۰۰۰ تھے۔ یہ لوگ کیلی فورنیا میں رہتے تھے لیکن یورپی افراد سے روابط نے ان میں نئی نئی بیماریاں پیدا کر دیں اور معاشرتی نظام کی خرابیاں پیدا ہو گئیں۔

ہوکان لسانی خاندان کی یانا (Yana) زبان بولنے والے ۱۸۶۴ء تک ختم ہو چکے تھے۔ اس زبان کا لوگوں کو علم بھی نہ ہوتا اگر اس زبان کا ایک فرد جو بھوکا اور سردی سے ٹھٹھرا ہوا تھا ۱۹۱۱ء میں اوروِل (Orville) کیلی فورنیا سے ملا۔ اس شخص سے اس زبان اور ثقافت کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں اور اس کی موت ۱۹۱۶ء تک اسے میوزیم میں رکھا گیا لیکن اس سے پہلے اس کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لیے اسے جیل میں بھی رکھا گیا۔

سرخ ہندی باشندے نفرت و حقارت کا نشانہ:

ان مقامی لوگوں کو بڑے ہی برے القاب بھی دیے گئے موہاک (Mohawk) کے معنی اوکسفرڈ انگلش ڈکشنری ۱۷۷۱ء کے مطابق وہ بدمعاشوں کی ایک جماعت جو راتوں کو لندن کی گلیوں میں اٹھارہویں صدی کے اوائل میں غنڈہ پھیلاتے تھے"

۱۹۰۱ء میں فرانسیسی موقر جریدہ لی فگارو (Le Figaro) کے صحافی ایمیلے ڈارسی (Emile Darsy) نے امریکا کی دس مقامی زبانوں اور قبائل کے ناموں کی فہرست تیار کی تا کہ انھیں فرانس میں غلیظ اور ناپسندیدہ عناصر کے لیے استعمال کیا جائے جو بدمعاشی کرتے اور نفرا تفری پھیلاتے ہیں۔

اس فہرست میں اپاچی کا انتخاب کیا گیا جسے پولیس کے افسر ایم لیپن (M. Lepine) نے استعمال کیا اور یہ لفظ ۱۹۴۳ء میں AcademieFrancaise نے فرانسیسی زبان میں بدمعاشی کے معنوں قبول کر لیا۔

سے چروکی زبان: ۸۶ حروف تہجی:

اروکوا (Iroquois) قبائل تمام سرخ ہندی قبائل میں زیادہ منظم گروہ تھا صرف شمالی امریکا میں یہ پانچ اقوام پر مشتمل گروہ تھا جنھوں نے ایک ریاست قائم کی ہوئی تھی ان کے مذہبی عقائد اور کہانیاں مستحکم بنیادوں

پر تھیں۔ اس لسانی خاندان کی ایک زبان چیروکی (Cherokee) ایسی زبان ہے جسے لکھا جاتا ہے۔ اس زبان کے حروف تہجی اس کے ایک خیر خواہ "سکوایاہ" (Sequoyah) نے ۱۲ سال کی محنت کے بعد ۱۸۲۱ء میں ترتیب دیئے۔ یہ ۸۶ حروف پر مشتمل ہے جو اس زبان کے تمام تلفظ کو ادا کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ ۱۸۲۳ء میں ان لوگوں نے اس رسم الخط میں اپنا ایک اخبار بھی نکال لیا۔ ان کی تعداد آج کل دس ہزار ہے۔ یہ لوگ ریاست اوکلاہوما اور شمالی کیرولائینا میں بستے ہیں۔

موہاک زبان نسل کا جبری انخلاء:

سی نے کا (Seneca) زبان بھی ارکوا گروہ سے تعلق رکھتی ہے اور نیویارک کے تحفظاتی علاقے میں پنپ رہی ہے۔ لیگ اوف ارکوا (League of Iroquois) میں شامل ایک اور طاقتور قوم (زبان) موہاک (Mohawk) ہے چوں کہ اس قوم نے امریکی جنگ آزادی میں برطانیہ کا ساتھ دیا تھا اس وجہ سے اسے آزادی کے بعد امریکی حکومت نے کینیڈا کی جانب دھکیل دیا۔

چوکتا سے ان کا آبائی علاقہ چھین لیا گیا:

چوکتا (Choctaw) نے امریکی استعمار کے خلاف دیگر قبائل چی کاسا (Chickasaws)، سیمی نولے (Seminoles)، کریک (Creek) اور چیروکی (Cherokee) کے ساتھ مل کر "پانچ تہذیب یافتہ قبائل" کے نام سے اپنی ایک تنظیم بنائی ۔ ۱۹۰۷ء تک یہ اتحاد قائم رہا۔ ۱۸۳۰ء میں امریکا نے ان کا آبائی علاقہ جو جنوبی مسسی سی پی دریا کے کنارے آباد تھا، ان سے چھین لیا اور ۱۹۰۷ء تک اس علاقے کی آبادی مکمل طور پر ختم کردی گئی اور ان کا علاقہ اوکلاہوما ریاست ہائے متحدہ امریکا میں ایک ریاست کے طور پر شامل کرلیا گیا۔ یہ زبان چی کاسا سے بہت ملتی جلتی ہے۔ ساک (Sac) جسے دوسرے نام فوکس (Fox) سے بھی جانا جاتا ہے کے بولنے والے بہت کم رہ گئے ہیں۔ یہ الگون کیان لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

کریک اور گوروں کی کشمکش:

کریک (Creek) زبان بولنے والوں کی گورے نوآبادکاروں سے دائمی کشمکش جاری رہتی تھی۔ یہ لوگ جیورجیا اور الاباما ریاستوں میں رہتے تھے لیکن آج کل انھیں تحفظاتی علاقوں میں محصور کردیا گیا ہے۔ ۱۴-۱۸۱۳ء کی جنگوں میں اس زبان کے بولنے والے قبیلے کو امریکیوں کے ہاتھوں شکست ہوئی اور ان کے آبائی علاقے ان سے جبراً چھین لیے گئے۔

ڈی لاویر نسل کا انخلاء:

ڈی لاویر (Delaware) زبان بولنے والے کبھی نیوجرسی، نیویارک، پین سلے وینیا اور ڈی لاویر ریاستوں میں رہا کرتے تھے۔ ۱۷۲۰ء میں امریکی استعماری ریاست نے انھیں مغرب کی طرف دھکیل دیا جہاں

اب یہ لوگ تحفظاتی علاقوں میں اپنی زندگی گزار رہے ہیں۔ یہ زبان الگون کیان (Algonkian) لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

ہوائی زبان کا تیزی سے خاتمہ:

ہوائی زبان بحرالکاہل میں واقع جزائر ہوائی میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان بہت تیزی سے ختم ہو رہی ہے۔ وہاں کی آبادی کا اب صرف ۰.۵ فی صد حصہ یہ زبان بولتا ہے۔ اس زبان کی انفرادیت کے تحفظ کے لیے وہاں کے چند خیر خواہوں نے جزیرہ نی آئی ہو (Niihau) میں کچھ سو لوگوں کو خاص کر بسایا ہے اور ان کے روابط دیگر زبانوں (خاص کر انگریزی) سے کم سے کم رکھنے کی کوشش کی گئی ہے تا کہ اس زبان کی خاصیت کو قائم رکھا جا سکے۔ یہ زبان پولی نیشیائی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔

تلنگت زبان کا حال:

تلنگت (Tlingit) زبان اتاپاسکان لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ قدیم تلنگت اقوام کا دعویٰ ہے کہ حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد ان کی قوم انٹارکٹک کے علاقے میں اتری تھی۔ یہ زبان آلاسکا کے علاقوں میں بولی جاتی ہے۔ یہ زبان بولنے والوں کی تعداد اب صرف ایک ہزار رہ گئی ہے۔

اتاپاسکان اور الگون کیان: خاموشی کے سمندر میں:

اتاپاسکان (Athapscan) اور الگون کیان (Algonkian) شمالی امریکا کے دو بڑے اہم لسانی خاندان ہیں جن کی کئی زبانیں اب مرچکی ہیں اور چند ایک بچ گئی ہیں۔ ان کے علاوہ زبانوں کے دیگر اور بھی بڑے خاندان ہیں لیکن ان خاندان کے بارے میں مغرب کی دو اہم قاموس انسائکلوپیڈیا امریکانا اور انسائکلوپیڈیا بریٹینکا نے سکوت اختیار کیا ہے اور ان کے صفحات اس بابت معلومات مہیا کرنے سے قاصر ہیں۔

سرخ ہندیوں کی بہت جلد مٹنے والی زبانیں:

ذیل میں ریاست ہائے متحدہ امریکا کی ایسی زبانوں کا مختصر تعارف دیا جا رہا ہے جن کے بارے میں اس بات کا اندیشہ ہے کہ کچھ عرصے میں یہ زبانیں فنا، معدوم اور گمنامی کے صحراء میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو جائیں گی۔

ا۔ مشرقی ابناکی (Eastern Abnaki): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک آدمی باقی ہے، جو ریاست مین (Maine) کے شکور گاؤں میں مقیم ہے۔

۲۔ اچوماوی (Achumawi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد صرف دس ہے۔ یہ لوگ شمال مشرقی کیلیفورنیا میں آباد ہیں۔

۳۔ آہتنا (Ahtena): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۸۰ ہے، جو صرف آٹھ گروہوں میں

بٹ کردہ گئے ہیں۔

۴۔ الاباما(Alabama): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۲۵۶ ہے۔ ٹیکساس اور اوکلاہوما سے اس کے تمام بولنے والے اب ختم ہو چکے ہیں۔ یہ وہ علاقے تھے جہاں کبھی ان کی کثیر آبادی رہا کرتی تھی۔ یہ لوگ امریکی حکومت کے مخصوص کردہ علاقے "الاباما کوشاٹا تحفظاتی علاقے" (Alabama-Cushatta Reservation) میں رہتے ہیں جو جنوب مشرقی ٹیکساس کے لوِنگسٹن (Livingston) شہر میں واقع ہے۔

۵۔ جی کاریلا اپاچی (Jicarilla Apache): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ سو بارہ ہے۔ یہ لوگ نیو میکسیکو کے شمالی علاقے ڈولسے (Dulce) میں رہتے ہیں۔

۶۔ کیووا اپاچی (Kiowa Apache): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اٹھارہ ہے۔ یہ لوگ کاڈو کاؤنٹی (Caddo) مغربی اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔

۷۔ لی پان اپاچی (Lipan Apache): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔ یہ لوگ میس کالے رو تحفظاتی علاقے، نیو میکسیکو میں محصور کیے گئے ہیں۔

۸۔ اراپاھو (Arapaho): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار باقی ہے۔ یہ لوگ دریائے ونڈ کے تحفظاتی علاقہ، ریاست ویومنگ میں رہتے ہیں۔

۹۔ اری کارا (Arikara): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد نوے ہے۔ یہ لوگ فورٹ برتھ ہولڈ (Fort Berthold) کے تحفظاتی علاقہ شمالی ڈکوٹا میں رہتے ہیں۔

۱۰۔ اسی نی بوئی نے (Assiniboine): یہ بہت تھوڑے لوگ ہیں جو ریاست مونٹانا میں دو تحفظاتی علاقوں فورٹ بلک نیپ اور فورٹ پیک (Fort Belknap, Fort Peck reservations) میں مقیم ہیں۔

۱۱۔ ات سوگے وی (Atsugewi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چار ہے۔ نسلی طور پر ان کی تعداد دو سو کے قریب ہیں۔ لیکن حالات نے انھیں اپنی زبان فراموش کرنے پر مجبور کردیا ہے۔ یہ لوگ شمال مشرقی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔

۱۲۔ بلیک فوٹ (Blackfoot): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار باقی ہے۔ یہ لوگ ریاست مونٹانا کے تحفظاتی علاقے میں رہتے ہیں۔

۱۳۔ کاڈو (Caddo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو کتابی ہے۔ نسلی طور پر ان لوگوں کی تعداد اٹھارہ سو ہے۔ یہ لوگ اوکلاہوما کے مغرب میں بستے ہیں۔

۱۴۔ کاہوئی یا(Cahuilla):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے۔یہ لوگ جنوبی کیلی فورنیا کے صحرائے موہاہے کے علاقے میں رہتے ہیں۔یہ زبان ازٹیکا (Aztec) لسانی خاندان سے تعلق رکھتی ہے جس کی تہذیب دنیا کی عظیم الشان تہذیبوں میں سے ایک ہے۔

۱۵۔ کاٹاؤبا(Catawba):یہ زبان معدوم ہو چکی ہے۔

۱۶۔ کایوگا(Cayuga):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔نیویارک کے مغربی حصے میں کاٹاروگس تحفظاتی علاقے(Cattaraugus Reservationa) میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۱۷۔ چے ہالس زیریں(Lower Chehalis):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔یہ ریاست واشنگٹن کے جنوب مغربی ساحل پر آباد ہیں۔

۱۸۔ چے ہالس بالائی (Upper Chehalis):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔یہ ریاست واشنگٹن کے پوجٹ ساؤنڈ (Puget Sound) کے جنوب میں رہتے ہیں۔نسلی طور پر ان لوگوں کی تعداد ۱۵۰ سے بھی کم ہے۔

۱۹۔ چیٹ کو(Chetco):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔یہ ریاست اوری گن (Oregon) کے جنوبی ساحل پر بستے ہیں۔

۲۰۔ شائین(Cheyenne):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار سات سو چالیس ہے۔یہ لوگ شمالی شائین تحفظاتی علاقہ (Nothem Cheyenne reservation) جنوب مشرقی مونٹانا میں بستے ہیں۔

۲۱۔ چی کاسا(Chickasaw):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار ہے۔جب کہ نسلی طور پر ان کی تعداد ۳۵ ہزار ہیں۔یہ لوگ اوکلاہوما میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۲۲۔ چی نوک(Chinook):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔یہ لوگ ریاست اوری گن اور واشنگٹن میں آباد ہیں۔

۲۳۔ چی نوک واوا(Chinook Wawa):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سترہ ہے۔کسی زمانے میں یہ لوگ ریاست اوری گن سے لے کر کیلیفورنیا اور الاسکا تک پھیلے ہوئے تھے لیکن اب دیگر علاقوں میں منتشر ہو چکے ہیں۔

۲۴۔ کلالم(Clallam):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔یہ لوگ جزیرہ نما اولمپک، ریاست واشنگٹن شمالی مغربی امریکہ میں بستے ہیں۔

۲۵۔ کوکوپا(Cocopa):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو تیس ہے۔یہ لوگ یوما (Yuma)

ریاست اریزونا (Arizona) میں بستے ہیں۔

۲۶۔ کوردالین (Coeur D'Alene): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ کوردالین تحفظاتی علاقے، ریاست آئیڈاہو (Idaho) میں آباد ہیں۔

۲۷۔ کولمبیا ویناچی (Columbia-Wenatchi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سینتیس ہے۔ ان لوگوں کی تعداد نسلی طور پر ۵۰۰ کے قریب ہیں یہ لوگ کول ویل (Colville) تحفظاتی علاقہ، شمال وسطی ریاست واشنگٹن میں رہائش پذیر ہیں۔

۲۸۔ کمانچے (Comanche): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ سو چون ہے۔ نسلی طور پر یہ لوگ تقریباً 6 ہزار ہیں جو اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔ اس زبان کا تعلق ازٹیکا سے ہے۔

۲۹۔ کوس (Coos): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے۔ مگر نسلی طور پر یہ لوگ دو سو کے قریب ہیں اور اوریگن کی جنوبی ساحلی پٹی میں محصور ہیں۔

۳۰۔ کاؤلز (Cowlitz) اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔ نسلی طور پر یہ لوگ اب دو سو سے بھی کم ہیں یہ ریاست واشنگٹن کے جنوب مغرب میں رہتے ہیں۔

۳۱۔ کرے میدانی (Plains Cree): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار ستر ہے۔ یہ لوگ شمال وسطی ریاست مونٹانا میں رہتے ہیں۔

۳۲۔ کوپینو (Cupeno): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد نو ہے ان کی کل آبادی صرف ایک سو پچیس ہے۔ یہ لوگ کیلی فورنیا کے جنوب کے تحفظاتی علاقے میں آباد ہیں۔ یہ زبان معدومی کے قریب ہے اس زبان کا تعلق ازٹیکا لسانی گروہ سے ہے۔

۳۳۔ ڈی ہے ژیٹ آن (Degexit' An): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے جب کہ نسلی طور پر یہ لوگ ڈھائی سو کے قریب ہیں یہ لوگ دریائے یوکون (Yukon) کے اطراف ریاست آلاسکا میں بستے ہیں۔

۳۴۔ ایاک (Eyak): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے جو آنکورانج آلاسکا میں مقیم ہے۔ یہ زبان معدوم ہو چکی ہے۔

۳۵۔ گوچ ان (Gwich'in): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو ہے۔ جب کہ گیارہ سو کے قریب نسلی لوگ زندہ ہیں۔ دریائے یوکون کے اطراف ۱۶ گاؤں میں یہ لوگ آباد ہیں۔

۳۶۔ ہائیدا (Haida): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ ہے۔ جب کہ چھ سو کے قریب ان کی آبادی ہے یہ لوگ آلاسکا کے جنوبی کونے میں بستے ہیں۔

۳۷۔ گروس ونٹرے (Gros Ventre): ۱۰ افراد یہ زبان بولتے ہیں اور شمالی وسطی مونٹانا کے بلک ناپ تحفظاتی علاقے میں مقیم ہیں۔

۳۸۔ ہان (Han): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سات ہے۔ یہ الاسکا کے جنوب میں آباد ہیں۔

۳۹۔ ہواسوپائی۔ ولاپائی۔ یواپائی (Havasupai-Walapai-Yavapai): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار سات ہے۔ یہ لوگ وسطی اریزونا میں گرینڈ کینین (Grand Canyon) کے اطراف میں بستے ہیں۔

۴۰۔ ہوائی (Hawaiian): امریکی حکومت نے اس زبان کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کیا جس کی وجہ سے یہ زبان اپنی ہی ریاست میں اجنبی زبان کا درجہ اختیار کر چکی ہے۔ آج نسلی طور پر یہ زبان بولنے والوں کی تعداد جزیرے میں ڈھائی لاکھ کے قریب ہے۔ اس کے علاوہ امریکہ کے دوسرے علاقوں میں بھی یہ لوگ آباد ہیں لیکن زبان بولنے والے اب صرف ایک ہزار رہ گئے ہیں۔ ۱۷۷۸ میں جزائر ہوائی میں اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ لاکھ سے اوپر تھی۔ اس زبان کا تعلق پولی نیشیائی خاندان سے ہے۔

۴۱۔ ہداتسا (Hidatsa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سو ہے۔ فورٹ برتھ ہولڈ تحفظاتی علاقہ، شمالی ڈکوٹا میں یہ لوگ آباد ہیں۔

۴۲۔ ہوکاک (Hocak): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو پچاس ہے۔ یہ لوگ چھ ہزار کے قریب ہیں جو ریاست وسکونسن (Wisconsin) اور نبراسکا (Nebraska) میں پھیلے ہوئے ہیں۔

۴۳۔ ہولی کاچوک (Holikachuk): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ یہ دریائے یوکون الاسکا میں رہتے ہیں۔

۴۴۔ ہوپا (Hupa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ لوگ کیلیفورنیا میں مقیم ہیں۔

۴۵۔ جےمیز (Jemez): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار تین سو ایک ہے یہ لوگ شمالی وسطی نیو میکسیکو میں رہتے ہیں۔

۴۶۔ کالا پویا (Kalapuya): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک ہے جو شمال مغربی اوریگن (NorthwestOregon) میں رہتا ہے۔

۴۷۔ کالیسپل۔ پینڈ ڈوریلے (Kalispel-Pend D'Oreille): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو ہے۔ یہ لوگ کالیسپل تحفظاتی علاقے ریاست واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۴۸۔ کانسا (Kansa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین ہے۔ جب کہ اس نسل کے زندہ لوگوں

کی تعداد ۲۵۰ ہے۔ یہ زبان بولنے والے اوکلاہوما کے شمال اور وسط میں بستے ہیں۔

۴۹۔ کاروک (Karok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو چھبیس ہے۔ جب کہ تین ہزار سات سو کیا سی افراد پر مشتمل ان کی آبادی ہے۔ شمالی مغربی کیلی فورنیا میں کلاماتھ دریا کے اطراف یہ لوگ بستے ہیں۔

۵۰۔ کاشایا (Kashaya): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چوبیس ہے۔ یہ لوگ الاسکا میں بستے ہیں۔

۵۱۔ کاٹو (Kato): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ کیلیفورنیا کے لے ٹن ویل (Laytonville) تحفظاتی علاقے میں رہتے ہیں اتاپاسکان لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۵۲۔ کاوائی سو (Kawaiisu): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ یہ لوگ صحرائے موجاوے (Mojave Desert) میں رہتے ہیں ازٹیکا لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۵۳۔ کی کاپو (Kickappo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ سو اڑتالیس ہے۔ جو کینیڈا اور امریکہ کے سرحدی علاقوں میں آباد ہیں۔

۵۴۔ کیووا (Kiowa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار بانوے ہے یہ لوگ ریاست اوکلاہوما (Oklahoma) میں رہتے ہیں۔

۵۵۔ کلامت موڈوک (Klamath-Modoc): اس زبان کا بولنے والا صرف ایک ہے یہ اوریگن (Oregon) میں مقیم ہے۔

۵۶۔ کوآساتی (Koasati): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ سو ہے۔ یہ لوگ لوئیزیانا، الاباما اور ٹیکساس کی ریاستوں کے تحفظاتی علاقوں میں رہتے ہیں۔

۵۷۔ کویوکون (Koyukon): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو ہے اتاپاسکان لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۵۸۔ کومی آئی (Kumiai): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ستانوے ہے جو سان ڈیے گو (San Diego) کیلی فورنیا میں رہتے ہیں۔

۵۹۔ بالائی کس کوک ویم (Upper Kuskok Wim): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے۔ یہ لوگ الاسکا میں رہتے ہیں۔

۶۰۔ کوتے نائی (Kutenai): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو دو ہے۔ یہ لوگ فلیٹ ہیڈ تحفظاتی علاقے Flathead Reservation, Montana ریاست مونٹانا میں رہتے ہیں۔

۶۱۔ لوئی سے نو (Luiseno): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تینتالیس ہے یہ لوگ جنوبی

کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔اس زبان کا تعلق ازتیکا لسانی گروہ سے ہے۔

۶۲۔ لوشوت سید(Lushootseed):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ساٹھ ہے یہ لوگ پوجٹ ساؤنڈ ریاست واشنگٹن(Washington) میں رہتے ہیں۔اس زبان کے کبھی دو لہجے ہوا کرتے تھے لیکن معدومی کے کنارے پر آنے کے بعد یہ ایک لہجہ بن چکا ہے۔

۶۳۔ شمال مشرقی مائدو(Northeast Maidu):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۶۴۔ شمال مغربی مائدو(Northwest Maidu):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ وسطی کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۶۵۔ ماکاہ (Makah):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے، یہ لوگ اولمپک جزیرہ نما (Olympic Peninsula) کی شمالی سطح پر رہتے ہیں۔

۶۶۔ مالی سیٹ پاسا ماکوڈی(Malecite-Passamaquoddy):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ سو اٹھتر ہے یہ لوگ ریاست مین(Maine) میں رہتے ہیں۔

۶۷۔ مان دان (Mandan):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ فورٹ برتھولڈ تحفظاتی علاقے(Fort Berthold reservation, North Dakota)شمالی ڈکوٹا میں رہتے ہیں۔

۶۸۔ ماری کوپا(Maricopa):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو کاسی ہے۔یہ لوگ ریاست اریزونا(Arizona) میں رہتے ہیں۔

۶۹۔ مینومنی(Menomini):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد انتالیس ہے۔یہ لوگ شمال مشرقی وسکونسن(Northeastern Wisconsin) میں رہتے ہیں۔اس زبان کے نسلی لوگوں کی تعداد ۳۵۰۰ ہے۔اس زبان کو بچانے کے لیے ان کی نئی نسل یہ زبان تیزی سے سیکھ رہی ہے اور اس کی تدریس پر خصوصی توجہ دی جا رہی ہے۔

۷۰۔ میس کواکی(Mesquakie):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو نوے ہے یہ لوگ اوکلاہوما کے فوکس تحفظاتی علاقے(Oklahoma Fox Reservation) میں رہتے ہیں۔

۷۱۔ مٹیشف(Michif):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو نوے ہے۔یہ لوگ شمالی امریکہ اور جنوب مشرقی کینیڈا میں بستے ہیں اس زبان پر فرانسیسی زبان کا گہرا اثر ہے۔

۷۲۔ مِک ماک(Micmac):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ سو ہے۔یہ لوگ شمالی

مین (Northern Maine) میں رہتے ہیں

۷۳۔ مِی کا سوکی (Mikasuki): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چار سو چھیانوے ہے۔ جنوبی فلوریڈا میں یہ لوگ بستے ہیں۔

۷۴۔ وسطی سی یرا مِی ووک (Central Sierra Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے یہ لوگ کیلیفورنیا (California) میں رہتے ہیں۔ ۱۹۹۰ء میں ایک سو پانچ تھی۔

۷۵۔ مِی ووک ساحلی (Coast Miwok): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک ہے۔ یہ زبان خلیج سان فرانسسکو سے خلیج بودیگا کی ساحلی پٹی پر کبھی بولی جاتی تھی اسی وجہ سے اسے ساحلی مِی ووک کہتے ہیں۔

۷۶۔ تالابی مِی ووک (Lake Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد آٹھ ہے۔ یہ زبان کلیر جھیل (Lake Clerar) کے اطراف بولی جاتی ہے اس وجہ سے اسے تالابی لہجہ کہتے ہیں۔

۷۷۔ مِی ووک شمالی سی یرا (Northern Sierra Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۔۔۔ ہے۔ یہ زبان دو دریاؤں موک لیومنے (Mokelumne) اور کالا ویراس (Calaveras) کے بالائی حصے کے میدان میں بولی جاتی ہے۔

۷۸۔ میدانی مِی ووک (Miwok, Plains): اس زبان کو بولنے والا ایک فرد باقی ہے۔ یہ دریائے ساکرمنٹو کے ڈیلٹا میں رہتا ہے اور یہ زبان اب مرنے کو ہے۔

۷۹۔ مِی ووک جنوبی سی یرا (Southern Sierra Miwok): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ۔۔۔ ہے۔ یہ لوگ کیلیفورنیا (California) میں رہتے ہیں۔

۸۰۔ موہابے (Mohave): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو چونتیس ہے۔ یہ لوگ فورٹ موہابے اور دریائے کولوراڈو کے تحفظاتی علاقوں (Fort Mohave and (Colorado River Reservations) کیلی فورنیا میں رہتے ہیں۔

۸۱۔ موہاک (Mohawk): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو ستر ہے۔ یہ لوگ علاقہ سینٹ ریگس تحفظاتی علاقہ نیو یارک (St. Regis Reservation) میں رہتے ہیں۔

۸۲۔ مونو (Mono): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تیس ہے۔ نسلی طور پر ان کی تعداد ایک سو پچاس ہے یہ مشرقی وسطی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔ اس زبان کا تعلق ازٹیکا سے ہے۔

۸۳۔ نیز پرس (Nez Perce): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ سو ستانوے ہے۔ یہ لوگ شمالی آئیڈاہو (Idaho) میں رہتے ہیں۔

۸۴۔ نی سے نان (Nisenan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد صرف بارہ ہے یہ لوگ وسطی

کیلیفورنیا California میں رہتے ہیں۔

۸۵۔ اوکاناگان (Okanagan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو بارہ ہے یہ لوگ علاقہ کول ویل تحفظاتی علاقہ واشنگٹن (Colville Reservation) میں رہتے ہیں۔

۸۶۔ اوماہاپونکا (Omaha-Ponca): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاسی ہے۔ یہ لوگ مشرقی نیبراسکا اور شمال مشرقی اوکلاہوما کے تحفظاتی علاقوں میں رہتے ہیں۔

۸۷۔ اونی ڈا (Oneida): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے یہ لوگ وسطی نیویارک میں رہتے ہیں۔

۸۸۔ اونون داگا (Onondaga): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پندرہ ہے اور یہ لوگ وسطی ریاست نیویارک میں رہتے ہیں۔

۸۹۔ اوساج (Osage): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے یہ لوگ اوکلاہوما (Oklahoma) میں رہتے ہیں۔

۹۰۔ شمالی پائیوت (Northern Paiute): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو اکتیس ہے یہ لوگ نیواڈا اور آئیڈاہو (Idaho) میں رہتے ہیں۔

۹۱۔ پانامنت (Panamint): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بیس ہے یہ لوگ ریاست نیواڈا (Nevada) میں رہتے ہیں یہ ازیکا لسانی گروہ سے اس کا تعلق ہے۔

۹۲۔ پاؤنی (Pawnee): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو ہے۔

۹۳۔ پومو وسطی (Central Pomo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے یہ لوگ شمالی کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۹۴۔ پومو شمال مشرقی (Northeastern Pomo): اس زبان کے بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے۔

۹۵۔ پومو جنوب مشرقی (Pomo, Southeastern): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔

۹۶۔ پومو جنوبی (Pomo Southern): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چالیس ہے اس زبان کو ہسپانوی لوگ گالی نومیرو (Gallinomero) کہا کرتے تھے کیلیفورنیا میں یہ لوگ آباد ہیں۔

۹۷۔ پوٹاواٹومی (Potawatomi): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے۔

۹۸۔ کواپاؤ (Quapaw): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چونتیس ہے یہ لوگ اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔

۹۹۔ کے چان (Quechan): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تین سو تینتالیس ہے یہ لوگ فورٹ

یما کے تحفظاتی علاقہ، کیلیفورنیا (Fort Yuma Reservation) میں رہتے ہیں۔

۱۰۱۔ کی لے اُتے (Quileute): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے۔ یہ لوگ اولمپک جزیرہ نما، واشنگٹن (Olympic Peninsula) میں رہتے ہیں۔

۱۰۲۔ کی نولت (Quinault): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ اولمپک جزیرہ نما، واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۱۰۳۔ شمالی پوجٹ ساؤنڈ سالش (Southern Puget Sound Salish): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو سات ہے۔ یہ لوگ واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۱۰۴۔ سے نی کا (Seneca): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو پچیس ہے۔ یہ لوگ کینیڈا اور امریکہ کے سرحدی علاقے میں بستے ہیں۔

۱۰۵۔ سیرانو (Serrano): اس زبان کو بولنے والا اب صرف ایک رہ گیا ہے۔ یا تقریباً مردہ ہی زبان ہے۔

۱۰۶۔ شاستا (Shasta): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔ شمالی کیلی فورنیا میں یہ زبان بولنے والے بستے ہیں۔

۱۰۷۔ شاونی (Shawnee): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو چھتیس ہے اور یہ لوگ اوکلاہوما (Oklahoma) میں رہتے ہیں۔

۱۰۸۔ اسکا جٹ (Skagit): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سو ہے۔ یہ لوگ واشنگٹن (Washington) میں رہتے ہیں۔

۱۰۹۔ سنوہومش (Snohomish): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ تولالپ تحفظاتی علاقہ Tulalip Reservation میں رہتے ہیں۔

۱۱۰۔ اسپوکانے (Spokane): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچاس ہے۔ یہ لوگ شمالی مشرقی واشنگٹن میں رہتے ہیں۔

۱۱۱۔ تاناکروس (Tanacross): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پینسٹھ ہے یہ لوگ ریاست الاسکا (Alaska) میں رہتے ہیں۔

۱۱۲۔ تنائنا (Tanaina): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ڈیڑھ سو ہے اور یہ لوگ آلاسکا (Alaska) میں رہتے ہیں۔

۱۱۳۔ تنانا زیریں (Lower Tanana): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد تیس ہے۔ یہ لوگ الاسکا میں رہتے ہیں۔

۱۱۴۔ تنانا بالائی(Upper Tanana): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ایک سو پانچ ہے۔ ان کی نسلی آبادی تین سو ہے۔ یہ لوگ الاسکا میں رہتے ہیں۔

۱۱۵۔ تے نی نو(Tenino): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دو سو ہے۔ یہ لوگ وارم اسپرنگ تحفظاتی علاقے Warm Springs Reservation ریاست اوریگن میں رہتے ہیں۔

۱۱۶۔ تلنگت(Tlingit): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سات سو ہے۔

۱۱۷۔ تولووا(Tolowa): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔

۱۱۸۔ سم شیان(Tsimshian): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد ستر ہے یہ لوگ الاسکا میں رہتے ہیں۔

۱۱۹۔ توباتولابل(Tubatulabal): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۲۰۔ توسکارورا(Tuscarora): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ Tuscarora Reservation Niagara Falls, New York میں بستے ہیں۔

۱۲۱۔ توتوت نی (Tututni): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ ریاست اوریگن Oregon میں بستے ہیں۔

۱۲۲۔ اوماتیلا(Umatilla): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پچیس ہے یہ لوگ اوماتیلا تحفظاتی علاقے Umatilla Reservation میں بستے ہیں۔

۱۲۳۔ اونامی(Unami): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد پانچ ہے۔ یہ لوگ اوکلاہوما میں بستے ہیں۔

۱۲۴۔ والاوالا(Walla Walla): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد سو ہے یہ لوگ Umatilla Reservation اوماتیلا تحفظاتی علاقے میں بستے ہیں۔

۱۲۵۔ واپو(Wappo): اس زبان کو بولنے والا صرف ایک رہ گیا ہے۔ یہ کیلیفورنیا میں رہتا ہے۔

۱۲۶۔ واسکو وشرام(Wasco-Wishram): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد انہتر ہے یہ لوگ شمال وسطی اوریگن North Central Oregon میں رہتے ہیں۔

۱۲۷۔ واشو(Washo): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے اور یہ لوگ کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۲۸۔ وچیتا(Wichita): اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ ریاست اوکلاہوما کے مغربی وسطی میں بستے ہیں۔

۱۲۹۔ ونٹو(Wintu):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ کیلیفورنیا میں بستے ہیں۔

۱۳۰۔ یاکی(Yaqui):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چار سو چھ ہے۔یہ لوگ ایریزونا میں بستے ہیں۔

۱۳۱۔ یوکٹ(Yokuts):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد اٹھتر ہے۔یہ لوگ کیلیفورنیا میں رہتے ہیں۔

۱۳۲۔ یوچی(Yuchi):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد بارہ ہے۔یہ لوگ اوکلاہوما میں رہتے ہیں۔

۱۳۳۔ یوکی(Yuki):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد چھ ہے یہ لوگ Round Valley Reservation راؤنڈ ویلی تحفظاتی علاقے شمالی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔

۱۳۴۔ یوروک(Yurok):اس زبان کے بولنے والوں کی تعداد دس ہے یہ لوگ Northwestern California شمالی مغربی کیلی فورنیا میں بستے ہیں۔

سرخ ہندیوں کی معدوم شدہ زبانیں

۱) السیا(Alsea):یہ زبان ۱۹۴۰ء میں ختم ہوگئی ریاست اوریگن اس کا علاقہ تھا۔

۲) اٹاکاپا(Atakapa):لوزی زیانا اور ٹیکساس میں بولی جانے والی یہ زبان ۱۹۷۷ء میں ختم ہوگئی۔

۳) باربارینو(Barbareno):جنوبی کیلی فورنیا۔

۴) بلوکسی(Biloxi):دریائے مسسی سپی کی زیریں وادی میں یہ زبان کبھی بولی جاتی تھی۔

۵) چی ماریکو(Chimariko):کیلی فورنیا

۶) چیٹی ماچا(Chitimacha):۱۹۷۷ء تک یہ زبان ختم ہوگئی حالاں کہ اس زبان کے نسلی لوگ ۳۰۰ کے لگ بھگ موجود ہیں یہ ریاست لوزی زیانا کے جنوب میں بستے ہیں اور انگریزی زبان بولتے ہیں۔

۷) چوماش(Chumash):کیلی فورنیا

۸) کوکیل(Coquille):اتھاپسکان ریڈ انڈین کی یہ زبان ریاست اوریگن کے جنوب مغرب میں بولی جاتی تھی۔

۹) شمالی کوستانوآن(NorthernCostanoan):یہ کیلی فورنیا کے شمالی ساحلی پٹی پر بولی جاتی تھی۔

۱۰) جنوبی کوستانوآن(SouthernCostanoan):جنوبی ساحلی پٹی کیلی فورنیا۔

۱۱) کروزینو(Cruzeno):جنوبی کیلی فورنیا

۱۲) پجن ڈیلاویر(Pidgin Delaware):بحر اوقیانوس سے ملحقہ امریکا کی شمالی ساحلی پٹی پر یہ زبان

بولی جاتی تھی۔

۱۳) ایسے لین (Esselen): وسطی کیلی فورنیا

۱۴) گالی سے (Galice): اوریگن

۱۵) انے سینو (Ineseno): سانتا باربرا کیلی فورنیا

۱۶) آیوا۔ اوٹو (Iowa-oto): یہ زبان ۱۹۹۶ء میں ختم ہوئی لیکن اس زبان کے بولنے والے نسلی طور پر ۴۳۰۰ کی تعداد میں آج بھی موجود ہیں۔

۱۷) کارکن (Karkin): ریاست کیلی فورنیا

۱۸) کتسائی (Kitsai): ریاست اوکلاہوما۔

۱۹) لمبی (Lumbee): ۳۰۰۰۰ لوگ نسلی طور پر اس زبان سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس زبان کو اب کوئی نہیں بولتا۔ یہ لوگ کیرولائینا اور میری لینڈ میں بستے ہیں۔

۲۰) وادی مائے دو (Valley Maidu): کیلی فورنیا

۲۱) مت تو لے (Mattole): اپاسکان لسانی گروہ سے اس کا تعلق تھا۔ کیلی فورنیا۔

۲۲) میامی (Miami): ۱۹۶۲ء تک یہ زبان ختم ہو چکی تھی جب کہ اس کے بولنے والے نسلی لوگ دو ہزار کی تعداد میں ہیں۔ ان کا مرکز ریاست انڈیانا اور اوکلاہوما ہے۔

۲۳) خلیجی می ووک (Bay Miwok): کیلی فورنیا۔

۲۴) موبی لی ین (Mobilian): دریائے مسی سسی پی کی زیریں وادی میں یہ لوگ بستے تھے۔

۲۵) موہے گان۔ مون تو ک۔ نرا گان ست (Mohegan-Montauk- Narragansett): ۱۲ سو کی لسانی آبادی میں اب اس زبان کو جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ ریاست کونیکٹی کٹ، جزیرہ رہوڈ (Rhode is)۔

۲۶) مولا لے (Molale): ریاست واشنگٹن اور اوریگن۔

۲۷) نانٹی کو کے (Nanticoke): ریاست ڈی لاویر۔

۲۸) نات چیز (Natchez): ریاست اوکلاہوما۔

۲۹) نوک ساک (Nooksack): ریاست واشنگٹن نسلی طور پر یہ لوگ تین سو پچاس کی تعداد میں ہیں۔

۳۰) اوبس پےنو (Obispeno): کیلی فورنیا۔

۳۱) اوفو (Ofo): زیریں مسی سسی پی۔

۳۲) پیرو (Piro): ریاست نیو میکسیکو۔

۳۳) مشرقی پومو (Eastern Pomo): کیلی فورنیا
۳۴) شمالی پومو (Northern Pomo): کیلی فورنیا
۳۵) پوہاٹان (Powhatan): نسلی طور پر تین ہزار افراد ہیں لیکن زبان بولنے والا کوئی نہیں۔ اس زبان کے لیے بھی تحفظاتی علاقہ قائم کیا گیا تھا لیکن اس کے باوجود اسے بچایا نہ جا سکا۔ یہ علاقہ رانکوکس انڈین ریزرویشن (Rankokus Indian) ریاست نیو جرسی میں قائم کیا گیا تھا۔
۳۶) پوریسی مینو (Purisimeno): کیلی فورنیا۔
۳۷) سالی نان (Salinan): کیلی فورنیا۔
۳۸) سیوسلاؤ (Siuslaw): اوریگن۔
۳۹) سس کے ہان نوک (Susquehannock): دریائے سس کے ہان نوک کے اطراف یہ لوگ بسا کرتے تھے۔
۴۰) تاکیلما (Takelma): ریاست اوریگن۔
۴۱) تلاموک (Tillamook): ریاست اوریگن۔
۴۲) تونکاوا (Tonkawa): ریاست اوکلاہوما۔
۴۳) تونی کا (Tunica): ایک سو بیس افراد کی آبادی میں کوئی اس زبان کو نہیں جانتا۔
۴۴) توتیلو (Tutelo): دریائے مسی سپی کی زیریں وادی۔
۴۵) توانا (Twana): تین سو بیس لوگوں کی آبادی ہے لیکن زبان کو جاننے والا کوئی نہیں۔
۴۶) وینچوریینو (Ventureno): کیلی فورنیا
۴۷) وائےلاکی (Wailaki): اسے بھی تحفظ دینے کے لیے اس زبان کے بولنے والوں کو خاص علاقے میں محصور کیا گیا لیکن یہ زبان محفوظ نہ ہو سکی۔ اتاپاسکان زبان سے اس کا تعلق تھا، کیلی فورنیا۔
۴۸) وامپانواگ (Wampanoag): ۲۰۰۰ کے قریب اس زبان کے نسلی لوگ ہیں جو ریاست میساچوسیٹ (Massachusetts) میں بستے ہیں۔
۴۹) وئی یوت (Wiyot): ۱۰۰ کی آبادی میں کوئی بولنے والا نہیں۔
۵۰) ویان دوت (Wyandot): اوکلاہوما۔
۵۱) یانا (Yana): کیلی فورنیا۔

قدیم امریکی توسیع پسندی کی تاریخ پڑھنے کے بعد اب ہم جدید امریکی توسیع پسندی کا جائزہ لیتے

ہیں:

جدید امریکہ، توسیع پسندانہ عزائم کی جھلک

ڈاکٹر جاوید آر لغاری کی تحقیق کے مطابق جو ۲۶ ستمبر ۲۰۰۱ء کو انٹرنیٹ پر جاری کی گئی [laghari@szabist.edu.pk] یہ فہرست ڈاکٹر شاہد وزارت کی ویب سائٹ shahid@szabist.edu.pk سے ۲۷ ستمبر ۲۰۰۱ء کو حاصل کی گئی۔ اس تحقیق کے مطابق دنیا بھر میں امریکی کارروائیوں کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

A) Ever since the United States Army massacred 300 Lakotas in 1890, American forces have intervened elsewhere around the globe 100 times. Indeed the United States has sent troops abroad or militarily struck other countries' territory 216 times since independence from Britain.

B) Since 1945 the United States has intervened in more than 20 countries throughout the world.

C) Since World War II, the United States actually dropped bombs on 20 countries. These include:

1. China 1945-46,
2. Korea 1950-53,
3. China 1950-53,
4. Guatemala 1954,
5. Indonesia 1958,
6. Cuba 1959-60,
7. Guatemala 1960,
8. Congo1964,
9. Peru 1965,
10. Laos 1964-73,
11. Vietnam 1961-73,
12. Cambodia 1969-70,

13. Guatemala '1967-69,

14. Grenada 1983,

15. Lebanon 1984,

16. Libya 1986,

17. El Salvador 1980S,

18. Nicaragua 1980s,

19. Panama -1989,

20. Iraq 1991-1999,

21. Sudan '1998,

22. Afghanistan 1998, and

23. Yugoslavia 1999,

D) Post World War II, the United States has also assisted in over 20 different coups throughout the world, and the CIA was responsible for half a dozen assassinations of political heads of state.

The following is a comprehensive summary of the imperialist strategy of the United States over the span of the past century:

1. Argentina - 1890 - Troops sent to Buenos Aires to protect business interests.

2. Chile - 1891 - Marines sent Chile and clashed with nationalist rebels.

3. Haiti - 1891 - American troops suppress a revolt by Black workers.

4. United States-claimed Navassa Island.

5. Hawaii - 1893 - Navy sent to Hawaii to overthrow the independent kingdom.

6. Hawaii annexed by the United States.

7. Nicaragua - 1894 - Troops occupied Bluefield, a city on the Caribbean Sea for a month.

8. China - 1894-95 - Navy, Army, and Marines landed during the Sino-Japanese War.

9. Korea - 1894-96 - Troops kept in Seoul during the war.

10. Panama - 1895 - Army, Navy, and Marines landed in the port city of Corinto.

11. China - 1894-1900 - Troops occupied China during the Boxer Rebellion.

12. Philippines - 1898-1910 - Navy and Army troops landed after the Philippines fell during the Spanish-American War, 600,000 Filipinos were killed.

13. Cuba - 1898-1902 - Troops seized Cuba in the Spanish-American War; the United States still maintains troops at Guantanamo Bay today.

14. Puerto Rico - 1898 - present. Troops seized Puerto Rico in the Spanish-American War and still occupy Puerto Rico today.

15. Nicaragua - 1898 - Marines landed at the port of San Juan del Sur.

16. Samoa - 1899 - Troops landed as a result over the battle for succession to the throne.

17. Panama - 1901-14 - Navy supported the revolution when Panama claimed independence from Colombia.

18. American troops have occupied the Canal Zone since 1901 when construction for the canal began.

19. Honduras - 1903 - Marines landed to intervene during a revolution.

20. Dominican Republic 1903-04 - Troops landed to protect American interests during a revolution.

21. Korea - 1904-05 - Marines landed during the Russo-Japanese War.

22. Cuba - 1906-09 - Troops landed during an election.

23. Nicaragua - 1907 - Troops landed and a protectorate was set up.

24. Honduras - 1907 - Marines landed during Honduras' war with Nicaragua.

25. Panama - 1908 - Marines sent in during Panama's election.

26. Nicaragua - 1910 - Marines landed for a second time in Bluefields and Corinto.

27. Honduras - 1911 - Troops sent in to protect American interests during Honduras' civil war.

28. China - 1911-41 - Navy and troops sent to China during continuous flare-ups.

29. Cuba - 1912 - Troops sent in to protect American interests in Havana.

30. Panama - 1912 - Marines landed during Panama's election.

31. Honduras - 1912 - Troops sent in to protect American interests.

32. Nicaragua - 1912-33 - Troops occupied Nicaragua and fought guerrillas during its 20-year civil war.

33. Mexico - 1913 - Navy evacuated Americans during revolution.

34. Dominican Republic 1914 - Navy fought with rebels over Santo Domingo.

35. Mexico - 1914-18 - Navy and troops sent in to intervene against nationalists.

36. Haiti - 1914-34 - Troops occupied Haiti after a revolution and occupied Haiti for 19 years.

37. Dominican Republic 1916-24 - Marines occupied the Dominican Republic for eight years.

38. Cuba - 1917-33 - Troops landed and occupied Cuba for 16 years;

Cuba became an economic protectorate.

39. World War I - 1917-18 - Navy and Army sent to Europe to fight the Axis powers.

40. Russia - 1918-22 - Navy and troops sent to eastern Russia after the Bolshevik Revolution; Army made five landings.

41. Honduras - 1919 - Marines sent during Honduras' national elections.

42. Guatemala - 1920 - Troops occupied Guatemala for two weeks during a union strike.

43. Turkey - 1922 - Troops fought nationalists in Smyrna.

44. China - 1922-27 - Navy and Army troops deployed during a nationalist revolt.

45. Honduras - 1924-25 - Troops landed twice during a national election.

46. Panama - 1925 - Troops sent in to put down a general strike.

47. China - 1927-34 - Marines sent in and stationed for seven years throughout China.

48. El Salvador - 1932 - Naval warships deployed during the FMLN revolt under Marti.

49. World War II - 1941-45 - Military fought the Axis powers: Japan, Germany, and Italy.

50. Yugoslavia - 1946 - Navy deployed off the coast of Yugoslavia in response to the downing of an American plane.

51. Uruguay - 1947 - Bombers deployed as a show of military force.

52. Greece - 1947-49 - United States operations insured a victory for the far right in national "elections".

53. Germany - 1948 - Military deployed in response to the Berlin blockade; the Berlin airlift lasts 444 days.

54. Philippines - 1948-54 - The CIA directed a civil war against the Filipino Huk revolt.

55. Puerto Rico - 1950 - Military helped crush an independence rebellion in Ponce.

56. Korean War - 1951-53 - Military sent in during the war.

57. Iran - 1953 - The CIA orchestrated the overthrow of democratically elected Mossadegh and restored the Shah to power.

58. Vietnam - 1954 - The United States offered weapons to the French in the battle against Ho Chi Minh and the Viet Minh.

59. Guatemala - 1954 - The CIA overthrew the democratically elected Arbenz and placed Colonel Armas in power.

60. Egypt - 1956 - Marines deployed to evacuate foreigners after Nasser nationalized the Suez Canal.

61. Lebanon - 1958 - Navy supported an Army occupation of Lebanon during its civil war.

62. Panama - 1958 - Troops landed after Panamanians demonstrations threatened the Canal Zone.

63. Vietnam - 1950s-75 - Vietnam War.

64. Cuba - 1961 - The CIA-directed Bay of Pigs invasions failed to overthrow the Castro government.

65. Cuba - 1962 - The Navy quarantines Cuba during the Cuban Missile Crisis.

66. Laos - 1962 - Military occupied Laos during its civil war against the Pathet Lao guerrillas.

67. Panama - 1964 - Troops sent in and Panamanians shot while protesting the United States presence in the Canal Zone.

68. Indonesia - 1965 - The CIA orchestrated a military coup.

69. Dominican Republic 1965-66 - Troops deployed during a national election.

70. Guatemala - 1966-67 - Green Berets sent in.

71. Cambodia, - 1969-75 - Military sent in after the Vietnam War expanded into Cambodia.

72. Oman - 1970 - Marines landed to direct a possible invasion into Iran.

73. Laos - 1971-:75 - Americans carpet-bomb on the countryside during Laos' civil war.

74. Chile - 1973 - The CIA orchestrated a coup, killing President Allende who had been popularly elected. The CIA helped to establish a military regime under General Pinochet.

75. Cambodia - 1975 - Twenty-eight Americans killed in an effort to retrieve the crew of the Mayaquez, which had been seized.

76. Angola - 1976-92 - The CIA backed South African rebels fighting against Marxist Angola.

77. Iran - 1980 - Americans aborted a rescue attempt to liberate 52 hostages seized in the Teheran embassy.

78. Libya - 1981 - American fighters shoot down two Libyan fighters.

79. El Salvador - 1981-92 - The CIA, troops, and advisers aid in El Salvador's war against the FMLN.

80. Nicaragua - 1981-90 - The CIA and NSC directed the Contra War against the Sandinistas.

81. Lebanon - 1982-84 - Marines occupied Beirut during Lebanon's civil war; 241 were killed in the American barracks and Reagan "redeployed" the troops to the Mediterranean.

82. **Honduras - 1983-89 - Troops** sent in to build bases near the Honduran border.

83. Grenada - **1983-84** - American invasion overthrew the Maurice Bishop government.

84. Iran - **1984** - American fighters shot down two Iranian planes over the Persian Gulf.

85. Libya - **1986** - American fighters hit targets in and around the capital training camps.

86. Yugoslavia - **1999** - Bombings and missile attacks carried out by the United States in conjunction with NATO in the 11 week war against Milosevic.

87. **Iraq - 1998-2001** - Missiles launched into Baghdad and other large Iraqi cities for four days. American jets enforced "no-fly zone" and continued to hit Iraqi targets since December-1998.

E) These hundreds of instances of American military intervention did not include times when the United States:

1. deployed military police overseas;
2. mobilized the National Guard;
3. sent Navy ships off the coast of numerous countries as a show of strength;
4. sent additional troops to areas where Americans were already stationed;
5. carried out covert actions where American forces were not under the " direct rule of an American command;
6. used small hostage rescue units;
7. used American pilots to fly foreign planes;

8. carried out military training and advisory programs which did not involve direct combat.

F) U. S. Government Assassination Plots.

Following is a list of prominent foreign leaders whose assassination (or planning for same) the United States has been involved in since the end of Second World War. The list does not include several assassinations in various parts of the world carried out by anti-Castro Cubans employed by CIA and headquartered in the United States:

LIST A: NON MUSLIMS

1. 1949 - Kim Koo, Korean opposition leader
2. 1950's - CIA/Neo-Nazi hit list of numerous political figures in West Germany
3. 1955 - Jose Antonio Remon, President of Panama
4. 1950's Chou En-lai, Prime Minister of China, several attempts on his life
5. 1951 - Kim il Sung, Premiere of North Korea
6. 1950s (mid) - Claro M. Recto, Philippines opposition leader
7. 1955 - Jawar Lal Nehru, Prime Minister of India
8. 1959 and 1963 - Norodom Sihanouk, leader of Cambodia.
9. 1950s-70s - Jose Figueres, President of Costa Rica, two attempts on his life:
10. 1961 - Francois "Papa Doc"Duvalier, leader of Haiti
11. 1961 - Patrice Lumumba , Prime Minister of Congo (Zaire)
12. 1961 - Gen. Rafael Trujillo, leader of Dominican Republic
13. 1963 - Ngo Dinh Diem, President of South Vietnam
14. 1960s - Fidel Castro, President of Cuba, more than 15 attempts on his

life.

15. 1960s - Raul Castro, high official in government of Cuba

16. 1965 - Francisco Caamanao, Dominican Republic opposition leader.

17. 1965 - Pierre Ngendandumwe, Prime Minister of Burundi.

18. 1965-6 - Charles de Gaulle, President of France.

19. 1967 - Che GL'GVara, Cuban leader.

20. 1970 - Salvadore Allende, President of Chile.

21. 1970 - General Rene Schneider, Commander-in-Chief of Army, Chile.

22. 1970s and 1981 - Gen. Omar Torrijos, leader of Panama

23. 1972 - General Manuel Noriega, Chief of Panama Intelligence.

24. 1975 - Mobutu Sese Seko, President of Zaire.

25. 1976 - Michael Manley, Prime Minister of Jamaica.

26. 1983 - Miguel d'Escato, Foreign Minister of Nicaragua.

27. 1984 - The nine commandantes of the Sandanista National Directorate

28. 1980s - Dr. Gerald Bull, Canadian Ballistics Scientist assassinated by Massad in Belgium.

G) Partial List of Muslim Leaders Assassinated or Attempted Assassinations:

1. 1950's Sukarno, President of Indonesia.

2. 1957 Gamal Abdul Nasser, President of Egypt

3. 1960 Brigadier General Abdul Karim Kassem, Leader of Iraq.

4. 1980-86 Muammar Qaddafi, Leader of Libya, several plots and attempts upon his life.

5. 1982 Ayatullah Khomeini, Leader of Iran.

6. 1983 General Ahmed Dlimi, Moroccan army Commander
7. 1985 Sheikh Mohammed Hussein Fadlullah, Lebanese Shiite Leader (80 people killed in that attempt)
8. 1991 Saddam Hussein, Leader of Iraq [Reference: Blum, William, "KILLING HOPE " U.S. Military and CIA Interventions Since World War II," Appendix III U.S. Government Assassination Plots, page 453, Common Courage Press, Monroe, Maine 1995. ISBN 1-56751-052-3]

امریکہ: دنیا بھر میں خفیہ جیلیں:

اے ایف پی نے ۵ جون ۲۰۰۵ء کو ایمنسٹی انٹرنیشنل کے حوالے سے دنیا بھر میں امریکی خفیہ جیلوں کی تفصیلات اخبارات کو جاری کیں جہاں لے جائے جانے والے واپس نہیں آئے خبر درج ذیل ہے:

WASHINGTON, June 5: The US government is operating an "archipelago" of prisons around the world many of them are secret camps into which people are being "literally disappeared", a top Amnesty International (AI) official said on Sunday.

AI Executive Director William Schulz criticized the administration of US President George W. Bush for holding alleged battlefield combatants in "indefinite incommunicado detention" without access to lawyers in an interview with Fox News on Sunday.

Schulz was pressed to substantiate Amnesty's claim in a May 25 report that the US prison camp at the Guantanamo Bay, Cuba naval base - where hundreds of foreign terror suspects are being held indefinitely - represents the "gulag of our times".

The gulag claim, referring to the notorious prison camp systems of the Soviet Union, has drawn withering criticism from the US president, who called it "absurd". Vice President Richard Cheney and Defence Secretary

Donald Rumsfeld have also slammed the rights group's claim.

Russian 1970 Noble Prize winner Aleksandr Solzhenitsyn described the Soviet prison camp system in his best-selling book "The Gulag Archipelago".

Schulz said the gulag reference was not "an exact or a literal analogy". [AFP]

بیسویں صدی جمہوری اور لبرل معاشروں کے کمالات

۸۹تا۹۸ دس سال میں ۱۰۷ خانہ جنگیاں

۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان ۱۰۷ خانہ جنگیاں ہو چکی ہیں جنہیں uncivil war کہا جاتا ہے۔ اس کے مقابلے میں ریاستوں کے درمیان صرف سات جنگیں ہوئیں۔ ۱۹۸۸ء کے آغاز میں ایک سرحد پار جنگ کے مقابلے میں ۳۲ خانہ جنگیاں ہو رہی تھیں۔ ۱۸۱۶ء سے ۱۹۹۸ء کے درمیان ۲۳۱ خانہ جنگیاں ہوئیں جس سے واضح طور پر یہ اشارہ ملتا ہے کہ ۱۹۸۹ء کے بعد بڑی تیزی سے بہت زیادہ خانہ جنگیاں ہوتی ہیں۔ ولیم جے، ایکہارڈ اور اس کے جانشینوں نے اندازہ لگایا تھا کہ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۹۵ء کے دوران بیسویں صدی میں جنگ سے متعلق ہلاکتوں کی تعداد مجموعی طور پر کم از کم ۱۰۶۱۱۳۰۰۰ ہے، جس میں ۶۲۱۹۴۰۰۰ شہری اور ۴۳۹۲۰۰۰۰ فوجی ہلاک شدگان شامل ہیں (سیوارڈ ۱۹۹۶ء:۱۹)۔ "سرد جنگ" کے "پرامن" دور میں قتل عام جاری رہا اور ۱۹۴۵ء اور ۱۹۹۲ء کے درمیانی عرصے میں ۱۴۹ جنگوں میں اندازاً کم از کم ۲۲۰۵۷۰۰۰ لوگ ہلاک ہوئے جن میں ۱۳۵۰۵۰۰۰ شہری اور ۵۵۵۲۰۰۰ فوجی تھے (سیوارڈ ۱۹۹۳ء:۲۰)۔ صرف ۱۹۹۶ء میں کم از کم تیس لڑائیاں جاری تھیں۔

اکیس سال میں ۸۰ لاکھ سرخ ہندی مارے گئے:

ڈیوڈ اسٹینرڈ کے مطابق، قبل از قتال عظیم، براعظم امریکہ کی مقامی آبادی اس وقت کی افریقہ اور یورپ کی مجموعی آبادی کے مقابلے میں زیادہ بڑی تھی سامریکہ کے ان قدیم باشندوں میں سے تقریباً ۸۰ لاکھ افراد براہ راست جنگ میں موت کا شکار ہوئے یا پھر جنگ اور تشدد سے تعلق رکھنے والے امراض اور دل شکستگی کے باعث موت سے ہمکنار ہوئے۔ یہ تمام لوگ کولمبس کے امریکہ پہنچنے کے بعد ۲۱ سال کے اندر مرے تھے۔ اسٹینرڈ نے تخمینہ ان اعداد و شمار سے قائم کیا کہ پندرہویں صدی کے اختتام پر کرہ ارض پر ۱۰ کروڑ سے زیادہ افراد بستے تھے اور چند صدیوں کے بعد ان کی تعداد تقریباً ۱۵ لاکھ رہ گئی تھی۔ سانسانی قتل پر ایک اور مطالعہ میں جو آر رومل نے داخلی اور بین الاقوامی جنگوں میں حکومتی قتل کا شکار بننے والوں کی تعداد کی تین شرحوں تک دستاویز تیار کرنے کے بعد

۱۹۹۴ء میں مرتب کیا تھا، جارحانہ قتل عام (Democides) کا اندازہ لگایا ہے جس میں بیسویں صدی سے قبل معلوم تاریخ کے ایک ہزار برسوں میں ایک کروڑ سے زیادہ افراد قتل کیے گئے تھے۔ ان کا اندازہ ہے کہ چین میں ۲۲۱ قبل مسیح اور ۱۹ ویں صدی عیسوی کے اختتام کے درمیان تقریباً تین کروڑ ۴۰ لاکھ افراد کو قتل کیا گیا۔ افریقیوں کو غلام بنانے کے نتیجے میں ایک کروڑ ۷۰ لاکھ افراد قتل ہوئے، اور یورپی باشندوں کی آمد سے لے کر ۱۹ ویں صدی کے اختتام تک نصف مغربی کرہ میں ایک کروڑ ۴۰ لاکھ افراد کو قتل کیا گیا۔ اس طرح یہ جارحانہ قتل عام تقریباً ۱۰ کروڑ افراد کے قتل کا باعث بن جاتے ہیں۔ (رمیل نے ۲۰۰۵ء میں ان اعداد و شمار میں حیرت انگیز اضافے کیے ہیں اور بتایا ہے کہ تیرھویں صدی سے لے کر بیسویں صدی تک کے قتل عام میں پونے دو ارب انسان ہلاک کیے گئے۔
[فروری ۲۰۰۵ء میں رمیل کی ویب سائٹ پر دیے گئے اعداد و شمار]

خانہ جنگیوں کی شدت ۱۸۱۶ء۔۱۹۹۸ء

	خصوصیات	ریاستوں کی تعداد	خانہ جنگیوں کی تعداد	ہلاکتیں	فیصد شرح
۱۸۱۶_۱۸۴۸	یورپ کی شکست میں بادشاہتوں کے نیچے کچلے گئے انقلاب	۲۸	۱۲	۹۳۴۰۰	۴(فیصد ۲۵)
۱۸۴۹_۱۸۸۱	ابھرتی ہوئی قوم پرستی اور خانہ جنگیاں	۳۹	۲۰	۲۸۹۱۲۰۰	(فیصد ۵)
۱۸۸۲_۱۹۱۴	سامراجیت اور نو آبادیت	۳۰	۱۸	۳۸۸۰۰۰	۴(فیصد ۱۷)
۱۹۱۵_۱۹۴۵	عالمی جنگیں اور معاشی دباؤ	۵۹	۱۴	۱۲۳۱۴۶۰	۴(فیصد ۲۹)
۱۹۴۶_۱۹۸۸	سرد جنگ کے دوران ابھرتے ہوئے عالمی جنوب کے ممالک نو آبادیت سے چھٹکارا اور آزادی	۱۶۷	۲۰	۲۴۴۹۰۲۰	۱۲(فیصد ۲۳)

۱۹۸۹ـ۱۹۹۸	ناکام ریاستوں اور خانہ جنگیوں کا عہد	۱۹۲	۱۰۷	۱۹۵۰۰۰۰	۱۰(۹ فیصد)
مجموعی تعداد		۱۹۲	۲۲۱	۱۳۳۶۲۰۰۰	۳۳(۱۴ فیصد)

Source: Chales W. Kegley, Jr. & Eugene R. Wittkopfe (eds), World Politics: Trend and Transformation, 8th ed., London: Macmillan press Ltd, 2001, P.436.

بیسویں صدی: انیسویں صدی کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ اموات:

رتھ لیگر سیورڈ کے اندازے کے مطابق ۱۹۱۰ء سے ۱۹۸۵ء کے دوران لڑی گئی ۲۰۲ جنگوں میں تخمیناً ۷ کروڑ ۸۰ لاکھ جانیں تلف ہوئیں۔ دوسرے الفاظ میں، بیسویں صدی میں ہونے والی اموات انیسویں صدی کے مقابلے میں پانچ گنا زیادہ تھیں۔ صرف ان دو جنگوں میں، ۱۰۰ سال سے کم عرصے کے دوران، اہم شریک ملکوں کے ۱۰ کروڑ شہری قتل ہوئے۔ یہ تعداد کئی یورپی ملکوں کی کل تعداد سے زیادہ ہے۔ پہلی عالمی جنگ میں ۸۰ لاکھ فوجی اور ایک لاکھ شہری ہلاک ہوئے جب کہ ۱۹۱۸ء میں انفلوئنزا کی وباء پھیلنے سے ایک کروڑ اسی لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ دوسری جنگ عظیم میں سب سے زیادہ متاثر ہونے والا ملک سوویت یونین تھا جہاں ہلاک ہونے والوں کی تعداد کل ہلاکتوں کا ۴۰ فیصد تھی۔

بیسویں صدی: ۱۸ ویں صدی سے سات گنا زیادہ ہلاکتیں:

پال کینیڈی نے ۱۹۹۵ء میں لکھتے ہوئے اس امر کا اظہار کیا تھا کہ "ایک تجربے کے مطابق ۱۹۴۵ء کے بعد ہونے والی جنگوں میں ہلاکتوں کی تعداد انیسویں صدی سے دوگنی اور ۱۸ ویں صدی سے سات گنا زیادہ تھی"۔ اس حیرت انگیز اضافے کی وجہ کیا تھی؟ اس اضافے کی وجوہات تاریخ، فکر اور فلسفہ میں ہی تلاش کرنے کے لیے ہمیں یونانی فکر و فلسفہ سے لے کر مغربی فکر و فلسفے تک کے اہم مباحث کو پیش نظر رکھنا ہوگا کیونکہ طرز زندگی میں تبدیلی کا براہ راست تعلق الٰہیات، مابعد الطبیعیات، علمیات سے ہے۔ یہ اگر تبدیل ہوں تو سب تبدیل ہو جاتا ہے۔ مغربی فکر و فلسفے کے فروغ نے دنیا میں تشدد کو جنم دیا ہے جو مسلسل بڑھ رہا ہے۔

افلاطون: جنگ سیاسی زندگی کی بنیادی حقیقت:

افلاطون (۴۲۷ـ۳۴۷ ق م) کی مثالی "جمہوریہ" (Republic) میں، فلسفی حکمران (سرپرست) کو جنگجو طبقے سے لیا گیا تھا جو (جزوی طور پر) استبداد اور ترغیب کے ذریعے پیداوار کرنے والوں اور غلاموں پر حکومت کرتے تھے۔ لیون ہیرالڈ کریگ نے اشارہ کیا ہے، "ایک غیر متعصب ناظر یہ نتیجہ اخذ کرنے سے شاید ہی بچ سکے کہ (افلاطون کی 'جمہوریہ' میں) جنگ کو سیاسی زندگی کی بنیادی حقیقت سمجھنا چاہیے اور وہ حقیقت پوری زندگی کے لیے اور یہ کہ ہر اہم فیصلہ اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کیا جانا چاہیے"۔

۷اویں صدی سے پہلے دنیا کی تاریخ میں صرف ۳۱ کروڑ لوگ مارے گئے اس صدی کے بعد جب دنیا بہت مہذب ہوگئی تھی انسان نیا فلسفہ نیا مذہب نئی سائنس پیدا ہوئی اس کے بعد دہشت گردی جنگیں طاعون کی طرح پھوٹ پڑیں اور رومیل کے مطابق صرف تین سو سال میں پونے دو ارب لوگ مارے گئے اس کی وجوہات فلسفیوں کے متشدد افکار میں تلاش کی جا سکتی ہیں۔ تمام مغربی فلسفیوں کے افکار آخر کار حرص و حسد کی عالمگیریت کو ممکن بناتے ہیں۔ یہ عالمگیریت، عالمگیر تشدد، جنگی جنون کا باعث ہے، بنیادی حقوق، آزادی، انسانی حقوق ہیومنزم، جمہوریت لبرل ازم کے فلسفے تشدد کے فروغ کا اصل سبب ہیں کیونکہ یہ نفرت، حرص و حسد اور بہیمیت کو فروغ دینے کا باعث ہیں۔ سیاست میں یہ عمل جمہوریت کے ذریعے ممکن ہوتا ہے اور معیشت میں سرمایہ دارانہ نظم معیشت کے ذریعے یہی دو ذریعے دنیا میں جنگوں کی دائمی موجودگی کو ممکن بناتے ہیں۔

ارسطو: ہتھیار صاحب جائیداد رکھے گا

ارسطو (۳۸۴۔۳۲۲ ق م) کی "سیاست" (Politics) میں، پسندیدہ سیاسی نظام میں ..... حکمرانی چاہے ایک کی ہو، چند کی یا کئی کی ہو..... ہتھیاروں پر اختیار صاحب جائیداد لوگوں کا ہوگا اور غلاموں کو تابع بنائے رکھنے اور دشمن کے قبضے میں جانے سے محفوظ رہنے کے لیے فوجیں ضروری ہیں۔ فوجوں کی اس مستقل ہلاکت آفریں موجودگی کو تو افلاطون موضوع بحث بناتا ہے اور نہ ارسطو اس بارے میں سوال اٹھاتا ہے۔

میکیاویلی: حکمرانوں کو ہلاکت خیز قوت کی اجازت

مشہور و مقبول میکیاویلی (۱۴۶۹۔۱۵۲۷) کی مشہور تصنیف "دی پرنس" میں حکمرانوں کو اپنا اقتدار قائم رکھنے اور اپنی ریاستوں کی طاقت، شہرت اور وقار میں اضافے کے لیے قتل کرنے کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے واضح جواز فراہم کیا گیا ہے۔ بہتر یہی ہے کہ "لومڑی" کی مکاری کے ذریعہ حکومت کی جائے، لیکن بوقت ضرورت حکمرانوں کو "شیر" کی بے باک ہلاکت آفرینی سے پہلو تہی نہیں کرنا چاہیے۔ جمہوری ریاست کی قوت کو استحکام بخشنے کے لیے وہ شہری ملیشیا قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہے۔

ہابس: حکمران کو اختیار رہے کہ عوام کو قتل کر سکے

تھامس ہوبس (۱۵۸۸۔۱۶۷۹) اپنی کتاب Leviathan میں سماجی نظم و ضبط کو قائم رکھنے اور جنگ میں فتح کے لیے حکومتوں کی جانب سے قتل کرنے کے لیے مزید جواز پیش کرتا ہے۔ انسان چونکہ قاتل ہے لہٰذا فطری حالت میں غیر منظم زندگی کا نتیجہ ایک سفاک بدنظمی کی صورت میں سامنے آتا ہے۔ لیکن انسان سلامتی کا خواہاں اور متلاشی بھی ہے چنانچہ اسے ایک مرکزی حکمران کی اطاعت کرنی چاہیے اور اسے یہ اختیار دینا چاہیے کہ وہ ان کی سلامتی کے لیے قتل کر سکے اور اپنی حفاظت کے لیے دوسرے کو ہلاک کرنے کا حق انھیں اپنے لیے محفوظ رکھنا چاہیے۔ ہوبس نے مسلح بغاوت کو جائز قرار دینے سے گریز اختیار کیا ہے۔

لاک: حکمرانوں اور عوام کو ہلاکت کا اختیار دیتا ہے

یہ کام جان لاک (۱۷۰۴-۱۶۳۲) نے اپنی کتاب Two Treaties of Government (حکومت کے دو اصول) میں انجام دیا ہے۔ وہ افلاطون، ارسطو، میکیاویلی، اور ہوبس کے ساتھ اس امر پر متفق ہے کہ سیاسی حکمرانی ہلاک کرنے کے لیے تیار رہنے کو ضروری بنا دیتی ہے۔ لیکن وہ مزید آگے بڑھ کر انقلابی ہلاکت آفرینی کو حق بجانب قرار دیتا ہے۔ جب اقتدار اعلیٰ پر فائز حکمران مطلق العنان بن جاتا ہے اور ملکیت، آزادی اور زندگی کے خلقی حقوق پامال کرتا ہے..... تو جبر و استبداد کے شکار شہریوں کو یہ حق حاصل ہے اور یہ ان کا فرض بنتا ہے کہ وہ اسے تباہ کر دیں۔ جیسے فطری صورت حال میں قاتل کو ہلاک کیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح سول سوسائٹی کے شہری ایک جابر حکمران کو تباہ کر سکتے ہیں۔

مارکس اینگلز: عبوری دور میں غارت گری کی اجازت ہے

ہوبس اور لاک کے، حاکموں اور محکوموں کی ہلاکت آفرینی کے دوہرے جواز کو کارل مارکس (۱۸۸۳-۱۸۱۸) اور فریڈرک اینگلز (۱۸۹۵-۱۸۲۰) نے "کمیونسٹ مینی فیسٹو" میں معاشی طبقے کی جنگ تک وسعت دے دی۔ صاحب جائیداد طبقوں سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ اور مفادات میں اضافے کے لیے ہلاکت آفرین قوت کا استعمال کریں۔ لیکن جب مادی اور سماجی تعلقات نازک مرحلے پر پہنچ جائیں تو استحصال زدہ طبقات متوقع طور پر سوسائٹی کے معاشی اور سیاسی ڈھانچے کی تبدیلی کے لیے پرتشدد بغاوت برپا کر سکتے ہیں۔ جدید انتخابی جمہوریت کی بعض مخصوص حالتوں میں پرامن تبدیلی ممکن ہو سکتی ہے۔ مستقبل میں جب کبھی معاشی استحصال ختم ہو جائے گا تو طبقاتی بنیاد پر قائم ہلاکت آفرین صورت حال بھی معدوم ہو جائے گی۔ لیکن عبوری دور میں معاشی عوامل کی بنا پر لوگوں کا میلان طمع و غارت کی جانب رہے گا۔

روسو: زندگی ریاست کی جانب سے مشروط تحفہ ہے

لاک اور مارکس کے درمیانی عرصے میں، ہوبس کے خیالات کی بازگشت کے طور پر ژاں ژاک روسو (۱۷۷۸-۱۷۱۲) اپنی تصنیف "عمرانی معاہدہ" "The Social Contract" میں ریاست کی سیاسی تنظیم کی بنیاد کے طور پر "عمرانی معاہدے" کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ شہری مجموعی طور پر ریاست کے حاکم اعلیٰ بھی ہیں اور رعایا بھی ہیں۔ وہ خود ہی اس برسر اقتدار حکومت کی اطاعت کی پابند ہو جاتے ہیں جو "عوامی خواہش" سے ماخوذ قوانین بناتی اور ان کا نفاذ کرتی ہے۔ معاہدے کے تحت ریاست جنگ اور صلح کے حق کی دعویدار ہوتی ہے، غداروں کو سزائے موت دی جا سکتی ہے اور مجرموں کو قتل کیا جا سکتا ہے۔ برسر اقتدار حکومت شہریوں کو حکم دے سکتی ہے کہ وہ ریاست کے لیے اپنی زندگیاں قربان کریں:

جب برسر اقتدار حکومت ایک شہری سے کہہ دے: ریاست کے مفاد میں تمہارا مرنا ضروری ہے تو

اسے مر جانا چاہیے، کیونکہ...... اس کی زندگی صرف عطائے فطرت نہیں ہے، بلکہ ریاست کی جانب سے ایک مشروط تحفہ ہے۔ [عمرانی معاہدہ، دوسرا حصہ، باب پنجم]

میکس ویبر: سیاست کا فیصلہ کن عنصر تشدد ہے

بیسویں صدی میں جرمنی کے بااثر سیاسی معاشیات کے ماہر اور عمرانیات کے نظریہ ساز، میکس ویبر (۱۸۶۴ء-۱۹۲۰ء) ''سیاست بطور مقدس پیشہ'' میں، جو دراصل ۱۹۱۸ء میں میونخ یونیورسٹی میں کی گئی تقریر پر مبنی ہے، اس خیال کو قطعی طور پر مسترد کر دیتا ہے کہ سیاست ہلاکت گریز پیش ہو سکتی ہے۔ ویبر کی رائے کے مطابق ''سیاست کا فیصلہ کن عنصر تشدد ہے'' تاریخی طور پر تمام بالادست سیاسی ادارے اقتدار کے لیے پر تشدد جدوجہد سے ابھرے تھے۔ نتیجتاً ویبر جدید ریاست کی تشریح ان الفاظ میں کرتا ہے ''ایک ایسی انسانی برادری جو (کامیابی سے) کسی مخصوص سرحد کے اندر جسمانی طاقت کے قانونی استعمال پر کامل اختیار کی دعویدار ہو'' لہٰذا ''جو اپنی اور دوسروں کی روحانی نجات چاہتا ہے وہ اسے کوچۂ سیاست میں تلاش نہ کرے کیونکہ سیاست کے مختلف اہداف صرف تشدد کے ذریعے ہی حاصل کیے جا سکتے ہیں''۔

امریکی دانش کا اجماع: ہلاکت گریز سماج محال ہے

گلین ڈی پیج کے خیال میں ہلاکت آفریں فلسفیانہ روایات کی بازگشت جسے تشدد پسند مذہب کی تائید حاصل ہے، وہ امریکا کی پوری سیاسی تاریخ اور تہذیب میں پھیلی ہوئی ہے۔ اس نے شہریوں اور عالموں دونوں کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کر دی ہے کہ ایک ہلاکت گریز سماج کا وجود ناممکن ہے۔ اس یقین کی بازگشت لیکسنگٹن میں چلنے والی توڑے دار بندوقوں کی آواز جس نے امریکی انقلاب کو چنگاری دکھائی، لاک کے دیے ہوئے جواز کے مطابق اعلانِ آزادی کے ذریعے حکومت وقت کی اطاعت سے روگردانی کا اعلان کرنے والے نقارچی کی آواز میں، اور نیو ہیمپشائر میں اعلانیہ سرکشی کے نعرے ''آزادی یا موت!'' میں سنائی دیتی ہے۔

امریکی صدارتی دعا قتلِ عام کے جذبات ابھارتی ہے

''ریاست کے جنگی ترانے'' میں بھی اس یقین کی گونج سنائی دیتی ہے جو کنفیڈریٹ باغیوں پر یونین کی فتح کا جذبہ پیدا کرتی ہے، اور ''امریکی جنوبی ریاستوں'' کی آہستہ ہوتا خانہ سرکشی میں، اور دور دراز علاقوں اور سمندروں میں جنگ میں مصروف لوگوں کے ''بحری ترانے'' میں ...... صدر کے کمانڈر ان چیف کے طور پر عہدہ سنبھالنے کے وقت ۲۱ توپوں کی سلامی میں بھی اس کی بازگشت سنائی دیتی ہے جو قوم کے متشدد ماضی اور موجودہ فوجی قوت کی یاد دہانی کراتی ہے۔ پرچم کشائی کی تقریب، قومی ترانے کے بجنے، اور مسلح حفاظتی دستوں کی موجودگی اور یہ صدارتی دعا کہ ''خدا امریکہ پر برکت نازل کرے'' (لوئن ۱۹۷۰ء) وہ چیزیں ہیں جن کے ذریعے قربانی دینے اور قتلِ عام کرنے کے جذبات ابھارے جاتے ہیں۔

امریکہ: ایک ہلاکت آفرین ریاست

گلین ڈی چیج کے خیال میں امریکہ کی ابتداء اس کی سرحدوں میں توسیع، قومی ہم آہنگی اور عالمی طاقت بننے میں اس کی مدد قتال نے کی۔ ملک کے اندر یا ملک کے باہر مارے جانے والے یا زخمی ہونے والے، فوجی یا شہری ہوں، ہلاک ہونے والوں یا زخمیوں کا اندازہ کرنا ابھی باقی ہے اور یقیناً وہ بے شمار ہیں، لیکن امریکی ریاست کی ہلاکت آفرینی کی حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دیگر ممالک میں سیاسیات کے عالموں سے مطالبہ کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی سیاسی تخصص پر بنیاد رکھا یا کم قتل عام کے کارگر انداز ہونے کے بارے میں روشنی ڈالیں۔

غلاموں کی محکومی برقرار رکھتے ہوئے، ایک جدید قوم نے شاہی نوآبادیاتی حکومت کے خلاف مسلح عوامی بغاوت کا آغاز کیا۔ آزادی کے پرچم تلے اس نے مقامی آبادی پر خونیں فتوحات کے ذریعے، شمال اور جنوب کے پڑوسیوں کے خلاف طاقت کے استعمال کے ذریعے اور زمینداروں کے مقابلے میں معیشت کو ترجیح دینے والوں کی جائیدادوں پر حقوق کو ساقط کر کے یا خریداری کے ذریعے اپنی ہمہ گیر قلمرو میں توسیع کی۔ ریاست نے خانہ جنگی کے ذریعے جبری طور سے قومی یکجہتی مسلط کی جس کے لیے ۲۵۴۴ے کنفیڈریٹ فوجیوں کو قتل کیا گیا اور یونین کے ۳۶۴۰۲۴ سپاہی قربان کر دیے گئے۔

امریکی توسیع پسندی: گلین ڈی چیج کی تحقیق

اپنے آپ کو مسند پارٹنگ پھیلاتے ہوئے امریکی ریاست نے ہوائی (۱۸۹۸)، پورٹو ریکو، گوام اور فلپائن (۱۸۹۸)، مشرقی ساموا (۱۸۹۹) اور بحرالکاہل کے جزائر (۱۹۲۵) پر تسلط حاصل کر لیا۔ فلپائن میں اس نے نوآبادیات کے خلاف برپا ہونے والی بغاوت (۱۸۹۸-۱۹۰۲) کو جبر و استبداد کے ذریعہ کچل دیا اور انضمام کی مخالفت کرنے والے لاتعداد مسلمانوں کا بے تحاشہ قتل عام کیا (۱۹۰۱-۱۹۱۳ء)۔ تنہائی پسند جاپان کو بحری طاقت کے استعمال کی دھمکی دے کر اسے بیرونی تجارت کے لیے کھول دیا (۱۸۵۳-۱۸۵۴)

گلین چیج: امریکہ کی جنگیں دوسری قوموں کے خلاف

اس ابھرتی ہوئی قوم نے جنگوں اور مداخلت کاریوں کے ذریعے اپنے مفادات کو آگے بڑھایا اور ان کا تحفظ کیا۔ امریکہ نے برطانیہ کے خلاف جنگ (۱۸۱۲-۱۴)، میکسیکو کے خلاف (۱۸۴۶-۴۸)، اسپین کے خلاف (۱۸۹۸)، جرمنی، آسٹریا، ہنگری، ترکی اور بلغاریہ کے خلاف (۱۹۱۶-۱۸)، جاپان، جرمنی اور اٹلی کے خلاف (۱۹۴۱-۴۵)، شمالی کوریا اور چین (۱۹۵۰-۵۳)، شمالی ویت نام (۱۹۶۱-۷۵)، اور عراق کے خلاف (۱۹۹۱) کی جنگیں لڑیں۔ مسلح مداخلتوں کی تفصیل کچھ اس طرح ہے: پیکنگ (۱۹۰۰)، پناما (۱۹۰۳)، روس (۱۹۱۸-۱۹)، نکاراگوا (۱۹۱۲-۲۵)، ہیٹی (۱۹۱۵-۳۴)، لبنان (۱۹۵۸)، ڈومینکن جمہوریہ (۱۹۶۵-۶۶) اور صومالیہ (۱۹۹۲)۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے گریناڈا میں (۱۹۸۳) اور پناما میں (۱۹۸۹) مداخلت کر کے

حکومتوں کو اقتدار سے معزول کروایا اور مداخلت کی دھمکی دے کر ہیٹی (۱۹۹۲) میں حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ مداخلت یا حملوں کے ذریعے اس نے کمبوڈیا (۱۹۷۰) اور لاؤس (۱۹۷۱) میں امتناع کی راہ اختیار کی، لیبیا (۱۹۸۶)، افغانستان (۱۹۹۸)، اور سوڈان (۱۹۹۸) میں انتقام لینے کے لیے حملے کیے اور عراق (۱۹۹۳)، بوسنیا (۱۹۹۵) اور یوگوسلاویہ (۱۹۹۹) میں جنگی اور حربی مفادات آگے بڑھانے کا عزم ظاہر کرنے کے لیے حملے کیے۔

گلین پیج: امریکی ہلاکت خیزی کی صلاحیت

ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے دوسری عالمی جنگ کے بعد آدھی صدی کے دوران، سرمایہ داری مخالف ریاستوں، انقلابیوں اور دیگر دشمنوں پر دنیا بھر میں غلبہ پانے کے لیے ہلاکت آفرینی کی اپنی استعداد میں بے پناہ اضافہ کرلیا۔ انقلاب امریکہ کے زمانے میں ایک ہزار سے بھی کم پر مشتمل باقاعدہ مسلح افواج کی تعداد ۱۹۹۰ء کے عشرے میں پندرہ لاکھ مردوں اور خواتین تک پہنچ چکی تھی، ان کی پشت پر پنٹاگون (امریکی محکمۂ دفاع) کے ۲۳۰۰۰ منصوبہ ساز، ایک اختراعی سائنسی اشرافیہ، اور دنیا میں اسلحہ سازی کی جدید ترین صنعت موجود ہے۔ یہ سب اس طرح ممکن ہوا کہ ان اخراجات کے لیے ٹیکس دہندگان کے چھتیاتی ٹریلین ڈالر ہر سال کانگریس اور صدر کی جانب سے منظور کیے جاتے تھے۔ ایک محتاط تخمینے کے مطابق ۱۹۴۰-۹۶ء کے دوران امریکہ کے صرف جوہری ہتھیاروں کے پروگرام پر قوم کو ۵.۸۲۱ ٹریلین ڈالر خرچ کرنا پڑے ہیں (شوارز ۱۹۹۸ء)۔ ریاست ہائے متحدہ کے تصرف میں کسی بھی دوسرے ملک سے زیادہ سمندر پار اڈے ہیں، وہ غیر ممالک میں زیادہ فوجی طاقت منتقل کرچکا ہے، زیادہ فوجی اتحاد قائم کرچکا ہے اور دوسرے ملکوں کی نسبت بیرونی افواج کو زیادہ سے زیادہ تربیت اور اسلحہ سے لیس کررہا ہے (یہ لوگ اس کے دشمنوں کے قاتل، بعض اوقات اس کے دوستوں کے قاتل اور یہاں تک کہ اس کے اپنے قوم کے قاتل ہیں)۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ وہ دنیا کی سب سے بڑی منافع بخش، اسلحہ منڈی میں ہتھیاروں کا سب سے بڑا فراہم کنندہ بن چکا ہے۔ انسان نے اب تک جس قدر ہلاکت آفریں ایجادات کی ہیں، اس حوالے سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اس صلاحیت کا مالک بن چکا ہے کہ وہ انتہائی تباہ کن ہتھیاروں کے ذریعے کرۂ ارض کی زمین، سمندر اور فضاء میں ہر جگہ قتل عام کرسکتا ہے۔

گلین ڈی پیج کی تحقیقات کا خلاصہ

ذیل میں ہم گلین پیج کی کتاب Politics of Non Killing میں گلین کی ان تحقیقات کو پیش کر رہے ہیں جو امریکی ریاست، امریکی سیاست، امریکی معیشت اور امریکی معاشرت سے متعلق ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی فوجی قوت کا دعویٰ

۱۹۹۰ء کے عشرے تک، جنگ کے ذریعے قائم ہونے والا ریاست ہائے متحدہ امریکہ ۱۷۷۶ء کے اعلانِ آزادی کے بعد سفر کرتے ہوئے اس دعوے تک پہنچ گیا ہے کہ وہ ''دنیا کی واحد سب سے بڑی فوجی طاقت

اور دنیا کی قیادت کرنے والی معیشت ہے" (صدر ولیم جے کلنٹن، قوم سے خطاب، ۱۹/فروری ۱۹۹۳ء)۔ جوائنٹ چیفس آف اسٹاف کے چیئرمین، آرمی جنرل شالی کاشویلی کے الفاظ میں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ "عالمی مفادات" کے ساتھ ایک "عالمی قوم" بن چکی ہے۔ ۱۹۹۵ء میں جاپان پر جوہری بم کی فتح کی ۵۰ویں سالگرہ کا جشن مناتے ہوئے صدر امریکہ نے ہوائی میں جمع ہونے والے تینوں مسلح افواج کے جوانوں سے عہد کیا "آپ پوری دنیا میں ہمیشہ بہترین تربیت یافتہ اور بہترین اسلحے سے لیس لڑاکا قوت رہیں گے"۔ انھوں نے اعلان کیا "ہمیں کرۂ ارض پر سب سے زیادہ طاقتور رہنا ہے تاکہ ہم اپنے عہد میں تاریکی کی قوتوں کو شکست دے سکیں"۔ اس عزم کی عکاسی چیف آف اسٹاف جنرل رونالڈ فوگل مین نے ۱۹۹۶ء میں ایئر فورس اسٹریٹجک پلاننگ کی صراحت کرتے ہوئے کی تھی، "ہمارا ہدف، تلاش کرنا، تحت نگرانی کرنا، تعاقب کرنا اور زمین پر حرکت کرنے والی ہر شے کو نشانے کی زد پر رکھنا ہے"۔ انھوں نے مزید انکشاف کیا، "اب ہم یہ کام انجام دے سکتے ہیں، لیکن بروقت نہیں" (وقوعہ کے وقت نہیں)۔ (ہیری ٹیج فاؤنڈیشن، واشنگٹن ڈی سی میں ۱۳/دسمبر ۱۹۹۶ء میں خطاب)۔

اکیسویں صدی: امریکی صدی

بیسویں صدی جب اختتام پر پہنچ رہی تھی تو امریکی رہنماؤں کی روایتی خواہش تھی کہ اسے "امریکی صدی" سے تعبیر کریں اور اس عزم کا اظہار کریں کہ تیسرے ہزاریے کی اولین صدی کو "دوسری امریکی صدی" بنایا جائے گا۔ اس نوع کے تشدد کے زیر اثر فتح مندی کی روایات کے درمیان ہلاکت خیز ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے بارے میں سوچنا ناقابل تصور ہے۔ قتل عام اور قتل عام کی دھمکی کے ذریعے قومی آزادی کی جدوجہد اور غلامی کا خاتمہ کیا گیا، نازی ازم اور فاشزم کو شکست دی گئی، عالمگیر تباہی کا خاتمہ کیا گیا، ایٹم بم کا شکار ہونے والے جاپان میں زندگیاں بچائی گئیں، عالمی سطح پر کمیونسٹوں کی توسیع پسندی کو روکا گیا، سوویت ایمپائر کے انہدام کے اسباب پیدا کیے گئے اور اب وہ اس دعوے پر پورا اترتا نظر آتا ہے کہ اکیسویں صدی کے پورے عرصے کے دوران وہ جمہوری آزادی اور سرمایہ دارانہ معیشتوں کے نفوذ کے لیے رہنما قوت بن جائے گا۔

ایسے امریکیوں کے لیے جو خواہ پروفیسر ہوں یا علم سیاسیات کے مبتدی طلبا، اس بات کو ماننے کے لیے نہ فلسفے کی ضرورت ہے اور نہ قومی سیاسی روایت کی کہ ایک ہلاکت خیز سماج کا قیام ناممکن ہے۔ روزمرہ زندگی میں ہونے والے قتال اس بات کی تصدیق کر دیتے ہیں۔

امریکہ میں اندرونی ہلاکتوں کی تعداد کا موازنہ

اپنے ہم وطنوں کے ہاتھوں ہر سال ۱۵ ہزار سے زائد امریکی ہلاک کر دیے جاتے ہیں (۱۹۹۹ء میں ۱۵۵۳۳، فی ایک لاکھ پر ۵.۷ افراد، ۱۹۰۰ء میں یہ شرح ۱.۲ تھی)۔ قتل کی جن وارداتوں کا اندراج کیا جاتا ہے، ان میں پولیس یا شہریوں کی جانب سے کیے جانے والے "جائز قتل" کو شامل نہیں کیا جاتا (۱۹۹۹ء میں ان کی تعداد

۲۹۴ اور ۱۸۸ تھی) دوسری عالمی جنگ کے بعد سے قتل ہونے والوں کی تعداد (اندازے کے مطابق لگ بھگ ۵۰۰۰۰۰۷) قوم کی تمام اہم جنگوں کے دوران ہونے والی ہلاکتوں (۶۵۰۰۵۳) سے آگے نکل گئی تھی۔ "اشتعال سے بھرپور حملے" (۱۹۹۹ء میں ۹۱۶۳۶۳ء، ۳۳۶ فی ایک لاکھ) ایسے ہتھیاروں کے ساتھ حملے جو ہلاک کرنے یا مہلک زخم پہنچانے کی صلاحیت رکھتے ہوں، (فیڈرل بیورو آف انویسٹی گیشن ۲۰۰۰ء: ۱۳، ۳۲،۲۳) امریکی سطح سوسائٹی میں قتل کے مقابلے میں خودکشیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے (۱۹۹۵ء میں ۳۱۲۸۴، ۹: ۱۱ فی ایک لاکھ)۔ اقدام خودکشی کی تعداد ۲۵ گنا زیادہ ہے۔ اندازوں کے مطابق سالانہ ۱۰ لاکھ سے زیادہ اسقاط کرائے جاتے ہیں۔

۴ امریکی شہریوں کے قتل کے طریقے

امریکی قتل کرنے کے یہ طریقے استعمال کرتے ہیں: شدت سے ضرب لگانا، سر قلم کرنا، بم سے اڑانا، آگ میں جلانا، غرقاب کرنا، پھانسی پر لٹکانا، دھکا دینا، اور زہر دینا، خنجر کے وار کرنا، گلا گھونٹنا، گلے میں پھندا ڈالنا اور زیادہ تر گولی مار دینا (۱۹۹۹ء میں ۶۴.۵ فیصد)۔ قتل کی نوعیت پہلے سے منصوبہ بندی، فوری اشتعال، پیشہ ورانہ اور حادثاتی واقعہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ازدواجی زیادتی، بچوں سے بدفعلی، بیویوں سے زیادتی، لفظی تکرار، شرابیوں کا فساد، منشیات کی تجارت میں دھوکہ بازی، سماج دشمن گروہوں کے جھگڑے، قمار بازی، رقابت، اغوا، جسم فروشی، زنا بالجبر، ڈاکہ زنی، جرم کی پردہ پوشی اور "آسمانی" یا "شیطانی" فرمان کے تحت ہونے والے قتل بھی شامل ہیں۔ حقیقی طور پر کوئی جگہ محفوظ نہیں ہے: گھر، اسکول، گلیاں، شاہراہیں، کام اور عبادت کی جگہیں، جیل خانے، پارک، قصبے، شہر، ویرانے اور قومی حکومت کی مرکزی عمارت۔ موت کا نشانہ بننے والوں کی انفرادی طور پر یکے بعد دیگرے اجتماعی طور پر اور بے وجہ قتل کر دیا جاتا ہے۔ زیادہ تر مرد (۱۹۹۹ء میں ۷۶ فیصد)۔ لیکن ۸۵-۱۹۷۶ء کے دوران ازدواجی قتل کے واقعات میں بیویوں کی تعداد (۹۲۸۰) کے مقابلے میں شوہروں کی تعداد کم تھی (۱۱۵۷) (مرسی اور سالٹزمان ۱۹۸۹ء)۔

۴ امریکہ: خوف زدہ انسانوں کی سرزمین

قاتلوں میں تنہا افراد جوڑے، گروہ، فرقہ پرست، جرائم پیشہ گروہوں کی انجمنیں، دہشت گرد اور جب قانون کا نفاذ کر رہے ہوں تو اس کام میں ریاست کے ملازم بھی شامل ہوتے ہیں۔ مشہور قاتلوں میں غالب اکثریت مردوں کی ہے (۱۹۹۹ء میں ۱۰۳۶ خواتین کے مقابلے میں ۹۱۳۰ مرد)، اور ان میں نوجوانوں کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۸۰ء میں لگائے جانے والے تخمینے کے مطابق "ایک امریکی کی زندگی میں ایک موقع ایسا ہوتا ہے کہ وہ قتل کا شکار ہو جائے، بہ تناسب سفید فاموں میں ۲۴۰ میں سے ایک اور سیاہ فاموں اور دیگر اقلیتوں میں ۴۷ میں سے ایک ہے" (روزن برگ اینڈ مرسی ۱۹۸۶ء: ۳۷۶) ۲۷ جنوری ۱۹۹۸ء کو صدر کلنٹن کے یونین ایڈریس کے جواب میں سینیٹ میں ری پبلکن اکثریتی رہنما ٹرنٹ لاٹ نے قومی ٹیلی ویژن پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا

"تشدد پر مبنی جرائم ہمارے ملک کو آزاد انسانوں کی سرزمین کے بجائے خوفزدہ انسانوں کی سرزمین بنا رہے ہیں"۔

امریکی عوام: دہشت گردی کا عجیب مزاج

نیوز میڈیا روزانہ امریکی ہلاکت آفرینی کی تصدیق کرتا ہے۔ ایک بچی اپنی ماں کا سر قلم کر کے پولیس اسٹیشن تک جاتی ہے اور اسے فٹ پاتھ پر پھینک دیتی ہے۔ ایک ماں اپنے دو بیٹوں کو غرقاب کر دیتی ہے، دو بیٹے اپنے والدین کو قتل کر دیتے ہیں۔ ایک سیریل کلر طوائفوں کو اپنا نشانہ بناتا ہے، ایک ہم جنس پرست بدکاری کی ترغیب دیتا ہے، اپنے نوجوان شکار کے اعضا کی قطع برید کرتا ہے، ان کے بدن کے ٹکڑے ریفریجریٹر میں محفوظ کر لیتا ہے اور پھر اس گوشت کو کھاتا ہے۔ چھپ کر گولی چلانے والا ایک شخص یونیورسٹی میں چند افراد کو قتل کر دیتا ہے۔ ایک دیہی مڈل اسکول میں رائفلوں سے مسلح دو لڑکے اپنی چار ہم جماعت لڑکیوں اور ایک ٹیچر کو ہلاک، ایک دوسرے ٹیچر اور نو مزید ہم جماعتوں کو زخمی کر دیتے ہیں۔ کولمبائن ہائی اسکول، لٹل ٹن، کولوراڈو میں بھاری ہتھیاروں سے مسلح لڑکوں نے ۱۳ ہم جماعتوں کو ہلاک اور ۲۸ کو زخمی کیا، اور پھر خودکشی کر لی۔ ۹۹۔۱۹۹۶ء کے دوران ۱۱ سے ۱۸ سال کی عمر کے اسکول کے طلباء نے ۲۷ ساتھیوں، طلباء و ٹیچروں، تین والدین کو ہلاک کیا اور ۶۵ دیگر کو زخمی کیا۔ خودکار ہتھیار سے ایک شخص شہری اسکول کے بچوں کا ان کے کھیل کے میدان میں قتل عام کر دیتا ہے۔ ویتنام جنگ میں حصہ لینے والا ایک شخص فاسٹ فوڈ کمپنی ریسٹورنٹ میں موجود گاہکوں پر مشین گن سے حملہ کر کے ۲۰ کو ہلاک اور ۱۳ کو زخمی کر دیتا ہے۔ اس کے علاوہ دو بدو فوجی لڑائی کا ماہر ایک دوسرا شخص چرچ میں گھس کر عبادت میں مصروف لوگوں کا قتل عام کرتا ہے، ساتھ ہی بلند آواز میں کہتا جاتا ہے "میں اس سے پیشتر ایک ہزار قتل کر چکا ہوں اور ایک ہزار مزید کروں گا"

امریکی شہری: بیس کروڑ بندوقیں سات کروڑ رائفلیں ۸۰ لاکھ دو مار گنیں

بالسی کی خوفزدہ کرنے والی غارت گری کے خلاف شہریوں کی صف آرائی اور تدبیر کے نظریات پر مبنی ریاست کے بارے میں لاک جیسی بے اعتقادی میں مبتلا مسلح افراد کے پاس لگ بھگ بیس کروڑ بندوقیں...... کم از کم سات کروڑ رائفلیں، ساڑھے چھ کروڑ ہینڈ گنیں، چار کروڑ نوے لاکھ شاٹ گنیں اور اسی لاکھ دیگر دو مار گنیں موجود ہیں (کنگ اینڈ لڈوگ ۱۹۹۷ء) ہتھیاروں کی تجارت...... ان کے کارخانے، ان کی فروخت، درآمد اور برآمد...... ہزارہا قانونی اور غیر قانونی ڈیلروں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ چار کروڑ چالیس لاکھ بالغ امریکی شہری آتشیں اسلحے کے مالک ہیں، ایک تخمینے کے مطابق یہ اسلحہ کم از کم ایک تہائی امریکی خاندانوں میں موجود ہے۔ بیشتر بچے ان کو تلاش کر لینے کی اہلیت رکھتے ہیں جب کہ والدین کے خیال میں وہ ایسا نہیں کر سکتے۔

امریکی بچے: ڈیڑھ لاکھ پستولیں اسکول لے جاتے ہیں:

قوم کی خاتون اول، ہلیری کلنٹن، چلڈرنز ڈیفنس فنڈ کے تخمینوں پر مبنی حقائق بیان کرتی ہیں کہ روزانہ

ایک لاکھ چھتیس ہزار بچے پستول اور دیگر ہتھیار اسکول لے کر جاتے ہیں (۲۲ فروری ۱۹۹۶ء کو اشواء خوتیم شائز میں خطاب)۔ کہا جاتا ہے کہ شہری اپنی حفاظت، شکار، تفریح اور حکومتی جبر کے خلاف مزاحمت کے لیے اسلحہ رکھنے کے حق کا دعویٰ کرتے ہیں جو ریاست ہائے متحدہ امریکا کے آئین میں ۱۷۹۱ء کی دوسری ترمیم کے ذریعے ناقابلِ تقسیم حق کے طور پر ودیعت کیا گیا ہے "ایک آزاد ریاست کی سلامتی کے لیے ایک بہترین منظم ملیشیا کا ہونا ضروری ہے چنانچہ عوام کا اسلحہ خریدنے اور اس کے استعمال کا حق ختم نہیں کیا جا سکتا"۔

۴۔ امریکہ: سزائے موت کے نفاذ کا مطالبہ:

ریاستی یونٹوں اور ریاست ہائے متحدہ کی وفاقی مسلح افواج کے ذریعے بوقتِ ضرورت قوت بہم پہنچائی جاتی ہے۔ مختلف جرائم میں دس لاکھ اسی ہزار سے زیادہ سزا یافتہ قیدی ہیں، ان میں ۱۹۹۹ء میں سزائے موت کے منتظر ۳۵۲۷ مجرم بھی شامل ہیں (بیورو آف جسٹس ۲۰۰۰ء بی: ۲۰۰۰ء ۱۱ے)۔ وفاقی جرائم کے لیے ۵۰ ریاستوں میں سے ۳۸ میں سزائے موت بدستور نافذ ہے۔ ۱۹۷۷ء تا ۱۹۹۹ء کے دوران مجموعی طور پر ۵۹۸ لوگوں کو موت کی سزا دی گئی۔ بیسویں صدی کے خاتمے پر بڑھتے ہوئے جرائم کے خوف اور بظاہر بے لگام تشدد کے درمیان ایسی تشویش ناک آوازیں بلند ہو رہی ہیں کہ سزائے موت میں توسیع یا اس کا دوبارہ نفاذ کیا جائے سڑکوں پر مزید پولیس والوں کو تعینات کیا جائے، زیادہ لمبی مدت کی سزائے قید نافذ کی جائے اور مزید جیل خانے تعمیر کیے جائیں۔

تشدد کی تربیت:

ویڈیو اور کمپیوٹر گیمز تشدد کے اصل مراکز

امریکہ میں تشدد کی تربیت سماجی طور پر حاصل ہوتی ہے اور ثقافتی طور پر اس کو تقویت پہنچتی ہے۔ رسمی اور غیر رسمی طور پر، قانونی اور غیر قانونی طور پر لوگوں کو سکھایا جاتا ہے کہ قتل کس طرح کیا جائے۔ دو کروڑ چھتیس لاکھ سے زیادہ سابق فوجی ہلاکت آفرینی کے لیے پیشہ ورانہ تربیت حاصل کرنے والے گریجویٹ کہے جا سکتے ہیں۔ (۲۳۸۰۰۰۰۰، ۱۹۹۹ء میں) تقریباً ۴ بالغ مردوں میں ایک سابق فوجی ہے۔ بہت سے جونیئر ہائی اسکولوں، ہائی اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں ابتدائی فوجی تربیت فراہم کی جاتی ہے۔ کاروباری حلقے خود حفاظتی میں قتل کرنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ نجی ملیشیاؤں کو دو بدو لڑائی کی تربیت دی جاتی ہے۔ سڑکوں پر پھرنے والے غنڈوں کے گروہ قتل کرنے کے لیے معاشرتی میلان پیدا کرتے ہیں۔ جیل خانے غارت گری کے کالجوں کے طور پر خدمات ادا کرتے ہیں۔ رسالے کے فوجیوں کے بہترین لڑائی کے فنی پہلو سکھاتے ہیں، ہتھیار فروخت کرتے ہیں اور رسالے پر دستیاب قاتلوں کے بارے میں اشتہارات شائع کرتے ہیں۔ ویڈیو اور کمپیوٹر گیمز، نوجوان کھلاڑیوں کو سڑکوں کی لڑائی سے لے کر زمینی، ہوائی، بحری اور خلائی جنگ میں قتل کرنے کی نقالی کرنے میں مصروف رکھتے ہیں، جس میں

وسیع پیمانے پر ہلاکت آفرین فنی پہلوؤں کا استعمال کیا جاتا ہے۔ "virtual reality" کا کاروبار کرنے والے، "ایڈیز ریالائن کی سطح بڑھانے" "قتل کرو یا قتل ہو جاؤ" جیسی تفریحی تجربات کی تجارت کرتے ہیں۔ ایک وقت کالج کیمپوں میں یہ رو چلتی ہے کہ ساتھی طلباء کو "قتل کرنے" کا کھیل کھیلا جائے۔ حقیقی اور نقلی قتل بچپن میں کھلونا ہتھیاروں سے کھیلنے کی فطری توسیع معلوم ہوتے ہیں۔

امریکی کارٹون فلم ٹی وی پروگرام: ہلاکت آفرینی کے ادارے

ہلاکت آفرینی کے لیے نیا تی تربیت اور انسانی زندگی کی اقدار سے بے حسی مواصلاتی ذرائع سے فراہم کی جاتی ہیں۔ کارٹون، فلموں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو پروگراموں، گیت، کتابوں اور تجارتی اشتہارات کے خالق استاد ہیں۔ بچپن سے بلوغت تک کے عرصے میں ذہن پر تشدد کی ہزار ہا شکلیں اپنا عکس چھوڑ چکی ہیں، ڈرامائی انداز میں یہ بتایا جاتا ہے کہ ہیرو اور ولن کے ذریعہ لوگوں، جائیدادوں، حیوانوں اور فطرت کو کس کس طرح تباہ کیا جا سکتا ہے آہستہ آہستہ کشت و خون اور بربریت کی تصویریں، تیزی سے جنسی مناظر سے متعلق ہو جاتی ہیں۔ خاص طور سے پر تشدد فلموں کے اشتہارات میں جن کے پس پشت ہلاکت آفرینی کے لیے تحت الشعوری رغبت پیدا کی جاتی ہے۔

پیشہ ور محب وطن قاتلوں کی ضرورت ہے:

فوجی بھرتی کے اشتہارات کا حاصل کیا ہے؟

تاریخ میں کسی قوم کے ذہنوں پر اتنی زیادہ ہلاکت خیز تصویروں کے نقش ثبت نہیں ہوئے ہوں گے۔ کمانڈوز اور قاتلوں کی تربیت کرتے ہوئے قتل کرنے میں جھجک پر قابو پانے کے لیے ایک آزمودہ فوجی تکنیک ان جبری طور پر گھناؤنے مظالم کی فلمیں دیکھنے پر مجبور کرنا ہے...... سر کو شکنجے میں جکڑ کر آنکھوں کو بند ہونے سے روکے رکھنا (واٹسن ۱۹۷۸ء: ۵۱۔۲۴۸) ...... یہ ایسا ہی ہے جیسے پوری قوم کو زندگی کے احترام سے عاری کیا جا رہا ہے تا کہ وہ قتل کو غیر جذباتی طور پر قبول کر لے۔ جج حضرات کا کہنا ہے کہ نابالغ قاتلوں میں بتدریج انسانی زندگی کے لیے احترام ختم ہوتا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ سول سوسائٹی کے لیے کتنا ہی نقصان دہ ہو لیکن پر تشدد ذرائع ابلاغ کا پھیلاؤ ایک ایسی ریاست کے لیے فائدہ مند ہے جسے پیشہ ور محب وطن قاتلوں کی ضرورت ہے۔ فوجی بھرتی کے دس لاکھ ڈالر کے ایک اشتہار میں اس کا نمونہ پیش کیا جاتا ہے اور اسے سپر باؤل امریکی فٹ بال کے کھیل کی ہمراہ راست ٹیلی ویژن نشریات پر دکھایا جاتا ہے۔ کروڑوں ناظرین دیکھتے ہیں کہ ایک ویڈیو گیم میں سے شمشیر بدست نیرا تا ہوا ازمنہ وسطیٰ کا ایک سورما چشم زدن میں فضائی فوک سے سلامی پیش کرتا ہوا ریاست ہائے متحدہ کا آج کا ایک میرین افسر بن جاتا ہے۔

امریکہ: روزمرہ کی گفتگو میں تشدد کے عناصر

زبان، ہلاکت آفرینی کو راسخ کرتی ہے اور اسے تقویت پہنچاتی ہے اور ایسا وہ فطری پن اور

ناگزیریت کے احساس کے ذریعے ترقی ہے۔ امریکی معیشت کی بنیاد آزاد انٹرپرائز کیپٹل ازم، پر قائم ہے۔ امریکی روزمرہ کی زبان میں بولتے ہیں "اسٹاک مارکیٹ میں قتل عام کرنا"۔ وال اسٹریٹ کی ایک کہاوت ہے "گلیوں میں جب خون بہہ رہا ہو تو آپ خریداری کرتے ہیں"، اور تجارتی ادارے "قیمتوں کی جنگ" میں مقابلہ کرتے ہیں۔ امریکی سیاست آزادانہ انتخابی جمہوریت پر مبنی ہے۔ انتخابی مہم چلانے والے کارکنوں کو "فوجی دستہ" یا "پیدل سپاہی" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، مجالس قانون ساز میں بل "قتل" کر دیے جاتے ہیں، اور غربت، جرائم، منشیات اور دیگر مسائل پر قوم "جنگ جاری رکھتی ہے"۔ بیس بال امریکہ کا قومی کھیل ہے۔ خوش اور ناخوش پرستار اپنے غصے کا اظہار کرتے ہوئے نعرہ لگاتے ہیں کہ "ایمپائر کو قتل کرو!" کھیل پر رواں تبصرہ کرنے والے مبصر فٹ بال کی مضبوط ٹیموں کو "قاتل" کہہ کر پکارتے ہیں، کھلاڑیوں کو "جنگی جہاز" کہا جاتا ہے، گیند ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کے ہاتھ میں منتقل ہوتے ہوئے "لانگ بم" کہلاتی ہے۔ ناکام ٹیموں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ "قاتلانہ جبلت سے محروم" ہیں۔ امن کے شہزادے کی پرستش کرتے ہوئے، مذہبی آزادی پر غرور میں مبتلا امریکی نعرہ لگاتے ہیں، "عیسائی فوجیو آگے بڑھو" اور عیسائی صلیبی جنگوں اور جہادی جذبے کی عکاسی کرتے ہوئے، "صلیبی سپاہیوں" کے طور پر، حلقہ بنا کر "زینۂ یعقوب" پر چڑھتے ہیں۔ زندگی میں فارغ لمحوں کے بارے میں بات کرتے ہوئے امریکی اسے "وقت کا قتل" کہتے ہیں۔

امریکی: ہلاکت آفرینی کی زبان کیوں بولتے ہیں؟

نسل پرستی اور جنس پرستی کی زبان کے نقصان دہ اثرات کی بڑھتی ہوئی آگہی کے باوجود امریکی فراٹے سے ہلاکت آفرینی کی زبان بولتے رہتے ہیں۔ امریکی انگلش کے لسانی "اسلحہ خانے" میں ایسی اصطلاحات پائی جاتی ہیں جن میں معلوم تاریخ کے تمام اسلحے کا تذکرہ محفوظ ہے۔ ان کے استعمال کے طریقے اور ان کے اثرات سامنے آجاتے ہیں۔ غداری "پشت میں خنجر پیوست کرنا" ہے، بحث پر کلہاڑی چلائی جاتی ہے اور کسی معاملے میں کوشش کا مطلب ہے "نشانے پر گولی چلانا"، "نظریات کو "تارپیڈو" کر دیا جاتا ہے"، حزب اختلاف کے لیے "طیارہ شکن گولہ باری" کی اصطلاح رائج ہے، اور عمل کے نتائج کو "صف سے باہر نکل جانا" کہا جاتا ہے۔ وکلاء "کرائے کی بندوقیں" ہیں۔ کسی خوبصورت فلم اسٹار کو اصطلاحاً "گورے رنگ اور سنہرے بالوں والا بم" کہا جاتا ہے۔

وحشت گردی کو چھپانے کے لیے خوبصورت لفظ

ہیروشیما پر گرانے والا پہلے بم کا نام "ننھا بچہ" تھا

دوسری جانب، حقیقی قتل کو روزانہ خوش گفتاری کا لبادہ پہنا دیا جاتا ہے۔ دنیا کا پہلا ایٹم بم بی۔۲۹ بمبار طیارے سے ہیروشیما پر گرایا جاتا ہے اور اسے "ننھا بچہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے، طیارے کو پائلٹ کی ماں

کے حوالے سے ''اینولا گے'' (Enola Gay) کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے بعد اگلا ہولو کوسٹ بم ''معمولی آدمی'' ناگاساکی پر ''بوک کی کار'' کے ذریعے گرایا جاتا ہے۔ شہری آبادی کے بے تحاشہ قتل عام کی صلاحیت کے حامل بین البراعظمی جوہری میزائلوں کو ''صلح جو'' کہا جاتا ہے۔ جنگ وجدل کی زبان کی جگہ کھیلوں کی اصطلاحیں استعمال کی جاتی ہیں۔ قتل عام کے لیے تیاری کی فوجی مشقوں کو ''کھیل'' کہا جاتا ہے۔ دوران جنگ شہری آبادی یا خود اپنے فوجیوں کے قتل کو ''ضمنی مرجانہ'' Collateral Damage کہا جاتا ہے۔ سابق صدر رونالڈ ریگن نے اس بارے میں یوں اظہار خیال کیا تھا ''جدید تاریخ میں امریکہ جنگ کے لیے کم سے کم تیار، انتہائی پر امن ملک ہے''۔ (پی بی ایس ۱۹۹۴ء)۔

امریکہ: ہلاکت آفرینی کے عناصر اور وجوہات:

امریکہ میں ہلاکت آفرینی کے عناصر باقاعدگی سے امریکی شہریوں کے درمیان اور خود اپنے اور ریاستی ایجنٹوں کے درمیان اجتماعی تشدد کا ارتکاب کرتے ہیں ۱۹۹۲ء ایک سیاہ فام باشندے کے خلاف پولیس کی بربریت کا الزام رد کرتے ہوئے جب عدالت نے پولیس اہلکاروں کو بری کیا تو اس کے ردعمل میں ہونے والی فائرنگ، لوٹ مار اور آتش زنی کے دوران لاس اینجلس کے جنوب مرکزی علاقے میں ۵۲ افراد قتل ہوئے، ۲۰۰۰ زخمی ہوئے، اور ۸۰۰۰ گرفتار کیے گئے۔ دو ماہ کے اندر اردگرد کے علاقوں کے خوف زدہ شہریوں کو کم از کم ۴۰۰۰۰ بندوقیں فروخت کی گئیں۔ یہ خونریزی واٹس (۱۹۶۵ء میں ۳۴) نیوآرک (۱۹۶۷ء میں ۲۶) اور ڈیٹرائٹ (۱۹۶۷ء میں ۴۱) میں ہونے والے اسی نوع کے قتال کی یاد دلاتی ہے، اس کے علاوہ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں غلاموں کی بغاوت کے دوران جانوں کے زیاں کی یاد تازہ کرتی ہے۔ ۱۹۶۷ء میں ڈیٹرائٹ میں امن و امان بحال کرنے کی کارروائی میں ۴۷۰۰ فوجی چھاتہ برداروں، ۱۰۰۰ قومی گارڈ کے سپاہیوں، اور ریاست مشی گن کے ۳۶۰ گھڑ سوار سپاہیوں نے حصہ لیا۔ (لاک ۱۹۶۹ء)

امریکی سیاسی رہنما، بائبل کی پیروی کرتے ہوئے، اس رائے کا اظہار کرنے میں دیر نہیں لگاتے کہ ''باہر ہر طرف جنگل ہے!'' اور ختم ہو جانے والی سلطنت روم کے پیشوائی اور حوالے یاد دلاتے رہتے ہیں، ''اگر امن چاہتے ہو جنگ کی تیاری کرو''۔

امریکی سیاسی علماء: ہلاکت گریز سماج کے امکان کو مسترد کرتے ہیں

یہ حیرت کی بات نہیں ہے کہ سیاسیات کے امریکی سیاسی علماء اور ان کے شاگرد ہلاکت گریز سماج کے امکان کو پرزور طور پر مسترد کر دیتے ہیں۔ اگر کسی یونیورسٹی کے تعارفی کورس سے لے کر گریجویٹ کلاس سیمینار میں ہلاکت گریز سماج کا سوال اٹھایا جائے تو انسانی فطرت، معاشی وسائل کی کمیابی اور جنسی اور دیگر حملوں کے خلاف دفاع کی ضرورت کے بنیادی اعتراضات روایتی طور پر سامنے آتے ہیں۔ کو کہ جوابات ثقافتی بنیادوں پر دیے

جاتے ہیں لیکن ان میں بلا کا تنوع پایا جاتا ہے اور ان کی شاخیں لامحدود ہوتی ہیں۔ ہر بار جب سوال اٹھایا جاتا ہے تو کوئی نئی بات سامنے آسکتی ہے۔ یہ کہا جاسکتا ہے کہ نوع انسانی غلبے کی جستجو میں رہتی ہے، وہ خود غرض، حاسد، ظالم اور جنونی ہے، خود حفاظتی میں قتل کرنا حیوانی رجحان ہے اور ایک ناقابلِ تقسیم انسانی حق ہے۔ انسان معاشی طور پر حریص اور مقابلے پر آمادہ رہتے ہیں، سماجی اختلافات اور متصادم مفادات قتل کو ناگزیر بنا دیتے ہیں۔

سزا کے طور پر جرائم پیشہ افراد کو ہلاک کرنا سماج کو فائدہ پہنچاتا ہے اور دوسروں کو ایسے اقدام سے روکتا ہے۔ ہتھیاروں کی ایجاد کو ختم نہیں کیا جاسکتا، ہلاکت خیز ٹیکنالوجی ہمیشہ موجود رہے گی۔ تاریخ میں ہلاکت گریز کسی سماج کی کوئی مثال نہیں ملتی، یہ قطعاً ناقابلِ تصور ہے۔

کولمبیا: امریکی دانشوروں کے برعکس رویہ

کولمبیا کے شہر میڈیلن میں فروری ۲۰۰۰ء کے دوران تقریباً ۲۰۰ کمیونٹی رہنماؤں کے اجلاس میں شریک لوگوں سے جب یہ سوال کیا گیا، ”کیا ایک ہلاکت گریز سماج کا وجود میں آنا ممکن ہے؟“ تو حیرت انگیز طور پر نفی میں ایک ہاتھ بھی نہیں اٹھا۔ بعد ازاں اس مفروضے کی حمایت میں تمام ہاتھ ایک ساتھ اٹھ گئے۔

کوریا اور کولمبیا میں یہ مثبت جوابات قابلِ توجہ ہیں، یہ وہ سماج ہیں جنھیں بدترین تشدد کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ڈیموکریٹک پیپلز ری پبلک آف کوریا کی تشدد آمیز سیاسی روایات جزوی طور پر ریاست ہائے متحدہ امریکی کی جارحیت پر مبنی ہیں۔

لیفٹیننٹ کرنل ڈیو گراس مین کی وضاحت کے مطابق ”جنگ ایک ایسا ماحول ہے جو تھوڑی عرصے میں اس میں حصہ لینے والے ۹۸ فیصد افراد کو ذہنی طور پر کمزور کر دیتا ہے، وہ لوگ جو جنگ میں پاگل نہیں ہوئے وہ بظاہر میدانِ جنگ میں آنے سے پہلے ہی پاگل پن ..... جارحانہ خلل دماغی ..... میں مبتلا رہ چکے ہوتے ہیں۔ (گراس مین ۱۹۹۵ء: ۵۰) یہ بات روایتی علم سیاسیات کے مفروضوں کے برعکس ہے کہ انسان فطری طور پر پیدائشی قاتل ہوتے ہیں، درحقیقت فوجی تربیت کا بنیادی ہدف ”ایک عام فرد کے اندر قتل کرنے کے خلاف گہری مزاحمت پر قابو پانا ہوتا ہے“۔ (۲۹۵)

انسانی کنبہ: محبت کا حصار نفرت کے خلاف دیوار

انسانی کنبہ قتل نہ کرنے کی صلاحیتوں کے مزید ثبوت فراہم کرتا ہے۔ اگر بنی نوع انسان فطری طور پر قاتل ہوتے، اگر صرف نصف انسانیت ناگزیر طور پر قاتلانہ رجحان کی حامل ہوتی تو اپنی مختلف شکلوں میں خاندان کا وجود باقی نہیں رہ سکتا تھا۔ باپ ماؤں کو قتل کر ڈالتے، مائیں باپوں کو، والدین بچوں کو اور بچے والدین کو۔ ایسے واقعات ہوتے تو ہیں لیکن ان واقعات کی بنا پر ہلاکت آفرینی کا ایک ایسا فطری قانون قائم نہیں ہوتا جو نوع انسانی کی تقدیر کے فیصلے کر سکے۔ اگر ایسا ہوتا تو بہت عرصہ پہلے دنیا کی آبادی عدم آباد کا رخ کر چکی ہوتی۔ اس کے

برخلاف ناقابل بیان حد تک مادی محرومیوں اور نہایت تذلیل آمیز رویوں کے باوجود انسانی کنبہ مسلسل زندگی کی تخلیق اور اس کو برقرار رکھنے میں بے مثال پیمانے پر مصروف رہا ہے۔

مجموعی انسانی زندگیوں کا ۱۰ لاکھ قبل مسیح سے سنہ ۲۰۰۰ء بعد مسیح کا تخمینہ تقریباً ایک سو نوے ارب ۹۱۱۰۰۰۰۰۰۰ لوگوں کا ہے (ویٹس ۱۹۹۶ء نے ۳۷ ساتھ کے فگر ۱۹۹۶ء کو شامل کرتے ہوئے جیسا کہ دوسرے نے ۱۹۹۹ء میں دوبارہ حساب لگایا) روڈولف رومیل نے جنگوں اور Democide کی ہلاکتوں کا جو اندازہ لگایا ہے، اسے پچیس کروڑ تک بڑھا دیں اور غلط طور پر فرض کریں کہ ہلاک ہونے والا ہر شخص واحد قاتل کے ہاتھوں ہلاک ہوا اور پھر قتل عمد کا ارتکاب کرنے والوں کے اعداد و شمار جاننے کے لیے اسے من مانے طور پر چھ سے ضرب دے دیں تو ۱۰۰۰۰ سال قبل مسیح سے اب تک تقریباً ۳۰۰۰۰۰۰۰۰۰ قاتل پیدا ہوئے۔ (۱۰ لاکھ قبل مسیح کے اعداد دستیاب نہیں ہیں)۔

جدید اشتراکی تصور کے مطابق مزدور جب ایک دوسرے کو قتل کرنے کی حمایت سے انکار کریں تو جنگیں ختم ہو جائیں گی۔ (پہلی عالمی جنگ کی مخالفت میں لکھا جانے والا ایک منشور اعلان کرتا ہے۔)

چوہے اور بلی تعاون کر سکتے ہیں تو پھر انسان؟

کیا عالمی طاقتیں اور کمزور ملکوں میں مفاہمت ممکن نہیں؟

ٹولین یونیورسٹی کے ماہر نفسیات لوہسنگ تسائی (۱۹۶۳ء) مظاہرہ کر چکے ہیں کہ چوہے کھانے والی بلی اور ایک تندرست ماں کے چوہے کو پر امن طور پر ایک ہی برتن میں کھانا کھانے کی تربیت دی جا سکتی ہے۔ یہ پر اثر کرنے، سماجی آموزش کی آمیزش کا طریقہ کار تھا۔ شروع میں شیشے کی دیوار کے ذریعے دونوں کو علیحدہ رکھا گیا جہاں دونوں جانوروں نے سیکھا کہ وہ خوراک کی ایک مشترک پلیٹ میں خوراک پہنچانے والے آلے کو چلانے کے لیے یکے بعد دیگرے متوازی لیوروں کا دبانا پڑے گا۔ سات ہزار تدریجی نشستوں کے بعد یہ ممکن ہو سکا کہ شیشے کی درمیانی رکاوٹ کو ہٹا دیا جائے اور چوہا بلی کا ترنوالہ نہ بنے۔ تسائی نتیجہ پیش کرتے ہوئے کہتا ہے: سائنس کی تاریخ میں ہم نے پہلی بار نہایت تجربات کے ذریعے اس بات کا مظاہرہ کیا کہ بلیاں اور چوہے...... نام نہاد فطری دشمن...... تعاون کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ اس طرح کی دریافت نفسیات میں اس روایتی عقیدے کو مسترد کر دیتی ہے کہ حیوانی فطرت میں ایک ناقابل تسخیر جھگڑالو جبلت موجود ہے جو لڑائی یا جنگوں کو ناگزیر بنا دیتی ہے۔

تسائی نے کہا کہ "بہت سوں کا خیال ہے کہ ہماری تحقیق نے امن عالم کے نظریاتی امکان کے لیے اساسی حیاتی بنیاد کا ابتدائی پتھر رکھ دیا ہے"۔

نفسیاتی معالج جیروم سے جے فرینک تعاون کی تجویز یہ ہے کہ ہلاکت خیز مخاصموں پر قابو پانے کے لیے مشترک فائدے متعدد طور پر ہونے چاہئیں۔ (فرینک: ۲۔۲۶۱:۱۹۶۰، ۵۔۲۰۲:۱۹۹۳ء)

انسان حیوانی طور پر جنگجو نہیں اس کی فطرت بہترین ہے:

ماہرین کے ایک بین الاقوامی گروپ نے ۱۶/مئی ۱۹۸۶ء کو سیوائل میں "تشدد پر موقف" کا تاریخی اعلان جاری کیا جس سے انسان کی ہلاکت گریز صلاحیتوں پر اعتماد کے لیے اہم سائنسی بنیاد فراہم ہوتی ہے۔ انھوں نے اعلان کیا:

"یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ ہم نے اپنے حیوانی اجداد سے جنگ کرنے کا رویہ ورثے میں پایا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ جنگ یا کوئی دوسرا پر تشدد رجحان ہماری انسانی فطرت میں جینیاتی طور پر داخل کیا گیا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ انسانی ارتقاء کے عمل میں رجحانات کی دیگر قسموں کے مقابلے میں جارحانہ رجحان کو زیادہ اختیار کیا گیا ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ انسان ایک "پر تشدد ذہن" کا مالک ہے...... یہ کہنا سائنسی طور پر نادرست ہے کہ جنگ کا باعث "جبلت" یا کوئی واحد تحریک ہے۔

انسان حیاتیاتی طور پر پر تشدد مزاج نہیں رکھتا:

ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ حیاتیات انسانیت کو جنگ کے لیے مجبور نہیں کرتی اور یہ کہ انسانیت کو حیاتیاتی قنوطیت کی قید سے آزاد کرایا جا سکتا ہے اور امن کے بین الاقوامی سال اور آنے والے برسوں میں درکار قلب ماہیت کے اہداف کی ذمہ داری نبٹنے کے لیے پر اعتمادی کا اظہار کیا جا سکتا ہے باوجود یہ کہ یہ اہداف اداروں کے اور اجتماعی ہیں، ان کا انحصار انفرادی شراکت داروں کے شعور پر بھی ہے جن کے لیے قنوطیت اور خوش امیدی فیصلہ کن عامل ہیں۔ جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ "جنگیں لوگوں کے ذہنوں میں شروع ہوتی ہیں، بالکل اسی طرح امن بھی ہمارے ذہنوں میں شروع ہوتا ہے۔ ہم میں سے ہر شخص پر اس کی ذمہ داری عائد ہوتی۔ (آدمز ۱۹۹۷: ۲۰۱ :۱۹۸۹)۔

۲/اگست ۱۹۳۹ء کو البرٹ آئن اسٹائن نے امریکی صدر فرینکلن ڈی روزویلٹ کو ایک خط لکھ کر مطلع کیا تھا کہ جوہری طبیعیات اس حد تک ترقی کر چکی ہے کہ "ایک نئی قسم کے انتہائی طاقتور بم" کی تخلیق "قریب الفہم" ہے (ناتھن اور نارڈن، ۱۹۶۸: ۲۹۵ء)۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ امریکی حکومت نے ایک مشاورتی کمیٹی کی تشکیل پر ۶ ہزار ڈالر کی ابتدائی سرمایہ کاری کی اور پھر کئی بلین ڈالر مین ہٹن پروجیکٹ کے لیے مختص کیے اور ۶ سال بعد دنیا کے پہلے یورینیم اور پلوٹونیم بموں کی تخلیق ہوئی اور وہ جاپان کے دو شہروں پر گرائے گئے۔ کئی بلین ڈالر کی رقم کہاں سے فراہم کی گئی؟ جاپان پر بم گرانے کے بعد ایٹم بم کی یہ ٹیکنالوجی امریکہ کے لیے اہمیت کی حامل نہ رہی۔ اس کے بعد ترقی کا سفر ہائیڈروجن بم سے بہت آگے چلا گیا لیکن ۱۹۹۹ء تک ۱۹۴۰ء کی ٹیکنالوجی مختلف ایجنٹوں کے ذریعے تیسری دنیا کے پر جوش سائنس دانوں بھریوں میں بیچی جاتی رہی اگر ٹیکنالوجی بنانے والے

اسے نہ بیچتے تو کون اسے خرید سکتا تھا۔ ٹیکنالوجی کی قیمت بھی وصول کی گئی اور اسی کی بنیاد پر مختلف ملکوں کے خلاف کارروائیوں کا جواز بھی تلاش کیا گیا۔ ہر سائنسی ایجاد اربوں کھربوں روپے کی سرمایہ کاری سے ممکن ہوتی ہے۔ یہ روپیہ ابتدائی طور پر نوآبادیات [کالونیز] کو لوٹ کر حاصل کیا گیا۔ اب یہ روپیہ کہاں سے آرہا ہے اس سوال کے حتمی جواب کے ساتھ ہی سائنس اور سائنسی تحقیقات کی تمام مابعد الطبیعیات، اخلاقیات، تاریخ اس طرح طشت از بام ہوگی کہ کوئی مغرب کی اس جدید سائنس و ٹیکنالوجی کا نام سننا گوارہ نہ کرے گا۔

اطالوی استعمار اور زبانیں:

اطالوی استعمار نے ایتھوپیا، صومالیہ، لیبیا پر قبضہ کیا۔ مقبوضات میں عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط جبراً نافذ کیا۔ لیبیا پر سرکاری زبان کے طور پر اطالوی زبان کا جبراً نفاذ کرایا گیا۔ ایتھوپیا کی زبان Amheric میں جبراً اطالوی الفاظ داخل کیے گئے مگر یہ کوشش ناکام ہوئی۔ یہ افریقہ کی واحد سامی النسل زبان تھی جو محفوظ رہی۔ اب لیبیا میں عربی زبان نافذ ہے اطالوی زبان ختم ہوگئی۔ صومالیہ میں عربی اور صومالی زبانیں آج بھی موجود ہیں۔ اطالوی استعماریت نے قتل عام، تشدد، دہشت گردی کے تمام مظاہر سے فائدہ اٹھایا۔

زائرے (Zaire) پر بیلجیئم کا قبضہ ہو گیا۔ اس کا نام بیلجیئن کانگو رکھا گیا اور یہاں کی زبان بھی تبدیل کردی گئی۔

فرانسیسی استعمار اور زبانیں:

الجزائر فرانس کی نوآبادیات تھا۔ یہاں دس لاکھ انسانوں کا بے دردی سے قتل عام کیا گیا۔ وسائل کا استحصال اس کے علاوہ ہے۔ زائر میں بنٹو زبانیں ہوتو اور تمسی بولی جاتی تھیں لیکن جبراً یہاں کی سرکاری زبان فرانسیسی قرار دی گئی۔ الجزائر میں بھی فرانسیسی کو جبراً سرکاری زبان قرار دیا گیا۔ یا غنچیریہ، مڈغاسکر، سینی گال اور مغرب اقصیٰ فرانس کی نوآبادیات بن گئیں۔ یہاں فرانسیسی زبان کو سرکاری زبان کا درجہ دیا گیا۔ اس کے ساتھ ساتھ مقامی زبانوں کو بھی حالت نیم جاں میں زندہ رہنے کی اجازت دی گئی۔ براعظم افریقہ میں عربی کی آمیزش کے ساتھ جو فرانسیسی بولی جاتی ہے اسے کیپیو (Crepus) کہتے ہیں۔ یہاں فرانسیسی زبان نے عربی کا اثر قبول کیا۔

ولندیزی استعمار اور زبانیں:

ولندیزیوں نے انڈونیشیا پر قبضہ کیا تو وہاں کی زبان پر جبراً اثر انداز ہوئے۔ Bahasa کا رسم الخط عربی سے جبراً لاطینی میں تبدیل کیا گیا۔ بہاسا زبان ملایو پولی نیشیا اور سنسکرت زبان کا سنگم ہے۔ قبول اسلام کے بعد اس کا رسم الخط فطری طور پر عربی ہو گیا تھا۔

جاوا جزیرے کی بوگولی اور بالینی زبانوں کے خود ساختہ رسم الخط تھے۔ یہ جزیرے دو مختلف مذاہب بدھ مت ہندو مت اور ثقافتوں کے مراکز تھے۔ ولندیزی استعمار نے انھیں بھی جبراً تبدیل کرنے کی کوشش کی۔ جزائر کیریبین پر ولندیزیوں کا قبضہ ہوا تو یہاں افریقی لوگوں کو بسایا گیا اور ناکی اور ریوس سولو زبان متعارف کر

سے کے لاطینی زبان و رسم الخط کا نفاذ کیا گیا۔ ہالینڈ کے استعمار کا جنوبی افریقہ پر قبضہ رہا وہاں زولو اور سوتھو زبانیں بولی جاتی تھیں۔ ولندیزی، انگریزی اور جرمن الفاظ داخل کر کے اس کا نام بھی افریکانز کر دیا گیا۔ اب یہ ایک انڈو یورپی زبان بن گئی ہے۔

ولندیزی استعمار نے سورینام (جنوبی امریکہ) پر قبضہ کیا تو اردو، ہندی، تامل زبانوں کا رسم الخط لاطینی کر دیا گیا اور اس ملک کا نام ہالینڈ نے ڈچ گیانا رکھا تھا جسے اب سورینام میں بدل دیا گیا ہے۔

پرتگالی استعمار اور زبانیں:

پرتگالی استعمار گوا پر قابض ہوا۔ گوا بیجاپور ریاست کا حصہ تھا یہاں قبضے کے بعد کوئی زبان کے عربی رسم الخط کو ختم کر کے لاطینی رسم الخط نافذ کیا گیا۔ بعد از یں پر قبضہ کر کے وہاں بھی پرتگالی زبان جبراً نافذ کی گئی۔

روسی استعمار اور زبانیں:

روسی استعماریت نے تمام مسلمان مقبوضات کے رسم الخط عربی سے سریلی (Cyrillic) میں تبدیل کر دیے۔ ازبک اور ایغور زبانیں جن کا ادب ترک اقوام کا زریں ادب کہلاتا تھا انھیں دانستہ فراموش کر دیا گیا۔ لیکن عیسائی ریاستوں آرمینیا اور جارجیا کے معاملے میں روسی استعمار نے مذہبی تفریق کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کا قدیم رسم الخط برقرار رکھا کیوں کہ اس رسم الخط میں عیسائیوں کا صدیوں پرانا علمی و تحقیقی اور تاریخی و ثقافتی ورثہ محفوظ تھا۔ روس نے جارجیئن زبان کو ایک اور رسم الخط جسے "خط سوری" کہتے ہیں لاگو کرنے کی آزادی اور اجازت دی جو سریلک رسم الخط سے انتہائی مختلف اور منفرد تھا۔ یہ فراخ دلی روسی استعمار نے عیسائیت کے لیے اختیار کی لیکن مسلمانوں کو اس فراخ دلی سے کوئی حصہ نہ مل سکا۔

ہرشکو (Avram Hershko) اور امریکا کے اروِن روز (Irwin Rose) کو ملا ہے۔[۵۲]

ایران و ہند: مذہبی استعماریت اور زبانوں کا قتل عام:

ایران و ہند میں مانگدھی سنسکرت ژند زبانوں پر کیا گزری اس کی تفصیل محمد حسین آزاد "آب حیات" میں بیان کرتے ہیں۔

اسی بنیاد پر فتح یابیوں کی بلند نظری نے اس کا نام سنسکرت رکھا۔ جس کے معنی آراستہ، پیراستہ، مسجّع، منزہ، مصفا، مقدس، جو چاہے سمجھ لو۔ ان کے قواعد زبان بھی ایسے مقدس ہوئے کہ نہ رنگان دین کی اسے پڑھائیں تو پڑھائیں، بلکہ اس طرح پکار کر پڑھنا بھی گناہ ہوا کہ شودر کے کان میں آواز پڑے۔ اس زبان کا نام دیو بانی ہوا، یعنی زبان الٰہی، زبان شاہی دید کے منتر ترتیب، جس سے اس عہد کی زبان کا پتہ لگے۔ ۱۲ سو برس قبل مسیح سمجھے جاتے ہیں خیال کرتے ہیں اس وقت ان فتح یابیوں کی باتیں اس ملک اور ملک والوں کے ساتھ ایسی سمجھو جیسے ہندوستان میں پہلے پہلے مسلمانوں کی تھیں۔ ان کے سنسکرت زبان کے مخرج اور تلفظ یہاں کے لوگوں میں آ کر کچھ اور ہو گئے

ہوں گے۔ اس لیے گھروں اور بازاروں میں باتیں کرنے کو قطعے قطعے میں پراکرت زبانیں خود بخود پیدا ہو گئی ہوں گی۔ جیسے اسلام کے بعد اردو۔ چنانچہ ماگدھی (پالی) سورسینی، مہاراشٹری وغیرہ قدیمی پراکرتیں اب بھی اپنی قدامت کا پتا دیتی ہیں۔ ان کی سیاہی میں سیکڑوں لفظ سنسکرت کے چمکتے نظر آتے ہیں مگر گھسے ہوئے ہیں۔

دیکھا پرکرت کے معنے ہیں۔ طبیعت اور جو طبیعت سے نکلے چنانچہ ہیم چند لغات سنسکرت کا جامع بھی یہی کہتا ہے۔ اس کے علاوہ سنسکرت مہذب اور مقدس اور پراکرت غیر مہذب لوگوں کو کہتے ہیں۔ پس ایسی باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھید والے لوگ تھے۔ ہر بات کو خوب سمجھتے تھے اور جو کچھ انھوں نے کیا سمجھ کر کیا۔

راجہ بھوج کے عہد کی ...... کہتی ہیں کہ ان عہدوں میں علمی، کتابی اور درباری زبان تو سنسکرت تھی۔ مگر چوں کہ معاملہ خاص و عام سے پڑتا ہے اس لیے گفتگو میں چندتوں کو بھی پراکرت ہی بولنی پڑتی ہے۔ پراکرت صاف سنسکرت کی بیٹی معلوم ہوتی ہے۔ کیوں کہ اس میں ہزاروں لفظ سنسکرت کے ہیں اور ویسے ہی قاعدے صرف و نحو کے بھی ہیں۔

سنسکرت کی اتنی حفاظت ہوئی، پھر بھی منو سمرتی ویدوں کی ترتیب سے کئی سو برس بعد لکھی گئی تھی۔ اس میں اور "وید" کی زبان میں صاف فرق ہے اور اب اور بھی زیادہ ہو گیا۔ لیکن چوں کہ سلطنت اور معتبر تصانیف پر مذہب کا چوکیدار بیٹھا تھا۔ اس لیے نقصان کا بہت خطرہ نہ تھا کہ دفعتاً ۵۴۳ برس قبل عیسوی میں بدھ مذہب کے بانی شاکیہ منی پیدا ہوئے۔ وہ مگدھ دیس سے اٹھے تھے۔ اس لیے وہیں کی پراکرت میں وعظ شروع کیا۔ کیوں کہ زیادہ تر کام عوام سے تھا۔ عورت مرد سے لے کر بچے اور بوڑھے تک یہی اس دیس کی زبان تھی۔ ان کی آتش بیانی سے مذہب مذکور ایسا پھیلنا شروع ہوا۔ جیسے بن میں آگ لگے دیکھتے دیکھتے دھرم، حکومت، رسم و رواج، دین، آئین سب کو جلا کر خاک کر دیا اور مگدھ دیس کی پراکرت کل دربار اور کل دفتروں کی زبان ہو گئی۔ اقبال کی یاوری نے علوم و فنون میں بھی ایسی ترقی دی کہ تھوڑے ہی دنوں میں عجیب و غریب کتابیں تصنیف ہو کر اسی زبان میں علوم کے کتب خانے سج گئے اور فنون کے کارخانے جاری ہو گئے۔ کہیں کہیں کونے گوشے میں جہاں کے راجہ وید کو مانتے رہے۔ وہاں ویدوں کا اثر رہا۔ باقی راج دربار اور علمی سرکار سب ماگدھی ہی ماگدھی ہو گئی۔ ان کے حوصلے وسیع ہو کر حد سے بڑھے۔ اور بآواز بلند کہہ دیا کہ ابتدائے عالم سے تمام زبانوں کی اصل ماگدھی ہے۔ برہمن اور کل انسان بات کرنے کے لائق بھی نہ تھے۔ اصل میں ان کی بھی اور اوتار مطلق بدھ کی زبان یہی ہے۔ اس کی صرف و نحو کی کتابیں بھی تصنیف ہوئیں۔ خدا کی قدرت دیکھو! جو لونڈی تھی وہ رانی بن بیٹھی اور رانی منہ چھپا کر کونے میں بیٹھ گئی۔

زمانے نے اپنی عادت کے بموجب (تخمیناً ۱۵ سو برس بعد) بدھ مذہب کو بھی رخصت کیا اور اس کے ساتھ اس کی زبان بھی رخصت ہوئی۔ شنکر اچارج کی برکت سے برہمنوں کا ستارہ ڈوبا ہوا پھر ابھر کر چمکا اور

سنسکرت کی آب و تاب بھی شروع ہوئی۔ راجہ بکرماجیت کے عہد میں جو روشنی اس کی فصاحت نے پائی۔ آج تک لوگوں کو آنکھوں کا اجالا ہے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ دربار سلطنت اور اعلیٰ درجے کے لوگوں کو سنسکرت بولنا اعتبار و افتخار کی سند تھا اور پراکرت عوام کی زبان تھی کیوں کہ اس عہد میں جو کالی داس ملک الشعراء نے شکنتلا کا ناٹک لکھا ہے سبھا میں دیکھو تو بادشاہ، امراء اور پنڈت سنسکرت بول رہا ہے کوئی عام آدمی کچھ کہتا تو پراکرت میں کہتا ہے۔

گیارہویں صدی عیسوی سے پہلے راجہ بھرت کے عہد میں برج کے قطعے کی وہ زبان تھی۔ جسے ہم آج کی برج بھاشا کی اصل کہہ سکتے ہیں۔ اس وقت بھی ہر قطعے میں اپنی اپنی بولی عام لوگوں کی حاجت روائی کرتی تھی اور سنسکرت تصنیفات اور خواص کی زبانوں کے لیے باعث برکت تھی کہ دفعتاً زمانے نے ایک اور رنگ بدلا۔ یعنی اسلام کا قدم ہندوستان میں آیا۔ اس نے پھر ملک و مذہب کو نیا انقلاب دیا۔ اور اسی وقت سے زبان کا اثر زبان پر ہونا شروع ہو گیا۔

سنسکرت اور اصل فارسی یعنی ژند و استا کی زبان ایرین کے رشتے سے ایک دادا کی اولاد ہیں۔ مگر زمانے کے اتفاق دیکھو کہ جدا جانے کے سو برس یا کے ہزار برس کی بچھڑی ہوئی بہنیں اس حالت سے آ ملی ہیں کہ ایک دوسری کی شکل نہیں پہچان سکی۔

ہندوستانی بہن کی کہانی تو سن چکے، اب ایرانی بہن کی داستان بھی سن لو کہ اس پر وہاں کیا گزری۔ اول تو یہی قیاس کرو کہ اس ملک نے جو ایران نام پایا، شاید وہ لفظ ایرین ہی کی برکت ہو۔ پھر یہ بھی کچھ تھوڑے تعجب کا مقام نہیں کہ جس طرح ہندوستانی بہن پر وقتاً بوقتاً بدھ مت وغیرہ کے حادثے گزرے اسی طرح اس پر بھی وہاں انقلاب پڑتے رہے۔ باوجود اس کے اب تک ہزاروں لفظ فارسی اور سنسکرت کے صاف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔

ایرانی بہن جب اس ملک میں جا کر بسی ہوگی، اول تو مدت تک ان کے مذہب، رسم و رواج اور زبان جیسے تھے، ویسے ہی رہے ہوں گے۔ مگر اس زمانے کی کوئی تصنیف ہاتھ نہیں آتی۔ کچھ کھوج پھوٹا پایا جاتا ہے تو زرتشت کے وقت سے ملتا ہے، جسے آج تخمیناً ۲۴۰۰ سو برس ہوئے۔ اس نورانی موحد نے شعلۂ آتش کے پردے میں توحید کے مسئلے کو رواج دیا۔ مذہب مذکور نے سلطنت کے بازوؤں سے زور پکڑا اور ایران سے نکل کر دو سو برس کے قریب اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا اور ایشیا کے امن و امان کو تہ و بالا کر دیا۔

یونانی استعماریت کے ہاتھوں ژند کی بربادی:

جو مصیبت بدھ کے ہاتھ سے بید شاستر پر پڑی تھی، وہاں وہی مصیبت ژند و استا پر آئی۔ چناں چہ جس

آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا جس کے آگے گشتاسپ نے تاج اتار کر رکھا۔ جس کی درگاہ میں اسفندیار نے گرز اور تلوار چڑھائی وہ ویران کر کے آب شمشیر سے بجھائی گئی اور آتش خانے خاک ہو کر اڑ گئے۔ افسوس یہ ہے کہ ژند پاژند کے ورق ورق برباد کیے گئے اور ہزاروں کتابیں فلسفۂ الٰہی اور علوم و فنون کی تحصیل کی نابود ہو گئیں۔ جب کہ یونانیوں نے ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر بھی زور دکھایا ہو گا تھوڑے ہی دنوں میں پارتھیاوالوں کا عمل دخل ہو گیا۔ وہ ایران، جسے ہزاروں برس سے ملک گیری کے نشان سلامی اتارتے تھے اور تہذیب و شائستگی اس کے دربار میں سر جھکاتے تھے پانچ سو برس تک تفرقہ پایوں کے قبضے میں دبا رہا۔ اور ژند کی کتب مقدسہ ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کی گئیں۔

۲۰۰ء میں پھر تن بے جان میں سانس اور ساسانیوں کی تلواروں میں قدیمی اقبال نے چمک دکھائی۔ ان بادشاہوں نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کو بھی روشن کیا۔ گرے ہوئے آتش خانوں کو پھر اٹھایا اور جہاں جہاں سے پھٹے پرانے اوراق پریشان ہاتھ آئے بہم پہنچائے۔ ان ہی کی کوششوں کی کمائی تھی، جو پھر ساڑھے چار سو برس بعد نظم اسلام کے قربان ہوئی۔ اس معاملے میں ہمیں نیک پارسیوں کا شکریہ نہ بھولنا چاہیے۔ کیوں کہ باوجود تباہی کے خانہ بربادی کے جو پرانا کاغذ کسی بااعتقاد کے آیا۔ وہ جان کے ساتھ ایمان کو بھی لیتا آیا کہ ہند، سورت، گجرات وغیرہ ملکوں میں آج تک اسی نور سے آتش خانے روشن ہیں۔ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ ان تصنیفات کا بقیہ ہے جو ساسانیوں کے عہد میں ہوئیں کتب مذکور دونوں زبانوں کا لفظی اتفاق ہی نہیں ثابت کرتیں۔ بلکہ ان کے اتحاد اعتقاد پر بھی شہادت دیتی ہیں۔ جو چار رہمان ہندوؤں میں وہی ایران میں تھے۔ اجرام آسمانی کی عظمت واجب تھی حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا تناسخ کا مسئلہ دونوں میں یکساں تھا۔ آتش، آب، خاک، باد اور بجلی، مرغ، ہوا وغیرہ وغیرہ اشیاء کے لیے ایک ایک دیوتا مانا ہوا تھا جس کے اظہار عظمت کے لیے خاص خاص طریقے تھے یا دانی کے زمزمے تھے جس کو وہ اپنی اصطلاح میں گاتھا کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہے جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے کیوں کہ اس میں بھی یادالٰہی کے گیت ہیں۔

بھارت: گیارہ معدوم زبانیں:

بھارت کی گیارہ معدوم زبانوں میں سے نو کا تعلق جزائر انڈمان سے ہے جبکہ دو زبانیں بھارتی سرزمین سے تعلق رکھتی ہیں۔ پالی زبان جو معدوم ہو چکی ہے اس کا سبب مذہبی وحشت گردی تھا۔ اس زبان میں بدھ مذہب کی مقدس کتابیں اور احکامات تھے لہذا برہمنیت نے اس زبان سے عناد برتا اور جب بودھ لوگوں کا نسلی قتل عام ہوا تو یہ لوگ بھارت کے اطراف کے ملکوں میں منتقل ہو گئے اور اس طرح یہ زبان فنا ہو گئی۔ آج سری لنکا اور برما (موجودہ میانمر) میں بودھ بھکشو یہ زبان صرف دینی تعلیم کی غرض سے سیکھتے ہیں۔ ساتی آہم (Ahom) بھارت کی مشرقی ریاست آسام اور اس سے ملحقہ علاقوں میں بولی جاتی تھی لیکن آج یہ ختم ہو چکی ہے۔ جزائر

انڈمان کی زبانیں جو ختم ہوگئیں ان کے نام یہ ہیں: اکابیا، اکابو، اکا کاری، اکا جیرو، اکا کیدے، اکا کول، اکا کوراہ آکمبالے، اور باو کوجواے۔

سنسکرت زبان بھی فنا ہوگئی تھی لیکن مذہبی تعصب اور تفاخر نے اسے پھر سے زندہ کردیا۔ یہ زبان جو کبھی دھرم شالاؤں اور جوگی سنیاسیوں تک محدود ہوگئی تھی اب اس کے بولنے والوں کی تعداد ۱۹۸۱ء کے شمار کے مطابق تقریباً ۶۱۰۶ ہے۔

بھارت دیس میں آج بھی ہندو استعماریت (Hindu Hegemony) اپنے عروج پر ہے جس کے تحت وہاں کی تمام زبانوں کو سنسکرت کے رنگ میں رنگا جارہا ہے جس کے باعث زبانیں اپنی انفرادیت کھوتی جارہی ہیں۔

سترہویں صدی سے پہلے کے قتل عام:

روملی نے اپنی کتاب Death by Government میں اعداد و شمار کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ دنیا کی پوری تاریخ میں جتنے قتل عام ہوئے بیسویں صدی کے صرف اٹھاسی سالوں میں اس سے کئی گنا زیادہ قتل عام ہوئے، سترہویں صدی سے قبل کے تمام قتل عام کی تفصیل ویب سائٹ Hawaii.com سے ۵/فروری ۲۰۰۵ء کو حاصل کیے گئے۔ روملی کے اعداد و شمار کے مطابق سترہویں صدی سے قبل دنیا کی تاریخ میں صرف ۱۴ کروڑ لوگ مارے گئے ان مارے جانے والوں میں سب سے زیادہ تعداد افریقی غلاموں اور چینی سرخ ہندی باشندوں کی ہے۔ چینی شہنشاہیوں چیونگ، ہان، تانگ، سانگ کے ہاتھوں چین کے ۲۰ کروڑ باشندے پانچ سو سال کے دوران ہلاک کیے گئے۔ روملی نے اس قتل عام کی وجوہات اور تفصیلات ویب سائٹ پر مہیا نہیں کی ہیں۔ اس کے بعد دوسرا نمبر امریکی استعمار کا ہے جہاں پچیس سال کے عرصے میں امریکہ کے اصل مقامی باشندے جن کی تعداد دس کروڑ تھی۔ روملی کے مطابق ۸ کروڑ ہلاک کردیے گئے جب کہ مائیکل مین کے مطابق ۹ کروڑ ہلاک کیے گئے۔ دیگر تفصیلات درج ذیل ہیں:

بارہویں صدی صلیبی جنگ: عیسائیوں کے مظالم: ستر ہزار قتل

After the capture of Bram in 1210, the Albigensian Crusaders, Christians all, took 100 of the captured soldiers and gouged out their eyes, cut off their noses and upper lips, and had them led by a one-eyed man to Cabaret, yet to be attacked. the alleged 40,000 to possibly even over 70,000 men, women, and children that were butchered after the Christian Crusaders took Jerusalem in 1099.

افریقی غلام: ساڑھے چھ کروڑ قتل

In the 16th to 19th centuries alone the death toll among African slaves being transported to the New World may have been over 1,500,000, possibly 2,000,000; millions more died in capture and in transit to the Orient or Middle East. And just among those kept in Africa some 4,000,000 may have died. Overall, in five centuries, Europeans, Arabs, Asians, and African slave traders, possibly murdered near 17,000,000 Africans; perhaps even over 65,000,000.

منگولوں کی یلغار اور اس کی تاریخ:

چنگیز خان: بخارا، سمرقند: ساٹھ ہزار شہید

Jinghiz Kahn's army captured Bokhara and allegedly murdered 30,000; and another 30,000 people in capturing Samarkand.

مرو: ۱۳ لاکھ شہید

a Mongol army seized Merv and reportedly took 13 days to slaughter 1,300,000 inhabitants

قزوین، نیشاپور: ایک لاکھ بیس ہزار شہید

Historians also record that in 1220 the Mongols killed 50,000 in Kazvin after it was captured;16 70,000 in Nessa, and a similar number in Sebzevar.

خراسان: تیرہ لاکھ شہید

the Mongol Tului slew 700,000 to 1,300,000 people in Meru Chahjan, one of the four main cities of Khorassan in the Northern borderland of Persia.

رے: تین ہزار مساجد اور کل آبادی شہید

the entire population of Rayy, a city with 3,000 mosques, was slaughtered. Herat was later captured, but only some 12,000 soldiers and their dependents were killed.

However, after the inhabitants later rebelled Jinghiz Khan angrily sent his general Noyan against them. The city was recaptured and it took a whole week

to burn it down and murder its estimated 1,600,000 people. Many thousands escaped, but Noyan later sought and killed over 2,000 of them. Then in 1226-33 there was the nearly total extermination-truly a genocide

بغداد: ۸ لاکھ شہادتیں

The Mongols subsequently invaded what is Iraq and in 1258 the Mongol Khulagu captured Baghdad, sacked and burned the city, including most mosques, and reportedly annihilated 800,000 of its people. 1381 to 1401

تیمور: تین ہزار جھیلیں، سروں کے مینار

Tamerlane (or Timur Lenk), a Turk who proclaimed himself restorer of the Mongol Empire, razed Isfarā'in to the ground in A.D. 1381; built 2,000 prisoners into a living mound and then bricked them over at Sabsawer in 1383; piled 5,000 human heads into minarets at Zirih in the same year; cast his Luri prisoners alive over precipices in 1386; massacred 70,000 people and piled the heads of the slain into minarets at Isfahan in 1387; . . . buried alive 4,000 Christian soldiers of the garrison of Sivas after their capitulation in 1400; and built twenty towers of skulls in Syria in 1400 and 1401.

منگولوں کے ہاتھوں تین کروڑ انسانوں کا قتل

the Mongol khans and their successors and pretenders possibly slaughtered around 30,000,000 Persian, Arab, Hindu, Russian, Chinese, European, and other men, women, and children.

قبلائی خان: ایک کروڑ پچاسی لاکھ چینیوں کا قتل

Khubilai Khan's rule over China. According to a Chinese writer, "in gaining and maintaining his throne he slaughtered more than 18,470,000 Chinese. He killed something like 1 out of every 137 Chinese each year. In ChineseDynasty:

شہنشاہ چینگ [چین]: ۴۶۰ دانشور زندہ دفن کردیے

Even the great emperor who unified China and gave it his name, Qin

(pronounced Chin) Shihuang, buried alive 346 scholars in order to discourage opposition.

ہان شہنشاہیت: ایک کروڑ قتل

In the eight years that the Han Dynasty was being replaced by the Qin Dynasty 221-207B.C., the population of China decreased from 20 million to 10 million.

چین: تین سو سال میں چار کروڑ تیس لاکھ قتل

In the Dong (Eastern) Han Dynasty 206B.C.-220A.D., the population of China was 50 million. After the transition of power to the Three Kingdom period 222-589, the population decreased to 7 million.

تانگ شہنشاہیت: ساڑھے تین کروڑ لوگوں کا قتل

In the Sui Dynasty 581-618, the population of China was 50 million. After the transfer of power to the Tang Dynasty 618-907, only one third was left.

سانگ شہنشاہیت: ساڑھے آٹھ کروڑ لوگوں کا قتل

At the peak of the Song Dynasty 960-1279 the population was about 100 million. But in the beginning of the Qing Dynasty in 1655, the population was 14,033,900. During the 20 year period from 1626 to 1655, the population decreased from 51,655,459 to 14,033,900.

تاپینگ ٹرائڈ غدر: چار کروڑ تیس لاکھ قتل

just in the one month of 1681, for just the Triad Rebellion, in merely the one province of Kwangtung, with the rebellions defeat "some 700,000 people were executed. During the last century in over some fifteen years the Teiping Rebellion possibly cost "tens of millions" of lives, maybe even as many as 40,000,000. Some 600 cities were "ruined." Because the rebellion began in the province of Kwangsi, Imperial forces allowed no rebels speaking its dialect to surrender. All were slaughtered. Indeed, massacre on both sides during this and the almost concurrent Nein Rebellion was general. For one county in the province of Anhwei, for example, local scholars lamented that out of a

population of 300,000 Chinese. "By the time the rebels were cleared only a little over 6,000 survived. This is a catastrophe unique for the locality since the beginning of the human race." Overall, 70 percent of the province's population were killed or died. When the Teiping rebels captured Nanking in 1853 they killed all the Tartars garrisoning the city. But this was not enough. They also murdered all their family members. In total about 25,000 people may have been wiped out. When imperial troops recaptured Nanking the following year they in turn allegedly exterminated about 100,000 rebels, and in just three days. They followed the same quick and bloody policy in Canton and along the Pearl River. After they recaptured this area from the rebels they are said to have beheaded 700 to 800 inhabitants a day, whether rebel collaborator or not, ultimately killing another 100,000 people. Just in the province of Kwangtung, it is written that 1,000,000 were executed. In one province, reportedly 1,000,000 were executed! This is more than the total number of Americans killed in all the civil and international wars the United States has fought in its whole history, including the War of Independence.

There also was the nearly concurrent Moslem uprisings with their attendant slaughter. For the province of Yunnan 5,000,000 out of 8,000,000 may have died. When the last Muslim stronghold fell to imperial forces, 20,000 men, women, and children were "put to the sword."45 In Shensi province population fell from 700,000 or 800,000 Moslems to between 20,000 and 30,000 in ten years. Even most of the 50,000 to 60,000 Moslems that fled to Kansu province perished. All told still a much larger number of Chinese were massacred by Moslem rebels or otherwise died.

عثمانی سلاطین: چالیس ہزار لوگوں کا قتل

When the Ottoman Mohammed II sieged and finally took Constantinople in 1452, he massacred thousands.

As the 1876 Bulgarian rebellion against the Ottoman Empire that was brutally suppressed by the Sultan: about 60 villages were destroyed, and 12,000 to 15,000 massacred. In one reported incident, a church was set ablaze to burn alive the 1,200 people who had gathered inside for protection.

Sixteen Century Sultan Selum (The Grim), father of SŸleyman whose campaign diary was quoted above, killed his father, two brothers, many nephews, sixty-two other relatives, and seven grand viziers during his eight year rule. It is told that he inaugurated this bloody reign by slaughtering 40,000 Turkish Shi'ites.

ڈیوک آف بوربن: لاکھوں لوگوں کا قتل عام

In 1527 the army of Tirolese condottiere Frunsberg and Charles, Duke of Bourbin, captured and sacked Rome. Historians record that at a minimum 2,000 corpses were thrown into the Tiber river and 9,800 dead were buried;50 many more were killed. During the Thirty Years War the Count of Tilly and Count zu Pappenheim may have massacred as many as 30,000 inhabitants of Magdeburg when the city fell to them after a six-month siege.

The German Empire alone may have lost more than 7,500,000 people in the war.

ڈیوک آف البا: اٹھارہ ہزار قتل

From 1567 to 1573, the Duke of Alba (representative to the Low Countries of Philip II, King of Spain) tortured to death and otherwise killed 18,000 Protestants to maintain order, or so it is said.

بوہیمیا: ایک کروڑ دس لاکھ قتل

The population of Bohemia had been reduced from around 4,000,000 people to possibly no more than 800,000. Putting a number of such figures together, in this war alone from 2,000,000 to over 11,000,000 people were probably murdered.

صلیبی جنگیں: لاکھوں لوگوں کا قتل عام

And the Crusades of the Middle Ages should not be ignored. In the aforementioned 1099 sack of Jerusalem, besides the 40,000 to over 70,000 Moslems that may have been butchered, the Crusaders herded surviving Jews into a synagogue and burned them alive.

In 1209 the Albigensian Crusaders also slaughtered some 15,000 to 60,000 inhabitants of Baziers, after which the city was plundered and burned. And in 1236 when the Jews of Anjou and Poitou refused to be forcibly baptized, the Crusaders reportedly trampled 3,000 of them to death with their horses.

فرانس: گیارہ لاکھ لوگوں کا قتل

the Great Terror of 1793-1794 in revolutionary France: The Revolutionary Tribunal and its equivalent in the provinces may have executed up to 20,000 of the nobility, political opponents, and alleged traitors. And although often reported as a civil war, in fact a full-scale genocide was carried out in the Vendze in which possibly 117,000 inhabitants were indiscriminately murdered.

دو کروڑ پچیس لاکھ یورپیوں کا قتل

Jews everywhere were thus attacked during the Black Death of 1347-1352 that killed around 25,000,000 Europeans.

جزیرہ بورنیو میں قتل عام:

An 1849 expedition sent out against certain native tribes of the coast of Borneo. Under the direction of Sir James Brooke, British Rajah of Sarawak, it annihilated a force of Dyaks then allegedly returning from a piratical excursion against coastal tribes. About 1,500 to 2,000 of them were killed by cannon shot, musket, grapeshot.

ولندیزی استعمار: ہزاروں چینیوں کا قتل

Inside the walls of Batavia, stripping them of the smallest kitchen knife and

putting them under a dusk-to-dawn curfew. The Dutch then distributed arms to what they themselves called "the low-class masses" and gave these "mobs" a free hand to massacre the helpless Chinese. The rapine inside Batavia was allowed to go on from the 9th to the 22nd of October, 1740. While the "mobs" were despatching Chinese lives inside Batavia, the Dutch East India Company troops killed those who had fled from the city before the curfew and roamed in Batavia's environs.

10,000 city-Chinese lost their lives.

Of the 80,000-odd Chinese in Batavia's environs prior to the extermination only around 3,000 survived.....

in June 1741 the Council of the Indies voted for a "general massacre of the Chinese over the whole of Java."

۴ امریکی استعمار: آٹھ کروڑ سرخ ہندیوں کا قتل

As the Puritan killing of 500-600 Pequot Indians at Mystic Fort in 1637 and the French annihilation of perhaps 1,000 Nanchez Indians in the lower Mississippi after defeating them in 1731. To consider one notorious massacre, in 1864 citizen and military troops enlisted from the Colorado territory and led by Colonel John Chivington surrounded and surprised Cheyenne at Sand Creek in the Colorado Territory. In total from 70 to 600 were massacred, the latter the upper estimate of the Colonel; 130 killed seems closer to the truth. At Washita 103 Cheyenne were killed in 1868; in 1870 at Piegan Village 173 Indians were killed; and at Wounded Knee in 1890 it was possibly 146 Sioux. Also often cited is the Bear River Massacre of 1863 in which 250 Shoshoni were wiped out. This began as a battle between Indians and soldiers, but degenerated into a slaughter of helpless and wounded Indians. Some 3,000 Indians were killed in the years 1789 to 1898. Settlers and vigilantes likely killed a thousand more.

Since many of these Indians were killed in pitched battles, it seems very unlikely that the number of Indians massacred outright by Calvary and settlers in the American West could have been more than 4,000, and was probably a good number less. In the 1835 treaty of New Echota with the U.S. government Cherokee leaders of a minority faction, and without the approval of the majority, agreed to the nation moving out of Georgia to West of the Mississippi River. Although many prominent Americans publicly opposed such a deportation, in 1838 President Van Buren ordered the army to enforce the treaty. At gun point the Cherokees were thus made to trek westward to Oklahoma in the winter of 1838-39. The resulting exposure and disease killed off nearly 25 percent of the tribe, or about 4,000 people. While the Federal Government's responsibility is mitigated by the treaty, the cruelty of the enforcement amounts to indirect massacre. It was democide. Perhaps overall, considering these and other cases and including massacres, by 1900 some 10,000 to 25,000 Indians may have been killed. Before the conquest of the New World the Indian population may have numbered from 8,000,000 to 110,000,000; perhaps even 145,000,000. A moderate population estimate consistent with the latest research is of 55,000,000 Indians. Almost totally as a result of several waves of disease carried to the Americas by the conquering and colonizing Europeans, the Indian population dropped steeply by tens of millions, even possibly by as much as 95 percent.80 In Mexico alone the Indian population may have fallen by 23,000,000 to under 2,000,000. including those Indians who were killed in warfare and democide, perhaps 60,000,000 to 80,000,000 Indians of Central and South America and the Caribbean died as "a result of the European invasion." I found one overall estimate of 15,000,000 Indians killed in what appears to be democide, but this figure is given without

citation or elaboration. In any case, judging by the bloody history of this period of colonization throughout the Americas, a democide of 2,000,000 would seem a rough minimum and 15,000,000 dead a maximum. Even if these figures are remotely true, then this still make this subjugation of the Americas one of the bloodier, centuries long, democides in world history.

برطانوی استعمار: آسٹریلیا کے باشندوں کا قتل عام

In Tasmania alone by 1832 as many as 700 out of an original population of 1,000 may have been killed. In all of Australia the Aborigine population in 1788 was about 300,000, divided into about 500 tribes, each with a distinct dialect and culture. In the resulting frontier conflict with settlers during the 18th and 19th centuries, possible 20,000 or more Aborigines were killed.

سلطان فیروز شاہ کے ہاتھوں قتل عام

It is recorded that in the 12th or 13 century Sultan Firoz Shah invaded Bengal and offered a reward for every Hindu head, subsequently paying for 180,000 of them. Whenever in his territory the number of Hindus killed in one day totaled 20,000, Sultan Ahmad Shah celebrated with a three-day feast.

کنگ چارلس نہم: ایک لاکھ کالونسٹوں کا قتل

On August 24th, 1572, King Charles IX or his Court unleashed a slaughter of French Calvinists that spread from Paris to the whole country. In this famous St. Bartholome day massacre a contemporary Protestant estimated that 300,000 were killed; later estimates reduced this to 100,000, then 36,000.

عثمانی سلاطین: قتل عام کی وارداتیں

A more recent example of genocidal massacres is given by the Ottoman Empire. It was composed of diverse nations, which were often treated with great cruelty by the ruling Turks. Their massacre of Bulgarians in 1876. This was but one of many massacres of national groups. In 1822 they allegedly killed 50,000

Greeks, largely in Scio (Chios); 10,000 Nestorians and Armenians in Kurdistan in 1850; and 11,000 Maronites and Syrians in Lebanon and Damascus in 1860. From 1894 to 1896 the Sultan carried out a systematic campaign of murder. Probably between 100,000 to over 300,000 Armenians were massacred. When these killings are added to those by various Ottoman Sultans through the centuries, at the very least they must have exterminated some 2,000,000 Armenians, Bulgars, Serbs, Greeks, Turks, and other subjects.

رومّل نے ہندوؤں کے ہاتھوں بدھ مت کی تباہی و بربادی اور لاکھوں بدھوں کی ہلاکت کے بارے میں اعداد و شمار مہیا نہیں کیے اسی طرح منگولوں کے ہاتھوں مسلم علاقوں کی تباہی کا بہت مختصر تذکرہ کیا گیا ہے۔ مغلوں کے ہاتھوں ہندوستان میں قتل عام کی تفصیل بھی نہیں دی گئی جب کہ مکنڈ مہدی نے کلین جج کی کتاب کے مقدمے میں مغلوں کے مقتولین کی تعداد تین کروڑ درج کی ہے جو درست نہیں ہے۔ رومّل نے ایران میں صفوی حکومت کے ہاتھوں قتل عام کی تفصیل بھی نہیں دی۔ جب کہ براؤن کی کتاب اس سلسلے میں کافی معلومات فراہم کرتی ہے۔ عیسائیت کے ہاتھوں ہم مذہب لوگوں کے قتل کی تفصیلات بھی نہیں دی گئی ہیں۔

بیسویں صدی: دنیا کی تاریخ کی سب سے خونی صدی

رومّل نے اپنی کتاب Death by Government میں اعداد و شمار کے ذریعے بیسویں صدی کو دنیا کی تاریخ کی خون خوار صدی کے طور پر نمایاں کیا ہے۔ رومّل کی کتاب کے اعداد و شمار ویب سائٹس Hawaii.com سے فروری ۲۰۰۵ء میں حاصل کیے گئے تھے ملاحظہ فرمایئے:

بیسویں صدی: پندرہ کروڑ دس لاکھ لوگوں کی قاتل

میدان جنگ میں مرنے والے: تین کروڑ پچاسی لاکھ

Those states killing in cold blood, aside from warfare, 1,000,000 or more men, women, and children. These fifteen megamurderers have wiped out over 151,000,000 people, almost four times almost 38,500,000 battle-dead for all this century's international and civil wars up to 1987. The most absolute Power, that is the communist U.S.S.R., China and preceding Mao guerrillas, Khmer Rouge Cambodia, Vietnam, and Yugoslavia, as well as fascist Nazi Germany, account for near 128,000,000 of them, or 84 percent.

بیسویں صدی: ڈیموسائیڈ میں ایک کروڑ پچاس لاکھ لوگوں کا قتل

Then there are the kilomurderers, or those states that have killed innocents by the tens or hundreds of thousands, China Warlords (1917-1949), Ataturk's Turkey (1919-1923), the United Kingdom (primarily due to the 1914-1919 food blockade of the Central Powers in and after World War I, and the 1940-45 indiscriminate bombing of German cities), Portugal (1926-1982), and Indonesia (1965-87). Some lesser kilomurderers were communist Afghanistan, Angola, Albania, Rumania, and Ethiopia, as well as authoritarian Hungary, Burundi, Croatia (1941-44), Czechoslovakia (1945-46), Indonesia, Iraq, Russia, and Uganda. For its indiscriminate bombing of German and Japanese civilians, the United States must also be added to this list. These and other kilomurderers add almost 15,000,000 people killed to the democide for this century.

روس میں بیگاری نظام: چار کروڑ کا قتل:

رومل کے خیال میں چار سو سال کے دوران افریقہ کے مقتول غلاموں کی تعداد روس میں جبری بیگار میں مرنے والوں سے نصف ہے جب کہ روس میں چار کروڑ لوگ صرف ستر سال کے عرصے میں ہلاک ہوئے جب کہ امریکی استعمار نے پچاس سال کے عرصے میں ۹ کروڑ سرخ ہندیوں کو جو امریکا کے اصل باشندے تھے۔ روئے زمین سے مٹادیا۔

Far above all is gulag-the Soviet slave-labor system created by Lenin and built up under Stalin. In some 70 years it likely chewed up almost 40,000,000 lives, over twice as many as probably died in some 400 years of the African slave trade, from capture to sale in an Arab, Oriental, or New World market.

بیسویں صدی کے اٹھاسی سال: سترہ کروڑ لوگوں کی تعذیب ۲۰٫۳ کروڑ لوگوں کی قتل

In total, during the first eighty-eight years of this century, almost 170,000,000 men, women, and children have been shot, beaten, tortured, knifed, burned, starved, frozen, crushed, or worked to death; or buried alive, drowned, hung, bombed, or killed in any other of the myriad, ways governments have inflicted

death on unarmed, helpless citizens or foreigners. The dead even could conceivably be near 360,000,000 people.

جنگوں اور خانہ جنگوں میں: بیس کروڑ تیس لاکھ قتل

Putting the human cost of war and democide together, Power has killed over 203,000,000 people in this century.

ہٹلر: ۲ کروڑ دس لاکھ یہودیوں کا قتل

روسی شہری چھ کروڑ بیس لاکھ قتل

Hitler murdered millions of Jews is common knowledge. That he murdered overall near 21,000,000 Jews, Slavs, Gypsies, homosexuals, Frenchmen, Balts, Czechs, and others, is virtually unknown. Similarly, that Stalin murdered tens of millions is becoming generally appreciated; but that Stalin, Lenin, and their successors murdered almost 62,000,000 Soviet citizens and foreigners is little comprehended out side of the Soviet Union (where similar figures are now being widely published). Then there is Mao Tse-tung's China, Chiang Kai-Shek's China, the militarist's Japan, Yahya Khan's Pakistan, Pol Pot's Cambodia, and the others.

نازی، جاپانی اور چینیوں کے ہاتھوں قتل عام:

Aside from battle or military engagements, during the war the Nazis murdered around 20,000,000 civilians and prisoners of war, the Japanese 5,890,000, the Chinese Nationalists 5,907,000, the Chinese communists 250,000, the Nazi satellite Croatians 655,000, the Tito Partisans 600,000, and Stalin 13,053,000.

بیسویں صدی: حکومتیں سترہ کروڑ لوگوں کی قاتل

Murder of between 5 to 6 million Jews became the paradigm case of genocide and underlies the word's origin.

Taking both social definitions into account, governments have murdered probably around 174 million people during the 20th Century. Most of this

killing, perhaps around 110 million people, is due to communist governments, especially the USSR under Lenin and Stalin and their successors (62 million murdered), and China under Mao Tse-tung (35 million). Some other totalitarian or authoritarian governments are also largely responsible for this toll, particularly Hitler's Germany (21 million murdered) and Chiang Kai-Chek's Nationalist government of China (about 10 million). Other governments that have murdered lesser millions include Khmer Rouge Cambodia, Japan, North Korea, Mexico, Pakistan, Poland, Russia, Turkey, Vietnam, and Tito's Yugoslavia.

Burundi (1972), Cambodian Khmer Rouge (1975-79), Iraq (1963-), Myanmar (1962-), Nigeria (1967-70), Rwanda (1994), Serbia (1990s), Sudan (1956-), and many others.In the Taiping Rebellion (1851-64) alone, upwards of forty million were killed, the vast majority likely murdered.

بدترین قاتل: روسی حکومت

The worst murdering government was that of the Soviet Union, where Lenin, Stalin, and their successors may have killed around 62 million citizens and foreigners.

The Communist Party of China under Mao Tse-tung and his successors may have accounted for 39 million Chinese.

The Nazis under Hitler carried out the Holocaust against the Jews, which everyone knows about, but lesser known is their other murders, which including the Jews amount to about 21 million murdered.

چیانگ کائی شیک: ایک کروڑ لوگوں کا قاتل

Virtually unknown is that the Chinese Nationalist government, while in power from 1928 to 1949 under Chiang Kai-Shek, murdered some 10 million Chinese.

There were lesser murdering governments that while they killed a million or

more people, managed to keep the total under 10 million. Just to name them, with the years and approximate millions murdered in parenthesis: Japan (1937-45: 6), Cambodia Khmer Rouge (1975-79: 2), Turkey (1909-18: 1.9), Vietnam (1945-87: 1.7), North Korea (1948-2002: over 2), Poland (1945-48: 1.6), Pakistan (1958-87: 1.5), Mexico (1900-20: 1.4), Russia (1900-17: 1.1), and Yugoslavia under Tito (1944-87:1). Well over a hundred other governments murdered their share in the tens or hundreds of thousands in this 20th century blood bath.

بیسویں صدی: دیگر قتل عام

Those cases that most clearly would be such crimes are the Holocaust costing 5-6 million Jews killed, of course. Both the UN Tribunals for Rwanda (overall about, 500-750 thousand Tutsi killed in 1994) and Yugoslavia (about 25,000-100,000 murdered in Bosnia-Herzegovina) have found that genocide had occurred and have meted out punishment. Some other major cases that fit or come close, with murdered in parenthesis) are the 1909-23 mass murder of Armenians, Greeks, and other Christians by the Turkish regimes (about 2.1 million Armenians and 347 thousand Greeks), Cambodian Khmer Rouge 1975-79 murder of Buddhist monks, Cambodian-Vietnamese, Muslims, and other minorities (541,000); 1904-07 German murder of Hereros, Hottentots, and Berg-Damaras of Namibia (72,000), 1967-87 Burundi murder of Hutus (150,000), World War II Croatia's murder of Serbs and Jews (655,000), Iraq's 1966-88 murder of Kurds and southern Shiites (over 100,000).

قتل کے اعداد و شمار کے لحاظ سے بیسویں صدی دنیا کی تاریخ کی بدترین، ظالم ترین اور وحشیانہ صدی تھی جس میں ایک ارب سے زیادہ لوگ مارے گئے۔ بیسویں صدی کو تاریخ انسانی کا سب سے اہم زمانہ کہا گیا، جب جمہوریت، مساوات، انسانی حقوق، سائنسی ترقی، خدا بیزاری، مذہب سے نجات، مذہبی اقدار سے لاتعلقی عام تھی۔ سترہویں صدی سے پہلے کے زمانے کو مغرب اور مشرق کے تمام سیکولر مفکرین Dark Age

تاریک زمانہ کہتے ہیں۔ کیونکہ کہ سترہویں صدی سے قبل انسان علم کا سرچشمہ انسان کو بھی اچھے علم، تجربے، مشاہدے، جذبات، حواس، وجدان کو نہیں سمجھتا تھا اور بخار رتی ذریعہ علم کو علم کالازمی حتمی قطعی آخری اور درست جیلہ سمجھتا تھا لہٰذا سترہویں صدی سے پہلے کے تمام انسان انسان نہیں جاہل، وحشی اور درندے تھے۔ ردمیل کے اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ سترہویں صدی سے پہلے کے وحشی جاہل انسانوں نے اپنی پوری تاریخ میں صرف ۷۴ کروڑ لوگ قتل کیے اس میں بھی تین چوتھائی قتل چینی شہنشاہیوں اور تاتاریوں کے ہاتھوں ہوئے۔ مذہبی بنیادوں پر قتل عام کی تاریخ بہت مختصر ہے۔ عیسائیوں کی جانب سے انکوئزیشن Inquisition اور ہندوؤں کی جانب سے بدھوں کے قتل عام کے اعداد و شمار بھی شامل کر لیے جائیں تب بھی بیسویں صدی کے جمہوری قتل عام بہت کم ہوں گے لیکن سترہویں صدی کے بعد تو پچھلے تمام ریکارڈ توڑ دیے گئے اور ردمیل کے مطابق صرف بیسویں صدی کے ابتدائی اٹھاسی سال میں ۳۶ کروڑ لوگ قتل کیے گئے۔

جدید جمہوریتوں کے ہاتھوں پندرہ کروڑ لوگوں کا قتل: مائیکل مین
صرف امریکی استعمار نے ۹ کروڑ سرخ ہندیوں کو قتل کیا

پروفیسر مائیکل مین کیلی فورنیا یونیورسٹی کے سوشیالوجی کے پروفیسر ہیں، ان کی نسل کشی سے متعلق کئی کتب شائع ہو چکی ہیں، ان کتب میں کیمبرج یونیورسٹی پریس سے شائع ہونے والی The Dark Side of Democracy شائع شدہ ۲۰۰۵ء، The Source of Social Power شائع شدہ ۱۹۹۳ء، ۱۹۸۶ء Facsist شائع شدہ ۲۰۰۴ء شامل ہیں۔ مائیکل مین کا مضمون "جمہوریت اور نسل کشی میں فطری تعلق" جو ان کی کتاب The Dark Side of Democracy میں شامل ہے جدید جمہوریتوں کے ہاتھوں قتل ہونے والے کروڑوں انسانوں کی تفصیلات بیان کی گئی ہیں، یہ مضمون لندن سے شائع ہونے والے رسالے New Left Review میں شائع ہو چکا ہے۔

مائیکل مین کے مطابق جمہوریت کے سنہری دور میں چھ کروڑ انسانوں کو قتل کیا گیا۔

۱۔ ۱۹۱۶ء سے قبل کی دہائیوں میں پچیس لاکھ یہودی مغرب کی طرف نقل مکانی کر گئے۔

۲۔ تشدد کی آخری لہر بلقان (Balkan) جنگوں کی صورت میں ظاہر ہوئی جس سے سلطنت عثمانیہ کے پانچ لاکھ عیسائی عوام شمال کی جانب فرار پر مجبور ہوئے۔

۳۔ قوم پرست ترکوں کی جانب سے آرمینیا میں دس لاکھ افراد کا قتل عام کیا گیا۔

۴۔ پچیس ہزار یوکرائنی یہودی خود یوکرائن ہی کے قوم پرستوں کے ہاتھوں مارے گئے اور پچاس ہزار سے زائد کو white آرمی نے مار ڈالا۔

۵۔ پولینڈ کے ۲۰ لاکھ باشندوں، ۲۰ لاکھ سے زائد روسیوں، اور یوکرائنوں، تقریباً دس لاکھ جرمنوں،

اندازاً ۲ لاکھ ۵۰ ہزار مالی شہری، ۸ لاکھ افراد کو لتھوانیا، لاتویا اور استونیا سے ترکِ وطن کرنا پڑا۔

۶۔ نازیوں نے بیسویں صدی میں یورپ اور امریکا کے دماغی طور پر معذور افراد کے اخلاف اور منحرفین کے حیاتیاتی انضمام کا دائرہ قتل و غارت پر مبنی تطہیر تک وسیع کر دیا۔ جنگ سے قبل ہی لوگوں کی حیاتیاتی خالصیت کو بچانے کی خاطر ۷۰ ہزار دماغی مریضوں کو مار ڈالا گیا۔ اس کے بعد نیم فوجی قائدین نے نسل کشی کی رہنمائی کا بیڑہ اٹھایا تقریباً ۲ لاکھ مریضوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اس کارروائی کا جال اتنا پھیلا کہ اس میں پولینڈ، روس اور فرانس کے مریض بھی شامل کر لیے گئے۔

۷۔ آریائی نو آبادیاتی بنانے والوں کے لیے زمین حاصل کرنے کی غرض سے پولینڈ کے ۲۰ لاکھ باشندے قتل کر دیے گئے۔

۸۔ یورپ میں آباد یہودیوں کا تین چوتھائی یعنی ۶۰ لاکھ کے قریب قتل کر دیے گئے۔ اگرچہ ۷۰ لاکھ غیر یہودی سوویت شہری، ۳۰ لاکھ سوویت جنگی قیدیوں کا قتل بھی سیاسی تطہیر کا حصہ تھا۔

۹۔ استاچے Ustachez نے اپنی سرزمین سے سربوں کو نکال باہر کیا جس سے ۳ لاکھ افراد کو قتل کیا۔

۱۰۔ سوشلزم کے مخالفین کا صفایا لاکھوں میں ہو گیا۔

۱۱۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد دو جرمن مملکتوں کے مشرق اور آسٹریا میں آباد ایک کروڑ ستر لاکھ جرمن باشندوں میں سے (سوویت یونین میں رہائش پذیر ۲۰ لاکھ جرمن اس تعداد کے علاوہ تھے) ۱۱ لاکھ جنگ کی نذر ہوئے۔

۱۲۔ تقریباً ایک لاکھ کروشیائی باشندوں کو جب وہ ہتھیار ڈال چکے تھے سربوں نے قتل کر دیا اور ایک لاکھ ۵۰ ہزار ترک باشندوں کو بلغاریہ سے نکال دیا گیا۔

دائرۃ المعارف Wikipedia: نسل کشی کے قدیم و جدید اعداد و شمار

Biblical Genocide:

بائبل کے اندر مختلف Genocide واقعات کا تذکرہ ہے جن کی صحت ذاتی مانے چکی ہے ان میں چند یہ ہیں:

☆ مصریوں کے ہاتھوں اسرائیل کی غلامی اور یہودیوں کا قتل۔

☆ کنعانی Canaanite افراد اور Moses اور Joshua کے درمیان جنگ۔

ایران میں سکندر اعظم کی نسل کشی:

مقدونیہ کا جنرل سکندر اعظم اور اس کی فوج نے ایران کے دارالحکومت میں ۱۰ ہزار افراد کو قتل کیا۔ اس نے تقریباً تمام باشندوں کو ذبح کیا اور مقامات کو نذرِ آتش کیا۔

روم الکبریٰ

رومن امپائر کے ہاتھوں نسل کشی کے چند حسب ذیل واقعات بیان کیے گئے ہیں:

☆ Helvetti کے خلاف Caesais جنگ میں ۶۰ فیصد قبیلے مار دیے گئے، ۲۰ فیصد غلامی میں لے لیے گئے۔

☆ Carthage: شہر مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔

☆ یروشلم: شہر جلا دیا گیا اور شہریوں کو غلام بنا لیا گیا۔

فرانس:

Albegensian Crusade (۱۲۰۹۔۱۲۲۹ء) کو Genocide تصور کیا جا سکتا ہے۔ یہ Cathar افراد کے خلاف تھا اس میں Inquisition اور فوج کا استعمال ہوا۔

Vendee کی جنگیں: اس میں عورتیں اور بچے ہلاک ہوئے۔

امریکہ:

بعض اوقات منظم اور بعض اوقات غیر منظم طویل قتل عام وجود میں آیا۔ یورپیوں کے ہاتھوں شمالی اور جنوبی امریکا کے باشندوں کا قتل عام تاریخ کا سب سے طویل قتل عام ہے۔ بعض اعداد و شمار کے مطابق امریکا اور کینیڈا سے پہلے کے مقامی باشندوں کی تعداد ۱۸ لاکھ سے زائد تھی۔ اگلی چار صدیوں میں ان کی تعداد دو لاکھ ۳۷ ہزار رہ گئی اور اکثر مقامی باشندے ختم ہو گئے۔ میکسیکو کی آبادی ۳ کروڑ سے ۳۰ لاکھ تک رہ گئی۔

کرسٹوفر کولمبس کی امریکا آمد کے بعد مقامی آبادی کم سے کم تر ہوتی گئی۔

کینیڈا:

Beothuk عوام جو نیو فاؤنڈ لینڈ کی سب سے قدیم آبادی ہے یورپی نو آبادیوں کے جھگڑوں کے نتیجے میں ختم ہو چکی ہے۔

گوئٹے مالا:

خانہ جنگی کے دوران سرخ ہندیوں کی ایک بڑی تعداد قتل ہو گئی تقریباً ۷۵ ہزار ۱۶ سو مایا (Maya) آبادی کو ختم کر دیا گیا۔

کانگو:

بادشاہ لیوپولڈ دوم کے زمانے میں کانگو کی آزاد ریاست کو بہت ساری جانوں کے ضیاع کا سامنا کرنا پڑا جو کہ مقامی آبادی کے ساتھ ربڑ کی پیداوار کے تنازعے کی وجہ سے ہوا۔

لیوپولڈ دوم (بلجیئم کے) کی شہرت ایک ظالم جابر کی خود قائم کردہ آزاد حکومت کے طور پر تھی اس کی

قائم کردہ Free State خود بلجیم سے جغرافیائی طور پر ۷۶ گنا بڑی تھی۔ ۱۸۸۰ اور ۱۹۲۰ء کے دوران کانگو کی آبادی نصف ہو گئی۔ ۱۰ ملین سے زائد مقامی آبادی کو وحشت و جبر کی وجہ سے بھوک، قتل اور بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

آسٹریلیا:

آسٹریلیا کی قدیم آبادی کو قفقازی (Caucasian) نسل کے لوگوں کے نفوذ کی وجہ سے کمی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی آبادی کو بہت سے نئے آبادکاروں کی وجہ سے بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا جس سے وہ موت کا شکار ہوئے۔

قدیم آبادی کے بچوں کو ان کے گھروں سے نکالنے کے آسٹریلوی حکومت کے عمل کو Genocide قرار دیا گیا۔ جب کہ تسمانیہ میں جو نسلی طور پر مختلف، قدیم آبادی موجود تھی انیسویں صدی میں ختم ہو گئی۔

جرمن شمال مغربی افریقہ:

جرمنی نے افریقہ کے Herero اور Nama قبائل کے افراد کا قتل عام کیا جس کو Genocide کی ابتدائی واقعات کے ضمن میں بیان کیا جائے گا۔ مجموعی طور پر ۶۵۰۰۰ ہریرو (کل ہریرو باشندوں کا ۸۰ فیصد) قتل کیے گئے اور ۱۰۰۰۰ ناما قتل کیے گئے۔ یہ Genocide قحط اور کنوؤں میں زہر ملانے کے ذریعے کیا گیا۔

ترکی:

عثمانیہ سلطنت نے ۶ لاکھ سے ۱۵ لاکھ آرمینیائی باشندے قتل کیے۔ ترکی حکومت سرکاری طور پر اس کی تردید کرتی ہے۔ ۳ سے ۶ لاکھ یونانی Pontian عثمانیہ سلطنت میں مارے گئے۔

جرمن نازی نسل کشی:

ہولوکاسٹ میں تقریباً ایک کروڑ ۱۰ لاکھ افراد قتل ہوئے جن میں ۶۰ لاکھ یورپی یہودی تھے۔ جن میں سے ۳۰ لاکھ پولش یہودی تھے۔

اس Genocide میں ۵۷ لاکھ روسی شہری اور ۳۲ لاکھ جنگی قیدی ہلاک ہوئے۔

دوسری جنگ عظیم میں جاپانی نسل کشی:

بعض لوگوں کے دعویٰ کے مطابق ۳ لاکھ افراد مارے گئے۔ اس قتل عام میں چینی آبادی کو نشانہ بنایا گیا۔

کیمیائی جنگ کے دوران ۳۰ ہزار افراد مارے گئے۔

۱۹۴۲ء میں نسلی چینی سنگاپور میں منظم طور پر قتل کیے گئے اس قتل عام کی تعداد ۲۵ ہزار اور ۵۰ ہزار تک تھی۔

مجموعی طور پر ۲ کروڑ چینی، ۹۰ لاکھ کوریائی، ۲۰ لاکھ تائیوانی اور بڑی تعداد میں جنوب مشرقی ایشیائی شہری دوسری جنگ عظیم میں قتل کیے گئے۔

کمبوڈیا:

۱۹۷۵ سے ۱۹۷۹ء کے دوران ۱۷ لاکھ کمبوڈیائی باشندے ہلاک ہو گئے۔

سوڈان:

۱۲/اکتوبر ۲۰۰۲ء کو امریکی حکومت نے سوڈان پر ۲۰ لاکھ شہریوں کو ۱۹۸۳ء سے جاری شہری جنگ کے دوران ہلاک کرنے کا الزام لگایا۔ ۲۰۰۴ء میں یہ بات بالعموم مشہور ہوئی Janjaweed Militia (خانہ بدوش عرب گھڑ سوار جن کو سوڈانی حکومت کی پشت پناہی حاصل تھی) نے مہم شروع کی اور ۸۰ سیاہ فام افریقی گروپوں کو دارفر کے علاقے سے نکال دیا۔

ویتنام:

ویتنام جنگ کے اختتام کے بعد یعنی امریکا کے انخلاء کے بعد ویتنامی حکومت نے ایسے لوگوں کے خلاف آپریشن شروع کیا جنھوں نے امریکیوں کی مدد کی تھی۔

برطانوی جنرل ڈائر:

جنرل ڈائر نے ۱۳/اپریل ۱۹۱۹ء میں دس ہزار مردوں، عورتوں اور بچوں کے جو جلیانوالہ باغ میں جمع تھے اور عوامی اجتماعات پر پابندی کے باوجود احتجاج کر رہے تھے، وارننگ کا ایک لفظ کہے بغیر ۵۰ فوجیوں کو حکم دیا کہ وہ اجتماع پر فائرنگ کر دے۔ ۱۰ سے ۱۵ منٹ کے دوران ۱۶۵۰ راؤنڈ مجمع پر پھینک دیے گئے تقریباً ۴۰۰ شہری ہلاک ہوئے اور ۱۲۰۰ زخمی چھوڑ دیے گئے جن کو طبی امداد نہیں دی گئی۔

انڈین نیشنل کانگریس کی سکھوں کے خلاف نسل کشی:

۱۹۸۴ء میں ۴ ہزار سکھ مردوں، عورتوں اور بچوں کو ہندوؤں نے ہلاک کر دیا صرف دہلی میں ۲۷۳۳ سکھوں کو زندہ جلا دیا گیا اور قتل اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

جموں اور کشمیر:

سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جموں و کشمیر میں دس ہزار ہندو شہری ہلاک ہوئے اور نصف ملین ہندو شہریوں کو ریاست سے باہر بھیج دیا گیا۔ [مسلمان مقتولین کی فہرست نہیں دی گئی ہے]

عراق:

ایرانی کرد شہریوں کو صدام حسین کی حکومت نے ہلاک کیا۔ کردوں کے علاقے حلبچہ پر کیمیائی ہتھیاروں سے ۸۶۔۱۹۸۸ء میں حملہ کیا گیا۔

انسائیکلوپیڈیا Wikipedia میں نسل کشی کے ضمن میں مندرجہ ذیل اعداد و شمار درج ہیں یہ معلومات انسائیکلوپیڈیا کی ویب سائٹ http://en.wikipedia.org/wiki/ genocide-in-history سے لیے گئے ہیں۔

دائرۃ المعارف انکارٹا: مہذب دنیا میں نسل کشی کے اعداد وشمار

انسائیکلوپیڈیا انکارٹا Encyclopedia Encarta میں نسل کشی سے متعلق اعداد وشمار درج ذیل ہیں، ان اعداد وشمار میں اور رومیل کی کتاب کے بیان کردہ اعداد وشمار میں فرق دیکھا جا سکتا ہے خصوصاً رُوس کے ہاتھوں مقتولین کی تعداد رومیل کے مطابق ۶۰۰ لاکھ سے زائد ہے جب کہ انکارٹا کے اعداد وشمار میں یہ تعداد ۸۵ سے ۱۸۰ لاکھ ہے۔

- ☆ ۵۱ سے ۵۹ لاکھ یہودی اور لاکھوں دوسری جنگ عظیم دوم کی نسل کشی (Genocide) میں قتل کیے گئے۔
- ☆ اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں اقوام عالم نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ جنگوں میں عام شہریوں کو قتل نہ کیا جائے۔
- ☆ بیسویں صدی میں بڑے پیمانے پر قتل عام Mass Killing قومی حکمت عملیوں کا حصہ بن گیا۔
- ☆ ۱۹۱۴۔۱۹۱۸ء میں سلطنت عثمانیہ نے جنگ عظیم اول کے دوران دس سے اٹھارہ لاکھ آرمینیائی باشندوں کو بے دخل کیا۔
- ☆ جنگ عظیم دوم میں ۵۰ سے ۶۰ لاکھ یہودی اور کئی لاکھ دوسرے افراد کو جرمنی کے لیے ناقابل برداشت قرار دیا گیا۔
- ☆ ہر تین یہودیوں میں سے دو یہودی جرمنی کے زیر تسلط علاقے میں قتل کیے گئے۔ روسی جنگی قیدیوں کی نصف اور مشرقی یورپ کے ۱۰ سے ۲۰ فیصد افراد قتل کیے گئے۔
- ☆ سابق یوگوسلاویہ کی کروٹ حکومت دو لاکھ سے تین لاکھ چالیس ہزار سرب شہریوں کی قاتل ہے۔
- ☆ دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک ۱۱۶ اقوام نے نسل کشی کی کوشش یا نسل کشی کا ارتکاب کیا ان اقوام کا تعلق ایشیا، افریقہ، یورپ اور امریکا سے ہے۔
- ☆ ۱۹۷۵ء میں انڈونیشیا نے مشرقی تیمور پر قبضہ کیا جس کے نتیجے میں ۲ لاکھ اموات ہوئیں جو کل آبادی کا ایک تہائی تھا۔
- ☆ گوئٹے مالا کی خانہ جنگی کے دور میں (۶۰۔۱۹۹۶ء) دو لاکھ افراد گوئٹے مالا حکومت کے عسکری بازو کے ہاتھوں قتل ہوئے۔
- ☆ روانڈا میں ۱۹۹۴ء میں ۵ سے ۱۰ لاکھ افراد قتل ہوئے ان میں سے بیشتر Tutsi گروپ سے تعلق رکھنے والے تھے۔
- ☆ ۱۹۹۱ء تک سابق یوگوسلاویہ میں ہزاروں بوسنیائی مسلمانوں کا قتل عام ہوا۔
- ☆ ۱۹۷۵ء تک Khmer Rouge کی کمیونسٹ تحریک جس کی سربراہی پول پوٹ Pol Pot کے ہاتھوں تھی نے ۱۷ لاکھ کمبوڈیائی باشندوں کا قتل عام کیا۔

☆ ۱۹۶۹ء میں امریکا نے خفیہ B52 بمباری کی تاکہ نیشنل لبریشن فرنٹ اور شمالی ویتنامیوں کا قبضہ کمزور کیا جاسکے۔ امریکا نے چار لاکھ نوے ہزار میٹرک ٹن (پانچ لاکھ چالیس ہزار ٹن) وزنی بم اگست ۱۹۷۳ء میں برسائے۔ ۱۷ اپریل ۱۹۷۵ء میں جب بمباری ختم ہوئی تو Khmer Rouge کی فوج کو شکست ہوئی۔ تقریباً سترہ لاکھ کمبوڈیائی باشندے قتل ہوئے۔ Khmer Rouge کی حکومت کے بعد تقریباً ۴ لاکھ ۲۵ ہزار چینی کمبوڈیائی میں سے نصف آبادی باقی بچی۔ جب کہ چار لاکھ پچیس ہزار چینی کمبوڈیائی باشندوں میں سے اکثر کو ملک سے بے دخل کر دیا گیا۔ ان میں سے اکثر کو Khmer Rouge نے نکال دیا یا قتل کر دیے گئے۔ دو لاکھ پچیس ہزار مسلمان میں سے نوے ہزار قتل کر دیے گئے باقی کو نکال باہر کیا گیا۔

آرمینیائی قتل:

سلطنت عثمانیہ میں رہنے والے آرمینیائی باشندوں کا اکثر قتل ۱۹۱۳ء میں جنگ عظیم اول کے موقع پر ہوئے۔ ۱۰ لاکھ سے زائد آرمینیائی ختم کر دیے گئے۔ آرمینیائی Genocide جنگ عظیم اول کے پردے میں کیا گیا۔ جنگ عظیم سے قبل آرمینیائی باشندوں کی آبادی ۱۸ لاکھ تھی۔ جنگ کے بعد ۱۹۱۹ء میں انکشاف ہوا کہ آٹھ لاکھ باشندے قتل کیے جاچکے ہیں۔ بچ جانے والوں نے فرار کی راہ اختیار کی۔ جن میں دو لاکھ پچیس ہزار قفقاز کی طرف بھاگے جو اب آرمینیا کہلاتا ہے اور کچھ جارجیا کی طرف۔

روانڈا:

اپریل ۱۹۹۴ء میں صدر Habyaremana اور برونڈائی کے صدر Cyprien قتل کر دیے گئے۔

Habyaremana کی موت نے لسانی فسادات کو فروغ دیا۔

اگلے چند ماہ میں یہ اندازہ لگایا گیا کہ پانچ سے دس لاکھ روانڈا کے باشندوں میں جن میں اکثر Tutsi قبیلے کی تھی، قتل کر دی گئی۔ وسط جولائی میں بارہ لاکھ روانڈا کی آبادی زائر کی طرف ہجرت کر گئی۔

ابتدائی اگست میں جنگ سے قبل روانڈا کی چوتھائی آبادی یا تو قتل ہو گئی یا ملک سے فرار ہو گئی۔

:Holocaust

یورپ میں یہودیوں کا قتل صفایا۔ جیسا کہ جنگ عظیم دوم کے بعد نازی فوجیوں نے یورپ کے اکثر ممالک کو فتح کر لیا تھا۔ لاکھوں یہودی قتل کیے گئے، قید کیے گئے، نازی کیمپوں میں رکھے گئے جہاں وہ مار دیے گئے یا بھوک اور بیماری سے ہلاک ہوئے۔ جنگ کے بعد ۵۱ لاکھ سے ۵۹ لاکھ یہودی مرد عورتیں قتل ہوئے۔

شمال مغربی افریقہ Herero قتل عام (نمیبیا):

۱۹۸۴ء میں اقوام متحدہ کی رپورٹ کے مطابق جرمنوں نے شمالی مغربی افریقہ کی Herero اور

Nama آبادی کو بے دخل کرنے کی کوشش کی جو کہ بیسویں صدی کے (Genocide) نسل کشی کی ابتدائی کوشش تھی۔ مجموعی طور پر ۶۵ ہزار ہریرو (کل آبادی کا ۸۰ فی صد) اور دس ہزار ناما (کل ناما آبادی کا ۵۰ فیصد) قتل یا ہلاک ہو گئے۔

۱۹۰۴ء میں جنرل لوتھر وان ٹروتھا Lother Von Trotha کو دس ہزار رضاکاروں کے ساتھ بغاوت کو کسی بھی طریقے سے کچلنے کے لیے بھیجا گیا۔ اس نے ایک حکم نامہ جاری کیا۔

"میں جرمنوں کا عظیم جنرل اس خط کے ذریعے ہریرو کے عوام سے مخاطب ہوں۔ جرمنی کی سرحدوں میں کوئی ہریرو باشندہ اگر پایا گیا خواہ مسلح ہو یا غیر مسلح، اسے گولی ماردی جائے گی، میں کسی بھی بچے یا عورت کو برداشت نہیں کروں گا"۔

جرمنی نے اسی ہزار ہریرو باشندوں کو قتل کر دیا اکثر کنوؤں میں لٹکا کر مار ڈالے گئے۔

[یہ اعداد و شمار انسائیکلوپیڈیا کی سی ڈی ۲۰۰۲ سے لیے گئے ہیں۔]

BIBLIOGRAPHY

ACKERKNECHT, ERWIN H. 1982. A Short History of Medicine. Baltimore: Johns Hopkins University Press.

ACKERMAN, Peter and DUVALL, Jack. 2000. A Force More Powerful: A Century of Nonviolent Conflict. New York: St. Martin's Press. - and KRUEGLER, C. 1994. Strategic Nonviolent Conflict. Westport, Conn.: Praeger.

ALMOND, GABRIEL A. 1996. Political science: the history of the discipline. In Good in and Klingemann 1996: 50-96.

ALPEROVITZ, GAR 1995. The Decision to Use the Atomic Bomb. New York: Alfred A. Knopf

AMATO, JOSEPH A. 1979. Danilo Dolci: a nonviolent reformer in Sicily. In Bruyn and Rayman 1979: 135-60.

ANDERSON, RICHARD C. 1994. Peace Was In Their Hearts: Conscientious Objectors in World War II. Watsonville, Calif: Correlan Publications.

AQUINO, CORAZON C. 1997. Seeds of nonviolence, harvest of peace: The Philippine revolution of 1986. In Grisolia et al. 1997: 227-34.

ARENDT, HANNAH.1970. On Violence. New York: Harcourt, Brace & World. - 1982. Lectures on Kant's Political Philosophy. Chicago; University of Chicago Press.

ARISTOTLE. 1962. The Politics. trans. T.A. Sinclair. Harmondsworth:

Penguin.

AUNG SAN SUU KYI. 1998. The Voice of Hope. New York: Seven Stories Press.

ADALIAN, ROUBEN. (February 1991) "The Armenian Genocide: Context and Legacy." SOCIAL EDUCATION 55.

AHMAD, RAFIQ 1984. (Ed.). THE ASSAM MASSACRE 1983 (A DOCUMENTARY RECORD). Lahore, Pakistan: Center for South Asian Studies, University of the Punjab.

ARENS, RICHARD.1976. (Ed.) GENOCIDE IN PARAGUAY. Philadelphia: Temple University Press.

ANDREOPOULOS, G. 1994. Genocide: Conceptual and Historical Dimensions. Philadelphia: University of Pennsylvania Press.

ARMENISCHE FRAGE. 1988. The Armenian Genocide, Vol. 2: Documentation. Munich: author (in German).

BANERJEE. MUKULIKA. 2000. The Pathan Unarmed. Karachi & New Delhi: Oxford University Press.

BAXTER. ARCIDBALD. 2000. We Will Not Cease. Baker, Ore.: The Eddie Tern Press.

BEISNER. ROBERT L. 1968. Twelve Against Empire: The Anti- Imperialists, 1898 - 1900. New York: McGraw-Hill.

BENNETT, LERONE JR. 1993. Before the Mayflower: A History of Black America. New York: Penguin Books.

BING, ANTHONY G. 1990. Israeli Pacifist: The Life of Joseph Abileah. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.

BOORSTIN, DANIEL J. 1983. The Discoverers. New York: Random House.

____ 1992. The Creators. New York: Random House.

____ 1998.; The Seekers. New York:

BOSERUP, ANDERS and MACK, ANDREW. 1974. War without Weapons: Non-Violence in National Defence. New York: Schocken Books.

BOUBALT, GUY; GAUCHARD, BENOIT, and MULLER, JEAN-MARIE. 1986. Jacques de Bollardie re: Compagnon de toutes les libe rations. Paris: Non-Violence Actualite.

BOULDING, ELISE. 1980. Women, the Fifth World. New York: Foreign Policy Association. ____ 1992. New Agendas for Peace Research: Conflict and Security Reexamined. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.

BOURNE, RANDOLPH S. 1964 (1914-1918). War and the Intellectuals. New

York: Harper & Row.

BROCK, PETER 1968. Pacifism in the United States: From the Colonial Era to the First World War. Princeton: Princeton University Press.

____ 1970. Twentieth Century Pacifism. New York: D. Van Nostrand.

____1972. Pacifism in Europe to 1914. Princeton: Princeton University Press.

____1990. The Quaker Peace Testimony 1660 to 1914. York, England: Sessions Book Trust.

____ 1991a. Studies in Peace History. York, England: William Sessions Limited. 1991 b.

BACQUE, JAMES 1989. OTHER LOSSES: AN INVESTIGATION INTO THE MASS DEATHS OF GERMAN PRISONERS. Toronto, Canada: Stoddard Publishing Company.

Barron, John and Anthony Paul. 1977 PEACE WITH HORROR: THE UNTOLD STORY OF COMMUNIST GENOCIDE IN CAMBODIA. London: Hodder and Stoughton, [American edition titled MURDER OF A GENTLE LAND. New York: Reader's Digest Press-Thomas Y. Crowell].

BAUER, YEHUDA 1982. A History of The Holocaust. New York: Franklin Watts

Baxter, David M. 1970 "The Serbo-Croatian Antagonism." In OPERATION SLAUGHTERHOUSE: EYEWITNESS ACCOUNTS OF POSTWAR MASSACRES IN YUGOSLAVIA, [edited] by John Prcela and Stanko Guldescu. Philadelphia: Dorrance & Co.,

BIGELOW, KATHERINE 1992. "A campaign to deter genocide: the Bahá'í experience." In GENOCIDE WATCH, [edited] by Helen Fein. New Haven: Yale University Press.

BOYAJIAN, DICKRAN H 1972. ARMENIA: The Case for a Forgotten Genocide. Westwood, New Jersey: Educational Book Crafters.

BROWNING, CHRISTOPHER R 1992, 1995. The Path to Genocide: Essays on Launching the Final Solution. Cambridge University Press.

BEDROSSYAN, M. (ed.) 1983. The First Genocide of the 20th Century: The Perpetrators and their Victims. N.p.: Voskedar Publishing.

BRUYN, SEVERYN T. and RAYMAN,. PAULA M., eds. 1979. Nonviolent Action and Social Change. New York: Irvington Publishers.

BURTON, JOHN. 1979. Deviance, Terrorism & War. The Process of Solving Unsolved Social and Political Problems. New York: St. Martin's Press.

CANADA, GEOFFREY. 1995. Fist Stick Knife Gun: A Personal History of

Violence in America. Boston: Beacon Press.

CHARNY, ISRAEL W. 1982. How Can We Commit the Unthinkable? Genocide the Human Cancer. Boulder, Colo.: Westview Press.

COMMAGER, HENRY S. 1991. The history of American violence: an interpretation. Pp. 3-28 in Violence: The Crisis of American Confidence, ed. Hugh D. Graham. Baltimore: Johns Hopkins Press.

CONSER, WALTER H., Jr.; McCARTHY, RONALD M.; TOSCANO, DAVID J.; and SHARP, GENE., eds. 1986. Resistance, Politics and the Struggle for Independence.. Boulder, Colo.: Lynne Rienner Publishers.

COOK, PHILIP J. and LUDWIG, JENS. 1997. Guns in America: national survey on private ownership and use of firearms. Research in Brief, no. 1026. Washington: National Institute of Justice.

COONEY, ROBERT and MICHALOWSIQ, HELEN, eds. 1987. Power of the People: Active Nonviolence in the United States. Philadelphia, Penn.: New Society Publishers.

COUSINS, NORMAN. 1987. The Pathology of Power. New York: W.W. Norton. CRAIG, LEON H. 1994. The War Lover: A Study of Plato' Republic. Toronto: University of Toronto Press.

CROZIER, FRANK P. (Brig. Gen.). 1938. The Men I Killed. New York: Doubleday.

CHAMBERLAIN, MIKE 1982. "The people of East Timor," In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University Press of America.

CHARNY, ISRAEL 1982 W. HOW CAN WE COMMIT THE UNTHINKABLE? GENOCIDE: THE HUMAN CANCER. Boulder Westview: Colorado Press.

CHAUDHURI, KALYAN 1972. GENOCIDE IN BANGLADESH. Orient: New Delhi Longman.

CHINA'S BLOODY CENTURY: GENOCIDE AND MASS MURDER SINCE 1900. New Brunswick, New Jersey: Transaction Publishers

CAMPBELL, KENNETH J 2001. Genocide and the Global Village. Palgrave Macmillan.

CHANDLER, DAVID 1996. The Killing Fields. Twin Palms.

CORZINE, JAY; and WHITT, HUGH P. 1994. The Currents of Lethal Violence: An Integrated Model of Suicide and Homicide. Albany: State University of New York Press.

DENSON, JOHN V., ed. 1997. The Costs of War: America's Pyrrhic Victories. New Brunswick, N.J.: Transaction Books.

CAPTAIN P.A.REYNOLDS "Notes on the Thags" Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, 4, (1837).

DESTEXHE, ALAIN 1995. Rwanda and Genocide in the Twentieth Century. Trans. Alison Marschner. New York University Press.

DU PREEZ, P. 1994. Genocide: The Psychology of Mass Murder London: Boyars/Bowerdean.

EASWARAN, EKNATH, 1999. Nonviolent Soldier of Islam. Tomales, Calif.: Nilgiri Press.

EIBL-EIBESFELDT, IRENAUS. 1979. The Biology of Peace and War: Men, Animals, and Aggression. New York: Viking Press.

E.LAKE 1873. Sir Donald McLeod: A Record of Forty-Two Years' Service in India. London. (Donald McLeod was once assistant to Sleeman in the Thuggee Department and later Lieutenant - Governor of the Punjab.)

FINER, SAMUEL E. 1997. The History of Government From the Earliest Times. New York: Oxford University Press. Vol. i, Ancient Monarchies and Empires. Vol. ii, The Intermediate Ages. Vol. iii, Empires, Monarchies, and the Modem State.

FISHER, ROGER and URY, WILLIAM. 1981. Getting to Yes. Boston, Mass.: Houghton Mifflin Company.

FOSTER, CATHERINE. 1989. Women for All Seasons: The Story of the Women's International League for Peace and Freedom. Athens: University of Georgia Press.

FROMM, ERICH. 1973. The Anatomy of Human Destructiveness. New York: Holt. Rinehart and Winston.

FUNG, YU-LAN. 1952. History of Chinese Philosophy, trans. Derke. Bodde. Vol. i. Princeton: Princeton University Press.

FRELICK, BILL 1992. "Refugees: contemporary witnesses to genocide." In GENOCIDE WATCH, [edited] by Helen Fein. New Haven: Yale University Press.

FEIN, H. 1979. Accounting for Genocide. New York: Free Press.

FEINGOLD, H. 1983. "How Unique is the Holocaust?" in A. Grobman & D. Landes (eds.), Genocide: Critical Issues of the Holocaust. Los Angeles: Simon Wiesenthal Center.

FRIEDLANDER, H. 1995. The Origins of Nazi Genocide: From Euthanasia to

the Final Solution. Chapel Hill: University of North Caroline Press.
____ 1958-1994. The Collected Works of Mahatma Gandhi. Vols. 1-100. New Delhi: Publications Division, Ministry of Information and Broadcasting, Government of India.
GARRISON, FIELDING H. 1929. An Introduction to the History of Medicine. Philadelphia, Penn: W.B. Saunders.
GIOGLIO, GERALD R. 1989. Days of Decision: An Oral History of Conscientious Objectors in the Military in the Vietnam War. Trenton, N.J.: Broken Rifle Press.
GIORGI, PIERO. 1999. The Origins of Violence By-Cultural Evolution. Brisbane, Australia: Minerva E&S.
GIOVANNITTI, LEN and FREED, FRED. 1965. The Decision to Drop the Bomb. New York: Coward-McCann.
GOLDMAN, RALPH M. 1990. From Warfare to Party Politics: The Critical Transition to Civilian Control. Syracuse: Syracuse University Press.
GOODIN, ROBERT E. and KLINGEMANN, HANS-DIETER, eds. 1996. A New Handbook of Political Science. Oxford: Oxford University Press.
GREENLEAF, ROBERT K. 1977. Servant Leadership: An Inquiry into the Nature of Legitimate Power and Greatness New York: Paulist Press.
GRISOLIA, JAMES S. et al., eds. 1997. Violence: From Biology to Society. Amsterdam: Elsevier.
GROSSMAN, DAVE (Lt. Col.). 1995. On Killing: The Psychological Cost of Learning to Kill in War and Society. Boston, Mass.: Little Brown.
DeGAETANO, GLORIA 1999. Stop Teaching Ou Kids to Kill. New York: Crown Publishers.
GUETZKOW, HAROLD. 1955. Multiple Loyalties: Theoretical Approach to a Problem in International Organization. Princeton, N.J.: Center for Research on World Political Institutions, Princeton University.
GRABER, G. 1996. Caravans to Oblivion: The Armenian Genocide, 1915. New York: John Wiley.
GUTMAN, R. 1993. A Witness to Genocide. New York: Macmillan.
HALBERSTAM, DAVID. 1998. The Children. New York: Random House.
HOFSTADTER, RICHARD. 1971. Reflections on violence in the United States. Pp. 3-43 in American Violence: A Documentary History, ed. Richard Hofstadter and Michael Wallace. New York: Vintage
HOROWITZ, Irving Louis 1976. GENOCIDE: STATE POWER AND MASS

MURDER. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books.

HEUVELINE, P. 2001. "Approaches to Measuring Genocide: Excess Mortality during The Khmer Rouge Period," in Chirot and Seligman (eds.), Ethnopolitical Warfare.

HOROWITZ, I. 1989. Taking Lives: Genocide and State Power. New Brunswick, N.J.: Transaction.

JONASSOHN, K. 1990. The History and Sociology of Genocide. New Haven, Conn.: Yale University Press.

JONASSOHN, K., with Bjornson, K. 1998. Genocide and Gross Human Rights Violations in Comparative Perspective. New Brunswick, N.J.: Transaction.

J.L.SLEEMAN. 1993. Thug: or, A Million Murders. Sampson Low, Marston & Co, London.

JAVEED MAJEED. 1996. "Meadows Taylor's' Confessions of a Thug The Anglo-Indian Novel as a Genre in the Making", in Bart Moore - Gilbert (ed.), Writing India. 1757-1990. Manchester University Press. Manchester.

JOHN MASTERS (1914-1983) 1952. (First edition). The Deceivers (A novel on the Thugs). Michael Joseph, London. 6th impression. 1956.

JOHN SHAKESPEAR. 1820. "Observations Regarding Badheks and Th'egs" Asiatic Researches. XIII.

KELLY, ALWRANCE, 1996, war before civilization: The myth of the peaceful savage Oxford: Oxford University Press.

KING, MARTIN LUTHER, JR 1998. The Autobiography of Martin Luther King, Jr., ed. Clayborne Carson. New York: Warner Books.

KOHN. STEPHEN M. 1987. Jailed for Peace: The History of American Draft Law Violators. 1658-1985. New York: Praeger.

KONRAD, A. RICHARD. 1974. Violence and the philosopher. Journal of Value Inquiry, 8: 37-45.

KOHEN, ARNOLD AND JOHN TAYLOR 1979. AN ACT OF GENOCIDE: INDONESIA'S INVASION OF EAST TIMOR. London: TAPOL.

KRESSEL, NEIL JEFFREY 2001. Mass Hate: The Global Rise of Genocide and Terror. Westview.

KIERNAN, BEN 1998. The Pol Pot Regime: Race, Power, and Genocide in Cambodia Under the Khmer Rouge, 1975-79. Yale University Press.

KEANE, FERGAL 1997. Season of Blood: A Rwandan Journey. Viking, 1996. Penguin.

KABIRIGI, L. 1994. Genocide an Rwanda: Honte pour thumanite. Kigali,

Rwanda: PREFED.
KAISER, H. 1996. "Denying the Armenian Genocide: The German Connection."
KIRK, T. 1996. Nazism and the Working Class in Austria. Cambridge: Cambridge University Press.
LEWER, NICK and SCHOFIELD, STEVEN, eds. 1997. Non-Lethal Weapons: A Fatal Attraction! London: Zed Books.
LEWIS, JOHN. 1973(1940). The Case Against Pacifism. Introd. Carl Marzani. New York: Garland.
LIGT, BARTHELEMY de. 1972(1938). The Conquest of Violence: an Essay on War and Revolution, introds. George Lakey and Aldous Huxley. New York: Garland.
LEMARCHAND, R. 19955. Burundi: Ethnic Conflict and Genocide. New York: Cambridge University Press
MAHONY, LIAM and EGUREN, LUIS E. 1997. Unarmed Bodyguards. West Hartford, Conn.: Kumarian Press.
MANN, CORAMAERICHEY. 1996. When Women Kill. Albany: State University of New York Press.
MARX. KARL and ENGELS, FRIEDRICH. 1976(1848). The Communist Manifesto, introd. A.J.P. Taylor. Harmondsworth: Penguin.
MORRISEY, WILL. 1996. A Political Approach to Pacifism. 2 vols. Lewiston, N.Y.: Edwin Mellen Press.
MORTON, BRUCE E. 2000. "The Dual Quadbrain Model of Behavioral Laterality." Department of Biochemistry and Biophysics, School of Medicine, University of Hawai'i.
MOSKOS, CHARLES and CHAMBERS, JOHN W. II, eds. 1993. The New Conscientious Objectors: From Sacred to Secular Resistance. Oxford: Oxford University Press.
MAZIAN, FLORENCE 1990. WHY GENOCIDE? THE ARMENIAN AND JEWISH EXPERIENCES IN PERSPECTIVE. Ames: Iowa State University Press.
MOHAN, Jag (Ed.) 1971. THE BLACK BOOK OF GENOCIDE IN BANGLA DESH. New Delhi, India: Geeta Book Center.
MYNZEL, MARK 1976. "Manhunt." In GENOCIDE IN PARAGUAY, [edited] by Richard Arens. Philadelphia: Temple University Press.
MELSON, ROBERT. 1992 Revolution and Genocide: On the Origins of the

Armenian Genocide and the Holocaust. University of Chicago Press.
MINOW, MARTHA 1998. Between Vengeance and Forgiveness: Facing History after Genocide and Mass Violence. Beacon.
MESTROVIC, S. (ed.). (1996). Genocide After Emotion: The Postemotional Balkan War. London: Routledge.
MILDT, D. 1996. In the Name of the People: Perpetrators of Genocide in the Reflection of their Post-War Prosecution in West Germany: The 'Euthanasia' and 'Aktion Reinhard' Trial Cases. The Hague: Nijhoff.
MIRKOVIC, D. 1993. "Victims and Perpetrators in the Yugoslav Genocide 1941-1945." Holocaust and Genocide Studies, vol. 7.
NAGLER, MICHAEL N. 1982. America Without Violence. Covelo, Calif: Island Press.
NOBEL PRIZE RECIPIENTS. 1981. Manifesto of Nobel prize winners. IFDA Dossier, 25.
NATH, VANN 1998. A Cambodian Prison Portrait. One Year in the Khmer Rouge's S-21. White Lotus.
PAIGE, GLENN D. 1968. The Korean Decision: June 24-30, 1950. New York: Free Press.
____ SATHA-ANAND, CHAIWAT; AND GILLIATT, SARAH, eds. 1993a. Islam and Nonviolence. Honolulu: Center for Global Nonviolence Planning Project, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai'i. Available at www.globalnonviolence.org.
PALMER, STUART H. 1960. A Study of Murder. New York: Thomas Y. Crowell.
PAREKH, BHIKHU. 1989a. Colonialism, Tradition and Reform: An Analysis of Gandhi's Political Discourse.. Newbury Park: Sage.
POWERS, ROGUERS AND VOGELE, WILLIAM; Beds 1997. Protest, power and change: An Encyclopedia of National action from Act up to women suffrage. New York and London; Garland publishing.
PARIS, EDMOND 1961.. GENOCIDE IN SATELLITE CROATIA, 1941-1945: A RECORD OF RACIAL AND RELIGIOUS PERSECUTIONS AND MASSACRES. Translated by Lois Perkins. Chicago, Illinois: The American Institute for Balkan Affairs.
PORTER, JACK NUSAN 1982. "Introduction: what is genocide? Notes toward a definition." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University

Press of America.
PRUNIER, GERARD 1995. The Rwanda Crisis: History of a Genocide. Columbia University Press.
PRAN, DITH, AND KIM DEPAUL 1999. Children of Cambodia's Killing Fields: Memoirs of Survivors. Yale University Press.
PRUNIER, GERARD 1995. The Rwanda Crisis: History of a Genocide. Columbia University Press.
PARIS, E. 1961. Genocide in Satellite Croatia, 1941-1945. Chicago: American Institute for Balkan Affairs.
POWERS, ROGER S. and VOGELE, WILLIAM B., eds.1997. Protest, Power and Change: An Encyclopedia of Nonviolen Action from ACT-UP to Women's Suffrage. New York & London: Garland Publishing.
PHILIP MEADOWS TAYLOR (1808-1876) "On the Thugs" New Monthly Magazine. 38 (July 1833).
PHILIP MEADOWS 'TAYLOR (1808-1876) 1986. Confessions of a Thug (A novel) Richard Bentley, London..1839, Kegan Paul, Trench & Co, London. 1883. Ed. By Patrick Brantlinger. Oxford University Press. Oxford Reprinted by Asian Educational Services, New Delhi 1998 Reprinted by Rupa & Co, New Delhi. 2001.
RESTAI, RICHARD M. 1979. The Brain: The last Frontier. Gardens City, New York Dubleday.
RUMMEL, R. 1992. Democide: Nazi Genocide and Mass Murder. New Brunswick, N.J.: Transaction.
1994. Death by Government. New Brunswick, N.J.: Transaction.
1998. Statistics of Democide: Genocide and Mass Murder Since 1900. Muenster:LIT.
RESTAI, RICHARD M. 1979. The Brain: The Last Frontier. Garden City, N.Y.: Doubleday.
R.C.SHERWOOD "Of the Murderers Called Phansigars". Asiatic Researches. XIII, (1820).
RADHIKA SINGHA. 1993 "Providential' Circumstances: The Thuggee Campaign of the 1830s and Legal Innovation." Modern Asian Studies, 27. 1
RADHIKA SINGHA. 1998."Criminal Communities: The Thuggee Act XXX of 1836", in Radhika Singha, A Despotism of Law: Crime and Justice in Early Colonial India. Oxford University Press. New Delhi
SAGAN, ELI. 1979. The Lust to Annihilate: A Psychoanalytic Study of

Violence in Greek Culture. New York: Psychohistory Press.

SCHWARTZ, STEPHEN I., ed. 1998. Atomic Audit: The Costs and Consequences of U.S. Nuclear Weapons Since 1940.Washington, D.C.: Brookings Institution Press.

SCHWARZSCHILD, STEVEN et al., n.d. Roots of Jewish Nonviolence. Nyack, N.Y.: Jewish Peace Fellowship.

SEMELIN, JACQUES. 1994. Unarmed Against Hitler: Civilian Resistance in Europe, 1939- 1943. Westport, Conn.: Praeger.

SHARP GENE. 1993. From Dictatorship to Democracy. Cambridge, Mass.: The Albert Einstein Institution.

SIMON, DAVID. 1991. Homicide: A Year on the Killing Streets. Boston, Mass.: Houghton Mifflin.

SIVARD, RUTH LEGER 1996. World Military and Social Expenditures 1996. Washington, D.C.: World Priorities. 16th edition.

STANNARD, DAVID E. 1992. American Holocaust: Columbus and the Conquest of the New World. Oxford: Oxford University Press.

SOLZHENITSYN, ALEKSANDR L. The Gulag Archipelago, 1918-1956: An Experiment in Literary Investigation. Trans. Thomas P. Whitney. 3 vols. Harper, 1974-1978, 1997. Classic account of Soviet labor and concentration camps.

SABRIN, B. (ed.) 1991. Alliance for Murder: The Nazi-Ukrainian Nationalist Partnership in Genocide. New York: Sarpedon.

SELLS, M. 1996. The Bridge Betrayed: Religion and Genocide in Bosnia. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.

SHENFIELD, S. 1999. "The Circassians: A Forgotten Genocide?" in M. Levene & P. Roberts (eds.), The Massacre in History. Oxford: Berghahn.

SLIWINSKI, M. 1995. Le Genocide Khmer Rouge: Une analyse demographique. Paris L'Harmattan.

SMITH, R. 1987. "Human Destructiveness and Politics: The Twentieth Century as an Age of Genocide," in I. Walliman & Dobkowski (eds.), Genocide in the Modern Age. New York: Greenwood.

STAUB, E. 1992. The Roots of Evil: The Origins of Genocide and Other Group Violence. Cambridge: Cambridge University Press.

STRAUS, S. 2004. "The Order of Genocide: Race, Power and War in Rwanda." Ph.D. dissertation, University of California at Berkeley.

TAYYEBULLA, M. 1959. Islam and "Non-Violence. Allahabad: Kitgbistan.

THOMPSON, HENRY O. 1988. World Religions in War and Peace. Jefferson, N.C. and London: McFarland & Company.
TOBIAS, MICHAEL. 1991. Life Force: The World of Jainism. Berkeley, Calif: Asian Humanities Press.
TOLSTOY, LEO. 1974 (1893 and 1894-1909). The Kingdom of God and Peace Essays, trans. Aylmer Maude. London: Oxford University Press.
TWAIN, MARK. 1970(1923). The War Prayer. New York: Harper & Row.
TASHJIAN, JAMES H 1982. "Genocide, the United Nations and the Armenians." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University Press of America.
"THE BURUNDI GENOCIDE," in S. Totten et al 1997a. (eds.), Century of Genocide: Eyewitness Accounts and Critical View. New York: Garland.
"THE PSYCHO HISTORICAL ORIGINS OF THE NAZI YOUTH COHORT 1983," in his Decoding the Past. New York: Knopf.
TOLSTOY, LEO. 1974 (1893 and 1894-1909). The Kingdom of God and Peace Essays, trans. Aylmer Maude. London: Oxford University Press.
WAAL, FRANS de. 1989. Peacemaking Among Primates. Cambridge, Mass.: Harvard University Press.
WASSERMAN, HARVEY. 1982. Killing Our Own: The Disaster of America's Experience With Atomic Radiation. New York: Delacorte Press.
WATSON, PETER. 1978. War on the Mind: The Military Uses and Abuses of Psychology. New York: Basic Books.,
WEBER, MAX. 1958(1919). Politics as a vocation. Pp. 77i 128 in From Max Weber: Essays in Sociology, ed. RR Gerth and C. Wright Mills. New York: OXford University Press.
WHIPPLE, CHARLES K. 1839. Evils of the Revolutionary War. Boston, Mass.: New England Non-Resistance Society.
WILSON. H. HUBERT. 1951. Congress: Corruption and Compromise.New York: Rinehart.
WITTNER. LAWRENCE S. 1993. One World or None: A History of the World Nuclear Disarmament Movement Through 1953. Stanford. Calif.: Stanford University Press.
WRANGHAM, RICHARD and PETERSON, DALE. 1996. Demonic Males: Apes and Origins of Human Violence. New York: Houghton Mifflin.
WEGLYN, MICHI 1978. Years of Infamy: The Untold Story of America's

Concentration Camps. Morrow.

WAGNER, M. 1998. "All the Bourgmestre's Men: Making Sense of Genocide in Rwanda.' Africa Today, vol. 45.

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) 1836.Ramaseeana, or A Vocabulary of the Peculiar Language Used by the Thugs, with an Introduction and Appendix, Descriptive of the System Pursued by that Fraternity and of the Measures which Have Been Adopted by the Supreme GQvemment of India for its Suppression. Military Orphan Press, Calcutta.

WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) 1839. The Thugs, or Phansigars of India. Philadelphia, USA (A pirated version of W H Sleeman's" Ramaseeana")

YOUNG, ANDREW. 1996. An Easy Burden: The Civil Rights Movement and the Transformation of America. New York: HarperCollins Publishers.

YOUTH DIVISION OF SOKA GAKKAI. 1978. Cries for Peace: Experiences of Japanese Victims of World War II Tokyo: The Japan Times.

YEGHIAYAN, V. 1990. The Armenian Genocide and the Trials of the Young Turks. La Verne, Calif.: American Armenian International College.

ZINN, HOW AR~. 1980. A People's History of the United States. New Y ork:Harper & Row.

____________________1980. TAKING LIVES: GENOCIDE AND STATE POWER, New Brunswick, New Jersey: Transaction Books.

__________1981. GENOCIDE: ITS POLITICAL USE IN THE TWENTIETH CENTURY. New Haven: Yale University Press.

1999b. "The Baghdad Railway and the Armenian Genocide, 1915-1916," in R. Hovannisian (ed.), Remembrance and Denial: The Case of the Armenian Genocide. Detroit: Wayne State

Into That Darkness: From Mercy Killing to Mass Murder. New York: Random House.

1994. "Types of Genocide? Croatians, Serbs and Jews, 1941-45," in Cesarani (ed.), The Final Solution: Origins and Implementation. London: Routledge.

RESEARCH JOURNALS

ADAMS, DAVID et al. 1989. Statement on violence. Journal of Peace Research, 26: 120-21.- 1997. War is not in our biology: a decade of the Seville statement, on violence. In Grisolia et al. 1997: 251-56.

BEBBER. CHARLES C. 1994. Increases in U.S. violent crime during the

1980s following four American military actions. Journal of Interpersonal Violence 9 (1): 109-16.

BEER, MICHAEL. 1994. Annotated bibliography of nonviolent action training. International Journal of Nonviolence, 2: 72-99:

BONTA, BRUCE D. 1993. Peaceful Peoples: An Annotated Bibliography. Metuchen, N.J. and London: Scarecrow Press ____ 1996. Conflict resolution among peaceful societies: the culture of peacefulness. Journal of Peace Research, 33: 403-420.

COPPIETERS, BRUNO AND ZVEREV, ALEXEI. 1995. V.C. Bonch-Bruevich and the Doukhobors: on the conscientious objection policies of the Bolsheviks. Canadian Ethnic StudiesIEtudes Ethniques au Canada.

EISENHOWER, DWIGHT D. 1953. Speech to the American Society of Newspaper Editors, April 16, 1953. Full-page excerpt in The Wall Street Journal, May 30, 1985, p. 29.

____ 1959. BBC TV interview, August 31, 1959. Quoted in Peter Dennis and Adrian Preston, eds., Soldiers as Statesmen. New York: Barnes & Noble, 1976, p. 132.

____ 1961. Farewell broadcast, January 17, 1961. The Spoken Word, SW-9403.

HESS, G.D. 1995. An introduction to Lewis Fry Richardson and his mathematical theory of war and peace. Conflict Management and Peace Science 14 (1)

HORIGAN, DAMIEN P. 1996. On compassion capital punishment: a buddhist perspective on the daath penalty. The American Journal of Jurisprudence, 41

KEYES, GENE. 1982., Force without firepower. CoEvolution Quarterly, 34: 4-25.

KEYFITZ, NATHAN. 1966. How many people have lived on earth. Demography 3 (2)

MARTIN, BRIAN. 1989. Gene Sharp's theory of power. Journal of Peace Research, 26:

MERCY, JAMES A. and SALTZM-N, LINDA E. 1989. Fatal violence among spouses in the United States 1976-85. American Journal of Public Health 79 (5)

ROSENBERG. MARK L. and MERCY. JAMES A. 1986. Homicide: epidemiologic analysis at the national level. Bulletin of the New York Academy of Medicine. 62:

SOROS, GEORGE. 1997. The capitalist threat. The Atlantic Monthly.

February.
"Albania Accuses Tito of Genocide in Kossowo" CENTRAL EUROPE JOURNAL 14 (December 1966): 399-400.
"The Ache of Paraguay 1982" In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Lanham, Maryland: University Press of America,
Braham, Randolph L. 1981. THE POLITICS OF GENOCIDE: THE HOLOCAUST IN HUNGARY. Volumes 1-2. New York: Columbia University Press.
the Ottoman-Armenians: the anatomy of genocide." INTERNATIONAL JOURNAL MIDDLE EAST STUDIES 18 (3, 1986)
"Documentation of the Armenian genocide in Turkish sources." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell, 1991
Harff, Barbara 1986. "Genocide as state terrorism." In GOVERNMENT VIOLENCE AND REPRESSION: AN AGENDA FOR RESEARCH, [edited] by Michael Stohl and George A. Lopez. New York: Greenwood Press.
"The etiology of genocides 1987." In GENOCIDE AND THE MODERN AGE: ETIOLOGY AND CASE STUDIES OF MASS DEATH, [edited] by Isidor Walliman and Michael N. Dobkowski. New York: Greenwood Press.
Ted Robert Gurr (1988). "Toward empirical theory of genocides and politicides: identification and measurement of cases since 1945." INTERNATIONAL STUDIES QUARTERLY 32
"Pol Pot's Cambodia 1984: was it genocide?" In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press.
Hirsch, Herbert and Roger W. Smith 1991. "The language of extermination in genocide." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell.
"The Unremembered Genocide." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Lanham, Maryland: University Press of America, 1982,
"The historical dimensions of the Armenian question, 1878-1923." In THE ARMENIAN GENOCIDE IN PERSPECTIVE, [edited] by Richard G. Hovannisian. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books, 1986a

INTERNET ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE: AN INTERNATIONAL INFORMATION RESOURCE EXCHANGE TOWARDS UNDERSTANDING, INTERVENTION, AND PREVENTION OF GENOCIDE. (various issues) [published by the Institute on the Holocaust and Genocide, P.O.B. 10311, 91102 Jerusalem, Israel].

"The Hutu-Tutsi Conflict in Burundi 1982." In GENOCIDE AND HUMAN RIGHTS: A GLOBAL ANTHOLOGY, [edited] by Jack Nusan Porter. Washington, D.C.: University Press of America.

TOTTEN, SAMUEL 1991. "First-person accounts of genocidal acts." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell.

FREEMMAN, M. 1995. "Genocide, Civilization and Modernity." British Journal of Sociology, vol. 46.

Haberer, E. 2001. "THE GERMAN POLICE AND GENOCIDE IN BELORUSSIA, 1941-1944," Journal of Genocide Research, vol. 3, in three parts.

"RWANDA: Genocide and Beyond." Journal of Refugee Studies, vol. 9

ROSSINO, A. 1997. "Destructive Impulses: German Soldiers and the Conquest of Poland." Holocaust and Genocide Studies, vol. 11

UNITED STATES OFFICIAL DOCUMENTS ON THE ARMENIAN GENOCIDE, reprinted 1993-5. Vol. I

"MIGRATION, DEPORTATION AND NATION-BUILDING: The Case of the Ottoman Empire," in R. Leboutte (ed.), Migrations et migrants dans une perspective historique. Brussels: Peter Lang.

THE PATH OF A GENOCIDE: The Rwanda Crisis from Uganda to Zaire. New Brunswick, N.J.: Transaction.

THE POLITICS OF GENOCIDE: The Holocaust in Hungary, 2 vols. New York: Columbia University Press.

"THE PARTITION OF INDIA AND RETRIBUTIVE GENOCIDE IN THE PUNJAB, 1946-47." Journal of Genocide Research, vol. 5.

"THE ROLE OF TURKISH PHYSICIANS IN THE WORD WAR I GENOCIDE OF OTTOMAN ARMENIANS." Holocaust and Genocide Studies, Studies, vol. R.

"THE ROLE OF THE SPECIAL ORGANISATION IN THE ARMENIAN GENOCIDE IN THE FIRST WORLD WAR," in P. Panayi (ed.), Minorities in Wartime. Oxford: Berg.

"PARTY ALLEGIANCE AS DETERMINANT IN THE TURKISH MILITARY'S INVOLVEMENT IN THE WORLD WAR I ARMENIAN GENOCIDE." Revue du monde Armenian, vol. i.

"THE TURKISH MILTARY TRIBUNAL'S PROSECUTION OF THE AUTHORS OF THE ARMENIAN FOUR MAJOR COURT-MARTIAL SERIES." Holocaust and Genocide Studies, vol. ii.

"NO LESSONS LEARNED FORM THE HOLOCAUST? ASSESSING RISKS OF GENOCIDE POLITICAL MASS MURDER SINCE 1955." American Political Science Review, vol. 97.

HARFF, B., & GURR, T. 1988. "Toward an Empirical Theory of Genocides and Politicides: Identification and Measurement of Cases Since 1945." International Studies Quarterly, vol. 32.

"EXPLAINING THE 1994 GENOCIDE IN RWANDA." Journal of Modern African Studies, vol. 37.

"THE DEMOGRAPHY OF GENOCIDE IN SOUTHEAST ASIA 2003." Gritical Asian Studies, Vol. 35.

"ANTICIPATORYOBEDIENCE" ANDTHE NAZIIMPLEMENTATION OF THE HOLOCAUST IN THE UKRAINE 2002." Holocaust and Genocide Studies , Vol. 16.

"WERE THE PERPETRATORS OF GENOCIDE 'ORDINARY MEN' OR 'REAL NAZIS'? RESULTS FROM FIFTEEN HUNDRED BIOGRAPHIES." Holocaust and Genocide Studies, Vol. 14

H.H.SPRY "Some Account of the Gangmurders of Central India. Commonly Called the Thugs. Accompanying the Skulls of Seven of Them" The Phrenological Journal and Miscellany, VIII, Dec.1832 -June 1834

J.A.R.STEVENSON. "Some Account of the Phansigars or Gang-Robbers and of the Shudgarshids, or Tribes of Jugglers." Journal of the Royal Asiatic Society of Great Britain and Ireland, I. (1834).

REPORTS AND DOCUMENTS

AMNESTY INTERNATIONAL. 2000. The Death Penalty, ACT 50/05/00. April 2000.

BUREAU OF JUSTICE. 2000a. Capital Punishment 1999. Washington: U.S. Department of Justice.

____ 2000b. Prison and Jail Inmates at Midyear 1999. Washington, D.C.: U.S. Department of Justice.

CAMPBELL, DONALD T. and FISKE, DONALD W. 1959. Convergent and discriminant validation by the multitraitmultimethod matrix. Psychological Bulletin 56 (2): 81- 105.

THE DEFENSE MONITOR 1972-. Washington, D.C.: Center for Defense Information.

FEDERAL BUREAU OF INVESTIGATION, U.S. DEPARTMENT OF JUSTICE. 2000. Crime in the United States 1999. Washington, D.C.: Federal Bureau of Investigation.

HOREMAN, BART and STOLWIJK, MARC. 1998. Refusing to Bear Arms: A World Survey of Conscription and Consci-entious Objection to Military Service. London: War Resisters International.

HAMID MIR 20,JUN 2005."Pirwala se America tek" Daily Jang,Karachi.Editotial page

HUMAN COST IN SECOND WORLD WAR, 7, JUN 2005.Guardin News service,Daily Dawn, Karachi.p.14

PLANNING PROJECT, Matsunaga Institute for Peace, University of Hawai'i. Available at www.globalnonviolence.org

SANTIAGO, ANGELA S. 1995. Chronology of a Revolution 1986. Manila: Found@9P for Worldwide People Power.

UNITED NATIONS. 1978. Final Document of Assembly Session on Disarmament 23 May-1 July 1978. S-10/2. New York: Office of Public Information.

WORLD BANK. 1997. World Development Report 1997: The State in a Changing World. Oxford: Oxford University Press.

WORLD WILDLIFE FUND. 1986. The Assisi Declarations: Messages on Man and Nature From Buddhism, Christianity,Hinduism, Jainism & Judaism. Gland, Switzerland: WWF International.

THE AMERICAN CRIME OF GENOCIDE IN SOUTH VIET NAM. 1967.South Viet Nam: Giai Phong Publishing House,

BRONKHURST, DAAN. "Extrajudicial Executions, International Alerts and Campaigning." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press

CHALK, FRANK AND KURT JONASSOHN 1988,. "The history and sociology of genocidal killings." In GENOCIDE: A CRITICAL

BIBLIOGRAPHIC REVIEW, [edited] by Israel W. Charny. New York: Facts on File, Inc.
THE HISTORY AND SOCIOLOGY OF GENOCIDE: ANALYSIS AND CASE STUDIES. New Haven: Yale University Press, 1990.
"The study of genocide." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW, [edited] by Israel W. Charny. New York: Facts on File Publications,1988
DARSA, Jan 1991. "Educating about the Holocaust: a case study in the teaching of genocide." In GENOCIDE: A CRITICAL BIBLIOGRAPHIC REVIEW: VOL. 2, [Edited] by Israel W. Charny. London: Mansell.
DEKMEJIAN, R. HRAIR 1986. "Determinants of Genocide: Armenians and Jews as Case Studies." In THE ARMENIAN GENOCIDE IN PERSPECTIVE, [edited] by Richard G. Hovannisian. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books.
DOBKIN, MARJORIE HOUSEPIAN 1986,. "What genocide? What Holocaust? News from Turkey, 1915-1923: a case study." In THE ARMENIAN GENOCIDE IN PERSPECTIVE, [edited] by Richard G. Hovannisian. New Brunswick, New Jersey: Transaction Books,
ACCOUNTING FOR GENOCIDE: NATIONAL RESPONSES AND JEWISH VICTIMIZATION DURING THE HOLOCAUST. New York: The Free Press, 1979.
"Scenarios of Genocide: Models of Genocide and Critical Responses." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press, 1984
"LIVES AT RISK: A STUDY OF VIOLATIONS OF LIFE-INTEGRITY IN 50 STATES IN 1987 BASED ON THE AMNESTY INTERNATIONAL 1988 REPORT." Paper. New York: The Institute for the Study of Genocide, John Jay College of Criminal Justice (CUNY), March, 1990
THE CASE FOR A FORGOTTEN GENOCIDE. Westwood, by Dickran H. Boyajian. New Jersey: Educational Book Crafters, 1972
Housepian-Dobkin, Marjorie. "What Genocide? What Holocaust? News from Turkey, 1915-23: a case study." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND

GENOCIDE 1984, [edited] by Israel W. Charny. Boulder: Westview Press.
"Genocide and Denial: The Armenian Case." In TOWARD THE UNDERSTANDING AND PREVENTION OF GENOCIDE: PROCEEDINGS OF THE INTERNATIONAL CONFERENCE ON THE HOLOCAUST AND GENOCIDE, [edited by] Israel W. Charny. Boulder: Westview Press, 1984
INVESTIGATIONS INTO CERTAIN PAST INSTANCES OF GENOCIDE AND EXPLORATION OF POLICY OPTIONS FOR THE FUTURE. U.S. House of Representatives, Hearings, Committee on International Relations. Ninety-Fourth Congress, Second Session, May 11; August 30, 1976.
_________. "Reflections on the prevention of genocide." In GENOCIDE WATCH 1992, [edited] by Helen Fein. New Haven: Yale University Press.
Libaridian, Gerard J 1987. "The ultimate repression: the genocide of the Armenians, 1915-1917." In GENOCIDE AND THE MODERN AGE: ETIOLOGY AND CASE STUDIES OF MASS DEATH, [edited] by Isidor Wallimann and Michael N. Dobkowski. New York: Greenwood Press
____________________1972. "Genocide: full report." In BANGLADESH GENOCIDE AND WORLD PRESS, edited by Fazlul Quader Quaderi. Dacca, Bangladesh: Begum Dilafroz Quaderi.
LETHAL POLITICS: SOVIET GENOCIDE AND MASS MURDER SINCE 1917. 1990 New Brunswick, New Jersey: Transaction Publishers.
Wallimann, Isidor and Michael N. Dobkowski (Eds.) 1987. GENOCIDE AND THE MODERN AGE: ETIOLOGY AND CASE STUDIES OF MASS DEATH. New York: Greenwood Press.
"THE GENOCIDE OF THE ARMENIANS AND THE SILENCE OF THE TURKS," in Proceedings of the International Conference on "Problem of Genocide." Cambridge, Mass.: Zoryan Institute.
THE HIDDEN GENOCIDE IN BOSNIA-HERZOGOVINA AND CROATTIA. Minneapolis: University of Minnesota Press.
THE BUSINESS OF GENOCIDE: THE SS, SLAVE LABOR, AND THE CONCENTRATION CAMPS CHAPEL HILL: University of North Carolina Press.
THE SLAUGHTERHOUSE PROVINCE: AN AMERICAN DIPLOMATS REPORT ON THE ARMENIAN GENOCIDE, 1915-1917. New Rochelle, N.Y.: Caratzas.
"The Armenian Genocide: GOVERNING MYTHS REVISITED." Paper presented at the European University Institute, Robert Schuman Centre for

Advanced Studies, Second Mediterranean Social and Political Research Meeting, Florence, March 21-25.
Eberhard Count Wolffskeel Von Reichenberg, Zeitoun, Mousa Dagh, Ourfa: LETTERS ON THE ARMENIAN GENOCIDE. Princeton, N.J.: Gomidas Institute.
"ENVER PASHA AND POL POT 1997: A Comparison of the Armenian and Cambodian Genocide," in Proceedings of the International Conference on "Problems of Genocide." Cambridge, Mass.: Zoryan Institute.
"THE ETHNIC ELEMENT IN THE CAMBODIAN GENOCIDE 2001," in Chirot and Seligman (eds), Ethnopolitical Warfare.
RAMBLES AND RECOLLECTIONS OF AN INDIAN OFFICIAL LONDON.1844. 1915. Revised and annotaled edition by V A Smith London Reprinted in Karachi. 1975. Reprinted by Asian Educational Services. New Delhi 1995.
WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856). 1849. Report on Budhak alias Bagree Decoits and Other Gang Robbers by Hereditary Profession. Calcutta
WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) Report on the Depredations Committed by the Thug Gangs of Upper and Central India, from the Cold Season of 1836-37, down to their Gradual Suppression under the Operation of the Measures Adopted against Them by the Supreme Government In the Year 1839. Calcutta. 1840
WILLIAM HENRY SLEEMAN (1788-1856) 1839. Report on the System of Megpunnaism, or the Murder of Indigent Parents for their Young Children (who Are Sold as Slaves) as It Prevails in the Delhie Territories and the Native States of Rajpootana, Ulwar and Bhurtpore. Serampore Press. Serampore. (Sleeman coined a word to describe what he claimed was a new type of thuggee. Megpunnaism, the murder of parents to sell their children as slaves)
Conscientious objectors in Lenin's Russia: A report, 1924. Pp. 81-93 in Studies in Peace History. ____ 1992. A Brief History of Pacifism: From Jesus to Tolstoy. Syracuse, N.Y.: Syracuse University Press.

ضمیمہ

لیکن چار سو سال پہلے براعظم امریکہ میں یورپی آبادکاروں نے اس براعظم کے اصل باشندوں سرخ ہندیوں کا قتل عام شروع کیا تو کسی قاعدے قانون، اخلاق، اصول روایت کا خیال نہیں رکھا گیا۔ صرف ایک قاعدہ تھا جس کی پیروی کی جاتی تھی کہ سرخ ہندیوں کو Exterminate or Banish کر دیا جائے۔ خون کے دریا بہا کر سونے کے دریا پیدا کیے گئے اس عہد کی المناک داستانوں کو تاریخ نگاروں نے محفوظ نہ رکھا کیوں کہ اس عہد کے تاریخ نگار، روشن خیال، مہذب و متمدن انسان سب اس بربریت اور لوٹ مار کو جائز سمجھتے تھے اور اس پر انھیں کوئی تاسف نہ تھا۔ ان مظالم پر نہ آسمان رویا نہ کسی کی آنکھ نم ہوئی نہ کسی کا سینہ شق ہوا، نہ کسی کا رنگ فق نہ کوئی چہرہ زرد ہوا۔ تاریخ کا یہ المناک خونی باب اب رفتہ رفتہ روشنی میں آ رہا ہے۔ قتال و جدال کی یہ کیفیت غیظ و غضب کی آخری حدود کو چھو چکی تھی، سرخ ہندی عورتوں بچوں کے لیے بھی ان مہذب متمدن تعلیم یافتہ دنیا کی اعلیٰ ترین گوری نسل کے دلوں میں ہمدردی اور محبت کا ایک شمہ بھی نہ تھا۔ سرخ ہندیوں کے وحشیانہ قتل عام کی عبرتناک داستانیں جو تین سو سال تک پوشیدہ رکھی گئی ہیں۔ اب رفتہ رفتہ منظر عام پر لائی جا رہی ہیں لیکن کئی چھلنیوں سے چھان کر اس کی تفصیلات Nash, Stannard, Sheehan, Wallace, Hoxie, La Perousse, Paddison, Nichols, Phillips, Hurtado, Heizer, Brown, Churchill, Cocker, Prucha, Madsen, Rommail, Micheal Man, Glain D. Page نے نہایت تفصیل سے اپنی کتابوں میں بیان کی ہیں۔ اس موضوع پر درج ذیل کتابوں کا مطالعہ دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔

1. Nash, G. 1992. Red, White and Black: The Peoples of Early North America, 3rd ed. Englewood Cliffs, N.J.: Prentice Hall.

2. Stannard, D. 1992. American Holocaust: The Conquest of the New World. New York: Oxford University Press.

3. Sheehan, B. 1973. Seeds of Extinction: Jeffersonian Philanthropy and the American Indian. Chapel Hill: University of North Carolina Press.

4. Wallace, A. 1999. Jefferson and the Indians: The Tragic Fate of the First Americans. Cambridge, Mass.: Belknap Press.

5. Hoxie, F. 1984. A Final Promise: The Campaign to Assimilate the Indians, 1880-1920. Lincoln: University of Nebraska Press.

6. La Perousse, J.-F. 1989. Monterey in 1786: Life in a California Mission: The Journals of Jean Francois de la Perousse, ed. M. Margolin. Berkeley: Heyday Books.

7. Paddison, J. 1999. A World Transformed: Firsthand Accounts of California Before the Gold Rush. Berkeley, Calif.: Heyday Books.

8. Nichols, D. 1978. Lincoln and the Indians: Civil War Policy and Politics. Columbia: University of Missouri Press.

9. Phillips, G. 1975. Chiefs and Challengers: Indian Resistance and Cooperation in Southern California. Berkeley & Los Angeles: University of California Press.

10. Hurtado, A. 1988. Indian Survival on the California Frontier. New Haven, Conn.: Yale University Press.

11. Heizer, R. 1993. The Destruction of California Indians. A Collection of Documents. Lincoln: University of Nebraska Press.

12. Brown, D. 1970. Bury My Heart at Wounded Knee: An Indian History of the American West. London: Barrie & Jenkins.

13. Churchill, Ward. 1997. A Little Matter of Genocide: Holocaust and Denial in the Americas, 1492 to the Present. San Francisco: City Light Books.

14. Cocker, M. 1998. Rivers of Blood, Rivers of Gold. London: Jonathan

Cape.

15. Prucha, F. 1994. "Andrew Jackson's Indian Policy: A Reassessment," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.
16. Madsen, B. 1994. "Mormons, Forty-Niners, and the Invasion of Shoshone Country," in Hurtado & Iverson (eds.), Major Problems in American Indian History.
17. J. M. Gran The origions of war 2 vols Groningen: Origin Press 1995.
18. Glen D Paige Nonkilling Global Political Science Philadelphia: X Libris Corporation 2002.
19. Allen D. Grimshaw "Encyclopedia of violence, peace conflict 3 volumes N. Y. Academic Press 1999.
20 Chles W. Kegley and Wiltt Kopfe World politics: Trend & Transformation 6th London Macmillan Press LTD 2000.
21. JACK Porter Genocide and Human rights: A Global Anthology Lanham, Maryland, University Press of America 1982.
22. Chalk F. & K. J. The History and Sociology of Genocide, New Haven 1990.
23. Chany I. W. [Ede] Encyclopedia of Genocide Vol. 1 - 2 Santa Barbara California 1999.
24. Horowitz, I.L Taking lives: Genocide and State Power New Brunswick, New Jersy 1997.
25. Kupuer, L. Genocide, Its political use in the Twentieth Century New Haven 1981

خطباتِ اقبال و جدید یتِ فکر

جدیدیت و مسلم جدیدیت

مقالاتِ جامعی

جلد چہارم

سیاست،جدیدیت،روزنماچہ،دہشت گردی

تہذیبی تصادم،اقبالیات،توہین، رسالت اورمغرب پر سید خالد جامعی کی فکر انگیز تحریروں کا مجموعہ ۔

مرتبہ

ڈاکٹر محمد علی جنید

KURF

جامعہ کراچی دارُالتحقیق برائے علم و دانش

Karachi University Research Forum

توہین رسالت اور عصر جدید

مغرب،اسلام اور د ہشت گردی